
سسپنس ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
2
دوسرا حصہ

موت کے سوداگر

اقلیم علیم

ہتھیار یک لخت مارتے ہیں مگر ان کا نشانہ خطا بھی ہو جاتا ہے، ہیروئن بسکا بسکا کر مارتی ہے اور اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ موت کی سوداگری کرنے والے اُن بین الاقوامی فتنوں کی ہولناک داستان جو نگر نگر طاقت و اقتدار کی بساط اُلٹ کر من پسند مُہرے سجاتے ہیں۔ ان سفّاک اور درندہ صفت مسیحاؤں کا آلۂ کار بننے والے ایک پُرعزم نوجوان کی ولولہ انگیز سرگزشت جس نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیّک کہہ کر قہر و جبروت کے ناخداؤں کو للکارا اور دہشت و انتقام کی ہر نادیدہ زنجیر کو توڑ کر اُن کے قدم اُکھاڑ دیے۔ اپنے دامن میں اندر کی اَن گنت کہانیاں سمیٹے ہوئے پَل پَل رنگ بدلنے والی ایک انوکھی کہانی۔

حقیقت سے زیادہ فکر انگیز سسپنس کا ایک تحیر خیز سلسلہ

"اس بے چاری کو اچانک ہی یہ رقعہ اپنی جیب میں ملا۔ نجانے یہ کس کی حرکت تھی۔ اس کی سنگین غلطی ہے کہ اس نے کسی کو باخبر نہیں کیا اور خود ہی اس محترم خاتون کے سر سے بُرقع اتارنے کی احمقانہ کوشش کا ارتکاب کر بیٹھی۔ آپ چاہیں تو اس حرکت پر اس کے خلاف سخت ترین تادیبی کارروائی کی جا سکتی ہے جس کا انجام ملازمت سے برطرفی بھی ہو سکتا ہے۔" وہ معذرت کرتا رہا۔ میں نے تھوڑی سی گرمی دکھانے کے بعد معاملہ رفع دفع کر دیا۔

اس ایئر ہوسٹس کو کسی مُسافر نے نہایت چالاکی کے ساتھ اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔

میں واپس اپنی جگہ آ بیٹھا لیکن میرے ذہن پر تشویش طاری ہو چلی تھی۔ اس رقعہ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس پرواز پر لے۔ ٹو کا کوئی ہرکارہ بھی سفر کر رہا تھا۔ گمان غالب تھا کہ اسے تصویر کی بنیاد پر غزالہ کی تلاش تھی۔ دوسری خواتین کو تو اس نے دیکھ ہی لیا تھا لیکن برقعے کی گری ہوئی نقاب کے باعث اس کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا لہٰذا اس نے رقعہ کے ذریعہ جہاز کے عملہ کو غزالہ کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کا چھوڑا ہوا شوشہ اس قدر مضبوط تھا کہ جہاز اور مسافروں کے تحفظ کے لیے عملے کی طرف سے کارروائی ناگزیر ہو جاتی۔ وہ تو ایئر ہوسٹس جوش میں ایک بے ضابطہ حماقت کر بیٹھی جس کی بنا پر نہ صرف پرچہ لکھنے والے کا منصوبہ ناکام ہو گیا بلکہ ہماری بھی پیچیدہ رسمی کارروائیوں سے گلوخلاصی ہو گئی کیونکہ اپنی ناکام کوشش کے باوجود ایئر ہوسٹس نے یہ یقین کر لیا تھا کہ برقعے میں مرد نہیں، کوئی عورت ہی سفر کر رہی تھی۔

میرا ذہن مسلسل اسی گتھی میں اُلجھا رہا اور آخر کار میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جس کسی نے بھی وہ حرکت کی تھی، اسی سمت میں بیٹھا ہوا تھا جدھر جینی نامی ہوسٹس سرو کر رہی تھی۔ دوم یہ کہ وہ شخص ایسی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا جہاں سے وہ براہ راست غزالہ پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔

میں نے غزالہ کے ساتھ اپنی جگہ تبدیل کر لی۔ اس طرح میں سرے والی نشست پر آ گیا۔ غزالہ میرے اور سلطان شاہ کے درمیان آ گئی۔ اس زاویے سے براہ راست اور مسلسل غزالہ پر نظر رکھنا صرف ایک ہی مُسافر کے لیے ممکن تھا۔ جو ہماری ہی قطار میں راہداری کے دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا لیکن وہ تیرہ چودہ برس کا ایک معصوم سا لڑکا تھا۔

سیٹ نمبر ۲۴ بی والے اس لڑکے کے علاوہ بائیں طرف کی اگلی تین کونے والی نشستیں ضرور ایسی تھیں کہ وہاں بیٹھے ہوئے مُسافر حسبِ مرضی سر گھما کر میری طرف دیکھ سکتے تھے۔

چند منٹ بعد میں نے اگلی نشست کے ایک مُسافر

کو گردن پیچھے گھماتے دیکھا۔ بڑے شیشوں والی عینک کے پیچھے، اس عورت کی نگاہیں جونہی میری نگاہوں سے ٹکرائیں؛ اس کے چہرے پر لحظہ بھر کے لیے تحیر کے آثار نمودار ہوئے پھر اس کا چہرہ دوبارہ اپنی نشست کی پشتگاہ کی اوٹ میں روپوش ہو گیا۔

غالباً برقع پوش عورت کی جگہ میری موجودگی اس کے لیے حیران کن ثابت ہوئی تھی۔ ترشے ہوئے بالوں کے نیچے میک اپ کی تہ میں سنوارا ہوا اس کا چہرہ خاصا دلکش تھا، عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہو گی لیکن اس کے چہرے کے کسی نقش سے بھی ایسی تجربہ کاری کا اظہار نہیں ہو رہا تھا جو منجھے ہوئے جرائم پیشہ لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

"میں بھی اس عورت کی طرف سے اُلجھن میں ہوں۔" غزالہ کی دھیمی آواز سُن کر میں چونک پڑا۔ وہ میری طرف جھکی ہوئی تھی اور شاید اس نے میری حکمتِ عملی بھی بھانپ لی تھی۔

"تو مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"سوچ رہی تھی کہ محض اتفاق ہی نہ ہو، صورت سے سیدھی سادی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا چہرہ مجھے کچھ شناسا لگ رہا ہے۔ اس نے کئی بار مڑ کر طائرانہ انداز میں پچھلی نشستوں پر نگاہ دوڑائی تھی۔"

"کہاں دیکھا تھا اسے؟" میں نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے بال مختلف انداز میں بنائے ہوئے ہیں اور آنکھوں پر عینک بھی اضافی ہے۔ اگر یہ دو تبدیلیاں نہ ہوں تو مجھے یاد آ جائے گا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔"

"سنڈیکیٹ کے دفتر میں بھی تم نے لڑکیوں کی موجودگی کا ذکر کیا تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا اور وہ چونک پڑی۔

"حد ہو گئی۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ "اس قدر سامنے کی بات ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ اسی لیے ایک اور ایک کو گیارہ کہتے ہیں۔ اسے میں نے وہیں دیکھا تھا، مسز مراد کے نام سے تعارف ہوا تھا اس سے۔"

میرے لیے وہ انکشاف پریشان کن تھا۔

ان لوگوں نے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں ہمارے ہاتھوں جو نقصانات اٹھائے تھے، ان کی بنا پر اگر وہ غزالہ کی تلاش میں اپنے سارے وسائل بھی جھونک دیتے تو مجھے حیرت نہ ہوتی۔ یہ بات بھی قرینِ قیاس تھی کہ غزالہ کے اغوا میں ناکامی کے بعد انہوں نے لاہور سے روانہ ہونے والی پروازوں کے مسافروں کی نگرانی شروع کرا دی ہو لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ مکمل پردے کے باوجود وہ لوگ غزالہ کی طرف کیوں کر متوجہ ہوتے اور پھر اس پرواز پر ایک ایسی عورت کو سوار کرا دیا جسے پہچان لینا غزالہ کے لیے دشوار ثابت نہ ہوتا جبکہ نصیر خان کی اطلاع کے مطابق ان لوگوں نے غزالہ کی تصویر بھی حاصل کر لی تھی۔ اور تصویر کی مدد سے ان کا کوئی بھی جہاندیدہ اور ہمارے لیے اجنبی ہرکارہ غزالہ کی تلاش کی مہم جاری رکھ سکتا تھا۔ اس کام کے لیے مسز مراد کا انتخاب میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ کافی دیر تک مسلسل سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں آخر کار ایک واضح سی تصویر بن ہی گئی۔

موت کے سوداگروں کے لیے مالی وسائل کی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ اپنے مفادات کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پوری قوت کے ساتھ مٹا دینے کی صلاحیت رکھتے تھے لہٰذا پے در پے نقصانات کے بعد جب انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ غزالہ اور اس کے ساتھی ان تباہ کاریوں کے پس پشت کام کر رہے ہیں تو انہوں نے رسل و رسائل کے دیگر ذرائع کے علاوہ اپنے کارندوں کی ایک ٹولی ہوائی اڈے پر بھی مامور کر دی۔

یقینی طور پر اس ٹولی کے ہر فرد کو غزالہ کی تصاویر فراہم کی گئی ہوں گی لیکن ان کے رہنما دماغ نے اس نکتے کو بھی فراموش نہیں کیا تھا کہ غزالہ بھیس بدل کر انہیں جُل دینے کی کوشش کر سکتی ہے۔ لہٰذا اس نے مسز مراد کو بھی چارے کے طور پر اس مہم میں جھونکنے کا فیصلہ کر لیا۔ مسز مراد یقینی طور پر کسی تجربہ کار شخص کی تحویل میں دے دی گئی ہو گی اور اس کی موجودگی کا مقصد صرف اتنا نظر آتا تھا کہ غزالہ اگر چھپ کر کسی پرواز سے فرار ہونے کی کوشش کرے تو مسز مراد کو مسافروں کی بھیڑ میں اپنے قریب دیکھ کر خوف زدہ ہو جائے۔ اور اضطراری طور پر اپنے کسی ساتھی کو مسز مراد کی سرکوبی پر مامور کر دے۔ ان کا دوسرا آدمی مسز مراد کی نگرانی پر مامور ہوتا۔ اس طرح مسز مراد پر ہاتھ ڈالنے والا ان کی نگاہوں میں آ جاتا۔ شاید وہ مسز مراد کو بچانے کی کوشش بھی نہ کرتے تاکہ غزالہ اور اس کے ساتھیوں کو میدان صاف ہونے کا یقین دلا سکیں۔ اس طرح وہ طویل تر نگرانی کے بعد بھرپور معلومات حاصل کر کے ہم پر کاری ضرب لگا سکتے تھے۔

اب یہ محض اتفاق ہی تھا کہ غزالہ ضرورت سے زیادہ احتیاط کی بنا پر ان کی نگاہوں میں آ گئی۔

طیاروں کے ذریعے عموماً جس طبقے کے لوگ سفر کرتے ہیں ان میں سے زیادہ تر گھرانے پردے کی ان روایتی پابندیوں کو ضروری نہیں سمجھتے جہاں برقع ناگزیر ہو جاتا ہے اور جو خواتین برقع استعمال کرتی ہیں وہ بھی عام طور پر چہرہ کھلا رکھتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ نچلا چہرہ نقاب میں لپیٹ لیتی ہیں۔

اس پس منظر میں غزالہ برقع میں مکمل طور پر چھپی ہوئی ایئرپورٹ پہنچی تو لازماً وہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوں گے۔ ایک طرف غزالہ نے کسی بھی لمحے چہرے کو بے نقاب نہیں ہونے دیا دوسری طرف مسز مراد اپنے دفتر میں ملازمت کے لیے آنے والی لڑکی کو زندہ سلامت اپنی نگاہوں سے دیکھ چکی تھی۔ اس سے رجوع کیے جانے پر ان لوگوں کو فوری طور پر یہ اشارہ مل گیا ہو گا کہ برقع پوش مسافر خاتون قد و قامت کے لحاظ سے مطلوبہ لڑکی سے مشابہ ہے۔

اس دوران میں شاید مسز مراد نے دیدہ دانستہ غزالہ کے سامنے آنے کی کوشش کی ہو تاکہ اسے چونکا سکے لیکن غزالہ تو شبے کے باوجود یاد نہ کر سکی کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔

ان جیسے منظم لوگوں کے لیے اس طیارے پر سوار ہونا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اوپن ٹکٹ پر آخری لمحات میں بھی ایک دو نشستیں ملنے کا امکان رہتا ہے۔ لہٰذا مسز مراد کم از کم ایک اور ساتھی کے ہمراہ اس پرواز پر جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ جب وہ سامنے آ کر بھی غزالہ کا ردِعمل دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تو اس کے ساتھی نے آخری حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا ہو گا کیونکہ غزالہ کا سخت ترین پردہ اس کے شبہات کو مسلسل تقویت دیتا رہا ہو گا۔

رقعہ کے ذریعے ایئر ہوسٹس کو اکسا کر اس نے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہا لیکن ہوسٹس کی ناتجربہ کاری نے اس کا کھیل بگاڑ دیا، مجھے پورا یقین تھا کہ کراچی پہنچنے کے بعد مسز مراد تو اپنی راہ ہو لے گی لیکن اس کا گمنام ساتھی اس وقت تک جونک کی طرح ہمارا پیچھا کرتا رہے گا جب تک غزالہ کی شکل دیکھ کر اپنے شبہات کی تردید یا تصدیق نہ کر لے۔

اس کے گمنام ساتھی کی نشاندہی سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان دونوں کو اتنی مہلت نہ دی جاتی کہ وہ اپنے کسی آدمی سے رابطہ قائم کر کے اسے تازہ ترین صورتحال سے باخبر کر سکیں۔ اگر اے۔ ٹو کو ایک بار بھی یہ علم ہو جاتا کہ اس کے دشمن کراچی سے متعلق ہو سکتے ہیں تو اس کی جملہ انتقامی کارروائیاں اسی طرف مرکوز ہو جائیں۔

آخر کار میں غزالہ کو وہیں چھوڑ کر ٹوائلٹ میں چلا گیا۔

"سیٹ نمبر بائیس بی والی عورت کو قابو میں کرنا ہے۔ جہاز میں اس کا کوئی ساتھی بھی ہے جو میرا اور غزالہ کا تعاقب کر سکتا ہے، تعاقب کو ناکام بنانا تمہاری ذمہ داری ہے ایئرپورٹ سے میری کار تم لے لینا، ہم ٹیکسی میں جائیں گے۔" کاغذ پر جلدی جلدی یہ پیغام نوٹ کر کے میں باہر آ گیا۔

میری غیر حاضری میں غزالہ پھر کونے والی نشست پر آ گئی تھی۔ میں اس کے اور سلطان شاہ کے درمیان بیٹھ گیا جو اس دوران بالکل لاتعلق بنا ہوا تھا۔

میں نے آہستگی سے وہ پیغام اس کی طرف بڑھا دیا۔ کار کی چابی پہلے ہی اس کی تحویل میں تھی۔

سلطان شاہ نے رفاقت کی مختصر سی مدت میں مجھے اپنی ذہنی صلاحیتوں کا قائل کر لیا تھا۔ اس نے پیغام لینے کے بعد بے پروائی سی مٹھی میں دبا لیا اور وہیں پڑھنے کے بجائے چند ثانیوں بعد اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ رقعہ پڑھنے کے لیے کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں اُٹھا تھا جو ٹوائلٹ ہی ہو سکتا تھا۔

واپسی کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے سلطان شاہ نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ شاید اسے خوشی تھی کہ لاہور سے واپسی کے باوجود کھیل جاری تھا۔

تھوڑی دیر بعد حفاظتی بند باندھنے کی ہدایات کے ساتھ ہی لینڈنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

دن کے اُجالے میں روشنیوں کے شہر کراچی کا فضائی نظارہ کچھ ایسا قابلِ دید نہیں تھا۔ طویل دائرے میں شہر کا چکر کاٹتے ہوئے طیارے کی بلندی تیزی سے کم ہونے لگی پھر طیارے نے کراچی کی زمین چھو لی۔

رن وے پر رفتار کم ہونے کے بعد طیارہ کسی تھکے ماندے عفریت کی طرح رینگتا ہوا ٹیکسی وے پر اپنی مقررہ پارکنگ بے کی طرف جا رہا تھا کہ مسافروں میں ہلکی سی سرگرمی پیدا ہو گئی۔ حفاظتی بند کھولے جانے لگے حالانکہ حفاظتی اصولوں کے تحت جب تک بند باندھے رکھنے کی روشن ہدایات معدوم نہ ہو جائیں، مسافروں کو بدستور لینڈنگ پوزیشن ہی اختیار کیے رہنا چاہیے۔

پچھلی نشستوں کا ایک مسافر کچھ زیادہ ہی بے صبرا ثابت ہوا اور جہاز کے ساکت ہونے سے پہلے ہی اپنی جگہ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے، خاصا قوی الجثہ اور طاقتور نظر آتا تھا۔ میں اس کے چہرے کی بس ایک ہی جھلک دیکھ سکا جو کچھ خوشگوار نہیں تھی۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا، جونہی وہ مسز مراد کے قریب سے گزرا، اس نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اسی لمحے طیارہ ٹھہر گیا اور مسافر نشستیں چھوڑ کر راہداریوں میں

جمع ہونے لگے۔

مسز مراد اس قوی الجثہ شخص سے تقریباً چپکی ہوئی کھڑی تھی کیونکہ اگلی نشستوں کے مسافروں نے باہر آ کر ان کی پیش قدمی کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ غالباً وہی مسز مراد کا ساتھی تھا اور اس نے روانگی سے پہلے مسز مراد کو ہدایات دینے کے لیے اس طریقۂ کار کا انتخاب کیا تھا۔ وہ دونوں ایسے زاویے سے کھڑے تھے کہ میرے لیے یہ دیکھنا ناممکن تھا کہ ان میں سے کون بول رہا تھا اور کون خاموش سامع تھا۔

میں نے پلٹ کر سلطان شاہ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں تفہیمی چمک لہرائی اور وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

میرا اندازہ تھا کہ سلطان شاہ کو اپنے شکار سے نمٹنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ طیارے کے مسافر ہونے کی بنا پر دونوں ہی غیر مسلح ہوتے جبکہ حریف کو سلطان شاہ پر واضح جسمانی برتری حاصل تھی۔

سلطان شاہ کو پارکنگ لاٹ سے میری کار نکالنی تھی لہٰذا وہ طیارے سے اتر کر پہلی ہی بس سے لاؤنج کی طرف روانہ ہو گیا، مسز مراد اور اس کا ساتھی بھی اسی بس میں گیا تھا البتہ میں کسی تنگ نظر اور دقیانوسی شوہر کی طرح غزالہ کو ساتھ لیے تیسری بس کی طرف بڑھ گیا۔

لاؤنج سے سامان لانے والے کنویر تک ان تینوں کا کہیں پتا نہیں تھا، میں آہستہ آہستہ باہر نکل آیا، مسز مراد فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ سلطان شاہ میری کار باہر لا چکا تھا لیکن قوی الجثہ شخص کا کہیں پتا نہیں تھا، میں نے بڑھ کر ایک خالی ٹیکسی کا عقبی دروازہ کھولا اور غزالہ سمیت پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ٹیکسی چل پڑی، پھر چوراہا گھومتے ہوئے میں نے ایک دوسری ٹیکسی میں مسز مراد کے ساتھی کی جھلک بھی دیکھ لی۔

سلطان شاہ کو ویران راستے پر کسی کارروائی کا موقع دینے کے لیے میں نے اپنے ٹیکسی ڈرائیور کو دانستہ گلشنِ اقبال چلنے کی ہدایت دی تھی لیکن جب ہماری ٹیکسی ڈرگ روڈ اسٹیشن سے داہنی طرف مڑی تو میری کھوپڑی جھنجھنا کر رہ گئی کیونکہ تعاقب میں آنے والی ٹیکسی زناٹے کے ساتھ سیدھی شہر کی طرف نکلی چلی گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اپنی کار نظر آ گئی۔ اس میں سلطان شاہ کے ساتھ اگلی نشست پر کوئی اور بھی موجود تھا۔ میں الجھ کر رہ گیا صورتحال میری توقع کے برعکس ہی نظر آ رہی تھی۔

آخر کار ڈرائیوان سینما سے ذرا آگے، راشد منہاس روڈ پر وہ کار اتنی قریب آ گئی کہ میں نے سلطان شاہ کے برابر میں بیٹھی ہوئی مسز مراد کو واضح طور پر پہچان لیا اور مجھ پر اضطراب طاری ہونے لگا۔

راشد منہاس روڈ پر لیول کراسنگ سے ذرا پہلے میں نے ٹیکسی رکوالی۔

"ادھر کدھر جانا ہے صاحب؟" ڈرائیور نے حیرت سے پوچھا۔

"ٹہلتے ہوئے چلے جائیں گے۔" میں نے قریبی فلیٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جلدی سے اس کو میٹر سے دس روپے زائد ادا کر دیے کیونکہ اتنی دیر میں سلطان شاہ قریب آ چکا تھا۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی، سلطان شاہ نے کار ہمارے قریب روک دی۔

برقع پوش غزالہ کو مسز مراد شاید دور ہی سے ٹیکسی سے اترتے ہوئے پہچان چکی تھی لہٰذا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، کار رکتے ہی اس نے دروازہ کھول کر اترنا چاہا لیکن سلطان شاہ نے مضبوطی کے ساتھ اس کا بازو جکڑ لیا۔

"لفٹ قبول کی ہے تو آسانی سے نہیں بھاگ سکو گی۔" کار میں بیٹھتے ہوئے سلطان شاہ کی زہریلی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جس میں تضحیک کا عنصر بھی شامل تھا۔

"مجھے چھوڑ دو ورنہ شور مچا دوں گی۔" مسز مراد پھنسی پھنسی خوفزدہ آواز میں بولی۔

"ضرور کوشش کرو، گردن ہی دبا دوں گی۔" غزالہ نے پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے سلطان شاہ نے کار تیزی سے آگے بڑھا دی۔

"کیا اس نے خود ہی تم سے لفٹ مانگی تھی؟" غزالہ نے سلطان شاہ سے پوچھا۔

"نہیں میں نے ہی منزلِ مقصود تک پہنچانے کی پیشکش کی تھی، شوقین مزاج معلوم ہوتی ہے، فوراً ہی کار میں آ بیٹھی۔ اب دیکھو کہاں پہنچتی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پہلے اسے گھر ہی لے چلو، اس کی وجہ سے کہیں کوئی اور شناخت نہ کر لے، اس کا ساتھی کدھر گیا۔ وہ بھی تو پیچھے ہی آ رہا تھا ہمارے۔" میں نے زبان کھولی۔ اس اثنا میں غزالہ برقع اتار چکی تھی۔

"میں باہر نکلا تو مقرب خان کا بھانجا نظر آ گیا۔ وہ ٹیکسی چلاتا ہے۔ شریف مسافروں سے میٹر سے ایک پیسہ زیادہ نہیں لیتا لیکن مشتبہ لوگوں کو بری طرح ادھیڑتا ہے۔ بس میں نے اسے اشارہ کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ بغیر سامان والا لمبا

چوڑا آدمی اس کو لینا ہے اگر وہ کسی کا پیچھا کرنا چاہے تو دھوکا دے کر اسے کسی پولیس اسٹیشن میں لے جائے۔ وہ ادھر مڑنے کے بجائے سیدھا نکلا چلا گیا۔"

"اور یہ کیا کہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک تو مجھے الو بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بھابی کے برقع پر نظر پڑتے ہی بدکنے لگی۔ ایسے معاملوں میں کچھ اناڑی معلوم ہوتی ہے۔" سلطان شاہ نے رائے دی۔

"تمہارے ساتھ کون تھا؟" میں نے مسز مراد کو اپنی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے میری بات کا جواب دینے کے لیے میری طرف سر گھمایا مگر غزالہ کے بے نقاب چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"اوہ۔ تو اس کا شبہ درست ہی تھا۔" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی تحیرآمیز آواز نکلی۔ "وہ یہی کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنی ساری عمر میں کسی عورت کو اتنی سختی سے پردہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ آج پہلی بار اسے ایئرپورٹ پر دیکھا تھا۔ وہ خود ہی مجھے پہچان کر میری طرف آیا تھا۔"

"تم ایئرپورٹ کس کی ہدایت پر پہنچی تھیں۔"

"صبح دفتر پہنچتے ہی فون پر حکم ملا تھا۔"

"نصیر خان؟" میں نے ٹٹولنے والے لہجے میں سوال کیا۔

وہ کانپ اٹھی۔ "نہیں۔ وہ تو ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت ہے، اسے بھنک بھی مل گئی تو مجھے نوکری ہی سے نکال دے گا۔ اس سے تو میں اپنی ایک کزن کی بیماری کا بہانہ کر کے دفتر سے نکلی تھی۔"

"پھر حکم دینے والا کون تھا؟"

"مجھے آج تک پتا نہیں چل سکا بس فون پر اس کی آواز پہچان لیتی ہوں۔"

"کب سے کام کر رہی ہو اس کے لیے؟"

"شاید دو سال ہونے والے ہیں۔" وہ ابھی تک خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

"ایک اجنبی کے لیے کام کرنے کی بات حلق سے نہیں اترتی۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجبوری۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ "ایک روز مجھے ڈاک سے اپنی کچھ ایسی تصاویر ملیں جنہیں دیکھ کر میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی تھی، وہ تصویریں میرے جاننے والوں تک پہنچ جاتیں تو میرے لیے خودکشی کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہ رہتا، میں دن رات ان ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ پتا نہیں وہ کس نے بھیجی تھیں اور اس حرکت سے اس کا کیا مقصد تھا۔ تیسرے دن اس نے ان ہی تصویروں کے حوالے سے فون کیا تھا۔ اگر میں اس کے لیے کام کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کرتی تو وہ مجھے بدنام کر دیتا۔ ویسے بھی میں بیوہ ہوں اور بیوہ عورتوں پر تہمتیں تراشنے کے معاملے میں لوگ ہر طرح کی آزادی محسوس کرتے ہیں... لل... لیکن میں یہ یقین دلاتی ہوں کہ میں نے آج تک کوئی بڑا جرم نہیں کیا۔"

"پھر کیا کرتی رہی ہو اس کے لیے؟"

"شاید وہ ہماری فرم کا کوئی حریف ہے۔ زیادہ تر نصیر خان اور اس کے کاروباری معاملات کی سراغرسانی کراتا رہا ہے، بارہا دفتر کے کچھ کاغذات بھی غائب کراتے ہیں۔ شاید دفتر میں اس کا کوئی اور آدمی بھی ہے کیونکہ اڑاتے ہوئے کاغذات میں اپنی میز کی مخصوص دراز میں چھوڑ کر آتی تھی جو اگلی صبح غائب ہوتے تھے۔"

اس کی کہانی نصیر خان کے بیان سے میل کھاتی تھی۔ ایک طرف اس نے نصیر خان کو کھلی چھٹی دی ہوئی تھی اور دوسری طرف مسز مراد سے اس کی سرگرمیوں کی نگرانی کراتا رہتا تھا۔ یوں اپنی غیر موجودگی میں بھی وہ فرم کے جملہ معاملات کی پوری خبر رکھتا تھا۔

مسز مراد نسبتاً لاعلم تھی لہٰذا اس کا خیال تھا کہ اس کی مخصوص دراز سے کاغذات غائب کرنے میں دفتر کے کسی آدمی کا ہاتھ تھا لیکن نصیر خان بتا چکا تھا کہ چھٹی کے بعد کوئی دفتر میں داخل ہو کر نہ صرف اس کی میز سے کاغذات کی فوٹو کاپیاں بلکہ کیمرے سے استعمال شدہ فلم بھی نکال لے جاتا تھا لیکن دونوں ہی اس شخص کی نشاندہی سے قاصر تھے جو ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے معاملات کی پشت پر تھا۔

لے دے کر ٹی۔ اے ملک کا نام سامنے آیا تھا جو ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا ایم ڈی تھا۔ وہ فرم لمیٹڈ تھی لہٰذا اس کا بورڈ آف ڈائریکٹرز ہونا بھی ضروری تھا لیکن نصیر خان ان تمام تفصیلات سے لاعلم تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ معلومات رجسٹرار آف کمپنیز یا کسی دوسرے سرکاری ادارے سے ہی مل سکتی تھیں۔

"تمہارے ساتھی کا نام کیا تھا؟" میں نے خالی الذہنی کے عالم میں بے مقصد سا سوال کیا۔

"پتا نہیں۔ مجھے ایئرپورٹ انکوائری کاؤنٹر پر کسی ایسے آدمی کا انتظار کرنے کا حکم ملا تھا جو مجھے بڑفلائی کہہ کر

مخاطب کرتا رہ مجھے اس کے احکام کی تعمیل کرنا تھی۔"

"اور اس کے احکام کیا تھے؟"

"اس کے پاس پروین کی ایک صاف اور واضح تصویر تھی۔" اس نے غزالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے بتایا کہ یہ عورت جُل دے کر لاہور سے نکلنے کے چکر میں ہے، ہمیں اس پہ ہاتھ ڈالنا ہوگا۔"

"جب اس کے پاس تصویر تھی تو تمہاری کیا ضرورت تھی؟"

"اس بات پر مجھے خود حیرت ہوتی تھی لیکن اسے اندیشہ تھا کہ پروین حلیہ بھی بدل سکتی ہے۔ ایسی صورت میں مجھے دیکھ کر وہ بوکھلا جاتی اور اس کا راز فاش ہو جاتا۔ پھر اس نے پردے کی بنا پر اس پہ شُبہ کیا اور مجھے اس کی بات درست معلوم ہوتی۔ کیونکہ قد اور جسامت میری دیکھی بھالی تھی۔"

"ائیر ہوسٹس کو رقعہ کس نے پہنچایا تھا؟"

"رقعہ؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "مجھے کسی رقعہ کا علم نہیں البتہ اس نے کسی مُسافر سے میری جگہ ضرور بدلوائی تھی تاکہ میں آسانی کے ساتھ پروین پہ نگاہ رکھ سکوں اور جب بھی وہ نقاب ہٹاتے تو اسے پہچان لوں۔"

"کراچی اُترنے کے بعد کیا پروگرام طے ہوا تھا؟"

"اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں صدر کے ایک ہوٹل میں قیام کروں۔ اس نے اپنا پروگرام نہیں بتایا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اپنی تسلی ہونے تک تمہارا پیچھا کرے گا۔"

"ان لوگوں کے لیے تم پہلے بھی کبھی ایسا کام کر چکی ہو؟"

"نہیں۔" اس نے تھوک نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "مجھے پہلی بار باہر کا کوئی کام دیا گیا ہے۔"

"اگر انہیں بھنک بھی مل گئی کہ تم ہمارے ہتھے چڑھ گئی تھیں تو نہایت خاموشی سے تمہارا پتہ صاف کر دیا جائے گا۔ تم جن لوگوں میں پھنسی ہوئی ہو وہ اوّل درجے کے قاتل اور بدمعاش ہیں۔"

"او خدا! یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔" وہ خوف سے کانپنے لگی۔

"اور ہم بھی کچھ ایسے شریف لوگ نہیں ہیں۔" غزالہ نے غرّاتے ہوئے لقمہ دیا۔ "تم نے دیکھ ہی لیا کہ تمہارے ساتھی کو ہم نے کیا چکمہ دے دیا۔ اب آسانی کے ساتھ تمہاری بھی گردن مروڑ سکتے ہیں۔"

"مم... مجھے معاف کر دو۔" وہ تقریباً رونے لگی۔ "میں نے تو تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑا، میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس بارے میں کبھی ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لاؤں گی۔"

شاید وہ... سچ ہی کہہ رہی تھی لیکن وہ ناتجربہ کار تھی جب کہ اس سے کام لینے والے بہت جہاندیدہ اور سفاک لوگ تھے اگر انہیں مسز مراد پر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو اپنے پیشہ ورانہ تشدد کے ذریعے اس کی زبان سے ہر بات اگلوا سکتے تھے دوسری طرف ہمارے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اسے اپنے گلے کا ہار بنائے رکھتے۔ اس سے گلوخلاصی کی دو ہی صورتیں تھیں۔ اسے مار دیا جاتے یا رہا کر دیا جاتے۔

میری نگاہوں میں وہ ان لوگوں کی شریکِ کار نہیں تھی۔ شریکِ کار ہوتی تو پھر موت کی سوداگری کا انعام بھی موت سے ہرگز کم نہ ہوتا لیکن وہ حقیقی معنوں میں ان کی آلۂ کار تھی۔ اس لیے اسے رہا کرنا ہی مناسب تھا لیکن اس کی رہائی سے پہلے میں ذہنی طور پر اسے اس قدر الجھا دینا چاہتا تھا کہ کبھی اسے زبان کھولنے پر مجبور کر بھی دیا جاتے تو وہ ان کی صحیح سمت میں رہنمائی نہ کر سکے۔

"زبان کھول کر تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔" میں نے سوچی سمجھی حکمتِ عملی کے تحت کہا۔ "خود اپنا ہی نقصان کرو گی۔ ان میں کچے لفنگے اور قاتل ہیں لیکن ہماری ایک باقاعدہ تنظیم ہے ایک آدمی کو نقصان پہنچا تو دس اس کی جگہ لے لیں گے اور صرف تنظیم ہی نہیں، ان سے دشمنی کے پیچھے ہمارا روایتی انتقامی جذبہ بھی کارفرما ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے دو جیالوں کو مارا ہے اب جب تک ہم ان کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا دیں گے خاموش نہیں بیٹھیں گے۔"

"تم یقین کرو، میرا ان کے کسی جُرم سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ بدستور رو دینے والی آواز میں بولی۔ "اگر مجھے بلیک میل نہ کیا جاتا تو شاید میں چھوٹے موٹے کام بھی سرانجام نہ دیتی۔"

"اسی قدر پارسا تھیں تو ایسا مواد ان کے قبضے میں کہاں سے آ گیا جس کی بنا پر تم بلیک میل ہونے پر مجبور ہو گئیں؟" غزالہ نے زہریلے لہجے میں دخل اندازی کی۔

اس کے ہونٹوں کے گوشے پھڑپھڑائے۔ اور وہ فریاد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

شاید غزالہ مزید کچھ بولتی لیکن میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کر دیا۔

سلطان شاہ نے بھی اس مرحلے پر اپنے مردودین کا ثبوت دیا اور کار چلاتے ہوئے غصے سے سر جھٹک کر پشتو میں نہ جانے کیا کیا بڑبڑانے لگا۔ مسز مراد نے سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر التجا آمیز نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

"ہم نے عہد کیا ہے کہ دشمن سے تعلق رکھنے والے چڑیا کے بچے کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن تم عورت ذات ہو، میں تم کو موقع دینا چاہتا ہوں، میری خواہش اپنی جگہ مگر تم میرے ساتھی کو دیکھ رہی ہو کہ کس طرح بنکار رہا ہے میرے لیے ان سب کو مطمئن کرنا دشوار ہو جائے گا۔"

"خدا کے لیے۔" وہ گڑگڑا کر رو پڑی۔ "مجھے رہا کر دو، مجھے چھوڑ دو، میں بے گناہ ہوں۔"

"خاموش رہو نامراد عورت۔" غزالہ نے اسے جھڑک دیا اور وہ سہم کر چپ ہو گئی۔

"اسے یہیں اتار دو۔" گلشنِ اقبال سے گزرنے کے بعد نیو ٹاؤن پولیس اسٹیشن والے چوراہے پر میں نے سلطان شاہ سے کہا اور مسز مراد جلدی جلدی رومال سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

گاڑی رکتے ہی وہ اس قدر عجلت میں اتری تھی جیسے اسے اندیشہ رہا ہو کہ تاخیر ہونے کی صورت میں کہیں میں اپنا ارادہ نہ بدل دوں۔

گھر پر بے فکری سے ان واقعات پر غور کرنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ رواروی میں ہم لوگ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ آئے تھے۔ مسز مراد کا رویّہ جو کچھ بھی رہتا، اس کا ساتھی اپنے اوپر والے کو ضرور یہ بتاتا کہ لاہور سے ایک مشتبہ عورت کراچی آئی تھی جس کے تعاقب کی کوشش ناکام بنا دی گئی۔ یوں لے۔ ٹو کی توجہ کراچی کی طرف مبذول ہو جانی تھی۔ محض ان ہی اندیشوں کے پیشِ نظر میں نے غزالہ کو مکمل طور پر گھر میں محدود ہو جانے کی ہدایت دے ڈالی تھی کیونکہ ان لوگوں کے پاس غزالہ کی تصویر موجود تھی۔

واپسی پر پہلے غزالہ کو اس کے گھر چھوڑ گیا پھر سلطان شاہ میرے گھر سے بھرپور تیاری کر کے اس ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا تھا جہاں مسز مراد کو قیام کرنا تھا۔

اگر لے۔ ٹو کی توجہ کراچی کی طرف مبذول ہونی ہی تھی تو اس میں اس کے لیے دھمکی یا عبرت کا پہلو ہونا ضروری تھا۔ میں نے سلطان شاہ کو کھلی چھٹی دے دی تھی کہ وہ شخص مسز مراد کا رُخ کرے تو اسے اغوا کر لیا جائے۔ اگر ناکامی کا خوف ہو تو بے دریغ اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔

اس نے جو کچھ اطلاعات لاہور پہنچائی ہوں، ان سے صرف نظر کر بھی وہ بہت سی باتوں کا عینی شاہد تھا۔ دوسری طرف وہ واقعات کی روشنی میں لے۔ ٹو کا قابلِ اعتماد ساتھی نظر آ رہا تھا لہٰذا اس کی ہلاکت میری نگاہ میں ضروری تھی۔

وہ معاملات تو بظاہر طے ہوتے نظر آ رہے تھے لیکن کراچی کے معاملات سے میں قطعی طور پر لاعلم تھا جاتے ہوئے شہر میں ساری سرگرمیاں معطل کر دی گئی تھیں اور جہانگیر کا اندازہ تھا کہ ہیروئن کی آخری کھیپ شاید ایک ہفتے تک شہر کی ضروریات پوری کر سکے گی۔ اس کے بعد کے حالات کا انحصار اوپر کے احکام پر تھا۔

اس وقت تنظیم کے معاملات بھی عجیب پیچیدگی کا شکار تھے۔ بی ون یعنی مٹھا خان اپنے ہاتھوں خودکشی کر کے کیفرِ کردار کو پہنچ چکا تھا اور کسی کو علم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کی حویلی سے برآمد ہونے والا طاقتور ٹرانسمیٹر ریسیور، ایم، ٹی تھری ہنڈرڈ ہیروئن کی مقامی اور بین الاقوامی تجارت میں استعمال ہو رہا تھا۔ فوجی ماہرین سے شہری حکام تک ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ مٹھا خان کوئی غیر ملکی جاسوس تھا جس نے راز فاش ہونے کے خوف سے خودکشی کر لی۔

اس اہم واقعے کے بعد ہدایات دینے کے لیے ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ کا استعمال ترک کر دیا گیا تھا۔ بی ون کی جگہ کسی اور کو مقرر کرنے کے بجائے لے۔ ٹو نے رات کے مقررہ اوقات میں بذاتِ خود فون پر ہدایات جاری کرنے اور رپورٹیں وصول کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ وہ جس فون کو اس کام کے لیے استعمال کرتا تھا، اسے میں لاہور میں تباہ کر آیا تھا۔ اس طرح کراچی سے کوئی بھی کارکن لے ٹو سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ لے ٹو حسبِ مرضی کسی بھی نمبر سے مقامی اہلکاروں سے رجوع کر سکتا تھا۔

میں بذاتِ خود بی ون کے منصب پر فائز تھا جو سکندر علی کی معطلی اور پھر ہلاکت کے نتیجہ میں خالی ہوا تھا۔ سی۔ ون یا قاسم میرا ماتحت تھا لیکن اپنے اختیارات کی بنا پر وہ خاصا خودسر ہو گیا تھا۔ رخشی کے معاملے میں میرے ساتھ اس کا معرکہ جاری تھا۔ اس نے مجھے خوف زدہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی جو ناکام رہی مگر میں نے سلطان شاہ کے ہاتھوں اس کے خالی گھر میں خاصی ابتری پھیلا ڈالی تھی۔

دوسری طرف قاسم نے رخشی کو بھی گلشنِ اقبال کے ایک مکان میں چھپا دیا تھا تاکہ اسے لے۔ ٹو کے صادر کیے ہوئے سزائے موت کے فیصلے سے بچایا جا سکے کیونکہ وہ اس کی دوست تھی۔ قاسم نے اپنی طرف سے رخشی کی روپوشی کا ڈھونگ رچایا ہوا تھا مگر میں اس کی کمین گاہ سے واقف تھا اور کسی بھی وقت اس کی

اس حرکت کا انکشاف کر کے اسے لے۔ لُو سے سنا یاب کر سکتا تھا۔“

کار روائیاں معطل کرتے ہوئے میرے ذمے صرف ایک کام کیا گیا تھا کہ ہیروئن کی بیرونِ ملک اسمگلنگ کے لیے کیریئرز تیار کر کے براہ راست لے۔ لُو کو اطلاع دوں۔ وہ کام میں حامد کے ذریعے کسی بھی وقت سرانجام دے سکتا تھا۔

جب میں مخصوص ٹرانسمیٹر پر جہانگیر سے بات کرتا تھا تو میری حیثیت بی۔ فور کی ہوتی تھی جسے وہ براہ راست جواب دہ تھا لیکن بطور ڈینی وہ مجھے اپنا دوست بلکہ ماتحت سمجھتا تھا۔

میں نے خاصی سوچ بچار کے بعد اسی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

سلسلہ ملنے پر دوسری طرف سے جہانگیر ہی نے ریسیور اٹھایا تھا۔ پھر میری آواز پہچانتے ہی ایک دم پھٹ پڑا ”تم بغیر کوئی اطلاع دیے کہاں غائب تھے؟ دو دن سے تمہیں تلاش کر رہا تھا۔“

”شہر ہی میں تھا، ایسی کیا ضرورت پڑ گئی تھی میری؟“ میں نے ہنستے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ادھر چلے آؤ تو بتاتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں رازدارانہ سنجیدگی عود کر آئی۔

”بھابی کہاں ہیں؟“ میں نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

”خون نہ کھولاؤ میرا۔“ اس کی غراہٹ سنائی دی۔ ”اُس سالی ہیڈ ماسٹرنی نے الگ دماغ خراب کیا ہوا ہے میرا۔ کل ہی کراچی میں اس کا کوئی ماموں دریافت ہوا ہے۔ کچھ دنوں کے لیے اسی کے گھر گئی ہے۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“ میں نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔ ”لیکن یہ یاد رکھو کہ بیوی سالی کبھی نہیں بن سکتی پہلا رشتہ غصے کا ہے اور دوسرا سراسر پیار کا ہوتا ہے۔“

”ہوتا ہوگا جس کا ہوتا ہوگا۔“ وہ رَو میں کہہ گیا۔ ”اپنی تو سرے سے سالی بھی نہیں ہے کوئی۔“

میں نے اس کی بے بسی پر دل کھول کر قہقہہ لگایا پھر جلدی پہنچنے کا وعدہ کر کے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

میں تیار ہو کر اس کے گھر پہنچا تو لان پر بدستور خونخوار کتوں کا راج تھا جو اپنے رکھوالے کے پاس کھڑے لمبی لمبی زبانیں باہر لٹکائے دُمیں ہلا رہے تھے۔

میں نے سُنا ہوا تھا کہ دُم دار جانوروں کے مزاج کا اندازہ دُم کی حالت سے کیا جا سکتا ہے اور اس وقت وہ دُمیں صاحبانِ دُم کے خوشگوار موڈ کا اعلان کر رہی تھیں لہٰذا میں بلا جھجک کار سے اُتر کر اندر چلا گیا۔

جہانگیر نے میرے پُرتپاک رویے کا جواب قدرے سرد مہری سے دیا پھر جب بیٹھنے کے بعد میں نے غور کیا تو اس کے چہرے پر افسری برس رہی تھی لیکن میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”کہاں غائب تھے تم؟“ رسمی گفتگو کے بعد اس نے سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔

”مصروف تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس سے آگے جاننا چاہو گے تو کچھ بھی نہ بتا سکوں گا۔“

”دیکھو ڈینی! دوستی اپنی جگہ ہے اور کام اپنی جگہ، یہ نہ بھولو کہ تمہارے بارے میں بھی میں کسی کو جوابدہ ہوں۔“ اس کی سنجیدگی کچھ ضرورت سے زیادہ گہری ہو گئی۔

”تو کیا اس بارے میں جواب طلب کیا گیا ہے تم سے؟“ میں نے تحیّر آمیز لہجے میں پوچھا۔

”بی۔ فور لاپتا ہے، ٹرانسمیٹر پر کوئی جواب نہیں ملتا۔ سی ون پچھلے دو دنوں میں کم از کم پانچ بار تمہارے بارے میں دریافت کر چکا ہے، شاید اسے میری اور تمہاری دوستی کا بھی علم ہے۔“

میں ایک گہرا سانس لے کر صوفے کی پشت گاہ سے ٹک گیا۔ ”یہ سی ون کون ہے؟“

”اوپر والے سب ہی فون پر کسی کٹکھنے کتے کی طرح غراتے ہیں۔“ وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ”میں ڈی ون ہوں اور بی فور کا ماتحت ہوں تو سی ون بھی مجھ سے اُوپر ہی ہوگا۔ اس نے تحکم آمیز لہجے میں تمہارے بارے میں پوچھا تھا جب میں نے کسی سی ون سے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ سڑی سڑی گالیوں پر اُتر آیا۔“ آخر میں اس کا لہجہ خفت آمیز ہو گیا۔

میرے لیے وہ لمحہ فکریہ تھا۔ قاسم میری تلاش میں اس قدر دیوانہ ہو رہا تھا کہ ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر براہِ راست جہانگیر سے رابطہ قائم کر بیٹھا تھا۔

”پھر تم نے کیا بتایا؟“ میں نے اسے خاموش پا کر ٹوکا۔

”مجھے معلوم ہی کیا تھا جو اسے کچھ بتاتا۔ ہر بار اس نے ایک ہی بات کہی کہ جب بھی تم سے ملاقات ہو، اس کا پیغام تم تک پہنچا دوں۔ مجھے حیرت ہے کہ اس سے تمہارا کیا واسطہ ہو سکتا ہے... تم تو میرے ماتحت ہی ہونا۔“

اپنی پریشانی کے باوجود میں اس کی بے یقینی پر ہنس پڑا۔ ”یہ تو اسی سے پوچھنا تھا تم کو، میرے لیے تو سی ون بالکل نیا نام ہے ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی غیر متعلق آدمی رہا ہو۔“

وہ خوف زدہ انداز میں ہنسنے لگا۔ ”ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے ہو، بھلا وہ باہر کا آدمی کیوں ہونے لگا۔“

”خدا کرے کہ تم سے کوئی بے احتیاطی سرزد نہ ہوئی ہو۔“ میں سنجیدگی کے ساتھ بڑبڑایا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ میرا یا تنظیم کا دشمن رہا ہو اور اسے کہیں سے کوڈ سسٹم کی بھنک مل گئی ہو۔ تمہاری طرح وہ بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ بی فور اور ڈی ون کے درمیانی خلا کو کوئی سی ون ہی پر کر سکتا ہے۔“

وہ میرے قریب سرک آیا۔ ”خیر یہ تو ہماری آپس کی بات ہے، میں بی فور سے اس کا ذکر ہی گول کر جاؤں گا۔“

”اور اگر اسے معلوم ہو ہی گیا۔“ میں نے کہا۔ ”میں جیوا اوز بھی جاتا ہوں، وہ کہیں بھی مجھ سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ میں بھی تو آخر اسی کو جوابدہ ہوں نا۔ خواہ تمہارے ہی ذریعہ سہی۔“

”اتر آئے گھٹیا باتوں پر۔“ وہ تیوریوں پر بل ڈال کر روٹھنے والے انداز میں بولا۔ ”جواب دہی اپنی جگہ لیکن دوستی بھی تو کوئی مقام رکھتی ہے۔ میری خاطر تم ذرا سا جھوٹ نہیں بول سکتے۔“

”میں تو بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتا ہوں، تم خود ہی ہر وقت مجھے ماتحتی کا احساس دلاتے رہتے ہو، یاد ہے میرے آتے ہی تم نے کیا کہا تھا مجھ سے۔“

وہ میرے بازو پر ہاتھ مار کر کھو کھلے انداز میں ہنس پڑا۔ ”بڑے کم ظرف ہو، مذاق بھی برداشت نہیں ہوتا تم سے، ارے ہم میں بھلا افسری ماتحتی چل سکتی ہے۔“

”آئندہ مذاق کیا کرو تو پہلے سے بتا دیا کرو۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔ ”ورنہ تمہاری بدمستیوں کے باعث کسی دن ہم بھوکے گیدڑوں کی طرح ایک دوسرے کو نوچ کھائیں گے۔“

”کھانے کی بات بعد میں، پہلے تھوڑا شغل ہو جائے۔“ وہ ہنستے ہوئے اُٹھ گیا۔

”تمہاری پسندیدہ بلیک ڈاگ ہے۔“ اس نے گلاس بنا کر واپس لوٹتے ہوئے کہا پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کے جامِ صحت تجویز کیے اور ولایتی سیال اپنے معدوں میں اُنڈیلنے لگے۔

”یار یہ سی ون بہت غیر ذمہ دار آدمی معلوم ہوتا ہے۔“ چند ثانیوں بعد وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔

”کیا تمہیں آنکھ مار بیٹھا تھا؟“ میں نے سگریٹ کا دھواں اس کے چہرے پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

”اسے صرف تمہاری ہی فکر تھی، میں نے بازار کی بات چھیڑنا چاہی تو اس نے سختی سے یہ کہہ کر بات کاٹ دی کہ مناسب وقت پر خود بخود ہدایات مل جائیں گی۔“

”بازار کو کیا ہوا؟“ میں نے تیوریاں چڑھا کر سوال کیا۔

”میرا اندازہ تھا کہ آخری کھیپ ایک ہفتہ کھینچ لے گی۔ مگر سارے اندازے غلط ہو گئے۔ بازار میں ایک دم مانگ بڑھی ہے۔ دو دن میں مال نہ پہنچا تو شہر میں کہرام مچ جائے گا۔ ہیروئن کا ایڈکشن واقعی بہت بھیانک ہوتا ہے۔ وقت پر ڈوز نہ ملنے پر نشے باز کی بدحالی بس دیکھی ہی جا سکتی ہے بیان نہیں کی جا سکتی۔“

”تمہارا اندازہ کیسے غلط ہو گیا؟“

”باہر سے تھوڑی بہت ہیروئن لا کر کھلے بازار میں بیچنے والے دو افغان ہمارے آدمیوں کی نگاہوں میں آ گئے تھے میں نے بی فور کو ان کے پتے سے آگاہ کر دیا تھا۔ دوسرے دن وہ دونوں سہراب گوٹھ کی ندی سے تقریباً نزع کے عالم میں اٹھائے گئے۔ انہیں بہت بے دردی سے مارا گیا تھا۔ تازہ گل نامی افغان کی کئی پسلیاں توڑ دی گئی تھیں۔ مکّوں سے چہرہ ادھیڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔ دوسرا کوئی نزار خان تھا اس کا تو سر کھول دیا گیا تھا، دونوں پنڈلیاں بھی توڑ دی گئیں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حملہ آوروں نے انہیں جان سے مارنے کے بجائے بُری طرح زخمی کرنے پر کمر باندھی ہوئی تھی، ہر طرف افواہیں ہیں کہ انہیں ہیروئن کی مارکیٹ میں گھسنے کی پاداش میں لہولہان کیا گیا تھا لہٰذا سارے برساتی ہیروئن فروش خوف زدہ ہو کر وقتی طور پر کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اب ان کے گاہک بھی ہمارے آدمیوں سے رجوع کر رہے ہیں۔“

”سیدھی سی ترکیب ہے کہ نئی پارٹیوں کو مال نہ دو۔“ میں نے کہا۔

”یہی کیا ہے لیکن اب وہ ہمارے پُرانے خوردہ فروشوں سے مال مہنگے دام لے رہے ہیں، پچھلے چند دنوں میں بہتیرے لوگوں کی تو چاندی ہو گئی ہے۔ پُرانے لوگوں کے مطالبات کو رد کرنا بس سے باہر ہے۔“

”نزار خان اور تازہ گل کے سلسلے میں کن لوگوں کے نام لیے جا رہے ہیں؟“

”پولیس تو اسے افغان منشیات فروشوں کی باہمی چپقلش سمجھ رہی ہے لیکن زیرِ زمین دھندوں سے تعلق رکھنے والے باخبر حلقوں میں نادر کا نام ہوّا بنا ہوا ہے کیونکہ طارق بے چارے کے قتل کے بعد وہی بازار میں پیش پیش ہے۔“

”وہ تنہا تو نہیں ہے۔“

”سو پچاس بھی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہی سب

سے سینئر ہے اسی لیے اس کا نام لیا جا رہا ہے۔"

"اگر اس معمولی سی تادیبی کارروائی نے تمہارے تخمینوں کو اُلٹ کر رکھ دیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ شہر میں ہیروئن کی حقیقی کھپت بہت بڑھ چکی ہے۔ ہم اس بازار کے سب سے بڑے حصے دار ضرور ہیں لیکن چھوٹے موٹے آدمی بھی خاصا کام کر رہے ہیں۔" میں نے اپنے گلاس سے آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ایک بات پوچھوں؟" اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔

"وہ پوچھنا لیکن پہلے گلاس لبریز کر دو۔" میں نے گلاس کا پیندا میز کی چوبی سطح پر مارتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھا اور بوتل کے ساتھ ہی آلتس ٹرے بھی ساتھ لے آیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ اب تم پوری بوتل چوس کر ہی اٹھو گے۔" وہ میرے مقابل بیٹھتے ہوئے ہنس کر بولا۔

"غیر حاضری کا حساب بھی تو برابر کرنا ہے۔"

"کبھی تم نے موجودہ حالات پر غور کرنے کی کوشش کی ہے؟" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد اس نے بات چھیڑی۔

"کچھ دن پہلے بھی ہم یہی موضوع زیرِ بحث لا چکے ہیں" میں نے ابرو پر بل ڈال کر کہا۔

"کون سا موضوع؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی کہ ہم کھلی زد پر ہیں، بی فور سمیت ہر ایک پردے میں ہے، اونچ نیچ ہو گئی تو بے موت مارے جائیں گے، طارق کا انجام سامنے ہے۔ ایک طرف قانون اور دوسری طرف نادیدہ سربراہ ہم پر مسلط ہے۔"

وہ بے ایمان تھا۔ شاید اپنے گلاس میں پہلے ہی زیادہ ڈال کر لایا تھا کیونکہ آخری گھونٹ لینے کے بعد اس کی آواز میں سرور کی لہر عود کر آئی تھی۔ "یہ تو خود غرضی کی باتیں ہیں، کبھی اخلاقی پہلو پر بھی غور کیا تم نے؟"

"ہائیں" میں نے حیرت سے آنکھیں نکال کر بے ساختہ کہا۔ "یہ اخلاق کا دورہ کیسے پڑ گیا تم پر؟"

"چرس تک تو بات ٹھیک تھی۔ مل گئی تو نشہ کر لیا، نہ ملی تو بھی چرسی کما کھاتے تھے لیکن ہیروئن تو تباہی کا زہر پھیلا رہی ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے دو کیس دیکھ چکا ہوں یہ بدبخت نشہ وقت پر نہ ملے تو انسان جانور کی سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو اپنی آنکھوں سے سسکتے، بلکتے اور گڑگڑاتے دیکھا ہے۔" اس کی آواز میں درد سمٹ آیا۔

"اگلی کھیپ وصول کرنے سے انکار کر دینا۔" میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے رحمانہ انداز میں کہا۔

"تاکہ کوئی دندناتا ہوا آئے اور میری کھوپڑی میں پگھلا ہوا سیسہ اُتار کر چلا جائے۔" اس نے چیخ کر تلخ لہجے میں کہا۔

"تمہارے کتے کسے آنے دیں گے؟"

"میرا مضحکہ نہ اُڑاؤ، میں بہت دنوں سے خلش محسوس کر رہا ہوں۔" وہ بوجھل لہجے میں بولا۔ "اکثر میری راتوں کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں... میں زیادہ عرصے یہ گاڑی نہ چلا سکوں گا۔"

میں غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لے کر اس کی بات کے وزن کا اندازہ کرتا رہا۔ اس کی مخمور نگاہوں میں واقعی کرب کے سائے لہرا رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، خلوصِ نیت سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے۔" آخر کار میں نے اُداس لہجے میں کہا۔ "میں بھی اسی قسم کے ایک نشے کے شکار کو دیکھتا رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں غزالہ کی ماں شمع اور اس کے لڑکے کامران کا دردناک تصور پوری طرح واضح تھا۔ "میرا خیال ہے کہ جس شخص کے ضمیر میں ذرا سی بھی جان موجود ہے، وہ ہیروئن کی سوداگری نہیں کر سکتا۔ موت تو بڑی آسان سی بات ہے ہم اس سے کہیں بھیانک جنس کے سوداگر بنا دیے گئے ہیں اور درمیانی آدمی تم سے ملنے والے مال میں ملاوٹ کرتے ہیں جنہیں اس کی لت لگ چکی ہے وہ لت پورا کرنے کے لیے مقدار بڑھاتے جا رہے ہیں اور اس کے سارے فائدے براہِ راست اُسے۔ تو کی جیب میں جاتے ہیں۔"

"فائدے پر لعنت بھیجو، مجھے تو کبھی کبھی اپنے وجود سے بھی کراہت محسوس ہونے لگتی ہے، اگر مجھے پہلے ہی دن یہ شبہ ہو جاتا کہ ہیروئن اس قدر تباہ کن نشہ ہے تو شاید میں وہیں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کرتا۔" اس کی آواز میں اداسی کا عنصر گہرا ہوتا چلا گیا جو شاید نشے کا اثر تھا کیونکہ نشہ کسی بھی قسم کا ہو، انسان کو ذکی الحس بنا دیتا ہے اور اندر چھپے ہوئے سسکتے ہوئے جذبوں کو قوتِ گویائی عطا کر دیتا ہے، شاید یہی اثر لوگوں کو نشے کی طرف راغب کرتا ہے کہ عالمِ سرور میں وہ ہر وہ بات کہہ اور کر گزرتے ہیں جو عالمِ ہوش و خرد میں سوچنی بھی دشوار ہوتی ہے۔

معاشی ناآسودگیوں، طبقاتی منافرت، مشینی عہد کی آسائشوں کے حصول کی تھکا دینے والی جدوجہد اور بساط سے باہر مقابلے کی فضا میں غریب اور امیر، ہر ایک پِسا جا رہا تھا۔ ہر شخص ہر لمحے دوسرے کی انا پر کاری وار کرنے پر تلا رہتا ہے، جن کے اعصاب ذرا مضبوط تھے وہ زندگی کے ان خود ساختہ عذابوں کو سہتے اس ابدی آرام گاہ میں جا اُترتے تھے جہاں ان میں سے زندگی کا کوئی جھمیلا نہیں تھا اور جن کے کمزور اعصاب اس بوجھ سے چٹخنے لگتے تھے وہ سگریٹ سے شراب اور ہیروئن تک نشوں کی آغوش میں پناہ ڈھونڈنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ جو جس قدر کمزور تھا وہ اسی قدر قوی تر نشے سے رجوع کر رہا تھا اور یوں موت کے سوداگر من مانے منافع کی فصل کاٹ رہے تھے۔

"کل کا اخبار نہیں دیکھا تم نے۔" وہ تھکی ہوئی سوگوار آواز میں کہہ رہا تھا۔ "کورنگی میں ایک نوجوان لڑکے نے نشے کے لیے رقم نہ دینے پر پہلے اپنی ماں کو ہلاک کیا، بہن نے مزاحمت کی تو اسے بھی لہولہان کر دیا۔ اس بے چاری کی پندرہ روز بعد شادی ہونے والی تھی، تم تصور نہیں کر سکتے کہ وہ بہن کا سہارا بننے کے بجائے اس کا زیور لے بھاگا اور بعد میں ایک سینما کے قریب سے ہیروئن کے نشے میں دھت گرفتار کر لیا گیا۔ پورا گھرانا تباہ ہو گیا، اب کون اس کی بہن کا ہاتھ تھامے گا۔"

"مجھے زیادہ دکھیا نہ کرو یار۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میں بھی یہ سب دیکھتا اور پڑھتا رہتا ہوں لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کوئی سامنے ہوتا تو اسے ہی ٹھکانے لگا دیتے۔"

"بی فور کا سراغ نکالو نا۔" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا اور میں ہنس پڑا۔ بی فور اس کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ اسی کا متلاشی تھا، وہ اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ تنظیم کس قدر پیچیدہ تھی اور اس میں بی فور کس قدر مجبور و بے بس تھا۔

"اسے مار دو گے تو باقی لوگ ہوشیار ہو جائیں گے۔ یہی دن کا تم ہی نے انکشاف کیا ہے۔ وہ خود یا کوئی اور بی فور کی جگہ سنبھال لے گا، یہ چکر تو ختم نہیں ہوگا۔"

"کوئی تو ہوگا جس کے بل بوتے پر یہ سارا کھیل چل رہا ہوگا؟" وہ قدرے جھلا گیا۔

"مافیا کا نام سُنا ہے تم نے؟ بس اسے منی مافیا سمجھ لو۔ اگر کسی دن ہماری تنظیم کا ماسٹر مائنڈ قدرتی موت کا شکار بھی ہو گیا تو ہمیں کچھ علم نہ ہو سکے گا، اس کا نمبر دو اس کی جگہ سنبھال لے گا اور یہ دھندا اسی انداز میں چلتا رہے گا جب تک نشوں کی طلب ختم نہیں ہو گی یہ چکر چلتا ہی رہے گا۔"

"چلتا رہے، مجھے اس سے غرض نہیں۔ میں پورے معاشرے میں انقلاب نہیں لا سکتا۔ میری۔" اس نے جوش میں اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "جہانگیر خان کی تو بس اتنی سی خواہش ہے کہ اب میرے ہاتھ اس کراہت آمیز دھندے میں ملوث نہ ہوں۔"

"چاہے اس کے لیے خون خرابا ہی کیوں نہ کرنا پڑے؟" میں نے چیلنج آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں ہاں۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "ایک بار قصہ تو تمام ہو جائے گا نا۔"

میں ہنس پڑا۔ "ابھی پی رہے ہو بیٹے! ذرا سی لگی ہوئی ہے ذہن سے دھند صاف ہو گی تو ننھی منی سی بیوی کی بیوگی کا خیال آئے گا اور سارا جوش بلبلے کی طرح بیٹھ جائے گا۔"

"تم پھر بیوی کا ذکر نکال بیٹھے۔" وہ غصیلے لہجے میں غرایا۔ "بیوی میری ہے اور زیادہ تمہیں رہتی ہے۔"

"تم ہی اسے اہمیت دیتے ہو لہٰذا مجھے بھی اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" میں نے موضوع کی نزاکت بھانپتے ہوئے محتاط لہجے میں کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ شادی کے بعد ہی سے ان دونوں میں ٹھنی رہتی تھی اور اس کی بیوی سلمیٰ تو کئی بار میری حوصلہ افزائی کی کوششیں کر چکی تھی لیکن میں نے جہانگیر کی دوستی کے حوالے سے کسی بے جا اقدام سے ہمیشہ گریز ہی کیا جس کی بنا پر وہ مجھ سے چڑنے لگی تھی۔

"جس دن بہت زیادہ خیال رکھنے کی کوشش کی تمہاری گردن جڑ سے اُکھاڑ دوں گا۔" وہ نئے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لے کر بولا۔ "اسے جہنم میں ڈالو اور مجھے کوئی ترکیب بتاؤ، میں سنجیدگی کے ساتھ گلوخلاصی چاہتا ہوں۔"

"بس دُعا ہی کر سکتا ہوں کہ سرگرمیوں کا موجودہ تعطل مستقل ثابت ہو اور تمہیں اگلی کھیپ ملنے کی نوبت ہی نہ آئے" میں نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

"یہ بھی ظلم ہو گا۔ ہیروئن کے آدھے سے زیادہ شکار پاگل ہو جائیں گے یا تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے، یہ ایسا موذی نشہ ہے کہ اپنا علاج بھی خود ہی ہے معالج تو بس نگرانی میں رکھ کر خوراک کی مقدار میں بتدریج کمی کرتا جاتا ہے۔"

"پھر ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ بی فور سے رابطہ ہو تو مرغے کی طرح بانگ دینی شروع کر دینا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"پھر بہکنے لگے۔" وہ آنکھیں نکال کر بولا۔

"درست کہہ رہا ہوں میرے عزیز۔ بی فور سمجھے گا کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے اور وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا۔"

"تم منافق اور دغاباز ہو۔" وہ جھلا کر بولا۔ "میری مدد ہی نہیں کرنا چاہتے، تم میرے ساتھ مل جاؤ تو میں دیکھتا ہوں کہ بی فور میرا کیا بگاڑ لیتا ہے۔"

"اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر مل کر اگلی کھیپ پکڑوا دیتے ہیں، اندر سے مخبری ہوگی تو پھر خود ہی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

اس نے مایوسانہ انداز میں سر ہلا دیا۔"ناممکن... طریقہ کار کچھ ایسا ہے کہ مال کے ساتھ میں خود پکڑا جاؤں گا۔ آخری لمحے تک علم نہیں ہو پاتا کہ مال کہاں اور کیسے آ رہا ہے، پتا چلتا ہے تو اسی لمحے سے مال میری تحویل میں ہوتا ہے اور اس کی جواب دہی میری ذمہ داری ہوتی ہے۔"

میں اس کے برابر میں جا بیٹھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔"آج پہلی بار مجھے یقین آیا ہے کہ تم واقعی اپنے موجودہ دھندے سے متنفر ہو چکے ہو اب سے پہلے تک تمہاری گول مول باتوں سے میں یہی سمجھتا رہا کہ تم میری وفاداری کا امتحان لینے کی کوشش کرتے ہو۔ میں ضرور کوئی راہ نکالوں گا، لیکن یہ باتیں اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا۔"

اس نے ایفائے عہد کے اظہار میں پُرجوش طریقے پر ہاتھ ملایا اور بولا۔"لیکن یہ نہ بھولنا کہ میں بی فور سے سی ون کا ذکر بالکل نہیں کروں گا، کیا پتا سالا سنک ہی جائے۔"

"یہ حماقت نہ کرنا۔" میں نے پورے خلوص سے کہا۔"اگر سی ون اندر کا آدمی ہوا اور بی فور کو اس بارے میں بتا بیٹھا تو وہ تمہاری طرف سے بدگمان ہو جائے گا۔ جواب دہی مشکل ہو جائے گی تمہارے لیے۔"

"بس تمہاری اسی حرکت سے میں چڑتا ہوں، پہلے خود ہی ایک بات کو دلائل سے صحیح ثابت کرتے ہوئے اور جب اسے مان لیا جائے تو اپنے ہی دلائل سے اسے یکسر رد کر دیتے ہو۔"

"اپنی عقل بھی تو استعمال کیا کرو، دوسروں کے دلائل پر اس قدر انحصار کرتے رہے تو بی فور تو کیا، چڑیا کے بچے سے بھی ٹکر لے کر نہ جیت سکو گے۔"

"دوسروں کی بات مت کرو، تمہیں میں عقلِ کُل سمجھتا ہوں اسی لیے تمہاری ہر بات مان لیتا ہوں۔" وہ وضاحت آمیز لہجے میں بولا اور میں گلاس کی تلچھٹ صاف کر کے اُٹھ گیا۔

"کہاں چلے؟ ابھی تو بوتل کا پیندا خاصی دور ہے۔" وہ حیرت سے بولا۔

لیکن وہ مجھے روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ میرے ذہن پر سی ون یا قاسم کی طرف سے خلش سوار ہو گئی۔ آخر اسے میری ایسی کیا ضرورت تھی کہ وہ میری تلاش میں جہانگیر تک سے رجوع کر بیٹھا تھا۔

*

میں جہانگیر کے گھر سے سرور کے عالم میں روانہ ہوا تھا اور ڈرائیونگ سے لطف اندوز ہونے کے لیے کار ایک نسبتاً طویل لیکن غیر مصروف راستے پر ڈال دی تھی کہ چند ہی منٹ بعد عقب سے ایک برق رفتار موٹر سائیکل غراتی ہوئی نمودار ہوئی اور آناً فاناً میں میری کار کے برابر آ گئی۔ لحظہ بھر کے لیے موٹر سائیکل کی رفتار دھیمی ہوئی اور وہ میری کار کے پہلو بہ پہلو دوڑتی رہی۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا سگنل دیا لیکن اسی لمحے موٹر سائیکل سے کسی بے آواز ہتھیار سے فائر کیا گیا، شاید میں غیر شعوری طور پر کار کی رفتار بڑھا چکا تھا لہٰذا گولی مجھے نشانہ بنانے کے بجائے عقبی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی کار کے کسی اندرونی حصے میں آ گھسی اور میرا ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہک گیا۔ اگر میں فوراً ہی بریک نہ لگاتا تو میری کار فٹ پاتھ پر کسی درخت یا بجلی کے کھمبے سے جا ٹکرائی ہوتی۔ اسی اثنا میں موٹر سائیکل سوار تمام روشنیاں گُل کر کے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ مجھے اتنی بھی مہلت نہ مل سکی کہ اس کے ہیولے کا ہی جائزہ لے سکتا، اپنی تمام روشنیاں گل کر کے اس نے نمبر دیکھ لیے جانے کا امکان بھی ختم کر دیا تھا۔ رہی میری کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی تو وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ بہکنے کے باعث پہلے ہی سڑک کے بجائے فٹ پاتھ پر پڑ رہی تھی۔

اس نے رُک کر اپنے فائر کا نتیجہ دیکھنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ انجن کی آواز ہی سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ موٹر سائیکل کا انجن بہت طاقتور تھا اور میرے لیے سنبھل کر اس کے تعاقب میں روانہ ہونا بے سود ہوتا۔

میں نے اپنی کار سڑک کے کنارے لگائی اور انجن بند کیے بغیر سگریٹ سلگا کر اس نامعلوم حملہ آور کے بارے میں سوچنے لگا۔ جس انداز میں گولی چلائی گئی تھی اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اتفاق یا غلط فہمی نہیں تھی بلکہ ایک سوچا سمجھا قاتلانہ حملہ تھا۔

سی ون یا قاسم میری تلاش میں جہانگیر سے رجوع کر چکا تھا، شاید اسے میرے اور جہانگیر کے گہرے مراسم کا بھی علم تھا لہٰذا اس نے اپنے کسی گرگے کو واضح ہدایات کے ساتھ جہانگیر کے گھر کی نگرانی پر مامور کر دیا تھا وہ شخص ہدایات کی روشنی میں میری کار پہچاننے کے بعد اطمینان سے میری واپسی کا منتظر رہا پھر چلتی موٹر سائیکل سے مجھ پر ایک بے آواز فائر کر کے فرار ہو گیا، وہ تو میرے ستارے ہی اچھے تھے کہ کار کی رفتار میں اچانک اضافے کے باعث اس کی چلائی ہوئی گولی میری کھوپڑی کے بجائے عقبی کھڑکی کے شیشے کے ٹکڑے اُڑا سکی تھی۔

سگریٹ کے چند گہرے کش لے کر میں نے کار آگے بڑھا دی۔

اس وقت شہر میں قاسم کے سوا کوئی میرا ایسا دشمن نہیں تھا جو میرے لہو کا پیاسا ہوتا اور اس کے جنون کے واضح اسباب موجود تھے۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ پہلے میں اس کا محکوم تھا پھر اسے ٹو کی عنایت سے حاکم بنا دیا گیا۔ دوسرا سبب رخشی کی ذات تھی۔ وہ قاسم کی دوست اور اے ٹو کی ایجنٹ تھی۔ پہلے اسے مخبری کے لیے سکندر علی کے پیچھے لگایا گیا۔ پھر جب مجھے بی فور کا منصب ملا تو اس نے مجھ پر ڈورے ڈالنے چاہے۔ وہ مجھے نہیں پہچان سکی لیکن میں نقاب پوش کے روپ میں اسے سکندر علی کے مکان میں ہر زاویے سے بخوبی دیکھ چکا تھا۔ مجھے پھانسنے کے لیے وہ خود میرے دام میں آ پھنسی اور جب اس کی بہکی بہکی کہانی میں نے اے ٹو تک پہنچائی تو اس نے بلا تامل رخشی کے قتل کا سنگدلانہ فیصلہ صادر کیا جسے پایۂ تکمیل کو پہنچانا قاسم ہی کے فرائض میں داخل تھا اور قاسم کو مجبور ہو کر رخشی کو روپوش کرنا پڑا۔

وہیں سے میری اور اس کی ٹھنی تھی۔ بظاہر ہم دونوں تنظیم کے اہم اراکین تھے اور فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ایک دوسرے سے تعاون کر رہے تھے لیکن ایک دوسرے پر وار بھی کرتے جا رہے تھے اور مجبوری یہ آ پڑی تھی کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کسی ایک کو دوسرے کی چیرہ دستیوں کا شکوہ تو کجا اعتراف بھی کرنے کی جرأت نہیں تھی۔

میری دانست میں کچھ بعید نہ تھا اگر حملہ آور قاسم خود ہی ثابت ہوتا۔

گھر پہنچتے ہی چوکیدار سے خبر ملی کہ ڈرائنگ روم میں کوئی مہمان منتظر تھا جب کہ سلطان شاہ کافی دیر پہلے واپس آ کر مہمان کی وجہ سے خوابگاہ میں جا گھسا تھا۔ پورچ سے ذرا آگے ایک نامانوس سی کار بھی موجود تھی۔

مہمان کے امکانی حدود اربعہ کے بارے میں سوچتے ہوئے کار پارک کر کے میں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو قاسم کی صورت دیکھ کر وہیں ٹھٹک گیا۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟" میں نے وہیں کھڑے کھڑے سرد اور سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"فرائض کی انجام دہی نے مجبور کیا ہے۔" وہ خبیثانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔"وہاں کیوں رک گئے، اندر چلے آؤ، تمہارا ہی گھر ہے یہ۔"

"میرا خیال تھا کہ میں تمہیں کچل آیا ہوں۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں تیر پھینکا۔

"کب کی بات ہے؟" اس کا لہجہ مضحکانہ تھا۔

"پندرہ بیس منٹ پہلے کی بات ہے۔" میں اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اور میں ڈیڑھ گھنٹے سے یہاں تمہارا منتظر ہوں، چاہو تو اپنے چوکیدار سے تصدیق کر سکتے ہو، ویسے کس بدنصیب کو کچل آئے میرے دھوکے میں؟ مجھ سے اچانک کیا پرخاش ہو گئی تمہیں؟"

"ایک دوست کے گھر سے لوٹتے ہوئے کسی موٹر سائیکل سوار نے مجھ پر ناکام قاتلانہ حملہ کیا تھا۔" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"اس کی گولی خطا ہو گئی لیکن میں نے موٹر سائیکل سمیت اسے کار کے نیچے کچل دیا۔"

اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔"اتنے بدگمان کیوں ہو میری طرف سے، میری تم سے کون سی دشمنی ہے جو تم پر قاتلانہ حملہ کرتا۔"

"زمین کا دور لد گیا اب تو فساد کے دو ہی بہانے رہ گئے ہیں۔ زر یا زن۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"پیسے کی نہ تمہیں کمی ہے نہ مجھے۔" وہ بولا۔"پھر عورت سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

"کسی اور سے نہ پوچھ لینا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"عورت عورت ہوتی ہے، چاہے تم اسے کچھ بھی نام دے لو، رخشی کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں... اوہ سمجھا۔" وہ چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔"کہیں تم مجھے اور رخشی کو ایک ہی کشتی کا مسافر تو نہیں سمجھ رہے؟"

"میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے حقائق تو نہیں بدل سکتے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ خاموش ہی رہا۔

"وہ حملہ آور کون ہو سکتا ہے؟" چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے سوال کیا۔

"ہوگا کوئی۔ اسے جہنم میں ڈالو۔" میں نے اس کے تجسس کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔"یہ بتاؤ کہ کس فرض کی انجام دہی نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا ہے؟"

"تم دو روز سے کہاں تھے؟"

"سوال نہیں۔" میں نے سخت اور کھردرے لہجے میں کہا۔

"مجھے جواب چاہیے۔"

"میں تم سے نیچے ضرور ہوں لیکن سلامتی کے معاملات میں خود مختار ہوں۔ کل رات لیے ٹو کو بھی تمہاری تلاش تھی۔۔"

"اسے میں خود جواب دے لوں گا، میری روپوشی کا تعلق بھی سلامتی کے معاملات سے ہی تھا جس کے بارے میں میں تمہیں آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔"

"بہرحال اب تمہاری راتیں اپنے گھر پر ہی گزریں گی۔۔ یہ میرا نہیں اوپر والے کا حکم ہے۔"

"تاکہ اگلا قاتلانہ حملہ کامیاب ہو سکے۔" میں نے زہرخند کے ساتھ کہا۔

"تم حد سے بڑھ رہے ہو۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا "میری تم سے کون سی دشمنی ہے؟"

"پتا نہیں۔" میں نے بے پروائی سے شانے اُچکا کر کہا۔ "دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھے جہانگیر کے گھر سے نکلنے کے بعد مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تم کو میرے اور جہانگیر کے مراسم کا شاید پہلے سے علم ہے کیونکہ میری تلاش میں تم براہِ راست اس سے رجوع کرنے کی حماقت کا ارتکاب بھی کر بیٹھے ہو۔"

"اسی لیے تم مجھ پر شبہ کر رہے ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ اپنے انداز سے وہ موضوع کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "تمہیں مار کر بھلا مجھے کیا حاصل ہوگا؟"

"سوال تو معقول ہے۔" میں نے سر ہلا کر طنزیہ لہجے میں کہا "تم چاہتے تو میری کار کی ڈکی میں ٹائم بم بھی رکھوا سکتے تھے۔"

وہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا کیونکہ وہ میری کار کی ڈکی میں بم رکھوا چکا تھا۔ پھر رخشی نے ہمدرد بن کر فون پر مجھے انتباہ کیا تو میں نے بروقت بم سے چھٹکارا حاصل کیا لیکن میں نے اس پورے واقعے کے سلسلے میں قاسم کو ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔ اس نے رخشی کے ذریعہ کتنی کوششیں کی تھیں اور اس فراق میں تھا کہ میں اس سے اشارۃً بھی رخشی کے خطرے کا ذکر کروں تو وہ میرے کسی اور گروہ کی نگاہوں میں آجانے کا یقین دلا کر لیے ٹو سے میرے خاتمے کی ہدایت حاصل کر سکے۔ اس طرح وہ بآسانی مجھے اپنے اشاروں پر نچا سکتا تھا۔

ہم دونوں میں شدید سرد جنگ جاری تھی، دونوں ایک دوسرے کے حربوں سے واقف تھے لیکن کھل کر بات نہیں ہو رہی تھی۔

"اس دھمکی کا کیا ہوا جو کسی نے تمہارے گھر کو تباہ کرنے کے بارے میں دی تھی؟" میں نے اسے ذہنی کچوکا لگانے کی نیت سے وہ چبھتا ہوا سوال کیا۔

"کچھ کر گزرنے والے دھمکیاں نہیں دیتے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ "ابھی تک تو کوئی نہیں آیا اور آیا تو زندہ لوٹ کر نہیں جا سکے گا، میں نے پورا انتظام کر لیا ہے۔"

میں اس کے جھوٹ پر دل ہی دل میں ہنس کر رہ گیا۔

"تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ میری تلاش میں تم اس قدر بے چین کیوں تھے؟"

"اس وقت حالات خراب ہیں، اپنے آدمی نگاہوں میں رہیں تو اچھا رہتا ہے۔ کل رات لیے ٹو نے فون کیا تھا، اب ہم اس سے رابطہ قائم نہ کر سکیں گے کسی مجبوری کی وجہ سے لاہور کا نمبر ترک کر دیا گیا ہے ضرورت پڑنے پر وہ خود ہی رجوع کرے گا۔"

"اسی لیے راتیں گھر پر گزارنے کا مشورہ دے رہے تھے۔"

"ہاں۔" وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا، اپنی رسٹ واچ پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر بولا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ تم اپنے تعاقب کی کسی کوشش کو برداشت کیوں نہیں کر پاتے۔"

"اپنی آزادی پر ڈاکا کوئی بھی برداشت نہیں کرے گا۔" میں نے کہا۔ "جب بھی کوئی نگاہوں میں آ گیا، بُرا حشر کروں گا۔ حفاظت کے لیے ساتھ رہنا اور بات ہے چوروں کی طرح چھپ کر تعاقب کرنا ذلیل حرکت ہے۔"

"دو روز پہلے میرے ایک آدمی کے ساتھ تم نے بہت بُرا سلوک کیا تھا، وہ ابھی تک اسپتال میں ہے۔ تمہارا آدمی ہجوم کو اکسا کر سرک گیا تھا اور لوگ اس وقت تک اسے مارتے رہے جب تک اس نے بے ہوشی کی اداکاری شروع نہیں کی۔"

"تم حکم بھی دو گے تو اب کم از کم وہ میرا پیچھا نہیں کرے گا۔" معاً فون کی گھنٹی بجی، قاسم کی آنکھوں میں چمک سی کوند گئی۔

میں نے ڈرائنگ روم والے آپریٹس کا ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف کی آواز سن کر میرے حلق سے ایک گہرا سانس آزاد ہو گیا۔

"کہاں بھاگے پھر رہے ہو تم؟ میں نے تو کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے ہیں تمہارے لیے۔" وہ آواز واضح طور پر رخشی کی تھی۔

"کیا کام پڑ گیا تھا؟" میں نے کنکھیوں سے قاسم کی طرف دیکھا وہ میری ہی طرف متوجہ تھا۔

"تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"ابھی کر ڈالو۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا تاکہ قاسم میری

پوری بات نہ سن سکے۔

"کہیں مل لو نا۔" وہ شاید ٹھنک کر بولی تھی۔ "ابھی یا کل کسی وقت جب تمہیں سہولت ہو۔"

"کل وقت دے دوں گا، اپنا نمبر بتا دو۔"

"ہائے۔" ریسیور پر اس کے گہرے سانس کی آواز اُبھری۔ "اپنا تو نمبر ہی نہیں ہے کوئی۔ پبلک بوتھ سے بول رہی ہوں۔ ساتھی بنا لو تاکہ کم از کم تمہارے ہی نمبر کو اپنا کہہ سکوں۔"

"اور تمہارا وہ متعصب دوست کہاں جائے گا؟" میں نے براہِ راست قاسم کی طرف گھوم کر دھیمی آواز میں کہا۔ وہ میری گفتگو کے بارے میں بے حد متجسس تھا لیکن مجھ سے نگاہیں چار کرنے کے بجائے ایک پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میں اس سے اُکتا گئی ہوں، پھر بتاؤ کہاں مل رہے ہو۔"

"کل شام فریئر ہال کے نکڑ پر انتظار کروں گا۔۔ چھ اور سوا چھ کے درمیان۔" میں نے پیچھا چھڑانے کی نیت سے کہا ورنہ، درحقیقت میرا اس سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

سلسلہ منقطع ہو گیا۔ عورت دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتی ہو، مرد پر جال ڈالنے کے لیے وہی پتھر کے دور کے پرانے ہتھیار آزماتی ہے جو کند ہونے کے باوجود بہت کم ناکام ہوتے ہیں مگر میں تو اس کے سائے سے بھی دُور رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"بڑے خوش ہو کس کا فون تھا؟" قاسم نے بلاوجہ ہی بات چھیڑی۔

"ایک گل رنگ اور فیاض لڑکی کا فون تھا، سراپا دعوت بنی ہوئی تھی۔" میں نے اس کی دلچسپی بھانپ کر چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے نہیں ملتی کوئی ایسی۔۔۔ آج کل تو چاہت بھی کمرشل ہو کر رہ گئی ہے۔"

"کل شام چھ بجے فریئر ہال کے نکڑ پر مل لینا اس سے۔ فون کا عشق ہے، میری صورت سے ابھی تک ناآشنا ہے۔"

"نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔ مجھے یقین تھا کہ رخشی نے اسی کے ایما پر ایسے مقررہ وقت پر فون کیا تھا جب وہ میرے پاس موجود تھا اور اب وہ میری زبان سے رخشی کا نام سننے کا منتظر تھا لیکن میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

"عورت کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ تھوڑی دیر پہلے تم نے خود ہی کہا تھا۔"

وہ بے بسی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لے کر بولا۔ "میں تم سے کچھ ذاتی باتیں کرنا چاہتا ہوں، میں نے تمہیں اور تم نے مجھے سمجھ لیا ہے، ہمیں برابری سے بات کرنا ہوگی۔"

"ہماری جو بھی گفتگو ہوگی، تنظیم کے حوالے سے اور اس کے دائرۂ کار میں ہوگی۔۔۔ رہی برابری تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تم ہر حال میں مجھ سے جونیئر ہی رہو گے۔"

"سوچ لینا۔" وہ اُٹھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔ "اگر ہم ایک دوسرے کے کام نہ آئے تو اپنے بھی کسی مصرف کے نہ رہیں گے۔" میں اس کے ہمراہ باہر آیا۔ اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے اس نے روشنی میں میری کار کی عقبی کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھا تو بے اختیار اسی طرف بڑھتا چلا گیا۔ "تم پر تو واقعی حملہ ہوا ہے۔" اس کا لہجہ تحیر آمیز تھا۔

"مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں سمجھا تم مذاق کر رہے ہو۔" وہ ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔

"مجھے اب بھی یقین ہے کہ وہ تمہارا ہی آدمی تھا۔" میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔ "پہلے تو میں اسے واقعی قاتلانہ حملہ سمجھا تھا لیکن تم سے گفتگو کے بعد اندازہ ہو رہا ہے کہ اس نے دانستہ عقبی کھڑکی پر فائر کیا تھا۔ اس کا مقصد صرف مجھے خوفزدہ کرنا تھا تاکہ میں تمہاری برتری تسلیم کر لوں۔"

"وہ اس گروہ کا کارندہ بھی ہو سکتا ہے جس سے رخشی جا ملی ہے۔"

"اس ڈھونگ میں کچھ نہیں رکھا قاسم۔" اچانک ہی میں نے بات کھول دینے کا فیصلہ کر لیا۔ "میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں جسے تم من مانی پٹیاں پڑھا سکو، تم مجھ پر سرِ راہ فائر کروا سکتے ہو تو میرے ادنیٰ کارکن تمہارے گھر میں گھس کر تباہی بھی پھیلا سکتے ہیں، میں تشدد کا قائل نہیں ہوں۔ ورنہ تمہیں کب کا معذور کرا چکا ہوتا۔"

میرا لب و لہجہ اسے پسند نہیں آیا اور وہ ایک جھٹکے سے اپنی کار کا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھا۔

اس کی گاڑی پھاٹک سے نکل جانے کے بعد میں اندر گھسا تو سلطان شاہ پر نظر پڑی۔

"خون کھول رہا تھا میرا اس مکار کی باتوں پر۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "میں راہداری میں چھپا ساری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے آتے ہی اس کی ایک جھلک دیکھ کر اسے پہچان لیا تھا اسی لیے اس کے سامنے نہیں آیا، تمہارے آنے سے پہلے اس نے تین مرتبہ کسی کو فون کیا تھا اور دبی دبی آواز میں گفتگو کرتا رہا تھا۔"

"فکر نہ کرو۔ میں اب اس قصے کو نمٹا ہی دوں گا۔" میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تمہاری مہم کا کیا رہا؟"

"میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔" وہ سرسری لہجے میں بولا۔

”مقرب خان کے بھانجے کو اس نے مار ڈالا تھا، اس کی گردن ٹوٹی ہوئی لاش کارساز روڈ پر کھڑی ہوئی ٹیکسی میں پڑی ہوئی ملی ہے۔ جب وہ بے چارہ ہمارے پیچھے آنے کے بجائے اسے سیدھا لے گیا تو شاید وہ اسے بھی ہمارا ساتھی سمجھا ہوگا۔ خیر میں نے بھی انتقام لے ہی لیا۔“

”وہ کہاں مل گیا تھا تمہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”شام کو وہ ہوٹل پہنچا تھا، شاید مسز مراد سے ملنے آیا تھا لیکن میں نے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا کام تمام کر دیا۔ اس نے مقرب خان کے بھانجے کی گردن توڑی تھی میں نے اس کے دل میں چاقو کا پھل اتار دیا۔“

”کہاں پیش آیا یہ واقعہ؟“

”ہوٹل کے احاطے میں ہی موقع مل گیا تھا۔ پہلے ہی وار میں کام تمام ہو گیا، اسے چیخنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔“

”یہ بُرا ہوا۔“ میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ”اسے ہوٹل سے دور ہانک کر مارتے تو بہتر ہوتا۔ لاش ہوٹل میں دریافت ہوگی لہٰذا عملے سے لے کر وہاں مقیم مسافروں تک کو شناخت کے لیے طلب کیا جائے گا۔ مسز مراد اسے دیکھ کر اپنے ردِعمل پر قابو نہیں پا سکے گی اور پولیس کی بے رحمانہ بازپرس کی زد میں آجائے گی۔“

”ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ وہ پیشانی پہ ہاتھ مار کر بڑبڑایا۔ ”سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن جب دماغ پہ خون سوار ہو جاتے تو عقل باریکیوں کو نظرانداز کرتی چلی جاتی ہے۔“ پھر چونک کر بولا۔ ”ہاں وہ تم پر حملے کا کیا چکر تھا؟“

”چلتی موٹر سائیکل سے بے آواز فائر کیا گیا تھا، پچھلی کھڑکی کا شیشہ برباد ہو گیا۔“

”کیا وہ واقعی اسی قاسم کا آدمی تھا؟“ اس نے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔

”اسے بھول جاؤ، ایک طرف غزالہ کی تصویر کا معاملہ ہے، دوسری طرف لاہور کے معاملات ہیں، تیسرا محاذ قاسم کے خلاف کھلا ہوا ہے۔ موجودہ حالات میں ہم اتنے خطرات مول نہیں لے سکتے، قاسم کا معاملہ شاید آج نمٹ ہی جاتے۔“

”کچھ کر گزرنے کا ارادہ ہے؟“ اس نے ٹٹولنے والے لہجے میں سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ آج لے ٹو کا فون ضرور آئے گا... مجھے اس سے دو ٹوک بات کرنی ہوگی۔“ میرے ذہن میں ایک واضح منصوبہ ترتیب پا رہا تھا۔

”یہ تو تم کر ہی لو گے لیکن مجھے رہ رہ کر مسز مراد کا خیال آ رہا ہے۔ وہ اپنے بے ساختہ ردِعمل کی بنا پر ضرور پولیس کی نگاہوں میں آجائے گی، اس کا بیان ہمارے حق میں زہر ثابت ہو سکتا ہے۔“

”جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ اب اسے بھول جاؤ، وقت پڑنے پر دیکھی جائے گی۔“

❖❖❖

سلطان شاہ بہت زندہ دل اور یار باش آدمی تھا۔ ابتدا میں اجنبیت کے باعث وہ بہت کم بولتا تھا اور بولتا بھی تھا تو محتاط رہتا تھا لیکن اس رات تو اس نے قصے اور لطیفے سنا سنا کر مجھے بے حال کر دیا۔ میں کھانے کے بعد شراب نوشی کے شغل میں مصروف ہو گیا اور اس نے اداکاری اور صوتی تاثرات کے ساتھ اپنی زندگی کے عجیب و غریب تجربات سنانے شروع کر دیے۔

آہستہ آہستہ گفتگو بے تکلفانہ ہوتی چلی گئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی یادداشت لطیفوں سے بھی مالامال تھی۔

سفر اور مسلسل بھاگ دوڑ کے باعث میرے ذہن میں آرام کی خواہش ضرور موجود تھی لیکن میں کم از کم دو ڈھائی بجے تک ضرور جاگتے رہنا چاہ رہا تھا تاکہ اے۔ ٹو کی طرف سے فون آئے تو میں حاضر دماغی کے ساتھ گفتگو کر سکوں۔ اسی وجہ سے میں نے خوابگاہ میں جانے کے بجائے ڈرائنگ روم میں نشست جما رکھی تھی اور ملازمین کو سونے کی اجازت دے دی تھی۔

لاہور میں اس عمارت کی تباہی کے بعد لے ٹو سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا اور مجھے قوی اُمید تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں نئے انتظامات سے آگاہ کرنے کے لیے وہ ضرور فون کرے گا۔

آتش زنی کا واقعہ لاہور کے مقامی اخبارات میں تو آگیا تھا لیکن رات گئے ہونے والی اس واردات کی خبر کراچی کے اخبارات میں جگہ نہیں پا سکی تھی۔ امکان یہی تھا کہ اگلی صبح کے اخبارات میں اس واقعے کی تفصیلی رپورٹنگ شائع ہوگی۔

ہم دونوں انتظار کی کیفیت کو بھلانے کے لیے باتوں میں مصروف تھے کہ ایک بج کر دس منٹ پر اچانک فون کی گھنٹی کسی خوفزدہ آسیب کی طرح چیخ پڑی اور میں نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو۔“ دوسری جانب سے جانی پہچانی سرد اور سپاٹ آواز سنائی دی۔

”یس سر۔“ میں فوراً ہی مؤدب ہو گیا۔ میرے لہجے سے سلطان شاہ کال کی نوعیت سمجھ گیا اور اس کے چہرے سے دبے جوش کا اظہار ہونے لگا۔

”تم دو روز سے کہاں تھے؟“ ریسیور پر اے ٹو کی سرد اور کاٹ دار آواز کانوں کے راستے دماغ تک اُترتی چلی گئی۔

”میں اہم کاموں میں مصروف تھا سر۔“ اس نادیدہ شخص کی آواز سنتے ہی میرے وجود پر ہلکا سا لاشعوری خوف طاری ہو جاتا تھا جسے میں کوشش کے باوجود ذہن سے جھٹکنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا تھا۔

”بکواس مت۔“ وہ درندگی کے ساتھ غرایا۔ ”مجھے تمہاری مصروفیات کی تفصیل درکار ہے، سی دن تمہیں پورے شہر میں کہیں بھی تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا، کہاں تھے تم؟“

”میرا بیشتر وقت اسی کے پیچھے گزرا ہے سر۔“

”کیا؟“ وہ بے یقینی کے عالم میں دہاڑا تھا۔

”اس کی مصروفیات کچھ عرصے سے مشکوک ہو...“

”پس منظر نہیں، میں تمہارے اخذ کیے ہوئے نتائج سُننا چاہتا ہوں۔“

”رخشی نامی لڑکی کو قاسم نے گلشنِ اقبال کے ایک مکان میں چھپایا ہوا ہے اور ہر روز چوری چھپے اس سے ملنے جاتا ہے۔“ میں نے مختصر ترین الفاظ میں وہ انکشاف کر ڈالا جسے سن کر اے ٹو کو میری غیر حاضری فراموش کر دینی چاہیے تھی۔

اور ہوا بھی یہی، میرے خاموش ہونے کے بعد چند ثانیوں کے لیے لائن پر سکوت چھا گیا پھر اس کی آواز ابھری۔

”بدترین خبر سنائی ہے تم نے۔ لڑکی کا فیصلہ صادر ہو چکا تھا مگر قاسم بتا رہا تھا کہ لڑکی روپوش ہو گئی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ غداری پر تل گیا ہے۔ کہاں رکھا ہے اس نے لڑکی کو؟“ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میرا انکشاف سن کر اسے صدمہ ہوا تھا۔

میں نے گلشنِ اقبال کا وہ پتا دُہرا دیا جو میں سلطان شاہ سے سُن کر ذہن نشین کر چکا تھا۔

”لیکن تم اس کے پیچھے کیسے لگے؟“

”میں نے ایک بار قاسم کی کار میں لڑکی کی جھلک دیکھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے مگر وہ زندہ تھی، دوسری طرف قاسم مجھ سے بھی مطمئن نہیں تھا، وقتاً فوقتاً اس کے آدمی میرے پیچھے لگے رہتے تھے لہٰذا ایک موقع پر اس کے آدمی کو اُلجھا کر میں نے روپوشی اختیار کر لی۔ کل رات میں نے آپ کو رپورٹ دینی چاہی لیکن فون پر سلسلہ ممکن نہ ہو سکا۔“

”ہاں وہ نمبر اب ترک کر دیا گیا ہے، میں روز خود ہی فون کروں گا۔“ وہ بولا۔ ”اور کیا معلوم ہوا قاسم کے بارے میں؟“

”میں اس کے کارندوں سے لاعلم ہوں، اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا ویسے وہ مشتبہ لوگوں سے ملتا رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے ہی آدمی رہے ہوں۔“

”تم بہت اچھے جا رہے ہو، قاسم میری لسٹ پر آگیا ہے مگر فی الحال میں اسے ڈھیل دوں گا۔ میں ابھی اسے رخشی کی کمین گاہ کے پتے سے آگاہ کرتا ہوں، تمہیں اس پہ نگاہ رکھنا ہوگی کہ اطلاع ملنے پر وہ کیا کرتا ہے۔“

”بہتر جناب! میں آنکھیں کھلی رکھوں گا۔“

”تمہیں یقین ہے کہ قاسم اس دوران میں کراچی ہی میں رہا ہے؟“

”یس سر! بالکل اسی طرح جیسے میں اپنے بارے میں پُریقین ہوں۔“

”لاہور میں کچھ مشتبہ لوگ نگاہوں میں آتے تھے۔“ وہ موضوع چھیڑتے ہی میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ ”ان میں سے ایک لڑکی کی تصویر لے لی گئی تھی، اس کی نقل تمہیں ڈاک سے بھیج دی گئی ہے، قاسم کو اس کی ہوا نہ لگنے دینا۔ اس لڑکی نے شاید کراچی کا رُخ کیا ہے، اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔ لاہور سے ایک پرواز پر میرے دو آدمی اس برقع پوش مشتبہ لڑکی کے پیچھے لگے تھے لیکن برقع کی آڑ میں چھپے ہوئے چہرے کو بے نقاب کرنے سے پہلے اس کا سُراغ کھو بیٹھے۔ آدمی نے جس ٹیکسی میں تعاقب کا آغاز کیا اس کا ڈرائیور بھی ان دونوں کا ساتھی تھا۔ تم چاہو تو ان دونوں سے مل سکتے ہو فالکن ہوٹل کے کمرہ نمبر اکیس میں مسز مراد ٹھہری ہے تم اس سے بڑے فلاتی کے کوڈ سے بلاتکلف گفتگو شروع کر سکتے ہو، وہی تمہیں کرامت سے ملوا سکے گی۔ وہ میرا ایک کارآمد آدمی ہے اس کے پاس بھی لڑکی کی تصویر موجود ہے۔ مسز مراد نے لڑکی کو بچشم خود دیکھا ہوا ہے۔“

”او کے سر۔“ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا پھر ایک سوال کی ہمت کر ہی ڈالی۔ ”کیا یہ ضروری ہے کہ جس برقع پوش لڑکی کا کراچی تک پیچھا کیا گیا، وہی ہماری مطلوبہ لڑکی ہو۔“

”تعارف سے شاید کھرچم گئی ہے تمہاری کھوپڑی پہ۔“ ریسیور پر اس کی غصیلی آواز اُبھری۔ ”حالات واضح طور پر اسی سمت میں نشاندہی کر رہے ہیں۔ کرامت نے اپنے ٹیکسی ڈرائیور کو قابو کر لیا تھا لیکن اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔“

”میں پوری کراچی چھان ماروں گا سر۔“ میرے لہجے میں منافقت

کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"اگر قاسم نے خود ہی رخشی کو چھپا کر اس کی روپوشی کا ڈھونگ رچایا ہوا ہے تو شاید وہ بدنیتی کا شکار ہو گیا ہے۔ مجھے موہوم سا شبہ ہونے لگا ہے کہ کہیں وہ لڑکی اور اس کا ساتھی قاسم ہی کا فرستادہ نہ ہو۔ اسے بھنک مل گئی کہ میرے آدمیوں نے ان کے کراچی پہنچنے کا سُراغ لگا لیا ہے تو وہ تلاش کی مہم کو کبھی کامیاب نہ ہونے دے گا۔"

میرا دل خوشیوں سے بلّیوں اُچھلنے لگا۔ ایک تیر سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ دو شکار ہو گئے تھے۔ ایک طرف میری غیر حاضری کی جواب دہی کا مسئلہ حل ہو گیا تھا اور دوسری طرف لاہور کے واقعات کے بارے میں لے ٹو کے شکوک و شبہات کا رُخ قاسم کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اس جوڑ توڑ میں سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ غزالہ کی تصویر صرف میرے حوالے کی جا رہی تھی۔ قاسم کو اس معاملے سے بالکل الگ کر دیا گیا تھا لیکن مجھے حیرت تھی کہ سب کچھ سن لینے کے باوجود لے ٹو نے قاسم کے خلاف کوئی سزا تجویز نہیں کی تھی۔

"لاہور کے معاملات میں خاصی گڑبڑ ہوئی ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر ان واقعات کی پشت پر قاسم ہی کا ہاتھ کارفرما ہے تو میں دیکھنا چاہوں گا کہ اس کے عزائم کیا ہیں۔ بازار کی صورتحال کیا ہے؟"

میں نے جہانگیر سے سُنے ہوئے حالات من و عن دہرا دیے۔

"مال آج پہنچ چکا ہو گا یا رات میں کسی وقت پہنچ جائے گا، تمہیں اس میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں، یہ شعبہ فی الحال قاسم ہی کی تحویل میں رہنے دو۔"

"بہتر جناب۔"

"سلسلہ منقطع ہونے کے بعد تمہارے پاس صرف دس منٹ ہوں گے۔ اس کے بعد میں قاسم کو فون کروں گا۔" یہ کہہ کر دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا اور میں نے اچھل کر سلطان شاہ کو گلے سے لگا لیا۔

"کیا ہوا؟ کیا ہو گیا؟" اس نے بوکھلا کر سنبھلتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے مختصر الفاظ میں لے ٹو سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سُنا دیا۔

"دیکھا جائے تو ایک ہی قلابازی نے سارے مسائل سلجھا دیے۔" وہ بولا۔ "بلکہ اس کی نگاہوں میں تمہارا مقام بڑھ گیا۔"

"تمہارے ہاتھوں مرنے والے کا نام کرامت تھا، مجھے اس سے ملنے کا مشورہ بھی دیا گیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ نصیر خان جھوٹا تھا، لے ٹو ہر معاملے میں اور ہر جگہ موجود ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ لے ٹو ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے معاملات کسی تیسرے شخص کی معرفت چلا رہا ہو۔ اس طرح وہ خود پس پردہ رہ کر بھی ہر بات سے باخبر رہ سکتا ہے۔"

"مسز مراد اسی دفتر میں کام کرتی ہے..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں یاد نہیں کہ نصیر خان کے حوالے پر وہ ڈر گئی تھی۔ نصیر خان لاتعلق معلوم ہوتا ہے۔ مسز مراد کو وہی تیسرا شخص یا اس کا کوئی گرگا بلیک میل کر رہا ہو گا۔"

"وہ بے چارہ مفت میں مارا گیا۔" وہ منہ بنا کر اداس لہجے میں بولا۔

"کون؟" میں نے اسے اپنے ہمراہ خواب گاہ کی طرف لے جاتے ہوئے سوال کیا۔

"مقرب خان کا بھانجا۔"

"کرامت تمہارے ہاتھوں مرنے سے پہلے لے ٹو کو پوری رپورٹ دے چکا تھا۔ اس نے ابھی ڈرائیور کے زیر ہو جانے کا ذکر تو کیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ زبان کھلوانے میں ناکام ہو کر کرامت نے اس کی گردن توڑ دی تھی۔"

"پھر اب کدھر جا رہے ہو تم؟" مجھے تیار ہوتے دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

"حکم کی تعمیل۔" میں نے داہنی آنکھ دبا کر کہا۔ "جب قاسم، لے ٹو کی زبانی رخشی کے خفیہ ٹھکانے کا پتا سنے گا تو اس کی حالت قابلِ دید ہو گی۔"

"تم کہاں جا رہے ہو۔ میں ہی دیکھے لیتا ہوں اسے۔"

"اسے تم ہی دیکھو گے۔" میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس کے مکان کے قریب اُتار کر میں گلشنِ اقبال چلا جاؤں گا، وہاں رخشی کو بھی دیکھنا پڑے گا، ایسا نہ ہو کہ قاسم فون ہی پر اسے خطرے سے آگاہ کر دے۔"

"خوب تو تم قاسم کے آنے تک اسے وہاں روکے رکھو گے اور میں قاسم کے تعاقب میں تم سے وہاں آ ملوں گا۔"

"ابھی سب قیاسات ہیں، ہو سکتا ہے کہ قاسم لے ٹو سے پتا ملتے ہی خوفزدہ ہو جائے اور اپنے ہاتھوں اپنی دوست کو ہلاک کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔"

وہ مزید بحث کیے بغیر پھرتی کے ساتھ تیار ہو کر میرے ہمراہ باہر آ گیا۔

"اسی زخمی کار میں چلو گے؟" اس نے عقبی کھڑکی کے

ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارے ہی پاس چھوڑ دوں گا ورنہ اس کا تعاقب نہیں کر سکو گے، ذرا رخشی کے مکان کا محلِ وقوع سمجھا دو تو میں ٹیکسی سے وہاں پہنچ جاؤں گا۔" میں نے پروگرام میں تبدیلی کرتے ہوئے کہا۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور مجھے رخشی کے مکان کا پتا سمجھانے لگا۔

گھر سے نکلنے سے قبل ہم دونوں ہتھیار لینا نہیں بھولے تھے۔

*

راستے میں سلطان شاہ نے مجھے ایک ایسی جگہ اُتار دیا، جہاں سے مجھے آسانی کے ساتھ ٹیکسی مل سکتی تھی اور خود آگے بڑھتا چلا گیا۔

میں نے ٹیکسی سمیت گلیوں میں بھٹکنے کے بجائے راشد منہاس روڈ پر شادی ہال کے قریب ٹیکسی چھوڑ دی اور تھوڑی دیر تک گلیوں میں بھٹکنے کے بعد مطلوبہ پتے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

مطلوبہ مکان چار سو مربع گز کی تعمیرات کے علاقے میں واقع تھا۔ میں سلطان شاہ سے سن چکا تھا کہ اس محلے کے لوگ اپنی آبادی میں اس غیر آباد مکان کی طرف سے تشویش میں مبتلا رہتے تھے اور کئی بار قاسم سے اس مکان کو آباد کرنے کے مسئلے پر ناکام گفتگو بھی کر چکے تھے لہٰذا رخشی جیسی خوبرو لیکن تنہا لڑکی کے آباد ہونے سے ان کے شکوک میں اضافہ ہونا لازمی امر تھا۔

ان حالات میں اگر میں خاموشی سے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرتا اور اہلِ محلہ میں سے کسی کی نگاہ پڑ جاتی تو غیر ضروری طور پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا لہٰذا میں نے مکان میں داخلے کے لیے باقاعدہ طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اطلاعی گھنٹی کا بٹن بجانے سے پہلے پھاٹک اور ذیلی کھڑکی پر دباؤ ڈال کر آزمایا تو دونوں ہی راستے اندر سے بند تھے۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی اور جواب میں کسی کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

چند ثانیوں تک انتظار کے بعد میں نے دوبارہ پُش بٹن پر انگلی رکھ دی۔ اس بار میں نے اندر سے گھنٹی کی آواز کی بازگشت بھی سُننا چاہی لیکن ناکام رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پُش بٹن کو بجلی کی فراہمی منقطع کر دی گئی تھی۔

آہنی پھاٹک بجانے کا ردِعمل حوصلہ افزا رہا۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد پھاٹک کے پیچھے پختہ فرش پر آہٹ سنائی دی۔ اسی کے ساتھ آواز اُبھری۔ "کون ہے؟"

"دروازہ کھولو۔" رخشی کی آواز پہچان کر میں نے بھدی آواز میں کہا۔

ذیلی کھڑکی کھلی اور گیٹ لیمپس کی روشنی میں غیر متوقع طور پر مجھے اپنے روبرو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ "تم... تم یہاں کیسے؟" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

"آ ہی گیا ہوں تو کیا اندر بھی نہ بلاؤ گی؟" میں نے پیشقدمی کرتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا اور اس نے سمجھ لیا کہ مجھے باہر روکنے کی کوشش بے سود ثابت ہو گی۔

اس نے میرے لیے راستہ چھوڑ دیا، میں نے اندر داخل ہو کر پھاٹک بند کر دیا۔ اس کی طرف مڑا تو وہ عمارت کی طرف میری رہنمائی کے بجائے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے وہیں کھڑی تھی اور تشویش زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"کیوں گھور رہی ہو؟" میں نے تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔ "میری بے بسی سے لطف اندوز ہونے کے طریقوں کے بارے میں تو نہیں سوچ رہیں؟"

اس کے ہونٹوں پر پھیکا سا تبسم تیر گیا۔ "بس اتنا بتا دو کہ تم یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"ٹیکسی سے۔" یہ کہہ کر میں نے مصالحانہ انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آؤ اندر بیٹھ کر سکون سے گفتگو کریں گے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی، بس خاموشی سے میرے ساتھ چل دی۔ مجھے ڈرائنگ رُوم میں بٹھا کر وہ چند ثانیوں کے لیے اندر گئی اور واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں دینٹی بیگ موجود تھا۔ اس میں دور ہی سے خاصا اُبھار نظر آ رہا تھا۔ رخشی کے چہرے پر سکون کے آثار سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی کہ اس بیگ میں بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ لیکن میں خاموش ہی رہا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

اس وقت میرے دل میں رخشی کے بارے میں عجیب سے جذبات موجزن تھے۔ اس سے میرے مراسم کی نوعیت ملی جلی سی تھی۔ اس نے دوستی کی آڑ میں میرے سر پر مسلط ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میں اس سے دامن بچاتا رہا تھا۔ پھر جب اس نے نشے کی حالت میں میرے سامنے بہت سے اعترافات کیے تو صورتحال ایک دم بدل گئی۔ لے ٹو نے مجھ سے رخشی کے اعترافات سننے کے بعد اس کی ہلاکت کا حکم جاری کر دیا لیکن قاسم نے رخشی

سے اپنی دوستی نبھانے کے لیے اسے روپوش کر دیا۔ اس دوران میں میری کار میں ٹائم بم رکھوانے کے ساتھ ہی رخشی نے فون پر مجھے دھمکیاں بھی دی تھیں۔ اس اعتبار سے دوستی کے بجائے ہمارے درمیان سنگین قسم کی دشمنی کی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اے، ٹو سے گلشنِ اقبال کے اس مکان کا پتا سننے کے بعد قاسم کیا قدم اٹھاتا۔ اگر وہ اس مکان میں آکر رخشی کو ٹھکانے لگاتا تو یہ نااہلی کے اعتراف کے مترادف ہوتا۔ وہ کراچی میں رہتے ہوئے رخشی کے ٹھکانے سے لاعلمی ظاہر کرتا رہا اور اے ٹو کا لاہور سے دیا ہوا پتا درست ثابت ہو جاتا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ قاسم رخشی سمیت غائب ہونے کی کوشش کرتا لیکن اس کی ایسی کوئی بھی کوشش خودکشی کے مترادف ہوتی۔ اے ٹو باغیوں کے خلاف کسی رعایت کا قائل نہیں تھا۔ وہ ان دونوں کے خاتمے کے لیے اپنے سارے وسائل داؤ پہ لگا سکتا تھا۔ ان حالات میں قاسم کے لیے ایک ہی راستہ قابلِ عمل رہ جاتا تھا کہ وہ رخشی کو گلشنِ اقبال کے اس مکان سے فوری طور پر ہٹا کر اے ٹو کو اطلاع دے دے کہ اس کے دیے ہوئے پتے پر رخشی نہیں مل سکی۔

قاسم کی ایسی ہی کسی حرکت کا سدِباب کرنے کے لیے اے ٹو نے مجھے اس پر نگاہ رکھنے کا حکم دیا تھا۔ ان پیچیدہ حالات میں رخشی کا مستقبل بہت غیر یقینی نظر آ رہا تھا۔ اس کے ٹھکانے کی اطلاع میں نے خود اے ٹو کو دی تھی، تاکہ اپنے لاپتا ہونے کا جواز پیش کر سکوں مگر حقیقت یہ تھی کہ رخشی کو اس گھر میں موجود پا کر میرے دل کے کسی گوشے میں بے نام سی خلش جنم لے چکی تھی۔

"میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے۔" چند ثانیوں کے اعصاب شکن سکون کے بعد رخشی نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ وینٹی بیگ پر قابض ہونے کے بعد وہ حیرت اور خوف کی ابتدائی لہر پہ قابو پا چکی تھی۔

"تم ایک لمحے کے لیے بھی میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکی تھیں۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے اس ٹھکانے کا مجھے پہلے ہی علم ہو گیا تھا۔ اب فرصت ملی تو چلا آیا۔"

"آنے کا سبب بھی بتا ڈالو۔" اس نے وینٹی بیگ کی زپ کھول لی تھی اور دایاں ہاتھ غالباً اس میں رکھے ہوئے ریوالور پہ تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں اس سے باخبر تھا۔ میں نے بھی اسے کچھ جتانے کی کوشش نہیں کی۔

"دوستی کی تجدید سمجھ لو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم دشمنی کر کے ابھی تک میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں تو میں نے سوچا کہ میں خود ہی تمہیں ایک موقع فراہم کروں۔ ہم دونوں کے ہاتھوں یہ بھی معلوم ہو جاتے گا کہ

مجھے خوف زدہ کر کے تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہ رہی تھیں؟"

"تم اس شہر میں ہیروئن کی تجارت کے سب سے بڑے حصے دار ہو۔" چند لمحوں تک سوچنے کے بعد اس نے تائید طلب لہجے میں کہا مگر میں خاموش رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "تم دیکھ چکے ہو کہ جو لوگ میرے ساتھ ہیں، وہ تمہیں کسی بھی وقت اور کہیں بھی ختم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہمیں تمہاری آمدنی میں اپنا حصہ چاہیے۔"

"خوب۔" میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم باغی ہو کر مقابلے پہ اتر آئی ہو۔"

"سیدھی سی بات ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "میں نے اپنی زندگی کا خوبصورت ترین عرصہ اس تنظیم کی جڑوں کو سینچنے میں صرف کیا لیکن میری ایک لغزش نے میری ساری خدمات پر پانی پھیر دیا۔۔۔ میں آخر تک یہی سمجھتی رہی کہ تم میرے فریب میں آ گئے ہو۔ اس لیے تمہارے ساتھ مے نوشی میں بے اعتدالی کی حد تک جا پہنچی اور۔۔۔ تمہارا منصوبہ کامیاب ہو گیا، تم نے میری زبان کھلوا لی۔۔۔ میں مانتی ہوں کہ وہ میری غلطی تھی لیکن تم تنظیم۔۔۔ کے اندر کے آدمی تھے۔ ہاں اگر میں نے باہر کے کسی آدمی پہ کوئی راز فاش کیا ہوتا تو واقعی بدترین سزا کی مستحق ہوتی۔ میرے بارے میں بہت سفاکانہ فیصلہ کیا گیا۔ تم کسی سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ آنکھیں بند کر کے زمین پر لیٹ جائے اور جس کا جی چاہے اُسے بے رحمی کے ساتھ ذبح کر ڈالے۔"

"بات چھوٹی اور بڑی غلطی کی نہیں۔ تم نے ایک اصول توڑا تھا۔"

"تم اوپر کی سطح کے آدمی ہو۔" اس کا لہجہ تنفر آمیز ہو گیا۔ "میں نے بہت نچلی سطح سے تنظیم کے لیے کام کی ابتدا کی تھی۔ ہیروئن کے کاروبار کے فروغ میں خون پسینے کے ساتھ میری خودداری کا لہو بھی شامل ہے۔ میرے احساسات کو سمجھنا تمہارے لیے محال ہے۔"

"لیکن تم تنہا تنظیم سے نہیں لڑ سکتیں۔"

"میرے سامنے تو دو ہی راستے تھے لڑ کر زندہ رہوں یا سزائے موت کا فیصلہ قبول کر کے قتل ہو جاؤں۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "ابھی مجھ میں زندہ رہنے کا ولولہ موجود ہے اسی لیے میں نے پہلی راہ اختیار کی۔ اور یہ کیسے سمجھ لیا تم نے کہ میں تنہا ہوں، یہ تمہاری سنگین بھول ہے، میں بتا چکی ہوں کہ میرے ساتھ خاصے طاقتور لوگ ہیں۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے مجھے یہی تاثر دینے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے فریب دینا تمہارے لیے اتنا آسان نہیں ہے۔ اگر قاسم کے دل میں تمہارے لیے نرم گوشہ نہ ہوتا تو میں دیکھتا کہ تم کتنے گھنٹے زندہ رہتیں۔"

میرے ان الفاظ پہ وہ چونک پڑی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "یہ سب بکواس ہے، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس شہر میں سزا کے تمام فیصلے اسی کے ہاتھوں نافذ ہوتے ہیں۔ وہ تو پورے شہر میں میری بو سونگھتا پھر رہا ہو گا۔" وہ بولی تو اس کے لہجے میں اعتماد مفقود تھا۔

میں ہنس پڑا۔ "تم بھول رہی ہو کہ میں شروع سے تمہاری نگرانی کر رہا ہوں۔ تمہیں اس مکان میں پہنچانے والا قاسم ہی تھا، میں چاہتا تو کسی بھی وقت تمہارا پتہ صاف کرا سکتا تھا۔ یہ تو بس تمہاری حرکت کا بدلہ تھا۔ تم نے میری کار میں ٹائم بم رکھوایا اور مجھے اطلاع بھی دے دی، اسی طرح مجھے سب کچھ معلوم تھا لیکن خاموش رہا۔ اب ہمارا حساب برابر ہے۔"

"میرے ساتھ جو لوگ ہیں، وہ ہیں۔ تمہارے قیاسات سے حقائق نہیں بدل سکتے۔" اس نے اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ میرے مطالبے کا کیا جواب ہے تمہارے پاس؟"

"کیسا مطالبہ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"شہر سے ہونے والی خطیر آمدنی میں حصہ۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو۔" میں نے ہنس کر ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "اگر تنظیم کی جڑوں میں تمہارے پسینے کا ایک قطرہ بھی شامل ہے تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سارے معاملات بہت منطقی بنیادوں پہ چلتے ہیں۔ حسابات میں کئی ہاتھ ملوث ہوتے ہیں اور آمدنی میں سے ایک پیسے کی بھی خرد بُرد کا امکان نہیں ہے اور نہ ہی تنظیم کے بڑے کسی کا اخراج گزار بننا پسند کریں گے۔ سزائے موت کی اطلاع نے تمہارے دماغ پہ اثر ڈالا ہے، تمہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔"

"تنظیم سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ اگر تم اصولی طور پر مطالبہ ماننے پہ آمادہ ہو تو میرے پاس قابلِ عمل طریقۂ کار بھی موجود ہے۔ تنظیم کو اس لین دین کی ہوا بھی نہیں لگ سکے گی، ہر بات تمہاری سطح پہ دفن ہو جائے گی۔"

"پہلے مرغی یا پہلے انڈے والی بات ہے۔" میں نے بے پروایانہ انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "تنظیم کی آمدنی میری جیب میں تو جاتی نہیں۔ میں تنظیم کا وفادار بھی ہوں لیکن شہر میں بلاوجہ کسی سے مخاصمت مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر اپنی گردن بچائے رکھنے کے لیے کچھ کرنا پڑتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ساری بات بس طریقۂ کار کی ہے۔ طریقۂ کار محفوظ اور قابلِ عمل ہوا تو اس پہ غور کیا جا سکتا ہے۔" میرا مقصد دراصل رخشی کی زبان کھلوانا تھا تاکہ اس کے سازشی منصوبے کا کچھ علم ہو سکے۔

اس مرحلے پہ مجھے احساس ہوا کہ میں نے رخشی اور قاسم کی رفاقت کا انکشاف کر کے حماقت کا ارتکاب کیا تھا۔ اگر رخشی قاسم کے ہاتھوں مرنے سے قبل اسے اس نکتے سے آگاہ کر دیتی تو قاسم اے ٹو کی نگاہوں میں اپنا مقام برقرار رکھنے کے لیے، رازداری کی بنا پر میرے لہو کا پیاسا ہو جاتا۔ زیادہ بولنے کی وجہ سے میں نے اپنے لیے ایک بڑی دشواری پیدا کر لی تھی۔

"طریقۂ کار بہت سیدھا سا ہے۔ مقامی مارکیٹ میں تمہارے ذریعے مقررہ مقدار میں ہمارا مال فروخت ہو گا اور وہی ہمارا حصہ ہو گا۔" اس نے کہا۔

"دوسرے الفاظ میں ہمیں اپنے مال کی کھپت میں کمی کرنا پڑے گی۔" میں نے دل ہی دل میں اس کی تجویز کو سراہتے ہوئے کہا۔

"ظاہر سی بات ہے۔" اس بار رخشی کا لہجہ بے نیازانہ تھا۔

"شاید تم بھول رہی ہو کہ مقامی سربراہ کے طور پر مقررہ ٹارگٹ کا حصول میری ذمہ داری ہے اور اوپر والوں کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ ٹارگٹ کبھی آسان ثابت نہیں ہوا ہے۔"

"یہ سب تمہارے سوچنے کی باتیں ہیں۔"

"تمہیں اس بکھیڑے کی ضرورت ہی کیا ہے، اپنا مال تم براہِ راست بھی بیچ سکتی ہو۔"

وہ مسکرانے لگی۔ "جب تقسیم اور فروخت کا ایک مربوط نظام موجود ہے تو ہمیں پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ پھر بتدریج ترقی کرتے کرتے اگر تم اوپر کے منصب پہ پہنچ گئے تو پوری تنظیم ہی ہماری ہو گی۔"

"مجھ پہ نگاہ کیوں ہے تمہاری؟" میں نے جھنجلا کر سوال کیا۔

"جب سے تم سے ٹھنی، یہ منصوبہ بھی فروغ پانے لگا۔"

"لیکن میرے لیے یہ سب ناقابلِ قبول ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ دشمنی مول لے کر کس طرح زندہ رہا جاتا ہے۔ میرے ساتھ کوئی حرکت کی گئی تو اگلی صبح ڈھونڈ کے کٹے ہوئے سر شہر کے کوڑے دانوں سے برآمد ہوں گے۔"

"اس کی الٹ بھی ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں کسی جوابی اقدام کی مہلت بھی نہ مل سکے۔" سرد لہجے میں یہ کہتے ہوئے رخشی نے اچانک ریوالور نکال لیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ صوفے سے اُٹھ گئی۔

"رکھ لو اس کھلونے کو۔" میں نے اس کی حرکت کا کوئی اثر لیے بغیر کہا۔ "ایسی دھمکی سے تم مجھے مرعوب نہیں کر سکتیں۔"

"تم نے خود اپنے لیے ہر راستہ مسدود کر لیا ہے۔" وہ فاتحانہ

انداز میں مسکرائی۔ "تم ایک بہت بڑی غلطی کر بیٹھے ہو۔ میرے اور قاسم کے باہمی اشتراک کی بات کتنی ہی غیر حقیقی کیوں نہ ہو لیکن عقل کو لگتی ہے، اگر تم اپنی اس نادر رائے کا اظہار لے ٹو پر کر بیٹھے تو قاسم کے لیے ناقابلِ بیان دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ وہ میرا دوست ہے میں اسے کسی قسم کی الجھن میں گرفتار ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"تو پھر دھمکانے سے کیا فائدہ، گولی ہی چلا دو۔"

"فی الحال تم میری تحویل میں ہو، تمہارا فیصلہ وہ خود ہی کریگا۔"

"کیا خواب گاہ میں سویا ہوا ہے؟" میں نے مضحکانہ لہجے میں سوال کیا۔ "بلا کر فیصلہ جلدی کرا لو، مجھے سونے سے قبل کچھ ضروری کام بھی نمٹانے ہیں۔"

"دونوں ہاتھ اُٹھا کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تلاشی بے سود ہو گی۔" میں نے اسے تاؤ دلانے کی نیت سے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم جیسی کسی عورت سے مقابلے کے لیے دھماکا خیز ہتھیار لیے پھرنا میرے لیے کھلی بدذوقی ہے، تم کچھ بھی برآمد نہ کر سکو گی۔"

"جو کہہ رہی ہوں، اس پر عمل کرو ورنہ پچھتاؤ گے۔" وہ جھلّا کر ریوالور کی نال کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"جو چاہو گی، وہی کروں گا، بس ایک بات کا جواب دے دو۔"

"بکو۔" وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر غصیلی نگاہوں سے مجھے گھورنے لگی۔

"جس روز قاسم نے تمہیں یہاں چھوڑا، اس دن وہ شہر سے باہر کہاں گیا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"آئے گا تو اسی سے پوچھ لینا۔" وہ چیخ کر بولی۔

"بتاؤ گی تو تمہارے ہاتھوں سکون سے مر سکوں گا، ورنہ یہ خلش ستاتی رہے گی۔"

"اوہو۔ شاید تمہیں کسی کا انتظار ہے جو مجھے باتوں میں الجھا رہے ہو۔" وہ چونک کر بولی۔ "چلو دیوار کی طرف، اب ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا تو دھماکے کی پروا کیے بغیر گولی چلا دوں گی۔"

"پڑوسی پہلے ہی تمہاری طرف سے غیر مطمئن ہیں، دھماکا ہوتے ہی یلغار ہو گی اور دونوں دھر لیے جائیں گے۔ ایسے حالات میں ملزمان کے حد سے گزرے بغیر بھی پولیس عموماً حدود کے تحت پرچہ کاٹتی ہے۔" میں نے اُٹھ کر دیوار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی طرف سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا، میں جانتا تھا کہ مجھ سے سب کچھ اُگلوائے بغیر وہ میرا بال بھی بیکا نہ کر سکے گی۔

اس نے پیچھے سے ٹٹول کر میری تلاشی لے ڈالی لیکن کچھ بھی برآمد نہ کر سکی۔ میں چاہتا تو اس وقت آسانی کے ساتھ اسے زیر کر سکتا تھا لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ آخر کار میرے... ساتھ کیا سلوک کرے گی۔

تلاشی سے مطمئن ہو کر اس نے مجھے دوبارہ صوفے پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

"تو میری تجویز تمہارے لیے قابلِ قبول نہیں ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ایسے فیصلے پل بھر میں نہیں کیے جا سکتے۔" میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "فی الحال مجھے تمہاری تجویز سرے سے ہی ناقابلِ قبول نظر آ رہی ہے، ہو سکتا ہے وقت ملنے پر میں اس میں کوئی محفوظ اور قابلِ عمل پہلو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اگر کوئی بات بنی تو وہ برابری کی بنیاد پر ہی ہو گی۔"

"برابری کی بنیاد پر ہی سہی، لیکن تمہیں اس پر عمل کرنا ہو گا۔"

"برابری کے لیے ایک فریق دوسرے پر ہتھیار نہیں اُٹھاتا، شروع سے اب تک تمہارا رویہ ایک گھٹیا اور کند ذہن بلیک میلر کا سا رہا ہے۔ حالانکہ تمہارے پاس میرے خلاف کچھ بھی نہیں ہے جبکہ میں تنظیم کے ساتھ تمہاری بدنیّتی سے پوری طرح واقف ہوں، بلیک میلنگ ہونا ہی ہے تو میری طرف سے ہو سکتی ہے، یہ کوشش تمہیں ہرگز راس نہیں آئے گی۔"

"حفظِ ماتقدم کو تم بلیک میلنگ نہیں کہہ سکتے۔" اس نے ریوالور گود میں ڈال لیا۔ "میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم اچانک یہاں آ پہنچو گے، پھر تمہارے ہی اصرار پر مجھے اپنا مقصد بھی ظاہر کرنا پڑا۔"

"تم اب بھی بضد ہو کہ تمہاری پشت پر قاسم کے علاوہ کچھ اور لوگ ہیں۔" میں نے ٹٹولنے والے لہجے میں سوال کیا۔

"جب تم سب کچھ جانتے ہو تو میری زبان سے کیوں سننا چاہتے ہو؟" وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔ "شہر میں ہیروئن کی تمام تر تجارت پر تمہارا اور قاسم کا کنٹرول ہے، اگر تم دونوں مل جاتے ہو تو اوپر والوں کو کسی بات کی ہوا بھی نہ لگ سکے گی۔"

بات کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس قسم کی ہیرا پھیری کے بارے میں قاسم براہِ راست مجھ سے بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا کہ کہیں اس کا ہم خیال نہ ہونے کی صورت میں میں اس کے عزائم سے اُوپر والوں کو باخبر نہ کر دوں لہٰذا وہ اپنی خواہش کو دل ہی دل میں پروان چڑھاتے ہوئے مناسب وقت کا منتظر رہا۔ اسی دوران میں رخشی پر میرا ہاتھ پڑ گیا اور اس کے اعترافات اس کے تابوت میں آخری کیل بن گئے۔ لے ٹو نے اس کے قتل کا حکم صادر کیا تو قاسم اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ شاید وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا

وہ خود کھل کر میرے سامنے نہیں آ سکا لیکن میرے خلاف ایسے شواہد جمع کرنے کی بھرپور کوششوں میں مصروف رہا جن کی بنا پر مجھے اپنے سامنے جھکا سکے اور دو طرفہ کمزوریوں کی بنیاد پر بے خوف ہو کر سازشی منصوبے کے بارے میں بات کر سکے۔ میرے محتاط اور جارحانہ رویّے کی وجہ سے اس کی ہر کوشش ناکام ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف رخشی سزا سے بچنے کے لیے روپوش ہو گئی تھی اور اس کا مجھ سے متنفر ہونا قدرتی امر تھا۔ لہٰذا قاسم نے اس پرخاش سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرتے ہوئے میرے خلاف رخشی کا ہوّا کھڑا کر دیا۔ اس طرح وہ مجھے اس مقام پر لانا چاہتا تھا جہاں میرے ساتھ مل کر آزادی کے ساتھ ہیروئن کی تجارت میں حصہ داری کے امکانات کو عملی شکل دے سکے۔

لیکن اس کوشش میں بھی وہ ناکام ہی رہا۔ رخشی شروع سے میری نگاہ میں تھی۔ شاید اس کی کمین گاہ کا پتا میری ہی ذات تک محدود رہتا لیکن لے ٹو مجھ سے اس عرصے کے بارے میں جواب طلب کر بیٹھا جو میں نے اس کے خلاف لاہور میں کارروائیاں کرتے گزارا تھا اور مجھے اس غیر حاضری کے جواز میں [illegible] معلومات کی بنیاد پر ایک نئی کہانی [illegible] اشنا پڑ گئی جو سراسر قاسم کے خلاف تھی۔

قاسم باغی ہو گیا تھا اور اس نے رخشی کو چھپا کر اس کی روپوشی کا سوانگ رچایا ہوا تھا۔ یوں قاسم لے ٹو کی لسٹ پر آ گیا۔ مگر اس نے مصلحتاً قاسم کے خلاف کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا۔ اس کہانی کی بنیاد پر مجھے کئی فوائد حاصل ہوئے جن میں اہم ترین یہ تھا کہ میری غیر حاضری مشتبہ نہیں رہی تھی۔ کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں نے ہی کراچی سے لاہور جا کر تنظیم کے مفادات پر کاری ضربات لگائی ہوں گی۔ بلکہ لے ٹو تو کھلے الفاظ میں کہہ بیٹھا تھا کہ کہیں لاہور میں دیکھا جانے والا مشتبہ جوڑا قاسم ہی کا فرستادہ نہ ہو۔ دوسری طرف لے ٹو کے پاس غزالہ کی تصویر موجود تھی مگر اس نے غزالہ کی تلاش کی مہم سے قاسم کو قطعی لاعلم رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کی تلاش کی ذمہ داری کلی طور پر مجھے سونپ دی تھی۔ اس طرح غزالہ کو درپیش خطرات بہت محدود ہو کر رہ گئے تھے ورنہ قاسم کے لیے اس کا کھوج نکالنا ناممکن نہ ہوتا۔

شہر میں ہیروئن کی ناجائز تجارت کو پھلتے پھولتے دیکھ کر قاسم کی نیت میں فتور آ چکا تھا لیکن وہ اکیلا کوئی ہیر پھیر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھے پوری طرح تنظیم کا وفادار سمجھتے ہوئے میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا۔ ادھر میں خود تنظیم کی بیخ کنی پر تلا ہوا تھا۔ شاید میرے ارادوں کو تائیدِ غیبی ہی حاصل تھی کہ حالات تیزی سے موافق رُخ اختیار کرتے جا رہے تھے۔

جب میں نے موت کے سوداگروں کے خلاف اپنے مشن کا آغاز کیا تو میں تنہا تھا لیکن اب لاہور میں ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے مختارِ عام، نصیر خان جیسا آدمی میرے ہاتھ میں تھا، قاسم مالی مفادات کے لیے میرے ساتھ مل بیٹھنے پر آمادہ تھا، سکندر علی اور مٹھا خان جیسے اہم اور ضمیر فروش مہرے جہنم واصل ہو چکے تھے، لاہور میں لے ٹو کا ایک اہم ترین ٹھکانا خفیہ ٹیلی فون اور اسلحہ کے ناجائز ذخیرے سمیت ہولناک آتشزنی میں تباہ ہو گیا تھا۔ میری مخبری پر آتشزنی کے سلسلے میں لے ٹو کے وہ دو آدمی گرفتار کر لیے گئے تھے جو لاہور میں ایشین سنڈیکیٹ کے دفتر سے واپسی پر غزالہ کے اغوا کی ناکام کوشش میں ملوث تھے وہ لے ٹو کے لیے اتنے اہم تھے کہ ان کی گرفتاری کو اپنے لیے سنگین خطرہ تصور کرتے ہوئے لے ٹو نے ان دونوں کو حوالات میں زہر دے کر ہلاک کرا دیا تھا۔ آثار یہ بتا رہے تھے کہ اپنی ذات پر پڑا ہوا دبیز نقاب برقرار رکھنے کے لیے وہ بڑی سے بڑی خونریزی پر بھی آمادہ تھا۔

لاہور سے لے ٹو کے جو دو افراد میرے اور غزالہ کے پیچھے لگے تھے ان میں سے کرامت نامی مرد کو سلطان شاہ نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ رہی مسز مراد تو وہ بہت ہی غیر اہم عورت تھی اس نے میرے سامنے جو کچھ کہا وہ اوّل تا آخر قابلِ یقین تھا۔ اسے مہم میں صرف اس لیے شامل کیا گیا تھا کہ وہ غزالہ کو بچشمِ خود دیکھ چکی تھی۔

وہ آزادی کے بدلے مجھ سے زبان بند رکھنے کا وعدہ کر چکی تھی۔ لیکن وہ سیدھی اور اناڑی عورت تھی۔ بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ اس کا ساتھی کرامت اسی ہوٹل کے احاطے میں مارا گیا تھا جہاں مسز مراد مقیم تھی۔ پولیس متوفی کی شناخت کے سلسلے میں مسافروں سے ضرور رجوع کرتی اور کرامت کی بھیانک لاش دیکھ کر مسز مراد کے لیے اپنا فطری ردِعمل چھپانا ناممکن ہوتا۔ مرنے والے سے کسی تعلق کی بنا پر اس کا پولیس کی تحویل میں جانا لازمی امر تھا اور اگر وہ کڑی بازپرس کے نتیجے میں بوکھلا کر سب کچھ اُگل بیٹھتی تو اس کے بیان کے حوالے سے یہ بات اخبارات میں اور لے ٹو تک پہنچ سکتی تھی کہ ملازمت کی تلاش میں ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے دفتر میں آنے والی لڑکی اور اس کے دو ساتھیوں کو اس نے بچشمِ خود کراچی میں دیکھا تھا۔

مسز مراد کا پولیس کی تحویل میں جانا میرے لیے مضر تھا، اسی کے ساتھ لے ٹو بھی اس بات کو ہرگز پسند نہ کرتا کہ قتل اور اس سے متعلق مشتبہ اور پُراسرار حالات کے حوالے سے ایشین سنڈیکیٹ کا نام پولیس کی توجہ کا مرکز بنے، بدقسمتی یہ تھی کہ مسز مراد کے بارے میں لے ٹو کو باخبر کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا، جس وقت اس نے

مجھے فون کیا، بظاہر میں مسز مراد اور کرامت کے وجود سے لاعلم تھا لیکن اسے ٹو کی زبان سے ان دونوں کے بارے میں سُن لینے کے بعد میں اس سے کھل کر بات کر سکتا تھا مگر میرے پاس اسے ٹو سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اس کا فون اگلی رات سے پہلے آنے کی توقع نہیں تھی۔

"کہاں کھوئے ہوئے ہو؟" مجھے سوچ میں مستغرق پا کر رخشی نے ٹوکا۔

میں پہلو بدل کر مسکرا دیا۔ "اتفاقات پر غور کر رہا تھا۔ ہمارے مراسم کی ابتدا ہوئی تو ہمارے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہا۔ اس کے بعد تمہارے تیور بدلے تو دشمنی پر اُتر آئیں، مجھ پر ریوالور تان لیا اور اب پھر دوستانہ فضا میں بات کر رہی ہو۔"

"اٹل فیصلوں کے ساتھ زندگی عذاب ہو جاتی ہے۔" وہ دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "حالات کے ساتھ فیصلے بھی بدلتے رہنے چاہئیں ورنہ زندگی پچھتاووں کا انبار بن کر رہ جاتی ہے۔"

"تمہیں تو کامیاب سیاستداں ہونا چاہیے تھا۔ سیاست کا بہترین اصول بے اصولی ہے۔ بس دھارے کے ساتھ ہی بہے جاؤ، کامیابی قدم چومتی رہے گی۔" میں نے نئی سگریٹ سلگا کر کہا۔

"تم کام کی بات سے کیوں گریز کر رہے ہو؟" اس نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مجھے فیصلے کے لیے وقت درکار ہے۔"

"آخر کتنا وقت درکار ہے؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم خاموشی سے اس بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"یہاں سے جانے کے بعد ہی کچھ سوچ سکوں گا۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ "تمہیں دیکھ کر پُرانی یادیں ذہن کے دریچوں سے سر اُبھارنے لگتی ہیں اور عقل کند ہو کر رہ جاتی ہے۔"

"تو جاؤ، یہاں وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟"

"ہائیں۔" میں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔ "تو یہ ننھا سا آتشیں کھلونا کس خوشی میں نکالا تھا تم نے؟"

"بس، اضطراری ردِعمل کہہ لو۔" اس نے مسکراتے ہوئے ریوالور گود سے اُٹھا کر وینٹی بیگ میں ڈالا اور اس کی زپ بند کرتے ہوئے بولی۔ "اب تو یقین آ گیا کہ میں تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کروں گی؟"

"مگر میں کچھ دیر یہاں رکنا چاہ رہا ہوں۔" میں نے کسل مندانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔ "فوراً چلے جاؤ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ تمہارے کوئی فیصلہ کرنے تک یہ معاملات ہمارے درمیان ہی رہیں گے اگر کوئی بات تنظیم کے بڑوں تک پہنچی تو اچھا نہ ہوگا۔"

"مجھے سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو، میں ان مبادیات سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن کان کھول کر سُن لو کہ میں یہاں اپنی مرضی سے آیا ہوں اور اپنی ہی مرضی سے جاؤں گا۔ اس دوران میں تم کافی کا ایک کپ بنا سکتی ہو۔"

"کسی کا انتظار تو نہیں ہے تم کو؟" وہ چونک کر بولی اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو تم شرارت کے ارادے سے ادھر آئے تھے۔"

"کافی پیے بغیر ارادہ تبدیل ہونا مشکل ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک تمہاری نیت صاف نہیں ہے، میں تمہیں تنہا چھوڑ کر کچن میں نہیں جا سکتی۔ کون آنے والا ہے یہاں؟"

"چلو میں بھی کچن میں ساتھ ہی چلتا ہوں، تین پیالیوں کا پانی تیار کرنا کیونکہ قاسم بھی آنے والا ہی ہوگا۔"

"قاسم؟" اس کی آنکھوں میں تحیر اُبھر آیا۔ "وہ کیوں آئے گا؟ تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"آئے گا تو یہ سب اسی سے پوچھ لینا۔" میں نے اُکتاتے ہوئے لہجے میں کہا اور صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو میں کچن میں تمہارا ہاتھ بٹانے کی کوشش کروں گا۔"

وہ اپنی جگہ کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں سے تذبذب جھانک رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی باہر سے آہنی پھاٹک کے بجائے جانے کی آواز گونجنے لگی اور وہ چونک پڑی۔

"شاید قاسم پہنچ گیا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "یہ پش بیل کو کیا ہوا جو دروازہ پیٹنا پڑتا ہے؟"

"بچے بلاوجہ تنگ کرتے ہیں اس لیے تار نکلوا دیا ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "تم پھاٹک کھولو گے اور میں برآمدے سے تم پر نگاہ رکھوں گی، اگر آنے والا کوئی اور ہوا تو اسے دروازے ہی سے ٹال دینا۔ اس کے خلاف عمل کیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

"مجھ پر شبہ ہے تو تم خود ہی دیکھ لو۔" میں نے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔

"چلو۔" وہ مجھے نکاسی کے راستے کی طرف دھکیلتے ہوئے غرائی کیونکہ پھاٹک دوبارہ پیٹا جانے لگا تھا۔

کمرے سے نکل کر ہم دونوں برآمدے میں آئے تو چٹ چٹ کی دو آوازوں کے ساتھ پورا برآمدہ تاریکی میں ڈوب گیا، اب صرف دو گیٹ لیمپ روشن رہ گئے تھے جن کے گرد آلود شیشوں نے روشنی کو پھاٹک تک ہی محدود کیا ہوا تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" میں نے پلٹ کر بوکھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اندھیرے میں کسی گملے سے ٹھوکر لگی تو بھیجا باہر آ سکتا ہے۔ بتیاں روشن کرو فوراً۔"

"دو جاؤ۔" اس نے مجھے پوری قوت سے آگے دھکیل دیا۔ "اندھیرے کے باعث میں آنے والے کی نگاہوں سے محفوظ رہوں گی۔ یہ تمہارے حق میں بھی بہتر ہوگا۔" اس کی آواز سرگوشیانہ تھی۔

آنے والے نے پھر دروازہ پیٹنا شروع کر دیا اور میں کھانستا کھنکھارتا ہوا پھاٹک کی طرف بڑھ گیا۔ "ٹھہرو بھائی! دروازہ کھول رہا ہوں، اسے اکھاڑ ہی نہ ڈالنا۔"

پھاٹک کا بولٹ سرکاتے ہی آنے والا زور کے کسی سانڈ کی طرح اندر گھس آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیب میں تھے۔ اندر گھستے ہی اس نے داہنا ہاتھ جیب سے نکالا اور وزنی پستول کی نال میری پسلیوں میں اڑا دی۔ وہ مکان اس کے لیے دیکھا بھالا تھا کیونکہ اس نے بائیں ٹانگ سے آہنی پھاٹک بند کیا اور میری طرف سے نگاہ ہٹائے بغیر بائیں ہاتھ سے پھاٹک کا بولٹ لگا دیا۔

گرد آلود شیشوں میں سسکتی ہوئی یرقان زدہ روشنی میں چہرے کی خراشوں کے باوجود میں نے اس بھیانک چہرے کو پہچان لیا۔ وہ قاسم ہی تھا اور غالباً کسی کے ہاتھوں پٹ کر آ رہا تھا۔

"اندر چلو۔" اس نے میری پسلیوں پر پستول کی نال کا دباؤ بڑھا کر غراتے ہوئے کہا۔ "آ گئے ہو تو اب یہاں تمہاری قبر ہی بنے گی۔"

"میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔" میں نے تکلیف اور جھنجھلاہٹ سے بے چین ہو کر اس کا ہاتھ ایک طرف جھٹک دیا اور اس کے امکانی ردِعمل سے محفوظ رہنے کے لیے برآمدے کی طرف چل دیا جہاں رخشی نے قاسم کو پہچان کر روشنی کر دی تھی۔

وہ کسی غضبناک شکاری کتے کی طرح میرے پیچھے لگا رہا۔ اور میں رخشی کے قریب سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

"یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟" اندر پہنچتے ہی قاسم نے غضبناک لہجے میں رخشی سے سوال کیا جو اس کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ قاسم کی دہکتی ہوئی سفاک نگاہیں میرے چہرے پر ہی مرکوز تھیں۔

"یہ... یہ اچانک ہی آیا تھا۔" رخشی اس کی حالت دیکھ کر بوکھلائی ہوئی تھی۔ "میں نے اس سے بات کی ہے، ہو سکتا ہے کہ ہماری تجویز قبول کر لے، مگر فیصلے کے لیے کچھ مہلت چاہتا ہے۔"

"یہ دوغلا ہے۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ "اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "اے ٹو کو اس مکان کا پتا کس نے دیا تھا؟"

"میرے علاوہ کون دے سکتا ہے؟" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "میری یہاں موجودگی ہی اس سوال کا مسکت جواب ہے۔"

"اسے اُکسا کر خود یہاں کیوں دوڑے چلے آئے؟"

"رخشی کے تحفظ کے لیے۔" میں نے مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مجھے ڈر تھا کہ اے ٹو کی خوشنودی کے لیے کہیں تم اسے ہلاک ہی نہ کر بیٹھو... میں صرف اس سرد جنگ کا خاتمہ چاہتا ہوں جو میرے اور تمہارے درمیان چھڑی ہوئی ہے۔ میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا، آرام سے بیٹھ کر بات کرو، تمہاری حالت خاصی ابتر دکھائی دے رہی ہے۔"

"اے ٹو کو تم نے کیا بتایا تھا؟"

"یہی کہ رخشی اس مکان میں روپوش ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"روپوشی کا پس منظر تو ضرور بتایا ہوگا تم نے؟"

"ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ وہ مختصر اور کام کی بات سننا چاہتا تھا، پس منظر سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"

"اس کمینگی کی کیا ضرورت تھی... اے ٹو کی نگاہوں میں گرانا چاہتے تھے مجھے؟"

"گرانا چاہتا تو یہی بتاتا کہ تم نے خود ہی رخشی کو چھپایا ہوا ہے۔" میں نے صفائی کے ساتھ جھوٹ بولا۔ "لیکن میں نے یہ سب بتانا ضروری نہیں سمجھا۔"

"لیکن مجھے کیا معلوم کہ تم نے اس سے کیا بکواس کی ہوگی۔ اس کی تصدیق کا تو کوئی بھی ذریعہ نہیں ہے۔"

"نہ ہو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "یہی کیا کم ہے کہ اس نے پھر تم ہی سے رجوع کیا ہے۔ رخشی کی روپوشی میں تمہارا نام ملوث ہوتا تو اسی کے ساتھ تم بھی مردود قرار پاتے اور سزا دینے کا اختیار تم سے چھین کر مجھے یا کسی اور کو منتقل کر دیا جاتا۔"

بات منطقی تھی، وہ سوچ میں پڑ گیا پھر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ہم دونوں کو گھیر کر ایک جگہ مارنے کی کوئی چال رہی ہو۔" وہ کام کی بات کرنے سے پہلے پوری طرح یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ میں نے اے ٹو کو اس کے خلاف بھڑکانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

"چال ہوتی تو میں رخشی سے ملنے کے بجائے چھپ کر تمہاری آمد کا انتظار کرتا۔ پھر صرف دو گولیاں تم دونوں کو سلانے کے لیے کافی ہوتیں مگر میں یہاں خالی ہاتھ آیا ہوں۔ رخشی میری تلاشی لے چکی ہے۔"

"لیکن وہ خالی ہاتھ تو نہیں تھا جس نے تمہاری کار میں اس وقت میرا تعاقب کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"جب تم مجھ پر مصنوعی قاتلانہ حملہ کر کے خوفزدہ کرنے

کی کوشش کر سکتے ہو تو مجھے کس نے روکا ہے کہ تم پر سرِعام گولیاں برسوانے کی کوشش نہ کروں؟ تمہارے مسلح آدمی اکثر میرا پیچھا کرتے رہے ہیں، میں نے تو کبھی اس پر برہمی ظاہر نہیں کی۔ جب چاہا سرِعام ان کی گوشمالی کر ڈالی؟"

"آج میں نے بھی یہی کیا ہے۔" وہ بھیانک انداز میں ہنسا۔ "تمہارا آدمی کہیں پڑا اپنے زخموں کو چاٹ رہا ہوگا۔"

سلطان شاہ کے بارے میں وہ اطلاع میرے لیے تشویشناک تھی۔ قاسم جسمانی طور پر سلطان شاہ سے کہیں برتر تھا۔ اس کے چہرے کی خراشیں ظاہر کر رہی تھیں کہ تصادم مہلک نہیں تو خونریز ضرور رہا ہوگا۔

"بات جلدی ختم کرو، تم نے میرا کام بڑھا دیا ہے مجھے ابھی سے پہلے اپنے آدمی کو بھی دیکھنا ہوگا، تم نے اسے کہاں اور کس حال میں چھوڑا ہے؟"

وہ سفاکانہ انداز میں مسکرانے لگا، اس کے ادھ کھلے ہونٹوں کے پیچھے سفید دانتوں کی قطاریں وحشیانہ انداز میں چمک رہی تھیں۔ "اس کے ساتھ اپنی گاڑی کی بھی خبر لے لینا، سائٹ کے ویران علاقے میں میں نے اس کا پورا سائیڈ برباد کر ڈالا تھا، اسے کرین سے ہی اٹھوانا ہوگا۔"

"اور آدمی کس حال میں ہے؟" میں کوشش کے باوجود اس انکشاف پر اپنا سکون برقرار نہ رکھ سکا۔

"زخمی ہو گیا تھا۔ اسے میں اپنی کار میں ڈال لے گیا۔ فلٹر پلانٹ کی پہاڑیوں میں اسے ہوش آ گیا تھا۔ وہ مجھ پر حملہ کر بیٹھا اور میں نے وہیں نیچے گھسیٹ کر اسے ادھیڑ ڈالا۔" اپنے تشدد کی تفصیل بتاتے ہوئے اس کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے کسی بچے کی آنکھیں اپنے پسندیدہ کارنامے کی انجام دہی پر دمک اٹھتی ہیں۔

"لیکن اس نے بھی تمہیں معاف نہیں کیا۔" میں اس کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب یہ سلسلہ بند ہونا چاہیے۔" رخشی نے دخل اندازی کر کے موضوع وہیں ختم کر دیا پھر قاسم سے بولی "یہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ تم آ گئے۔ اب کیا کہتے ہو؟"

"کیا طے ہوا؟" اس نے سوال کیا اور رخشی اسے میری اور اپنی گفتگو سے آگاہ کرنے لگی۔

"لیکن جانے سے پہلے یہ سن لو کہ اس پتے پر رخشی تمہیں نہیں مل سکی۔" رخشی کے خاموش ہونے پر قاسم مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب تم اس معاملے کو بھول جاؤ گے۔"

"ساری بات مجھ پر آ جائے گی۔ اسے تو کا سوال یہی ہوگا کہ میں نے اسے غلط اطلاع کیوں دی؟"

"تمہاری اطلاع درست تھی، تم اسی پر مصر رہو گے، رخشی کسی پنجرے کی قیدی نہیں ہے اس کے ساتھ بھی کچھ لوگ ہیں۔ وہ خطرہ بھانپ کر میرے آنے سے پہلے یہ ٹھکانا چھوڑ کر چلی گئی۔"

"یعنی اب رخشی یہاں نہیں مل سکے گی؟"

"ظاہر ہے۔" اس نے جھلا کر کہا۔ "تمہارے جانے کے بعد ہی یہ مکان خالی کر دیا جائے گا۔ یہ یاد رکھنا کہ تمہاری وجہ سے رخشی پر ذرا بھی آنچ آئی تو میں تمہاری زندگی عذاب بنا دوں گا۔"

"آنچ۔" میں استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "وہ تو خود آگ سے کھیلتی رہی ہے اس کا پورا پیرہن داغ داغ ہے تم نہ جانے اسے کس آنچ سے بچانے کی فکر میں گھلے جا رہے ہو۔"

"بس دفع ہو جاؤ۔" وہ باہر کے راستے کی طرف ہاتھ اٹھا کر جھلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے وہ تم اچھی طرح سمجھ چکے ہو۔ اس کی خلاف ورزی ہوئی تو پھر محاذ کھل جائے گا۔"

میں نکلا تو رخشی پھاٹک تک میرے ساتھ لگی چلی آئی۔

"دیکھ لیا تم نے چاہنے والے ایسے ہوتے ہیں۔" برآمدے میں آ کر اس نے فخر آمیز سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"چاہت ہی نہیں خلش بھی ہے اس کے دل میں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "ایسا نہ ہوتا تو میرے طنز پر جھلا نہ جاتا۔"

اس سے قبل کہ وہ جواب دیتی میں پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھول کر باہر گلی میں نکل گیا۔

اس مکان کی دیوار کے ساتھ ہی قاسم کی کار کھڑی ہوئی تھی جس کا بایاں حصہ بری طرح پچکا ہوا تھا۔ اس سے یہ قیاس کرنا دشوار نہیں تھا کہ اس نے سلطان شاہ کو بری طرح سائیڈ مار کر کار کو الٹنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

میری کار تصادم میں اس بری طرح تباہ ہوئی تھی کہ مرمت کے باوجود اس کو اصلی حالت میں واپس لانا ناممکنات میں سے نظر آ رہا تھا۔ اس طرف سے مایوسی کے بعد میں پیدل ہو گیا تھا اور گھر میں نقد رقم موجود ہونے کے باوجود اتنی رات گئے دوسری کار خریدنا ناممکن تھا۔ سلطان شاہ کو فلٹر پلانٹ کی پہاڑیوں سے لانے کے لیے اول تو کوئی ٹیکسی ڈرائیور راضی نہ ہوتا اور کسی کو زائد کرائے کا لالچ دے کر آمادہ کر بھی لیا جاتا تو اس سے یہ خطرہ لاحق رہتا کہ سلطان شاہ کی حالت دیکھ کر کہیں وہ پولیس کو اطلاع نہ کر دے۔ ان حالات میں نہ چاہتے ہوئے بھی میں جیوا باوز کا رخ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کیونکہ وہاں گیراج میں ہمیشہ ایک کار

موجود رہتی تھی جسے اہم مواقع پر شاذ و نادر ہی استعمال کیا جاتا تھا۔

جیوا باوز ان دنوں مال کی وصولیابی کے علاوہ کسی اور مصرف میں نہیں تھا لہٰذا وہاں کے در و دیوار سے عجیب سی ویرانی ٹپک رہی تھی۔ محافظوں نے نہایت سپاٹ سنگی چہروں کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ ان ہی میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ تین نمبر کمرے میں داخلے کے بارے میں مجھے استثنا حاصل ہو چکا تھا میں حسبِ خواہش کسی بھی وقت اس ممنوعہ کمرے میں داخل ہو سکتا تھا لیکن میرے لیے میری ہی جانب سے جاری ہونے والی وہ ہدایت جو محافظ نے سنائی، بے سود ہو چکی تھی۔ مٹھا خان کی خودکشی کے بعد ایم ٹی تھری ہنڈرڈ کا استعمال ترک کیا جا چکا تھا جس کے بعد تین نمبر کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔

میں جیوا باوز سے کار لے کر سیدھا فلٹر پلانٹ کی ویران پہاڑیوں میں جا پہنچا۔ سڑک سے اتر کر چند سو گز بعد راستہ کار کے لیے دشوار گزار تھا لیکن میں کار کی خرابی کا خطرہ مول لے کر بڑھتا ہی رہا، آخر کار دو ٹیلوں کے درمیان مجھے زمین پر ایک ڈھیر سا پڑا ہوا نظر آ ہی گیا جس کے گرد آوارہ کتوں کا ایک غول جمع تھا۔

انجن کی آواز اور ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سلطان شاہ کے زخموں سے لہو چاٹتے ہوئے آوارہ کتے بھونکتے ہوئے وہاں سے بھاگ لیے اور میں نے قریب پہنچ کر کار کا انجن بند کر دیا۔ ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں سلطان شاہ پتھریلی زمین پر بیہوش پڑا ہوا تھا، دونوں آنکھوں کے نیچے ورم آلود نیل پڑے ہوئے تھے نچلے پپوٹوں پر سوجن کے باعث دونوں آنکھیں بند ہو کر رہ گئی تھیں۔ داہنے ابرو سے ذرا اوپر پیشانی پھٹی ہوئی تھی بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی پیشہ ور باکسر نے آہنی کلپ پہن کر اس کے چہرے پر طبع آزمائی کی ہو۔ قاسم کے بدن کی ساخت ہی سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی ہڈیوں میں فولاد کی سی طاقت رچی ہوئی ہے، مجھے فکر بس یہ تھی کہ اس مقابلہ میں سلطان شاہ کہیں اپنی دو چار ہڈیاں نہ تڑوا بیٹھا ہو۔ کیونکہ اس کے سانسوں کا آہنگ بھی بگڑا ہوا تھا۔

میں اسے کار میں ڈال کر برق رفتاری سے واپس ہو لیا۔ اس کی نازک حالت کے پیشِ نظر میں نے اسے گھر لے جانا مناسب نہ سمجھا اور ایک پرائیویٹ اسپتال جا پہنچا، راستے میں میں نے طبی عملے کی اشتباہ آمیز باز پرس کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار کر لیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ طبی امداد دیے جانے کے دوران ہوش میں آتے ہی وہ پشتو زبان میں بڑبڑانا شروع کر دے گا لہٰذا مادری زبانوں کے فرق کی بنیاد پر اسپتال میں میں نے خود کو اس کا دوست ظاہر کرتے ہوئے دوستوں کے باہمی جھگڑے کی کہانی سنائی۔

جس پر عملے نے پولیس سے رجوع کرنے کی بات چھیڑ دی۔ اسی اثنا میں کسی نرس سے اطلاع پا کر اسپتال کا سیٹھ نما مالک سفید گاؤن پہنے آ موجود ہوا۔ اس کے سامنے میں نے بہترین طبی امداد کے عوض فراخدلانہ اخراجات کا ذکر چھیڑا تو اس بے چارے کے رگ و پے میں انسانی ہمدردی کا لاوا کھولنے لگا۔ یوں انسانی جان کو ضابطوں پر ترجیح دیتے ہوئے فوری طور پر دیکھ بھال کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ سلطان شاہ کو پہلا گھنٹہ گزرنے سے پہلے ہی ہوش آ گیا۔ ورم سے بھنچے ہوئے پپوٹوں کی درمیانی جھریوں سے مجھے اپنے قریب دیکھ کر اس نے مسکرانا چاہا لیکن پھٹے ہوئے ہونٹوں نے اسے روک دیا۔

وہ لوگ اسے اسپتال میں داخل کرنے پر مصر تھے کیونکہ بدقسمتی سے اس وسیع عمارت میں مریضوں کی آبادی کم ہی نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف ضابطوں کے حوالے سے عملے نے میری استطاعت کا اندازہ لگا لیا تھا لہٰذا وہ سلطان شاہ کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کے درپے ہو گئے تھے۔ لیکن اس کی جملہ ہڈیوں کی سلامتی کی اطلاع پانے کے بعد میں اسے ساتھ لے جانے پر اڑ گیا اور آخر کار ساڑھے تین ہزار روپے کی ادائیگی کے بعد اسے چھٹی مل ہی گئی۔

"تمہاری کار تباہ ہو گئی۔" اسپتال سے روانہ ہونے کے بعد وہ بگڑی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔ زخموں کے باعث اس کے لیے صحیح تلفظ ادا کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

"سب کچھ بھول جاؤ، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"اس نے کار لڑا کر مجھے حواس باختہ کر دیا، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی حرکت کر گزرے گا... میرے خدا! جب اس سے دوبدو ٹکراؤ ہوا تو میں ہل کر رہ گیا۔ کسی دیو کی طرح طاقتور تھا وہ۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم کسی کمزور آدمی سے نہیں پٹے ہو۔ بس اب خاموش ہو جاؤ۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور وہ واقعی خاموش ہو گیا۔

گھر پہنچا تو وال کلاک صبح کے چار بجا رہا تھا۔ پوری رات بھاگ دوڑ کی نذر ہو گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد اجالا ہونے والا تھا لیکن میرا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ منزہ مراد کا مسئلہ ذہن میں رہ رہ کر بچھو کی طرح ڈنک مار رہا تھا۔

تکان کے غلبے سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے میں نے برف کے ڈلوں میں بے حساب مقدار انڈیل کر کم از کم چار گنا پیمانہ تیار کیا اور تلخ لاوے کے گھونٹ معدے میں اتارتا فون کے قریب

جا بیٹھا۔

"کیسے فون کر رہے ہو؟" سلطان شاہ نے اذیت ناک لہجے میں کہا اور میں اس پر برس پڑا۔

"خاموش نہیں رہو گے تو کمرے میں مقفل کر کے تنہا چھوڑ دوں گا۔ جو ہو رہا ہے بس خاموشی سے دیکھتے رہو۔ زیادہ ذہنی قلابازیوں کی ضرورت نہیں، زیادہ مجبور کر دگے تو کوئی خواب آور دوا دے دوں گا۔"

میں نے ڈائریکٹری میں تلاش کر کے اس ہوٹل کا نمبر ملایا جہاں مسز مراد مقیم تھی تو دوسری گھنٹی پر ایک غنودہ سی نسوانی آواز نے کال وصول کی۔ جب میں نے مسز مراد سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو آپریٹر کی آواز سے نیند کا خمار ایک دم دور ہو گیا، لہجے میں بھی بیزاری کی جگہ تجسس پیدا ہو گیا۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟" اس نے پُراشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

"وہ میری بھانجی ہے۔" میں نے دبنگ لہجے میں کہا۔ "تمہیں میرے شجرے سے کیا غرض ہے؟"

"اوہ غلط نہ سمجھیں جناب۔" اس کی بوکھلائی ہوئی آواز آئی۔ "ہم خود ان کے کسی عزیز یا واقف کار کی تلاش میں تھے۔ آپ ذرا ہولڈ کریں میں منیجر صاحب کو اٹھاتی ہوں۔" اور وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر لائن پر سے غائب ہو گئی۔

بمشکل ایک یا ڈیڑھ منٹ بعد فون پر منیجر کی آواز سنائی دی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے گہری نیند سے بیدار کیا گیا ہے۔ "آپ مسز مراد کے ماموں ہیں۔۔۔؟ زحمت نہ ہو تو فوراً ہوٹل چلے آئیں یا اپنا پتا بتا دیں یا فون نمبر دے دیں۔ مسز مراد ایک مشکل سے دوچار ہو گئی ہیں۔ ہوٹل کے رجسٹر میں لکھوایا ہوا پتا مفروضہ ثابت ہوا ہے۔ ان کے کمرے سے بھی کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی جس سے ان کے پتے ٹھکانے کا علم ہو سکے۔"

"وہ کوئی یتیم یا لاوارث لڑکی نہیں ہے، میں ابھی آ رہا ہوں۔" میں نے اسی دبنگ اور غصیلی آواز میں کہا۔ "لیکن پتا تو چلے کہ وہ کہاں ہے؟ کیا مصیبت مول لے بیٹھی ہے؟"

"ایک قتل کا معاملہ ہے جناب!" ریسیور پر منیجر کی کپکپاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہوٹل کے احاطے میں ایک اجنبی کا قتل ہو گیا تھا۔ لاش کی شناخت کے لیے پولیس نے ہوٹل میں مقیم مسافروں سے بھی رجوع کیا۔ مسز مراد مقتول پر نظر پڑتے ہی ہذیانی انداز میں چلانے لگیں اور اسی عالم میں بے ہوش ہو گئیں۔ وہ پولیس کی حراست میں سول اسپتال میں داخل ہیں اور میرے ستارے گردش میں آتے ہوتے ہیں۔ پولیس مجھے گرفتاری کی دھمکیاں دے رہی ہے کیونکہ مسز مراد کا دیا ہوا مستقل پتا غلط ثابت ہوا ہے۔۔۔ اب میں ہر مسافر کے سچ اور جھوٹ کی تصدیق تو نہیں کر سکتا۔ آپ کتنی دیر میں آ رہے ہیں جنابِ عالی؟"

"بس میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" میرا جواب سُن کر اس کے منہ سے دعائیہ کلمات کا سیلاب بہہ نکلا تھا۔ میں نے اس کے خاموش ہونے کا انتظار کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

یہ بھی غنیمت تھا کہ مسز مراد پولیس کو کوئی بیان دیے بغیر اسپتال جا پہنچی تھی۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس قسم کے معاملات میں وہ بالکل اناڑی تھی۔ غیر متوقع طور پر کرامت کی لاش سامنے آنے پر صدمے سے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہو گی۔ لیکن اسے پولیس کی حراست سے نکالنا بہت دشوار تھا۔ قانونی طور پر بیان دینے تک اس کی جان نہیں چھوٹ سکتی تھی۔ پھر بیان کی بنیاد پر تفتیشی حکام اگر اسے گرفتار کرنے کا فیصلہ ہی کر لیتے تو اس کی عدالت میں پیشی سے قبل ضمانت دشوار تھی۔ میں اس اُدھیڑ بُن میں مبتلا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور بے اختیار میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

"تم جاگ رہے ہو؟" پہلی گھنٹی ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے ریسیور اٹھایا تو کانوں میں اے ٹو کی آواز رس گھول گئی۔

"ہاں جناب! حالات کچھ ایسے ہی ہو گئے ہیں۔"

"رخشی کا کیا رہا؟" اس نے اپنے مخصوص انداز میں نپا تلا سوال کیا۔

"قاسم سیدھا اسی پتے پر پہنچا تھا لیکن مکان خالی تھا۔ واپسی پر وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ ادھر کا رُخ کرنے سے پہلے اس نے رخشی کو ہوشیار کر دیا ہو؟"

"سب کچھ ممکن ہے جناب! میری تو عقل ہی کام نہیں کر رہی۔ میں مسلسل اس کی نگرانی کرتا رہا ہوں، وہ وہیں مقیم تھی اب پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی؟"

"قاسم پر کڑی نگاہ رکھو۔۔۔ وہ کام کا آدمی ہے، میں سوچ سمجھ کر اس کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"بہتر جناب۔ وہ ایک پل کے لیے بھی میرے آدمیوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو سکے گا۔"

"تم کن حالات کا ذکر کر رہے تھے؟"

"پچھلی شام کسی نے کرامت کو اس ہوٹل کے احاطے میں ہلاک کر دیا، جہاں مسز مراد مقیم تھی۔ آپ سے اطلاع ملنے کے بعد مسز مراد سے رجوع کرنے کی کوشش کی گئی تو اسے پولیس کی تحویل میں اسپتال منتقل کیا جا چکا تھا۔"

"کھیل دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔" ریسیور پر اس کی آواز قدرے خوابناک ہو گئی۔ جیسے قتل و خون کی خبر سن کر اس کے حواس پر نشہ چڑھ رہا ہو۔ "ذرا تفصیل تو بتا ڈالو۔"

میں نے مختصر ترین الفاظ میں اپنی معلومات کا نچوڑ اس کو سُنا دیا۔

"اس وقت کیا حال ہے اس کا؟" چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے سوال کیا۔

"بیان دینے کے قابل نہیں ہو سکی ہے۔" میں نے اندازے کی بنا پر اعتماد سے کہہ ڈالا۔

"وہ بہت کم جانتی ہے لیکن جو کچھ جانتی ہے، اس کا افشا ہماری کاروباری ساکھ کی تباہی کے لیے کافی ہو گا۔ اگر اسے پولیس کی تحویل سے نکالنا ناممکن ہے تو اسے اسپتال ہی میں ختم ہو جانا چاہیے۔"

اس کا فیصلہ سُن کر میرے اعصاب جھنجھنا اُٹھے، سنگدلی اور سفاکی کے ایسے بھیانک تیور کبھی میرے تصور میں بھی نہیں آ سکے تھے۔ مسز مراد عملاً باہر کی عورت تھی، اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ایشین سنڈیکیٹ کی ملازمہ تھی اور اس کے بیان سے اس گھناؤنے برآمدی کاروباری ادارے کی نیک نامی پر حرف آ سکتا تھا للٰذا نہایت سرد مزاجی کے ساتھ اس کے قتل کا حکم جاری کر دیا گیا تھا، جیسے وہ انسان نہیں، کوئی حقیر سی چیونٹی ہو۔ بے بس، مجبور اور غیر اہم۔

"میں یہ حکم قاسم تک پہنچا دوں گا۔" میں نے اپنے دل و دماغ میں اُبھرتی ہوئی نفرت کی لہر پر قابو پا کر آہستگی سے کہا۔

"اس کام کے لیے وہی مناسب رہے گا۔" اس کی آواز پر خونریزی کا خمار اور گہرا ہو گیا۔ "کرامت کے قتل کا مطلب ہے کہ وہ اس مشتبہ جوڑے کا سُراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر اس جوڑے کو تخریب کاری کے لیے لاہور بھیجنے والا قاسم ہی تھا تو اس کو اب مسز مراد کی بھی جستجو ہو گی، وہ یہ کام خوشی سے انجام دے گا۔"

"یس سر۔" میں جواب میں اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکا، لائن بے جان ہو چکی تھی۔

اے ٹو ذہنی اعتبار سے بہت برتر تھا، کرامت کے قتل سے اس نے صحیح نتائج اخذ کیے تھے، اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ کرامت کو مارنے والوں کو مسز مراد کی طرف سے بھی خلش ہو گی، فرق صرف اتنا تھا کہ میری کامیاب حکمتِ عملی کی بنا پر وہ مجھے نظر انداز کر کے قاسم کو سارے مصائب کا ذمے دار سمجھ رہا تھا۔

میرے دل میں اس کی طرف سے نفرت میں اضافے کے ساتھ ہی ذہن پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔ اتنا کچھ کر گزرنے کے باوجود میں اے ٹو کی خود اعتمادی کو متزلزل نہیں کر سکا تھا۔ وہ شوریدہ سر، طوفانی لہروں میں گھری ہوئی کسی دیو ہیکر چٹان کی طرح بدستور اپنی جگہ اٹل تھا اور لہریں اس کے قدموں میں مچل مچل کر دم توڑ رہی تھیں۔ اس کے لہجے میں وہی تحکم اور غرور تھا جس نے آواز بن کر نجانے کتنے منہ زوروں کو غلام بنایا ہوا تھا۔ اس کے الفاظ میں طاقت تھی اور پے در پے زخم کھانے کے باوجود وہ حوالات کی سلاخوں کے اس پار سے لے کر ہسپتال کے بستر تک اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے پر قادر تھا۔ اور یہ محض اس لیے تھا کہ وہ اپنے وفاداروں سے دشمنوں تک سب کے لیے ایک بے نام آسیبی سایہ تھا۔ وہ خود کسی پر اور کہیں بھی وار کر سکتا تھا مگر دوسروں کے لیے وہ ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی بھاری اور خوابناک آواز کے سوا کچھ نہ تھا جسے نہ وہ پکڑ سکتے تھے، نہ تباہ کر سکتے تھے۔

میرا جی چاہا کہ اسی وقت اٹھوں اور ہر اس فرد اور شے کو تباہ کرتا چلا جاؤں جس سے اے ٹو کے مفادات وابستہ تھے۔ گو کلاس میں برف کے ڈلوں کو گھلاتا ہوا، سارا سیمابی سیال میرے معدے میں اُتر چکا تھا لیکن ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ کوئی بھی اندھا دھند اقدام میری ساری کوششوں پر پانی پھیر سکتا تھا۔ میرا سفر صحیح سمت میں جاری تھا، خرابی بس اسی قدر تھی کہ مجھے اپنی جاں سوز کوششوں کا مطلوبہ صلہ نہیں مل رہا تھا۔

اے ٹو کے نام پر اپنی سلامتی کو داؤ پر لگانے والے خالد اور کمال اپنے آقا کے اشارے پر حوالات کی سلاخوں میں محفوظ ہونے کے باوجود موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے اور اب شجرِ حیات سے ایک پتّہ اور جھڑنے والا تھا۔ اے ٹو کے آسیبی وجود کو ایک اور انسانی جان کی بھینٹ درکار تھی، ہیروئن کے سیلاب میں ہر طرف تباہی اور بربادی کے سودے کرنے والا اپنی سلامتی کے لیے یکے بعد دیگرے انسانی لاشوں کے ڈھیر لگاتا جا رہا تھا۔ اور میں اپنی تمام تر نیک خواہشات کے ساتھ اس کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور تھا۔

دل گرفتگی کے عالم میں میں قاسم کا نمبر ملانے لگا تاکہ اس خونخوار درندے کو ایک سہمے سکڑے ہوئے بے ضرر شکار کی اطلاع دے سکوں۔

اگلی صبح کے اخبارات سنسنی خیز خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ لاہور کے واقعات کی تازہ ترین تفصیلات کراچی کے اخبارات تک پہنچ گئی تھیں، مختصر سی اشاعت کے

ایک مقامی اخبار میں مسز مراد کے قتل کی خبر بھی پہلے صفحے پر موجود تھی۔ اسے ایک اجنبی ڈاکٹر کے بھیس میں دیکھنے آیا تھا۔ اسپتال کے عملے نے اس کے پیشہ ورانہ حلیے کی بنا پر اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا اور مسز مراد کے بستر کے قریب بینچ پر اونگھتا ہوا ڈیوٹی کانسٹیبل اسے اسپتال کے عملے کا کوئی فرض شناس ڈاکٹر سمجھتا رہا۔ اس نے خواب آور دواؤں کے اثر کے تحت سوتی ہوئی مسز مراد کا معائنہ کیا، سپاہی سے کچھ سوالات کیے اور پھر مریضہ کو ایک انجکشن لگا کر واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے دس منٹ بعد ہی مریضہ کے منہ سے نیلے جھاگ نکلنے لگے، بدن اینٹھنے لگا پھر اس نے طبی عملے کی نگاہوں کے سامنے سسک سسک کر دم توڑ دیا۔ پراسرار اجنبی کی تلاش کی کوششیں بے سود ہی ثابت ہوئیں۔

مسز مراد کرامت کے قتل کے سلسلے میں سامنے آئی تھی۔ اخبارات میں کرامت کو نامعلوم مقتول قرار دیا گیا تھا کیونکہ اس کے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی جس سے اس کی شناخت میں مدد ملتی البتہ اس گمنام مقتول کے جوتوں پر لاہور کی ایک کمپنی کا نام درج تھا لہٰذا سارے قیاسات میں یہی فرض کیا گیا تھا کہ مقتول لاہور کا باشندہ تھا، گو مقتول اور مسز مراد کا کوئی تعلق سامنے نہیں آ سکا تھا لیکن مسز مراد کے ردعمل کی بنا پر ان دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھی تصور کر لیا گیا تھا پھر کہانی سیدھی سادی ہو گئی تھی۔ اخباری وقائع نگار نے دلائل کی بنیاد پر کراچی میں ہونے والے دوسرے سفاکانہ قتل کا تعلق لاہور کے پچھلے دن کے واقعات سے قائم کر دیا تھا۔

لاہور کی ایک بڑی عمارت میں بھیانک آتش زنی کے نتیجے میں نہ صرف اس عمارت کے ایک احاطے سے لاش برآمد ہوئی بلکہ عمارت میں موجود غیرقانونی اسلحے اور بارود کے ذخیرے کا بھی انکشاف ہوا جو نامعلوم مقاصد کے تحت وہاں جمع کیا گیا تھا۔ اسی شام لاہور میں گمنام قاتلوں نے اندھادھند تین گداگروں کو ہلاک کیا جس سے اس شبہ کو تقویت ملتی تھی کہ جنونی قاتلوں کو مقتول گداگروں جیسی جسامت والے کسی ایسے دشمن کی تلاش تھی جو کسی مقابلے میں لباس تار تار ہونے کے بعد بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پھر پولیس نے کسی گمنام مخبر کی اطلاع پر آتش زنی کے شبہ میں کمال اور رخالد نامی دو افراد کو حراست میں لیا لیکن باقاعدہ بازپرس کے آغاز سے پہلے ہی ان دونوں کو حوالات میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا تاکہ وہ مجرموں کے اہم راز فاش نہ کر سکیں پھر کراچی میں نامعلوم شخص مارا گیا اور مسز مراد پولیس کی نگاہوں میں آ گئی۔ اسے بھی کچھ اہم باتیں معلوم تھیں لہٰذا اس سے پیشتر کہ وہ اپنا بیان دیتی اسے بھی ختم کر دیا گیا۔

نامعلوم مقتول کے لاہور کے بنے ہوئے جوتوں اور رخالد، کمال اور مسز مراد کے قتل کے یکساں طریقۂ کار کی بنا پر ان سب معاملات کو ایک ہی کڑی میں پرو کر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ ملک میں بڑے پیمانے پر اسلحے کی اسمگلنگ اور تجارت جاری تھی۔ اور اسی میں اجارہ داری وغیرہ برقرار رکھنے کی خاطر زیرزمین دنیا کے کوئی دو طاقتور گروہ آپس میں ٹکرا گئے تھے، ہر فریق دوسرے کو بدترین جانی اور مالی نقصان پہنچانے پر تلا ہوا تھا۔ لیکن اس تصادم سے پولیس کو دور رکھنے کے معاملے میں دونوں ہی فریق یکساں پالیسی پر کاربند تھے کہ اپنے کسی ایسے کارندے کو پولیس کی تحویل میں زندہ نہ چھوڑا جائے جو اہم کاروباری راز فاش کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہو۔

اخباری وقائع نگار بہت ذہین تھا۔ اس نے اپنے تجربے اور بےلاگ تجزیے کی بنیاد پر واقعات کی کڑیاں بہت خوبصورتی کے ساتھ یکجا کی تھیں لیکن افسوس اور حیرت کی بات یہ تھی کہ لمبے چوڑے متن میں کہیں بھی ہیروئن جیسے موذی نشے کا ذکر نہیں آیا تھا جس کی سوداگری وہ سارے گل کھلا رہی تھی۔

ملک کے شہری حلقوں میں منشیات کے بڑھتے ہوئے استعمال کے خلاف بالعموم اور ہیروئن کی مقبولیت کے خلاف خاص طور پر غصے، تشویش اور اضطراب کی لہر پھیل رہی تھی جس میں انسداد منشیات کے ذمہ دار ادارے بھی سخت تنقید کا نشانہ بن رہے تھے۔ اس ضمن میں رائے عامہ کے دباؤ سے مجبور ہو کر آئے دن خصوصی مہمات چلائی جا رہی تھیں جن میں دس بیس گرام ہیروئن بیچنے والے خوردہ فروش ہی پکڑے جاتے تھے، کوئی بڑا سوداگر کبھی ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔ دوسری طرف اسے ٹو نے اپنے گھناؤنے کاروبار پر اس قدر دبیز غلاف چڑھایا ہوا تھا کہ میرے بڑے بڑے اقدامات بھی ہیروئن کی تجارت کو اخبارات کی سرخیوں میں جگہ نہیں دلوا سکے تھے۔

سکندر علی جن دنوں کراچی میں ہیروئن کا بادشاہ تھا، ان ہی دنوں میرے دل میں بغاوت کے جذبے نے سر ابھارا تھا۔ پھر مسلسل کوششوں کے بعد میں اسے جہنم واصل کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اخبارات میں کہیں بھی اس شخص کے لیے مذمت کا ایک لفظ شائع نہیں ہو سکا، ہر طرف ایک ہی ذکر تھا کہ سکندر علی شہر کا بہت مخیر اور سماج دوست باشندہ تھا اور اسے محض اس وجہ سے موت کے گھاٹ اتارا گیا کہ وہ منشیات کے خلاف ہر مہم میں پیش پیش رہتا تھا، سکندر علی مر گیا، اس کا منصب بھی مجھے سونپ دیا گیا لیکن شہر میں کسی کو علم نہ ہو سکا کہ کراچی کے ناآسودہ

گھروں میں ہیروئن کے زہر کو متعارف کرانے اور پھیلانے والوں کا سرغنہ سکندر علی تھا۔

پھر مٹھا خان جو بی ون کے منصب پر فائز ہو کر بجانے کتنی مقداریں اور کتنے شہروں میں ہیروئن کی تجارت کو کنٹرول کرتا تھا، اپنے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا تو اس بار بھی ہیروئن کے بارے میں ایک لفظ کا انکشاف نہیں ہوا۔ اس کی حویلی سے ایم بی تھری ہنڈرڈ ساخت کا طاقتور ٹرانسمیٹر ریسیور سیٹ برآمد ہوا جو ملک گیر پیمانے پر موت کی سوداگری میں اہم ترین مواصلاتی ذریعے کا کردار ادا کرتا تھا لیکن کسی کو اس حقیقت کا گمان تک نہ ہو سکا، اسے یقینی طور پر کسی ملک دشمن کے لیے جاسوسی کا کردار سمجھ لیا گیا۔ ہر حلقے میں اس واقعے پر دل کھول کر طبع آزمائی کی گئی لیکن کوئی بھی معاملے کے اصل رخ کو نہ پہچان سکا۔

پھر اب لاہور میں میرے ہاتھوں اے ٹو کا ایک اہم ترین ٹھکانا برباد ہوا تھا لیکن اس بار بھی اخبارات میں کہیں ہیروئن کا نام نہیں آنے پایا تھا۔ اخبارات قیاس آرائیوں سے بھرے ہوئے تھے مگر سارا زور صرف اسلحے کی اسمگلنگ پر تھا، آدمی مر رہے تھے، بھاری مالی نقصان ہو رہا تھا لیکن ہیروئن کا نام دبیز پردوں میں چھپا ہوا تھا کیونکہ اے ٹو اس سفوف سے اپنا ہزاروں گنا نقصان بھی پورا کر سکتا تھا، اسے ایک سے ایک جائداد مل سکتی تھی، وفادار لڑاکوں کی ٹولیاں زرخرید غلام بنائی جا سکتی تھیں لیکن ایک مرتبہ ہیروئن کی تجارت کا راز فاش ہو جاتا یا وہ گھناؤنا کاروبار اس کے قبضے سے نکل جاتا تو اس کا متبادل تلاش کرنا ناممکنات میں سے تھا۔

اخباری حوالوں سے سامنے آنے والی اطلاعات اور اصل صورتحال کا موازنہ کرتا ہوا میں فیکٹری جا پہنچا۔ وہاں سے میری غیرحاضری کافی طوالت اختیار کر گئی تھی۔ وہاں کے بہتیرے کام ایسے تھے جو میرا عملہ کافی مدت تک میری کسی مدد کے بغیر چلا سکتا تھا لیکن پھر بھی بعض قانونی ضابطوں کی خانہ پری کے لیے کاغذات پر میرے دستخط ضروری تھے، دفتری عملے نے خوشگوار حیرت کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو خطوط کا ایک انبار میرا منتظر تھا۔

طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق سیکریٹری نے عام ڈاک سے آئے ہوئے خطوط رجسٹرڈ خطوط سے الگ رکھے تھے۔ میں نے سرسری انداز میں خطوط کا جائزہ لینا شروع کیا اور چوتھی کوشش میں لاہور سے آئے ہوئے ایک لفافے سے غزالہ کی تصویر برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اخبارات میں کرامت کے قتل کے سلسلے میں ساری ہی تفصیلات شائع ہوئی تھیں ساری جزئیات پر اس حد تک توجہ دی گئی تھی کہ جوتے بنانے والی کمپنی کا نام تک سامنے آ گیا تھا لیکن کسی بھی خبر میں مرنے والے کے پاس سے غزالہ کی تصویر کی برآمدگی کا ذکر نہیں تھا جبکہ مسز مراد نے مجھے خود بتایا تھا کہ لاہور سے چلتے ہوئے کرامت کے پاس غزالہ کی تصویر موجود تھی۔ اگر وہ تصویر ضائع ہو گئی تھی تو مجھے کوئی پروا نہیں تھی لیکن کسی پولیس افسر نے تفتیش کی خاطر دانستہ تصویر کا ذکر گول کر دیا تھا تو یہ میرے لیے تشویش کی بات تھی۔

قاسم کی کاٹ کر کے تنظیم کی طرف سے غزالہ کی تلاش کی ذمہ داری مجھے سونپ دی گئی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ آزادانہ طور پر شہر میں نقل و حرکت کر سکے گی لیکن کرامت کے پاس موجود تصویر کو میں بھلا ہی بیٹھا تھا۔ وہ کاپی اگر پولیس کے ہاتھ لگ گئی تھی تو غزالہ کے لیے گھر سے باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں مضطرب ہو گیا، فون پر اس قسم کی گفتگو مناسب نہیں تھی، غزالہ بلاوجہ ضرورت سے زیادہ پریشان ہو جاتی پھر لاہور سے واپسی کے بعد میں اسے گھر چھوڑنے گیا تو کسی سے ملے بغیر ہی واپس آ گیا تھا لہٰذا ضرورت اور موقع کی مناسبت سے میں نے دفتر چھوڑ دیا۔

گھر پہنچا تو وہاں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کرنل زمار زیدی سیدھا میری طرف آیا تھا اور چڑھے ہوئے سانسوں کے درمیان بلاتمہید ہی بولنے لگا۔ ”غغ... غضب ہو گیا تنویر میاں! وہ جنون کے عالم میں کمرے سے نکل آیا ہے، ہر طرف توڑ پھوڑ اور بربادی مچا دی ہے، اس کی ماں راہداری میں بےہوش پڑی ہے، کہیں وہ شمع کو مار ہی نہ دے؟“

میرے ذہن میں ایک فلم سی تیزی سے گزر گئی، اگر کامران اپنی ماں کو ہلاک کر بیٹھتا تو گھر والوں کی مرضی کے بغیر بھی وہ پولیس کیس ضرور بنتا، تفتیش ہوتی، سب کے بیان لیے جاتے اور غزالہ کو پولیس کے سامنے پیش ہونا پڑتا جبکہ کرامت کے پاس سے اس کی تصویر امکانی طور پر پولیس کی تحویل میں جا چکی تھی۔

میں غزالہ کے باپ کو وہیں چھوڑ کر دوڑتا ہوا اندر گھستا چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں غزالہ نہایت خوفزدہ حالت میں کھڑی اندر جانے والے راستے کی طرف دیکھے جا رہی تھی اور ادھر سے توڑ پھوڑ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں میں ڈرائنگ روم سے نکل کر راہداری میں داخل ہوا تو غزالہ کی ماں، شمع فرش پر بےحس و حرکت پڑی ہوئی تھی اور راہداری کے سرے پر غزالہ کے والدین کی خواب گاہ سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے وہاں آوارہ بد

روحیں آپس میں لڑ رہی ہوں۔

میں خواب گاہ کے دروازے پر پہنچتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ کامران ہاتھ میں ایک ڈنڈا لیے، اول فول بکتے ہوئے اسے چاروں طرف یوں گھمائے جا رہا تھا جیسے وہ ہر طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہو اور اگر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی ہاتھ روکا تو وہ سب مل کر اسے دبوچ لیں گے، لاٹھی کی زد میں آنے والی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کا قدآدم آئینہ چور چور ہو چکا تھا، آرائشی سامان ٹوٹ کر فرش پر بکھرا ہوا تھا، خود کامران بھی اس خیالی مقابلے میں زخمی ہو چکا تھا لیکن اسے اپنی چوٹ کا احساس ہی نہیں تھا۔

پھر وہ اپنی پشت پر موجود کسی خیالی دشمن کے سر پہ ڈنڈا رسید کرنے کی نیت سے پیچھے گھوما تو اچانک ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کے ہاتھ تھم گئے بے رونق اور ویران آنکھیں کسی تاثر کے بغیر خوف زدہ انداز میں مجھ پہ جم کر رہ گئیں اور میں مدافعت کے لیے تیار ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مجھے اپنے دشمنوں کا سرغنہ سمجھ کر مجھ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن اس نے مجھے دیکھ کر حیرت ناک ردِ عمل کا مظاہرہ کیا۔

اس نے ڈنڈا فرش پر پھینک دیا، چہرے کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے اور وہ سر جھٹک کر زیرِ لب مہمل سے الفاظ بڑبڑاتا ہوا میرے قریب سے گزر گیا۔

غزالہ کے ساتھ کرنل زوار زیدی بھی میرے تعاقب میں راہداری میں آ پہنچا تھا میں کامران کو دیکھنے کے لیے پلٹا تو... ان دونوں کے تحیر زدہ چہروں پر نگاہ پڑی وہ حیرت سے کامران کو دیکھ رہے تھے جو دیوانگی کو بھول کر شریفانہ انداز میں سر جھکائے چلا جا رہا تھا ان دونوں ہی کے لیے کامران کے رویے کی تبدیلی ناقابلِ فہم تھی۔

"کامران!" میں نے پُراعتماد لہجے میں اسے آواز دی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور مشینی انداز میں آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا، اس نے راہداری میں بے ہوش پڑی ہوئی اپنی ماں سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا تھا لیکن مجھے ڈر تھا کہیں وہ کھلے لان میں نکل کر دوبارہ سرکشی کے موڈ میں نہ آ جائے لہٰذا میں لپک کر آگے بڑھا اور اس کا بازو تھام لیا وہ کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح بے چون و چرا میرے ساتھ چلتا رہا اور میں نے اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔

وہاں میں نے تنہا ہی اس کے زخموں کو صاف کر کے ابتدائی طبّی امداد بہم پہنچائی۔ اس دوران میں غزالہ یا کرنل میں سے کوئی کمرے میں نہیں آیا تھا۔ کامران کو میرے ساتھ مفاہمانہ رویّہ اختیار کرتے دیکھ کر وہ دونوں شاید بے ہوش شمع کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے تھے۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر میں نے کامران کو اسی کمرے میں مقفل کر دیا اور ڈرائینگ روم میں چلا آیا۔ وہاں غزالہ کی ماں پنکھے کے نیچے ایک صوفے پر پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں کرب کے سائے لہرا رہے تھے مجھے دیکھتے ہی اس کے سوکھے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ اُبھر آئی اور آنکھوں میں ممتا بھرے پیار کا نور پوری طرح چمکنے لگا۔

"آؤ بیٹے!" وہ نقاہت زدہ آواز میں بولی۔ "اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔ ورنہ آج تو اس کے تیور بہت خراب تھے۔ نجانے تم سے کیوں اتنا ڈرتا ہے؟"

"ڈرتا نہیں ہے، بس پہلا تجربہ اس کے ذہن کے کسی بے نام گوشے میں جم کر رہ گیا ہے۔" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"پہلا تجربہ کیسا؟" کرنل نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی کہ میں جسمانی طور پر اس سے برتر ہوں، پہلی مرتبہ میں نے مضبوطی سے اسے جکڑ لیا تھا۔"

"پھر تو خوف ہی ہوا نا۔" کرنل مایوسانہ لہجے میں بولا۔ "ڈاڈوں کی مار دھاڑ سے تو بڑے سے بڑا پاگل بھی خوف کھاتا ہے۔ خوف تو بالکل لاشعوری کیفیت ہوتی ہے، میں سمجھا تھا کہ تم کچھ اور کہو گے، شاید کامران کے ذہن کا کوئی حصہ ناکارہ ہونے سے بچ گیا ہو۔"

"میرا اندازہ ہے کہ اس کے ذہن کا کوئی حصہ محفوظ ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ غزالہ کے ساتھ اس کا رویّہ مختلف نہ ہوتا۔ اس کے ساتھ آج تک کامران نے کبھی کوئی بدتمیزی نہیں کی۔"

"کاش وہ نارمل ہو سکے۔" شمع دردناک لہجے میں بولی۔ "جس دن اسے پُرانی حالت میں واپس دیکھ لوں گی، جرم اور گناہ کا احساس میرے ذہن سے مندمل ہو جائے گا... اب تو ہر وقت اسے دیکھ کر کڑھتی رہتی ہوں۔"

اچانک مجھے ایڈکشن کیور سوسائٹی یاد آ گئی۔ "آپ فکر نہ کریں، میں انشاء اللہ جلد ہی کامران کا علاج کراؤں گا۔"

"کہاں؟" شمع نے بے اختیار سوال کیا۔ "کیا لاہور میں کوئی بندوبست کر آئے ہو بیٹا؟"

میری اور غزالہ کی نگاہیں چار ہوئیں پھر ندامت کے بوجھ سے میرا سر جھک گیا۔ شمع کی آواز میں اُمید اور التجا رچی ہوئی تھی۔

"لاہور نہیں، یہیں کراچی میں علاج ہوگا کامران کا۔"

میں نے آہستگی سے کہا۔

"علاج کے دعویدار تو بہتیرے ہیں اس شہر میں مگر میری رسائی ٹھگوں سے آگے نہ ہو سکی۔" کرنل زوار زیدی نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "مریض کا علاج مرض نہیں، جیب دیکھ کر کیا جاتا ہے... تم نے کس سے رجوع کیا ہے یہاں؟"

"شہر میں ایڈکشن کیور سوسائٹی کے نام سے انسدادِ منشیات کا ایک ادارہ کام کر رہا ہے...." میں نے تمہید شروع کی لیکن غزالہ کے باپ نے سوسائٹی کا نام سنتے ہی میری بات کاٹ دی۔

"اوہ.... اس سوسائٹی کا نام نہ لو، میں ان کے چکر میں بھی پھنس چکا ہوں۔ شاندار دفتر لیے بیٹھے ہیں، مفت سماجی خدمات کے نام پہ بھاری سرکاری گرانٹ حاصل کر کے سوسائٹی کے بانی اور چیئرمین نے اپنے کاروبار کو خوب وسعت دے لی ہے۔ شاید محسن نام ہے اس فراڈ کا... میں کئی بار اس سے مل چکا ہوں۔ چندہ دے کر ادارے کا رکن بھی بن چکا ہوں۔ ایک خیراتی ادارے میں کامران کو دو مرتبہ بھیجا تھا، دونوں مرتبہ ناقابلِ عمل کاغذی علاج تجویز کر کے لوٹا دیا...."

"مگر میں...." میں نے اس کی بات کاٹنی چاہی لیکن اس نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔

"پہلے میری پوری بات سن لو، پھر اپنی کہنا۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "کامران کے بارے میں میری بے چینی بھانپ کر محسن نے مجھے اکبر سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا، معلوم ہے اس نے کیا فیس طلب کی تھی؟ دس ہزار روپے اور وہ بھی پیشگی۔ شاید میں اس جال میں پھنس بھی جاتا لیکن مجھے بر وقت پتا چل گیا کہ اکبر سائیکاٹرسٹ ہونے کے ساتھ محسن کا داماد بھی ہے تو میرا دل اس کی طرف سے کھٹا ہو گیا، وہ سوسائٹی تو اب اکبر کے لیے بڑے گھرانوں کی موٹی آسامیاں پھانسنے کا اڈہ بن کر رہ گئی ہے۔"

اس بار میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ کرنل زوار زیدی بھرپور تجربے سے گزر چکا تھا اور محسن کے داماد کی اصلیت دیکھ چکا تھا جب کہ میں خود بھی کامران کو اسی کے پاس لے جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"تم کیا کہہ رہے تھے بیٹے؟" غزالہ کی ماں نے مجھے خاموش پا کر پُرامید لہجے میں ٹوکا۔

"اکبر لالچی ضرور ہے مگر میں نے اس کی تعریف سنی ہے۔" میں نے اپنی بات بنانے کے لیے کھلا جھوٹ بولا۔

"ہمارے میاں کیا کرتے پھرتے ہیں، ہمیں تو کچھ پتا نہیں چلتا، اگر وہ اچھا معالج ہے تو دس ہزار کی یہ قربانی بھی سہی، اتنی رقم تو میرے ایک آدھ زیور کی فروخت سے حاصل ہو سکتی ہے۔"

"پھر وہی بکواس!" میرے احتجاج کرنے سے پیشتر کرنل بھڑک اٹھا۔ "میں اپنی پنشن بیچ کر بھی رقم پیدا کر سکتا ہوں۔ زیور کا نام کیسے لیا تم نے؟ نجانے یہ زیور کا نام ہر وقت تمہاری زبان کی نوک پر کیوں دھرا رہتا ہے؟"

شمع سہم گئی۔ اس کے زردی مائل سفید چہرے سے رہی سہی سُرخی بھی کافور ہو گئی اور اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نظر آنے لگے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت اگر اسے ذرا سا سہارا نہ دیا گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گی۔

"زیور عورت کو سب سے عزیز ہوتا ہے۔" میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے صورتحال کی سنگینی کو ختم کرنے کی نیت سے کہا۔ "امی بھی عورت ہی ہیں لیکن آپ اپنی پنشن کو کیوں لے بیٹھے۔"

"شمع جب زیور کا نام لیتی ہے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ مجھے میری، قلیل سی آمدنی کا احساس دلا رہی ہو، اس کی یہ بات مجھے گالی محسوس ہوتی ہے۔" کرنل بدستور غصیلے لہجے میں بولا۔

"زیور عزیز ہوتا ہے مگر اولاد عزیز تر ہوتی ہے۔" شمع میری مداخلت سے حوصلہ پا کر اپنے خشک ہوتے ہوئے لبوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے بولی۔ "میں عمر کی اس منزل پر ہوں جہاں زیور اور آرائش کی ضرورت نہیں رہتی پھر میں دھیمے دھیمے اس آگ کا ایندھن بھی بنتی جا رہی ہوں جو میں نے خود ہی لگائی تھی۔" اس کے لہجے میں ٹوٹ کر اُداسی اُمڈ آئی۔ "کچھ پتا نہیں کہ زندگی کے کتنے سانس باقی رہ گئے ہیں مجھے تو بس اتنی سی تمنا ہے کہ اپنی زندگی میں کامران کو ہوش و حواس میں دیکھ لوں۔ ایک بار وہ امی کہہ کر مجھ سے لپٹ جائے تو مجھے قرار آ جائے گا۔ رہی غزالہ، تو اب مجھے اس کی طرف سے بے فکری ہے....!"

"بس بس۔" کرنل اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے کے باوجود لہجے کی ترشی پر قابو نہ پا سکا۔ "زیادہ لمبی چوڑی تقریر کی ضرورت نہیں..... ابھی پھر سے بے ہوش ہو جاؤ گی اور سیوا مجھ ہی کو کرنی پڑے گی۔"

ان دونوں کے درمیان مصالحانہ فضا پیدا ہوتے دیکھ کر میں پلٹا تو غزالہ وہاں سے غائب تھی، میں بھی خاموشی کے ساتھ باہر کھسک گیا۔ برآمدے میں پہنچتے ہی غزالہ نظر آ گئی۔ وہ لان کے ایک دُور افتادہ گوشے میں بیٹھی گلاب کی کیاریوں میں کچھ کرید رہی تھی۔ میں برآمدے سے اُتر کر سیدھا اسی کی طرف ہو لیا۔

مجھے دیکھتے ہی غزالہ خجالت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلے گئے آپ؟ جھگڑا؟"

"ایسی چھوٹی موٹی جھڑپیں ازدواجی زندگی میں دلچسپی کو برقرار رکھتی ہیں؟" میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ "سب کچھ مرضی کے مطابق پُرسکون انداز میں ہوتا چلا جائے تو دونوں فریق زندگی کی یکسانیت سے اکتا جاتے ہیں۔"

"کیا اکبر واقعی اچھا سائیکاٹرسٹ ہے؟" اس نے اپنی غزالی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز کر کے پوچھا جیسے اسے میری غیر متوقع قلابازی پر یقین نہ رہا ہو۔

"تمہیں شبہ کیوں ہے اس میں؟" میں نے سنجیدگی کے ساتھ جوابی سوال کر ڈالا۔ مجھے اندازہ تھا کہ کامران کی بیماری اس گھرانے کے لیے حساس ترین موضوع تھا اور میں اس بارے میں اپنے خلوص کو شبہات میں ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا۔ "لالچ ایک الگ چیز ہے، اس کا پیشہ ورانہ مہارت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں آپ۔" وہ دھیمے سے بولی۔ "آج کل تو جس کے ہاتھ میں خدا نے ذرا بھی شفا دی ہے، لالچ کا شکار ہو گیا ہے۔ نفع بخش کارخانوں اور ہوٹلوں کے بجائے دھڑا دھڑ فور اور فائیو اسٹار اسپتال کھلتے جا رہے ہیں...."

"ان میں بے لوث معالج بھی ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مستحق مریضوں کو ادویات تک خود فراہم کرتے ہیں بات بس اتنی ہے کہ جو بے غرض ہیں وہ اپنی تشہیر پسند نہیں کرتے اور حرص کے ماروں کی کہانیاں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔"

"خیر جو آپ بہتر سمجھیں کریں۔ اب تو وہ مجھ سے زیادہ آپ کا بھائی ہے۔"

"اوں ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے تردید کی۔ "ان رشتوں میں ہیر پھیر ممکن نہیں، ہونے والا سالا بھائیوں سے زیادہ عزیز ہو سکتا ہے مگر بھائی ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

وہ بوکھلا کر دوبارہ گلاب کے پودوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کی یہی ادا مجھے پسند تھی۔ روشن خیال اور تعلیمیافتہ ہونے کے باوجود اندر سے وہ ایک خالص مشرقی لڑکی تھی جس کے خمیر میں حیا کا عنصر بہت بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

"پھولوں سے کھیل رہی ہو یا کانٹوں سے الجھ رہی ہو؟" میں نے ایک قدم بڑھ کر سوال کیا۔

"دانستہ کوئی کانٹوں سے نہیں الجھتا۔" وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔ "نگاہیں پھول کی نرم و نازک پتیوں سے فریب کھاتی ہیں۔ چبھن ہوتی ہے تو اچانک ہی کانٹوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔" پھر اس نے یک بیک موضوع بدل دیا۔ "لاہور سے واپسی کے بعد یہاں کی صورت حال نہیں بتائی آپ نے۔"

"صورت حال سنگین ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے جیب سے تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"یہ... یہ کہاں سے آئی آپ کے پاس؟" اس نے تحیّر زدہ لہجے میں سوال کیا کیونکہ جیتے جاگتے رومانس میں میں نے کبھی اس سے کوئی تصویر لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

"یہ تصویر غالباً ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے دفتر میں لی گئی تھی۔ مجھے سخت ہدایات کے تحت موصول ہوئی ہے اور ہر قیمت پر کراچی میں تمہارا سراغ لگانا ہے۔"

"اوہو" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آج کل ستارے کچھ زیادہ ہی اچھے جا رہے ہیں، میری تلاش کا کام آپ ہی کو سونپا گیا ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہوا؟"

"شہر سے میری غیر حاضری کو بُری طرح محسوس کیا گیا، پورا کھیل ہی بگڑتا نظر آ رہا تھا، میں نے اپنی غیر حاضری کے جواز میں ایک کہانی تراشی جو قبول کر لی گئی۔" یہ کہہ کر میں اسے مختصر الفاظ میں گزرے ہوئے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔

"یہ تو بڑا اہم موڑ ثابت ہوا ہے۔" میرے خاموش ہونے پر وہ مسرت آمیز لہجے میں بولی۔ "ایک طرف آپ اے ٹو کی نگاہوں میں اپنا مقام پیدا کر رہے ہیں، دوسری طرف تنظیم کے اندر کے لوگ آپ کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اب جلد ہی یہ سارا گورکھ دھندا بکھر کر رہ جائے گا۔"

"اس قدر خوش فہمی بھی اچھی نہیں، جو کچھ ہو رہا ہے، نہ ہونے سے بہتر ہے لیکن اے ٹو کی ذات اپنی جگہ محفوظ ہے، اتنی جدوجہد کے بعد بھی اس کے بارے میں کوئی ہلکا سا سراغ بھی نہیں مل سکا ہے دوسری طرف وہ اس قدر مستعد اور چوکنا ہے کہ کسی قسم کا کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"اس کے لیے سب سے بڑا خطرہ تو یہ ہے کہ وہ ابھی تک آپ پر اندھا دھند اعتماد کیے جا رہا ہے۔"

"حالات کی مہربانی ہے، قاسم کے بارے میں اس کے رویے سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اپنے خاص آدمیوں کے بارے میں وہ ذرا فکر مند ہو گیا ہے۔ اس نے قاسم کے خلاف کوئی سخت فیصلہ صادر کرنے کے بجائے اس پر نگاہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ شاید وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ اگر خود ہی شکوک و شبہات کی بنا پر اپنے آدمیوں کو مرواتا رہا تو جلد ہی بالکل اکیلا رہ جائے گا اور اس کا نظام بگڑ جائے گا۔"

"یعنی اس کی سنگدلی اور سفاکی میں کمی آ گئی ہے؟"

"یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "مسز مراد معمولی مہرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن اے ٹو نے اس کی گرفتاری

کو اپنے حق میں مضر سمجھتے ہوئے پولیس کی تحویل میں مروا دیا۔"

"مروا دیا!" وہ حیرت اور بے یقینی کے عالم میں تقریباً چیخ پڑی۔ "یہ کب کا قصہ ہے؟"

"آج اُجالا.... ہونے سے پہلے وہ اسپتال میں ختم کر دی گئی۔" میں نے بتایا۔ شاید غزالہ کے گھر وہ اہم اخبار نہیں آتا تھا، جس میں مسز مراد کی موت کی خبر شائع ہوئی تھی۔ "اس کے قتل کے بارے میں ہدایت میرے ہی ذریعے قاسم تک پہنچی تھی، اس نے اطلاع ملتے ہی اپنا کام دکھا دیا۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر وہیں بیٹھ گئی۔ "یقین نہیں آتا.... انسانی لہو کی اتنی ارزانی میری سمجھ سے باہر ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے کسی بدترین ذہنی مرض میں مبتلا ہے ورنہ ذرا ذرا سی بات پر یوں خونریز فیصلے نہ کرتا۔ کسی صحیح الدماغ آدمی کے لیے تو ایک خون کا بوجھ بھی ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔"

"وہ جنونی ہے، اسی لیے تم کو محتاط رہنا ہوگا۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

"مجھے؟ کیوں؟ میرا اس سے کیا تعلق؟" اس نے بڑی بڑی وحشت زدہ نگاہیں میری طرف اٹھا کر سوال کیا۔

"بدقسمتی سے تعلق پیدا ہو گیا ہے، نصیر خان کے دفتر میں لی جانے والی تصویر کو تمہیں ہر لمحے ذہن میں رکھنا ہوگا ورنہ ناقابلِ تصور پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں...."

"مگر وہ تصویر تو آپ کے حوالے کی گئی ہے اور میں لاہور جانے سے رہی۔"

"تصویر میرے پاس ضرور ہے لیکن یہ نہ بھولو کہ بدلتے ہوئے حالات میں مشتبہ لڑکی اس کے لیے بے پناہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تصویر لے کر اس کا کوئی خاص آدمی براہِ راست یہاں پہنچ جائے اور اپنے طور پر تمہاری تلاش کی متوازی مہم شروع کر دے.... اس سے بھی بڑا خطرہ اس تصویر کی طرف سے ہے جو مسز مراد کے مقتول ساتھی کے پاس تھی۔ اس کے قتل کی خبروں میں کہیں بھی اس کے پاس سے کسی تصویر کی برآمدگی کا ذکر نہیں ہے...."

"واقعی یہ تشویش کی بات ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی "وہ کسی کے بھی ہاتھ لگ سکتی ہے، پولیس والے بھی اس کا ذکر گول کر سکتے ہیں، ایسا ہوا تو تصویر کے حوالے سے کسی بھی وقت کوئی اسکینڈل جنم لے سکتا ہے۔"

"بس میں یہی جتانا چاہ رہا تھا.... تم سختی سے گھر میں محدود رہو گی، کوئی یقینی صورت حال سامنے آنے تک یہ احتیاط کرنی ہی پڑے گی۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت مشکل ہوگا۔" وہ تشویش زدہ لہجے میں بڑبڑائی۔ "کامران کے ناکارہ ہونے کی وجہ سے گھر کے بہتیرے کاموں کا انحصار مجھ پر ہے.... ایسی خانہ نشینی سے تو امی بھی پریشان ہو جائیں گی۔"

"کاموں کے لیے ملازم رکھ لو، گھر سے کسی ضرورت کے تحت نکلنا ہی پڑے تو برقع استعمال کرنا۔"

"یہ اور بھی مشکل ہوگا۔" وہ بولی۔ "برقع تو شبہات کو اور بھی ہوا دے گا۔" وہ چند ثانیوں خاموشی کے ساتھ سوچتی رہی پھر بولی۔ "کیوں نہ میں بال ترشوا لوں...."

"کیا یہ آسان ہوگا؟"

"بہت زیادہ۔ بلکہ یہی صورت قابلِ عمل ہو سکتی ہے۔ صرف امی سے ذرا سا جھوٹ بولنا ہوگا کہ آپ کو ترشے ہوئے بال پسند ہیں، وہ آپ کا بہت احترام کرتی ہیں، فوراً اجازت مل جائے گی۔"

"پھر ایسا ہی کر لو کٹے ہوئے بالوں اور عینک سے چہرہ بڑی حد تک بدل جائے گا... لیکن اس کے باوجود بھی تم گھر سے کم ہی باہر نکلو گی۔"

اسی وقت کرنل زوار زیدی مجھے آوازیں دیتا برآمدے سے نکل آیا اور میں غزالہ کو وہیں چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

"کہاں تھے تم؟ میں سارے کمروں میں تلاش کر کے آ رہا ہوں" مجھے دیکھتے ہی اس نے بزرگانہ شان سے پھٹکارا۔

"کامران کے بارے میں سوچ رہا تھا، آج ہی اکبر سے ملتا ہوں" میں نے خفت کے ساتھ کہا۔

"میں تمہیں روکتا نہیں لیکن میرا دل اس پر مائل نہیں۔"

میں کچھ دیر کے لیے اس کے پاس بیٹھا لاہور کے بارے میں مفروضہ مصروفیات کے قصے سناتا رہا پھر بات گھما پھرا کر اسے بھی اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی میرا خیال تھا کہ وہ اکبر سے مل چکا تھا۔ لہٰذا مجھے براہِ راست اس تک لے جا سکتا تھا تنہا جانے کی صورت میں مجھے اڈکشن کیور سوسائٹی کے سیکریٹری، نسیم سے رجوع کرنا پڑتا۔ لیکن کرنل زوار زیدی سختی کے ساتھ اپنے انکار پر اڑا رہا اور میں وہاں سے اُٹھ گیا۔

وہاں سے روانہ ہو کر میں محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی کے اس بنگلے پر پہنچا جس کے بیرونی کمروں میں سوسائٹی کا شاندار دفتر قائم تھا اور اندرونی حصہ رہائشی استعمال میں تھا۔ دفتر کے باہر وہی چپراسی ملازم بیٹھا اونگھ رہا تھا جسے میں پہلی بار چپراسی نوشی

پہ ڈانٹ چکا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا اور سلام کرنے کے ساتھ ہی رازدارانہ لہجے میں انکشاف کیا کہ وہ چرس نوشی کی عادتِ بد ترک کر چکا تھا۔ لیکن اس کی جھنجھیاتی ہوئی سرخ آنکھیں اس کے کھلے جھوٹ کی چغلی کھا رہی تھیں۔

"نسیم صاحب موجود ہیں؟" میں نے اس سے رسماً دریافت کیا۔

"جی صاحب۔ آج تو محسن صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔" اس نے خوشامدانہ انداز میں دانت نکال کر کہا۔

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وسیع ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں گھستے ہی میرے نتھنوں میں کیوبا کے بیش قیمت سگار کی خوشبو در آئی، دروازہ بے آواز تھا، دبیز فرشی قالین کے سبب قدموں کی چاپ بھی نہیں پیدا ہوتی تھی۔ لیکن دفتر کے خوابناک ماحول میں کھلے ہوئے دروازے سے پڑنے والی تیز روشنی نے ان تینوں کو میری طرف متوجہ کر دیا تھا۔ دروازہ بند ہوا تو اندر پھر وہی دھیمی دھیمی سی روشنی باقی رہ گئی، جو کھڑکیوں پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کے باعث رات کا سماں پیدا کر رہی تھی۔

چند قدم بڑھنے کے بعد میری نگاہیں اس ناکافی روشنی کی عادی ہوئیں تو میں بے اختیار چونک پڑا۔

ایڈکشن کیور سوسائٹی کا سیکریٹری اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری بڑی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر میں ایک لحیم شحیم اور گورا چٹا شخص دانتوں میں سگار دباتے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز کی دوسری جانب قاسم براجمان تھا۔ مجھے وہاں دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار نظر آئے تھے لیکن اس نے مجھے مخاطب کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

میں اپنی حیرت پر قابو پا کر، بظاہر قاسم کو نظر انداز کرتا ہوا نسیم کی میز کی طرف بڑھ گیا۔

"آئیے آئیے، تنویر صاحب، کیسے مزاج ہیں؟" نسیم نے کرسی سے اٹھ کر تپاک لہجے میں میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ غالباً میرا نقد عطیہ اس کے لیے خاصا غیر متوقع رہا تھا اور اسی وجہ سے اسے میرا نام یاد رہ گیا تھا۔

اس سے ہاتھ ملا کر بیٹھتے ہوئے میں نے پلٹ کر سرسری انداز میں دوسری بڑی میز پر نگاہ ڈالی تو قاسم کہنیوں کے بل میز پر جھکا دوسرے آدمی سے دھیمے لہجے میں باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ نسیم کے مقابل بیٹھنے کے بعد میرے لیے گھوم کر ان دونوں کی طرف دیکھنا مشکل تھا لہٰذا میں نسیم سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

"یہ دوسرے صاحب کون ہیں؟" رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد میں نے نسیم سے سوال کیا۔

"ارے یہی تو محسن صاحب ہیں۔" اس نے گویا میری کم علمی پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا "سوسائٹی کے بانی اور چیئرمین۔"

"وہ تو میں نے اندازہ لگا لیا تھا۔" میں نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں ان کے ملاقاتی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"وہ محسن صاحب کے دوست اور سوسائٹی کے قابلِ قدر سرپرست قاسم صاحب ہیں....!"

اس کی زبان سے قاسم کا اصل نام سن کر میں نے مضحکانہ لہجے میں اس کی بات کاٹ دی "صورت سے تو چھٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔" یہ تبصرہ کرتے ہوئے میں نے دھیمی آواز کر لی تھی۔

"ان کی صورت پر نہ جائیے۔" نسیم نے بھی آواز مدھم ہی رکھی۔ "بڑا دردمند دل پایا ہے انہوں نے۔ مستقل عطیات دیتے رہتے ہیں، کوئی اچانک ضرورت پیش آ جائے تو اس سے بھی منہ نہیں موڑتے۔"

"آپ کے بھی بڑے بے نام مہربان پائے جاتے ہیں اس شہر میں، یہ کوئی معروف شخصیت تو نہیں معلوم ہوتے۔" میں نے اسے اکسانے کے انداز میں کہا۔ دراصل میں اس سے یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ قاسم جیسا وحشی اور خونی انسان ایڈکشن کیور سوسائٹی میں کس حیثیت سے پہچانا جاتا تھا؟

"نہیں صاحب، خاصے باحیثیت آدمی ہیں۔" نسیم میری توقع کے مطابق اچھٹ کر بولا "بہت بڑا برآمدی کاروبار ہے ان کا۔ لاہور میں واقع ایشین سنڈیکیٹ نامی فرم کے مالک یا پارٹنر ہیں۔ کراچی میں بھی دفتر ہے۔"

اس کے انکشافات پر میری کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایشین سنڈیکیٹ کا نام قاسم کے لیے مانوس ہو گا مگر نسیم دوسری ہی کہانی سنا رہا تھا۔

پھر میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور میں بے اختیار پھریری لے کر رہ گیا۔ قاسم بظاہر کراچی میں تنظیم کے مفادات کا پس پردہ نگران تھا اور اپنے کام کی انجام دہی کے سلسلے میں اس کے ہاتھ کئی انسانوں کے خون سے آلودہ تھے۔ یہ درست تھا کہ وہ ہمیشہ ہی بہت زیادہ محتاط رہتا تھا۔ اور کبھی بھی کسی واردات کے سلسلے میں اس کا نام مشتبہ افراد کی فہرست میں نہیں آ سکا تھا لیکن پھر بھی وہ ہر وقت قانون کی گرفت کے خطرے سے دوچار تھا۔ کسی بھی معاملے میں ذرا سی لغزش اسے براہِ راست ہتھکڑیاں لگوا سکتی تھی جبکہ اسے تو اس قسم کے لوگوں سے فاصلہ برقرار رکھنے کا قائل تھا لیکن قاسم کے معاملے میں صورتحال مختلف نظر آ رہی تھی ایک طرف وہ قتل و خونریزی سے ہیروئن کی ترسیل تک عملی کاموں میں

پوری طرح ملوث تھا اور دوسری طرف اسے ایشین سنڈیکیٹ جیسے اہم ادارے کے حوالے سے اپنا تعارف کرانے کی چھوٹ ملی ہوئی تھی جس کی نیک نامی پر حرف آنے کے خوف سے اسے ڈون نے مسز مراد کو ٹھکانے لگوا دیا تھا۔ اس کے علاوہ رخشی کے معاملے میں بھی اسے ڈون کا رویہ ناقابلِ فہم تھا۔ ایک طرف یہ عالم کہ جس کسی پر ذرا سا شبہ بھی ہو جائے تو اس کے خلاف سزا کا فیصلہ صادر کر دیا جائے لیکن جب میں نے اسے رخشی کے معاملے میں قاسم کی بدنیتی سے آگاہ کیا تو اس نے قاسم کو اہم آدمی قرار دیتے ہوئے اسے اس حد تک ڈھیل دینے کا فیصلہ کر لیا کہ بعض کام بھی اسی کے ذریعے انجام دیتا رہا۔

مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ میں نہ سمجھ بیٹھا۔ قاسم بذاتِ خود ہی تنظیم کا سرغنہ نہ ہو اور اس نے پورے حالات سے بے نیاز رہنے کے لیے بظاہر نچلے درجے کی رکنیت اختیار کی ہوئی ہو۔ اپنی ذات کو شبہات سے بالاتر رکھنے کے لیے وہ اپنے کسی بھی قابلِ اعتماد تنخواہ دار کو اپنے ڈون کا نام دے کر لاہور میں بٹھا سکتا تھا جبکہ تمام تر اختیارات اور قوت کا سرچشمہ وہ خود ہی تھا۔

اس نظریے میں بس ایک ہی جھول تھا کہ اپنی منصوبہ بندی اور طریقۂ کار کی بنا پر اسے ڈون بہت اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ اور قاسم ان خوبیوں سے محروم نظر آتا تھا۔

اگر قاسم خود ہی تنظیم کا سرغنہ تھا تو وہ میرے ساتھ کوئی بھیانک کھیل کھیل رہا تھا۔ بظاہر میری کراچی سے غیر حاضری کے جواز کو قبول کر چکا تھا مگر ساتھ ہی رخشی کے ذریعے مجھے تنظیم سے غداری پر اکسا رہا تھا۔ رخشی براہِ راست تو مجھ پر تسلط قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی لیکن نئے تناظر کی روشنی میں وہ اپنا وہی کردار بخوبی سرانجام دے رہی تھی۔ شاید قاسم میری طرف سے شبہات کا شکار ہو چکا تھا۔ اور مختلف حربوں کے ذریعے میری نیت کا کھوج لگانے پر تل گیا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب مجھے قاسم سے ضرورت سے زیادہ محتاط رہنا ہو گا کیونکہ مجھ سے سرد جنگ کے دوران وہ میری تخریبی کارروائیوں کی صلاحیت کا بخوبی اندازہ کر چکا تھا اور مجھ پر جرم دار کرتا، اس کی منصوبہ بندی میں ایسے امکانی پہلوؤں کو ہرگز نظر انداز نہ کرتا۔

لیکن ایڈکشن کیور سوسائٹی سے اس کا کیا تعلق تھا؟ وہ پس منظر میں رہ کر کام کرنے والا آدمی تھا۔ تنظیم کے معاملات میں اسے عام روابط یا اپنی نیک نامی کی تشہیر کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی پھر وہ اس ادارے کے لیے خطیر رقم کیوں برباد کر رہا تھا؟ میرے اس سوال کا جواب صرف محسن ہی دے سکتا تھا۔

"خیر ہوں گے کوئی تیس مار خان۔" میں نے اکتاتے ہوئے لہجے میں نسیم سے کہا۔ "میں تو ایک ضروری کام سے آیا تھا۔ اگر محسن صاحب کے پاس وقت ہو تو ذرا ان سے گفتگو کرنی چاہوں گا۔"

"بالکل تشریف لے جائیے۔" اس نے سراپا اخلاق بن کر کہا۔ میں نے سر گھمایا تو قاسم کا کہیں پتا نہیں تھا اور محسن میز پر رکھے ہوئے کاغذات کے مطالعے میں مصروف تھا۔ دھواں اگلتا ہوا سگار اس کے دہانے میں یوں دبا ہوا تھا جیسے وہ پیدائشی طور پر وہیں نصب رہا ہو۔ نسیم نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے محسن سے موزوں الفاظ میں میرا تعارف کرایا اور میں نے محسن کے ایما پر وہی کرسی سنبھال لی جس پر چند ثانیوں قبل قاسم براجمان تھا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" محسن نے دانتوں سے سگار نکالتے ہوئے کہا۔ اس کی انگلیوں میں تین عدد بیش قیمت انگوٹھیاں جھلملا رہی تھیں۔ "نسیم نے مجھے بتایا تھا کہ آپ سوسائٹی کے پروگرام میں خاصی دلچسپی لے رہے ہیں، غالباً لیاری میں ہونے والے مجوزہ سروے میں بھی آپ شریک ہونا چاہتے ہیں۔"

"یقیناً۔" میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "مگر فی الوقت میں ایک مشورے کے لیے حاضر ہوا تھا۔"

"حکم۔" وہ سگار ایش ٹرے میں رکھ کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"میرے ایک واقف کار کا نوجوان بچہ کسی نشے کے ہاتھوں ذہنی توازن برباد کر بیٹھا ہے۔ اس کے علاج کے لیے میں آپ کے مشورے کا طالب ہوں۔ عزت دار گھرانا ہے، بدنامی سے بھی ڈرتے ہیں اور بچے کا علاج بھی کرانا چاہتے ہیں۔"

"منشیات کی وبا کی لہر آبادی کے نچلے طبقوں میں زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔" وہ پرخیال انداز میں کہنے لگا۔ "اور سوسائٹی کے سارے پروگرام آبادی کے ان ہی طبقات کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ شاید سوسائٹی کے مراکز آپ کو پسند نہ آئیں۔ وہاں بھانت بھانت کے جاہل لوگ آتے ہیں اور اپنے مریضوں کے لیے اودھم برپا کیے رہتے ہیں، میری رائے میں اگر آپ اپنے مریض کا علاج نجی طور پر کرائیں تو زیادہ بہتر رہے گا، بعض اداروں کی کارکردگی سے میں خود مطمئن ہوں۔"

"میں نے اکبر نامی کسی صاحب کی تعریف سنی ہے۔" میں نے انجان بن کر کہا۔

"درست سنی ہے۔" وہ جلدی سے بولا "معزز اور خوشحال گھرانوں کو میں خود وہیں جانے کا مشورہ دیتا ہوں۔ اس کلینک میں سائنٹیفک طریقوں سے اڈکشن کا علاج کیا جاتا ہے۔۔۔"

"لیکن میرے مریض کا مسئلہ اڈکشن نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر تصحیح کی۔ "وہ کوئی نشہ نہیں کرتا۔ اس کا ذہنی توازن اس قدر خراب ہو چکا ہے کہ اسے کسی چیز کا ہوش ہی نہیں رہا۔"

"آپ اکبر سے مل لیں"۔ اس نے اپنی میز کی دراز سے اکبر کے کلینک کا کارڈ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں اسے فون کیے دیتا ہوں، آپ کے آدمی کو وہاں وی آئی پی کی حیثیت دی جائے گی۔"

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے نمبر ملا کر فون پر اکبر سے گفتگو شروع کر دی اور اسی دوران میں شام کے لیے وقت بھی مقرر کر دیا۔ اس نے پوری گفتگو میں کہیں بھی اپنے اور اکبر کے رشتے کا اظہار نہیں کیا تھا، میں نے بھی اس دکھتی رگ کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور وہاں سے اُٹھ گیا۔

کامران کو اسی شام میں نے کیور کلب میں داخل کرا دیا۔ وہاں کا ماحول پُرسکون، صاف ستھرا اور متاثر کن تھا۔ خرابی بس ایک ہی تھی کہ وہاں کے اخراجات بہت ہی ہوشربا تھے۔ اکبر تقریباً پون گھنٹے تک ایک مخصوص کمرے میں کامران کے ساتھ بند رہا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اس نے اپنے تجزیے کے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ کامران کی حالت نارمل ہونے کے قوی امکانات موجود ہیں لیکن نفسیاتی علاج کا مرحلہ بہت صبر آزما تھا۔ نتائج برآمد ہونے میں تین چار مہینوں کی نوبت بھی آ سکتی تھی جب میں نے اخراجات کا تخمینہ دریافت کیا تو اس نے یومیہ اخراجات کی سرسری تفصیل سنا ڈالی جس کے مطابق تین چار مہینوں میں تیس سے چالیس ہزار روپے تک خرچ ہونے کا امکان تھا۔ اس مرحلے پر میں نے اسے یاد دلایا کہ وہ مریض کے باپ کو دس ہزار روپے کا تخمینہ دے چکا تھا تو اس نے یہ کہہ کر مجھے لاجواب کر دیا کہ وہ مریضوں کا علاج کرتا ہے ٹھیکیداری نہیں کرتا۔ اگر اس نے کرنل زوار زیدی سے ایسی کوئی بات کی ہو گی تو وہ مریض کے تفصیلی معائنے سے پہلے محض اندازے کی بنا پر کی ہو گی جس کا حوالہ دینا بھی مناسب نہیں تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ کیور کلب کے خزانچی کے پاس دس ہزار روپے پیشگی جمع کرا کے لوٹ آیا۔ اس علاج گاہ کی سہ منزلہ عمارت کے تمام کمرے ائیر کنڈیشنڈ اور آرام دہ تھے جہاں بہرے کی حد تک مریضوں کی پرائیویسی کی نگہداشت کی جاتی تھی۔

کامران کو میں تنہا ہی لے کر آیا تھا۔ غزالہ کے ساتھ حفاظت کی مجبوری تھی، اس کی ماں مستقل روگی تھی اور باپ اکبر سے متنفر تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ میں اکبر سے ملاقات کے بعد کامران کو واپس گھر لے آؤں گا۔

اسپتال کے ایک معاون کے ہمراہ کامران کو لفٹ کے ذریعہ تیسری منزل پر اس کے کمرے میں پہنچا کر میں واپس روانہ ہو گیا۔ راستے میں میں غزالہ کے گھر ٹھہرا تو وہاں ماحول پر سوگوار سی اُداسی طاری تھی۔ گو کامران اس گھر میں ایک اجنبی کی طرح بوجھ بن کر رہ رہا تھا اور گھر والوں پر اس کی دیکھ بھال کی صورت میں ناگوار ذمہ داری بھی عائد تھی لیکن بہرحال تکنیکی طور پر وہ اس گھر کا رکن تھا لہٰذا اس چھت کے نیچے اس دیوانے کی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔

"کیا رائے ہے ڈاکٹر کی؟" شمع نے مجھے دیکھتے ہی دردمندانہ لہجے میں سوال کیا تھا۔

"کامران کا مرض قابلِ علاج ہے لیکن نتائج برآمد ہونے میں کافی وقت لگ سکتا ہے"۔ میں نے کہا۔

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو، مجھے تو یہ سب بکواس ہی معلوم ہوتی ہے"۔ کرنل زوار زیدی نے تلخ لہجے میں تبصرہ کیا۔ "مریض کی صحت یابی کی اُمید دلائے بغیر وہ ایک دھیلا بھی وصول نہیں کر سکتا، جس دن اس نے اندازہ لگا لیا کہ کامران کے علاج کے اخراجات ہماری برداشت سے باہر ہو گئے ہیں، اسی دن وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہماری اُمیدوں پر پانی پھیر دے گا۔"

"جس دن اس کی بدنیتی کا کوئی ثبوت سامنے آیا اسی دن میں اس کی عزّت اُتار کر رکھ دوں گا"۔ میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "میں ذاتی تجربے کے بغیر مفروضات میں اُلجھنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"ان میں یہی خرابی ہے بیٹے"۔ شمع نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "انہیں اپنی پہچان پر بڑا ناز ہے، بس جس کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں، اسی پر اَڑ جاتے ہیں۔۔۔"

"اور آج تک میری کوئی رائے غلط ثابت نہیں ہوئی"۔ وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ "اب یہی دیکھ لو کہ میں نے تنویر کو نیک اور سعادت مند سمجھا تھا اور اس نے ابھی تک ہمیں مایوس نہیں کیا۔"

"غزالہ نظر نہیں آ رہی"۔ میں نے موضوع بدلنے کی نیّت سے چونک کر کہا۔

"وہ بے وقوف کامران کے کمرے میں گھسے روئے جا رہی ہے۔۔۔ جاؤ، شاید تم ہی اسے سمجھا سکو"۔ غزالہ کے باپ نے مجھے شہ دی اور میں بلا تامّل وہاں سے اُٹھ گیا۔

کامران کے کمرے کے دروازے پر میں رک گیا کیونکہ غزالہ اپنے فاترالعقل بھائی کے میلے بستر پر اس کے تکیے میں منہ چھپائے سسک سسک کر رو رہی تھی۔ رونے کے ساتھ اس کے بدن پر تشنج کی سی کیفیت بھی طاری تھی۔ جیسے وہ اس وقت شدید جذباتی ہیجان میں مبتلا ہو۔

"غزالہ!" میں نے آہستگی سے اُسے آواز دی اور وہ بوکھلا کر بستر سے اُٹھ گئی۔ اس کی بڑی بڑی، خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سُرخی رچی ہوئی تھی۔ بجانے وہ کتنی دیر سے اسی طرح روتے جا رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس نے جلدی جلدی اپنی آنکھیں خشک کیں پھر زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "کامران کہاں ہے؟" اس نے سوال کیا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

میں نے اسے کامران کے بارے میں تفصیلات بتانی شروع کیں اور ہم دونوں مکان کے عقبی حصّے سے نکل کر ٹہلتے ہوئے لان پر نکل آئے۔

کچھ دیر بعد جب اس کا موڈ بحال ہوا تو میں نے اس کے سامنے ایک پہیلی رکھ دی۔

"نہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکی"۔ اس نے حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"ایڈکشن کیور سوسائٹی کے دفتر میں ایک جانا پہچانا شخص دکھائی دیا تھا، نام پوچھو تو مان لوں گا"۔ میں نے مسکراتے ہوئے تھوڑی سی وضاحت کی۔

"جانا پوچھا"۔ اس نے آہستگی سے دُہرایا پھر مجھ سے سوال کیا "کیا میں بھی اس سے واقف ہوں؟"

"کم از کم نام سے واقف ہو۔"

"قاسم؟" اس نے بے یقینی کے ساتھ پوچھا اور میں اچھل پڑا۔

"اس کا نام کیسے آ گیا ذہن میں؟"

وہ مسکرا دی۔ "میرے اور آپ کے درمیان گنے چُنے نام ہی مشترک ہیں، محسن کا وہاں ملنا حیرت کا باعث نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ سوسائٹی کا کرتا دھرتا ہے، اس کے بعد دو نام ہی رہ گئے تھے، جہانگیر یا قاسم۔"

"شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو کہ کراچی میں بھی ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا دفتر موجود ہے اور سوسائٹی میں قاسم اس کاروباری ادارے کے شریک کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔"

"یہ تو عجیب ہی خبر سنائی آپ نے"۔ وہ بے اعتباری کے عالم میں بولی۔ "اس جیسے خونی اور قاتل کو اے ٹو نے اجازت کیسے دے دی کہ وہ ایشین سنڈیکیٹ کا نام استعمال کرتا پھرے؟"

"یہی اُلجھن تو مجھے بھی ہے"۔ میں نے اعتراف کیا۔ "ایک طرف اے ٹو کو ایشین سنڈیکیٹ کی نیک نامی اس قدر عزیز ہے کہ اس پر حرف آنے کے خوف سے اس نے مسز مراد کو اسپتال میں مروا دیا اور دوسری طرف قاسم کو کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے اس کا تو کام ہی ایسا ہے کہ وہ کسی وقت بھی پکڑا جا سکتا ہے۔"

"پھر ایڈکشن کیور سوسائٹی سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟"

"اللہ بہتر جانتا ہے۔۔۔ سیکرٹری کے بیان کے مطابق تو قاسم سوسائٹی کا سرپرست، فراخدلی کے ساتھ ان کی مالی اعانت کرتا رہتا ہے۔"

"راجہ سکندر علی کی طرح اس نے بھی دوسرا بہروپ رچایا ہوا ہے، بھیڑیے کے ساتھ بھیڑ بھی بنا ہوا ہے، لیکن اسے یہ ناٹک رچانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اسے تو پسِ پردہ رہ کر ہی اپنے فرائض انجام دینے ہوتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ کسی بُرے وقت کی پیش بندی کر رہا ہو۔۔۔ یا ہو سکتا ہے کہ تنظیم میں کسی اعلیٰ حیثیت کا حامل ہو اور محض حالات سے باخبر رہنے کے لیے نچلی سطح پر کام کرتا ہوا نظر آ رہا ہو۔"

"سیکرٹری بھی بے چارہ آلۂ کار معلوم ہوتا ہے، اصل بات تو محسن ہی کو معلوم ہو گی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ انسدادِ منشیات کے ادارے کی آڑ میں محسن بھی ہیروئن فروخت کرتا ہو؟"

"براہِ راست ملک سے باہر اسمگل کرتا ہو تو دوسری بات ہے ورنہ مقامی بازار کے لوگوں سے پوشیدہ رہنا ناممکنات میں سے ہے، پھر مال کی ترسیل اور تقسیم قاسم کی نہیں جہانگیر کی ذمہ داری ہے، یہ تو کوئی اور ہی چکر معلوم ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ قاسم کو اب گھیرنا ہی پڑے گا۔"

"کاش میں آپ کی مدد کر سکتی، لاہور جا کر تو میں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔"

"تمہاری یہی مدد کچھ کم نہیں ہے کہ نصیر خان ہمارے ساتھ مل گیا ہے اور ہم اے ٹو کے کچھ آدمیوں کی نشاندہی کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں، یہ اور بات ہے کہ ہم اپنے کسی بھی حربے سے اے ٹو کے اعتماد کو متزلزل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔"

وہ خاموش رہی اور میں سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ چند ثانیوں بعد اس نے بوجھل سی آواز میں سکوت توڑ دیا۔ "آپ نے اچھا کیا کہ کامران کو اسپتال میں داخل کرا دیا لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ میں اسے دیکھنے کے لیے آسانی سے نہ جا سکوں گی۔"

"آسانی یا مشکل کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔۔۔ فی الحال تم اُدھر کا رُخ بھی نہیں کرو گی۔"

"کیوں؟ برقع اوڑھ کر جانے میں کیا مضائقہ ہے؟"

"یہ اچھا ہی ہوا کہ ایڈکشن کیور سوسائٹی سے قاسم کا تعلق بروقت سامنے آ گیا۔ میں نے تو اس قدر احتیاط سے کام لیا ہے کہ اسپتال میں تمہارے گھر کا پتا بھی درج نہیں کرایا۔ کامران

کے مستقل رہائشی پتے کے طور پر اپنے مکان کے کوائف درج کراتے ہیں۔ تاکہ یہ گھر کسی بھی طرح قاسم کی نگاہوں میں نہ آسکے۔"

"آپ شاید قاسم کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔"

"سوسائٹی کے دفتر میں ہم دونوں نے براہِ راست ایک دوسرے کو دیکھا تھا لیکن اس کی لاتعلقی دیکھ کر میں بھی انجان بن گیا جس طرح مجھے اس کی وہاں موجودگی پر حیرت ہوئی تھی اسی طرح وہ بھی میری آمد کا سبب جاننا چاہے گا اس نے بعد میں یقیناً محسن یا نسیم سے رجوع کیا ہوگا اور میرے لاتے ہوئے مریض کی حیثیت سے کامران کی ذات اس کے لیے دلچسپی کا سبب بنی ہوگی۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "اسے وقتاً فوقتاً میرے ہاتھوں زک اٹھانی پڑی ہے اور وہ لامحالہ اس نئے حوالے سے میرے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہے گا۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے آدمیوں کو کامران کے ملاقاتیوں کی نگرانی پر بھی مامور کر سکتا ہے۔ وہ بہت خبیث آدمی ہے، تمہارے سامنے آتے ہی میری کمزوری بھانپ لے گا۔ اور ہمارے لیے نئی دشواریاں کھڑی کر دے گا۔"

"یعنی میں مہینوں کامران سے نہ مل سکوں گی؟" اس کی آواز میں مایوسی اُمڈ آئی۔

"ہو سکتا ہے کہ ہفتے عشرے میں حالات سازگار ہو جائیں۔" میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن فی الحال تمہیں خود پر قابو رکھنا ہوگا۔ . میں کامران کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا۔"

"حالات کا رُخ موڑنے کے لیے اب کیا سوچا ہے آپ نے؟" قدرے توقف کے بعد اس نے سوال کیا۔

"ذہن میں کچھ بکھرا بکھرا سا خاکہ موجود ہے تنہائی میں بیٹھ کر لائحہ عمل مرتب کرنے کی کوشش کروں گا۔ اب صبر کی انتہا ہو چلی ہے، اسے تو اُس کی ذات کو بے نقاب ہو جانا چاہیے۔"

وہ دھیمے سے ہنس پڑی۔ "آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے کسی مورتی کی نقاب کشائی کرنا ہو، وہ بہت شاطر آدمی معلوم ہوتا ہے اور اب تو وہ نامعلوم دشمنوں کی جانب سے چوکنا بھی ہو گیا ہے۔"

"وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہے۔ . . ہم جیسا ایک عام انسان ہے کہیں نہ کہیں اس سے لغزش ضرور ہوگی اور ہمیں اسی سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔"

"میں سمجھ رہی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ کو سوچنے کے لیے تنہائی کی ضرورت ہے اور تنہائی میں بوتل آپ کی رفیق ہوتی ہے۔ . . آخر آپ یہ عادت ترک کیوں نہیں کر دیتے؟"

"یہ توقع کیوں کرتی ہو کہ موت کی سوداگری کر کے بھی میں پُرسکون رہ سکوں گا۔ . . شاید یہی میری ہلکی پھلکی سی سزا ہے کہ ذہنی آسودگی کو ترسا ہوا ہوں۔ . . پیتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے ساری الجھنیں بھول جاتا ہوں۔ لیکن وہ وقت بھی جلد ہی آئے گا کہ مجھے ایسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

تھوڑی دیر بعد میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

راستے میں میرا ارادہ جہانگیر سے ملنے کا تھا لیکن سلطان شاہ کی وجہ سے میں نے وہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ خاصا زخمی تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ گھر پر اکیلا پڑے پڑے اکتا نہ گیا ہو۔ اس کی خبرگیری کے بعد بھی میں جہانگیر سے رجوع کر سکتا تھا کیونکہ ان دنوں وہ بیوی کے خوف سے آزاد بے فکری کے دن گزار رہا تھا۔

جہانگیر کے دل میں پروان چڑھنے والے باغیانہ خیالات سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ میرے اکسانے پر وہ کئی بار اس تنظیم سے اپنے تنفر کا اظہار کر چکا تھا لیکن ہر بار میں نے ایک حد تک پہنچنے کے بعد موضوع کو ٹال دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب اسے اعتماد میں لینے کا وقت آگیا تھا۔

ایک طرف قاسم تنظیم سے باغی ہو گیا تھا اور مقامی منڈی میں اپنے ٹو کے مالی مفادات کو زک پہنچا کر میرے ذریعے دولت بٹورنی چاہتا تھا، دوسری طرف جہانگیر بھی تنظیم کے گندے کاموں سے دست بردار ہو کر عزت کے ساتھ گمنامی کی زندگی گزارنے کا آرزومند تھا، میں اپنی خفیہ سرگرمیوں کے ذریعے اس کے ذہن میں نادیدہ دشمنوں کا ہوّا کھڑا کر چکا تھا لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ میں قاسم اور جہانگیر کو اپنے ساتھ ملا کر محاذ کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتا۔ مزے کی بات یہ ہوتی کہ میرے مفادات کے لیے کام کرتے ہوئے قاسم اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا کہ سارا گورکھ دھندا اسی کے اشارے پر چلایا گیا ہے۔

لیکن یہ سارے مفروضات اسی وقت درست ثابت ہوتے جب قاسم واقعی نچلے درجے کا آدمی ہوتا جب کہ اس کے بارے میں میرے ذہن میں ہولناک خدشات جنم لے چکے تھے، بعض اہم واقعات کی کڑیاں یکجا کرنے سے اس کی شخصیت پر تنظیم کے مقتدرِ اعلیٰ کا گمان ہوتا تھا۔

اپنے منصوبے کے مطابق کسی بھی پیش رفت سے پہلے میں اس بات کا یقین کرنا چاہتا تھا کہ قاسم میرے ساتھ کوئی گہری چال نہیں چل رہا تھا۔ ایک بار اس کی صحیح حیثیت کا تعین ہونے کے بعد معاملات آگے بڑھائے جا سکتے تھے یقین دہانی اور بازپرس کا یہ مرحلہ بھی میں جہانگیر کی موجودگی میں انجام دینا چاہتا تھا تاکہ آئندہ کے لیے میرے اور اس کے درمیان باعتماد

بنیادیں استوار ہو سکیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ ہم دونوں کی منزل قاسم سے قطعی مختلف تھی۔ اگر وہ واقعی لمبے ٹو نہیں بلکہ اس کا کارندہ تھا تو بظاہر اس کی کھوپڑی پر ذہن کے ساتھ ہوسِ زر سوار تھی۔ وہ بھاری رقم کما کر لمبے ٹو کے حوالے کرنے کے بجائے میرے ساتھ مل کر خود ہضم کرنا چاہتا تھا جبکہ ہم دونوں اس گھناؤنے کام سے ہی تائب ہونا چاہتے تھے۔

اسی اُدھیڑبُن میں کھویا ہوا میں گھر پہنچا تو سلطان نے اپنے اُدھڑے ہوئے ورم آلود چہرے پر مسکراہٹ سجا کر میرا استقبال کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے پپوٹوں کی نیلاہٹ گہری ہو گئی تھی۔ ورم آلود آنکھوں میں خاصی جھری پیدا ہو گئی تھی۔ مگر سوجے ہوئے ہونٹوں نے مسکراہٹ کے ساتھ ڈراؤنا انداز اختیار کر لیا تھا۔

"تمہارے لیے دو بار فون آچکا ہے۔" اس نے سرہانے رکھے ہوئے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کون تھا؟" میں نے اس کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"جہانگیر۔ بہت بوکھلایا ہوا تھا۔ تمہارے لیے پیغام چھوڑنے کے باوجود پچھلے بیس پچیس منٹ میں دوبار فون کر چکا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"تمہارا کیا حال ہے؟" میں نے مسہری پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "جس حال میں ہوں ٹھیک ہوں، لیکن اب تم میری مزاج پرسی نہ کرنا، گالی سی محسوس ہوتی ہے۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بس ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مزاج پرسی کے بہانے تم مجھے چِڑا رہے ہو، اس مقابلے کا خیال آتے ہی میری کھوپڑی چٹخنے لگتی ہے۔ . . وہ لاکھ طاقتور سہی لیکن مجھے نجانے کیا ہو گیا تھا کیوں اس کے ہاتھوں پٹتا ہی چلا گیا۔ جب تک میں بھی اپنے ہاتھوں سے اس کا حلیہ نہ بگاڑ لوں گا، چین نہیں آئے گا۔"

"اگر وہ تم سے صلح کرنا چاہے؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے منہ بگاڑ کر صلح کی شان میں کچھ نازیبا کلمات کہے پھر بولا۔ "جب تک اس پر جوابی وار نہ کر لوں، صلح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہمارے قبیلے میں دشمن کے ہاتھوں پٹنے کے بعد صلح کا مطلب بزدلی اور نامردی ہوتا ہے۔ . . یہ تو ہتھیار ڈالنے سے بھی زیادہ شرمناک ہے۔"

"لیکن اب تم قبیلے میں نہیں، میرے ساتھ رہ رہے ہو۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

"رہ بھی رہا ہوں، تمہارا نمک بھی کھا رہا ہوں لیکن رگوں میں وہی قبائلی خون زور مار رہا ہے، جوش رگ کٹنے سے پہلے ہار ماننی نہیں جانتا یہ اب میرا اور اس کا ذاتی معاملہ ہے۔"

"اور اگر بدلے ہوئے حالات کے تحت ہمیں اس سے مل بیٹھنا پڑ جائے تو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر سوال کیا۔

"تمہاری کسی مصلحت کا تقاضا ہوا تو فی الحال میں بھی اس سے مل بیٹھوں گا لیکن میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑکتی رہے گی، تمہارا کام نکلتے ہی میں اس پر ٹوٹ پڑوں گا۔ . . انتقام کے لیے تو ہم لوگ ساری ساری عمر انتظار کرتے ہیں لیکن اسے بھولنا ہمارے مزاج کے خلاف ہے۔ . . اسے چھوڑو، تم کیا بحث لے بیٹھے ابھی تو میں باہر نکلنے سے بھی معذور ہوں، وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا کہ کیا کرنا ہے تم اپنے دوست کی تو خبر لو۔"

میں چونک کر فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دوسری طرف سے پہلے ہی گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا۔ جہانگیر کی آواز سے واقعی تشویش نمایاں تھی۔

"کیا ہو رہا ہے؟ میں ابھی ابھی گھر پہنچا ہوں۔"

"اوہ۔ . . کہاں مر گئے تھے تم؟" میری آواز پہچانتے ہی وہ پھٹ پڑا۔ "میں بہت پریشان ہوں، فوراً میرے پاس پہنچو۔"

"لیکن ہوا کیا ہے۔ . . ؟"

میں نے کچھ جاننے کی نیت سے پوچھنا چاہا لیکن اس نے میری بات درمیان ہی سے کاٹ دی۔ "فون پر بات نہیں ہو سکتی بس بلاتاخیر چلے آؤ، میں انتظار کر رہا ہوں۔"

پھر اس نے میرا جواب سننے کی زحمت کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا، میں نے بھی ایک گہرا سانس لے کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ "وہ واقعی پریشان ہے، میں اس کی طرف جا رہا ہوں۔" میں نے سلطان شاہ سے کہا اور فوراً ہی واپس چل دیا۔ اس بار میں پستول اور کچھ فاضل راؤنڈز ساتھ لینا نہیں بھولا تھا۔

میں نے جہانگیر کے مکان کے پھاٹک پر رک کر ہارن بجایا تو کئی منٹ کے انتظار کے بعد آہنی پھاٹک کھولا گیا۔ . . . . .

ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سامنے چوکیدار کے بجائے جہانگیر خود ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ گاؤن کی جیب میں پڑا ہوا تھا، میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ جہانگیر کی اس جیب میں ریوالور موجود تھا۔

میں تیزی سے کار کو پورچ میں بڑھا لے گیا۔ مجھے

یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چوکیدار کے ساتھ ہی مکان میں کتوں کا دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔

میں اگنیشن آف کر کے چوکنے انداز میں نیچے اترا تو جہانگیر پھاٹک بند کر کے تیز تیز قدموں سے واپس آتا نظر آیا۔ قریب آکر وہ رکے بغیر میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے ساتھ اندر لیتا چلا گیا جیسے باہر کی کھلی فضا میں اسے کسی سے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو۔

”کیا قیامت ہے؟ یہ سب بھاگ دوڑ کیسی ہے؟ مجھے کچھ تو بتاؤ۔“ میں نے اس کے پُراسرار رویے پر احتجاج کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

”یہ دیکھ رہے ہو؟“ اس نے ہیجان آمیز دھیمے لہجے میں فرشی قالین پر بکھرے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں اور پتھروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مین سوئچ آف کر کے پورے مکان میں اندھیرا کر دیا گیا تھا پھر اچانک ہی مکان کے شیشوں پر پتھراؤ شروع ہو گیا۔ اندھیرے میں باڑھ کے قریب مجھے تین ہیولے نظر آئے تھے جو پورے جوش و خروش سے پتھراؤ کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ان میں سے ایک کو زخمی بھی کر دیا تھا میری طرف سے بے آواز فائرنگ کا آغاز ہوتے ہی وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے، اندھیرے میں باہر نکلنے سے پہلے میں نے تمہیں فون کیا تو تم غائب تھے، مجبوراً میں نے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا تو گیراج میں لگا ہوا مین سوئچ آف تھا... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے؟“

”کتے کیا کر رہے تھے تمہارے؟“

”کتے عقبی حصے میں بے ہوش پڑے تھے، قریب ہی لان پر اُبلے ہوئے گوشت کے کچھ پارچے پڑے ہوئے تھے، شاید ان پارچوں میں کوئی خواب آور دوا شامل تھی، باہر سے وہ ٹکڑے اندر اچھال کر پہلے کتوں کو خاموش کیا گیا پھر روشنی گل کر دی گئی، پہلے چوکیدار بجلی کی خرابی کا سراغ لگانے گیراج کی طرف گیا تو کئی آدمیوں نے اسے بے خبری میں دبوچ کر باندھ دیا۔ دوسری طرف سے کتوں کا رکھوالا گیراج میں پہنچا تو اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ ان دونوں کے دہانوں میں بے رحمی سے کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ انہیں میں نے ہی اس عذاب سے نجات دلائی تھی وہ دونوں کوارٹر کے اندر پڑے اب خوف سے گھگھیا رہے ہیں۔“

”انہوں نے کسی کو دیکھا تو ہوگا؟“ میں نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”اندھیرے میں خاک نظر آتا... انہیں تو یہ بھی ہوش نہیں کہ حملہ آور کتنے تھے، دونوں ہی درجنوں کی کہانی سُنا رہے ہیں۔“

وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

”تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ تم نے ان میں سے ایک کو زخمی کر دیا تھا؟“

”فائر کے بعد ہلکی سی بے اختیار چیخ سنائی دی تھی، ادھر لان پر خون کا دھبہ بھی موجود ہے۔“

”ان قدآدم شیشوں کے ٹوٹنے سے خاصا شور ہوا ہوگا۔ آس پاس سے کسی نے دخل انداز ہونے کی کوشش نہیں کی؟“ میں نے وسیع و عریض چوبی فریموں پر نگاہ ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

وہ تلخ انداز میں ہنس پڑا۔ ”یہ لالو کھیت نہیں ہے میرے دوست جہاں کمروں کی دیواریں دیوار سے ملی ہوتی ہے ایک گھر میں گڑبڑ ہو تو پورا محلہ جمع ہو جاتا ہے... یہاں کوئی دوسرے کے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑاتا... اوّل تو کسی نے شور سُنا ہی نہیں ہوگا اور سُن بھی لیا ہوگا تو اسے میرے گھر کی گڑبڑ سے زیادہ اپنی حفاظت کی فکر لاحق ہو گئی ہوگی۔“

اسی وقت میری نگاہ دیوار کی جڑ میں پڑے ہوئے ایک پتھر پر پڑی اور میں نے لپک کر اسے اُٹھا لیا۔ اس چٹانی پتھر کے ساتھ نائیلون کی مضبوط ڈوری کے ذریعے ایک کاغذ بندھا ہوا تھا، وہ عجیب پتھر دیکھ کر جہانگیر بھی اضطراری طور پر میرے قریب آ گیا۔

بھورے رنگ کے مضبوط پیکنگ پیپر پر سُرخ مارکر سے موٹے اُردو حروف میں ایک مختصر سا دھمکی آمیز پیغام تحریر تھا۔

”پتھروں کی طرح دستی بم بھی برسائے جا سکتے ہیں۔“

وہ تحریر دیکھ کر میرے ذہن سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا ورنہ میں شروع سے مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ اتنی جدوجہد کے بعد ان گمنام حملہ آوروں نے صرف پتھراؤ پر کیوں اکتفا کیا؟

اس رقعے سے صاف ظاہر تھا کہ حملہ آوروں کا مقصد صرف جہانگیر کو خوف زدہ کرنا تھا اس دھماچوکڑی کے ذریعے وہ اسے بے بسی اور عدم تحفظ کا احساس دلانا چاہتے تھے جس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے تھے۔

لیکن اس دھمکی کا مقصد کیا تھا؟ خود جہانگیر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”بازار میں تو کسی سے مخاصمت مول نہیں لے بیٹھے ہو؟“ میں نے پُر تفکر لہجے میں سوال کیا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”مخاصمت تو اسی وقت ہوتی ہے جب کوئی حریف سامنے ہو... پھر حملہ آور تعداد میں کئی تھے، یہ تو کوئی منظم سازش معلوم ہوتی ہے۔“

”تم یہ واقعہ اپنی ذات تک ہی محدود رکھو گے۔“ میں نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ بری طرح چونک پڑا۔

”طارق کا حشر یاد ہے نا؟ وہ اسی لیے مارا گیا تھا کہ کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے تھے، مجھے صحیح حالات کا تو علم نہیں لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ مرنے سے پہلے وہ اسی قسم کی صورتحال سے دوچار تھا۔“

”لل... لیکن وہ لوگ بہت باخبر ہیں۔“

”شاید اب وہ طلسم بھی ٹوٹ جائے گا۔“ میں نے قہقہہ مار کر کہا اور وہ یوں مجھے گھورنے لگا جیسے اس میری ذہنی صحت پر شبہ رہا ہو۔

”کھل کر بات کرو، اس وقت بھی میں بہت پریشان ہوں۔“

”تیار ہو جاؤ، ہم اسی وقت جیوا ہاؤز چل رہے ہیں، تمہاری بہت سی الجھنیں رفع ہو جائیں گی۔“

”یہ اچانک جیوا ہاؤز کی کیا سوجھ گئی تم کو؟“

”میرا پہلے سے پروگرام تھا، تمہارے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بعد اس میں زیادہ تاخیر مناسب نہیں ہوگی۔“

”اور کون ہوگا وہاں؟“ وہ میری طرف سے بے اعتمادی کا شکار نظر آنے لگا تھا۔

”فی الحال کوئی نہیں، بعد میں سی ون کو بلانے کا ارادہ ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”اور وہ دوڑا چلا آئے گا؟“ اس نے کھوکھلے انداز میں میرا مضحکہ اُڑانے کی کوشش کی۔ ”پھر تم سے واسطہ کیا ہے اس کا؟“

”تیاری کرو، پھر خود ہی دیکھ لینا، آج شاید تمہارے لیے انکشافات کی رات ہوگی۔“

کافی دیر بعد میں اسے اپنی سنجیدگی کا یقین دلا سکا اور وہ لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔

میں نے اس کی کیبنٹ سے اپنا پسندیدہ برانڈ نکال کر ایک گلاس تیار کیا اور اپنے ذہن میں آنے والے لمحات کی منصوبہ بندی کرنے لگا میں نے جو کچھ سوچا ہوا تھا، وہ بہت خطرناک تھا۔ لیکن ایسا کوئی قدم اُٹھائے بغیر بہتیری گتھیاں سلجھانی ناممکن تھیں۔

تھوڑی دیر بعد جہانگیر سیاہ سوٹ پہن کر آ گیا۔ اس وقت تک اس کے دونوں ملازمین کی حالت قدرے بہتر ہو چکی تھی۔ جہانگیر نے ان دونوں کو ہدایت کی کہ اس کی روانگی کے بعد پھاٹک بند کر کے وہ دونوں باہر ٹھہرنے کے بجائے خود کو کسی ایسے کمرے میں محبوس کر لیں جس تک کسی بیرونی آدمی کی رسائی کا امکان نہ ہو۔ پھر باہر بم بھی پھٹنے لگیں تو وہ باہر نکلنے کی حماقت نہ کریں۔ جہانگیر کی واپسی پر وہ اس کی کار کا ہارن پہچان کر باہر نکل سکتے تھے۔

”میں غیر مسلح ہوں۔“ باہر نکل کر اس نے آہستہ سے مجھے باخبر کیا مگر میں خاموش رہا۔

اگر میں قاسم کو جیوا ہاؤز کے محلے کمیں اور طلب کرتا تو وہ تنہا ہرگز نہ آتا بلکہ اس کے آدمی مناسب فاصلے سے اس کی حفاظت کرتے رہتے جبکہ جیوا ہاؤز آنے کے لیے اسے ایسے کسی انتظام کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس سنگین اور محفوظ عمارت میں اسے میں باآسانی اپنی مرضی پر چلا سکتا تھا۔

”کم از کم اپنا پروگرام تو بتا دو مجھے۔“ طویل خاموشی کے بعد جہانگیر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

”شاید تمہیں علم نہ ہو کہ طارق کا قتل سی ون کے ہاتھوں ہوا تھا۔“ میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ”تمہارے معاملے میں اگر کچھ ہونے والا ہے تو وہ ضرور باخبر ہوگا۔“

”لیکن... لیکن تم تو میرے ماتحت ہو... تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ میرے لیے تو طارق کی موت آج بھی ایک معمّہ بنی ہوئی ہے۔“ پھر چونک کر بولا۔ ”کہیں تم یہ تو جتانا نہیں چاہ رہے کہ تم اپنے طور پر تنظیم کے خلاف کام شروع کر چکے ہو؟“

”بہت دیر میں سمجھے۔“ میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ جیوا ہاؤز میں تمہیں ہر حال میں میرا ساتھ دینا ہے، اس کے خلاف ہوا تو تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہیں مل سکے گا۔“

”تو کیا تم براہِ راست سی ون سے بھڑ جانے کا فیصلہ کر چکے ہو؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

”اس کا انحصار تو خود اس کے رویے پر ہوگا۔“ میرے اس جواب کے ساتھ ہی کار میں خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے کار جیوا ہاؤز کے پھاٹک پر روک دی۔ وہ وسیع و عریض عمارت مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دور سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہاں برسوں سے ویرانی کا راج ہو لیکن مخصوص انداز میں ہارن بجانے کے چند ہی لمحوں بعد پھاٹک کھل گیا۔ اندر جاتے ہوئے گھور اندھیرے میں کار کی پارکنگ لائٹس کی روشنی بھی خاصی تیز محسوس ہو رہی تھی۔ اس روشنی کے انعکاس میں میں نے تاریک برآمدے میں دو گرانڈیل سایوں کو ستونوں کی اوٹ میں سرکتے دیکھا۔

ہم دونوں گاڑی سے اُترے تو جیوا ہاؤز کے سفاک محافظ ہمیں پہچان کر سامنے آ گئے۔ ”تھوڑی دیر بعد ایک مہمان آئے گا، اس کی جامہ تلاشی لے کر اندر پہنچا دینا۔“ میں نے ان سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

”تمہیں ان کو جو کچھ ہدایت دینی تھی، میرے ذریعے دیتے

ان کے نزدیک تم میرے ماتحت ہو۔" اندر داخل ہونے کے بعد جہانگیر میرے کان کے نیچے منمنایا۔

"ان کے لیے یہی کافی ہے کہ تم نے میری ہدایت سے اختلاف نہیں کیا۔" میں نے روشنی آن کرتے ہوئے بے پروایانہ لہجے میں کہا اور فون کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے قاسم کا نمبر ڈائل کیا تو جہانگیر قریب کھڑا میری ایک ایک حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"تم فوراً جیوا ہاؤز چلے آؤ۔" سلسلہ ملتے ہی میں نے... براہِ راست کہا

"جیوا ہاؤز؟" اس کی آواز تحیر آمیز تھی۔ "مگر کیوں؟"

"کچھ معاملات طے کرنے ہیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"اس وقت میں نہ آسکوں گا، تھکا ہوا ہوں۔" اس کا لہجہ بھی سرد ہو گیا۔ "کل کسی وقت کیس اور رکھ لو۔"

"میں اس وقت بی فور کی حیثیت سے تمہیں حکم دے رہا ہوں۔ آج اور اسی وقت تمہیں آنا ہے۔" میں نے غرا کر کہا۔ میرے منہ سے بی فور کا نام سنتے ہی جہانگیر کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"ٹھیک ہے میں پندرہ منٹ لوں گا۔" ریسیور میں قاسم کا جواب سنائی دیا۔

"بس یہ یاد رکھنا کہ میں اس وقت بھی جیوا ہاؤز میں تمہارا منتظر ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"یہ تم نے کیا بکواس شروع کر دی۔" میرے فارغ ہوتے ہی جہانگیر لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں تمہیں جیوا ہاؤز کی چھت کے نیچے من مانی کی اجازت نہیں دے سکتا، وہ یہاں ہونے والی ہر بات سے باخبر ہو جاتا ہے۔"

"مائی ڈیئر برادر جہانگیر!" میں نے اس کی ٹھوڑی چھو کر گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "میں جو کچھ کر رہا ہوں، پوری ذمہ داری کے ساتھ کر رہا ہوں، اس کے لیے میں تمہاری اجازت کا محتاج نہیں ہوں۔"

"اس خیال میں بھی نہ رہنا۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "اس چھت کے نیچے میرا حکم چلتا ہے، میں تمہیں کسی فراڈ کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔"

اس کی عقل سنک گئی تھی لہٰذا مجھے مصالحانہ لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ "یہ کوئی فراڈ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ میں ہی بی فور ہوں اور شروع سے اب تک تم مجھ ہی کو جواب دہ رہے ہو۔"

وہ مجھے یوں گھورنے لگا جیسے میرے سر پر یک بیک سینگ نکل آتے ہوں پھر بے اعتباری سے بولا۔ "میں نہیں مان سکتا۔ اس کی تو آواز سے اوسان خطا ہونے لگتے ہیں تم یقیناً کسی لمبے چکر میں معلوم ہوتے ہو۔"

"چکر ہمیشہ گول ہوتا ہے۔" میں نے آواز بدل کر بی فور کے خشک لہجے میں کہا۔ "اگر تم اب بھی نہ مانے تو مجھے تمہاری تھوڑی سی گوشمالی کرنی پڑے گی۔"

میری بدلی ہوئی آواز سن کر اس کے قدم لڑکھڑا گئے، اگر وہ فوراً ہی قریبی کرسی میں نہ دھنس گیا ہوتا تو یقیناً فرش پر گر گیا ہوتا۔

"تت... تم نے یہ راز اتنے دن تک مجھ سے چھپائے رکھا!" وہ لقاہت آمیز شکایتی لہجے میں بولا۔

"مجبوری۔" میں نے آہستگی کے ساتھ کہا۔ "اگر اب بھی تم نے کھل کر مجھے اعتماد میں نہ لیا ہوتا تو میں بدستور بی فور ہی بنا رہتا۔ تنظیم میں ہر مرحلے پر رازداری سب سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے۔"

"اور اسی رازداری کی خاطر تم نے ٹھنڈے ملک کے ساتھ طارق کے قتل کا فیصلہ صادر کر دیا۔ تمہارے ہاتھ اپنے ایک جگری دوست کے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔"

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اس قسم کے فیصلے اعلیٰ ترین سطح پر کیے جاتے ہیں مجھے ایسے کسی فیصلے کی بھنک بھی مل جاتی تو راتوں رات طارق کو سمندر پار کے کسی ملک کی طرف فرار کرا دیتا۔"

"بڑا راز سر کھولا ہے تم نے میری زندگی میں۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم جانتے تھے کہ سلمیٰ ہمیشہ میری طرف سے شاکی رہتی ہے پھر بھی تم وقت بے وقت مجھے تنگ کرتے رہے وہ مجھے اس آواز کا غلام سمجھتی ہے۔"

"ماضی کو بھول جاؤ، وہ ایک عارضی دور تھا جو ہم سب کے لیے عذاب بن گیا تھا، آج سے ہم ایک نئے دور کا آغاز کر رہے ہیں لیکن دوسروں کے لیے وہی پرانا طلسم برقرار رہے گا۔"

"اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم ہی بی فور ہو۔" وہ مسلسل میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"شاید تمہیں راجہ سکندر علی کا نام یاد ہو، پہلے وہی بی فور ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں میں ڈی ون تھا اور اس سے احکام لے کر تم تک پہنچایا کرتا تھا۔"

"وہ تو شاید قتل کر دیا گیا تھا۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "بہت عجیب اور نیک دل آدمی تھا، اخبارات نے اس کے قتل کی خبر سیاہ حاشیوں کے ساتھ چھاپی تھی۔"

"وہ اس کا بہروپ تھا، راجہ سکندر علی کا اصل روپ موت کے سوداگر کا تھا، دیکھا جائے تو اس شہر میں ہیروئن جیسے موذی اور تباہ کن نشے کو متعارف کرانے والا وہ ہی تھا۔"

"اس کے مرنے کے بعد سے تم بی فور ہو؟" جہانگیر نے سوال کیا۔

"ہاں۔ اور جسے میں نے یہاں بلایا ہے وہ سی ون ہے۔ طارق کا قاتل۔ اس کا اصل نام قاسم ہے۔ وہ بے ایمان ہو گیا ہے۔ مقامی مارکیٹ کی کھپت میں خطیر حصے کے خواب دیکھ رہا ہے..."

"اچھا ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "اصل بات یہ ہے کہ وہ بھی تنظیم کے مفادات کے خلاف کام کرنا چاہتا ہے، تنظیم کو کمزور کر کے ہی بتدریج ختم کیا جا سکتا ہے اور اس کے خاتمے کے بغیر ہماری گلو خلاصی ناممکن ہے۔ آخر تم کیوں قاسم سے تصادم مول لینے پر تل گئے ہو؟"

"میں اس کی طرف سے کچھ شبہات کا شکار ہو گیا ہوں... آج وہ معاملہ صاف کرنا چاہتا ہوں، اگر میرے شبہات بے بنیاد ہیں تو ہم تعاون کریں گے بصورتِ دیگر آج یہی عمارت اس کا مدفن بنے گی۔"

"مجھے دیکھ کر وہ اُچٹ گیا۔" جہانگیر نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اچٹنے دو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "وہ مجھ سے معاملات طے کرنا چاہتا ہے لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں ساتھ لیے بغیر آگے نہیں بڑھوں گا۔ ایسے معاملات میں ایک اور ایک عموماً گیارہ ہوتے ہیں۔"

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی پھر قاسم کا قہربار چہرہ سامنے آ گیا مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ چلتے ہوئے لنگڑا رہا تھا۔ اس کے پیچھے جیوا ہاؤز کا ایک محافظ موجود تھا جو قاسم کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر کے غالباً واپس لوٹ گیا۔

پہلے قاسم کی نگاہیں مجھ سے چار ہوئیں تو وہ قہربار تھیں۔ پھر جونہی اس کی نگاہ جہانگیر پر پڑی، اس کا چہرہ یک بیک دھواں ہو گیا۔ وہ تبدیلی اس قدر نمایاں تھی کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"رک کیوں گئے، چلے آؤ، یہاں کوئی غیر نہیں ہے۔" اسے رکتے دیکھ کر میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آج میری کھلی ہوئی تذلیل ہوئی ہے۔" وہ صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے غصیلے لہجے میں غرایا۔ اپنے چہرے پر رونما ہونے والے تغیر پر وہ فوراً ہی قابو پا چکا تھا۔

"کیا غصے کی شدت سے لنگڑا رہے ہو؟" میں نے تمسخر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"...تمہارے محافظوں نے تلاشی لے کر مجھے نہتا کیا ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے غصیلی آواز میں بولا۔ "میں نے احتجاج کرتے ہوئے واپس جانا چاہا تو مجھے گنوں کی زد پر لے کر مطلع کیا گیا کہ جیوا ہاؤز میں آنے والا آتا اپنی مرضی سے ہے مگر اس کی واپسی بڑوں کے فیصلے کی تابع ہوتی ہے۔"

"میزبانی کا عام فہم اصول ہے، اس پر چراغ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے سلگانے والے میٹھے لہجے میں سوال کیا۔

"دیکھ لوں گا تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔" وہ سر ہلا کر غرایا۔ "بہت جلد میں بھی تمہاری میزبانی کروں گا۔"

"تم نے اپنی لنگڑاہٹ کے اسباب پر روشنی نہیں ڈالی۔" میں اس کی جھلاہٹ سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔

"میرے پاس وقت کم ہے، جس مقصد سے بلایا ہے براہِ راست اسی پر بات کرو تو بہتر ہے۔"

"آج ایڈکشن کیور سوسائٹی میں تم ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے تھے، میں جاننا چاہوں گا کہ تمہاری ٹانگ کیسے خراب ہوئی کیونکہ آج شام ہی جہانگیر نے اپنے مکان میں ایک نامعلوم حملہ آور کو زخمی کیا تھا۔"

"تو تمہارا خیال ہے کہ وہ حملہ آور میں ہی تھا۔" وہ اچانک ہی ہنس پڑا۔

اس کی ہنسی اس وقت بے ربط سی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ معاملے کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کر رہا ہو میں یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ "جہانگیر نے حملہ آور پر بے آواز ریوالور سے فائر کیا تھا میں بذاتِ خود تمہارا زخم دیکھوں گا اگر یہ گولی سے آیا ہے تو تمہیں بہت سی وضاحتیں کرنی ہوں گی، کسی اور طرح سے زخمی ہوئے ہو تو مجھے اس کی تفصیلات سے کوئی سروکار نہ ہو گا۔"

وہ چند ثانیوں تک ہونٹ بھینچے باری باری مجھے اور جہانگیر کو گھورتا رہا پھر سرد لہجے میں بولا۔ "تو کیا اس وقت مجھے اسی باز پرس کے لیے بلایا گیا تھا؟"

"اصل بات تو بعد میں سامنے آئے گی، تمہاری لنگڑاہٹ نے اچانک ہی ایک نئے خیال کو جنم دیا ہے اب تو اسی کے بعد کوئی بات ہو سکے گی۔"

"وہ حملہ میں نے ہی کرایا تھا۔" قدرے توقف کے بعد وہ بول پڑا۔ "یہ بدقسمتی ہے کہ میرے ساتھیوں کا بال بھی بیکا نہیں ہوا مگر میری پنڈلی ادھڑ گئی لیکن اس ہنگامے کا مقصد جہانگیر کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں تھا۔"

"وہ تو خشت زنی سے صاف ظاہر ہے، ہزاروں روپے کے شیشے چکنا چور ہو گئے اور دھمکی الگ کہ پتھروں کی جگہ گھر پر بم بھی برسائے جا سکتے ہیں۔"

"میرا قیاس ہے کہ جہانگیر کے بارے میں میری اور تمہاری سوچ ایک ہی ہے۔" حملے کے اعتراف کے بعد وہ پرسکون ہو گیا تھا۔

"کوئی الزام ہو لہے؟"

"جہانگیر کی یہاں موجودگی بتا رہی ہے کہ تم نے اسے اعتماد میں لینے کا فیصلہ کرلیا ہے' میرا طریقۂ کار ذرا لمبا تھا' میں اسے خوفزدہ کرکے اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا اسے توڑے بغیر ہم دونوں کی کوئی بھی حکمتِ عملی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔"

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہاری تجویز قبول کر ہی لوں گا؟" میں نے سگریٹ سلگا کر سوال کیا۔

"میں کوئی نیا کام تو نہیں کرنا چاہتا، جو کر رہے ہو وہی کرتے رہو گے' اگر طریقۂ کار کی ذرا سی تبدیلی سے آمدنی میں دس پندرہ گنا اضافہ ہو سکتا ہے تو اس سے کون انکار کر سکے گا۔"

"لیکن میں ابھی تک تمہاری حیثیت سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"حیثیت تو تمہاری ہے، ایک فون کیا تو میں دوڑا چلا آیا۔ یہاں محافظوں سے عزت اُتروا لی، میں تو بالکل بے حیثیت آدمی ہوں۔"

"ایڈکشن کیور سوسائٹی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔" اس نے اپنے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"مشہور سماجی اداروں سے وابستگی میرے فرائض کا ایک حصّہ ہے، ایسے روابط سے اندر کی خبریں معلوم کرنے میں سہولت رہتی ہے اور شخصیت پر بھی ایک خوشنما خول چڑھ جاتا ہے۔"

"گڈ۔" وہ تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ "تم ایمانداری پہ آمادہ ہو تو مجھے بھی کھلے دل سے بات کرنی چاہیے' سوسائٹی سے میرا تعلق صرف مجبوری کا ہے' اصل واسطہ محسن سے ہے وہ ہیروئن کا بڑا خریدار ہے۔"

"خریداری کے معاملات سے تمہارا کیا واسطہ؟"

"مقامی مارکیٹ سے میں واقعی لاتعلق ہوں محسن بشیر مال ایکسپورٹ کرتا ہے' تھوڑا بہت اس کے داماد کی علاج گاہ میں فروخت ہوتا ہے... چونکو نہیں۔ اکبر منشیات فروش نہیں ہے' دراصل ہیروئن کے عادی مریضوں کا علاج بھی ہیروئن ہی ہے، نپی تلی، مقدار کی خوراکیں بتدریج گھٹائی جاتی ہیں۔ نشہ ایک دم بند کردو تو مریض بدترین حالات کا شکار ہو سکتا ہے' اکبر کو سرکاری کوٹہ بہت کم ملتا ہے' یہ کمی وہ ہمارے مال سے پوری کرتا ہے۔"

"اور ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ سے کیا تعلق ہے تمہارا؟"

"سینئر ڈائریکٹر ہوں اس کا۔" وہ داہنی آنکھ دبا کر بولا' "تم نے تو باقاعدہ سراغرسانی کرائی ہے میرے خلاف۔"

"اس فرم کی مصروفیات کیا ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ سات برس سے میں اس سے منسلک ہوں۔ آج تک ایک دھیلے کا بھی کام نہیں کیا۔ نکل روڈ کی ایک عمارت کے ایک کمرے میں سات کاغذی فرموں کے دفاتر ہیں۔ بس ہر فرم کی ایک میز اور کرسی پڑی ہوئی ہے۔ ایشین سنڈیکیٹ ان ہی میں سے ایک ہے۔"

"لمیٹڈ فرم تو اس طرح برقرار ہی نہیں رہ سکتی۔" میں نے اعتراض کیا۔

"تمہارے سامنے ہی ہے... جیب میں پیسہ ہو تو یہاں کیا ممکن نہیں، پھر سنا ہے کہ فرم کا ہیڈ آفس لاہور میں ہے' وہاں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی ہوگا، کراچی میں تو برائے نام دفتر ہے۔"

"اس کے ڈائریکٹر کیسے بنے تھے؟"

"ایک روز راجہ سکندر علی نے اطلاع دی تھی، بیٹھے بٹھائے یہ منصب مل گیا۔ کچھ روز بعد فرم کے ایم ڈی کی طرف سے ایک عدد باضابطہ خط بھی ملا تھا۔ تنخواہ باقاعدگی سے ملتی ہے' اس کے عوض کبھی کبھار بعض دستاویزات پر دستخط کرنے پڑتے ہیں۔ اس سے آگے مجھے کچھ علم نہیں۔"

کم از کم اسوقت وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، درست ہی کہہ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے جوابات بے تکان اور نپے تلے تھے' ان میں کہیں بھی کوئی جھول نہیں تھا۔ اس نے میرے ہر اعتراض کو اپنے معقول جوابات سے دور کر دیا تھا لیکن ابھی بھی دو نکات تشنہ تھے' اوّلاً یہ کہ لے ٹو نے رخشی کے معاملے میں اس کی باغیانہ روش سے باخبر ہونے کے باوجود اسے ڈھیل کیوں دے رکھی تھی اور دوم یہ کہ اسے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ سے تعلق کے اظہار کی کھلی چھوٹ کیوں ملی ہوئی تھی؟

ان میں سے دوسرے سوال کا بالواسطہ جواب تو مل ہی گیا تھا وہ سات برس سے اس فرم سے منسلک تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جن دنوں ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ ایک بے حیثیت فرم تھی، ان دنوں قاسم کو اس سے وابستہ کیا گیا تھا' پھر فرم ترقی کرتی رہی لیکن کراچی میں قاسم کا نام بدستور اس کے ساتھ چلتا رہا۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق تھا وہ خاصا ٹیڑھا تھا۔ میں نے قاسم کو بتایا تھا کہ رخشی کے معاملے میں میں نے اسے لے ٹو کے سامنے پوری طرح بے نقاب نہیں کیا تھا اس اعتبار سے میں اس سے وہ سوال دریافت ہی نہیں کر سکتا تھا مگر پھر مجھے اچانک ایک چال سوجھ گئی۔

رخشی کا جو بھی کردار تھا، وہ اپنی جگہ تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ قاسم اس کی چاہت میں اس حد تک دیوانہ تھا کہ اس نے رخشی کے خاتمے کے لیے لے ٹو کے حکم سے روگردانی کرتے ہوئے خود ہی رخشی کو چھپا کر اس کی روپوشی کا ہوّا کھڑا کر لیا تھا۔ اب اگر وہ خود ہی لے ٹو تھا تو اسے رخشی کی روپوشی کے بارے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر وہ واقعی لے ٹو کا کوئی ماتحت تھا تو اسے روپوشی کا راز بہت عزیز ہونا چاہیے تھا۔ اس کی آزمائش کے لیے میں نے اس پر آخری ہتھیار بھی آزمانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

"اور اب رخشی کی طرف آجاؤ۔" میں نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" میرے الفاظ پر وہ بری طرح چونکا تھا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو تو مطلب صاف ظاہر ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا' "تمہیں جیوا بادز بلا کر غیر مسلح کر دیا گیا ہے' یہاں میرے ساتھ جہانگیر ایک گواہ کی حیثیت سے موجود ہے' تم کھل کر اس کے سامنے اپنے باغیانہ عزائم کا اظہار کر چکے ہو لہٰذا میں تمہیں بدنیتی اور بغاوت کے جرم میں یہاں قید کرکے لے ٹو کو سارے معاملات سے آگاہ کر دوں گا اور تمہارے مقدّر کا فیصلہ اسی کی صوابدید پر منحصر ہوگا..."

"یہ... کمینگی کی انتہا ہے... میں تمہیں فنا کر دوں گا۔" وہ غصے سے کانپتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھ گیا مگر میں نے اسی وقت اپنا پستول نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

"یہی نہیں بلکہ رخشی کی نئی کمین گاہ بھی میری نظر میں آچکی ہے۔" میں نے اندھیرے میں تیر پھینکا' "میں لے ٹو کو بتا دوں گا کہ اس کی مجرمہ اب کہاں مقیم ہے' باقی معاملات وہ خود نمٹا لے گا۔"

"تت... تم کتے سے بدتر ہو ڈینی... تم نے دغا کی ہے میرے ساتھ۔" وہ غصے میں آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

"کتے میں وفا ہوتی ہے قاسم ڈارلنگ۔" میں نے اسے سلگایا۔

"میں تو اب بھی لے ٹو کا وفادار ہوں، تم اپنے اس محسن سے دغا کرنے پر تلے ہوئے ہو جو برسوں سے تمہیں پال رہا ہے۔"

"غلطی میری ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا' "تمہارے بارے میں اب تک میرے تمام اندازے غلط ثابت ہوتے آئے ہیں میں سمجھا تھا کہ تم واقعی کسی مریض کے علاج کے لیے اتفاقاً ایڈکشن کیور سوسائٹی آپہنچے ہو، مجھے ذرا بھی اندازہ ہو جاتا کہ تم میری ٹوہ پہ وہاں پہنچے ہو تو اسی دفتر میں تمہارا قصّہ پاک کر دیتا۔"

"اب لے ٹو کا کوئی ہرکارہ بے خبری کے عالم میں رخشی کا نرخرا جا دبوچے گا..."

اس کے بشرے پر ناقابلِ بیان کرب کی لہریں اُبھر کر معدوم ہو گئیں "مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم اکبر کے اسپتال جاؤ گے' بس چوک یہ ہوئی کہ رخشی کو ہوشیار نہیں کیا... ذرا سی احتیاط کر لیتا تو تمہارے فرشتے بھی اس تک نہ پہنچ سکتے۔" پھر وہ ایک دم بھڑک اُٹھا۔ "مگر تم اب بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔"

میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ قاسم نے غصے اور مایوسی کے عالم میں خود ہی انکشاف کر دیا تھا کہ رخشی اکبر کے اسپتال میں روپوش تھی۔ اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ دنیا بہت مختصر سی جگہ ہے یہ اور بات ہے کہ انسان زندگی بھر ایک کوں اتر میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں لیکن کسی کا سُراغ نہیں لگا پاتے۔ ہاں، کوئی کہیں تھک ہار کر سستانے بیٹھ جائے تو بہت سے جانے پہچانے چہرے نظر آجاتے ہیں۔

"میں اس کا کچھ نہیں بگاڑنا چاہتا۔" میں نے پستول جیب میں رکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا' "مجھے شبہ تھا کہ کہیں لے ٹو نے تمہیں میری آزمائش پر مامور نہ کیا ہو۔ اب میں مطمئن ہوں۔"

وہ تھکے تھکے انداز میں صوفے پر گر گیا۔

"مگر میں ابھی تک کچھ نہیں سمجھ سکا۔" جہانگیر نے الجھن آمیز لہجے میں پہلی بار زبان کھولی۔

"بی فور سے تم مل چکے ہو۔" میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا' "اور یہ سی ون ہے لے ٹو کا خونخوار ماتحت۔" میں نے قاسم کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "تنظیم کے لیے گھلتے ہوئے ہم نے ایک عمر گزار دی ہے اب قاسم کا خیال ہے کہ ہمیں اپنا مستقبل بھی سنوارنا چاہیے... اس کے لیے ہم تینوں کو تعاون کرنا ہوگا۔"

"ٹھہرو۔" قاسم نے فضا میں ہاتھ بلند کرکے مجھے خاموش کر دیا' "میں اسے پوری بات سمجھاتا ہوں۔"

اور وہ نپے تلے انداز میں جہانگیر کو بریف کرنے لگا۔

"ڈینی اور تم اسی کشتی کے سوار ہو جس میں میں سفر کر رہا ہوں۔" قاسم نپے تلے لہجے میں جہانگیر سے کہہ رہا تھا' "ہم سب آج سے پہلے ایک دوسرے کے لیے محض کوڈ ورڈز کی شناخت رکھتے تھے لیکن مدّتوں بعد یہ مرحلہ آیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے اپنے اصل روپ میں موجود ہیں۔ سی ون بی فور اور ڈی ون کے گورکھ دھندے ہمارے سربراہ نے اسی لیے پھیلائے ہوئے تھے کہ ہم نہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں اور نہ کبھی یکجا ہو سکیں۔ یہ اتفاق ہے یا بدقسمتی کہ ان دنوں درمیانی رابطے بکھر کر رہ گئے ہیں اور میرے ساتھ ہی ڈینی کا بھی براہِ راست لے ٹو سے رابطہ ہے مگر ہمارے لیے اس کی شخصیت آج بھی ایک ڈراؤنا راز ہے۔ ہم برسوں سے اپنی جانوں پر کھیل کر اس بے نام آسیبی سائے کے لیے دولت کما رہے ہیں مگر ہر لمحے یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں بھی ذرا سی لغزش ہوئی تو برسوں کی خدمات کو یکسر فراموش کرکے موت کا حکم نامہ جاری کر دیا جائے گا... اس شہر میں ہیروئن کی ساری تجارت

ہم تینوں کے ہاتھ میں ہے۔ ڈینی مقامی تنظیم کا سربراہ ہے۔ میرے لیے بعض احکام اوپر سے بھی آتے ہیں مگر اصولی طور پر میں ڈینی ہی کی ہدایات کا تابع ہوں۔ تم مال شہر میں پھیلاتے ہو اور پیسہ جمع کرتے ہو اور تم بھی ڈینی ہی کو جوابدہ ہو اور میری ایک اضافی ذمہ داری یہ ہے کہ تم دونوں کی حفاظت اور نگرانی کرتا رہوں اور اگر کسی مرحلے پر تمھاری ذات سے تنظیم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا خطرہ لاحق ہو تو براہِ راست سربراہ کو خبر دے کر ہنگامی ہدایات حاصل کروں۔۔"

" اتنی لمبی تمہید کی ضرورت نہیں "۔ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔" اختصار سے کام لو، جہانگیر دودھ پیتا بچہ نہیں ہے "۔

" سارے مقامی معاملات پر ہم تینوں کی گرفت مضبوط ہے۔۔۔ ان حالات میں کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اے ٹو کے لیے کماتے کماتے مر جائیں ؟ وہ پُرزور لہجے میں بولتے بولتے لحظہ بھر کے لیے ڈرامائی انداز میں خاموش ہوا پھر بولنے لگا۔" کیوں نہ ہم خود اپنی خوشحالی پر توجہ دیں ؟"

" کم از کم مجھے تو کوئی مالی دشواری نہیں ہے "۔ جہانگیر بولا۔" میں تو اس زندگی سے اکتا گیا ہوں "۔

" کنارہ کشی جیتے جی ناممکن ہے "۔ قاسم نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "تنظیم کا سربراہ بہت محتاط آدمی ہے۔ وہ کبھی کوئی خطرہ مول نہیں لیتا۔ اس کے فیصلے سرد، غیر جذباتی اور بے رحمانہ ہوتے ہیں۔ تم اندر کے آدمی ہو۔ الگ ہونا چاہو گے تو تمھاری خواہش سے باخبر ہوتے ہی وہ تمھاری جان کے درپے ہو جائے گا "۔

میں نے جہانگیر کو آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ میرا مدعا سمجھ گیا۔ "جان سب کو عزیز ہوتی ہے، یہی خوف تو آج تک اس کی غلامی پر مجبور کرتا رہا ہے "۔

" لیکن اب ہم اس کے غلام نہیں رہیں گے "۔ قاسم پوری شدومد کے ساتھ اپنے مؤقف کی حمایت میں دلائل دے رہا تھا۔" میری تجویز یہی ہے کہ اسے اندھیرے میں رکھ کر ہم اپنا مال آگے بڑھائیں۔ جب یہی دھندا کرنا ہے تو اس کے لیے کیوں، اپنے لیے کیوں نہ کیا جائے ؟"

" اپنی آمدنی میں کٹوتی وہ زیادہ دن تک برداشت نہیں کرے گا "۔ جہانگیر نے منہ بنا کر کہا۔

" اس کے لیے فضا سازگار ہے۔ نزار خان اور تازہ گل کا قصہ ابھی تازہ ہے۔ اسے ڈینی باور کراتا رہے گا کہ حیرتناک سُرعت کے ساتھ چھوٹے سپلائرز کی تعداد بڑھی ہے۔ شمالی سرحدوں سے تھوڑی مقدار میں مال لانے والوں کی تعداد بڑھ جائے تو تم کتنوں کو مارو گے، شہر میں قتلِ عام تو کرنے سے رہے "۔

" اور وہ ڈینی کی باتوں پر ایمان لا کر گھر بیٹھا رہے گا، اسے شہر کی خبریں نہیں ملیں گی ؟"

" وہ لاہور میں رہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ مجھ سے رپورٹ طلب کرے گا اور میری رپورٹ ڈینی کی کہانی کی لفظ بہ لفظ تائید کرے گی "۔

" اتنی بڑی منڈی وہ یوں آسانی سے نہیں چھوڑے گا "۔ جہانگیر نے اس کے استدلال کا اثر قبول کیے بغیر مایوسانہ لہجے میں کہا۔" وہ لاہور میں رہتا ہو یا پشاور میں لیکن یہ بات سب جانتے ہیں کہ منشیات کی کھپت کے اعتبار سے کراچی سب سے بڑی منڈی ہے۔ یہاں کی آمدنی سے محرومی کے آثار پیدا ہوتے ہی وہ خود کراچی دوڑا آئے گا اور اگر اسے ہماری ملی بھگت کا شبہ بھی ہو گیا تو ہم تینوں کو صفائی کی مہلت دیے بغیر وہ خاموشی کے ساتھ لمبے سفر پر روانہ کر دے گا "۔

" کراچی آ کر بھی وہ کچھ نہ کر سکے گا "۔ قاسم نے پُرزور لہجے میں کہا۔" ہیروئن شوکیسوں میں سجا کر کھلے عام دکانوں پر نہیں بیچی جاتی۔ ڈیلرز سے لے کر خوردہ فروشوں تک سب زیرِ زمین دنیا کے آدمی ہیں۔ کسی اجنبی کے لیے ان تک رسائی حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ زیادہ کھل کر سامنے آیا تو ہو سکتا ہے کہ کوئی سرپھرا اسے سرکاری مخبر سمجھ کر خود ہی ٹھکانے لگا دے "۔

چند ثانیوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا کہ قاسم کی تیاری بہت بھرپور تھی۔ وہ شاید کافی عرصے سے ان خطوط پر سوچ رہا تھا اور اپنی خفیہ سازش کے ہر پہلو سے اچھی طرح واقف تھا۔

اے ٹو کے بارے میں یہ بات یقینی تھی کہ وہ کوئی پیشہ ور حیثیت مجرم نہیں تھا۔ اسے معاشرے میں باعزت مقام حاصل تھا اور اسی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے اس نے خود سامنے آنے کے بجائے ایک مفروضہ نام کی آڑ لی ہوئی تھی۔ اس کے ہر حکم اور فیصلے سے ذہانت اور وسیع النظری جھلکتی تھی جسے اختیار کرنا کسی معمولی جرائم پیشہ شخص کے بس کی بات نہیں تھی اور اگر یہ قیاسات درست تھے تو اس جیسے آدمی کے لیے براہِ راست زیرِ زمین دنیا کے سرکردہ لوگوں سے رابطہ قائم کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔

" اور تم مال کہاں سے فراہم کرو گے ؟" جہانگیر نے سکوت توڑتے ہوئے سوال کیا۔

" یہ تم مجھ پر چھوڑ دو "۔ وہ پہلی بار مسکرایا۔ اتنی گفتگو کے بعد اس کی خود اعتمادی بحال ہو چلی تھی۔

" ایک آدمی پر کچھ بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔۔۔" جہانگیر نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔" شروع ہی میں اس غلطی کی بنیاد رکھ دی گئی تو کل تم بھی ہمارے لیے کوئی ہوّا کھڑا کر سکتے ہو "۔

" وہ میرا اپنا بندوبست ہو گا، اس سے تمھیں کوئی غرض نہ ہونی چاہیے، البتہ آمدنی میں ہم تینوں برابر کے حصے دار ہوں گے "۔ قاسم نے کہا۔

" جہانگیر کے سوال کا تعلق آمدنی ہی سے ہے "۔ میں نے اسے ٹوکا۔

" وہ کیسے ؟" اس نے تحیر آمیز لہجے میں میری طرف گھوم کر سوال کیا۔

" مال کہاں سے اور کس دام آ رہا ہے ؟ اس کا علم ہوئے بغیر آمدنی کا تعین کیسے ہو سکے گا ؟"

میرا سوال شاید اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ لحظہ بھر کے لیے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر تاسف آمیز لہجے میں بولا۔

" اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تمھیں میری نیت پر شبہ ہے "۔

" اپنی بدنیتی تو تم خود ہی ثابت کر چکے ہو "۔ میں نے خوشدلی کے ساتھ کہا۔" اے ٹو کے لیے کماتے کماتے اب تم خود غرضی پر اتر آئے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اب بھی تم خالص آمدنی میں تیسرے حصے کے علاوہ خریداری میں اپنا کمیشن وصول کرتے رہو اس لیے ہر بات کا علم ہونا ضروری ہے "۔

" شمالی علاقے سے ایک قبائلی آیا ہوا ہے۔ وہ سرحدی دّروں میں واقع ہیروئن تیار کرنے کی تین فیکٹریوں سے واقف ہے۔ اس کی معرفت سستے داموں خالص مال مل سکتا ہے "۔

" وہ خود بیچنے کے بجائے تمھیں کیوں دینے لگا ؟" جیوا ہاؤز کے زیرِ سایہ جہانگیر کی عقل خوب کام کر رہی تھی۔

" اگر کراچی کے پانی نے اسے بزدل نہ بنا دیا ہوتا تو نجانے وہ یہاں کیا کچھ کر گزرا ہوتا۔ اب تو وہ خود ہیروئن کے نشے کا عادی ہو گیا ہے "۔ قاسم نے کہا۔

" کون ہے وہ ؟" جہانگیر غیر ارادی طور پر پوچھ بیٹھا۔

" دلاور خان۔۔۔۔!" قاسم کا جواب سنتے ہی میں چونک پڑا۔

" یہ وہی مقرب خان اور عقرب کا ماموں تو نہیں ہے ؟" میں نے اس سے سوال کیا تو اس بار وہ چونک پڑا۔

" ہاں وہی۔۔۔۔ مگر تم اسے کیا جانو ؟"

" مجھے معلوم ہے "۔ میں طنزیہ انداز میں مسکرایا۔" وہ اپنے بھانجوں کے سفاکانہ قتل کی خبر پا کر انتقام لینے کی نیت سے یہاں پہنچا تھا، بہت بے خوف اور سفاک آدمی ہے، کمال ہے کہ انتقامی فطرت کا مالک ہونے کے باوجود وہ تمھارے وجود میں اپنے بھانجوں کے لہو کی بو محسوس نہ کر سکا "۔

قاسم کے ہونٹوں پر کسی بے رحم درندے جیسی مسکراہٹ پھیل گئی۔" وہ کلاشنکوف لے کر کراچی پہنچا تھا۔ اپنے بھانجوں کے قاتل کی تلاش کی مہم اس نے ایسے دیوانہ وار انداز میں شروع کی کہ میرے آدمیوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکا اور میری ہدایت پر انھوں نے دلاور خان سے دوستی گانٹھ لی۔ پہلے وہ نشے کے نام سے کانوں کو ہاتھ لگاتا تھا اب ہیروئن کا نشہ پورا کرنے کی دُھن میں کلاشنکوف تک بیچ چکا ہے۔ اب اگر میں اس کے سامنے اعتراف بھی کر لوں کہ عقرب اور مقرب کا قاتل میں ہوں تو وہ مجھ پر ہتھیار تو کجا ہاتھ تک نہ اٹھا سکے گا کیونکہ میں اس کا محسن ہوں۔۔۔۔ نہ صرف اس کی نشے کی ضرورت پوری کرتا ہوں بلکہ اسے کراچی جیسے شہر میں سر چھپانے کا ٹھکانا بھی فراہم کیا ہوا ہے "۔

" وہ خود نشے کا عادی ہو گیا ہے تو تمھاری کیا مدد کر سکے گا ؟" جہانگیر نے سوال کیا۔

" اسے ساتھ لے کر میں خود سرحد یا افغان علاقے میں جاؤں گا۔ وہ تو درمیان کا آدمی ہے۔ مال بنانے والوں سے تعارف کرانے کے بعد اس کا کام ختم ہو جائے گا۔ دام اور دیگر شرائط میں خود طے کروں گا "۔

" پورے ملک کو ہیروئن ان ہی اطراف سے سپلائی ہوتی ہے۔ حالات بتاتے ہیں کہ اے ٹو ان کا بہت بڑا گاہک ہے۔ اگر اسے وہاں سے تمھاری خریداری کی بھنک مل گئی تو کیا ہو گا ؟" جہانگیر کسی بھی خطرے کو نظر انداز کرنے کو تیار نہیں تھا۔

" نشے کے سوداگر نام نہیں پیسہ پہچانتے ہیں۔۔۔ میں کوئی بھی فرضی نام اختیار کر سکتا ہوں۔ خود دلاور خان کو آج تک میرا اصل نام معلوم نہیں "۔

" مقامی بازار سے تمھارا کوئی تعلق نہیں ہو گا "۔ جہانگیر نے کہا۔

" ہرگز نہیں "۔ اس نے خلوصِ دل سے کہا۔" یہ تو پورے معاملے کا اہم ترین نکتہ ہے۔ تم میرے ساتھ ہیر پھیر کرو گے تو میں مال کی فراہمی روک دوں گا۔ میں تمھارے ساتھ کوئی فریب کر دوں تو تم میرے مال کی فروخت کا سلسلہ موقوف کر سکتے ہو۔ ایسے تحفظ کے بغیر گاڑی چلنی محال ہے "۔

" تو پھر کب جا رہے ہو تم، مال کی خریداری کے لیے ؟" میں نے موضوع سمیٹتے ہوئے سوال کیا۔

" کسی بھی وقت۔۔۔۔ لیکن تمھیں ایک یقین دہانی کرانا ہو گی "۔ اس نے کہا۔

" کیسی یقین دہانی ؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

" اب تم رخشی کو بھول جاؤ گے، وہ ایک مریضہ کے روپ میں اکبر کے اسپتال میں رہ رہی ہے، اسے تمھاری ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے "۔

" تکلیف یقیناً نہیں پہنچے گی لیکن اسے بھول جانا فی الحال مشکل ہو گا "۔ میں نے اسے سلگانے کی نیت سے کہا۔" وہ مجھ سے بہت قریب رہی ہے، اس رشتے سے اس سے ملتے رہنے پر تمھیں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے "۔

قاسم کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ بولا تو اس کا لہجہ زخم خوردہ سا تھا۔" وہ میری بیوی نہیں، محض ایک اچھی دوست ہے۔ ہم ایک دوسرے کے راستے میں کبھی دیوار نہیں بنے، اگر وہ

تم سے ملنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میرے لیے یہی کافی ہوگا کہ تم اے ٹو کو اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دو گے۔"

"یہ میرا وعدہ ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا دیا جو نیم دلی کے ساتھ تھام لیا گیا۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔" جہانگیر نے اپنے گھر کی طرف واپس لوٹتے ہوئے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"بہت کچھ ہوا ہے..... بس اب تم تماشا دیکھتے جاؤ۔ اے ٹو کی بربادی کا آغاز ہو چکا ہے۔ بہت جلد وہ خود سامنے آنے پر مجبور ہو جائے گا یا اچانک ہم سب سے رابطہ ختم کر کے گوشہ نشین ہو جائے گا۔"

"مگر یار وہ ہے بڑا ذہین۔ بڑے کتابی انداز میں اپنا گروہ چلا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ رقم کی وصولیابی میں اس نے بنک کو ملوث کیا ہوا ہے پھر بھی پردہ نشین ہے۔ آخر ٹمبر ٹریڈ اکاؤنٹ کے حوالے سے رقم وصول کرنے والا آگے کس کو ادائیگی کرتا ہوگا وہاں تو اسے سامنے آنا چاہیے۔"

میں ہنس پڑا۔ "رقم کسی کھاتے میں جمع نہیں ہوتی، اکاؤنٹ کے حوالے سے دی جاتی ہے۔ اسے بھی ہنڈی ہی کا ایک طریقۂ کار سمجھ لو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ رقم ملک میں کسی کو بھی ادا نہ کی جاتی ہوگی بلکہ کسی غیر ملکی اکاؤنٹ میں منتقل کر دی جاتی ہوگی..... مجھے شبہ ہے کہ اے ٹو کوئی بگڑا ہوا کاروباری ہے اور اس نے اصل دھندے کو چھوڑ کر مال بنانے کا آسان طریقہ اختیار کیا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آڑ کے لیے اس نے دو چار کاروباری گورکھ دھندے بھی پھیلا رکھے ہوں۔" آخری فقرے ادا کرتے ہوئے میرے ذہن میں ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا نام گھوم رہا تھا۔

"کاروباری آدمی کتنا بھی بگڑ جائے، قتل و غارتگری کے سفاکانہ فیصلے کبھی صادر نہیں کر سکتا۔" اس نے بے اعتباری سے کہا۔

"اشیائے خورد و نوش میں سستے اور مہلک اجزاء کی ملاوٹ، ناقابلِ استعمال اور متروک دواؤں کی فروخت اور تشہیر بھی اقدامِ قتل سے کم نہیں......"

"ایک وار میں کسی کو ہلاک کر دینا اس سے قطعی مختلف ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "ملاوٹ کرنے والا کسی خاص دشمن کو نشانہ نہیں بناتا، اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا بیچا ہوا زہر کون استعمال کرے گا۔ ان سب کا اثر دھیمے دھیمے ہوتا ہے اور وجۂ قتل کبھی سامنے نہیں آتی لیکن اے ٹو تو گولیاں چلواتا ہے اور شاید اپنے دشمن کے انجام سے لطف اندوز بھی ہوتا ہو۔"

"پیسہ کمانے کی ہوس انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔" میں نے پُرزور لہجے میں کہا۔ "شاید تمھیں یقین نہ آئے لیکن میں جانتا ہوں کہ اے ٹو کا تعلق ایک معتبر کاروباری ادارے سے ہے جو برآمدات کی آڑ میں ہیروئن کی اسمگلنگ کرتا ہے۔"

"اس کے باوجود تم اے ٹو تک نہیں پہنچ سکے؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ادارہ موجود ہے لیکن سربراہ تک رسائی ناممکن ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے بے اعتباری سے کہا۔ "کاروباری ادارہ قائم ہے تو اس کے روزمرہ کے کاموں کی انجام دہی کون کرتا ہوگا؟"

"ملازم ایسے ہی مواقع پر کام آتے ہیں جو کام لوگ خود نہ کرنا چاہیں یا نہ جانتے ہوں، ان ہی کے لیے تنخواہ دار رکھے جاتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ملازم تو اس سے واقف ہوں گے؟" میرے انکشافات اس کے لیے ناقابلِ یقین ثابت ہو رہے تھے۔

"اس نے ایک شخص کو بلیک میل کر کے اپنا مختارِ عام مقرر کیا اور وہی سارے کام چلاتا ہے۔ اس نے آج تک اس شخص کی صورت نہیں دیکھی جس کے لیے وہ کام کرتا ہے۔"

"تم کہتے ہو تو مانے لیتا ہوں ورنہ یہ بات قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی..... شاید مافیا کی تنظیم بھی اس قدر پُراسرار نہ ہوگی۔ آدمی کو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کے سامنے تو آنا ہی پڑتا ہے۔"

"اب ہم مل ہی بیٹھے ہیں تو کچھ روز میں ہر چیز تمھارے سامنے آجائے گی۔" میں نے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔ "اب یہی دیکھ لو کہ ہم برسوں کے ساتھی ہیں لیکن تمھیں بھول کر بھی شبہ نہیں ہوا ہوگا کہ شناختی کوڈ کی آڑ میں میں ہی تمھیں ساری ہدایات دیتا تھا۔"

"بعض اوقات تو زندگی تلخ کر دیتے تھے تم۔" وہ بڑبڑایا۔

"تمھیں ستانے میں مزہ آتا تھا، جب بھی تمھاری بیگم بھڑکی ہوئی ہوتی تھی، میں دانستہ تم سے رجوع کر بیٹھتا تھا۔ اس کے بعد تمھاری دکھ بھری کہانی سننے میں بڑا لطف آتا تھا۔"

"لعنت ہو تمھارے لطف پر۔" وہ خجالت آمیز لہجے میں بولا۔ "اگر اس وقت مجھے تم پر شبہ بھی ہو جاتا تو تمھیں گولی ہی مار دیتا۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ تمھاری ان بونگی حرکتوں کی بنا پر کئی بار میرے گھر میں بدترین تلخیوں نے جنم لیا تھا۔ ایک بار تو سلمیٰ میکے لوٹنے پر تل گئی تھی۔"

"بیوی بھی عجیب شے ہے۔" میں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "ساتھ رہے تو آدمی پیچھا چھڑانے کے چکر میں رہتا ہے اور جانے کا نام لے تو شوہر مجنوں کا باپ بن جاتا ہے....."

"ابھی تمھارے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "شادی کر لو پھر بہتیری باتیں خود بخود سمجھ میں آجائیں گی۔"

"تو پھر رشتہ تلاش کرو نا کوئی۔" میں نے اسے چھیڑنے کی نیت سے کہا۔

"کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"سامنے دیکھو ورنہ کار لڑا بیٹھو گے۔" میں نے کہا۔ "سنجیدہ ہونے کے لیے سر کے بل کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب مجھے بھی کسی کسی وقت تنہائی کا احساس کھانے لگتا ہے۔"

"دیکھو، میں بتاؤں گا۔" وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ غالباً اس کے ذہن میں دو چار نام پہلے سے موجود تھے میں نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ اگر غزالہ کو اس گفتگو کی بھنک بھی مل جاتی تو صدمے سے اس کا برا حال ہو جاتا۔

ہم جہانگیر کے گھر واپس پہنچے تو کئی بار ہارن بجانے کے بعد پھاٹک کھولا گیا۔ غالباً ملازمین اس کی ہدایت کے مطابق واقعی عمارت کے اندرونی حصوں میں دبکے ہوئے تھے۔

"یہ رخشی کون ہے؟" ڈرائنگ روم میں گلاسوں میں برف کے ڈلے ڈالتے ہوئے جہانگیر پوچھ بیٹھا۔

"ایک لڑکی ہے۔" میں نے اپنا گلاس سنبھالتے ہوئے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔ "دیکھو گے تو پسند کر دو گے۔"

"پسند ہے تو اسی سے بات کیوں نہیں کرتے؟" جہانگیر نے اتنی سادگی سے سوال کیا کہ میری کھوپڑی بھنا گئی۔

"ملے بغیر ہی تمھاری عقل خبط ہو کر رہ گئی ہے۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "تم نے سنا نہیں تھا کہ قاسم سے اس کے کیسے مراسم ہیں، ایسی آبرو باختہ عورت کے بارے میں تو سوچنا بھی بد ذوقی ہے۔"

"خفا ہو گئے۔" اس نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ "میں تو بس یہ اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ تم کہیں اور تو دلچسپی نہیں لے رہے، اسی لیے رخشی کا ذکر نکال بیٹھا تھا۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے محض مذاق میں ایک شوشا چھوڑا تھا اور وہ احمق شاید درمیانی عرصے میں بھی میری شادی کرانے کے امکانات پر غور کرتا رہا تھا۔

"بس اب زبان بند رکھو۔" میں نے اس موضوع سے پیچھا چھڑانے کے لیے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کسی اور کا نام لیا تو منہ پر گلاس خالی کر دوں گا۔"

اسی وقت ملحقہ راہداری سے فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور جہانگیر گلاس لیے ادھر ہو لیا۔ دوسری گھنٹی کے دوران میں ہی شاید اس نے ریسیور اٹھا لیا تھا کیونکہ گھنٹی ادھوری رہ گئی تھی۔

"تمھارا فون ہے ڈیئی!" اس نے وہیں سے خوشدلانہ لہجے میں ہانک لگائی۔

میں نے چونک کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ جہانگیر کے گھر میرے لیے کون فون کر سکتا تھا؟

"کون ہے؟" راستے میں اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"یہ تو تم ہی بتا سکو گے۔" وہ شوخ لہجے میں بولا۔ "جو بھی ہے آواز بڑی سریلی پائی ہے۔"

نسوانی آواز کا اشارہ پاتے ہی میرا ذہن غزالہ کی طرف گیا تھا لیکن اسے نہ جہانگیر کے گھر کا نمبر معلوم تھا اور نہ ہی یہ علم تھا کہ اس وقت میں وہاں موجود تھا۔

"ہیلو۔" میں نے تپائی سے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں کہا۔

"بولنے کی ضرورت نہیں، بس خاموشی سے میری بات سنتے جاؤ۔" ریسیور میں ابھرنے والی اے ٹو کی سرد اور خوفناک آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اترتی چلی گئی۔ "میں شام سے تمھیں ٹرائی کر رہا ہوں مگر تم لاپتا ہو، میں تمھیں بیس منٹ بعد تمھارے گھر فون کروں گا، فوراً وہاں پہنچو۔"

اور میرے جواب سے پہلے ہی دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

میں چند ثانیوں تک بے جان ریسیور کان سے لگائے کسی بُت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں اور دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی تھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اے ٹو کو مجھ سے کون سا اہم کام آپڑا تھا کہ میری تلاش میں اسے جہانگیر کے گھر فون کرنے کی ضرورت پیش آگئی؟ ریسیور کریڈل پر ڈال کر میں نے وہیں کھڑے کھڑے گلاس خالی کر دیا۔

"بڑی مختصر سی گفتگو ہوئی تمھاری؟" جہانگیر نے مجھے واپس لوٹتے دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"کام کی باتیں مختصر ہی ہوتی ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہوں۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے سر کو جنبش دی۔ "بلاوا تو نہیں تھا تمھارا؟"

"بس یہی سمجھ لو، میں جا رہا ہوں۔ ذرا ضروری کام ہے۔" میں نے بے پروائی اختیار کرتے ہوئے کہا لیکن ابتدائی جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا اے ٹو ہی نے آواز بدل کر جہانگیر کو دھوکا دیا تھا یا اس سے پہلے فون پر واقعی کوئی عورت رہی تھی، اور اگر وہ کوئی عورت ہی تھی تو یقیناً اے ٹو

کی رازداں رہی ہوگی۔ شاید روپ کے ساتھ اس کے بہروپ سے بھی واقف رہی ہو مگر وہ تھی کون؟

جہانگیر نے عجلت پر میرا مضحکہ اڑایا۔ عورتوں کی فطرت اور ان سے دوستی کے فلسفے پر ایک مختصر سی تقریر جھاڑ کر مجھے روکنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ہم تینوں کے سازشی اتحاد کے بعد وہ اسے ٹو کی پہلی اور نہایت غیر معمولی فون کال تھی اور میں ہر قیمت پر مقررہ وقت پر گھر پہنچنا چاہتا تھا لہٰذا اس کے ہر مشورے کو ٹال کر فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

سلطان شاہ گھر پر نہایت بے چینی کے ساتھ میرا منتظر تھا۔ وقت گزاری کے لیے وہ میز پر پتے پھیلا کر اکیلا ہی کچھ کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کارڈز سمیٹ کر اٹھ گیا۔

"بیٹھے رہو، تکلف کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔ "دو چار دن جم کر احتیاط کرو گے تو بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"میں ٹھیک ہوں، میری پروا نہ کرو۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "گھر میں پڑے پڑے بس یہی سوچتا رہا کہ تم نجانے کیا کرتے پھر رہے ہو... تمھارے بارے میں چار مرتبہ فون بھی آ چکا ہے، کوئی تم سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔"

"مرد تھا یا عورت؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"مرد ہی تھا، چاروں بار تمھاری غیر موجودگی کی اطلاع پاتے ہی مزید کچھ کہے بغیر اس نے فون بند کر دیا تھا۔"

"اے ٹو تھا وہ، اسی کی ہدایت پر میں اس وقت یہاں پہنچا ہوں۔"

"اس سے کیسے رابطہ ہو گیا تمھارا؟"

میں اسے تفصیل سنانے لگا اور وہ حیران رہ گیا پھر میں نے اسے قاسم سے ہونے والے سمجھوتے سے بھی باخبر کر دیا۔ اسی ضمن میں دلاور خان کا ذکر بھی آ گیا کیونکہ اس کی کراچی آمد کی اطلاع مجھے سلطان شاہ سے ہی ملی تھی۔

"بڑا دکھ ہوا اس کا انجام سن کر۔" وہ متاسفانہ لہجے میں بولا۔ "دلاور خان وہ آدمی تھا جس کی صورت دیکھ کر دشمنوں کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ ہر وقت جان ہتھیلی پر لیے مرنے مارنے پر آمادہ رہتا تھا مگر اب ہیروئن کا عادی ہونے کے بعد کسی خارش زدہ کتے سے بھی بدتر ہو کر رہ گیا ہوگا۔ قاسم واقعی بہت مکار ہے۔"

"یہ یاد رکھنا کہ اب وہ ہمارا ساتھی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے عہد کی پابندی کروں گا۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "جس دن تمھارا اشارہ مل گیا اس کے سارے بدن کو اس طرح داغ دار کروں گا کہ وہ عمر بھر کے لیے معذور ہو کر رہ جائے گا۔"

"شاید اب اسے ٹو کا آخری وقت قریب آ گیا ہے جو حالات خود بخود سازگار ہوتے جا رہے ہیں۔ فی الحال ہمیں اپنی ساری توجہ اسی ایک محاذ پر رکھنی چاہیے ورنہ ہم غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔"

میں اس سے باتیں کرنے کے ساتھ رسٹ واچ کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ اے ٹو کے دیے ہوئے وقت سے دس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی تو میں نے پھرتی کے ساتھ ریسیور اٹھا لیا۔

"مشتبہ جوڑے کا کیا رہا؟" ریسیور اٹھاتے ہی مجھے اے ٹو کی خشک اور تحکم آمیز آواز سنائی دی۔

"آج ڈاک سے مجھے لڑکی کی تصویر مل گئی ہے، میں نے اس کی کئی نقلیں بنوا کر اپنے آدمیوں کو دے دی ہیں لیکن ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ جھوٹ بولا۔

"اس لڑکی کو ہر قیمت پر تلاش کرنا ہے۔" اس کے لہجے میں ترشی عود کر آئی۔ "تمھاری ناکامی کی صورت میں مجھے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔"

اس کے آخری الفاظ کسی ہتھوڑے کی طرح میری سماعت سے ٹکرائے مگر میں نے سنبھالا لے کر جلدی سے کہا۔ "میں پوری کوشش کر رہا ہوں جناب... شاید کچھ وقت لگے لیکن کامیابی ضرور ہوگی۔"

"مجھے تمھاری کوششوں سے نہیں، نتائج سے دلچسپی ہے۔" اس کے الفاظ میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔ "تم وقت چاہتے ہو اور میرے لیے ہر لمحہ بہت قیمتی ہے... شہر میں مال کی کیا پوزیشن ہے؟"

"مال اب پہنچنا چاہیے ورنہ سپلائی میں خلل پڑنے کے امکانات ہیں۔"

"کل آدھا ٹن مال آ رہا ہے، اسی کے ساتھ مختلف ساخت کے چار سوٹ کیس ہیں۔ ان میں پرانے کپڑے وغیرہ بھرے ہوئے ہیں، انھیں تلف کرا دینا۔ تمھارے کیریئرز اپنا سامان ان ہی سوٹ کیسوں میں لے جائیں گے۔ ہر سوٹ کیس کی جیب میں ایک رقعہ موجود ہے جس پر بیرونی ممالک میں سوٹ کیس وصول کرنے والے کا نام، پتا اور کوڈ درج ہے۔ تمھارے آدمی وہ سوٹ کیس مقررہ آدمی کو دے کر لوٹ آئیں گے۔ آدمی تیار ہیں تمھارے؟"

"جی ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "سب طالب علم ہی ہیں۔"

میں نے مال کے بارے میں دریافت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جس انداز میں سوٹ کیسوں کی ترسیل کا ذکر کر رہا تھا اس کی بنا پر یہ سمجھ لینا دشوار نہیں تھا کہ ہیروئن کی طے شدہ مقدار پہلے ہی سے ان سوٹ کیسوں میں چھپا دی گئی تھی۔

"یہ ان چاروں کا آزمائشی سفر ہوگا۔ سوٹ کیس عام ساخت کے اور بالکل خالی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس حد تک محتاط اور قابلِ اعتماد ہیں۔ اگلے پھیرے میں ان سے اصل کام لیا جائے گا۔" اس نے یہ انکشاف کر کے مجھے چونکا دیا لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اگر پہلی بار خالی سوٹ کیس ہی بھیجنے تھے تو وہ میں بھی بازار سے خرید کر دے سکتا تھا۔ باہر سے سوٹ کیس

آنے کا مطلب تھا کہ ان کی کسی خفیہ تہہ میں مال چھپا دیا گیا تھا جس کا بادی النظر میں سراغ لگانا ناممکنات میں سے تھا۔

"قاسم پر مسلسل نگاہ رہنی چاہیے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اس پر دن بدن شبہات بڑھتے جا رہے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے میرا جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اگلا دن میرے لیے بہت مصروفیت لے کر طلوع ہوا۔

میں ناشتے کی میز پر ہی تھا کہ جہانگیر کا فون آ گیا۔ اس سے پتا چلا کہ پچھلی رات مال کی فروخت کے حساب کتاب پر نادر کا ایک بڑی پارٹی سے تصادم ہو گیا اور نادر نے بے دریغ گولیاں چلا کر تین افراد کو لہولہان کر دیا۔ اپنی اس حماقت کی پاداش میں وہ گرفتار ہونے سے بال بال بچا تھا لیکن پولیس اس کی تلاش میں تھی اور وہ رات گئے پناہ لینے کے لیے جہانگیر کے گھر جا پہنچا تھا۔

"اسے اپنے گھر سے فوراً ہٹا دو اور کسی عدالت سے اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کا بندوبست کراؤ، ایسا نہ ہو کہ تم خود کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا... آج صبح سویرے مال پہنچا ہے، اس میں چار سوٹ کیس تمھارے لیے ہیں، وہ میں نے جیوا ہاؤز کے ڈرائنگ روم میں رکھوا دیے ہیں، جب چاہو وہاں سے لے لینا۔"

"زیادہ بڑے یا وزنی تو نہیں ہیں؟"

"تمھاری گاڑی میں آ جائیں گے، کیا آیا ہے ان میں؟"

"پرانے کپڑے بھرے ہوئے ہیں، مجھے اطلاع ملی تھی کہ وہ رات تک پہنچیں گے۔"

"سمجھا۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "شاید ان کی ساخت میں گنجائش رکھی گئی ہوگی...."

"باتوں میں وقت ضائع نہ کرو، پہلے نادر کا بندوبست کرو، باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

سلسلہ منقطع کر کے میں نے اپنی تیاری مکمل کی اور سیدھا اکبر کی علاج گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر کا رخ کرنے کا دہرا مقصد تھا۔ اول تو کامران کی خبر گیری، دوئم وہاں رخشی کا سراغ لگانا۔

قاسم پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ میں رخشی کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ میرے لیے قاسم کا یہ انکشاف حیرتناک ثابت ہوا تھا کہ رخشی صحت مند ہوتے ہوئے بھی نفسیاتی اور منشیات کے عادی مریضوں کے درمیان پناہ گزین تھی۔

میں نے اسپتال پہنچ کر اسپتال میں موجود مریضوں کی فہرست پر نگاہ دوڑائی تو اس میں تین عورتوں کے نام ضرور موجود تھے مگر رخشی کا نام کہیں نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی مفروضہ نام کے تحت وہاں مقیم تھی۔

کامران اپنے کمرے میں آرام دہ بستر پر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ مجھے اس کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر فلور پر موجود خوبصورت ڈیوٹی نرس تیزی سے کمرے میں آئی تھی۔

"اسے ڈسٹرب نہ کیجیے گا۔" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ملتجیانہ لہجے میں بولی تھی۔ "مریض اس وقت ٹرانکولائزر کے زیر اثر ہے۔"

"یہاں اس کی پہلی رات تھی، تنگ تو نہیں کیا آپ لوگوں کو؟" میں نے خوش اخلاقی کے ساتھ سوال کیا۔

"نہیں۔ کوئی خاص پریشانی تو نہیں ہوئی۔"

"عام مریضوں کے مقابلے میں ایڈکٹ زیادہ ہی دشوار ثابت ہوتے ہوں گے۔" میں نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ پھریری لے کر مسکرا دی۔ "شروع میں مریض سب کچھ بھول جاتا ہے، اسے بس نشہ ہی یاد رہتا ہے۔ ہیروئن کے مریضوں کی حالت تو بہت قابلِ رحم ہوتی ہے، کبھی کبھی تو ترس کھا کر نشہ فراہم کرنے کی ہمدردانہ خواہش ہمارے دل میں بھی جنم لینے لگتی ہے۔"

"عورتیں زیادہ خطرناک ہو جاتی ہیں یا مرد؟"

اس نے آنکھیں سکوڑ کر اپنے سر کو ایک ادا سے جنبش دی پھر بولی۔ "عورتوں کی حالت زیادہ ابتر ہوتی ہے۔"

"لیکن آپ کی ایک مریضہ تو بالکل ہی نارمل لگتی ہے۔" میں نے موقع پاتے ہی مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"کس کو دیکھ لیا آپ نے؟" وہ پہلی بار قدرے بے تکلفانہ لہجے میں بولی۔

"کل نیچے ریسپشن کے قریب دیکھا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے بلاتامل رخشی کا حلیہ دہرا دیا۔

"اوہ وہ حنا۔" وہ ایک دم ہنس پڑی۔ "وہ بہت دلچسپ لڑکی ہے۔ دو تین دن پہلے ہی آئی ہے اور ابھی تک بالکل نارمل ہے۔ فائل سے پتا چلا کہ کبھی کبھی اسے اچانک ہسٹیریا جیسے دورے پڑتے ہیں۔"

مریضوں میں گھری رہنے والی اس نرس کو اس بے فکری گفتگو سے شاید خاصی خوشی ہوئی تھی کیونکہ وہ کچھ دیر تک وہیں رکی رہی۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ میں کامران کی طرف سے بالکل بے فکر رہوں کیونکہ اس علاج گاہ میں علاج کے ساتھ مریضوں کی جملہ ضروریات کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔

اس کے جانے کے بعد میں کامران کے کمرے سے رخصت ہو کر اوپری منزل کے ساتویں کمرے پر جا پہنچا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک کے جواب میں کنڈی گرانے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔

میرے سامنے رخشی موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت جھانک رہی تھی۔

"اندر آنے کو نہیں کہو گی؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سکوت توڑا۔

"تت.... تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"تم میرے آدمی کی نگرانی میں یہاں پہنچی تھیں۔" میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "میں بتا چکا ہوں کہ تم مجھے فریب نہیں دے سکو گی، میں کسی آسیب کی طرح پاتال تک تمھارا پیچھا کروں گا۔"

"یعنی تم مل بیٹھنے کے لیے تیار نہیں ہو؟" وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"آیا تو اسی لیے ہوں۔" میں نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "دیکھنا ہے کہ تم کہاں تک پیش قدمی کرتی ہو۔"

"مذاق نہیں، میں سنجیدگی سے پوچھ رہی ہوں۔"

"میں سنجیدہ ہوں۔ قاسم سے بات طے ہو گئی ہے۔ ہم مل کر کام کریں گے، تمھارے بارے میں اس نے چھوٹ دے دی ہے۔ تمھیں اعتراض نہ ہو تو وہ ہمارے مراسم سے چشم پوشی برتتا رہے گا۔"

"میں کوئی بے جان مجسمہ نہیں ہوں۔" وہ چیخ کر بولی۔ "جو وہ میرے بارے میں ایسے فیصلے صادر کرے، اپنی پسند اور ناپسند میں خود سمجھتی ہوں، اسے مشورے دینے کا کوئی حق نہیں۔"

"میں اسے بتا دوں گا۔" میں نے خلوصِ دل کے ساتھ کہا۔

"اپنی اوقات جان کر اسے زیادہ خوشی نہیں ہو گی۔"

"کیا اس وقت مجھے صرف یہ جتانے آئے ہو کہ تم میری یہاں موجودگی سے باخبر ہو؟"

"یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہاں سے اب کہاں جاؤ گی؟"

"کچھ روز یہیں رہنے کا ارادہ ہے یہ جگہ محفوظ بھی ہے اور پُرسکون بھی۔"

"باہر کس سے خطرہ ہے؟ ہمارا آپس کا معاملہ تو نمٹ ہی گیا ہے؟"

"فی الحال میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اے ٹو نے براہِ راست کسی کو میری تلاش میں روانہ کر دیا ہو۔ وہ جب لڑتا ہے تو بیک وقت سارے امکانی محاذ کھول دیتا ہے، تم نے اسے میرے پیچھے لگا کر اچھا نہیں کیا۔"

"اے ٹو کے بارے میں تم اور کیا جانتی ہو؟"

"بہت کچھ اور کچھ بھی نہیں۔" اس نے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"کسی اجنبی کے لیے بہت کچھ جانتی ہوں تمھارے لیے کچھ بھی نہیں۔" وہ دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں جو اس کی ذات پر روشنی ڈال سکے۔"

"پھر تمھارے پاس وقت برباد کرنا بیکار ہے۔"

اس نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ دفتر پہنچ کر سب سے پہلے میں نے غزالہ کو فون کیا۔ اسے کامران کی خیریت سے آگاہ کیا تو میری توقع کے مطابق وہ بہت خوش ہوئی اور احسان مندانہ لہجے میں میری ہمدردی کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ اس نے مجھے دوپہر کے کھانے پر گھر بلانا چاہا لیکن میں نے شام میں چکر لگانے کا وعدہ کر کے معذرت کر لی۔

دو بجے تک دفتر کے کاموں سے فارغ ہو کر میں جیوا ہاؤز کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں کار سے اترتے ہی محافظوں نے وہ اطلاع دہرائی جو میں جہانگیر سے سن چکا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ہاتھ سے بنے ہوئے درمیانی سائز کے چار چرمی سوٹ کیس موجود تھے۔ انھیں کھولا تو اندر واقعی استعمال شدہ کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ سوٹ کیس خالی کر کے میں نے انھیں ہر طرح الٹ پلٹ کر دیکھ لیا لیکن کوئی ایسی بات نوٹ نہ کر سکا جو کسی خفیہ تہہ کی نشاندہی کرتی ہو البتہ ہر سوٹ کیس کی جیب میں ایک ٹائپ کیا ہوا رقعہ موجود تھا۔ تین غیر ملکی ناموں اور کوڈ ورڈز کے ساتھ مغربی یورپ کے مختلف شہروں کے تفصیلی پتے اور فون نمبر موجود تھے چوتھے رقعہ پر نیویارک کے کسی گیسولین اسٹیشن پر کام کرنے والے پاکستانی کیشیئر کا نام پتا درج تھا۔

میری دانست میں وہ سوٹ کیس ساتھ لیے پھرنا حماقت ہوتا۔ حامد کے ذریعہ منتخب کیے ہوئے کیریئرز کو میں اپنا گھر دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ کسی ہوٹل میں کمرہ حاصل کر کے پرانا طریقۂ کار استعمال کرتا تو سوٹ کیس لے جانے والے غیر ضروری طور پر لوگوں کی نگاہوں میں آتے اور کھیل خراب ہو جاتا لہٰذا میں نے اس بار جیوا ہاؤز کو اڈے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

شام کے وقت میں موتی دادا کے اڈے سے تھوڑی دور رک گیا۔ پہلی بار میں نے حامد پر اسی طرح ہاتھ ڈالا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک بار ہیروئن کی فروخت میں ملوث ہو جانے کے بعد حامد کے لیے اس کام سے کنارہ کش ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ لہٰذا یہ بات اٹل تھی کہ وہ مقررہ وقت پر موتی دادا سے مال لینے آتا۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اس کی جھلک نظر آئی تو میں نے انجن اسٹارٹ کر کے کار آگے بڑھا دی۔ وہ ہارن کی آواز سن کر چونکا

اور کار پہچانتے ہی اس کا چہرہ اتر گیا۔ میرے کسی اشارے کا انتظار کیے بغیر وہ دروازہ کھول کر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور میں نے کار آگے بڑھا دی۔

"کیا بات ہے آج کچھ اداس نظر آ رہے ہو؟" کچھ دیر کے سکوت کے بعد میں نے اسے چھیڑا۔

"تمھیں دیکھ کر دلی صدمہ ہوا ہے۔" اس نے سر اٹھائے بغیر بوجھل مگر دوٹوک لہجے میں کہا اور میرے ردِعمل پر توجہ دیے بغیر کہتا رہا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ شاید تم سے جان ہی چھوٹ گئی۔ ہو سکتا ہے تم کسی حادثے میں کہیں مر کھپ گئے ہو لیکن تم پھر موجود ہو۔ یہ میرے لیے کوئی خوشی کی بات تو نہیں ہے۔"

"کوّوں کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرا کرتے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "صاف گوئی اچھی بات ہے مگر اتنی بے باکی بعض اوقات مہنگی پڑ جاتی ہے۔"

"کتنی مہنگی پڑے گی؟" وہ مضحکانہ لہجے میں بولا۔ "جان سے زیادہ تو کچھ نہیں لے سکتی۔ میں آج کل ویسے ہی زندگی سے بیزار ہوں۔ اپنے وجود تک سے گھن آنے لگی ہے۔"

"کیوں؟ تم نے کلا تو نہیں کاٹا کسی کا؟"

"کسی کو زندگی بھر کے لیے معذور اور اپاہج بنا دینے کو میں قتل سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"معذور اور اپاہج؟" میں نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔ "کیا تصادم ہو گیا تھا کسی سے؟"

"تصادم تو پہلے روز سے جاری ہے۔ یونیورسٹی میں اِکا دُکا تماشے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ آدمی کا ہاتھ پیر ٹوٹ جائے تو اس کے باقی حواس کام کرتے رہتے ہیں لیکن نشہ ٹوٹ جائے تو آدمی نہ زندہ رہتا ہے نہ مردہ کہلاتا ہے اور ہیروئن کے عادیوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ پرانے عادی، نئے پنچھیوں کو پھانستے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کا تاوان دوسروں کو گمراہ کر کے وصول کر رہے ہیں۔ میں زیادہ مقدار فراہم کرنے میں تردد کرتا ہوں تو لڑکے مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں نے اس گھناؤنے دھندے میں ضرورت سے زیادہ کما لیا ہے اور اب مجھ پر ہوس طاری ہو گئی ہے۔"

"یعنی مال روک کر دام بڑھانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"یونیورسٹی میں ہیروئن کو میں نے خود متعارف کرایا مگر اب اس... سے میں خوفزدہ ہوں۔ مجھے اپنی عافیت کی فکر لاحق ہو گئی ہے... اب تک شاید میں اس دھندے سے تائب ہو گیا ہوتا لیکن یونیورسٹی میں رہتے ہوئے ایسا کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ نشہ بازوں کا دباؤ اتنا شدید ہے کہ مجھے چھٹی کے دنوں میں بھی فراہمی برقرار رکھنی پڑتی ہے جس دن ناغہ کیا وہ لوگ مار مار کر میرا حشر خراب کر دیں گے۔"

"تو یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دو۔" میں نے اسے ٹٹولنے کی نیت سے کہا۔

"اور ایک پیشہ ور منشیات فروش بن جاؤں۔" اس کا لہجہ بے حد زہریلا ہو گیا۔ "لیکن تم سے کیا شکوہ، تمھارا تو سارا وجود ہی شاید ایسی آمدنی پر پلا بڑھا ہو مگر میرے اپنے مستقبل کے خواب ہیں۔ بارہ برس یونیورسٹی سے باہر پڑھتا رہا، اب ڈیڑھ سال جامعہ میں گزار چکا ہوں۔ اتنی ہی مدت اور باقی رہ گئی ہے۔ اس کے بعد شاید میں تمھاری طرح شان و شوکت سے تو نہ رہ سکوں لیکن عزت کی روزی کمانے کے قابل ضرور ہو جاؤں گا۔"

اس نے مجھ پر بدترین اور گھناؤنا طنز کیا تھا لیکن میں اسے پی گیا۔ میں گمراہ ضرور تھا لیکن میرا ضمیر زندہ تھا جو ہر قدم پر نیکی اور بدی کا امتیاز واضح کرتا رہتا تھا۔ اندر سے میری بھی وہی خواہش تھی جو حامد کی تھی لیکن وہ انسان ہی کیا جو اپنی ہر آرزو کو پایۂ تکمیل کو پہنچا لے۔ میں اسے چھیڑنے سے باز نہ رہ سکا۔

"برس میں دو مہینے پڑھائی ہوتی ہے۔ ڈیڑھ برس اور گزار لیا تو کون سا تیر مار لو گے — کاغذ کا ایک پرزہ ملے گا جسے کوئی نہیں پوچھتا۔ شہر میں ہزاروں ڈگری یافتہ گھومتے پھرتے ہیں۔ ملازمت کے ساتھ ہی انھیں سٹ پرالش دکانوں پر سستے اور مضبوط جوتوں کی تلاش رہتی ہے جو ملازمت ملنے تک ساتھ دے سکیں۔"

میری نگاہیں بظاہر سڑک پر مرکوز تھیں مگر میں کن انکھیوں سے اس ناپختہ کار لڑکے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ لاجواب تو ہو گیا تھا مگر مجھے خونخوار نگاہوں سے گھورے جا رہا تھا۔

"تم ذہین، تعلیم یافتہ اور نوجوان ہو — جاہل جرم کرتا ہے اور اپنی لغزشوں سے پکڑا جاتا ہے۔ ذہین آدمی کوئی کام کرتا ہے تو اس کی گرفت ناممکن ہوتی ہے — عمر کا ہر لمحہ جو تم گزار رہے ہو لوٹ کر نہیں آئے گا۔" میں نے توقف کے بعد اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "معاشرے میں بہتیرے موقع شناس جائز اور ناجائز کی تفریق میں پڑے بغیر دونوں ہاتھوں سے پیسہ بٹور رہے ہیں اور تم جیسے بیسیوں ضرورت مند ہر روز ان کی چوکھٹوں پر حاضری دیتے ہیں۔ محض اس امید میں کہ روزی ملے تو جبری روزوں سے نجات ملے۔"

"میرا دماغ خراب مت کرو۔" وہ جھلّائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ بتاؤ کہ آج مجھ پر کیوں نظرِ کرم کی ہے؟"

"سوچ رہا تھا کہ تمھیں بھی ایک بار باہر کی دنیا دکھا دوں۔"

"اندر کی دنیا میں تم جیسے مل جائیں تو باہر جانے کی کیا ضرورت

ہے۔" وہ جلے بھنے لہجے میں بولا اور میں بمشکل بے ساختہ مسکراہٹ کو ہونٹوں پر طلوع ہونے سے روک سکا۔ "خضر بن کر گمراہ کرنے کے بجائے اپنا مدعا بیان کرو، میں تمھاری کار میں گھومتا ہوا دیکھا جانا بھی پسند نہیں کرتا۔ کیا خبر کل ہی میرے دروازے پر پولیس دستک دے رہی ہو۔"

"تمھارے دوستوں کی روانگی کا وقت آگیا ہے...... ان سے میری فوری ملاقات ضروری ہوگئی ہے۔"

"کیا تم انھیں معاف نہیں کرسکتے؟" اس نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔ "تمھیں اپنی دنیا میں بہت سے تجربہ کار لوگ مل جائیں گے پھر نئے خون کو کیوں گندہ کرتے ہو؟"

"تجربہ کاروں کو صرف ہم ہی نہیں، ہمارے دشمن، سرکاری ادارے بھی پہچانتے ہیں، وہ جہاز پر قدم رکھنے سے پہلے دھر لیے جائیں گے۔ نئے چہروں کے لیے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہوتا اور پھر تمھارے دوستوں پر مفت میں دنیا دیکھنے کی دھن سوار ہے۔ میں انھیں نظر انداز کردوں گا تو وہ کسی اور کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔ میرے مزاج کی نرمی کا اندازہ تم اسی بات سے کرسکتے ہو کہ تمھاری جو گستاخانہ تقریر میں نے خاموشی سے سن لی، اس پر کوئی دوسرا تم پر بہت پہلے ہاتھ اٹھا چکا ہوتا۔"

"میں اٹھنے والے ہاتھوں کو جھکانا بھی جانتا ہوں۔" اس وقت وہ واقعی شیر ہو رہا تھا۔ "تم یہ بتاؤ کہ ان سے کب اور کہاں ملنا چاہتے ہو؟"

میں اسے جیوا ہاؤز کا محل وقوع سمجھانے لگا۔ وہ ان لوگوں کو اگلے دن لانے پر مُصر تھا لیکن تھوڑی سی بحث کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچنے پر تیار ہوگیا۔

اسے راستے میں اتار کر میں نے گاڑی کا رُخ گھر کی طرف کرلیا کیونکہ اس ڈیڑھ گھنٹے کے لیے میرے پاس تفریح یا آوارہ گردی کے علاوہ کوئی مصروفیت باقی نہیں رہی تھی۔ گھر جاکر میں اس دوران میں تازہ دم ہوکر بآسانی قبل از وقت جیوا ہاؤز پہنچ سکتا تھا۔

میں اپنے خیالات کی رو میں ڈوبا گھر پہنچا تو پھاٹک پر ہی چوکیدار نے مجھے سرِشام کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی لیکن وہ مہمان کے حلیے کے علاوہ اس کی کوئی شناخت نہ بتا سکا۔ اس کے کہنے کے مطابق مہمان کو میری آمد تک ڈرائنگ روم ہی میں محدود رکھنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ مالکانہ دھونس کے ساتھ پورے گھر میں دندنا رہا تھا۔ اس دوران میں اس نے سلطان شاہ کے ساتھ بھی خاصا وقت گزارا تھا۔

میں چند ثانیوں تک کھلے ہوئے پھاٹک میں گاڑی روکے اس عجیب وغریب مہمان کے بارے میں سوچتا رہا۔ نجانے وہ کون تھا؛ واقعی دوست ہی تھا یا دوست کے روپ میں کوئی بڑا دشمن جو کوئی پرانا حساب چکانے کے لیے بے باکی کے ساتھ میرے گھر میں گھس آیا تھا۔

ہونہہ، جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ میں نے سر جھٹک کر اور ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھادی۔ اگر وہ میرا دشمن ہی تھا تو یہ کھلی ہوئی بزدلی تھی کہ وہ میرے گھر میں دندناتا پھر رہا تھا اور میں اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑا مخمصے کا شکار تھا۔ کار پورچ میں روکنے سے قبل میں نے ڈیش بورڈ کے خانے سے بھرا ہوا ریوالور نکال کر اسے اپنی جیب میں ڈال لیا تاکہ کسی فوری ہنگامے میں تہی دستی کی بنا پر پچھتانا نہ پڑے۔

میں کار سے اتر ہی رہا تھا کہ اندر سے ایک دراز قامت اور صحت مند شخص برآمدے میں نکل آیا۔ شاید پختہ فرش پر میری کار کے ٹائروں کے تیز شور نے اسے کسی کی آمد کا اشارہ دیا تھا۔

وہ جو بھی تھا، میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔

چوڑے چکلے شانوں اور کسرتی بدن پر کڑھا ہوا لمبے دامن کا سفید کرتا اسے بہت سج رہا تھا۔ آنکھوں میں عقابی چمک کو نمایاں تھی، چہرے پر ہلکی سی کرختگی پائی جاتی تھی جو شاید ہونٹوں پر موجود پتلی ترشی ہوئی مونچھوں کے باعث تھی۔ اس نے اپنے گھنے اور گھونگھریالے بالوں میں ہاتھ پھیر کر براہِ راست میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اسی کے ساتھ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ مچلنے لگی۔

"مجھے یوں نہ گھورو۔" اس نے مسکراتے ہوئے نرم آواز میں کہا۔ "اگر تم مجھے نہیں پہچانتے تو میں بھی تمھیں نہیں جانتا لیکن میرا خیال ہے کہ تم ہی تنویر ہو۔"

"ہوں تو تنویر ہی۔" میں نے برآمدے کی سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن میں چاہوں گا کہ تم بھی اپنا تعارف کرادو۔"

جوں ہی میں نے آخری سیڑھی عبور کی اس نے اچانک مجھے دونوں بانہوں میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لگالیا۔ "تعارف کرادوں؟ ارے تم اپنے خون کو نہیں پہچانتے۔" اس کے لہجے میں محبت آمیز شکوہ تھا، اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور برسوں پرانے واقعات ذہن میں گزرنے لگے۔

بڑی ماں اور ان کے دو بیٹے، جنھوں نے مجھے اور میری ماں کو والد صاحب کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد محض اس لیے گھر سے نکال دیا تھا کہ ہم ان کے لیے سوتیلے تھے۔ میں اپنی بدنصیب ماں کے ساتھ گھر سے نکالا گیا تو میری عمر کُل چار برس کی تھی پھر چودہ برس کی عمر میں مَیں نے اپنے ایک ہم جماعت کو طیش کے عالم میں بلیڈ کی تیز دھار سے زخمی کیا تو میری ماں اس چوکھٹ کا رُخ کرنے کی ہمت تک نہ کرسکی پھر پندرہ برس کی عمر میں جب مجھے ایک ساتھی پر قاتلانہ حملے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تو ماں اس دہلیز پر جا ہی پہنچی لیکن اسے وہاں سے دھتکار دیا گیا۔ ماں نے گھر کے اُٹھتے سے اپنے سہاگ کی نشانیاں تک فروخت کرکے میری ضمانت پر رہائی کا بندوبست کرایا اور خود مجھ سے ملے بغیر ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی۔

میں اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز تھا۔ اس نے مجھے اپنے خونِ جگر سے پالا تھا مگر میں بگڑ گیا کیونکہ میرا خمیر رشوت سے اٹھا تھا۔ میرے باپ منشی اقبال نے رشوت کی آمدنی سے بدمست ہوکر دوسری شادی رچائی تھی۔ اس طرح میں رزقِ حرام سے پیدا ہوا تھا۔ یہ سب میرے اختیار سے ماورا باتیں تھیں لیکن اپنی جگہ اٹل تھیں۔ ماں کی تمام تر کوششیں بھی مجھے سیدھی راہ پر نہ رکھ سکیں اور میں حالات کا شکار ہوتا چلا گیا۔ ماں کی خودکشی کے بعد میں نے لاہور چھوڑ دیا۔ وہاں کے عدالتی ریکارڈ کے مطابق شاید میں آج بھی مفرور مجرم تھا لیکن کراچی میں کوئی میرے ماضی سے واقف نہیں تھا۔ ایک غزالہ تھی جسے میں نے ہی سب کچھ بتادیا تھا۔

بڑی ماں اور ان کے بیٹوں نے مجھ پر بڑے ستم ڈھائے تھے لیکن وقت ہر درد کو بھلا دیتا ہے۔ چند روز پہلے جب میں لے لو کی تلاش میں لاہور گیا تو میرے دل میں ہوک سی اٹھی تھی، میں بڑی ماں کی تلاش میں اپنے پرانے محلے میں پہنچا تھا لیکن وہاں سے ان کا کوئی سراغ نہ ملنے کے بعد مایوس واپس لوٹ آیا تھا اور اب میرے گھر کے برآمدے میں ایک کڑیل جوان مجھے اپنے سینے سے چمٹائے لہو کے حوالے سے اپنی شناخت بتا رہا تھا تو وہ بڑی ماں کے دو بیٹوں میں سے ایک کے علاوہ بھلا اور کون ہوسکتا تھا۔ میرا خون کا رشتہ تو بس دو سوتیلے بھائیوں ہی سے تھا۔

یہ تمام خیالات ذہن میں پل بھر میں آکر گزر گئے اور میرے لبوں سے کانپتی ہوئی، مسرت آمیز آواز برآمد ہوئی۔ "کک کون..... تصویر بھائی؟"

"تصویر علی لاہور میں ہے۔" وہ پُرجوش انداز میں میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ "اسے یقین نہیں تھا کہ میں کراچی جیسے، آدمیوں کے گنجان جنگل میں تمھیں تلاش کرسکوں گا۔"

"بڑی ماں کیسی ہیں؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اپنے سوتیلے بھائی سے برسوں بعد غیر متوقع ملاقات کے باعث مجھ پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو چلی تھی۔ وقت نے ہر دکھ اور درد بھلا دیا تھا اور اس وقت صرف یہی احساس پورے وجود میں گونج رہا تھا کہ ملنے والا میرے باپ کی اولاد ہے۔

اور شاید اس کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ اس نے ہم ماں بیٹے کے ساتھ زیادتیاں کی تھیں لیکن اب شاید اپنے کیے پر پشیمان تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ لاہور سے مجھے ڈھونڈتا ہوا کراچی میں میرے گھر آ پہنچا تھا۔

"بڑی ماں ٹھیک ہیں۔" وہ میرے شانے پر محبت آمیز انداز میں ہاتھ رکھ کر اندر جاتے ہوئے بولا۔ "وقت وقت کی بات ہے۔ بائیس برس پہلے انھوں نے تمھیں، تمھاری ماں کے ساتھ گھر سے نکال دیا تھا مگر اب تمھارا نام سنتے ہی تڑپ اٹھی تھیں۔ بڑی آرزو ہے انھیں تم سے ملنے کی ـــ پرانی باتوں کو یاد کرکے اکثر روتی رہتی ہیں۔"

"پرانی باتوں کا ذکر نہ کرو توقیر بھائی۔" میری آواز بے اختیار رُندھ گئی۔ "میرے لیے تو یہی بہت بڑی بات ہے کہ تم ماضی پر خاک ڈال کر مجھ سے ملنے چلے آئے ہو۔"

وہ ڈرائنگ روم میں آکر بے فکری سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور بغور میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "بالکل ہی بدل گئے ہو تم تو ـــ ہر نقش بدل گیا ہے تمھارا ان سات آٹھ برسوں میں۔"

میں بھی والہانہ انداز میں مسکرا دیا۔ "میں خود تمھیں نہیں پہچان سکا تھا، خون کا حوالہ نہ دیتے تو شاید مجھ سے کوئی گستاخی بھی سرزد ہوجاتی۔"

"ہاں۔ وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔" وہ پہلو بدل کر شوخ لہجے میں بولا۔ "جیب ہلکی کرلو اپنی، کہیں بے دھیانی میں گولی چل ہی نہ جائے۔"

میں خفت آمیز انداز میں سر جھکا کر اندر چل دیا۔ اتنی ہمت نہیں ہوسکی تھی کہ ریوالور کے بارے میں کوئی وضاحت کرتا یا اسی کے سامنے جیب خالی کرلیتا۔ سیفٹی کیچ چڑھا کر میں نے ریوالور تکیے کے نیچے رکھا اور دوبارہ ڈرائنگ روم میں آبیٹھا۔

اس وقت خوشی سے میرا رواں رواں جھوم رہا تھا جیسے کھوئی ہوئی کوئی قیمتی شے واپس مل گئی ہو۔

"تمھارے ملازم بہت پریشان تھے۔" توقیر مزے لے لے کر بتا رہا تھا۔ "میں نے انھیں تم سے اپنا رشتہ نہیں بتایا تھا، بس تمھیں پوچھتا ہوا اندر گھس آیا تھا۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھائے رکھنا چاہتے تھے، میں نے تمھاری غیر موجودگی میں پورے گھر کا سروے شروع کیا تو وہ بوکھلا گئے تھے۔" پھر چونک کر بولا۔ "ہاں وہ اندر کون پڑا ہوا ہے؟ خاصا زخمی معلوم ہوتا ہے۔"

"میرا ایک دوست ہے، کچھ غنڈوں سے الجھ گیا تھا۔" میں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"باتیں مزے کی کرتا ہے ـــ وہ زخمی پڑا ہے، تمھاری جیب میں کوئی آتشیں اسلحہ تھا، آج کل کام کیا کررہے ہو تم؟" اس

نے دھیمے مگر معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

"ایک چھوٹی سی پلاسٹک فیکٹری ہے۔" میں نے منکسر المزاجی کے ساتھ کہا۔ "آج کل کراچی کا ماحول کچھ خراب ہے — یہاں رات کے اندھیرے میں چوریوں کے ساتھ دن دہاڑے ڈاکے بھی پڑنے لگے ہیں — حفاظتِ خود اختیاری کے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

"ابھی تک اکیلے ہی ہو....؟" اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"گھر بنا لیا ہے تو اب آباد بھی کر ہی لوں گا۔" میرے جواب پر وہ ہنس پڑا اور مجھے یک بیک یہ خیال آیا کہ آخر اسے میری کراچی میں موجودگی کا علم کیسے ہوا اور اس نے میرا پتا کیسے تلاش کر لیا۔

"تمھیں اچانک خیال کیسے آگیا میرا؟" میں نے سوال کیا۔

"چند روز پہلے بازار میں اچانک رمضان چاچا سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اسی نے بتایا تھا کہ کچھ دن پہلے تم ہم لوگوں کو ڈھونڈتے ہوئے پرانے محلے میں پہنچے تھے اور ناکام لوٹ آئے تھے۔ میں نے بڑی ماں کے سامنے ذکر کیا تو وہ بے چین ہوگئیں۔ ان ہی کے اصرار پر یہاں آیا ہوں۔"

"لیکن میرا پتا کہاں سے ملا؟"

"ٹیلی فون ڈائرکٹری میں تنویر علی تین ہی ہیں۔ باری باری تینوں نمبروں پر فون کیا اور یہاں چلا آیا کیونکہ دوسرے دونوں لب و لہجے سے ہی سندھی معلوم ہو رہے تھے۔ یہاں سے تمھارے کسی ملازم نے بتایا کہ اس کا صاحب پنجابی ہے، اصل نام خدا جانے کیا ہے مگر ڈینی صاحب کہلاتا ہے — تم ڈینی کب سے بن گئے؟"

"بس دوستوں نے ایک نام دے دیا اور وہی چل پڑا، اب تو مجھے بھی وہی نام مانوس لگتا ہے۔"

"لاہور ہماری ہی تلاش میں گئے تھا یا کوئی اور کام تھا؟" اس نے سرسری لہجے میں سوال کیا۔

"کاروباری جھمیلا تھا۔ لاہور چھوڑنے کے بعد پہلی بار وہاں گیا تھا، لاہور کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی بے اختیار پرانے رشتے یاد آنے لگے تھے۔ یہ سوچ کر پرانے محلے میں گیا تھا کہ سر جھکا کر بڑی ماں کو سلام کروں گا، انھوں نے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو سمجھوں گا کہ زندگی کا ایک خالی خانہ آباد ہوگیا۔"

اس کی سیاہ عقابی آنکھوں میں چمک گہری ہوگئی اور وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "میں نے کیبنٹ دیکھا ہے تمھارا، پینے کے معاملے میں خاصا ستھرا ذوق رکھتے ہو — کیوں نہ اس ملاقات کو یادگار بنانے کے لیے ایک دور ہو جائے۔"

ملازم قریب ہی میرے اشارے کا منتظر تھا، چند ہی لمحوں میں ٹرالی سجا کر لے آیا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے گلاس تیار کرتے ہوئے سوال کیا۔

"چھوٹا سا کاروبار ہے اپنا بھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔"

"اور تصویر بھائی؟"

"ہم دونوں ساتھ ہی کام کر رہے ہیں۔" وہ گلاس سے اپنے لبوں کو تر کرتے ہوئے بولا۔

"بڑی ماں کی صحت کیسی ہے؟" مجھے برسوں بعد ان رشتوں کے بارے میں بات کرنے کا موقع ملا تھا تو میں مسلسل ہی گفتگو میں مصروف رہنا چاہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہیں — ضعیفی تو خود ہزار بیماریوں کی ایک بیماری ہے، چند برس پہلے لقوہ ہوگیا تو چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی تھیں پھر موتیا سے ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی، دوسری آنکھ بھی دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے — جس دن سے تمھارا ذکر سنا، بس یہی کہہ رہی ہیں کہ رہی سہی بینائی ضائع ہونے سے پہلے ایک بار تنویر اور اس کی بیوی سے ملا دو تاکہ ان دونوں کو جی بھر کر دیکھ سکوں۔"

میرا دل بھر آیا۔ "میں چلوں گا، ضرور چلوں گا بلکہ تمھارے ساتھ ہی چلوں گا، ابھی شادی تو نہیں کی لیکن بڑی ماں اپنی ہونے والی بہو کو ضرور پسند کریں گی۔"

"اوہ۔" وہ بھویں چڑھا کر بولا۔ "تو عشق لڑا رہے ہو آج کل۔"

میں ہنس پڑا۔ ہنسی بوجھل سی تھی — "عشق دماغ کے خلل کا دوسرا نام ہے، اسے میں نے سنجیدگی کے ساتھ دیکھا، پرکھا اور پھر چاہا ہے، بہت سلجھی ہوئی اور خوبصورت لڑکی ہے۔"

"خوش قسمت ہو کہ تمھیں اپنے معیار کی لڑکی مل گئی، ہم دونوں بھائی تو فیصلہ کر چکے ہیں کہ زندگی ہنستے کھیلتے، اکیلے ہی گزار دیں گے۔"

معاً میں چونک پڑا۔ میں نے حامد کو جیوا ہاؤز پہنچنے کا وقت دیا ہوا تھا۔ گلاس خالی کر کے میں نے توقیر علی سے معذرت چاہی تو وہ صوفے کی پشت گاہ سے ٹک کر مسکرانے لگا۔ "بوتل اور گلاس میسر ہو تو پھر وقت آسانی سے گزر جاتا ہے مگر اکیلے میں زیادہ لطف نہیں آتا — کہو تو ٹرالی تمھارے زخمی دوست کے کمرے میں لے جاؤں۔"

"اسے مدعو بھی نہ کر بیٹھنا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "اس معاملے میں پورا پٹھان اور کٹر مسلمان ہے، برا مان جائے گا۔"

"جاؤ۔ ہو سکے تو واپسی پر ہماری ہونے والی بھابی کو لیتے آنا۔" اس نے برف کے قتلے گلاس میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "ذرا معلوم تو ہو کہ تمھاری پسند کا معیار کیا ہے۔"

"کافی دیر ہو جائے گی۔" میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "آنے کو وہ آجائے گی مگر میں مناسب نہیں سمجھتا۔ اس سے کل ملوا دوں گا تمھیں۔"

وہاں سے نکل کر میں سلطان شاہ کے پاس پہنچا تو وہ منہ پھلائے بستر پر دراز تھا۔ اس کی آنکھوں میں ناراضگی کے آثار دور ہی سے دیکھے جا سکتے تھے۔

"ہوگئی فرصت تمھیں؟" وہ مجھے دیکھتے ہی طنزیہ لہجے میں بولا۔ "ایسی محبت تو میں نے سگے خون میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔" شاید ملازمین سے اسے معلوم ہوگیا تھا کہ مہمان سے میرا کیا رشتہ تھا۔

"مرچیں نہ چباؤ، ہم برسوں کے بعد ملے ہیں۔" میں نے آہستگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔"

"میں تم سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے نیازمندانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے بس دس منٹ دے دو۔"

"میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔" میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "واپس آکر ایک گھنٹے تک تمھارے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے مقررہ وقت پر کہیں پہنچنا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اچانک ہی اس کی نگاہیں میرے چہرے سے ہٹ کر عقب میں کسی چیز پر مرکوز ہوگئی تھیں۔ میں نے سر گھمایا تو توقیر علی گلاس تھامے خوابگاہ کے دروازے میں کھڑا تھا۔

مجھ سے نگاہیں چار ہوتے ہی وہ مسکرانے لگا۔ "ایک بات بھول گیا تھا، باہر جا رہے ہو تو واپسی پر میرے لیے کچھ پنیر لیتے آنا۔ میں رات میں عموماً کھانے کے بجائے پنیر کے پارچوں پر گزارا کرتا ہوں۔"

میں اسی کے ہمراہ سلطان شاہ کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

"اگر میں اس کے پاس بیٹھ کر شغل کرتا رہوں تو اسے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟" راہداری میں توقیر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے سوال کیا۔

"اعتراض تو نہیں کرے گا مگر اندر ہی اندر سلگتا رہے گا — ویسے بھی وہ تکلیف میں ہے، تمھیں بور کرے گا، میں جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

میں نے ایک ملازم کو توقیر کے لیے خوابگاہ صاف ستھری کرنے کی ہدایت کی اور تیز رفتاری کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں جیوا ہاؤز کے ملازمین نے حامد اور اس کے ساتھیوں کو باہر ہی سے نہ لوٹا دیا ہو کیونکہ اس بارے میں میں نے انھیں کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔

ان تینوں کے لیے میری آمد غیر متوقع ثابت ہوئی۔ یہ تو اکثر ہوتا رہتا تھا کہ میں شام ڈھلے ان کے گھر پہنچ کر رات گئے واپس لوٹتا تھا لیکن اتنی دیر سے وہاں پہنچنا میرے معمولات کے خلاف تھا۔

غزالہ کی ماں کوکین کی آخری خوراک لے کر گہری نیند سو چکی تھی اور کرنل زوار زیدی وقت گزارنے کے لیے غزالہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا شطرنج کھیل رہا تھا۔

"یہ مجھ سے مسلسل تین بازیاں ہار چکی ہے۔" کرنل ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی مجھ سے پُرجوش لہجے میں بولا۔ "اور دیکھو اب پھر اس پر رخ کی شہہ پڑ رہی ہے، یہ بازی بھی بچنی مشکل ہے۔"

"سعادت مند اولاد والدین سے ہار کر خوشی محسوس کرتی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

زوار زیدی بھڑک اٹھا۔ "یعنی میرے کھیل میں کوئی کمال ہی نہیں ہے۔"

"یہ کمال ہی تو ہے کہ چوتھی بازی بھی آپ کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے جلدی سے بات بنائی پھر لحظہ بھر توقف کے بعد سوال کیا۔ "کامران کے پاس گئے تھے آپ؟"

"گیا تھا۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "بہت اداس اور خاموش تھا وہ — غزالہ بہت فکرمند ہے اس کی طرف سے۔"

"میں اسی لیے آیا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میں بھی صبح گیا تھا۔ دس پندرہ دن کے بعد ہی اندازہ ہو سکے گا کہ اس پر علاج کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ فی الحال تو اتنا بھی کافی ہوگا کہ اسے جنونی دورے نہ پڑیں۔"

"یہ سب اسی کو سمجھاؤ۔" وہ غزالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔ "یہ سمجھ رہی ہے کہ ہم نے اکتا کر کامران کو وہاں ڈال دیا ہے۔"

"تمھارے ڈیڈی بڑے ہوشیار ہیں۔" تخلیہ ہوتے ہی میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ "بیچارے کبھی بھی کباب میں ہڈی نہیں بنتے۔ مجھے ایسے لوگ بے حد پسند ہیں جو اپنی روایات سے محبت کرنے کے باوجود نئی نسل کے راستے کی دیوار نہیں بنتے۔"

"میں کامران سے ملنے کب جا سکوں گی؟" اس نے اداس لہجے میں سوال کیا۔

"کوئی راہ نکالوں گا، ذرا انتظار کرو۔" میں نے اس سے نگاہیں چار کیے بغیر کہا۔ "آج صبح میں کامران کے پاس گیا تو رخشی سے بھی ملا تھا۔ وہ نام تبدیل کر کے ہسٹریا کی مریضہ کی حیثیت سے وہاں داخل ہے۔"

"اسے کامران کی وہاں موجودگی کا علم ہے؟" اس نے جلدی سے سوال کیا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اس طرف سے تم بے فکر رہو — ویسے ایک خبر ہے تمھارے لیے۔"

”کیسی خبر؟“ اس نے نگاہیں اٹھا کر معصومانہ حیرت سے سوال کیا۔

”لاہور سے میرا سوتیلا بھائی آج مجھے تلاش کرتا گھر آ پہنچا ہے۔“ میں نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”بڑی ماں زندہ ہیں اور مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔“

”وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“

”میرے گھر۔ اور سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ ماضی کی غلطیوں پر خود نادم ہے۔“

”سیدھے ادھر ہی سے آ رہے ہیں آپ؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اپنوں سے ملنے کی خوشی بھی عجیب ہوتی ہے۔“

”وہاں سے جیوا ہاؤز گیا تھا۔“ میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”آج چار لڑکوں کو اے ٹو کی ہدایت پر سوٹ کیس دیے ہیں جو انھیں یورپ کے مختلف شہروں میں پہنچانے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ان میں ہیروئن چھپائی گئی ہوگی۔“

”سوٹ کیس کہاں سے لیے تھے؟“

”وہ اے ٹو نے مال کے ساتھ ہی بھیجے تھے۔ ان میں پرانے کپڑے بھرے ہوئے تھے جو تلف کر دیے گئے۔“

”آپ کے بھائی کو آپ کے گھر کا علم کیسے ہو گیا؟“ تھوڑے سے توقف کے بعد عزالہ نے سوال کیا۔

لاہور میں ایک پرانے محلے دار سے میری آمد کا علم ہوا تھا۔ یہاں آ کر ٹیلیفون ڈائرکٹری سے پتا تلاش کر لیا۔“

”دو سوتیلے بھائی تھے نا آپ کے؟ یہاں کون آیا ہے؟“

”تصویر علی بڑے بھائی کا نام ہے، ان سے چھوٹا بھائی توقیر علی یہاں آیا ہے۔“

”کتنا عجیب اتفاق ہے کہ آپ تینوں ہی کے ناموں کا مخفف ٹی۔ اے ہے اور لاہور میں ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے سربراہ کا نام بھی ٹی۔ اے ملک ہی بتایا گیا تھا۔“ وہ پُرخیال لہجے میں بولی اور میں چونک پڑا۔ ابھی تک اس پہلو پر میں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ کہیں آنے والا میرے سوتیلے بھائی کے روپ میں اے۔ ٹو کا فرستادہ کوئی مخبر نہ ہو۔

ناموں کے مخفف کی یکسانیت میرے لیے قطعی غیر اہم تھی لیکن عزالہ کے اٹھائے ہوئے نکتے نے میرے ذہن میں کچھ نئے دریچے کھول دیے تھے۔

میں نے چار سال کی عمر کے بعد پندرہ سال کی عمر میں صرف اس رات لمحہ بھر کے لیے اپنے سوتیلے بھائیوں کو سوتے ہوئے دیکھا تھا جب میں چوری کی نیت سے بڑی ماں کے مکان میں کودا تھا اور میرے لیے ان دونوں کو پہچاننا تقریباً ناممکن تھا۔ اپنے گھر کے برآمدے میں توواردسے پہلی ملاقات پر میں نے محض قیاس سے کام لیا تھا۔ توواردنے خون کے رشتے کا حوالہ دیا اور میں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ میرا سوتیلا بھائی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ اے ٹو کو کسی طرح میرے خاندانی حالات کی بھنک مل گئی ہو اور اس نے میرے بارے میں تحقیقات کے لیے ان معلومات کا سہارا لینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ اگر ایسا ہی تھا تو نووارد توقیر علی بن کر میرے گھر میں پناہ لینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے یہ بھی جتا دیا تھا کہ وہ میرے لاہور کے سفر سے باخبر تھا جب کہ میں نے اے۔ ٹو کو اپنی غیر حاضری کے حقیقی جواز سے بے خبر رکھتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ اس عرصے میں میں قاسم کی نگرانی میں مصروف رہا تھا۔

میں نے اپنے ذہن پر خاصا زور دیا لیکن دونوں سوتیلے بھائیوں میں سے کسی کی کوئی ایسی شناختی علامت یاد نہ کر سکا جس کی بنا پر میں انھیں پہچاننے میں کامیاب ہو پاتا۔

”یہ اتفاق عجیب ضرور ہے لیکن اتنا اہم بھی نہیں۔“ میں نے عزالہ سے کہا۔ ”اس طرح تو خود میری ذات بھی شبہ کی زد میں آ جاتی ہے۔“

”ٹی۔ اے ملک کا نام میرے سامنے بھی آیا تھا مگر میں نے آپ کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کے نام کے مخفف حروف کیا ہیں لیکن اس بار حالات مختلف ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس بار آنے والا لاہور سے آیا ہے اور وہی شہر اے۔ ٹو کا گڑھ ہے، ایشین سنڈیکیٹ کا دفتر بھی وہیں ہے۔“

”یہ بڑی عجیب بات ہوگی کہ آنے والا میرے سوتیلے بھائی کے بجائے کوئی اجنبی ثابت ہو... پھر بھلا اے۔ ٹو کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں اپنے گھر والوں کی تلاش میں اپنے پرانے محلے میں پہنچا تھا؟“

”آپ کے لاہور جائے بغیر یہ گتھی نہ سلجھ سکے گی۔“

”توقیر کے مطابق بڑی ماں میرے ساتھ میری بیوی کو بھی دیکھنے کی متمنی ہیں۔“ میں نے موضوع کی سنگینی کم کرنے کے لیے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ ”میں نے توقیر سے کہا تھا کہ بیوی کہاں، البتہ میں انھیں ہونے والی بیوی سے ضرور ملوا سکتا ہوں اور بڑی ماں سے پہلے وہ خود تم سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔“

”اگر وہ کوئی فراڈ ہے تو میرا اس کے سامنے جانا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ اے۔ ٹو کا آدمی ہے تو اس نے میری تصاویر بھی دیکھی ہوں گی، فوراً ہی پہچان لے گا۔“

”میں تمھارے پاس معاملہ سلجھانے آیا تھا مگر تم نے بات کچھ زیادہ ہی الجھا دی ہے۔ اب مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟“

”میں نے تو صرف امکانات کی نشاندہی کی ہے، فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔“

”تم ابھی تک گھما پھرا کر بات کرتی رہی ہو، کھل کر بات کرو تاکہ میرے لیے کسی فیصلے پر پہنچنا آسان ہو سکے۔ اس وقت کی کوئی لغزش ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔“

”لاہور میں آپ کے بھائیوں کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟“

”کوئی کاروبار کر رہے ہیں دونوں بھائی مل کر۔“

”کاروبار کی تفصیل تو ضرور بتائی ہوگی انھوں نے۔“ اس نے گہری سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔

”نہیں، میں نے زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔“

”میرے ذہن میں ایک موہوم سا بہت ہی موہوم سا شبہ سر ابھار رہا ہے۔“ اس نے جھجکتے ہوئے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ ”کیا یہ ممکن نہیں کہ منشیات کے کاروبار کی پشت پر آپ کے بھائیوں میں سے کوئی ہو...؟“

”مجھے شبہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی اے۔ ٹو جیسا باصلاحیت ہو اور بالفرض توقیر یا تصویر ہی نے یہ چکر چلایا ہوا ہے تو توقیر نے میرے پاس دوڑے چلے آنے کی حماقت کیوں کی؟“

”وہ اے۔ ٹو نہیں، بچھڑا ہوا بھائی بن کر آیا ہے اور اس کی آمد کا بہت ہی خاص مقصد ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے اضطراری طور پر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”تمھارے ذہن میں جو کہانی ترتیب پا رہی ہے وہ میں سمجھ رہا ہوں۔ ان میں سے کوئی ایک اے ٹو ہے اور انھیں مدت سے معلوم ہے کہ ڈینی کے طور پر انھوں نے اپنے سوتیلے بھائی کو کراچی کی مارکیٹ سونپی ہوئی ہے۔ انھیں مجھ پر پورا اعتماد تھا لیکن پچھلے دنوں لاہور میں کئی بھاری نقصانات اٹھانے کے بعد ایک مشتبہ مرد اور عورت کا حوالہ سامنے آیا جو کراچی پہنچنے کے بعد ان کے آدمیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر غائب ہو گئے۔ اس عرصے میں میری غیر حاضری پر باز پرس کی گئی تو میں نے ایک معقول بہانہ تراش لیا اور اس بارے میں ان شبہات کا رُخ قاسم کی طرف ہو گیا۔ اس دوران میں بدقسمتی سے لاہور میں ہمارے والد صاحب کا پرانا دوست رمضان چاچا تصویر یا توقیر سے جا ٹکرایا، اس کی زبانی انھیں علم ہو گیا کہ جن دنوں لاہور میں ان کے ستارے گردش میں آئے ہوئے تھے، میں کراچی میں نہیں لاہور میں مقیم تھا اور بڑی ماں کی تلاش کے سلسلے میں رمضان چاچا سے بھی ملا تھا۔ توقیر صرف اسی لیے کراچی آیا ہے کہ میری بغاوت کے سلسلے میں .... مزید کڑیاں تلاش کرنے کے ساتھ ہی اس عورت کا بھی سراغ لگا سکے جس نے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”اور اسی لیے وہ سب سے پہلے آپ کی منگیتر سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔“ اس نے میرے رُکتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ ”وہ اپنے خلاف ہونے والی باغیانہ سازش کی وسعت کا تعین کرنا چاہتا ہے، کسی یقینی نتیجے پر پہنچنے کے بعد وہ ایک سرے سے دشمنوں کا صفایا شروع کر دے گا اور ہمیں سنبھلنے کی مہلت بھی نہ مل سکے گی۔“

”لیکن اس کہانی کی بنیاد اسی ایک مفروضے پر ہے کہ اے ٹو کے پردے میں تصویر یا توقیر میں سے کوئی ہے۔ ایسا ہے تو پھر توقیر کو بڑی ماں کا ذکر درمیان میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”وہ دشمن نہیں، دوست بن کر آیا ہے، آپ کی جذباتی کمزوری سے کھیل کر اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔ بڑی ماں کے نام پر آپ مجھے لازماً سامنے لے آئیں گے۔ مجھے پہچانتے ہی وہ اپنی حکمت عملی کو آخری شکل دے ڈالے گا اور شاید آپ کو مہلت دیے بغیر کسی ناقابلِ بیان دشواری میں ڈال دے گا۔“

”اسے آزمانا میرے لیے زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔ تمھارے بارے میں اسے امید میں رکھ کر میں وقت لے لوں گا۔ تمھارے سامنے آئے بغیر وہ کبھی کھل کر سامنے نہیں آئے گا۔“

”مجھے تو یہ سوچ کر ہی ہول آنے لگے ہیں کہ آپ نے اپنے ایک بدترین دشمن کو اپنی چھت کے نیچے پناہ دی ہوئی ہے۔ اگر میرے اندازے درست ہیں تو آپ کے بھائی آج بھی آپ کے ازلی دشمن ہیں، وہ ابھی تک اس بات کو فراموش نہیں کر سکے ہیں کہ آپ کی والدہ نے بڑی ماں کے اقتدار کا بٹوارا کرایا تھا۔“

”اگر یہ بٹوارا کوئی جُرم ہی تھا تو سب سے بڑے مجرم میرے والد صاحب ہی ٹھہرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے حقیقی وسائل پر قناعت کرنے کے بجائے رشوت کی اندھی آمدنی کے بل پر دوسری شادی کا جُرم کیا تھا اور جب وہ معتوب ہو کر اس زرخیز کرسی سے محروم ہوئے تو دونوں میں سے کسی بیوی کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔“

”وہ فوت ہو گئے، آپ کی والدہ نے خودکشی کر لی۔ آپ کا جُرم یہ ہے کہ ابھی تک زندہ ہیں۔ ایسی دشمنیاں تو نسل در نسل چلتی ہیں۔ آپ کے بھائی متعصب اور تنگ نظر معلوم ہوتے ہیں۔“

”کاش تمھارے سارے قیاسات غلط ہوں۔“ میں نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”درست نکلے تو رزقِ حلال کا فلسفہ اٹل ثابت ہو جائے گا۔“

”میری خود یہی آرزو ہے کہ کاش میں غلط سوچ رہی ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”لیکن آپ کی آخری بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔“

"ہمارا گھرانہ مدتوں رشوت کی آمدنی پر پھلتا پھولتا رہا۔ سب کی پرورش رزقِ حرام سے ہوتی رہی اور انجام سامنے ہے۔ ماں نے خودکشی کرلی، بڑی ماں معذوری کی زندگی گزار رہی ہیں۔ میں بدی کے راستوں کا مسافر ہوں اور اگر تمھارے اندیشے درست ہیں تو تصویر اور توقیر بھی اپنے لیے جہنم خرید رہے ہیں۔ پرورش تو ان کی بھی اسی رزقِ حرام سے ہوئی تھی نا؟"

کمرے کی فضا پر بوجھل اور سوگوار سی خاموشی چھاگئی۔

میرے لیے سب سے آسان راستہ یہ تھا کہ سب سے پہلے گھر کو لات مار کر کہیں گمنام ساٹھکانا بنالیتا اور دُور رہ کر توقیر کے ردِ عمل پر نگاہ رکھتا۔ وہ جھوٹا تھا تو میری اچانک روپوشی پر جھلا کر انتقامی حربوں پہ اتر آتا، سچا تھا تو دو چار دن انتظار کرنے کے بعد لاہور واپس ہولیتا لیکن اس اقدام میں خرابی یہ تھی کہ سلطان شاہ خراب اور خستہ حالت میں میرے گھر میں پڑا ہوا تھا۔ وہ میرے بیشتر رازوں کا امین تھا اور اگر میں غائب ہوجاتا تو توقیر اسے یرغمال بناکر اس کے ساتھ بدترین سلوک کرسکتا تھا جو مجھے کسی صورت بھی گوارا نہ تھا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ اے۔ ٹو جو برسوں سے ایک آواز کی صورت میں پوری تنظیم پہ حکمرانی کر رہا ہے، یوں اچانک توقیر کے روپ میں سامنے آجائے گا۔" آخر کار میں نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"یقین کہاں، ابھی تو صرف شبہات ہی ہیں جو غلط بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔"

"اب مجھے خیال آرہا ہے کہ سلطان شاہ بھی مجھے روک کر کوئی خاص بات کہنا چاہ رہا تھا لیکن عجلت کی وجہ سے میں نے اسے ٹال دیا، پھر عین وقت پر توقیر بھی وہاں آگیا تھا۔"

"آپ کو اس سے ضرور بات کرنا چاہیے۔ توقیر کی سب سے پہلے تو اسی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے آپ اندازہ کرسکیں گے کہ توقیر کیا جاننا چاہ رہا تھا۔"

"ہاں، آج اس سے ضرور بات کروں گا۔ اسی کے ساتھ اسے گھر سے کہیں اور منتقل بھی کرنے کی کوشش کروں گا۔ حالات نے اچانک کوئی پلٹا کھایا تو وہ چوہے دان میں پھنسا رہ جائے گا۔"

پھر میں فون پر قاسم کے نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی جواب ملا تھا۔

"کیا خیر خبر ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں دلاور خان سے بات ہوگئی ہے۔ ایک دو روز میں اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔"

"اس وقت میں باہر سے بول رہا ہوں، میرے پاس ایک مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ معمول کی گفتگو کے لیے تم مجھے گھر فون کرسکتے ہو لیکن آپس کے معاملات میں ذرا محتاط ہی رہنا، میری طرف سے اشارہ ملے بغیر کوئی ہلکی بات نہ کر بیٹھنا۔"

"کیا اوپر سے کوئی آیا ہوا ہے؟" اس نے بے ساختہ لہجے میں سوال کیا تھا۔

"ارے نہیں، میرا بھائی دوسرے شہر سے آیا ہوا ہے۔ صرف اسی لیے احتیاط کا مشورہ دیا ہے کہ کہیں وہ دوسری لائن پر ہماری گفتگو نہ سُن لے۔ میں گھر والوں میں نیک نام ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

"تم بے فکر رہو۔" اس کا جواب سُن کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔" غزالہ تحسین آمیز لہجے میں بولی۔ "اگر توقیر کا تنظیم سے ذرا بھی تعلق ہے تو پھر آپ کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔ جب وہ ایم ٹی تھری ہنڈرڈ جیسے نازک مواصلاتی آلات تک رسائی رکھ سکتا ہے تو الیکٹرونکس کے چھوٹے موٹے شعبدے اختیار کرکے گفتگو سُننا یا ریکارڈ کرنا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔"

"صبح میں آپ کی کال کا انتظار کروں گی۔" مجھے روانگی پہ آمادہ پاکر اس نے کہا اور اسی لمحے کرنل زوار زیدی کہیں سے مجھے آوازیں دیتا ہوا وہاں آموجود ہوا۔

راستے میں میرا ذہن اسی گتھی میں اُلجھا رہا۔ میں اپنے دونوں بھائیوں کی صلاحیتوں سے اتنا مرعوب نہیں تھا کہ انھیں کسی منظم منصوبہ بندی کا اہل سمجھ لیتا لیکن غزالہ کی باتیں بھی بے وزن نہیں تھیں۔

میں گھر پہنچا تو توقیر ڈرنکس ٹرالی سمیت ڈرائنگ روم سے خواب گاہ میں منتقل ہوچکا تھا۔ اس نے خواب گاہ میں آرام کرسی سے اُٹھے بغیر میرا استقبال کیا۔ اس کی سیاہ عقابی آنکھوں میں گہرے خمار کے ڈورے تیر رہے تھے اور تپائی پر طلائی رنگ سیال کا بھرا ہوا گلاس موجود تھا۔ غالباً وہ میرے چلے جانے کے بعد سے مسلسل ہی پیتا رہا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ نہ اس کی زبان پہ لکنت تھی نہ حواس میں انتشار، وہ نہایت سکون کے ساتھ آرام کرسی پر جما فضا میں دھوئیں کے مرغولے بکھیر رہا تھا۔

پنیر کے ڈبے اس کے حوالے کرکے میں لباس تبدیل کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ عجلت میں لباس بدل کر میں تیسرے کمرے میں گیا تو سلطان شاہ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں بستر پہ بے حس و حرکت پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہ پہلو بدل کر دھیمی آواز میں مجھے پکار بیٹھا۔

میں لپک کر اس کے قریب جا پہنچا اور اس طرح اس پر جھک گیا کہ دروازہ لگا ہوں بی رہ سکے۔

"تھوڑی دیر بعد تم زخموں میں شدید تکلیف سے بے چین ہونے کی اداکاری شروع کر دینا۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "میں اسے شبہے کا موقع دیے بغیر تمھیں پہلی فرصت میں یہاں سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں بھی تم کو یہی بتانا چاہ رہا تھا۔" وہ بولا۔ "نو وارد سے تمھاری کوئی بھی رشتے داری رہی ہو لیکن وہ مجھے ذرا بھی پسند نہیں آیا ہے، میں نے اس کی آنکھوں میں خون کی پیاس جھلکتی دیکھی ہے۔"

"جو کہوں وہ کرتے جاؤ، باقی سب کچھ میں دیکھ لوں گا۔" یہ کہہ کر میں اس کے پاس سے ہٹ گیا اور سیدھا توقیر کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ بدستور اسی حالت میں نظر آیا، جس میں میں نے چند منٹ قبل اسے چھوڑا تھا۔

"تم بلانوش معلوم ہوتے ہو۔" میں نے اس کے مقابل کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ "یہ عادت کچھ اچھی نہیں ہے۔ ہر کام میں اعتدال ہونا چاہیے۔"

"ہر کام میں اعتدال سے کام لے سکتا ہوں، بس یہی ایک کمزوری ہے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے، پُرسکون لہجے میں کہا۔ "کیا تم نہیں لوگے؟"

"تصویر بھی تمھیں نہیں ٹوکتے؟" میں نے اپنے لیے گلاس سیدھا کرتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ خود میرے ساتھ بیٹھا ہے، مجھے کیسے روکے گا۔" اس نے قہقہہ مار کر کہا۔

"بس یہی بہت بڑی خرابی ہے۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "چھوٹے بڑے کا لحاظ ہر قیمت میں برقرار رہنا چاہیے۔ یہ احترام بھی ختم ہوجائے تو بُرے بھلے کی تمیز اٹھ جاتی ہے، اب ان میں اتنی جرأت ہی پیدا نہیں ہوسکتی کہ تم کو ٹوک سکیں اور یہ بھرم توڑنے میں نام نہاد بزرگ عموماً خود ہی پہل کرتے ہیں۔"

"بھرم!" وہ تحقیر آمیز انداز میں ہنسا۔ "بعض لوگ اسے بھی بھرم کا درجہ دیتے ہیں، یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ کام کی بات تو بس ایک ہی ہے

واعظ شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا کہ جہاں پر خدا نہ ہو"

"تم دونوں کی عادت سے بڑی ماں کو تو بہت دکھ ہوتا ہوگا؟"

"تم کچھ اور بات نہیں کرسکتے؟" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "پیتے ہو تو تمھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان فضول باتوں سے نشہ ٹوٹنے لگتا ہے....."

میں اچانک ہی کھانسنے لگا اور اسے مجبوراً خاموش ہوجانا پڑا۔ میری کھانسی مختلف سُروں میں بلند ہوتی رہی اور وہ صبر و سکون سے میرے سنبھلنے کا منتظر رہا۔ جب مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں کھانس کھانس کر گلے میں خراشیں نہ پڑ جائیں تو بتدریج خاموش ہونے میں ہی عافیت نظر آئی۔

"کیا پھیپھڑے خراب ہیں تمھارے؟" میرے خاموش ہونے پر اس نے نہایت اطمینان سے سوال داغ دیا۔

"اے..... لے ٹو۔" اتنا کہتے ہی کھانسی دوبارہ چل پڑی لیکن مجھے اس کے چہرے پر ذرا بھی تبدیلی کے آثار نظر نہ آئے۔ وہ گلاس ہاتھ میں تھامے مسلسل پُرسکون انداز میں مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ تیر خالی گیا تھا لہٰذا میں نے غیر ضروری مشقت ترک کر دی اور یوں گلے کو سہلانے لگا جیسے کھانسی سے واقعی خراشیں آگئی ہوں۔

"کیا ہوا اے ٹو کو؟" توقیر نے خفیف ترین جذباتی تغیر کے بغیر سوال کیا۔

"ایک نئی سگریٹ نظر آئی تھی۔ کے ٹو کے مقابلے پر اے ٹو نام تھا۔ پیکٹ خرید کر آٹھ دس سگریٹیں پی گیا تھا جب ہی سے گلا خراب ہے۔" میں نے سوچا سمجھا عذر پیش کر دیا۔

"اس نام کی کوئی سگریٹ میری نگاہ سے نہیں گزری۔" اس کا لہجہ بالکل سپاٹ اور بیانیہ تھا۔

"نہیں گزری ہوگی، باہر کی بنی ہوئی تھی وہ۔"

"نام بڑا بے ہودہ رکھا سگریٹ کا۔" وہ مسکرانے لگا تھا۔ "اے ٹو سے بھلا کیا بات بنی، نام رکھنا ہی تھا تو اے ون رکھا ہوتا، کم از کم وقار تو ہوتا نام میں۔"

"تم کیا کام کر رہے ہو لاہور میں؟" میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

"شاید یہ سوال دوسری بار کیا ہے تم نے۔" اس بار اس کے لہجے میں ہلکی سی چبھن پوشیدہ تھی۔

"کیونکہ پہلی بار جواب ادھورا ملا تھا۔" میں نے ہنستے ہوئے ٹکڑا لگایا۔ "کاروبار تو ضرور کر رہے ہوگے لیکن لائن کیا ہے تمھاری؟ میں خود بھی آج کل سنجیدگی سے کسی نئے کام کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ایکسائز ڈیوٹی نے پلاسٹک کے بڑے کارخانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے، چھوٹی موٹی دکانوں میں ڈائیاں اور مشینیں لے کر بیٹھنے والے بازار پر چھائے ہوئے ہیں۔ دانہ لے کر محض مزدوری پر کام کر رہے ہیں۔"

"ہر دھندے کا یہی حال ہے۔" وہ گلاس سے ایک گھونٹ لے کر بے پروایانہ انداز میں بولا۔ "ایمانداری سے تو گزارا بھی مشکل ہوگیا ہے، کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بیرونِ

کی تجارت کی جائے، باہر کا ایک بھی پھیرا لگ گیا تو برسوں تک کمانے کی فکر سے آزادی مل جائے گی۔"

"تو پھر کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

"کوشش۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔ "کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔ جس دن معقول دام دینے والا کوئی گاہک ٹکرا گیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی کے پیچھے ہو لوں گا۔" وہ لحظہ بھر کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔ "یار تم ہماری ہونے والی بھابی کو نہیں لائے۔"

"میں گیا تھا، وہ گھر والوں کے ساتھ کسی شادی میں گئی ہوئی تھی۔"

"اسے تمہارے ساتھ شہر سے باہر جانے پر اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"کیوں؟ باہر کہاں لے جانا ہے اسے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"بڑی ماں کی فرمائش تھی، مل کر فوراً ہی لوٹ آنا۔"

"بہو بن کر آجائے گی تو بڑی ماں بھی اس سے مل لیں گی، کبھی اسے باہر لے جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ روایت پسند گھرانا ہے، انکار کر دیا تو خواہ مخواہ ندامت ہوگی۔"

"تو تم تو میرے ساتھ چلو گے نا؟ بڑی ماں مجھے اکیلا گھر میں نہیں گھسنے دیں گی۔"

"ضرور۔" میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے تو عین سعادت ہوگی۔"

اسی لمحے اندر سے سلطان شاہ کے کراہنے کی آواز آئی اور میں وہاں سے اٹھ گیا۔ میں بوکھلانے کی اداکاری کرتا ہوا اس کے کمرے میں پہنچا تو توقیر میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔

سلطان شاہ کربناک انداز میں بستر پر پہلو بدل رہا تھا، شاید اس نے میرے ساتھ توقیر کو بھی دیکھ لیا تھا لہٰذا اس نے ہم دونوں کو یکسر نظر انداز کر دیا اور بدستور شدید تکلیف میں مبتلا ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔

"اس کی حالت بگڑ رہی ہے.... ڈاکٹر کو بلاؤ۔" توقیر نے گمبھیر آواز میں مجھے مشورہ دیا۔

"اسے اسپتال منتقل کرنا ہوگا۔" میں نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر اسے داخل کرنے پر مُصر تھا لیکن یہ زبردستی میرے ساتھ لوٹ آیا۔ ڈاکٹر نے یہی کہا تھا کہ چوٹیں وقت گزرنے کے بعد ستائیں گی۔"

"تو کھڑے کیا ہو، ابھی لیے چلتے ہیں اسے۔"

ایک لمحے کے لیے میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ میں نقل و حرکت سے معذور سلطان شاہ کو توقیر کی نگاہوں سے دور نکال لے جانا چاہتا تھا اور وہ اس مرحلے پر میرے سر پر مسلط ہوا جا رہا تھا لیکن میں نے فوراً ہی سنبھالا لے لیا۔ "تم فکر نہ کرو، بلاوجہ سارا لطف غارت ہو جائے گا، میں اسے چھوڑ کر ابھی واپس آتا ہوں۔"

تھوڑی سی بحث کے بعد میں اسے روکنے میں کامیاب ہوگیا اور سلطان شاہ کو اسی کی مدد سے اپنی کار کی عقبی نشست پر منتقل کر دیا۔

میں لباس تبدیل کر کے بعجلت گھر سے روانہ ہوا تو بھرا پستول میرے پاس موجود تھا۔

گاڑی تھوڑی دور نکلتے ہی سلطان شاہ سیدھا ہو بیٹھا۔ "تمھیں اس شخص سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ تمہاری غیر موجودگی میں سارا زور تمہاری لاہور کی مصروفیات پر دیتا رہا تھا۔ مجھ سے اگلوانے کی کوشش کی تھی کہ میں بھی تمہارے ساتھ لاہور گیا تھا مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔"

"غزالہ کے بارے میں تو کچھ نہیں پوچھا تھا اس نے؟"

"نہیں.... ارے.... رے.... اس گلی میں کہاں گاڑی موڑ رہے ہو؟" میرے اچانک اسٹیئرنگ کاٹنے پر وہ بُری طرح بوکھلا گیا۔ "ادھر راستہ بہت تنگ ہے۔"

"دیکھتے رہو، مجھے سب معلوم ہے۔" میں نے عقب نما آئینے سے نگاہیں ہٹائے بغیر کہا۔ "ہمارے نکلتے ہی تھوڑے فاصلے سے ایک کار ہمارے پیچھے لگی تھی، مجھے شبہ ہے کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔"

"اوہ۔ یہ تو برا ہوا۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "میں غیر مسلح ہونے کے ساتھ زخمی بھی ہوں، تصادم ہوگیا تو تمہارے لیے بوجھ بن جاؤں گا۔ کوئی اسلحہ ہے تمہارے پاس؟"

"اسلحہ بھی ہے۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، اپنے اوسان بحال رکھو۔ پچھلی گاڑی میں صرف ایک ہی آدمی نظر آ رہا ہے۔ لو وہ بھی ادھر ہی مڑ گئی۔"

"اس کی رفتار خاصی تیز ہے۔" سلطان شاہ نے شاید مڑ کر پیچھے آنے والی کار کا جائزہ لیا تھا۔ "وہ غالباً تعاقب کرنے کے بجائے ٹکراؤ کے موڈ میں ہے۔ اپنا پستول مجھے دے دو۔"

میں نے بے چون و چرا اپنا بھرا ہوا پستول اس کے سپرد کر دیا کیونکہ عقبی کار کی روشنیاں تیزی سے قریب آتی جا رہی تھیں اور میں ڈرائیونگ کے ساتھ اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے معذور تھا۔

گلی ختم ہوتے ہی میری کار پھر کشادہ سڑک پر نکل آئی۔ دوسری کار بدستور پیچھے لگی ہوئی تھی اور درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔

پیچھے آنے والی کار کا انجن خاصا جاندار تھا کیونکہ میں ایکسیلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھانے کے باوجود درمیانی فاصلہ بڑھانے میں کامیاب نہ ہو سکا بلکہ لحظہ بہ لحظہ وہ کار قریب ہوتی جا رہی تھی۔ جب میں نے اس مجبوری کو محسوس کر لیا تو اپنی گاڑی کی رفتار بھی کم کر دی کہ کہیں تیز رفتاری کے باعث کسی حادثے سے دوچار نہ ہو جاؤں۔

تعاقب میں آنے والی کار کی روشنیاں آناً فاناً میں سر پر آگئیں۔

"اسے راستہ دے دو۔" سلطان شاہ پُر جوش لہجے میں بولا۔ "وہ اوورٹیک کر کے ہمارا راستہ بلاک کرنے کی فکر میں ہے جیسے ہی برابر میں آئے گا، میں اسے گولیوں پر رکھ لوں گا۔"

وہ جو کچھ سوچ رہا تھا اس وقت وہی سب سے مناسب تھا۔ میرے لیے کوئی انتخاب باقی نہیں رہا تھا، اگر میں اسے آگے نکلنے سے روکنے کی کوشش کرتا تو وہ نہایت آسانی سے فائر کر کے عقبی ٹائروں کو ناکارہ کر کے مجھے کار روکنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی کار بائیں طرف ڈھالی، پچھلی کار کی روشنیوں کا رُخ قدرے تبدیل ہوا اور جوں ہی وہ سرعت سے میری کار کے برابر میں آئی، مختصر سے وقفے سے میرے کان کے پیچھے دو ہولناک بارودی دھماکے ہوئے۔ برابر والی کار کی کھڑکیوں کے شیشوں کے ٹکڑے اڑ گئے، اس میں سے دبی دبی سی ایک چیخ بھی گونجی لیکن اس کار کی رفتار کم ہونے کے بجائے یک بیک تیز ہوگئی۔ اس اثنا میں میں یہ یقین کر چکا تھا کہ اس کار میں ایک ہی آدمی موجود تھا۔

میری گاڑی کو اوورٹیک کرنے کے بعد تعاقب کرنے والی کار میرے ہیڈ لیمپس کی زد میں آئی تو میں چونک پڑا۔ قاسم کی سرخ کرولا کو میں اس کے نمبروں سمیت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میرا ذہن اُلجھ گیا۔

قاسم کو میرے تعاقب کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ کیا معاہدے کی ابتدا ہی میں اس کی نیت میں فتور آگیا تھا؟

اس وقت صورتِ حال بالکل ہی بدل چکی تھی۔ قاسم کی کار آگے دوڑ رہی تھی اور ہم اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ غنیمت یہ تھا کہ فائرنگ کے شور پر کسی نے بھی ہمارا پیچھا کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی حماقت نہیں کی تھی بلکہ جو اِکا دُکا گاڑیاں اس سمت میں آ رہی تھیں وہ بھی شاید ذیلی گلیوں میں جا گھسی تھیں اور عقب نما آئینے میں سڑک دور تک صاف نظر آ رہی تھی۔

قاسم کی کرولا کے انجن کی کارکردگی کا مجھے خوب اندازہ تھا کیونکہ ایک بار وہ کار میرے تصرف میں بھی رہ چکی تھی لیکن آگے نکلنے کے بعد اس کی رفتار خاصی کم تھی۔ تعاقب کرنے والا فرار ہونا چاہتا تو اس کے لیے راستہ کھلا ہوا تھا، پھر آخر اس آنکھ مچولی کا کیا مطلب تھا؟

"وہ پھر اُلجھنے پر آمادہ ہے۔" سلطان شاہ کی تشویش زدہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"یہ قاسم کی کار ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

"اوہ، تو وہ بدمعاش ابھی سے شرارت پر اتر آیا ہے، مجھے تو پہلے ہی اس کی صورت پر تاؤ آتا رہا ہے۔ وہ آگے جا رہا ہے تو تم اپنا راستہ کیوں نہیں بدل لیتے؟"

"مجھے کوئی بات کھٹک رہی ہے، رفتار کم رکھ کر وہ مجھے اپنے تعاقب پر اکسا رہا ہے، میں دیکھوں گا کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے۔"

دونوں گاڑیاں تاریک اسٹیڈیم روڈ پر دوڑتی ہوئی، راشد منہاس روڈ پر گھوم گئیں۔ دو نمبر ڈرائیو ان سینما سے ذرا آگے اچانک قاسم کی کار رک گئی اور ڈرائیونگ سیٹ پر سے ایک ہیولا نیچے اتر آیا۔

میں نے بے اختیار بریک پیڈل پر پاؤں رکھ دیا کیونکہ اگلی کار سے اترنے والا قاسم بذاتِ خود تھا۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں وہ ہاتھ اٹھا کر مجھے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا، دوسرا خالی ہاتھ پہلو میں جھول رہا تھا اور بظاہر اس کی جیبیں بھی خالی نظر آ رہی تھیں۔

"ہوشیار رہنا، کہیں اس میں بھی کوئی چال نہ ہو۔" مجھے کار روکنے پر آمادہ پا کر سلطان شاہ نے وارننگ دی۔

"تم تیار رہو، وہ ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کرے تو بے دریغ گولی مار دینا۔" میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔

میری کار رکتے ہی قاسم تیر کی طرح برابر والی کھڑکی پر آیا تھا اور غراتے ہوئے بولا تھا۔ "تم نے میرا شانہ ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہی میری ہمدردی کا بدلہ تھا؟"

اس کا بایاں شانہ واقعی لہولہان تھا کیونکہ گہرے رنگ کی قمیص اس مقام پر خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔

"تمھیں میرا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے ترش لہجے میں سوال کیا۔

"اس وقت میرے آدمی تین گاڑیوں میں تمہارے مکان کے گرد منڈلا رہے ہیں۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ چلتے وقت میں قریب ہی تھا اور تمھیں نکلتے دیکھ کر میں نے خود تمہارے پیچھے آنے کا فیصلہ کر لیا، میں تو موقع پا کر راستے میں تمھیں روکنا چاہ رہا تھا تاکہ تمھیں بدترین خطرات سے خبردار کر سکوں اور تم نے مجھ پر فائر جھونک مارے۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس کے آدمی میرے مکان کی نگرانی کیوں کر رہے تھے؟ وہ مجھے کن خطرات سے باخبر کرنا چاہ رہا تھا؟

"فائرنگ تک مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کون میرا تعاقب کر رہا ہے، وہ تو جب تمہاری کار سامنے آئی تو مجھے پتا چلا کہ ...."

تمھاری ہے — باہر نہ کھڑے رہو، اندر آجاؤ۔ کوئی گشتی پارٹی آگئی تو بلاوجہ بازپرس شروع ہو جائے گی۔“

”میں گاڑی یہاں نہیں چھوڑ سکتا، تم کدھر جا رہے ہو؟“ اس نے رکھائی سے سوال کیا۔

”اکبر کے اسپتال کا ارادہ تھا، اسے وہاں داخل کرانا ہے۔“

”اوہ۔ شاید اس کے ساتھ زیادتی ہی کر بیٹھا تھا میں —“ قاسم نے متاسفانہ لہجے میں کہنا چاہا۔

”بکواس مت کرو۔“ سلطان شاہ اس کی بات کاٹ کر کسی کٹکھنے کتے کی طرح غرّایا۔ ”مجھے تمھاری کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں — تمھیں شاید یہ سن کر زیادہ خوشی نہ ہو کہ تمھارے اوپر لاعلمی میں گولیاں میں نے ہی برسائی تھیں۔“

”چلو حساب برابر ہو گیا۔“ قاسم نے خلافِ توقع نرم لہجے میں کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ ”تم چلو، میں بھی وہیں پہنچتا ہوں، اکبر میرا شناسا ہے، وہاں میرے زخم کی ڈریسنگ کسی الجھن کے بغیر ہو جائے گی۔“

وہ اپنی کار میں جا بیٹھا اور میں آگے روانہ ہو گیا۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ اکبر بہت حریص انسان تھا جب وہ رخشی جیسی عورت کو مریضہ بنا کر اپنی علاج گاہ میں پناہ دے سکتا تھا تو معقول رقم کی توقع میں سلطان شاہ کو بھی صحت مند ہونے تک اپنے مرکز میں رکھ سکتا تھا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے علاج گاہ کے احاطے میں داخل ہوئیں۔ میں سلطان شاہ کو گاڑی میں چھوڑ کر قاسم کے ساتھ اندر گیا اور چند ہی منٹ میں سلطان شاہ کے لیے ایک کمرہ مل گیا کیونکہ اس مرکز کے نچلے عملے کے لوگ بھی اکبر اور قاسم کے مراسم سے واقف تھے۔

ہم سلطان شاہ کو لے کر کمرے میں پہنچے تو ایک ڈاکٹر دو نرسوں اور ڈریسنگ ٹرالی سمیت وہاں قاسم کا منتظر تھا۔ اس نے فوراً ہی قاسم کی قمیص اتروا کر اس کے زخم کی صفائی شروع کر دی۔ میں موقع پا کر وہاں سے نکلا اور رخشی کے دروازے پر جا پہنچا۔ پہلی ہی دستک کے جواب میں اس نے دروازہ کھول دیا اور مجھے دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپکانے لگی۔

”خدا خیر کرے — ایک دن میں دوسری بار کیسے نظر آ رہے ہو یہاں؟“

”آنکھیں سینکنے کے لیے آیا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سنا ہے کہ ہسٹیریا کے دورے میں مریض لباس بھی تار تار کر دیتا ہے، تمھارے دورے کے اوقات کیا ہیں آج کل؟“

”قاسم اسے پسند نہیں کرے گا کہ تم حد سے تجاوز کرنے لگو۔“ وہ شوخ لہجے میں بولی۔

”مشکل یہی ہے کہ تمھارے معاملے میں آج تک حد کا تعین نہیں ہو سکا، ویسے قاسم بھی اس وقت اسی چھت کے نیچے موجود ہے، چاہو تو اسے بھی یہاں بلا لوں۔“

”قاسم؟ کہاں ہے وہ؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

”ایک کمرے میں پڑا مرہم پٹی کرا رہا ہے، اسے گولی کا زخم آیا ہے۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور وہ بے چین ہو کر اپنے کمرے سے راہداری میں نکل آئی۔

”کیا ہوا؟ کس نے گولی مار دی اسے؟“ اس نے میرا بازو تھام کر گھبرائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”بدقسمتی اور غلط فہمی کی بنا پر میرے ہی آدمی کا نشانہ بن گیا۔“ میں نے اس کے ہمراہ نچلے فلور پر جاتے ہوئے کہا۔ ”ستارے اچھے تھے کہ شانے پر سطحی زخم آیا ہے ورنہ گولی کھوپڑی میں بھی اتر سکتی تھی۔“

اس کا کردار جیسا بھی رہا ہو مگر وہ قاسم کے لیے اپنے دل میں محبت رکھتی تھی۔ جب تک اس نے قاسم کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا، اس کی بے قراری قابلِ دید تھی اور یہی وہ مقام تھا جہاں مشرقی عورت کی شناخت الگ ہو جاتی ہے۔

ڈریسنگ کے بعد جب عملے کے اراکین چلے گئے تو رخشی قاسم کے شانے کو سہلاتے ہوئے بستر پر دراز سلطان شاہ کو گھورنے لگی اور وہ بوکھلا کر چھت کی طرف تکنے لگا۔

”یہ میرا ساتھی ہے۔“ میں نے اسے مطلع کیا۔ ”اس رات قاسم نے نہایت بے دردی کے ساتھ اس پر ہاتھ اٹھایا تھا اور آج اسی کی چلائی ہوئی گولی سے زخمی ہوا ہے۔“

”تو اس رات کا بدلہ لیا ہے تم نے قاسم سے۔“ وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

”جو کچھ ہوا، غلط فہمی میں ہوا ہے۔ میں ان کے پیچھے تھا، یہ لوگ مجھے نہ پہچان سکے — آج رات حالات نے ایک بالکل نئی کروٹ لی ہے، ڈینی اچانک عتاب میں آ گیا ہے۔“

”کھل کر بات کرو، اب تو یہاں کوئی غیر نہیں ہے۔“ میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔

”آج شام مجھے اے ٹو سے براہِ راست تمھارے مکان کی نگرانی کا حکم ملا تھا، وہاں سے نکلنے والے ہر شخص کا تعاقب کر کے اس کے کوائف جمع کرنے ہیں جو کل صبح اے ٹو کو دینے ہوں گے۔“ وہ مجھے بتانے لگا۔ ”دوسری طرف تم نے آج ہی مجھے فون پر احتیاط برتنے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ تمھارے پاس کوئی مہمان ٹھہرا ہوا ہے میرا خیال ہے کہ تمھارے مہمان کی موجودگی اے ٹو کو پسند نہیں آئی ہے اور وہ تمھارے بارے میں کڑی چھان بین کرانا چاہتا ہے۔“

”لیکن اے ٹو تو لاہور میں ہے۔ اسے کیا خبر کہ ڈینی کے پاس کون ٹھہرا ہوا ہے؟“ رخشی نے اعتراض داغ دیا۔

”یہ میرا اندازہ ہے، ہو سکتا ہے کہ ہم لوگوں کے علاوہ بھی اے ٹو کی اطلاعات کا کوئی اور ذریعہ ہو۔“ قاسم نے کہا۔ ”مجھے پورا یقین ہے کہ صبح مجھ سے سوال کیا جائے گا کہ ڈینی زخمی کو لے کر کہاں گیا تھا؟“

”بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ ڈینی نے زخمی کو کہاں چھوڑا تھا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی تصحیح کی۔

”بالکل۔“ قاسم نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے یہاں داخل کرا کے تم اکیلے ہی گھر واپس جاؤ گے۔“

”اب تو سوچ رہا ہوں کہ گھر جانا مناسب بھی ہو گا یا نہیں۔“ میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ”ایسا نہ ہو کہ گھر جانے کے ساتھ ہی ناقابلِ بیان مشکلات کا سلسلہ شروع ہو جائے۔“

”لیکن یہ ہو کیا رہا ہے اور اس کا سبب کیا ہے؟“ رخشی نے مجھ سے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ اے ٹو یا اس کا کوئی اہم برکارہ کراچی میں موجود ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ! تمھارا اشارہ اپنے مہمان کی طرف تو نہیں ہے۔“ قاسم نے تحیر آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

”مجھے اسی پر شبہ ہے۔“ میں نے ایمانداری سے کہا۔ ”قاسم کو میرے گھر کی نگرانی پر لگا کر نہ صرف اس کی حفاظت کی جا رہی ہے بلکہ میرے ملنے جلنے والوں کی فہرست بھی مرتب کی جا رہی ہے۔“

”جس میں کسی عورت کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔“ قاسم نے ڈرامائی انداز میں لقمہ دیا۔

”عورت کا ذکر کہاں سے آ گیا؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

”مجھے حکم دیا گیا تھا کہ اگر تمھارے مکان میں کوئی عورت دیکھی جائے تو اسے ہر قیمت پر اغوا کر لیا جائے۔“ قاسم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمھارے پیچھے آ گیا ہوں مگر میرے آدمی اس حکم کی تعمیل کریں گے، آخر تمھارے حوالے سے اے ٹو کو کس عورت کی تلاش ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے رخشی کا شریک کار سمجھ رہا ہو۔“ میں نے ان کے ذہنوں کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے غزالہ کے بجائے رخشی کو ملوث کرتے ہوئے کہا۔

”ایسی صورت میں وہ نگرانی اور اغوا کا حکم مجھے ہرگز نہ دیتا کیونکہ تم میرے اور رخشی کے بارے میں اسے گمراہ کر چکے ہو۔“

”یہی تو اہم نکتہ ہے۔“ میں نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ”اسے اب خیال آیا ہو گا کہ کہیں میں شروع ہی سے جھوٹ نہ بولتا رہا ہوں، رخشی کے ساتھ خود ہمدردی کرتا رہا اور الزام تمھارے سر رکھ دیا۔“

”خیر، یہ سب فضول باتیں ہیں — اصل سنسنی خیز خبر یہ ہے کہ اے ٹو کا کوئی اہم کارندہ ڈینی کا مہمان ہے۔ کیوں نہ ہم بالا ہی بالا اس پر ہاتھ ڈال دیں۔“ رخشی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اس کا بال بھی بیکا ہوا تو اے ٹو، قاسم کی زندگی جہنم بنا دے گا۔“

”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ آنے والا تمھارا بھائی ہے جو کسی دوسرے شہر سے یہاں پہنچا ہے۔“ قاسم نے سوال کیا۔ ”پھر اب اس پر شبہات کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟“

”یہ حقیقت ہے کہ وہ میرے بھائی کے ہی روپ میں آیا ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے اپنے بھائی کو دیکھے ہوئے ایک مدت ہو چکی ہے اور میں اس کو شناخت کرنے سے قاصر ہوں۔“

”تو تم جا کر اسے براہِ راست کیوں نہیں گھیر لیتے؟“ قاسم نے سوال کیا۔ ”تشدد کے سامنے تو گونگے بھی بولنے لگتے ہیں۔“

”اب مشکل ہے — ابھی تک تو مٹھی بند تھی، اب کھل گئی ہے۔ اے ٹو میرے گرد اپنا جال کس رہا ہے۔ اسے جس کسی پر شبہ ہو جائے اس کی زندگی کی مہلت ختم ہو جاتی ہے، اب تو میرا سامنے آنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہو گا۔ میں دور رہ کر ہی مدافعت کر سکوں گا۔“

”یعنی اب اپنے گھر ہی نہیں جاؤ گے؟“ سلطان شاہ نے بے یقینی کے ساتھ سوال کیا۔

”زندگی کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی سلطان شاہ — مکان تو سیکڑوں بنا لیے جائیں گے۔ میری مستقل آمدنی کا ذریعہ فیکٹری کی صورت میں برقرار ہے، میں ہفتوں بھی ادھر کا رُخ نہ کروں تو میرا کام چلتا رہے گا۔“

”مکان اور فیکٹری کو تباہ بھی کیا جا سکتا ہے۔“ رخشی نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔ ”زک پہنچانی جو ٹھہری۔“

”میری ایک ایک کیل کا انشورنس ہے۔“ میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ”مجھے مالی طور پر زک پہنچانا مشکل ہے۔“

میں ان سے گفتگو کر رہا تھا لیکن میرے ذہن میں صورتِ حال کی بہت مہیب تصویر سر ابھار رہی تھی۔ رمضان چاچا سے میری ملاقات فیصلہ کن ثابت ہوئی تھی۔ اس شخص کی گواہی نے اے ٹو کی نگاہوں میں مجھے جھوٹا ثابت کر دیا تھا اور توقیر کوئی اٹل فیصلہ کر کے میرے پاس پہنچا تھا لیکن فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے وہ

میرے ساتھ بلی اور چوہے کا کھیل کھیل رہا تھا تاکہ مجھے ابھاکر، میری وساطت سے غزالہ پہ ہاتھ ڈال سکے۔ غزالہ کے سامنے آتے ہی میری بازی ختم ہو جاتی اور توقیر مجھ پر آخری وار کر گزرتا۔

اس وقت قاسم کا مجھ سے آٹکرانا بہت کارآمد ثابت ہوا ورنہ اس سے پہلے تو میرے ذہن میں صرف شبہات ہی تھے جنھیں قاسم کی کہانی نے یقین میں بدل دیا تھا۔

"اب مجھے کیا کرنا ہے۔ میں ساری رات یہاں نہیں رک سکتا۔" قاسم نے سوال کیا۔

"تمھیں دو کام کرنے ہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اوّل تو دلاور خان کے ساتھ سرحدی علاقوں میں جانے کا پروگرام ملتوی کر دو کیونکہ حالات ناموافق ہیں دوم یہ بھول جاؤ کہ میں سلطان شاہ کے ساتھ یہاں مقیم ہوں۔"

"تمھارے بارے میں اے ٹو کو تو کچھ نہ کچھ بتانا ہی ہوگا۔ وہ صبح فون کرے گا مجھے۔"

"کہہ دینا کہ رات بھر مکان سے کوئی کہیں نہیں گیا۔" سلطان شاہ نے کہا۔

قاسم بوجھل انداز میں ہنس دیا۔ "ڈینی کے مشتبہ مہمان کو کیوں بھول رہے ہو تم؟ اگر وہ اے ٹو کا مخبر ہے تو میرا جھوٹ فوراً پکڑ لیا جائے گا۔"

"تم کہہ سکتے ہو کہ ہمیں سول اسپتال پہنچا کر تم واپس لوٹ گئے تھے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا اور سب ہی نے اس خیال کی پوری طرح تائید کی۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمھاری آنکھیں کھل گئیں۔" زخشی اور قاسم کے رخصت ہونے کے بعد سلطان شاہ گہرا سانس لے کر بولا۔ "مجھے تو تمھارا بھائی پہلی ہی نظر میں فراڈ معلوم ہوا تھا۔"

"میں دن ہی میں غائب ہو جاتا لیکن تمھیں اس کے چنگل سے نکالنا ضروری تھا۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "میرے روپوش ہوتے ہی تم اس کی جھلاہٹ کا نشانہ بن جاتے اور شاید تمھارا سراغ پانا بھی دشوار ہو جاتا۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کھلی جنگ شروع ہو گئی ہے، کاش میں جلد از جلد تمھارا ساتھ دینے کے قابل ہو سکوں۔"

"ابھی تو ایک اور مشکل پیدا ہوگی۔ قاسم نے شاید اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا ہے۔"

"وہ کیا؟" اس نے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے سوال کیا۔

"قاسم کے ساتھ مل کر کام کرنے کا جو سمجھوتہ ہوا ہے اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ میں تنظیم میں اپنی رکنیت سے بھرپور فائدہ اٹھاؤں گا، اگر میں باہر ہو گیا تو وہ مجھے حصہ دار کیوں رکھے گا۔

"اس کا تو باپ بھی رکھے گا، وہ اے ٹو کے ساتھ رہ کر غداری کرے گا تو تم اس کی قیمت وصول کرنے کے حقدار ہو گے۔ نہ مانا تو اسے اٹھا کر آزاد علاقے میں لے جاؤں گا۔"

"وہ بعد کی بات ہے۔ ویسے بھی وہ آدمی میرے لیے غیر اہم ہے۔ میرا مشن تو اس تنظیم کی بیخ کنی ہے اور شاید اب اس کا وقت آ پہنچا ہے۔"

✻✻✻

اگلی صبح سب سے پہلے میں نے گاڑی سے گلو خلاصی حاصل کی اور اسے کھارادر کے علاقے میں ایک جگہ چھوڑ دیا۔ کار کی وجہ سے شہر میں کہیں بھی مجھے آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔

ایک کال آفس سے جہانگیر کو فون کیا تو میری آواز پہچانتے ہی وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں شروع ہو گیا۔ رات کے تین بجے اے ٹو نے اسے گہری نیند سے بیدار کر کے فون پر میری تلاش کا حکم دیا تھا اور وہ بیچارہ نیند کی جھونک میں فون کرنے کے بجائے خود ہی میرے گھر دوڑا چلا گیا تھا جہاں توقیر نے خشمناک تیوروں کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ گھر میں عجیب سا سماں تھا۔ اتنی رات گئے ملازمین ڈرائنگ روم میں توقیر کے سامنے موجود تھے اور وہ ان سے میرے امکانی ٹھکانوں کے بارے میں معلوم کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

توقیر جہانگیر کے لیے اجنبی تھا لیکن اس کے تحکمانہ طرزِ عمل کی وجہ سے جہانگیر اس سے گفتگو کو طول دینے کی ہمت نہ کر سکا اور واپس ہو لیا۔ واپسی میں سارے راستے اس کا تعاقب کیا گیا اور پانچ بجے دوبارہ اے ٹو کی کال آ گئی۔ میرا سراغ نہ ملنے پر وہ سخت برہم تھا۔

جہانگیر نے مجھ سے اس بارے میں بہت سے سوالات کرنے چاہے۔ مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میرا شکریہ ادا کیا لیکن میں نے اسے سنگین خطرات کے حوالے سے ٹال کر سخت ہدایت کر ڈالی کہ میرے فون کا تذکرہ اپنی ذات تک ہی محدود رکھے پھر میں نے سرسری انداز میں غزالہ کو بھی حالات سے آگاہ کر دیا... تفصیلات میں جائے بغیر میں نے صرف اس قدر بتایا کہ خطرہ بھانپ کر میں نے اپنی قیام گاہ کو خیرباد کہہ دیا تھا اور کامران کی علاج گاہ کے ایک کمرے میں رہائش اختیار کر رہا تھی۔ وہ مصر ہو گئی کہ یہ محدود مدت میں اس کے گھر پہ گزار لوں لیکن بدقت تمام میں نے اسے اپنا ہم نوا بنا ہی لیا۔

ان دونوں اہم کاموں سے فارغ ہو کر میں نے اپنے گھر کا نمبر ملایا تو دوسری طرف سے اپنے ایک ملازم کی بدحواسی آواز سنائی دی، چند گھنٹوں کے اعصابی تناؤ میں توقیر نے شاید ان

سب کی زندگی تلخ کر کے رکھ دی تھی۔

میری آواز پہچانتے ہی وہ بیچارہ بلک کر رو پڑا۔

"تمھارا بھائی عجیب پاگل آدمی ہے صاحب۔" اس نے روتے روتے بتایا۔ "تین بجے مار مار کے سب کو اٹھا دیا اور پوچھنے لگا کہ تمھارا صاحب کہاں ہے؟ پھر کئی دفعہ فون کیا، کبھی اصلی آواز میں بولتا تھا کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر جن آ گیا ہو، آواز بالکل ہی بدل جاتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں اور کہاں جائیں۔ تم گھر کب آؤ گے صاحب؟"

"میری طرف سے تم سب آزاد ہو رحمت۔" میں نے نرم مشفقانہ لہجے میں کہا۔ "میں خطرے میں ہوں۔ کچھ پتا نہیں کہ کب تک گھر نہ آ سکوں۔ تم لوگ گھر سے جو کچھ لے سکتے ہو لے کر خاموشی سے کسی طرف نکل جاؤ۔ توقیر اس وقت کہاں ہے؟"

"پتا نہیں صاحب۔" میری الوداعی باتیں سن کر اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ "ایک کالی گاڑی آئی تھی اسی میں کہیں گیا ہے۔ شراب تو پانی کی طرح پیتا ہے۔ آپ کا سارا سامان بھی بکھیر ڈالا ہے، پتا نہیں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔"

میں نے اسے تسلی دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

رحمت سے گفتگو کے بعد میرے ذہن سے رہی سہی دھند بھی صاف ہو گئی۔ اگر توقیر آواز بدل کر فون کر رہا تھا تو یقینی طور پر وہ خود ہی اے ٹو تھا۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ مجھے اپنے شکنجے میں جکڑنے کی نیت سے لاہور سے کراچی آیا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے غزالہ کو سامنے لانے کے لیے بڑا خوبصورت ناٹک رچایا تھا لیکن اس کی سب تدبیریں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ غزالہ اپنے گھر کی چار دیواری میں محفوظ و مامون تھی اور میں قطعی آزاد۔

علاج گاہ کی طرف واپس لوٹتے ہوئے میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں توقیر کے لیے زندگی کو ذرا دشوار تر بنا دوں۔ وہ میرا سوتیلا ہی سہی لیکن بڑا بھائی تھا۔ بچپن میں اس نے بڑی ماں اور دوسرے بھائیوں سے مل کر مجھے گھر سے بے گھر کیا۔ میری سگی ماں کی بے آبروئی کی، پھر اے ٹو کے نام سے برسوں مجھے آلۂ کار بنا کر منشیات فروشی میں ملوث کیا اور جب ان ساری دشواریوں کے بعد میں نے اپنی زندگی کا ایک طرز بنا لیا اور گھر بسانے کی آرزو شرمندۂ تکمیل ہوتی نظر آنے لگی تو پوری قوت اور جبروت کے ساتھ مجھ پر براہِ راست ہاتھ ڈالنے آ پہنچا تھا۔

راستے ہی سے میں نے پولیس کے ایک اعلیٰ ترین افسر کو فون کر دیا۔ توقیر یا اے ٹو سے میری جنگ چھڑ چکی تھی اور جنگ میں ہر بات جائز ہوتی ہے۔

واپسی پر میں نے سلطان کو صرف یہی بتایا کہ میں کار سے پیچھا چھڑانے گیا تھا۔ اگر اسے زیادہ تفصیلات بتا دیتا تو وہ جوش میں باہر نکل پڑنے پر تل جاتا جب کہ میرے لیے اسے سنبھالنا دشوار ہوتا۔

شام کا دھندلکا پھیلنے کے ساتھ ہی میری طبیعت پر اضطراب طاری ہونے لگا۔ میں پولیس کی کارروائی کے نتائج دیکھنے کے لیے بے چین تھا لیکن میرا اپنے گھر کے قرب و جوار میں پایا جانا میرے حق میں بدترین ثابت ہو سکتا تھا۔

وہ رات میں نے سگریٹیں پھونک پھونک کر بے چینی سے جاگتے ہوئے بسر کی۔ سلطان شاہ یہی سمجھتا رہا کہ میں حالات کی وجہ سے پراگندگی کا شکار ہوں۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے پولیس کی کارروائی کی جانب سے خدشہ لاحق تھا۔ میں نے اپنی دانست میں ہر وہ حربہ استعمال کیا تھا جو پولیس کو کسی بڑی کارروائی پر اکسا سکے لیکن یہ اندیشہ بھی تھا کہ اس گمنام اطلاع کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔

لیکن صبح کا اخبار دیکھتے ہی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ پہلے صفحے پر جلی سرخی میں ایک بڑے چھاپے کی تفصیل درج تھی اور خبر کے نیچے میرے مکان کی تصویر موجود تھی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق مقامی پولیس نے ایک قاتل اور منشیات کے بدنام اسمگلر کی موجودگی کی اطلاع پر بھاری جمعیت کے ساتھ مکان کو محاصرے میں لے کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو باوردی پولیس والوں پر عمارت سے اسٹین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ ماری گئی جس کے نتیجے میں دو سپاہی شدید زخمی ہو گئے۔ یوں باقاعدہ فائرنگ کے تبادلے کا آغاز ہو گیا۔ جب محصور عمارت پر پولیس کا دباؤ بڑھنے لگا تو عمارت کے مختلف حصوں سے آگ کے ہولناک شعلے بھڑک اٹھے۔ اسی کے ساتھ فائرنگ بھی ہوتی رہی۔ آخری خبر آنے تک پولیس جلتی ہوئی عمارت میں گھسنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اندر سے فائرنگ کا سلسلہ موقوف ہو چکا تھا۔ متعدد فائر انجن آگ بجھانے میں مصروف تھے اور سلگتے ہوئے ملبے سے ایک لاش برآمد کی جا چکی تھی۔

لاش کی برآمدگی کی خبر پڑھتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں نے شکست خوردہ انداز میں اخبار اپنی گود میں ڈال لیا۔ کیوں کہ متوفی کا جو حلیہ خبر میں درج تھا وہ میرے معمر ملازم رحمت کا تھا۔

میں اخبار کے مطالعے میں منہمک تھا، رحمت کی ناگہانی موت پر مجھے دلی صدمہ ہوا تھا، مکان کے سلگتے ہوئے ملبے سے اس کی لاش کی برآمدگی کی خبر پڑھنے کے بعد

میں خاصی دیر تک دوبارہ اخبار نہ دیکھ سکا تھا لیکن پھر مجھے خود پر جبر کرنا پڑا۔ توقیر، لے ٹو یا اس کے کسی بے جگر ہرکارے سے میری کھلی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور اس جنگ میں ایک ایک لمحہ قیمتی تھا جسے میں رحمت کے سوگ میں گزار کر مزید دشواریاں مول لے سکتا تھا۔

رحمت کا تعلق انسانوں کی اس قبیل سے تھا جس کے خمیر میں وفا کا عنصر فراوانی کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جس در سے اپنی روزی کماتے ہیں اس کے تحفظ کے لیے جان بھی دینے کو آمادہ رہتے ہیں اور جذبے کی شدت بسا اوقات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ مالک سے زیادہ دردمند نظر آتے ہیں۔

رحمت کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ اس سے فون پر بات ہوئی تو میں نے اسے اپنی ضرورت کا سامان لے کر گھر سے نکل جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس وقت توقیر بھی مکان پر نہیں تھا۔ رحمت بابا کے لیے زندگی بھر کی خدمت کا صلہ سمیٹنے اور پھر کسی بے نام راستے پر نکل جانے کا سنہرا موقع موجود تھا۔ لیکن اس نے بُرا وقت آنے پر وہ چوکھٹ چھوڑنی گوارا نہیں کی جس پر وہ برسوں سے اچھا وقت گزارتا آیا تھا۔ شاید دوسرے ملازمول نے اس کھلی چھوٹ سے فائدہ اٹھایا تھا مگر رحمت بابا میرے گھر کا نگہبان بن کر وہیں ڈٹا رہا۔

توقیر سیاہ گاڑی میں گھر سے چلا گیا پھر شاید واپس لوٹا ہوگا اور اس نے رحمت بابا کو اپنی جھنجھلاہٹ آمیز زیادتیوں کا نشانہ بنایا ہوگا، پھر پولیس کی کارروائی کا آغاز ہوا، فضا میں بارود کی دھماکوں کی بو پھیلتی گئی لیکن رحمت بابا نے گھر کو لاوارث چھوڑ کر بھاگ جانا گوارا نہیں کیا۔ اور آخرکار توقیر گھر میں پیٹرول چھڑک کر آگ کے شعلوں اور دھویں کی اوٹ میں وہاں سے فرار ہو گیا۔

رحمت بابا شاید آگ میں گھرا، اپنی جان سے بے پروا، بھیانک شعلوں سے لڑتا رہا، مالک کے اثاثوں کو بچانے کی فکر میں اُس نے اپنی جان کی پونجی بھی گنوا دی۔

رحمت بابا سے میرا لہو کا رشتہ نہیں تھا اور وہ میرے مال و متاع کے لیے اپنی جان تک قربان کر بیٹھا تھا۔ اور جن سے میرا لہو کا قریب ترین رشتہ تھا وہ اپنے مال کے لیے روزِ ازل ہی سے میری جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ رشتوں کا کھیل بھی کس قدر عجیب ہوتا ہے۔ یکسر ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین سا۔

رحمت بابا سے مجھے یہ تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ توقیر کے نام سے میرے گھر میں ٹھہرا ہوا شخص میری غیر موجودگی میں بار بار فون کرتا رہا تھا، کبھی اپنی اصل آواز میں اور کبھی بدلے ہوئے لب و لہجہ میں۔ اس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ توقیر رہا ہو یا نہ رہا ہو مگر لے ٹو مزدور تھا۔

لے ٹو بنفسِ نفیس شہر میں موجود تھا، اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں نے اپنی غیر حاضری کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ جب لاہور میں اس کے ستارے گردش میں آنے ہوئے تھے تو میں کراچی میں نہیں لاہور ہی میں مقیم تھا... اسے شبہ ہو چکا تھا کہ لاہور میں جس لڑکی نے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے دفتر میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی وہ میری منگیتر غزالہ تھی اور محض اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے اسے کھیل کو طول دینا پڑا ورنہ مجھے تو وہ جب چاہتا مسل سکتا تھا۔ اس بہانے میں اس کے چنگل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن وہ خود میری بُو پر لگا ہوا تھا۔ اس نے قاسم اور اس کے آدمیوں کو میرے خلاف مامور کیا ہوا تھا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ اس مہم کی ابتدا سے پہلے ہی قاسم سے میرا سمجھوتہ ہو چکا تھا ورنہ وہ مجھے بے خبری میں کہیں بھی چھاپ سکتا تھا مگر مسئلہ یہی تھا۔ قاسم سے میرا جو کچھ سمجھوتہ ہوا، اس کی بنیاد یہی تھی کہ تنظیم میں مجھے ایک خاص مقام حاصل تھا اور مجھے اسی مقام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باہمی مفاد کے لیے کام کرنا تھا۔ لیکن اب یک بیک لے ٹو سے میرا تصادم ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں میرا نام تنظیم کے غداروں کی فہرست میں آ گیا تھا۔ ایسی صورت میں میرے لیے قاسم سے کیے ہوئے معاہدے کے مطابق اپنا کردار انجام دینا ناممکن تھا۔ وقتی ہنگامے میں قاسم کو یہ سوچنے کی مہلت نہیں مل سکی تھی لیکن کسی بھی لمحے وہ ان حقائق کا اندازہ لگا سکتا تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ خود میری جگہ لینے کے شوق میں میری بیخ کنی پر تُل جاتا۔ میرا قلع قمع کر کے وہ نہ صرف اپنی خاتی کدورتوں کا حساب بے باق کر سکتا تھا بلکہ فوری طور پر لے ٹو کا منظورِ نظر بھی بن سکتا تھا اس طرح وہ میری مدد کے بغیر تنظیم میں رہتے ہوئے خود اپنے مفادات کو آگے بڑھا سکتا تھا۔

اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور سلطان شاہ کی بھی نیند اُچٹ گئی۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اپنی خمار آلود آنکھیں جھپکاتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں بے تابانہ انداز میں دوبارہ دستک دی گئی اور میں جھپٹ کر دروازے کے قریب جا پہنچا۔

"کون ہے؟" میں نے جیب میں موجود پستول کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے سوال کیا۔

"دروازہ کھولو۔" راہداری سے قاسم کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی اور میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ قاسم زور لگا کر یوں اندر گھس آیا جیسے عقب سے کسی گینڈے نے اسے ٹکر رسید کی ہو۔

"کیا ہو گیا؟ اس قدر بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟" میں نے اسے اپنے ہاتھوں پر روکتے ہوئے سوال کیا۔

"دروازہ بند کر کے اندر سے بولٹ کر دو۔" اس نے سنبھلتے ہوئے بے چینی کے ساتھ کہا۔

میں دیکھ چکا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے لہٰذا فوراً ہی دروازہ بند کر دیا۔ واپس پلٹا تو وہ کرسی میں دھنسا خالی خالی نظروں سے اخبار کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تم نے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔" میرے متوجہ ہونے پر اس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔

"جو ہو رہا ہے تمھارے سامنے ہی ہے، میری کس غلطی کا حوالہ دے رہے ہو۔" میں نے پُراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تمھارے گھر کون ٹھہرا ہوا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"میرا بھائی! میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا تھا۔" میں نے پُرسکون انداز میں کہا۔

"تم غلط کہہ رہے ہو... وہ بذاتِ خود لے ٹو تھا۔" اس نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "لے ٹو بھی تو تم جیسا کوئی انسان ہی ہے، کوئی آسمانی مخلوق تو نہیں ہے وہ۔ لیکن تمھیں یہ خیال کیوں کر پیدا ہوا؟"

"کل رات میں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولا جیسے کسی ڈراؤنے خواب کا ذکر کر رہا ہو۔ "میں اپنے آدمیوں سمیت تمھارے گھر کی نگرانی کر رہا تھا کہ رات گئے جہانگیر اپنی سیاہ بلٹ پروف کار میں وہاں پہنچا۔ چند منٹ بعد وہ واپس روانہ ہوا تو میں نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ کار کے ٹنٹڈ شیشوں کے باعث مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کار میں اور کون تھا۔ جہانگیر سیدھا جیوا ہاؤز پہنچا۔ وہاں سے نصف گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی تو راستے میں کھڑکی کے اُتارے ہوئے شیشے میں سے بس میں اس کی ایک ہی جھلک دیکھ سکا۔ وہ سر سے پیر تک سیاہ پوش تھا۔ اس نے دُور ہی سے تحکمانہ اور پُریقین انداز میں ہاتھ اٹھا کر مجھے واپسی کا اشارہ کیا اور میں نے سیاہ کار کا تعاقب ترک کر دیا اور واپس تمھارے گھر پہنچا۔ وہاں رات بھر نہ وہ کار واپس لوٹی نہ ہی پُراسرار سیاہ پوش نظر آیا۔ پھر رات ہی میں کسی وقت پولیس کی بھاری نفری اسلحہ سے لیس وہاں دھاوا بولنے آ پہنچی۔ پولیس کی گاڑیاں دیکھتے ہی میں نے اپنے آدمیوں سمیت پسپائی اختیار کر لی۔ ہم اس علاقے سے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ پہلی بار فضا اسٹین گن کے نغموں سے گنگنا اٹھی پھر یک بیک رائفلوں کا شور گونجنے لگا۔ شاید تمھارے مکان سے مزاحمت میں اسٹین گن چلائی گئی تھی۔ اس کے جواب میں پولیس والوں نے رائفلوں کا استعمال شروع کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب مکان میں کوئی نہیں تھا تو مزاحمت کس نے شروع کی؟"

"تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ جہانگیر کی کار میں لے ٹو ہی تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"صبح پانچ بجے اس نے مجھے فون کیا تھا اور اس بات پر شاباش دی تھی کہ میں نے محض قیاس سے اسے پہچان کر حکم کی تعمیل کر ڈالی ورنہ وہ فائر کر کے میری گاڑی کے ٹائر پھاڑ دینے کا ارادہ کر چکا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شروع ہی سے تعاقب سے باخبر تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ پہلے تو وہ تمھیں اپنے پیچھے لگا کر جیوا ہاؤز تک لے گیا مگر واپسی میں تعاقب کرنے سے تمھیں روک دیا۔"

"ہاں۔ یہ بات تو واقعی اہم ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔"

"چاہتے تو جہانگیر سے معلوم کر سکتے تھے کہ واپسی پر اس نے سیاہ پوش کو کہاں اتارا تھا؟"

"اس کے فون کی گھنٹی بج رہی ہے لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا۔"

"ایسا ہونا ناممکن ہے، بیوی کے علاوہ اس کے ملازمین بھی گھر پر ہی ہوتے ہیں۔" میں نے تردد آمیز لہجے میں کہا پھر اس سے سوال کیا۔ "صبح اس نے خود ہی اپنی کراچی میں موجودگی کا ذکر کیا تھا؟"

"ہاں ابتدا اسی بات سے ہوئی تھی۔ پھر تمھارے اور سلطان شاہ کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے تم دونوں کے سول ہسپتال پہنچنے کی کہانی سُنا دی... جانتے ہو تازہ ہدایات کیا ہیں؟"

میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیے بغیر استفسار طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"ہر قیمت پر تمھیں اغوا کر کے جیوا ہاؤز میں بند کرنا ہے، مزاحمت کی صورت میں بے دریغ تشدد کی کھلی چھوٹ ہے۔" وہ میری طرف جُھک کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"پھر کیا ارادہ ہے تمھارا؟" سلطان شاہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

قاسم نے یوں چونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے اب تک اس کی وہاں موجودگی سے بے خبر رہا ہو پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں! یہ بتاؤ کہ لے ٹو اچانک تمھارے

گھر میں کیسے گھس آیا؟"

"وہ واقعی میرا بھائی ہے۔" میں نے قاسم سے چال چلنے کا فیصلہ کرتے ہوئے دو ٹوک لہجے میں کہا۔" وہ بھائی بن کر میرے گھر ٹھہرا تھا لیکن اپنی گفتگو کے باعث میری نگاہوں میں مشکوک ہو گیا تھا، اسے شبہ ہے کہ میں رخشی کے بارے میں کوئی اہم بات چھپا رہا ہوں۔ اس نے گھما پھرا کر مجھ سے کئی ٹیڑھے سوالات کیے۔"

قاسم کا چہرہ اُتر گیا۔" تم نے رخشی کے معاملے میں شروع ہی سے پے در پے غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ جب تک وہ رخشی کو پابہ سلاسل اپنے سامنے نہ دیکھ لے گا اسے نہیں بھولے گا۔" اس نے کہا۔

"اور اس چکر میں اس نے بلی چوہے کا کھیل شروع کرا دیا ہے۔" میں نے آگے جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔" سیٹی بج چکی ہے، اب جو چوکنا ہوگا وہ جیت جائے گا۔"

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"وہ رخشی کی تلاش میں ہے شاید اس بارے میں تم بھی اس کی نگاہوں میں مشکوک ہو۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں رخشی کی نشان دہی کر سکتا ہوں لہٰذا اس نے تمھیں میری تلاش پر مامور کر دیا ہے۔ تمھیں اپنی شہر میں موجودگی سے بھی باخبر کر دیا ہے تاکہ تمہارا جذبۂ وفاداری جوش میں آجائے اور تم مجھے اس کا قیدی بنوانے میں سر دھڑ کی بازی لگا دو، تمھارے ہاتھوں یہ چوٹ کھانے کے بعد میں لامحالہ سب کچھ اُگل بیٹھوں گا اور یوں تم خود زیرِ عتاب آجاؤ گے۔"

"میں اس حد تک تو کڑیاں نہیں ملا سکا تھا لیکن مجھے بھی شبہ تھا، وہ خود تمھارے گھر میں مقیم تھا نگرانی کے باعث مجھے معلوم ہے کہ تم دونوں بلکہ تینوں بیک وقت اسی چھت کے نیچے مقیم تھے۔ وہ چاہے تو خود بھی تمھیں گھیر سکتا ہے۔"

"یہ کام وہ تمھارے ہاتھوں انجام دلانا چاہتا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔" تاکہ میرے دل میں تمھارے لیے نفرت کے جذبات کو ہوا مل سکے۔"

"کیا تمھیں پہلے سے معلوم تھا کہ اے ٹو تمھارا بھائی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مبہم سا شبہ تھا جو یقین میں کبھی نہ بدل سکا۔" میں نے صفائی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔" عملی زندگی میں اس نے اپنی ذات پر کند ذہنی اور غبی پن، ایسا لبادہ اوڑھا ہوا ہے کہ اس پر اے ٹو ہونے کا شبہ کرنا محال ہے۔"

تمھارا مکان برباد کر دیا گیا ہے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔" وہاں اس بُری طرح چوطرفہ آگ لگی تھی کہ کوشش کے باوجود کچھ نہ بچایا جا سکا۔ اصل مجرم پولیس کے ہاتھ نہ آسکا۔ ملبے

سے ایک ادھ جلی لاش برآمد ہوئی ہے۔ اب پولیس لامحالہ تمھارا رُخ کرے گی۔"

یہ ایک ایسی اُلجھن تھی جس کے بارے میں میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ روپوش رہتا تو۔۔۔ اے ٹو کی انتقامی کارروائی سے بچاؤ کا امکان موجود تھا۔ لیکن پولیس کی مشتبہ فہرست میں میرا نام بھی مشتبہ افراد کے خانے میں درج ہو جاتا۔ پولیس مکان کے حوالے سے میری پلاسٹک فیکٹری تک جا پہنچتی اور میرے لیے دشواریوں میں اضافہ ہوتا اور اگر ان دشواریوں کے سدِباب کے لیے میں پولیس کے سامنے آتا تو اے ٹو کسی بھی لمحے بے خبری میں مجھ پر اپنا وار کر سکتا تھا لیکن میں نے قاسم کے سامنے اپنی کسی کمزوری کا اعتراف نامناسب سمجھتے ہوئے بات ٹال دی۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا، پولیس میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"لیکن پولیس اچانک ہی تمھارے مکان پر کیسے چڑھ دوڑی؟ یقینی طور پر کسی نہ کسی نے اے ٹو کے خلاف مخبری کی ہو گی ورنہ یہ نوبت ہی نہ آتی۔" اس کا لہجہ اشتباہ آمیز تھا۔

"خبر میں تو ایک قاتل اور اسمگلر کی نشاندہی کا تذکرہ ہے، محکمے نے تفصیلات شاید جاری ہی نہیں کیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور وہ پُرخیال انداز میں سر ہلانے لگا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مخبری تمھارے خلاف ہوئی ہو، میرا اندازہ ہے کہ دو چار خون تمھارے ہاتھوں بھی سرزد ہوئے ہوں گے اور تم منشیات کے اسمگلر نہ سہی، بڑے سوداگر ضرور ہو۔"

میں دل ہی دل میں اس کی کم فہمی پر ہنس دیا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ مخبری کرنے والا میں خود ہی تھا۔ البتہ میں نے اتنی رعایت ضرور کی تھی کہ پولیس کو مجرم کا نام نہیں بتایا تھا۔

"تمھارا اندازہ درست ہے۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔" ہو سکتا ہے کہ ساری مہم میرے خلاف رہی ہو اور بدقسمتی سے اے ٹو اس کی زد میں آگیا ہو۔"

"پھر اب میں کیا کروں؟" قاسم نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"شہر میں پورے زور شور سے مجھے تلاش کرتے رہو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔" ہو سکتا ہے کہ مجھے پکڑنے میں کامیاب ہی ہو جاؤ، بس یہ یاد رکھنا کہ ہمارے درمیان باہمی تعاون کا ایک معاہدہ وجود میں آچکا ہے۔"

کیسا معاہدہ؟" اس نے حیرانگی سے کہا۔" میری دانست میں تو اب حالات یکسر بدل چکے ہیں۔ تم نے تنظیم میں اپنا مقام کھو دیا ہے۔ اب کس طرح ہمارے ساتھ مل کر چل سکتے ہو؟"

آخرکار میرا خدشہ سامنے آ ہی گیا تھا لیکن میرے ذہن میں اس کا توڑ موجود تھا۔" اس کا مطلب ہے کہ تم اے ٹو سے ملی ہوئی ہدایات پر عمل کرنے پر آمادہ ہو؟"

"اصولاً مجھے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔" اس نے مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔" لیکن تمھاری آزادی سے میری سلامتی بھی وابستہ ہو گئی ہے، تشدد کے نتیجے میں تم میرے خلاف خاصا زہر اُگل سکتے ہو لہٰذا میں تمھیں چھوٹ دینے پر مجبور ہوں لیکن کام اور نفع کی تقسیم سے اب تمھارا کوئی تعلق نہ ہوگا، وہ میرا اور جہانگیر کا نجی معاملہ ہوگا۔"

"تم رخشی کو بھول رہے ہو۔۔۔ اس کی سلامتی کو تم معمولی نفع کی تقسیم پر قربان نہیں کر سکو گے۔"

"میں اس کی طرف سے بے فکر ہوں، وہ رات ہی یہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر منتقل ہو چکی ہے۔ اب تم اس کا سایہ بھی نہ پا سکو گے۔" اس نے انکشاف کرتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔" اب میرے اور تمھارے درمیان پُرامن بقائے باہمی کی واحد شرط یہی ہے کہ تم رخشی اور میرے تعلقات کے بارے میں زبان بند رکھو گے اور میں تمھیں نظر انداز کرتا رہوں گا۔ جس دن تمھاری ذات سے رخشی کو کوئی زک پہنچی، میں پوری قوت کے ساتھ تمھارے مقابل آجاؤں گا۔"

مجھے اپنے حلق میں تلخی کا سا احساس ہونے لگا۔ اس وقت میں قاسم سے اپنی شرائط منوانے سے قاصر تھا۔ لیکن میرے لیے یہی ایک مہلت کافی تھی کہ وہ توقیر کے حکم کے باوجود مجھے رعایت دینے پر آمادہ تھا۔

"بس یہی ایک شرط ہے نا تمھاری؟" میں نے پُراعتماد لہجے میں سوال کیا۔ پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔" اس کا میں احترام کروں گا لیکن میرے بغیر تم جہانگیر کو شریک نہ رکھ سکو گے۔"

"خوش فہمی ہے تمھاری۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔" جب تک تم اندر کے آدمی تھے، اور بات تھی اب تو شاید وہ تم سے کھلے بندوں ملنا بھی گوارا نہیں کرے گا، میں نے اے ٹو کو دُور سے دیکھا ہے لیکن جہانگیر کسی سعادت مند ڈرائیور کی طرح اسے شہر میں لیے گھوم رہا تھا۔ اے ٹو نے اُسے تمھاری طرف سے چوکنا کر دیا ہوگا۔"

"وقت آنے پر سب دیکھ لیا جائے گا۔"

"کاش اس نے تمھیں زندہ پکڑنے کا حکم نہ دیا ہوتا تو بس میری ایک ہی گولی کافی ہوتی۔ تم میرے راز سینے میں لیے منوں مٹی کے نیچے سو جاتے اور اے ٹو اس کارکردگی پر فی الفور مجھے تمھارا خالی کیا ہوا منصب سونپ دیتا۔" اس نے حسرت بھرے لیکن بے خوف لہجے میں کہا۔ اور میرا خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔

"اے ٹو کے حکم کو بھول جاؤ اور اپنے دل کی حسرت نکالنے کی کوشش کر دیکھو۔ انجام تمھیں جاگتی آنکھوں دیکھنا نصیب نہ ہو سکے گا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"واللہ ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا تم کو۔ ٹھوکروں سے اُڑا کے رکھ دوں گا۔" سلطان شاہ غضبناک لہجے میں بولا۔

قاسم اچانک ہی ہنس پڑا۔" تم دونوں تو سنجیدہ ہی ہو گئے۔ وہ تو مذاق کی بات تھی۔ اب یہ بتاؤ کہ تمھارا ٹھکانا کہاں رہے گا؟ گھر تو اس قابل نہیں رہا تمھارا۔"

"فی الحال اسی عمارت کو ہوٹل سمجھیں گے، سلطان شاہ کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی۔" میں نے اضطراری طور پر اپنے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے کسی وقت موقع نکال کر ملنے آؤں گا لیکن تم ذرا محتاط رہنا۔ اے ٹو جب تک شہر میں ہے، باہر نکلنے سے گریز ہی کرنا ورنہ مارے جاؤ گے بے موت۔ تمھارے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ کسی کٹکھنے کتے کی طرح غرّا رہا تھا۔"

"میں اپنا تحفظ کر سکتا ہوں، تم میری فکر نہ کرو۔" میں نے خوش دلی کے ساتھ کہا اور وہ کرسی سے اُٹھ گیا۔ اُس کے جاتے ہی سلطان شاہ بستر سے اُتر پڑا۔" کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

"قاسم بدنیت آدمی ہے۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔" عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم پہلی فرصت میں ٹھکانا چھوڑ دیں۔ اس کی نیت بدلنے میں دیر نہیں لگے گی۔"

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔ اسے ابھی سے بی فور کے منصب کے خواب آنا شروع ہو گئے ہیں۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ رخشی کو یہاں سے نکال کے لے گیا ہے۔"

"فیصلہ تو بہت سہل نظر آرہا ہے لیکن اس پر عمل کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔" میں نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔" اگر اس کی نیت میں فتور ہے تو باہر اس کے آدمی ہمارے استقبال کے لیے تیار ہوں گے۔"

"کیوں نہ ہسپتال کے عملے سے مدد لی جائے۔" اس نے خیال ظاہر کیا۔

"یہ نہ بھولو کہ اکبر قاسم کا گہرا دوست ہے۔ قاسم کے آدمی اگر موجود ہوئے تو ہسپتال کے احاطے سے باہر ہی ہوں گے۔ احاطے میں کئی ایمبولینس گاڑیاں میں نے دیکھی تھیں۔ ان ہی میں سے کوئی لے بھاگیں گے۔۔۔ تم یہ بتاؤ کہ اپنے قدموں پر چل سکو گے؟"

"چل تو میں پہلے بھی سکتا تھا لیکن اب بہت افاقہ ہے، یہاں کا علاج بہت مؤثر معلوم ہوتا ہے۔" بولتے بولتے وہ چونک پڑا۔" لیکن ہم جائیں گے کہاں؟"

"ٹھکانا میرے ذہن میں ہے، تم بس دیکھتے جاؤ۔"

چند ثانیوں بعد میں سلطان شاہ کو سہارا دے کر کمرے سے باہر راہداری میں لے آیا تاکہ ہسپتال کے عملے کو ہم پر کوئی شبہ نہ ہو۔ میری ہدایت پر سلطان شاہ نے زندگی سے اکتائے

ہوئے کسی مریض کی سی اداکاری شروع کردی تھی۔

ہمیں دیکھتے ہی ڈیوٹی کاؤنٹر سے کرخت صورت والا ایک میل نرس ہماری طرف لپکا تھا۔ "ارے... رے! آپ مریض کو کہاں لیے جارہے ہیں؟"

"بستر پر پڑے پڑے اُکتا گیا ہے۔" میں نے کسی پیدائشی تیماردار کی طرح مغموم لہجے میں کہا۔ "تھوڑی دیر لان پہ ٹہلے گا تو طبیعت بہل جائے گی۔"

اس وقت میری رسٹ واچ آٹھ بجا رہی تھی۔ اور ڈیوٹی کاؤنٹر سے ملحقہ کمرے میں عملے کی کثرت اور چہل پہل سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس وقت شاید ڈیوٹی تبدیل ہو رہی تھی۔ لہٰذا کسی نے ہم پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اور ہم بآسانی عمارت سے باہر نکل آئے۔

احاطے میں تین ایمبولینس گاڑیاں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک میں ڈرائیور اپنی نشست پر براجمان اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں میدان صاف پاکر اس کے قریب جا پہنچا۔

"زحمت نہ ہو تو ذرا ہمیں سڑک تک چھوڑ دو، جہاں سے ٹیکسی مل سکے۔" میں نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"ٹیکسی کیوں؟" اس نے نگاہیں اٹھا کر سلطان شاہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اندر سے پرچی بنوالو، گھر ہی چھوڑ آؤں گا، تمھارے مریض کی حالت خراب نظر آرہی ہے۔"

"یہی تو مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "اندر ڈیوٹی بدل رہی ہے اور اسے بیٹھنا محال ہو رہا ہے۔"

اس نے غصیلے لہجے میں ڈیوٹی بدلنے والوں کو ایک ثقیل گالی دی اور اخبار سیٹ پر ڈال کر نیچے اُتر آیا۔ "کہاں جانا ہے؟ مجھے بتاؤ، میں ایک منٹ میں پرچی لے کر آتا ہوں۔"

اس اثنا میں، میں اگنشن میں لگی ہوئی چابی دیکھ چکا تھا اور میں نے تہیّہ کرلیا تھا کہ اگر ڈرائیور نے چابی ساتھ لے جانے کی کوشش کی تو میں اس سے چابی چھین لوں گا۔ لیکن وہ بیچارا خدمتِ خلق کا مارا، میری زبان سے عزیز آباد کا نام سُنتے ہی چابی چھوڑ چھاڑ کر تیر کی طرح عمارت کے داخلی دروازے کی طرف ہو لیا۔

سلطان شاہ لپک دوسری نشست پر جا بیٹھا اور میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ایمبولینس کا انجن خفیف سی ہچکی لے کر بیدار ہوا اور میں گاڑی برق رفتاری سے احاطے سے باہر نکال لایا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں دوسری گاڑی میں ہمیں پکڑنے کی کوشش نہ کی جائے لہٰذا سائرن آن نہیں کیا تھا اور تیزی کے ساتھ پیچ در پیچ گلیوں میں گھستا چلا گیا۔ جب چند منٹ بعد بھی عقب نما شیشے میں میدان صاف نظر آتا رہا تو میں ایمبولینس بڑی سڑک پر نکال لایا۔

اگلا مسئلہ خاصا گمبھیر تھا کہ ایمبولینس سے کہاں جان چھڑائی جائے اسے جہاں بھی روکتا، سلطان شاہ ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن جاتا کہ ایمبولینس سرِراہ چھوڑ کر مریض کے لیے سواری کی تلاش کیوں کی جارہی ہے اور سلطان شاہ بھی اس وقت بیکار ثابت ہوا، میری تشویش سے آگاہ ہوتے ہی اس نے پٹیاں کھول ڈالیں مگر اسی اثنا میں مجھے ایک بہتر تجویز سُوجھ گئی، میں نے ایمبولینس جناح اسپتال کے راستے پر ڈال دی۔

ہسپتال کے احاطے میں داخل ہو کر میں نے ایمبولینس عمارت کے عقب میں ایکسرے کے شعبے کے قریب چھوڑ دی اور سلطان شاہ سمیت عمارت سے گزر کر سامنے نکل آیا۔

ہسپتال میں بھانت بھانت کے مریضوں کا ہجوم تھا جو سلطان شاہ سے کہیں زیادہ ابتر حالت میں تھے لہٰذا کسی نے بھی ہم پر توجہ نہیں دی۔ سیڑھیاں اُترتے ہی مریضوں سے خالی ہونے والی ایک ٹیکسی مل گئی اور میں نے ڈرائیور کو بلا تامّل کرنل زوار زیدی کے مکان کا پتا بتا دیا۔

پھاٹک عزالہ کے باپ نے خود ہی کھولا تھا۔

اپنے دروازے پر مجھے ٹیکسی ڈرائیور کو ادائیگی کرتے دیکھ وہ حیران رہ گیا۔ "ارے۔ تم ٹیکسی سے آتے ہو، گاڑی کیا ہوئی تمھاری؟"

"ایک حادثے میں تباہ ہوگئی، یہ اسی سے زخمی ہوا تھا۔" میں نے بل ادا کرکے جلدی سے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"مگر دوسری کار بھی تو تھی تمھارے پاس؟" اس نے جیوا ہاؤز والی کار کے حوالے سے دریافت کیا۔ اس کے نزدیک ایک کار کی تباہی اور اس حادثے میں سلطان شاہ کے زخمی ہونے سے زیادہ قابلِ تشویش یہ امر تھا کہ میں ٹیکسی میں وہاں پہنچا تھا۔

"وہ چوری ہوگئی۔" میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کی نیت سے کہا۔

"اوہو!" وہ پھاٹک بند کرتے کرتے حیرت سے اُچھل پڑا۔ "کار چوری ہوگئی اور تم اس قدر مطمئن ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کی بازیابی کے لیے کیا کیا تم نے؟"

"گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی کار انشورڈ تھی۔ دس پندرہ دن میں نہ ملی تو انشورنس کمپنی سے پوری کلیم کی رقم مل جائے گی۔ فی الحال مجھے پورے سکون اور تخلیے کی ضرورت ہے۔" میں نے قدرے ناخوشگوار لہجے میں کہا اور وہ سر کو جُنبش دے کر رہ گیا۔

"یہ تو وہی نوکر ہے نا تمھارا جو تمھارے اور عزالہ کے ساتھ لاہور گیا تھا۔" خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے سلطان شاہ کو پہچان کر وہ پھر بول پڑا۔

"نوکر نہیں یہ میرا دستِ راست ہے کرنل صاحب!" میں نے اس کے توہین آمیز تبصرے پر اپنا غصّہ برداشت کرتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔ "بلکہ آپ اسے دوست بھی سمجھ سکتے ہیں میرا۔"

"ہاں.... آں.... ایک ہی بات ہے۔" وہ میرے لہجے کی چبھن محسوس کیے بغیر منہ بنا کر بولا۔ "اب وہ نوابی زمانہ لد گیا تنویر میاں! جب نوکروں کو مصاحب، درباری اور رتن کہا جاتا تھا۔ آج کل یہ سب نہیں چلتا۔" غنیمت یہ ہوا کہ پھر اس نے چونک کر خود ہی موضوع بدل دیا۔ "ارے آج اتنی صبح کیسے اِدھر آنکلے؟"

"کچھ مسائل میں اُلجھ گیا ہوں۔" میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ دو چار روز کے لیے آپ ہی کے گھر ڈیرا ڈالنا پڑ جائے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ شوق سے رہو، تمھارے لیے کامران کا کمرہ ٹھیک کرائے دیتا ہوں، یہ سرونٹ کوارٹر میں رہ لے گا۔ وہاں سے ذرا کاٹھ کباڑ ہٹانا ہوگا۔"

میں اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا۔ کرنل زوار زیدی انگریزوں کے زمانے کا تربیت یافتہ افسر تھا اور کسی بھی قیمت پر طبقاتی امتیاز کو فراموش کرنے کے لیے تیار نہیں تھا یا شاید وہ فرق اس کے لاشعور سے چپک کر رہ گیا تھا۔ میری بار بار کی وضاحت کے باوجود وہ سلطان شاہ کو میرے برابر کی حیثیت میں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ دو چار روز کے قیام میں کرنل، سلطان شاہ کو اپنے رویے سے اتنا مشتعل نہ کردے کہ وہ بدتمیزی پر اُتر آئے۔

لیکن سلطان شاہ بہت سمجھدار آدمی تھا۔ اس نے میرے چہرے پر شدید قسم کی ناگواری کے اثرات بھانپ لیے تھے اور بات سنبھالنے کے لیے فوراً ہی دخل دے بیٹھا۔ "کوئی فرق نہیں پڑتا، سرونٹ کوارٹر کی صفائی میں دقت ہوئی تو میں باہر ہی کوئی جگہ بنالوں گا۔ تم دونوں میری فکر نہ کرو۔"

شاید میں خود بھی عزالہ کے گھر میں سلطان شاہ کو اپنے ساتھ اندر نہ ٹھہراتا لیکن کرنل جس طرح بار بار سلطان شاہ کو اس کی حیثیت جتا رہا تھا، وہ انداز مجھے گراں گزر رہا تھا۔ اس نے خود زبان کھولی تو میں لاتعلقانہ انداز میں صوفے میں گر گیا۔

اسی وقت عزالہ بھی ڈرائنگ روم میں آپہنچی اور مجھے سلطان شاہ کے ہمراہ براجمان دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے دیکھتے ہی کرنل زوار زیدی خاموشی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

"لمبی کہانی ہے، آرام سے سُناؤں گا۔" اس کے چہرے پر تحیّر کی جھلکیاں تیرتی دیکھ کر میں نے جلدی سے کہا۔ "پہلے ہمارے لیے ناشتے کا بندوبست کراؤ۔"

وہ کچھ کہے بغیر مسکراتی ہوئی واپس لوٹ گئی۔

میں سلطان شاہ کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کرکے راہداری میں رکھے ہوئے فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت میری رسٹ واچ صبح کے سوا نو بجا رہی تھی جب کہ پلاسٹک فیکٹری میں ساڑھے آٹھ سے کام شروع ہو جاتا تھا۔

"سر صبح سویرے فیکٹری کُھلنے سے پہلے کوئی توقیر صاحب آپ سے ملنے آئے تھے۔" میری آواز پہچانتے ہی سیکریٹری نے بتایا۔ "ہم لوگوں کے آنے تک وہ باہر ہی گاڑی میں بیٹھے رہے، پھر پندرہ بیس منٹ اندر بھی انتظار کیا۔ جاتے ہوئے پیغام چھوڑا ہے کہ آپ پہلی فرصت میں ان سے مل لیں۔"

"توقیر صاحب!" میں نے پُر خیال لہجے میں دُہرایا۔ "حُلیہ کیا تھا ان کا؟"

جواب میں اس نے جو حُلیہ بتایا وہ سو فیصدی توقیر ہی پر صادق آتا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے کس بوتے پر اس دیدہ دلیری کا مظاہرہ کیا تھا؟

"سر وہ عجلت میں اپنا بریف کیس بھی بھول گئے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "اس کا کیا کیا جائے؟"

"بریف کیس!" میرے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی اور دورانِ خون یک بیک تیز ہوگیا۔ "اسے ہاتھ تو نہیں لگایا کسی نے؟"

"یس... یس سر!" میرے وحشت زدہ لہجے پر وہ بوکھلا گئی۔ "میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہے.... لل.... لیکن اسے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔"

"لائن متین صاحب کو دے دو اور اپنا کمرہ فوراً چھوڑ دو۔" میری آواز ہیجان آمیز ہوگئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ توقیر نے وہ بریف کیس وہاں دیدہ دانستہ چھوڑا ہوگا۔ بریف کیس کے معاملے میں تنظیم کی ہولناک تکنیک سے میں ذاتی طور پر واقف تھا۔ خود میری تحویل میں ایک ایسا بارودی بریف کیس رہ چکا تھا، جسے کھولنے میں ذرا سی بے احتیاطی بربادی کا سبب بن سکتی تھی۔

متین میرا قابلِ اعتماد ادھیڑ عمر کلرک تھا۔ لائن پر اس کی فوراً تشویش زدہ آواز اُبھری تھی۔ "السلام وعلیکم سر! آپ خیریت سے تو ہیں نا؟"

"میں خیریت سے ہوں، تھوڑی دیر پہلے ایک ملاقاتی کوئی بریف کیس بھول گیا ہے۔ ذرا احتیاط سے اس سے کان لگا کر دیکھو کہ کوئی آواز تو نہیں آرہی؟ اسے کھولنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔"

"ہاں، اس میں سے ٹِک ٹِک کی بہت مدّھم سی آواز آرہی ہے۔" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد اس کی کانپتی ہوئی آواز ریسیور پر اُبھری۔ "اور.... اور شاید آج کے اخبار میں.....؟"

"ہاں ہاں" میں نے اضطرار کے عالم میں اس کی بات کاٹ دی۔ "میرا گھر جلا دیا گیا ہے، کوئی دشمن پیچھے لگ گیا ہے اور میں نے روپوشی اختیار کر لی ہے.... اس بریف کیس میں یقیناً طاقتور ٹائم بم ہے۔ اسے ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر کسی ویرانے میں ڈلوا دو۔" میں نے اس کا جواب سُنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں چند ثانیوں تک سکتے کے عالم میں وہیں کھڑا رہا میرے بدن کے سارے مساموں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ مکان کو جلا کر راکھ کر دینے کے بعد توقیر نے اپنی دانست میں فیکٹری کی تباہی کا سامان بھی کر دیا تھا۔ پلاسٹک فیکٹری میں خام مال کے سارے ذخائر ایسے مادوں پر مشتمل تھے جو تیزی سے آگ پکڑتے ہیں۔ اگر وہ طاقتور بریف کیس بم عمارت میں پھٹ جاتا تو چشم زدن میں آگ ملحقہ کمرے، گودام اور فیکٹری میں پھیل جاتی اور متعدد افسران اور کارکن سمجھنے سے پہلے ہولناک آگ اور زہریلے دھوئیں میں گھر کر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

میں بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گیا۔ توقیر میرے اندازوں سے کہیں زیادہ سرد مزاج اور سنگدل ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے جہانگیر کے گھر فون کیا تو محتاط رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ توقیر اے ٹو کے رُوپ میں اس کے سامنے آ چکا تھا۔ اسے میرے اور جہانگیر کے قریبی مراسم کا پوری طرح علم تھا اور وہ جہانگیر کے علم میں لائے بغیر کسی بھی شعبدے کے ذریعے اس کا فون ٹیپ کر سکتا تھا۔

دوسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا، میری آواز پہچانتے ہی جہانگیر ہذیانی کیفیت میں پھٹ پڑا۔ "تصادم کا راستہ اختیار کر کے تم نے تباہی کو دعوت دی ہے ڈینی! اب بھی کچھ نہیں بگڑا سامنے آ کر ہتھیار ڈال دو۔"

"میں برسوں سے کان دبائے کام کرتا چلا آ رہا تھا، مجھے تو تصادم کی راہ پر دھکیلا گیا ہے اور اب میں بھی تنظیم کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے پر تل گیا ہوں۔ اے ٹو کو تم جلد ہی میری ٹھوکروں میں سسکتا دیکھو گے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے محفوظ رابطے کے بارے میں کس طرح دریافت کروں کہ اے ٹو کو بھنک بھی نہ مل سکے۔

"تم کتے کی موت مار دیے جاؤ گے ڈینی!" اس کی آواز فرطِ خوف سے واضح طور پر لرز رہی تھی۔ "پورے شہر میں تمہاری تلاش جاری ہے، مکان جلا دیا گیا، فیکٹری بھی تباہ ہو چکی ہو گی، بھرپور تنظیم کے سامنے تم زیادہ دن نہیں ٹِک سکو گے، کوڑی کوڑی سے محتاج ہونے کے بعد ایک دن کسی پاگل کی طرح موت کو پکارتے خود سڑکوں پہ نکل آؤ گے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہارے بزدل اور پردہ نشین اے ٹو کو سامنے آنے پر مجبور کر دیا ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "آج تک وہ اپنے محکوموں کے ذریعے دشمنوں کا شکار کیا کرتا تھا۔ لیکن میرا مقابلہ وہ خود کر رہا ہے۔ مہمان بن کر میزبان کے مکان کو آگ لگانا دلیری نہیں بزدلی ہے۔ اس نے فیکٹری میں جو بریف کیس چھوڑا تھا وہ کسی ویرانے ہی میں پھٹ سکے گا اور اس کی لہریں وہ ان اطراف میں بھی نہ پھٹک سکے گا۔ میں نے پورا حفاظتی بندوبست کر لیا ہے۔"

"آج شام سات بجے کے بعد مجھے فون نہ کرنا، میں بیوی کو گھر لا رہا ہوں، یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ ان قصوں کی بھنک اس کے کان میں بھی پڑے۔" تھوڑے سے توقف کے بعد اس کی ترش آواز سُنائی دی اور اس کی عقلمندی پر میرا دل خوش ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی بیوی، سلمیٰ پچھلے تین دن سے کراچی میں موجود اپنے کسی اکلوتے رشتے دار کے گھر گئی ہوئی تھی۔ گو اس گھر پر مجھے کبھی رجوع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی لیکن اپنی طرف سلمیٰ کے جھکاؤ اور اس سے نوک جھونک کے باعث مجھے وہاں کا فون نمبر بھی معلوم تھا۔ جہانگیر نے مجھے جتا دیا تھا کہ شام کو وہ اپنی بیوی کو لینے جائے گا اگر میں چاہوں تو اس سے بے خوف و خطر اس جگہ بات کر سکتا ہوں۔

"کم از کم اتنا تو بتا ہی دو کہ میرے گھر کو آگ لگانے کے بعد اب وہ کہاں مقیم ہے؟" میں نے گفتگو کو قدرتی رنگ دینے کے لیے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"ان باتوں کو بھول جاؤ ڈینی! تم اب دوستوں کی صف میں سے نکل کر دشمنوں میں مل گئے ہو، یہ یاد رکھنا کہ اب میں خود بھی تمہاری جستجو میں ہوں، اگر تم راہِ راست پر نہ آئے تو برسوں کی رفاقت کے حوالے سے مجھے تمہارے انجام پر دُکھ ہو گا۔"

"زیادہ دُکھ ہو تو دردِ دشتی مرہم لگا لیا کرنا، بادی کے علاوہ خونی تکلیف میں بھی اکسیر کا حکم رکھتا ہے، اے ٹو کو بھی خاصا افاقہ ہو گا۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا اور دوسری طرف سے یکلخت ریسیور کریڈل پر ڈال دیا گیا۔

پھر میں نے دوبارہ فیکٹری کا نمبر ملایا تو لیڈی سیکریٹری کی آواز سے سراسیمگی ٹپک رہی تھی۔ میری ہدایت پر اس نے لائن فوراً ہی متین کو منتقل کر دی۔

"وہ بریف کیس میں نے بھجوا دیا ہے سر!" وہ فوراً ہی بولنے لگا۔ "ہاکس بے کے راستے میں بہت بڑا ویرانہ ہے.... فیکٹری سے وہی جگہ قریب ترین تھی۔ صبح جلے ہوئے مکان کی تصویر دیکھ کر مجھے محض شبہ ہوا تھا لیکن آپ کی تائید نے سب کو فکر مند کر دیا ہے۔ آخر وہ کون ہے جو آپ کی جان کے ساتھ مال کا بھی دشمن ہو رہا ہے؟"

"کوئی سامنے آئے تو پتا بھی چلے متین صاحب!" میں نے کہا۔ "بظاہر کوئی بلیک میلر ہے۔ تین دن قبل فون کر کے چہلا کو روپے طلب کیے تھے جس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میرے انکار پر اس نے بس اسی قدر کہا تھا کہ دو روز میں مطلوبہ رقم فراہم نہ کی گئی تو گھر سے کاروبار تک ہر طرف بربادی ہی بربادی نظر آئے گی۔"

"لیکن اخبار میں تو کسی قاتل اور اسمگلر کے حوالے سے خبر شائع ہوئی ہے سر!" اس کا لہجہ تحیر آمیز تھا۔

"فی الحال میری عقل ماؤف ہو کر رہ گئی ہے۔ تم میری جانب سے پولیس میں رپورٹ درج کرا دو موقع ملنے پر میں اعلیٰ حکام سے خود مل لوں گا۔ ہو سکے تو فیکٹری پر پولیس کے مسلح گارڈ لگوا لو لیکن رپورٹ میں بریف کیس کا ذکر نہ کرنا۔"

"بریف کیس کا معاملہ تو میری ذات تک محدود ہے لیکن جہاں وہ پھینکا جائے گا، وہاں اگر کوئی شدید دھماکا ہوا تو فیکٹری میں بات ضرور پھیلے گی۔ ویسے بھی لوگ بریف کیس کو یوں پھنکوائے جانے پر چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔"

"پھر یہ قصہ بھی بتا دینا اس طرح پولیس گارڈ آسانی سے مل جائے گی۔ فیکٹری میں اپنے چوکیداروں کی تعداد بھی بڑھا دو کوئی بھی مشکوک آدمی نظر آئے تو بے دریغ گولی چلا دیں۔ اور ہاں! توقیر کا نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں، میں سب معاملات سنبھال لوں گا لیکن ضرورت پڑنے پر آپ سے کہاں رابطہ ہو سکے گا؟"

"میں شہر ہی میں ہوں لیکن ٹھکانے بدلتا رہوں گا۔ تم فکر نہ کرو، میں خود ہی روزانہ بات کر لیا کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ریسیور رکھ کر مُڑا تو غزالہ ناشتے کی ٹرالی لیے راہداری ہی میں کھڑی شاید میری گفتگو سنتی رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ سنجیدگی اور تشویش کے سائے لرزاں تھے۔

"مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہے ورنہ آپ ہمارے گھر کا رُخ ہرگز نہیں کرتے۔"

"فوری طور پر یہی ایک محفوظ ٹھکانا سجھائی دیا تھا شہر میں، بس آنکھیں بند کر کے اِدھر ہو لیا۔" میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی میرے ساتھ چل رہی تھی۔

"یہ بلیک میلر کا چکر کہاں سے آ گیا؟" اس نے سوال کیا۔

"مفروضہ قصہ ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "کل رات توقیر کھل کر سامنے آ گیا، وہ خود ہی اے ٹو ہے۔" ناشتے کے دوران میں نے اسے اختصار کے ساتھ پورے واقعات سے آگاہ کر دیا۔

"اوہ تو وہ اخبار میں آپ ہی کے مکان کی خبر شائع ہوئی ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے ہنستے ہوئے اعتراف کیا۔ "وہ تو غنیمت ہے کہ کرنل صاحب نے میرا گھر نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ اس قدر سوالات کرتے کہ میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔"

"انھیں نہیں بتایا آپ نے؟"

"تم بھی ذکر نہ کرنا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ میرے بارے میں ان کی رائے خراب ہو جائے۔"

"اب میرا باہر نکلنا خطرناک ثابت ہو گا، آپ بھی بظاہر گھر چکے ہیں پھر اب کیا حکمتِ عملی اختیار کریں گے؟"

"میرے سامنے دو کام سب سے اہم ہیں۔" میں نے چائے کی پیالی خالی کرتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے پولیس کے کسی اعلیٰ عہدیدار سے مل کر اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ روپوشی میں پولیس بھی میرے وارنٹ جاری کرا دے۔ اس کے بعد جہانگیر سے ملنا ہو گا۔"

"اس قصے کو یہیں دفن کیوں نہیں کر دیتے؟"

"توقیر مجھے زندہ دفن کر دے گا، کسی باغی کو زندہ چھوڑنا اس کی سرشت کے خلاف ہے۔"

"آپ کو پورا یقین ہے کہ آپ کے گھر ٹھہرنے والا آپ کا سوتیلا بھائی تھا؟"

"رمضان بابا چاچا کے حوالے سے اور کون آ سکتا ہے؟ اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ لاہور کے پُرانے محلے میں میری رمضان چاچا سے ملاقات ہوئی تھی۔ ابھی تک تو میں ساری مہم منشیات فروشی کے خلاف چلا رہا تھا مگر اب اس میں ذاتی عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ سوتیلے بھائیوں نے مجھے جیتے جی مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کر لی تھی لیکن میں اپنے ہاتھوں اپنا مستقبل بنانے میں کامیاب ہو گیا تو اب وہ کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟"

"اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ تم اتفاقاً ان کے لیے کام کرتے رہے تھے یا انھوں نے دانستہ تمھیں اپنا شکار بنایا تھا۔" سلطان شاہ نے پہلی بار زبان کھولی۔ "اگر دوسری بات درست ہے تو تم سے قطع تعلق کرنے کے باوجود انھوں نے تم پر کڑی نگاہ رکھی تھی۔ مجھے تو یہ اپنے ہی قبائل کا قصہ نظر آتا ہے۔ پہاڑوں کے چپے چپے پر تمھیں انتقام کی کہانیاں بکھری ہوئی ملیں گی۔ انتقام بہت عجیب اور حیوانی جذبہ ہے جس طرح شیر مرے ہوئے جانور پر مُنہ نہیں ڈالتا بلکہ زندہ شکار کو زیر کرتا ہے اسی طرح بہتیرے انسانوں میں یہ حیوانی جذبہ ہوتا ہے۔ انہیں کمزور دشمن سے انتقام لینے میں مزا نہیں آتا۔ وہ برسوں اس کے پھلنے پھولنے کا انتظار کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو خود اسے

سہارا دے کر پروان چڑھاتے ہیں اور جب طاقت اور خوشحالی کے نشے میں وہ سرشار ہوتا ہے تو گھات لگا کر اس کا قصہ تمام کر دیتے ہیں۔"

"نہیں سلطان شاہ۔ بیسویں صدی کا انسان ایسا درندہ نہیں ہو سکتا۔" غزالہ بھوری نے کربِ اعتباری کے ساتھ بولی۔ "جس ماحول میں انتقام اس حد تک رچ بس جائے وہاں انسان رہ ہی نہیں سکتا۔ دہشت سے گھٹ کر مر جائے گا۔"

"میں نے اپنی آنکھوں سے یہ کھیل دیکھے ہیں بی بی جی۔" وہ عارفانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اکبر زئی اور نواخیل کے دو خاندانوں میں برسوں پرانی دشمنی تھی۔ آخری خون اکبر زئی کے ایک نوجوان کا ہوا تھا۔ وہ لوگ گھات میں رہے اور نواخیل والے کسی وبا کی زد میں آ کر ایک ایک کر کے مرتے چلے گئے۔ اس گھرانے میں ایک نو سال کا بچہ ہی باقی بچ سکا۔ اکبر خیل والے کھلے بندوں کہتے پھرتے تھے کہ وہ اس یتیم ولاوارث کو اس وقت تک نہیں چھیڑیں گے جب تک اس کی چار دیواری میں اس کی لاش پر نوحہ اور بین کرنے والیاں آباد نہ ہو جائیں۔ انہوں نے پورے تیس برس انتظار کیا بی بی جی! اور تیس برس بعد جب وہ دو بیویوں کا شوہر اور آٹھ بچوں کا باپ ہو چکا تھا تو انہوں نے اپنے دشمن کو گھوڑی سے نیچے گرا کر چٹانوں میں ذبح کر دیا.... پرانا نہیں، یہ ابھی تین چار برس کا قصہ ہے۔"

"بے شک ایسا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھ سے اب وہ کس بات کا انتقام لینا چاہتے ہیں... میرے باپ نے کوئی جاگیر تو نہیں چھوڑی تھی جو میں نے ہتھیا لی ہو۔"

پھر کرنل زوار زیدی کے آجانے سے گفتگو کا سلسلہ وہیں منقطع ہو گیا اور ہم تینوں وہاں سے اٹھ گئے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" کرنل زیدی نے ملتے ہوئے کے ساتھ میرے شانے پر ہاتھ مار کر سوال کیا۔

"سرونٹ کوارٹر صاف کرائیں گے۔" میں نے خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یہ زخمی ہے اسے آرام کی ضرورت ہے۔"

وہ مجھے شانے پر ہاتھ رکھے ایک گوشے میں لیتا چلا گیا۔ پھر میرے کان میں رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "دیکھو! انسانوں اور اپنے خدمت گاروں کے لیے دل میں ہمدردانہ جذبات رکھنا بہت اچھی بات ہے لیکن اس کا بے جا اظہار ڈسپلن کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے، ملازم سرکشی بھی اختیار کر سکتے ہیں۔"

"میرے پاس نہ ملازموں کی بٹالین ہے کرنل صاحب! اور نہ میں کوئی کمان دار ہوں۔ ملازم، نوکر، غلام، دوست یا ہمدرد جو بھی کہہ لیں، بس یہی ایک ہے میرے ساتھ، سرکش ہوتا ہے تو ہو جائے۔ میں اس کے نخرے بھی اٹھا لوں گا۔" میں نے اس کی حاکمانہ ذہنیت سے بیزار ہو کے کہا۔

"خیر! یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے، میں اس میں دخل نہیں دیتا۔" اس نے میرے تیور بھانپ کر فوراً ہی پسپائی اختیار کر لی۔ "لیکن یہ بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟ مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔"

"ایک پرانی دشمنی رنگ دکھا رہی ہے، آپ فکر نہ کریں، دو چار دن میں سب ٹھیک کر لوں گا۔"

"کون ہے تمہارا دشمن؟ مجھے بتاؤ، میں اس کا خون پی جاؤں گا۔" وہ ایک دم غصے میں آگیا۔

"ابھی تک وہ سامنے نہیں آیا۔ بس قیاس ہی ہے۔ یقین ہوتے ہی آپ سے مشورہ ضرور کروں گا، اکیلا رہ کر تو میں کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔" اس سے پیچھا چھڑانے کی نیت سے میں نے لجاجت سے کہا اور فخر سے اس کا سینہ پھول گیا۔

آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر میں خود ہی چونک پڑا تھا۔

بال باریک ترشوانے کے بعد میں نے اپنے سیاہ بالوں کی رنگت بادامی کرنے کے لیے نائس این ایزی کلر شیمپو استعمال کیا جس نے میرے خدوخال ہی بدل کر رکھ دیے تھے پھر سنہرے فریم اور سفید شیشوں والی عینک لگانے کے بعد میں ڈپٹی کے بجائے کسی غیر ملکی یونیورسٹی کا پروفیسر نظر آنے لگا تھا۔ لیکن میرا وہ حلیہ بھی کوتوالی کے دروازے پر کھڑے تنے ہوئے بندوق بردار سنتری کو متاثر نہ کر سکا۔ اس نے خاصے کرخت لہجے میں مجھے سیڑھیوں پر ہی روک لیا۔

"کس سے ملنا ہے تمہیں؟" اس نے مشکوک نگاہوں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"ایس پی صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔

"کس کی چٹھی لائے ہو؟" اس نے تھوڑا سا سنبھالا لے کر لہجہ تھوڑے نرم کر لیا۔ شاید سفارشیوں کا خوف خاصے تجربے کے بعد اس کے مزاج میں شامل ہوا تھا۔

"کسی کی نہیں۔" میں نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "آخر مجھے ہی کیوں روک کر کھڑے ہو گئے، اور لوگ بھی تو بلا روک ٹوک اندر جا رہے ہیں؟"

"ہم یہاں ہر ایک کی نہیں مشکوک آدمیوں کی دیکھ بھال کے لیے کھڑے کیے گئے ہیں، آج کل شہر میں دہشت گرد آئے ہوئے ہیں تم ان کے ساتھی تو نہیں ہو؟"

"یہ ایس پی صاحب ہی بتا سکیں گے، میں ان کا دوست ہوں۔" بازپرس کو طوالت اختیار کرتے دیکھ کر مجھے مجبوراً جھوٹ کا سہارا لینا پڑا اور میرا حربہ کام کر گیا۔

اس نے ایڑیاں بجائے بغیر پھرتی سے دونوں پاؤں ملا کر مجھے سیلوٹ مارا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "ایسا تھا تو پہلے ہی بتانا تھا نا صاحب جی! اندر جا کر سیدھے ہاتھ مڑ جائیں وہیں صاحب کا دفتر ہے۔"

خاصے انتظار کے بعد ایس پی کے دفتر میں باریابی کی اجازت مل سکی۔ مسئلہ صرف اتنا تھا کہ میں نے باہر والوں کو اپنی ملاقات کا مقصد بتانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ لیکن اندر نسبتاً جوان سال پولیس افسر کے پرتپاک رویے سے دوچار ہوتے ہی انتظار کی ساری کوفت زائل ہو گئی۔

"میں سوسائٹی کے علاقے میں ہونے والی پولیس ریڈ کے سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"آپ کا نام پتا؟" اس نے فوراً ہی پیڈ اپنے آگے سرکا کر قلم سنبھال لیا اور میں نے بلا تامل مطلوبہ کوائف دہرا دیے۔

"اوہ، تو اس مکان میں آپ ہی رہتے ہیں؟" اس نے پتا سنتے ہی ہونٹ سکوڑ کر کہا اور مجھے خوشی ہوئی کہ پولیس کے اعلیٰ افسران شہر میں ہونے والی اہم وارداتوں کے بارے میں بعض باتیں زبانی بھی یاد رکھتے ہیں۔

"جی ہاں۔ وہ مکان میری ہی ملکیت ہے۔" میں نے دیکھا کہ اس نے میرے بولنے سے قبل ہی میز پر رکھے ہوئے ڈکٹا فون کا سوئچ آن کر دیا تھا مگر میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "شہر میں میری ایک پلاسٹک فیکٹری ہے جسے میں نے برسوں کی محنت کے بعد کسی مقام پر پہنچایا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ اس ساری مدت میں کسی سے میری چپقلش ہوئی ہو لیکن تین دن قبل میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب کسی نامعلوم آدمی نے مجھے گھر پر فون کر کے چھ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ میرے انکار پر اس نے دھمکی دی تھی کہ دو دن میں مطلوبہ رقم فراہم نہ کی گئی تو میرا مکان اور کاروبار تباہ کر دیا جائے گا۔ میں نے اس کال کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن کل میری عدم موجودگی میں میرے مکان پر ایک خونیں ڈراما ہوا جس میں نہ صرف میرا سارا اثاثہ جل کر راکھ ہو گیا بلکہ میرا ایک پرانا خدمت گار بھی ہلاک ہو گیا۔ پھر آج صبح سویرے ایک نامعلوم ملاقاتی میری فیکٹری پہنچا اور تھوڑے سے انتظار کے بعد بظاہر اپنا بریف کیس بھول کر واپس چلا گیا۔ بعد میں عملے نے توجہ دی تو بریف کیس سے کسی گھڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی، ٹائم بم کا خطرہ محسوس کرتے ہی وہ بریف کیس ماری پور روڈ کے قریب پھنکوا دیا گیا، میری کل رات سے حالت ابتر تھی اور میں خوفزدہ تھا میں نے اپنے آدمیوں کو پولیس سے رجوع کرنے کی ہدایت کر دی تھی لیکن خود شہر میں چھپتا پھر رہا تھا۔ میرا دشمن نادیدہ ہے وہ جب پولیس کو مدعو کر کے میرے مکان کو خاکستر میں تبدیل کر سکتا ہے تو مجھے ٹھکانے لگانا اس کے لیے بہت آسان ہو گا۔"

"وہ شاید آپ کو نقصان نہ پہنچائے۔" وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کا زندہ رہنا اس کے لیے سودمند ہو گا۔ اسے رقم درکار ہے جو وہ آپ کو خوفزدہ کر کے وصول کرنا چاہتا ہے۔ بریف کیس دس بج کر دو منٹ پر ماری پور کے ویرانے میں ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ فوجی ماہرین اس کے ٹکڑوں کا تجزیہ کر رہے ہیں۔ دھماکہ بے حد طاقتور تھا اور خیال ہے کہ اس میں آتشگیر مادہ بھرا ہوا تھا۔ ویرانے کے بجائے وہ بم فیکٹری میں پھٹا ہوتا تو آگ پر قابو پانا دشوار ہو جاتا۔"

"اوہ خدا!" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آئے گا۔" ایس پی کا بدلا ہوا طنزیہ لہجہ سن کر میں چونک پڑا۔ "یہ بتاؤ کہ اپنے سر کے بالوں کا رنگ کب تبدیل کیا ہے؟" مجھے حیرت تھی کہ بالوں کے رنگ کی تبدیلی کا اندازہ اس نے کیسے لگا لیا۔

"آج صبح۔" میں نے حیرت اور بے چارگی کے ساتھ کہا۔ "یہ عینک بھی صبح ہی خریدی ہے تاکہ وہ پہلی نظر میں مجھے نہ پہچان سکے ورنہ میں تو شہر کی بھری پری سڑکوں پر بھی خود کو تنہا محسوس کر رہا ہوں۔"

"تمہاری فیکٹری کے کسی افسر نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی تھی۔ اندراج کے بعد وہ واپس چلا گیا لیکن ماری پور میں دھماکے کے بعد وہ پولیس کی تحویل میں ہے کیونکہ تمہارے بارے میں وہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔ تم روپوشی کے بجائے براہِ راست پولیس سے رجوع کرتے تو شاید خاصی دشواریوں سے بچ جاتے۔"

"دشواریاں؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "میں بتا رہا ہوں کہ میں رات سے حواس باختہ تھا، میں تو یہی فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ اب کہاں پناہ لوں، وہ کہیں بھی مجھ پر ہاتھ ڈال رہا ہے۔"

"اسی لیے بالوں کو رنگتے ہوئے یہ بھول گئے کہ تمہارے ہاتھوں اور چہرے کے بالوں کے گہرے سیاہ رنگ میں کہیں بھی سرخی کی جھلک نہیں ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے تمہاری کہانی مضبوط ضرور ہے لیکن قابلِ قبول نہیں ہے۔ تمہارا مکان پورے اسباب سمیت بیمہ شدہ تھا۔ تمہارا تو ذرا بھی نقصان نہیں ہو گا۔ سارا بوجھ انشورنس کمپنی کو اٹھانا ہو گا۔"

"معاوضہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا جناب۔" میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مکان کی بے شمار چیزوں سے مجھے جذباتی لگاؤ تھا، مجھ سے عافیت کا احساس چھن چکا ہے۔ اس ذہنی

عذاب کی قیمت کون چکا سکے گا؟
”تفتیش سے سب کچھ سامنے آجائے گا۔“ وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ ”تمہارا موجودہ پتا کیا ہے؟“

”ابھی تو دربدر پھر رہا ہوں، شاید کسی ہوٹل میں پناہ لینی پڑے گی۔“ میں نے دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا وِرد کرتے ہوئے کہا کیونکہ ایس پی سے ملنے کے بعد تو مسئلہ اور الجھتا نظر آرہا تھا۔

”تمہیں حراست میں لینے کے لیے فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ مکان کے ایک حصے سے شراب کی پڑی ہوئی بوتلوں کی خاصی تعداد ملی ہے۔“ اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”بہتیرے گھروں میں امتناع کے باوجود پرائیویٹ بار موجود ہیں، میری بدنصیبی ہے کہ آگ مکان کے ساتھ ہی یہ بھرم بھی چاٹ گئی۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں اپنی اس خامی سے انکار نہیں کروں گا۔“

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر پُرخیال لہجے میں بولا۔ ”تم معزز آدمی معلوم ہوتے ہو لیکن ابھی تفتیش ابتدائی مراحل میں ہے۔ میں تمہیں صرف اس شرط پر چھوڑ سکتا ہوں کہ شہر میں، فوراً اپنا ٹھکانا تلاش کرکے مجھے اپنے پتے سے آگاہ کرو اور پولیس سے اپنا رابطہ برقرار رکھو۔“

”میں ان ہدایات پر پوری طرح عمل کروں گا۔“ گلوخلاصی کا امکان پیدا ہوتے ہی میں نے خلوصِ دل سے کہا اور اس نے مجھے اپنے اسٹینو کے کمرے میں بھیج دیا۔ میں ملحقہ کمرے میں پہنچا تو اسٹینو ریسیور کان سے لگائے شاید ایس پی سے میرے ہی بارے میں ہدایات لے رہا تھا۔ اندر میں جو کچھ کہتا رہا تھا وہ نوٹس کی صورت میں باہر قلمبند ہوتا رہا تھا۔ اسٹینو نے آڑی ترچھی لکیروں کو پڑھتے ہوئے مجھ سے مزید بہت سے سوالات کیے اور پھر ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھا کر ٹائپنگ میں مصروف ہوگیا۔

بیان کی تیاری کے بعد شناخت کا مرحلہ آیا جو شناختی کارڈ اور کریڈٹ کارڈ نے حل کر دیا اور یوں ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے وہاں سے واپسی کی اجازت مل گئی۔

باہر نکلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ پولیس کے ملوث ہونے کی وجہ سے میرے لیے الجھنیں بڑھ گئی تھیں جنہیں نظرانداز کرکے میں پولیس کی مخاصمت مول لے سکتا تھا۔ اس سینئر پولیس افسر سے مل کر مجھے ایک ہی فائدہ ہوا تھا کہ بالوں کی رنگت میں تبدیلی کی ایک خامی سامنے آگئی تھی۔ قریب سے کوئی اور بھی محسوس کرسکتا تھا۔

کوتوالی سے نکل کر میں اپنی فیکٹری کے معاملات سے متعلق قانونی مشیر کی طرف ہولیا۔ اس سے میری خاصی بے تکلفی تھی لیکن وہ آواز سن کر بھی فوراً مجھے نہ پہچان سکا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے من وعن وہی کہانی اس کے سامنے دُہرا دی جو میں کوتوالی میں سُنا چکا تھا۔

”یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ ایس پی سے مل لیے۔“ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔ ”معاملہ پیچیدہ ہے۔ اس میں تمہاری کم ازکم ایک حاضری ضروری تھی، بس اب تم مختار نامے پر دستخط کردو باقی معاملات میں خود دیکھ لوں گا۔ میرا ایک ساتھی ایسے ہی معاملات ہاتھ میں لیتا ہے۔“

”اور متین سے چارے کا کیا ہوگا؟“

”میرا واسطہ تو نہیں پڑا لیکن بار میں سُنا ہے کہ موجودہ ایس پی بہت معقول آدمی ہے ہوسکتا ہے کہ تمہارے نکلتے ہی اس نے فون پر متعلقہ تھانے کو ہدایات جاری کردی ہوں۔“

”انشورنس کا قصہ بھی تم ہی کو نمٹانا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”اوہ۔ تم فکر نہ کرو۔ میں کل ہی متین سے پالیسی منگوا کر دیکھ لوں گا، اسی کے مطابق سروے کرا کر کلیم داخل کردوں گا۔ بریف بھی بس رسمی سا ہوگا کیونکہ وہاں جلے ہوئے مکان کے ڈھانچے کے علاوہ بچا ہی کیا ہوگا۔ آگ لگنے کے بعد تم گئے تھے ادھر؟“

میں خوفزدہ انداز میں ہنس پڑا۔ ”فطری ردِعمل تو یہی ہونا چاہیے تھا اور یہ شاید نامعلوم بلیک میلر بھی وہاں میرا منتظر رہا ہو اسی خوف سے میں نے اُدھر کا رُخ نہیں کیا۔“

”تم کاروباری لوگ واقعی بہت ڈرپوک ہوتے ہو۔“ اس نے قہقہہ مار کر کہا۔ ”جرم کے مقابلے کے بجائے قیمت ادا کرنے کو تیار رہتے ہو اور شاید تم ہی لوگوں کی وجہ سے ملک میں رشوت کی وبا پھیل رہی ہے۔“

”یہ تو سراسر الزام ہے۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”الزام نہیں حقیقت ہے، سرکاری اہل کار من مانی قانونی تاویلیں نکال کر تمہیں بلیک میل کرتے ہیں اور تم بڑے نقصان کے ڈر سے انھیں چیلنج نہیں کرپاتے۔ ان کی مٹھی گرم کرکے کام نکال لیتے ہو، رفتہ رفتہ یہ ان کی عادت بن گئی ہے۔ اب تو شاید وہ بیشتر ان قانونی موشگافیوں کے حافظ ہوچکے ہیں جن کے سہارے تمہاری دُکھتی رگیں دبائی جاسکتی ہیں۔“

”یہ کسی ایک طبقے کا نہیں پورے معاشرے کا قصور ہے۔ صرف کاروباری طبقے کو تم الزام نہیں دے سکتے۔“

”اصل ملزم وہی ہے کیونکہ سرکار سے سب سے زیادہ تعلق اسی طبقے کا ہوتا ہے اور پھر معاشرہ آسمان سے تو نازل نہیں ہوتا۔ ہم اور تم ہی معاشرے کے ارکان ہیں۔ جب حکومت کو سب سے زیادہ محاصل ادا کرنے والے طبقے ہی حق کے لیے لڑنے کے بجائے بُرائی کی پرورش کرنے لگیں گے تو کیا ہوگا؟ محکوم خود ہی بزدل ہوں تو حاکم ظالم سے ظالم تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔“

ظلم کی فصل حلال کی روزی سے کبھی سیراب نہیں ہوتی۔ کیونکہ اپنی تنخواہ بڑھانے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ ہاں وہ دوسروں کی جیبوں اور تجوریوں پر ڈاکے ڈال سکتے ہیں اور تمہارے چاروں طرف یہی ہو رہا ہے۔“

وہ بے فکر اور آسودہ حال تھا لہٰذا اسے ٹھنڈے کمرے میں بیٹھے ہوئے اصلاحِ معاشرہ کی تقریریں سوجھ رہی تھیں فلاحی مملکت کے خواب آرہے تھے اور میں موت کے سوداگروں کے سربراہ توقیر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ بولتا رہا اور میں نیم دلی کے ساتھ بحث میں حصہ لیتا رہا اور اس کی تقریر میں پہلا وقفہ آتے ہی میں نے اس کا دفتر چھوڑ دیا۔

غزالہ کا گھر میرے لیے ایک بہتر اور محفوظ ٹھکانا تھا لیکن وہاں رہنے میں کچھ الجھنوں کا اندیشہ بھی سر ابھارنے لگا تھا۔ ایک طرف اے ٹو میری راہ پر لگا ہوا تھا، دوسری طرف قاسم کی طرف سے میں مطمئن نہیں تھا۔ وہ فطرت کے اعتبار سے لالچی اور خودغرض ثابت ہوا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے دھوکے میں رکھ کر پھنسانے کی کوشش کرے گا تاکہ اے ٹو کی خوشنودی حاصل کرکے تنظیم کے مقامی ڈھانچے میں میرا چھوڑا ہوا منصب حاصل کرسکے اور یوں اے ٹو کے ساتھ رہتے ہوئے اپنے مال کی نکاسی کی راہ بھی ہموار کرسکے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی ذات کے سوا کسی کے وفادار نہیں ہوتے۔ اسے نہ مجھ سے کوئی ہمدردی تھی نہ وہ اے ٹو کا خیرخواہ تھا لیکن قاسم کا اپنا مفاد اسی میں تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر اے ٹو سے جا ملے۔ تیسرا مسئلہ پولیس کی صورت میں سامنے آگیا تھا۔ بظاہر میں نے خود کو پولیس کی پُرپیچ اور صبرآزما کارروائیوں سے محفوظ کرلیا تھا لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کب میرا رُخ کربیٹھیں۔

ایسی صورت میں میری وجہ سے غزالہ کا مکان ان میں سے کسی کی بھی نگاہ میں آسکتا تھا اور یوں غزالہ کے لیے خطرہ جنم لے سکتا تھا کیونکہ میرے ساتھ توقیر پوری شدومد کے ساتھ اس..... لڑکی کی بھی تلاش میں تھا جو میرے ساتھ لاہور گئی تھی۔ اپنے دفاع کے ساتھ غزالہ کا تحفظ شاید میرے لیے دشوار تر ہو جاتا اور میں بری طرح اے ٹو کی گرفت میں آجاتا لہٰذا بہتر یہی تھا کہ میں فوری طور پر اپنا ٹھکانا تبدیل کرلیتا۔

اس معاملے میں شہر میں واقع مشہور ہوٹل میرے لیے مخدوش ہوسکتے تھے لہٰذا میں نے ایئرپورٹ کے نواح میں واقع ایک ہوٹل کو ترجیح دی اور اسی طرف روانہ ہوگیا۔

ہوٹل میں مفروضہ نام سے کمرہ حاصل کرنے کے بعد میں نے وہیں سے غزالہ کو فون کیا تو وہ میرے بارے میں تشویش میں مبتلا تھی۔

”سلطان شاہ باہر نکلنے کی فکر میں ہے۔“ میری روداد سننے کے بعد اس نے مجھے باخبر کیا۔ ”اسے میں بمشکل گھر میں روک سکی ہوں۔“

”باہر کیا کام ہے اسے؟“ میں نے تحیرآمیز لہجے میں سوال کیا۔

”وہ قاسم کی طرف سے بہت زیادہ بدظن ہے، کہتا ہے کہ میں دلاور کو اس کے قبضے سے نکال لاؤں گا۔“

”عجیب احمق آدمی ہے، ہمیں کیا فائدہ ہوگا اس سے؟“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”اس کی منطق ہی نرالی ہے کہ ہمیں فائدہ ہو یا نہ ہو قاسم کو زبردست نقصان ہوگا اور اس کی منصوبہ بندی دھری رہ جائے گی جو وہ اپنا مال بازار میں لانے کے لیے کررہا ہے۔“

”اس سے کہو کہ فی الحال صبر کرے، جب تک اے ٹو شہر میں ہے ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔ قاسم کے بارے میں ہمارے ذہن میں صرف شبہات ہیں، جب تک وہ اپنے رویے سے ان شبہات کی تصدیق نہ کرے، ہمیں بلاوجہ نیا محاذ کھولنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس دوران میں وہ جسمانی طور پر بھی سنبھل جائے گا۔“

غزالہ ہنس پڑی۔ ”یہی تو سب سے بڑی خرابی ہے۔ وہ اپنی تکلیف پر بری طرح جھنجلایا ہوا ہے... اس تذکرے پر ہی بھڑک اٹھتا تھا اور کہہ رہا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”موقع ملا تو میں رات میں چکر لگاؤں گا... بولتا بہت ہے لیکن میری ہدایت کے خلاف عمل نہیں کرے گا، اسے بتا دینا کہ تمہاری مجھ سے بات ہوچکی ہے۔“

”ڈیڈی کامران کو دیکھنے کے لیے اسپتال جانا چاہ رہے تھے لیکن میں نے انھیں روک دیا...“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ”حالات کا یہ رُخ میری نگاہوں سے بالکل ہی اوجھل تھا، ہمیں کچھ دن کے لیے کامران سے دور ہی رہنا ہوگا۔“

”کیوں؟“ اس نے معصومانہ لہجے میں سوال کیا۔ ”میں نے تو ڈیڈی کو بس اضطراری طور پر ادھر جانے سے روک دیا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔“

”یہی بات تو مجھے پسند ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے تمہارے لاشعور میں کوئی طاقتور ریڈار لگا ہوا ہے جو تمہیں آنے والی مشکلات سے خبردار کردیتا ہے اور تم شعوری طور پر کسی خطرے سے واقف ہوئے بغیر اس مشکل کا توڑ کرلیتی ہو۔ شاید تمہیں یاد نہیں کہ کامران کو اکبر کی علاج گاہ میں داخل کرانے سے پہلے میں سفارش کے لیے ایڈکشن کیور سوسائٹی کے دفتر گیا تھا جہاں قاسم پہلے سے سوسائٹی

کے بانی، محسن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کو دیکھا تھا لیکن آپس میں بالکل انجان بن گئے تھے۔ اب اگر قاسم کو وہ ملاقات یاد آگئی تو وہ محسن سے مل کر باآسانی یہ معلوم کرلے گا کہ میں کسی مریض کے علاج کے سلسلے میں آیا تھا، اس کے بعد وہ فوری طور پر میرے اور کامران کے تعلق کا سراغ لگالے گا کیونکہ میں نے کامران کو اپنے گھر کے پتے سے داخل کیا تھا۔ کرنل صاحب کے نام اور پتے سے دانستہ گریز کیا تھا۔"

"اوہ۔۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جب بھی کامران کی عیادت یا دیکھ بھال کے لیے جائے گا، وہ قاسم یا اس کے آدمیوں کی نگاہ میں آسکتا ہے۔" اس کی تشویش زدہ آواز ابھری۔

"یہ عارضی احتیاط ہے۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "دو تین روز میں معاملات صاف ہو جائیں گے۔ جہانگیر سے گفتگو یا ملاقات کے بعد ہی میں کسی نتیجے تک پہنچ سکوں گا۔"

"میں انتظار کروں گی، کوشش کر کے رات چکر لگا ہی لیں۔"

"گاڑی کی وجہ سے ڈیڈی کو پریشانی تو نہیں ہو رہی؟"

"کوئی پریشانی نہیں ہے.... آپ کی ضروریات اس وقت مقدم ہیں۔"

چھ بجے میں نے اس نمبر پر فون کیا جہاں جہانگیر کی بیوی گئی ہوئی تھی۔ جہانگیر کے بارے میں استفسار پر مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا اور چند ہی ثانیوں بعد سلمیٰ کی زندگی سے بھرپور آواز ریسیور میں گونج اٹھی۔

"ڈینی بول رہا ہوں...."

"اوہو۔ آج تو بڑا مبارک دن ہے کہ آپ کی آواز سنائی دے رہی ہے۔" میرا نام سنتے ہی وہ بات کاٹ کر چہکنے لگی۔ "آج کل کہاں غائب ہیں آپ؟"

"اسی شہر میں رہ رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"گھر آنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ ان کے دوستوں میں ایک آپ ہی سے میں دل کی کچھ باتیں کر لیتی تھی اور بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا، کیا مجھ سے کچھ ناراض ہو گئے ہیں؟"

میں بے ڈھنگے پن سے ہنس دیا۔ "بھلا آپ سے کیوں ناراض ہونے لگا، میرا بس چلے تو روز ہی آپ کے گھر کے چکر لگاتا رہوں، بس جہانگیر سے محتاط رہتا ہوں، آپ کے معاملے میں وہ بہت زود حس ہے۔ کسی دن کوئی تلخ بات کہہ بیٹھا تو ہماری برسوں کی دوستی جاتی رہے گی۔"

"آپ مجھے بنا رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں بے یقینی سے زیادہ خوشی پوشیدہ تھی۔

"جسے قدرت نے دستِ خاص سے بنایا ہو اسے میں کیا بنا سکوں گا۔" میں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہی اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ "کیا جہانگیر ابھی تک نہیں آیا ادھر؟"

"شاید نشے کی رو میں کسی کُتّے کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھے ہوں گے۔" اس کی آواز تلخ ہو گئی، "نجانے وہ مجھ سے کیوں دور دور بھاگتے ہیں۔ میں اتنی بری تو نہیں ہوں۔"

"اچھی اور بری کی بات نہیں۔" میں نے اس کمزور پہلو سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ اس کی اپنی کچھ الجھنیں یا کاروباری پریشانیاں ہوں۔"

"تو مجھے اعتماد میں کیوں نہیں لیتے؟ اگر میں ان کی الجھنیں دور نہ کر سکی تو کم از کم گھر کی فضا میں غلط فہمیوں کے جنم لینے کا امکان تو ختم ہو جائے گا۔"

"باہمی اعتماد کی فضا رفتہ رفتہ اور دو طرفہ رویے سے جنم لیتی ہے۔ موقع ملا تو میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔" میں نے قصّہ مختصر کرنے کے لیے اس کی بات کاٹ کر نرم لہجے میں کہا۔

"خدا کرے کہ جہانگیر آپ کی بات سمجھ سکے۔ اس شہر میں تو بس ایک آپ ہی میرے ہمدرد ہیں۔" تلخی کے اعتدال پر آتے ہی اس کا لہجہ ایک مرتبہ پھر ذومعنی ہو گیا۔

"اس عنایت کا شکریہ۔" میں نے دل ہی دل میں خود کو احمق محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "جہانگیر آئے تو اس کو میرا دوسرا فون آنے تک یہیں روک لیں، مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"میں گھر فون ہی نہ کرادوں آپ کو؟"

"میں گھر پر نہیں ہوں، تھوڑی دیر بعد ایک اور جگہ پہنچ کر فون کروں گا۔" میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے نئے ٹھکانے سے واقف ہو سکے۔ جہانگیر نے میرے مکان میں آتشزدگی کے بارے میں سلمیٰ کو نہ بتا کر عقلمندی کا مظاہرہ کیا تھا اور میں سلمیٰ کی لاعلمی دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"انھیں تو فون کرتے ہی رہتے ہیں، کبھی کبھار مجھ سے بھی مل لیا کریں۔" اس کی دھیمی اور سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔ "ملنے میں دقت ہو تو کم از کم فون ہی کرتے رہا کریں۔ اس گھر میں میں خود کو بالکل تنہا اور اداس پاتی ہوں۔"

"میں کوشش کروں گا۔" میں نے گفتگو کو اختصار دیتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

سلمیٰ شکل و صورت، عمر اور سراپا کے اعتبار سے ایسی گئی گزری نہیں تھی کہ اسے نظرانداز کیا جا سکے جس دن سے وہ جہانگیر کے ساتھ کراچی آئی تھی، میں جہانگیر سے اپنی دوستی کی بنیاد پر اس کے ساتھ بے تکلفانہ انداز میں پیش آتا رہا تھا لیکن جب جہانگیر

کی وقت، ناوقت کی پراسرار سرگرمیوں کی بنا پر ان دونوں کے درمیان کدورت کی بنیاد پڑی تو سلمیٰ کے جھکاؤ کے تیور کچھ بدلنے لگے لیکن میں ہمیشہ اس سے اپنا دامن بچاتا ہی رہا۔

میرا اندازہ تھا کہ وہ بہت زیادہ تلوّن مزاج تھی۔ اگر جہانگیر اس پر بھرپور توجہ بھی دیتا رہتا تو کچھ عرصے کے بعد وہ زندگی کی اس یکسانیت سے اُکتا جاتی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں اس کی مل بیٹھنے کی دعوت قبول کر بیٹھا تو کچھ عرصے کے بعد وہ مجھے اپنے گرد و پیش میں بھی دیکھنا پسند نہیں کرے گی۔ ایسے مرحلے پر وہ میرے خلاف جہانگیر کے بھی کان بھر سکتی تھی جب کہ ان دنوں میں جہانگیر کی دوستی سے ہاتھ دھونے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا لیکن اب حالات میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہو چکی تھی اور میری ترجیحات میں بھی رد و بدل ہو چکا تھا۔

توقیر یا اے ٹو کھل کر میرے سامنے آچکا تھا اور جہانگیر میرا لاکھ دوست اور خیر خواہ سہی لیکن اس کے دل میں اے ٹو کی طرف سے دہشت جاگزیں ہو چکی تھی پھر حالیہ دنوں میں توقیر نے خود کو ایک سیاہ پوش سائے کے روپ میں جہانگیر پر ظاہر بھی کر دیا تھا۔ ان حالات میں جہانگیر کے لیے توقیر کی ہدایات سے سرتابی کرنا ناممکنات میں سے ہو کر رہ گیا تھا۔

اپنے دل میں میرے لیے تمام تر ہمدردیاں رکھنے کے باوجود اگر وہ مجھ سے تعاون کرنے سے انکار کر دیتا تو میں تنظیم سے بالکل کٹ کر رہ جاتا۔ مجھے اندر کے معاملات کی ہوا بھی نہ لگنے پاتی اور یوں موت کے سوداگروں کا شیرازہ بکھیرنے کا خواب کبھی شرمندۂ تکمیل نہ ہو پاتا۔ میں نے محض ان ہی اندیشوں کی بنا پر اس وقت خلافِ معمول پہلی بار سلمیٰ کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اے ٹو کے لیے کام کرتے ہوئے میں نے بھی چند ایسے شعبدوں سے واقفیت حاصل کر لی تھی کہ وقتِ ضرورت سلمیٰ سے مل کر جہانگیر کے فون پر ہونے والی ہر گفتگو سن سکتا تھا۔ اس طرح میں جہانگیر کی لاعلمی میں بہت سی معلومات حاصل کر سکتا تھا۔

نصف گھنٹے بعد میں نے ہوٹل کی لابی میں لگے ہوئے پبلک فون بوتھ سے دوبارہ اس نمبر پر فون کیا تو ریسیور سلمیٰ ہی نے اٹھایا اور اطلاع دی کہ جہانگیر وہاں پہنچ چکا تھا۔

"تت۔ تم بے موت مار دیے جاؤ گے۔" فون پر آتے ہی وہ دبی دبی ہذیانی آواز میں بولا تھا۔ "تمھارے گرد گھیرا بہت تیزی کے ساتھ تنگ کیا جا رہا ہے، تم نے براہِ راست سامنے آ کر بہت بھیانک غلطی کی ہے۔"

"تم گھاس کھا گئے ہو۔" میں نے ترش لہجے میں کہا۔ "مجھے پاگل کتے نے نہیں کاٹا تھا کہ میں خود بخود سامنے آنے کی حماقت کرتا۔ وہ خود ہی میرے گھر مہمان بن کر آ پہنچا تھا۔"

"اوہ،" ریسیور پر اس کی تحیر آمیز آواز سنائی دی۔ "اس کا مطلب ہوا کہ قاسم ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ تو کیا اے ٹو واقعی تمھارا سوتیلا بھائی ہے؟"

"کم از کم اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔"

"تم تو اس کے عتاب میں آ ہی گئے ہو۔" وہ فون پر دھیمی آواز میں گھگھیانے لگا۔ "تم غیر شادی شدہ ہو، مکان تباہ ہونے کے بعد کہیں بھی پناہ لے سکتے ہو، روپوش ہو کر اس کا مقابلہ کر سکتے ہو لیکن خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو، ایسا نہ ہو کہ تمھارے ساتھ میں بھی بے رحمی کے ساتھ روند ڈالا جاؤں۔"

"لیکن ہم تینوں تو اے ٹو کے خلاف ایک معاہدے کے پابند ہیں میرے دوست!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اسے بھول جاؤ، سب بھول جاؤ۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "اس وقت مجھے اے ٹو کی شخصیت اور صلاحیت کا اندازہ نہیں تھا۔ کل رات میں نے سوا دو گھنٹے اس کے ساتھ گزارے تھے۔ وہ اس قدر وحشی، سرد مزاج اور سفاک ہے کہ مجھے حیرت ہے کہ میرا ہارٹ فیل کیوں نہ ہوا۔ اسے میں نے تمھارے گھر کے قریب کے ایم سی اسپورٹس کمپلیکس کے پھاٹک سے ذرا آگے اتارا تھا لیکن جانتے ہو اس نے رات کہاں بسر کی تھی؟"

"میرے گھر کو آگ لگا کر کسی ویرانے میں جا سویا ہوگا۔" میں نے مضحکانہ لہجے میں کہا۔

"تمھارے گھر میں آگ لگنے کی خبر تو میں نے اخبار میں دیکھی۔ اس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ صبح اس نے فون پر مجھے اطلاع دی کہ وہ سلمیٰ کی خوابگاہ میں موجود ہے۔ تمھارے گھر میں آگ لگا کر وہ مسلح چوکیداروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر میرے گھر میں آگھسا تھا، فون کی ایک لائن میرے کمرے میں ہے، دوسری سلمیٰ کی خوابگاہ میں رہتی ہے۔ اے ٹو نے اسی کو انٹرکام کے طور پر استعمال کیا تھا۔"

"تمھارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ تمھاری لاعلمی میں وہ تمھاری بیوی کی خوابگاہ میں گھس آیا۔"

"تم گدھے ہو۔" اس کی خفت آمیز آواز ابھری۔ "سلمیٰ تو گھر پر ہی نہیں تھی۔ تمھارا فون آیا وہ گھر پر ہی موجود تھا، میرا خیال ہے کہ اس نے میری اور تمھاری گفتگو لفظ بہ لفظ سنی ہوگی۔"

"میں بھی اسی ڈر سے محتاط رہا تھا۔ یہ بتاؤ کہ اب کہاں مل رہے ہو؟"

"میں تم سے نہ مل سکوں گا، تمھارے لیے کچھ بھی نہ کر سکوں گا ڈینی۔" وہ جلدی سے بولا۔ "تم میرے گہرے دوست ضرور ہو لیکن میں بلا وجہ اپنی گردن کٹوانی پسند نہیں کروں گا۔ وہ تمھارے لہو کا پیاسا ہو رہا ہے اسے کسی ملی بھگت کا شبہ بھی ہو گیا تو میرے

ٹکڑے اڑا کر رکھ دے گا۔"

"تم سے تو قاسم ہی بہتر ہے۔" میں نے اسے چھیڑنے کی نیت سے کہا لیکن اس نے میری بات کاٹ دی۔

"اس کے فریب میں بھی نہ آنا، وہ دوست بن کر دغا دینے والوں میں سے ہے۔" اس کی اضطراری آواز سنائی دی۔ "اسے بھی شدت سے تمہاری تلاش ہے۔ صبح تک شاید تم گلشن اقبال میں کہیں روپوش تھے اور ذرا سی مہلت ملتے ہی اسے جل دے کر وہاں سے نکل بھاگے، تمہارے بارے میں اس نے مجھ سے بھی پوچھ گچھ کی تھی میں نے اسے بتا دیا کہ تمہارا فون ضرور آیا تھا لیکن میں نے کسی بھی قسم کے تعاون سے انکار کر دیا لیکن شاید میں اسے پوری طرح مطمئن نہیں کر سکا۔"

"وہ خود تمہارے پاس آیا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں۔ فون کیا تھا۔"

"اس وقت اسے تم کہاں تھا؟"

"میرا خیال تھا کہ وہ خوابگاہ میں ہی ہوگا، میں نے ایک ملازم کے ہاتھ ناشتہ بھجوایا تو کمرہ خالی پڑا ہوا تھا۔ وہ جس طرح آیا تھا، اسی طرح ہم سب کی لاعلمی میں واپس چلا گیا۔"

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ قاسم تمہارے جوابات سے مطمئن نہیں تھا؟"

"اس وقت بھی سرخ کرولا باہر منڈلا رہی ہوگی۔ گھر سے نکلتے ہی میرا پیچھا شروع کر دیا گیا تھا، شاید وہ قاسم ہی کا کوئی آدمی ہے اور اس توقع میں میرا تعاقب کر رہا ہے کہ میں کہیں نہ کہیں تم سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے علاوہ میرے تعاقب کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

"تمہارا اندازہ سو فیصد درست ہے۔" میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "یہ وہی سرخ کرولا تو نہیں ہے جس کی کھڑکیوں کے شیشے تاریک ہیں؟"

"ہاں وہی ہے۔" فوری طور پر اس کا جواب ملا۔

"وہ قاسم کی کار ہے، وہ خود تمہارا پیچھا کر رہا ہے۔ تم کم از کم بیس منٹ بعد گھر سے نکلنا، میں اسے اچھی طرح سبق دینے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں کہہ چکا ہوں کہ تمہاری وجہ سے اپنی گردن نہیں کٹواؤں گا۔ میں فوراً یہاں سے نکل رہا ہوں، تم نے اس پر حملہ کرایا تو وہ سمجھ جائے گا کہ میں نے تعاقب کا اندازہ لگا کر یہاں سے فون پر کسی کو کارروائی کی ہدایت کی تھی۔"

"سمجھنے دو، تم پر کیا حرف آئے گا۔" میں نے مصالحانہ لہجے میں کہا۔ "تمہیں کیا معلوم کہ سرخ کرولا کس کی ہے، تم اسے کسی دشمن کی گاڑی بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"نہیں ڈینی، نہیں۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "حالات بدل گئے ہیں، اب میں ایک لمحے کے لیے بھی تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا، مجھے اپنی چمڑی بہت زیادہ عزیز ہے، فی الحال ہم دونوں کا مفاد اسی میں ہے کہ تم مجھے اور میری دوستی کو بھول جاؤ۔ اگر کبھی میں اس ٹوکے جنگل سے نجات پانے میں کامیاب ہو گیا تو ہم نئے سرے سے، مضبوط تر بنیادوں پر اپنی دوستی کی ابتدا کر سکیں گے فی الحال میں تمہاری کسی توقع پر پورا نہ اتر سکوں گا، اپنی بقا کی جنگ تمہیں تنہا لڑنی ہوگی۔ حالات نے اجازت دی تو میں بس اتنا کروں گا کہ کسی دوراہے پر تم سے آمنا سامنا ہو جائے تو تمہیں پہچاننے کے بجائے کسی اجنبی کی طرح سر جھکائے گزر جاؤں، موجودہ حالات میں یہ رعایت بھی نہ دے سکوں گا۔"

ایک دن میں وہ دوسری چوٹ تھی۔ صبح قاسم نے آنکھیں پھیر کر مجھے اپنی بے بسی کا احساس دلایا تھا اور اب برسوں پرانے دوست، جہانگیر نے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔

میں نے مزید کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ اس وقت میرے دل میں اچانک ہی ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔ دل چاہا کہ میں خود، ہیروئن خرید کر بلا قیمت ملک کے چپے چپے میں پھیلا دوں اور پھر اسے ٹو سے پوچھوں کہ اس کی بادشاہت کہاں چلتی ہے، وہ کس جنس کی سوداگری کرتا ہے اور دشمنوں کو کس بوتے پر زیر کرتا ہے؟

لیکن وہ ایک لمحاتی ابال تھا۔ ایک شکست خوردہ انسان کے وجود میں دہکتے ہوئے انتقام کے لاوے کا ابال۔ جس کا حقائق سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا کوئی اندھا دھند قدم اٹھا کر میں خود اپنے لیے دشواریاں پیدا کر لیتا۔

بات صرف اتنی تھی کہ پچھلی رات تک میں شہر میں موت کے سوداگروں کا مطلق العنان حکمران تھا۔ توقیر میرے گھر میں مقیم تھا مگر پھر بھی میرا سکہ چل رہا تھا پھر چند لمحوں میں میرے اقتدار کا گھروندا ٹوٹ گیا جو میرے محکوم تھے، وہ مجھے آنکھیں دکھانے لگے تھے، حاکم میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ نہ صرف میرا بلکہ وہ میری ساتھی کے خون کا بھی طلبگار ہو رہا تھا۔ اس اچانک انقلاب پر اگر میں اپنی انا کے آگے ہتھیار ڈال دیتا تو کامیابی محض خواب بن کر رہ جاتی۔

میرے ذہن میں سلطان شاہ کا سنایا ہوا قصہ سر ابھارنے لگا۔ بیسویں صدی کے مہذب انسان کے بارے میں عزالہ خوش فہمی کا شکار تھی۔ بیسویں صدی میں بھی پتھر کے زمانے کا انسان سانس لے رہا تھا، وہی خونی اور درندہ صفت انسان جو موقع پاتے ہی کمزور کو پھاڑ کھانے پر تلا بیٹھا رہتا تھا فرق صرف اتنا تھا کہ بیسویں صدی میں مذہب اور معاشرت کے نام پر اس درندے

نے اپنے چہرے پر خوشنما لیکن پُرفریب خول سجا لیے تھے ورنہ اندر وہی وحشی موجود تھا۔ مایوسی کے ان لمحات میں میرے ذہن میں پیدا ہونے والے خلا میں کچھ فلسفہ بھی زور مارنے لگا۔ پتھر کے دور کا انسان خونخوار اور خون آشام تھا بس دو چار کے لیے کیونکہ اس کے ہتھیار بھونڈے اور کم تباہ کن تھے لیکن بیسویں صدی کا انسان اپنے خودکار ہتھیاروں اور نت نئی ایجادات کے سہارے قوموں، معاشروں بلکہ پوری نسل انسانی کے لیے خطرہ پیدا کر سکتا ہے۔ جوہری طاقتوں کے سربراہ بھی تو عام سے انسان ہی ہیں جنہیں کرۂ ارض پر نسل انسانی کو فنا کرنے کے ہولناک فیصلوں کا اختیار حاصل ہے۔ کمپیوٹر صدر امریکہ کے نشانات انگشت کو پہچانتا ہے بس ننھا سا انگلی ایک بٹن پر پڑنے کی دیر ہے اور کرۂ ارض پر ہر طرف آگ، دھماکوں، پگھلے ہوئے لاوے اور تابکاری کا طاغوتی رقص ایٹمی موسیقی کی زہرہ گداز دھنوں پر شروع ہو جائے گا۔ صدر امریکہ کا ہو یا روس کا، اس کا دماغ پھرتے کتنی دیر لگتی ہے۔

دوسروں کی طرح ان پر اگر کسی وقت پتھر کے زمانے کی جبلت حاوی آگئی تو کیا ہوگا؟

عزالہ کے قیاسات یکسر غلط تھے۔ انسان ہر دور میں درندہ رہا ہے اور درندہ بن سکتا ہے، خون کی بو سے اسے خاص رغبت ہے۔ اکبرزئی اور لواخیل والوں جیسی کہانیاں ہر طرف عام ہیں اور میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اکبرزئی والوں نے بھرپور اور پرشکوہ انتقام کے لیے تیس برس انتظار کیا تھا اور مجھے بھی انتظار کرنا تھا، وقت کا تعین میرے اختیار سے باہر تھا لیکن یہ بات اٹل تھی کہ مجھے صبر اور تحمل سے کام لینا تھا کیونکہ اس معرکے میں میں تنہا رہ گیا تھا۔

لیکن وہ لڑائی بڑی پہلودار تھی۔ میرا اصل دشمن توقیر تھا اور شاید تصور بھی جو سیکڑوں میل دور لاہور میں بیٹھا بساط پر مہروں کو آگے پیچھے سرکا رہا تھا لیکن ان کے پیادے میری نگاہوں میں تھے۔ جہانگیر، قاسم، رخشی یا ایشین سنڈیکیٹ والے نصیر خان کو زک پہنچا کر میں اپنے اصل دشمن کو قدرے ہراساں کر سکتا تھا۔

میں نے فوراً ہی ہوٹل چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

جہانگیر سے میری بات ہو چکی تھی، اس نے مجھ سے تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا، قاسم اپنی سرخ کرولا میں مسلسل اس کا تعاقب کر رہا تھا اور جہانگیر نے مجھے موقع فراہم کرنے کے لیے اپنی روانگی میں تاخیر کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا مجھے یقین تھا کہ مکمل ناامیدی سے قبل قاسم کافی دیر تک جہانگیر پر نگاہ رکھے گا اور اگر جہانگیر اپنی بیوی، سلمیٰ کو لے کر گھر کی طرف روانہ ہو چکا تھا تو اس کے مکان کے اطراف میں قاسم کی موجودگی کے قوی امکانات موجود تھے۔ میرے پاس کرنل زوار زیدی کی سالخوردہ سی کار تھی جو کتابی اصولوں کے مطابق کئی برس پہلے مرحوم و مغفور ہو چکی تھی لیکن جس طرح ریٹائرڈ کرنل زندہ تھا اسی طرح اس کی گاڑی بھی اس سے رسم وفا نباہ رہی تھی میں ہوٹل سے روانہ ہو کر خراماں خراماں دس بارہ منٹ میں جہانگیر کے مکان پر جا پہنچا۔ وہاں نہ صرف سڑک پر دور دور تک سرخ کرولا کا پتا نہیں تھا بلکہ جہانگیر کے مکان پر بھی بے رونقی کا راج تھا۔ جس کی بنا پر میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت تک جہانگیر گھر نہیں پہنچا تھا۔

اس مفروضے کے بعد میں نے جہانگیر کے سسرالی عزیز کے مکان کا رخ کرنے کے بجائے وہیں ٹھہرنے کو ترجیح دی اور ایک تناور درخت کے نیچے، اندھیرے میں گاڑی روک کر کھڑا ہو گیا خودکار پستول میں نے جیب سے نکال کر گود میں رکھ لیا تھا اور ٹریگر کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا تھا۔

اس وقت فرصت میسر تھی اور ذہن میں خیالات کی یلغار ہو رہی تھی ایسے میں سگریٹ نوشی کی خواہش کچھ بے جا بھی نہیں تھی لیکن میں نے خود ہی اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ ویسے تو میری کار اندھیرے ہی کا جزو نظر آ رہی تھی لیکن دور سے اندھیرے میں کسی جگنو کی طرح چمکتا ہوا سگریٹ کا سرا دیکھ کر کوئی بھی ادھر متوجہ ہو سکتا تھا۔

دن کے اوقات میں وہ علاقہ نہ بے رونق تھا اور نہ غیر آباد لیکن رات کے ان ابتدائی لمحات میں وہاں ہر طرف سکوت ہی سکوت پھیلا ہوا تھا۔ وسیع و عریض احاطوں میں گھری ہوئی کوٹھیوں کے مکین اپنے در و دیوار میں محبوس، اپنی دلچسپیوں میں کھوئے ہوئے تھے اور ان کے ملازمین شاید ان کے تجسس میں اپنی حسرتوں کا حساب چکانے میں مشغول تھے لہٰذا اس وقت وہاں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

خاصے وقفے سے اس سڑک پر تین گاڑیاں گزریں اور میں ان کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں اپنی نشست پر بس کسمسا کر رہ گیا لیکن ان میں سے کسی کی منزل قرب و جوار میں نہیں تھی لہٰذا میں نے انھیں نظر انداز کر دیا لیکن تقریباً دس منٹ بعد جو چوتھی کار آئی وہ سڑک پر دھیمی ہو کر جہانگیر کے مکان کے آہنی پھاٹک کے سامنے مڑ گئی اور اس کے عقب میں آنے والی پانچویں کار وہاں سے بظاہر آگے بڑھ کر ٹیک بیک داہنی گلی میں گھوم گئی۔ اس کار کی اپنی روشنیوں کے انعکاس میں میں بس اسی قدر دیکھ سکا کہ داہنی گلی میں مڑنے والی کار کا رنگ سرخ تھا۔

حالات پوری طرح میرے سامنے تھے۔ جب جہانگیر کے مکان کے سامنے کھڑی ہوئی کار کے پہلے ہی ہارن پر پھاٹک کھول دیا گیا تو وہ کار اندر چلی گئی اور میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار نہ رہا کہ اس کار میں جہانگیر شاید اپنی بیوی سلمیٰ سمیت گھر واپس پہنچا تھا۔

سیاہ کار کے اندر جانے کے لمحہ بھر بعد جب میں اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کر کے اسے آگے بڑھانے کے بارے میں تذبذب کا شکار تھا تو میری کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں آگے والی داہنی گلی میں سے سرخ کرولا باہر نکل کر جہانگیر کے مکان کی طرف گھومتی نظر آئی اور میں نے اضطراری طور پر پستول ہاتھ میں لے لیا۔

سرخ کرولا قریب سے گزری تو اس میں بس ایک ہی ہیولا نظر آیا جو ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا میں نے کسی اضطراری ردِعمل کے طور پر وہ مشاہدہ کرتے ہی پستول اٹھا کر گولی داغ دی۔ ایک ہولناک دھماکا ہوا اور سرخ کرولا سڑک پر لہرانے کے بعد سیدھی ہو لی۔ شاید میرا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔ میں نے گیئر میں ڈال کر کرنل کی ڈھانچہ کار کو واپس گھمایا اور سرخ کرولا کے پیچھے ڈال دیا۔

چند ثانیوں بعد کرولا کی عقبی روشنیاں میری کار کے ہیڈ لیمپس کی زد میں تھیں میں نے پُرجوش انداز میں اپنی کار کی رفتار بڑھا دی اور درمیانی فاصلہ تیزی سے کم ہونے لگا لیکن اس سے قبل کہ سرخ کرولا میری فائرنگ رینج میں آتی، درمیانی فاصلہ چند سکنڈ کے لیے تیزی سے بڑھا اور پھر مستقل ہو گیا۔ کرولا والے کے اس رویے نے مجھے چونکا دیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ محفوظ فاصلے پر رہتے ہوئے یہ اندازہ قائم کرنا چاہ رہا ہو کہ اس کا تعاقب کون کر رہا تھا۔

میرے لیے خوشی کی بات صرف اتنی تھی کہ ایک فائر ہونے کے باوجود اس بے رونق رہائشی علاقے میں میری کار کے عقب نما آئینے میں سڑک ویران نظر آ رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد دونوں گاڑیاں آباد علاقے کو پیچھے چھوڑ کر یونیورسٹی جانے والی ویران سڑک پر نکل آئیں۔ حسن اسکوائر اور راشد منہاس روڈ والے چوراہے سے آگے سڑک بالکل تاریک اور سنسان تھی۔ اس آخری چوراہے پر بنی ہوئی پولیس چوکی پر بھی سناٹا ہی تھا کیونکہ وہاں سے گزرتے ہوئے بھی دو کاروں کی دوڑ عملے کے کسی رکن کی توجہ حاصل نہیں کر سکی تھی۔

یونیورسٹی سے آگے نکلتے ہی سرخ کرولا اچانک سڑک کے کنارے روک دی گئی۔ اس کے ڈرائیور کا وہ منصوبہ سوچا سمجھا تھا جب کہ مجھے ہنگامی طور پر بریکوں سے کام لینا پڑا اور یوں رکتے رکتے بھی میری کار سرخ کرولا کے اتنے قریب پہنچ گئی کہ ادھر سے کیا جانے والا فائر بونٹ کے آس پاس کے کسی حصے میں جا گھسا۔ میں نے عجلت کے عالم میں انجن بند کیا اور دروازہ کھول کر کار سے نیچے اتر گیا۔

شاید میرے حریف کی نگاہیں بہت تیز تھیں کیونکہ میرے نیچے اترتے ہی اس کی طرف سے دوسرا فائر ہوا، اگر میں اس وقت سینے کے بل کچی زمین پر نہ پڑا ہوا ہوتا تو گولی اندھیرے کے باہر میرے بدن کا کوئی حصہ چاٹ گئی ہوتی۔ میں زمین پر پڑے پڑے جھاڑیوں کی طرف لڑھک گیا۔ دوسری طرف سے تسلسل کے ساتھ مزید دو فائر ہوئے اور بے اختیار میرے حلق سے ایک چیخ آزاد ہو گئی۔ جھاڑیوں میں پہنچنے کے بعد لمحہ بھر کے لیے میں ساکت پڑا یہ سوچتا رہا کہ آخر میرے بدن پر کہاں زخم آیا تھا جو اضطراری چیخ بلند ہو گئی تھی لیکن یہ احساس بہت خوشگوار ثابت ہوا کہ میرے بدن میں کہیں کوئی ٹوٹ پھوٹ رونما نہیں ہوئی تھی۔

میرا حریف چار فائر کر چکا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کے پستول کے چیمبر میں مزید دو یا تین گولیاں باقی تھیں لیکن اس کا امکان یہی تھا کہ اس کے پاس فاضل میگزین بھی رہا ہو گا جس کے بل پر وہ رات بھر مجھے اس ویرانے میں چھپے رہنے پر مجبور کر سکتا تھا جب کہ میرا کُل اسلحہ ایک فائر کے بعد چھ گولیوں پر مشتمل تھا۔

میرا خیال تھا کہ اسلحہ کی کمی کو میری غیر ارادی چیخ سے خاصی تقویت مل گئی تھی۔ اگر قاسم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا کہ اس نے اپنی کسی گولی سے مجھے زخمی کر دیا ہے تو وہ مجھے گھیرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ میں نے جھاڑیوں میں پناہ لینے کے بعد احتیاط سے سرخ کرولا کی سمت میں دیکھا تو تاروں کی چھاؤں میں وہاں سناٹا نظر آیا۔ قرب و جوار میں قاسم تو کیا، کسی بھی ذی روح کا وجود نہیں تھا۔ پھر میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اونچی اونچی خودرو جھاڑیوں کا جائزہ لینے لگا۔

سناٹا۔ ہر طرف گمبھیر سناٹا طاری تھا۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ میں ایک جگہ رُک کر اپنے لیے مشکلات کو دعوت دے رہا تھا۔ میں جہاں کار سے اترا تھا عملاً وہیں موجود تھا اگر قاسم مکاری کے ساتھ پیش قدمی کر رہا تھا تو وہی مقام اس کا نشانہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کی دانست میں زخمی شکار کے لیے اندھیرے میں زیادہ دور نکلنا دشوار ہوتا۔

میں نے خودرو جھاڑیوں میں مزید اندر گھس کر حشرات الارض کا خطرہ مول لینے کے بجائے واپس سڑک پر نکل آنے کا فیصلہ کیا اور پھر سرعت کے ساتھ کہنیوں کے بل زمین پر رینگتا ہوا سڑک پر آیا اور اپنی کار کے پیچھے سے گھوم کر اسی کی اوٹ میں اپنا مورچہ جما کر بیٹھ گیا۔

وقت دھیمے دھیمے گزرتا چلا گیا لیکن صورت حال میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی تو مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں قاسم گھات لگائے اس انتظار میں نہ بیٹھا ہو کہ میں کار میں فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔

میں نے ایک پتھر اٹھا کر ہولے سے جھاڑیوں میں اچھالا

اس حرکت کا ردِعمل توقع کے عین مطابق ہوا۔ اندھیرے میں ایک دھماکے کے ساتھ شعلہ سا تیرتا ہوا نمودار ہوا اور اسی طرف معدوم ہو گیا جہاں میں نے پتھر پھینکا تھا۔ اسی کے ساتھ سڑک پر موجود ہونے کی وجہ سے قاسم کی کمین گاہ بھی میری نظروں میں آ گئی۔ شعلے کا مخرج میری نظروں میں آ گیا تھا بلکہ فائر سے پیدا ہونے والے مدھم سے بارود کی انعکاس میں میں نے وہ چمکتی ہوئی آنکھیں بھی دیکھ لی تھیں جو فوراً ہی اندھیرے کا جزو بن گئیں۔ میں نے گھٹنوں کے بل سڑک پر پوزیشن لے کر ہاتھ سیدھا کیا اور اسی سمت میں گولی چلا دی میرا وار کارگر رہا کیونکہ قاسم کی دردناک چیخ سو فیصد حقیقی تھی۔ میں نے بلا توقف اسی زاویے پر دوسرا بھی فائر کر دیا اور اس بار بھی ستاروں نے میری یاوری کی کیونکہ اس بار قاسم کی آواز میں اذیت کے ساتھ غیظ و غضب کی جھلاہٹ بھی شامل تھی۔

اس بار شاید اس نے بھی میری پوزیشن دیکھ لی تھی۔ وہ غصے کے عالم میں ٹرائیگر دباتا ہی چلا گیا۔ دو گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں اور کار کی باڈی سے ٹکرا کر دم توڑ گئیں۔ اس کے بعد فضا میں محض ٹرائیگر کی کھٹ کھٹ گونج کر رہ گئی۔ میں نے پوری قوت سے قاسم کی کمین گاہ کی طرف دوڑ لگا دی۔

اس نے غصے اور جھنجلاہٹ میں خود ہی اپنا بھرم کھول دیا تھا۔ سات گولیاں چلانے کے بعد اس کے پستول کا چیمبر خالی ہو چکا تھا اور میں اسے دوبارہ چیمبر لوڈ کرنے کا موقع دیے بغیر اس پر ٹوٹ پڑنا چاہتا تھا۔

میرے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز نے اس کے اوسان خطا کر دیے اور اس نے پوری قوت سے اپنا آہنی پستول مجھ پر کھینچ مارا۔ شاید اپنی چالاکی کے زعم میں وہ بھی فاضل راؤنڈز نہیں لایا تھا۔ پستول میری پنڈلی سے ٹکرایا تو میں درد کی شدت سے وہیں بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے پوری قوت سے دانت بھینچ کر درد کی ناقابل برداشت لہر پر قابو پانے کی کوشش کی اور پھر لپک کر قاسم پر ٹوٹ پڑا جو جھاڑیوں میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ زخمی ہونے کے باعث اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں تھا۔ پہلے ہی وار میں میں نے اسے بری طرح رگید کر رکھ دیا۔ جبڑوں پر پڑنے والے مکوں نے غالباً اس کے سارے دانت ہلا کر رکھ دیے تھے لیکن وہ سمجھ چکا تھا کہ اب اس نے ہاتھ پیر ذرا بھی ڈھیلے چھوڑے تو زندہ نہ رہ سکے گا۔ اس نے وحشیانہ مار کی پروا کیے بغیر میرے نرخرے پر ہاتھ ڈالنے کی کوششیں شروع کر دیں اور میں اسے چھوڑ کر اٹھ گیا۔

اس نے میری ٹانگوں سے لپٹ پڑنے کی کوشش کی لیکن میں نے ٹھوکروں سے اسے پیچھے اُلٹ جانے پر مجبور کر دیا۔

”ٹھٹ — ٹھہرو — ڈڈ — ڈینی — میری — بب — بات سنو“ وہ بری طرح ہانپتے اور کراہتے ہوئے بولا۔ شاید اس دوران میں مغلظات کے تبادلے میں، آواز کی بنا پر وہ مجھے پہچان چکا تھا۔

لیکن اس وقت میرے سر پر خون سوار ہو چکا تھا۔ قاسم کے ہاتھ طارق سمیت متعدد انسانوں کے خون میں آلودہ تھے اور وہ میری آزادی کا بھی دشمن ہو چکا تھا۔ اپنے مفاد کے لیے اس نے اے ٹو کے خلاف میرے ساتھ سمجھوتہ کیا لیکن اے ٹو کی خوشنودی کے ذریعے بڑا فائدہ ملنے کی اُمید پر مجھ سے دغا کرنے پر تل گیا۔ ایسے خود غرض، قاتل اور غدّار کو زندہ چھوڑنا اپنی ذات پر ظلم کے مترادف ہوتا۔

وہ قتل و غارت گری کا بازار گرم کرنے کے باوجود قانون کی گرفت سے محفوظ تھا، زندہ رہتا تو نجانے اور کتنے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارتا۔ میں نے پوری قوت سے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی اور پھر اپنا بھرا ہوا پستول لے کر آگے بڑھا اور اس کی نال سے قاسم کے ہلتے ہوئے دانتوں پر ضرب لگائی تو وہ بری طرح تڑپ اُٹھا۔ پھر اس سے قبل کہ وہ میرے اگلے قدم کا اندازہ لگا تا میں نے اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر پستول کی مہیب نال اس کے دہانے میں ڈالی اور فوراً ہی ٹرائیگر دبا دیا گولی اسکے دہانے سے گزر کر اس کا بھیجا پھاڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس کے حلق سے ایک لرزہ انگیز ادھوری سی چیخ نکلی اور پھر اس کا بدن خاک میں اُچھلنے لگا۔

اسے وہیں ویرانے میں تڑپتا چھوڑ کر میں وہاں سے واپس ہو لیا۔

سکندر علی کے بعد قاسم تنظیم کا دوسرا اہم رکن تھا جو میرے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا تھا۔ وہ بذاتِ خود خونی تھا اپنے مالی مفاد کے لیے شہر میں ہیروئن کی منڈی پھیلانے کے چکر میں تھا، توقیر کے اشارے پر میرے لیے خطرہ بن چکا تھا لیکن پھر بھی اس خون پر میرا دل بوجھل ہو گیا تھا۔

مجھے کسی مجرم کو سزا دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا اس فرض کی انجام دہی کے لیے ملک میں متعدد ادارے کام کر رہے تھے لیکن مجبوری یہ ہے کہ جرائم کے انسداد کے قوانین میں جابجا جھول پائے جاتے ہیں۔ وکالت کا فن اس قدر ترقی پا چکا ہے کہ سچ کی جڑیں تلاش کرنے میں مدتیں لگ جاتی ہیں، گواہ پیشے پیشیوں اور ذاتی سطح کی نکیلی اور زہریلی جرح سے اکتا کر گواہیوں

سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد جب قانونِ تعزیر حرکت میں آتا ہے تو سزائیں مضحکہ خیز نظر آتی ہیں کیونکہ کتابوں میں وہی درج ہیں۔ اس دور میں جرم کے محرکات تیزی سے بدل رہے ہیں، معاشرے پر جرم کے اثرات ہمہ گیر ہوتے جا رہے ہیں لیکن ان سب کی روک تھام کے لیے وہی ایک صدی پرانا قانون چلا آ رہا ہے جس کی موجودگی میں کوئی عادل چاہتے ہوئے بھی کڑی سزائیں تجویز نہیں کر سکتا۔

قاسم قاتل تھا لیکن اس کے اعترافات کے باوجود اسے قاتل ثابت کرنا میرے لیے ناممکن تھا، وہ ہیروئن کی تجارت کا پشت پناہ تھا لیکن اسے کون ثابت کرتا؟ اسے قانون کی تحویل میں دے کر میں خود کو اسی گورکھ دھندے میں الجھا لیتا۔ اے ٹو ہوشیار ہو جاتا، قاسم کو بہترین قانونی مشاورت فراہم کی جاتی اور میری انسدادِ منشیات کی مہم ادھوری رہ جاتی، توقیر کا غیر قانونی کاروبار دن رات پھلتا پھولتا رہتا اور توقیر کسی روز موقع پا کر راستے میں پڑے ہوئے کسی روڑے کی طرح، مجھے ٹھوکر مار کر ہمیشہ کے لیے اپنے راستے سے ہٹا دیتا۔

میری دانست میں آئینی اصلاحات اور طرزِ حکومت سیاستدانوں کے محبوب مشاغل ہیں۔ ایک عام شہری کا تعلق صرف قانون سے ہوتا ہے جس میں کبھی کوئی بڑی تبدیلی نہیں آتی۔ ایک دیہاتی یہ جاننا چاہتا ہے کہ کوئی اس کے مویشی چرا کر لے جائے اور ان کی واپسی کے لیے بھنگ یا زرِ تاوان طلب کرے تو قانون اس کی کیا مدد کرتا ہے اور اس بارے میں آج بھی وہی قانون رائج ہے جو برسہا برس پہلے انگریز نے اپنے مفادات کی پرورش کے لیے اس سرزمین پر رائج کیا تھا جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ قانون میں ابہام رکھا جائے تاکہ وقتِ ضرورت اس ابہام کا فائدہ سرکار پرستوں کو دیا جا سکے۔ انگریز چلا گیا، جمہوریت سے آمریت تک بھانت بھانت کے نظام ملک میں رائج ہوتے رہے۔ آئین بنتے اور بگڑتے رہے لیکن قانون وہی نوآبادیاتی چلے آتے ہیں، فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ پہلے ابہام کا فائدہ سرکار پرستوں کو ملتا تھا لیکن آزادی کے بعد ایسا ہر فائدہ زر پرستوں کو منتقل ہو چکا ہے۔ انگریز صرف ضرورت کے وقت ابہام کا سہارا لیتا تھا، آج ابہام لوگوں کی جیبوں سے پیسہ نکلوانے کا ذریعہ بنا ہوا ہے اور ضرورتوں کے باقاعدہ نرخ طے پا چکے ہیں۔ سرکار پریشان ہے، آمدنی کم ہوتی جاتی ہے، کالا دھن مسلسل بڑھ رہا ہے۔ فکر ہے کہ کس کس کو کیا کیا رعایتیں دے کر یہ اگلوایا جائے۔ لوگ دور دور کی کوڑی لاتے ہیں لیکن ناک کے نیچے کس نے دیکھا ہے؟

شاید ان نامعقول خیالات کی رو مجھے بالکل ہی بہائے جاتی لیکن اسی اثنا میں، میں غزالہ کے گھر پہنچ گیا۔ ہارن بجایا تو مجھے حیرت ہوئی کہ پھاٹک کھولنے والا سلطان شاہ تھا۔

"کیا کوئی اور نہیں ہے گھر میں؟" میں نے گاڑی اندر لے جا کر اسے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں سوال کیا۔

وہ کھڑکی پر جھکا اور کسی شریر بچے کی طرح ٹھنکاری ... پڑا۔ "تمہارا حلیہ بتا رہا ہے کہ کسی سے لڑ کر آ رہے ہو لیکن جھگڑے کا غصہ مجھ پر تو نہ اتارو نا۔"

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی اور پھر چونک پڑا۔ برآمدے میں غزالہ کا پرتشویش چہرہ میرے سامنے تھا۔

"کہاں سے آ رہے ہیں؟" کار سے اترتے ہی اس نے ... پھٹے ہوئے اور خون آلود کپڑوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے ... آمیز لہجے میں سوال کیا اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"اس وقت تم شوہر سے اکتائی ہوئی کوئی روایتی بیوی معلوم ہو رہی ہو۔"

"یہ حلیہ کیا بنایا ہوا ہے آپ نے؟" اس نے میرے ... آگے کھلے ہوئے گریبان میں سے نظر آنے والی گردن اور سینے ... خراشوں پر اپنی مخروطی انگلیاں پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔

"تصادم۔" میں نے سر کو قدرے خم دیتے ہوئے کہا۔ "... تصادم میں پھول اور کلیوں کا تبادلہ تو نہیں ہوتا نا۔"

"اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" سلطان شاہ نے دخل ... کرتے ہوئے کہا۔ "بی بی جی نے مجھے ایسی زبردست گولیاں ... ہیں کہ میرا سارا درد کافور ہو گیا ہے، کل سے میں تمہیں تنہا باہر ... جانے نہ دوں گا۔"

"بی بی جی گولیاں دینے کی ماہر ہیں۔" میں نے ازراہِ مذاق ... "کون سی گولی دی انھوں نے تم کو؟"

"ہومیوپیتھی میں ہڈیوں کی چوٹ کی ایک بہت مؤثر دوا ہے ... وہی خوراک دی تھی اسے اور یہ پورے گھر میں دوڑتا پھر رہا ..." غزالہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"بس یہ خیال رکھنا کہ سلطان شاہ دوڑتا ہوا گھر سے باہر نہ نکل جائے۔" میں نے سلطان شاہ کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

غزالہ کے والدین غالباً سو چکے تھے کیونکہ مکان میں سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن غزالہ اور سلطان شاہ میں عجیب سی مفاہمت ... ہو چکی تھی۔ غزالہ میرے ساتھ لگی میرے کمرے تک چلی آئی ... اس کی آڑ میں سلطان شاہ بھی وہیں آ پہنچا۔

"اب آپ بتائیں کہ کیا کر کے آ رہے ہیں؟" غزالہ نے ... بستر پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا اور سلطان شاہ کی ناقدانہ نگاہیں ...

جسم میں کسی ٹوٹ پھوٹ کے امکانات کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئیں۔

"قاسم سے آج نجات مل گئی۔" میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور پستول جیب سے نکال کر ایک طرف رکھ دیا۔ "وہ بہت اونچا اڑ رہا تھا اور کسی بھی وقت میرے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔"

"یہ تم نے برا کیا۔" سلطان شاہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔ "وہ تو میرا شکار ہونا چاہیے تھا۔"

"ہر وقت بچوں جیسی باتیں نہیں کرتے۔" میں نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔ "ضروری نہیں تھا کہ وہ تمہاری گرفت میں آ ہی جاتا۔ میں اسے بمشکل تمام گھیرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔"

پھر ان دونوں کے استفسار پر میں انھیں دن بھر کی کارگزاری سے آگاہ کرنے لگا۔

"جہانگیر نے تمہارا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا؟" میرے خاموش ہوتے ہی سلطان شاہ نے تحیر اور بے یقینی کے عالم میں سوال کیا۔

"دوستی اپنی جگہ ہے، اس وقت وہ اے ٹو کی طرف سے جان کے خوف میں مبتلا تھا اسی وجہ سے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہ رہا تھا لیکن اب اسے بھی اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنا ہو گی۔"

"کیا اس سے بھی نمٹنے کا ارادہ ہے؟" غزالہ نے سوال کیا۔

"نہیں، اس نے برا وقت پڑنے پر دوستی کو بالائے طاق رکھ دیا مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ البتہ معلومات اگلوانے کے لیے اسے بلیک میل ضرور کر سکوں گا، قاسم کا انجام اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گا۔"

"یہ باتیں تو اب ہوتی رہیں گی، آپ لباس کیوں نہیں بدل لیتے؟"

"میں نہاؤں گا۔" میں نے کسلمندانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "شاید میری داہنی پنڈلی زخمی ہو گئی ہے، پہلے اس کی ڈریسنگ کر دو۔"

وہ بیچاری فوراً ہی میری پنڈلی لے بیٹھی۔ میں نے بھی اس وقت پہلی بار زخم دیکھا تو پنڈلی کی ہڈی نیلی پڑی ہوئی تھی۔ کئی جگہ سے جلد ادھڑ کر زخم پر خون کے لوتھڑے جم گئے تھے۔

"بہت بری طرح چوٹ آئی ہے۔" غزالہ نے زخم صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ورم بھی آ گیا ہے کہیں ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔"

"ہڈی ٹوٹی ہوتی تو اپنے قدموں پر کھڑا ہونا بھی دشوار ہو جاتا۔ بس تم ڈریسنگ کر دو، دو چار روز میں زخم ٹھیک ہو جائے گا۔"

"قاسم کی موت سے ایک اور بھی مسئلہ حل ہو گیا ہے۔" غزالہ بولی۔ "آپ کے چکر میں وہ کامران تک پہنچ کر تنگ کر سکتا تھا کم از کم اب وہ خطرہ ٹل گیا ہے۔"

میں سگریٹ سلگاتے ہوئے ہنس دیا۔ "بشرطیکہ وہ پہلے ہی اس بارے میں رخشی کو باخبر نہ کر چکا ہو۔"

"وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔" سلطان شاہ نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "شاید قاسم کی موت کی خبر ہی اس کا حوصلہ ختم کر کے رکھ دے گی ہمیں اس کے بارے میں سوچ کر اپنا دماغ کھپانے کی ضرورت نہیں۔"

"تم اسے اچھی طرح نہیں جانتے" میں اسے بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں ایک زمانے میں وہ اے ٹو کے لیے تنظیم کے ایک بڑے کے خلاف سراغرسانی کرتی رہی ہے اور پھر اسے قاسم سے بہت گہرا لگاؤ تھا کل رات جب میں نے اکبر کی علاج گاہ میں اسے قاسم کے زخمی ہونے کی خبر دی تھی تو وہ بری طرح بے چین ہو گئی تھی۔ قاسم کا بدلہ لینے کے لیے وہ خود بھی حرکت میں آ سکتی ہے۔"

"لیکن وہ تنہا ہو گی، قاسم کی پشت پر تنظیم کی قوت تھی، آپ کے خلاف وہ زیادہ کھل کر دار نہیں کر سکے گی کیونکہ وہ خود بھی اے ٹو کے عتاب میں آئی ہوئی ہے۔" غزالہ بولی۔

"وہ بات پرانی ہو گئی، اس وقت توقیر کو شبہ تھا کہ لاہور میں الشین سنڈیکیٹ اور دوسرے نقصانات سے اس کا بھی کوئی تعلق رہا ہو گا۔ اب ہر بات صاف ہو چکی ہے وہ رخشی کو دوبارہ اپنے ساتھ ملا کر فائدے میں رہے گا۔"

"میرے خیال میں تم نے قاسم کو مار کر غلطی کی ہے ــــ" سلطان شاہ پرخیال لہجے میں بولا۔ "اسے بری طرح مار پیٹ کر زندہ چھوڑ دیتے تو بہتر ہوتا۔ کم از کم ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ ہمارا دشمن کون ہے، اس کے مرنے کے بعد اس کی جگہ خالی نہیں رہے گی اور آنے والا ہمارے لیے اجنبی ہو گا۔"

"ہوا کرے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ہمارا اصل محاذ اب کراچی نہیں لاہور میں کھلے گا۔ قاسم کی موت کے بعد شاید توقیر یہاں نہیں رکے گا۔"

"یہ پتا نہیں چل سکا کہ وہ کراچی میں کہاں مقیم ہے؟" غزالہ نے سوال کیا۔

"وہ اپنی ذات کو بہت زیادہ پُراسرار بنائے رکھتا ہے۔ کل رات بھی وہ جہانگیر اور اس کے ملازمین کی لاعلمی میں اسی کے گھر میں سوتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آج کسی نئے ٹھکانے پر ہو۔"

یہ کہتے ہوئے اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں اس مرحلے پر جیوا ہاؤز کو یکسر بھلا بیٹھا تھا۔ توقیر اس عمارت میں پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو لیکن تنظیمی ڈھانچے میں اس عمارت کی اپنی

ایک اہمیت تھی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میری آخری معلومات کے مطابق ایم ٹی تھری ہنڈرڈ نامی متروک ٹرانسمیٹر ریسیور اپنے ناقابلِ شکست حفاظتی نظام سمیت جیوا ہاؤز ہی کے ایک کمرے میں موجود تھا۔

پولیس کو جیوا ہاؤز کی طرف متوجہ کرنا شاید اس قدر سہل ثابت نہ ہوتا کیونکہ وہ عمارت شہر کے ایسے حصے میں واقع تھی جہاں بسنے والوں کی کثرت بارسوخ امرا پر مشتمل تھی اور پولیس باقاعدہ ثبوت کے بغیر وہاں کسی بھی کارروائی پر آمادہ نہ ہوتی میں نے فیصلہ کرلیا کہ مجھے خود ہی ادھر کا رخ کرنا چاہیے البتہ اس بار میں غیر ضروری تخریب کاری یا آتش زنی میں اپنی صلاحیتیں صرف نہ کرنے کے بارے میں پختہ ارادہ کرچکا تھا۔

غزالہ نے سختی کے ساتھ اس وقت جیوا ہاؤز جانے کی مخالفت کی اور سلطان شاہ بھی اس کا ہم نوا ہوگیا مجبوراً مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے میں لباس وغیرہ بدل کر فارغ ہوا تو غزالہ میرے لیے کھانا لے آئی غنیمت یہ تھا کہ کرنل زوار زیدی اپنے لگے بندھے اصولوں کے مطابق بہت دیر پہلے مقررہ وقت پر سوچکا تھا، وہ جاگ رہا ہوتا تو میری حالت کے بارے میں پے در پے سوالات کرکے مجھے زندگی سے بیزار کردیتا۔

کھانے کے بعد میں نے ہوٹل واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو غزالہ مجھے وہیں روکنے پر مصر ہوگئی اسے شبہ ہوگیا تھا کہ کہیں میں ہوٹل واپسی کے بہانے جیوا ہاؤز کی طرف نہ جانکلوں۔

جب وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی تو سلطان شاہ میرے قریب آبیٹھا۔

”اب بتاؤ کہ تم کیا سوچ رہے ہو؟“ اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کچھ بھی نہیں، فی الحال تو بالکل خالی الذہن ہوں۔“ میں نے فضا میں دھواں بکھیرتے ہوئے کہا۔

”اس وقت کی نہیں، میں آئندہ حکمت عملی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“

”حکمت عملی تو لاہور پہنچ کر ہی سامنے آسکے گی۔“

”تم شاید کچھ الجھ گئے ہو، کہیں اس لڑے سے خوفزدہ تو نہیں ہوگئے؟“ اس نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

میں بے اختیار مسکرادیا۔ ”کس بات سے اندازہ لگایا تم نے؟“

”کچھ کھوئے کھوئے سے نظر آنے لگے ہو تم۔“

”مجھے نہ خوف ہے نہ تشویش، بس ایک ہی خیال مجھے کھائے جارہا ہے کہ زندگی میں بہتیرے اتفاقات رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن میرے ساتھ سنگین ترین اتفاق ہوا ہے، برسوں پہلے جس قصے کو لاہور میں دفن کرنے کے بعد میں نے کراچی میں نئی زندگی کی ابتدا کرنے کی کوشش کی وہ آج پھر میرے سامنے ہے۔ ایک ہی باپ کی اولادیں ایک دوسرے کے سامنے ہیں، یا وہ مجھے فنا کردیں گے یا میں ان پر غالب آجاؤں گا لیکن یہ بھائی اور خونی کھیل میرا مقدر کیوں بن گیا ہے؟“

”بدل ڈالو اس مقدر کو، معاف کردو اپنے بھائیوں کو۔“

”میں انھیں معاف کردوں لیکن وہ میرے لہو کے پیاسے ہیں، میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔“

”انھیں بھول کر کسی بھی گمنام سمت میں نکل جاؤ پھر کسی مقام پر ڈیرا ڈال دو جہاں وہ تمھارا سایا بھی نہ پاسکیں۔“

”بات میرے مشن کی آپڑی ہے سلطان شاہ۔ ذاتی دشمنی کو میں بھول سکتا ہوں لیکن میں نے ہیروئن کی تجارت کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے، توقیر اور تصویر اس گھناؤنی تجارت کے رُوحِ رواں ہیں۔ وہ دانستہ مجھ سے مخاصمت رکھتے ہیں اور میں بے خبری میں ان سے دشمنی مول لے بیٹھا ہوں۔ اس مشن میں میرے ساتھ صرف تم ہی نہیں غزالہ بھی میری ہم سفر ہے۔“

”میں تمھارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔“ وہ پُرخلوص لہجے میں بولا۔ ”لیکن ایمانداری کے ساتھ سوچو کہ تم ان کا کیا بگاڑ لوگے ان کالے دھندوں میں بے حساب آمدنی ہوتی ہے، میدان خالی ہوگا تو دس نئے توقیر پیدا ہوجائیں گے جب تک نشے کے طلبگار ختم نہ ہوں گے، ہر نشے کی تجارت پروان چڑھتی رہے گی۔“

”یہ سب نظریاتی باتیں ہیں، انھیں میں بے عملی کے ہاتھوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ایسے دھندے قانون کے خوف سے کبھی ختم نہیں ہوتے کیونکہ سزا کے مقابلے میں لالچ کا عنصر ہمیشہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ آج شہر میں ہیروئن بیچنے والوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ شہر میں کوئی ایسا سرپھرا بھی پیدا ہوگیا ہے جو ہر ہیروئن فروش کو موت کے گھاٹ اتارنے پر تلا ہوا ہے تو تم دیکھنا کہ دو چار ہی وارداتوں کے بعد سب موت کی سوداگری سے تائب ہوجائیں گے۔“

”تو پھر یہی کام کیوں نہیں شروع کردیتے؟“

”چھوٹے موٹے لوگ ضرور تائب ہوکر دوسرے منفعت بخش کاموں کی طرف راغب ہوجائیں گے لیکن منظم تجارت بدستور چلتی رہے گی بلکہ اور زیادہ پھلے پھولے گی کیونکہ توقیر جیسے لوگ خطرات کا مقابلہ کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے ملک میں ہیروئن کی اسّی فیصد سے زیادہ تجارت اُن کی تنظیم کے قبضے میں ہے۔ ہاں ان کی جڑیں اکھاڑنے کے لیے دوسروں کو خوفزدہ کرکے گوشہ نشین کرانا آسان ہوگا۔“

”تو پھر لاہور کب چل رہے ہو؟“

”لاہور جانے سے پہلے کامران کی دیکھ بھال کا کوئی معقول بندوبست کرنا ہوگا۔ وہ بے چارہ آج کل بری طرح نظرانداز کیا جارہا ہے۔ میں اندازہ لگانا چاہوں گا کہ کامران کے ذریعے غزالہ پر یا مجھ پر تو ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کی جائے گی اس کے بعد ہم بے فکری کے ساتھ لاہور روانہ ہوجائیں گے۔“

وہ اس وقت تک دھیمی آواز میں مجھ سے باتیں کرتا رہا جب تک میری آواز پر نیند کا خمار نہ چھانے لگا پھر میرا ذہن نیند کی پُرکیف وادیوں میں دھنستا چلا گیا۔

اس وقت شاید صبح کے چار بجے کا عمل تھا اور میں گہری نیند سویا ہوا تھا کہ اچانک زلزلہ سا آگیا۔ میں ہڑبڑا کر بیدار ہوا تو ایک نرم سا نسوانی ہاتھ میرے دہانے پر جم گیا۔ نیند کی جھونک میں ہونے کے باوجود میں نے غزالہ کے وجود کی جانی پہچانی خوشبو فوراً ہی شناخت کرلی۔

”گھر میں کوئی گھس آیا ہے۔“ اس نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں میرے کان کے قریب سرگوشی کی۔ ”شاید وہ کوئی کھڑکی توڑ کر اسٹور روم میں داخل ہوچکا ہے لیکن اسٹور کا دروازہ باہر سے مقفل ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے اس دروازے پر زور آزمائی کی آوازیں سنی ہیں۔“

میں خاموشی کے ساتھ ننگے پاؤں بستر سے اتر پڑا۔

”میں بھی چلوں؟“ کمرے کی تاریک فضا میں سلطان شاہ کی سرگوشی گونجی اور میں چونک پڑا۔ وہ وہیں فرش پر پڑا سو رہا تھا اور شاید آہٹیں سن کر بیدار ہوگیا تھا۔

”تم غزالہ کے ساتھ اسٹور کے اندرونی دروازے پر پہنچو، میں باہر سے گھوم کر اسٹور روم میں داخل ہوتا ہوں۔“ میں نے ٹٹول کر اپنا پستول سنبھالتے ہوئے کہا۔

غزالہ خوفزدہ تھی لہٰذا فطری طور پر وہ پیچھے ہی رہی سلطان شاہ دروازے کی طرف بڑھا لیکن پھر اُلٹے قدموں اندھیرے میں اندر لوٹ آیا۔

مجھے اپنی حیرت کو الفاظ میں ڈھالنے کی مہلت نہ مل سکی کیونکہ فوراً ہی دروازے کے خلا میں ایک دیو قامت انسانی ہیولا نظر آیا جس کے ایک ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا، شاید اسی نے سلطان شاہ کو الٹے قدموں کمرے میں لوٹنے پر مجبور کیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں غزالہ کی غیرارادی چیخ کھیل ہی نہ بگاڑ دے لیکن اس بے چاری نے خوف سے لرزنے کے باوجود ذرا بھی آواز نہ نکالی۔ شاید وہ اس کھیل میں اپنے باپ کی شرکت کے بارے میں زیادہ فکرمند تھی۔

”ہینڈز اپ!“ دیو قامت اجنبی نے بھاری سرگوشیانہ آواز میں حکم صادر کیا۔ اس اثنا میں، میں تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اپنا پستول بستر پر ڈال چکا تھا، میں نے فوراً ہی دونوں ہاتھ سر سے بلند کرلیے غزالہ نے سر گھما کر مایوسانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور پھر میری تقلید میں مشینی طور پر اس کے ہاتھ بھی بلند ہوگئے، لیکن سلطان شاہ جو نووارد سے سب سے قریب تھا، اس نازک مرحلے پر اپنا کام دکھا گیا۔

ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے اس نے سر جھکا کر پوری قوت سے دوڑ لگائی اور کسی سانڈ کی طرح نووارد کے پیٹ میں وحشیانہ ٹکر رسید کرکے اسے پیچھے الٹ دیا۔

نووارد نے گرتے گرتے گولی چلادی، کھٹ کی آواز کے ساتھ گولی نکلی اور چھت سے ٹکرا کر کسی گوشے میں جاگری۔ اس کے پستول پر یقینی طور پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔

اجنبی جسمانی طور پر سلطان شاہ سے کہیں برتر تھا پھر سلطان شاہ زخمی بھی تھا لیکن اس وقت اس کے وجود میں نجانے کہاں سے اتنی قوت عود کر آئی تھی کہ اس نے ایک لحظے کے لیے بھی اپنے حریف کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اسی اثنا میں، میں سلطان شاہ کی مدد کے لیے آگے بڑھا تو اجنبی کے دونوں ہاتھ خالی نظر آئے۔ سنبھلنے کی کوشش میں پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

میں نے اس کی پنڈلیوں پر دو تین بھرپور ٹھوکریں لگائیں، وہ کربناک لیکن دبی دبی آواز میں کراہا اور اسی وقت راہداری کرنل کی آواز سے گونج اٹھی۔

”کون ہے؟ جو جہاں ہے وہیں ٹھہرے ورنہ میں گولی ماردوں گا۔“

اس کی تحکمانہ آواز سنتے ہی اجنبی کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑگئے، پھر شاید کرنل ہی نے راہداری کا بلب روشن کردیا دوسری طرف غزالہ نے کمرے میں روشنی کردی۔

حملہ آور کے ساتھ ہی میں نے بھی حیرت سے پلکیں جھپکا کر کرنل کو دیکھا جو نہایت اطمینان سے خالی ہاتھ راہداری میں کھڑا اجنبی کو گھورے جارہا تھا، روشنی ہونے پر اس نے بڑھ کر سائلنسر لگا ہوا پستول فرش سے اٹھالیا۔

”یہ کیا ہورہا ہے یہاں؟“ وہ غصیلی آواز میں دہاڑا۔

”میں اسے دیکھ لوں گا۔ آپ غزالہ کو ساتھ لے جائیں۔“ میں نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”غزالہ؟“ کرنل نے حیرت سے کہا پھر سوال کیا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

اور غزالہ کمرے سے نکل کر، خوف سے کانپتی ہوئی راہداری میں باپ کے سامنے آگئی۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" وہ گونجیلی آواز میں بولا۔" میں خود دیکھوں گا کہ یہ بدمعاش کون ہے اور اس نے میرے گھر میں گھسنے کی جرأت کیسے کی؟"

عزالہ سر جھکائے وہاں سے چلی گئی۔ اس اثنا میں اجنبی اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا اور یوں گھر جانے پر خائف نظر آرہا تھا۔ روشنی ہونے کے بعد وہ میرے اور سلطان شاہ کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ وہ قاسم کے ساتھیوں میں سے تھا اور میرا تعاقب کرنے پر ایک بار سلطان شاہ کے ہاتھوں خاصی مار کھا چکا تھا۔

"یہاں کیا لینے آئے تھے؟" سلطان شاہ نے اس کے چہرے پر اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کرتے ہوئے تلخ لہجے میں سوال کیا اور کچھ کہے بغیر کینہ توز نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔

"بولو!" کرنل غصّے کے عالم میں دھاڑا اور وہ چونک پڑا۔

"میرا کسی سے اُلجھنے یا کچھ لے جانے کا ارادہ نہیں تھا۔" وہ بھاری لہجے میں، مدافعانہ انداز میں بولا۔" میں تو بس یہ دیکھنے کے لیے اندر داخل ہوا تھا کہ یہاں کون کون چھپا ہوا ہے؟"

"تمھیں یہاں کس نے بھیجا تھا؟" میں نے آگے بڑھ کر سرد لہجے میں سوال کیا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں بولا۔" قاسم سے میرا رابطہ قائم ہو گیا ہوتا تو شاید اس وقت میری جگہ وہی موجود ہوتا۔"

"اس گھر کی نشاندہی کس نے کی تھی؟"

اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری اور سلطان شاہ نے بلا تامل اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ اس بار آنے والے کے دہانے کے سرے سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔

"بولتے رہو گے تو عافیت میں رہو گے۔" میں نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔" زیادہ اَڑنے کی کوشش کی تو ادھیڑ کر یہیں کسی گوشے میں دفن کر دیے جاؤ گے، کسی کو تمھارے انجام کی بھنک بھی نہ مل سکے گی۔"

میرا وہ روپ کرنل زوار زیدی کے لیے تحیر آمیز تھا۔ وہ مجھے یوں حیرت سے دیکھ رہا تھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

"آج دوپہر قاسم نے مجھے گلشن اقبال میں اکبر کی علاج گاہ پر مامور کیا تھا۔" وہ آستین سے خون کی لکیر صاف کرتے ہوئے بولا۔" وہاں مجھے کامران نامی ایک مریض کے ملاقاتیوں پر نگاہ رکھنی تھی اور ایک آدھ کا تعاقب بھی کرنا تھا تاکہ اس کا ٹھکانا دیکھ سکوں۔ آج شام کو یہ وہاں پہنچا تو میں چوکنا ہو گیا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کرنل کی طرف اشارہ کیا تھا اور کرنل میری استفہام طلب نگاہوں کے جواب میں اثبات میں سر ہلانے لگا تھا۔

"واپسی پر میں نے اس کا تعاقب کیا تو یہ گھر نگاہ میں آیا۔ قرب و جوار میں رہنے والوں سے تسلی بخش معلومات نہ مل سکیں۔ دوسری طرف قاسم سے بھی کوئی رابطہ نہ ہو سکا لہٰذا آج رات میں نے خود مکان میں گھسنے کا ارادہ کر لیا۔ کم از کم مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ آج صبح سے قاسم پوری شدت کے ساتھ تمھاری تلاش میں تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا لیکن یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں اندر گھس کر خود اُلجھ گیا۔"

"آپ جائیں۔ اب اس سے میں نمٹ لوں گا۔" میں نے عزالہ کے باپ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"دل کھول کر میرے سامنے اس کی مرمت کر دو پھر اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔" کرنل نے تیز لہجے میں کہا۔" وہ اس کا باپ، قاسم کون ہے، میں اسے بھی پکڑ واؤں گا۔ آخر ان لوگوں نے خود کو سمجھ کیا رکھا ہے۔"

"میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ آپ جا کر آرام کریں۔" میں نے نرم لہجے میں دوبارہ اسے سمجھانے کی کوشش کی اور غنیمت یہ ہوا کہ اس بار اس نے بے چون وچرا میری بات مان لی۔

"اس پستول کا کیا کرو گے؟" اس نے ہاتھ میں تھامے ہوئے بے آواز ہتھیار کے بارے میں دریافت کیا۔

"اسے ضبط سمجھیے۔ فی الحال ساتھ لے جائیں، بعد میں کہیں تلف کر دیں گے۔"

میں کرنل کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک سے اندازہ لگا چکا تھا کہ اس بے آواز، قیمتی پستول پر اس کی نیت خراب ہو رہی تھی۔ میرے مشورے کے بعد وہ کچھ کہے بغیر مڑا اور رخصت ہو لیا۔

میدان صاف ہونے پر میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ کرنل کے بھیج دیے جانے پر میرے شکار کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

"رخشی کہاں ہے؟" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"میں کسی رخشی کو نہیں جانتا۔"

"وہ عورت جو پہلے قاسم ہی کے ساتھ رہتی تھی۔" میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"اوہ۔ مسز قاسم! اسے کافی دنوں سے نہیں دیکھا گیا۔ ممکن ہے کہ وہ شہر سے باہر رہی ہو۔"

"قاسم کے ٹھکانے کہاں کہاں ہیں؟"

"ہم لوگ اس کے معاملات سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ وہ معاوضے پر ہم سے مختلف کام لیا کرتا تھا۔"

"اس کے لیے انجام دیے جانے والے کاموں کی نوعیت کیا ہوا کرتی ہے؟"

"اس دنیا کے لیے تم بھی اتنے اجنبی نہیں ہو۔" اس کے لہجے میں اعتماد لوٹ آیا تھا۔" معاوضے پر عموماً وہی کام دوسروں سے کرائے جاتے ہیں جن میں پکڑے جانے کا زیادہ خطرہ ہو۔ بعض اوقات اس کے لیے چھوٹے موٹے کام بھی سر انجام دیے ہیں۔"

"اور اگر میں قاسم ہی سے نجات حاصل کرنا چاہوں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کم از کم میرے لیے یہ ناممکن ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔" میں اس کا بست پرانا نمک خوار ہوں۔"

"اس کے ساتھ تم کتنے آدمی ہو؟"

"مستقل تو بس مجھ ہی کو سمجھو، ضرورت کے تحت تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔"

"وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟" اچانک سلطان شاہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔" اس نمک حلال کو بھی اس کے آقا تک پہنچا دو، دونوں مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"قاسم کہاں ہے؟" وہ چونک کر بولا۔

"وہ بھی خود ہی چوہے دان میں آ پھنسا تھا، اپنے ستاروں کی گردش سے تم ہمارے ہاتھ لگ ہی گئے ہو تو اب ہمارے لیے ایک کام سر انجام دینا ہو گا، انکار کی صورت میں تمھیں اپنے فیصلے پر افسوس کرنے کی مہلت بھی نہ مل سکے گی۔"

"کیا کام؟" اس نے تشویش زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"جیوا ہاؤز کا نام تمھارے لیے اجنبی تو نہ ہو گا؟"

"وہی ڈیفنس والی عمارت؟" اس نے بے چینی کے ساتھ اپنے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے تائید طلب لہجے میں کہا اور میں نے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔" وہ تو بہت خوفناک عمارت ہے۔"

"تمھیں ہماری نگرانی میں وہاں گھسنا ہو گا۔ اندر تھوڑا سا ہنگامہ کرنے کے بعد تم آزاد ہو گے۔"

"یہ تو خودکشی ہی ہو گی۔" وہ اُلجھن آمیز لہجے میں بولا۔" جیوا ہاؤز کے بارے میں قاسم نے بتایا تھا کہ اس کے احاطے میں دن رات مسلح محافظ گشت پر رہتے ہیں، موقع محل دیکھ کر تو انھیں چوٹ دی جا سکتی ہے لیکن تمھاری نگرانی میں وہاں قدم رکھنا تو موت کو دعوت دینے کے برابر ہو گا۔"

"یہ سوچنا تمھارا کام ہے۔" میں نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔" قاسم میری جان کا دشمن ہو رہا ہے، تم سمجھ سکتے ہو کہ ایسی صورت میں تمھارے ساتھ میں کیا سلوک کروں گا۔"

"لیکن تم مجھے غیر مسلح کر چکے ہو۔" وہ تذبذب کے ساتھ بولا۔" اسلحہ کے بغیر میں جیوا ہاؤز میں اپنا دفاع بھی نہ کر سکوں گا۔"

"ہتھیار پر قابض ہونے کے بعد تمھاری نیت میں فتور بھی آ سکتا ہے!"

"پھر تم ہی مجھے بتاؤ کہ اندر گھسنے کے بعد میرا کیا حشر ہو گا۔ شاید ہنگامے کی نوبت آنے سے پہلے ہی جیوا ہاؤز کے محافظ مجھے اپنی گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیں گے۔"

خاصی بحث کے بعد ایک قابلِ عمل طریقۂ کار طے کر لیا گیا اور پھر ہم تینوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کرنل کو ہماری روانگی پر حیرت ہوئی تھی لیکن خلافِ معمول اس نے کوئی بحث نہیں چھیڑی۔

"شاید پہلے تم بھی قاسم کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے۔" راستے میں اپنے انجام سے بے خبر اس بدنصیب قیدی نے سوال کیا۔

"یہ اندازہ کیسے لگا لیا تم نے؟"

"پہلے بھی میں بارہا تمھارے تعاقب پر مامور کیا گیا تھا لیکن ہر بار تصادم سے گریز کی ہدایت دی گئی تھی، شاید قاسم اپنی تسلی کے لیے تمھاری نگرانی کراتا رہا تھا کہ کہیں تم اس کے مفادات کے خلاف نہ چلنے لگے ہو لیکن آج صبح سے اس کے تیور بدل گئے ہیں۔ شہر میں تمھاری تلاش میں بہت سے لوگ پھیلا دیے گئے ہیں جنھیں تشدد کی کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ تمھیں زندہ پکڑنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قاسم سے تمھاری چل گئی ہے۔"

اس نے اچانک ہی ایک نازک موضوع چھیڑ دیا تھا اور میرے ذہن کے کسی گوشے میں ایک تادیبی گونج ابھرنے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ قاسم کو تو موت کے گھاٹ ... م آثار کر راستے سے ہٹا دیا گیا تھا لیکن شہر میں اس کے چھوڑے ہوئے گرگے میری بُو پر لگے ہوئے تھے۔ ان کی سرگرمیاں معطل کرانے کے لیے ضروری تھا کہ قاسم کی موت کی تشہیر کی جاتی جب کہ دہانے میں فائر کر کے بھیجا اڑا دیے جانے کے باعث قاسم کی لاش شاید ناقابلِ شناخت ہو کر رہ گئی تھی۔

یونیورسٹی سے آگے، ایک ویرانے سے ناقابلِ شناخت لاش ملنے کی خبریں تو خوب اچھالی جاتیں لیکن جب دو تین روز بعد سرخ کر ولا یا کسی اور نشانی کے ذریعے قاسم کی لاش شناخت کی جاتی تو وہ خبر نہایت غیر محسوس انداز میں چھاپی جاتی اور اس کے حواریوں کو اپنے آقا کی موت کا علم ہونے میں کئی دن لگ سکتے تھے جب کہ میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

"قاسم براہِ راست آدمیوں سے کام لیتا تھا یا اس کا زیرِ زمین دنیا میں کوئی خاص رابطہ بھی تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"فردوس اس کا خاص آدمی تھا۔ اس کے مطالبے پر وہی قاسم کے لیے آدمی مہیا کرتا تھا۔"

"فردوس وہی تو نہیں جو لے بی سی بار کا منیجر ہوا کرتا تھا؟"

"وہی وہی۔" میرے شکار نے فوراً ہی تائید کی۔ "شراب کے امتناعی قوانین کے بعد بار کے دروازے پر تالے ڈالے جا چکے ہیں لیکن عقبی دروازہ زیرِ استعمال ہے، وہ بار آج بھی اسی دھوم دھام سے چل رہا ہے۔"

"تم بھی اسی کے ذریعے قاسم سے ملے تھے؟"

"میری کہانی ذرا مختلف ہے۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "رخشی میری بڑی بہن ہے، وہ قاسم کو ٹوٹ کر چاہتی ہے، اسی نے مجھے قاسم سے متعارف کرایا تھا۔"

"پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم اس کے موجودہ ٹھکانے سے لاعلم ہو؟"

"یہ معاملے بڑے نازک ہوا کرتے ہیں۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "رخشی میری بڑی بہن ہے اور بہت سرکش ہے۔ میں نے ہمیشہ ہی اس کے معاملات سے دور رہنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ قاسم سے شادی کر چکی ہے اور میں نے اس کے بیان کو تسلیم کر لیا۔ کبھی اس کی تصدیق کی کوشش نہیں کی، ایسے نازک رشتوں میں اگر کبھی کھوٹ آ جائے تو انسان اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ مجھے بس ایک ہی خیال سے تسکین ملتی رہی کہ وہ اپنے لیے زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھی اور میں اپنے لیے زندہ تھا۔"

"قاسم کو علم تھا کہ تم رخشی کے بھائی ہو؟" میں نے کار کا رُخ ایک طویل تر راستے کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

"وہ بہت محتاط آدمی ہے، اسے علم ہو جاتا تو شاید مجھے وظیفے کے طور پر تنخواہ دیتا رہتا لیکن مجھ سے کوئی کام ہرگز نہ لیتا۔ ہم نے رشتوں کو کبھی سامنے نہیں آنے دیا۔"

"لیکن تم آسمان سے تو نہ ٹپک پڑے ہو گے۔ تمہارا گھر بار، تمہارے والدین کون تھے اور کہاں تھے؟" اس کی کہانی سن کر مجھے اپنے زخم تازہ محسوس ہونے لگے۔ غنیمت یہ تھا کہ میں اپنی ماں کی اکلوتی اولاد تھا۔ میری نہ کوئی بہن تھی اور نہ بھائی ورنہ میں بھی رشتوں کا اسیر ہو کر ضمیر کو مدتوں پہلے نیلام کر چکا ہوتا۔

"سنا ہے کہ ہم کسی لکھ پتی کی اولاد ہیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "ماں ہمارے سامنے سسک سسک کر مر گئی لیکن باپ کا نام نہیں بتایا۔ اس بے چاری کو عشق نے راندۂ درگاہ کیا تھا، ہوس کو محبت سمجھ کر گھر چھوڑ بیٹھی تھی۔ وہ مر گئی اور آج رخشی اس کی کہانی دُہرا رہی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ قاسم نے اس سے شادی ہرگز نہ کی ہو گی لیکن وہ اپنے بھائی کے سامنے بھلا کیسے حقیقت کا اعتراف کر سکتی ہے۔"

"لیکن وہ ہے کہاں؟" میں نے پُرخیال لہجے میں سوال

"کہیں بھی ہو سکتی ہے۔" وہ پُرخیال مگر تلخ لہجے میں

"بھائی ہونے کے ناتے میری سوچ خود قیاس کر سکتے ہو، عورت تو جس چھت کے نیچے چاہے لے سکتی ہے۔"

"تمہارا احساس زندہ ہے، بڑی بہن غلط راستوں پر پڑی ہے، پھر تم زندہ کیسے ہو میرے دوست! تمہیں تو ... کو مار کر سکون سے سُولی چڑھ جانا چاہیے۔"

وہ تلخ انداز میں ہنسنے لگا۔ "یہ نہ سمجھنا کہ تم مجھے دھوکا ... میں کامیاب ہو گئے ہو، میں سمجھ چکا ہوں کہ مجھے زندہ چھوڑ ... مفادات کے خلاف ہے، تم چاہتے ہو کہ میں جیوا ہاؤز میں ... کی کوشش کرتے ہوئے وہاں کے محافظوں کے ہاتھوں مارا ... اور پھر وہ عمارت پولیس کی توجہ کا مرکز بن جائے۔ میں نے ... رہنے کے لیے ہر لمحے بڑی جانگسل جدوجہد کی ہے مگر اب ... ہو گیا ہے کہ میں پھنس چکا ہوں۔ میں فریب کے عالم میں ز... رہا لیکن مرتے ہوئے ہر فریب کا طلسم بکھیر دینا چاہتا ہوں ... مجھے معلوم ہے کہ تمہاری قاسم سے ٹھن گئی ہے، ہو سکتا ہے ... اسی کی کوئی عبرتناک شکست رخشی کی آنکھیں کھول سکے۔"

"تو تم مرنے کے لیے تیار ہو؟"

"شاید تیار رہی ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔ "میرا خیال تھا کہ ... کبھی دغا نہ دے سکوں گا کیونکہ رخشی نے اس کے چہرے پر ... محترم رشتے کا نقاب چڑھایا ہوا ہے لیکن آج تم سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میرے دل میں اس کے خلاف ... کا ایک جہنم دہک رہا ہے۔ مرنا تو ہر ایک کو ہے، اگر مرتے ہوئے کسی مقصد کی آڑ بھی مل جائے تو کیا برا ہے۔"

میں کچھ نہ بولا، وہ بھی خاموش ہی رہا۔

رات کے سناٹے میں کار کے انجن کا شور کسی یکساں ... شور کی طرح تسلسل کے ساتھ گونجتا رہا اور اس بار کار جیوا ... کی طرف بڑھتی رہی۔

جب تک وہ غزالہ کے گھر میں ہمارا اسیر تھا، میرے ... دل میں اس کے لیے قہر اور نفرت کے کوندے لپکتے ر... لیکن راستے میں اس نے جو کچھ باتیں کیں انھوں نے میرے ... میں اس کے لیے ہمدردی کی جوت جگا دی تھی۔ میرا دل ... کہ اسے قاسم کی ہلاکت کی خوشخبری سنا دوں لیکن میں ہمت نہ کر سکا۔

میری وسیع تر کامیابی کے لیے اس کی ہلاکت ناگزیر ... اور اگر اسے قاسم کی موت کا علم ہو جاتا تو شاید اس کے دل ... یک بیک زندگی سے محبت کا جذبہ موجزن ہو جاتا اور وہ جیوا ہاؤز میں بیباکانہ انداز میں موت کو گلے لگانے سے انکاری ہو جاتا۔

"تمہاری بدترین نفرت کا مرکز کون ہے؟ رخشی یا قاسم؟" میں نے موت کے سے گمبھیر سکوت کو توڑنے کے لیے سوال کیا کیونکہ اس وقت بھی جیوا ہاؤز کی مسافت پانچ سات منٹ سے کم نہ تھی۔

"اتنی کھلی کھلی گفتگو کے بعد ایسا شرمناک سوال تمہیں زیب نہیں دیتا۔" اس کی آواز ملامت آمیز تھی۔ "رخشی لاکھ بُری سہی لیکن وہ میری بہن ہے، ایک عورت ہے جسے بہت زیادہ آزادی حاصل نہیں ہوتی، قاسم نے شاید اس کی کمزوریاں بھانپ کر اس کا استحصال کیا، اسے کچھ سبز باغ دکھائے اور آج وہ اسی کے دکھائے ہوئے راستے پر چل رہی ہے۔"

"اور اگر آج کی رات قاسم کا پتا ہی صاف کر دیا جائے تو تمہارا ردِعمل کیا ہو گا؟"

"آج پہلی بار میں نے اپنے دل کو ٹٹولا ہے۔ مجھے بے اندازہ خوشی ہو گی، اس کی موت کے بعد شاید رخشی زیادہ حقیقی انداز میں اپنے مسائل کے بارے میں سوچ سکے۔"

"مگر وہ ہے کہاں میرے دوست؟" میں نے سوال کیا۔

"تم یقین کرو کہ مجھے معلوم نہیں۔" اس نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "اس وقت تمہارے ساتھ صریحاً خودکشی کی نیت سے جیوا ہاؤز کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر مجھے ذرا بھی علم ہوتا تو میں ضرور بتا دیتا۔ اگر تم میں ذرا بھی انسانیت موجود ہے تو رخشی کو ایک کھلونے کے بجائے اس کے حقیقی پس منظر میں دیکھو گے۔ وہ لاکھ بری اور قابلِ ملامت سہی لیکن اس کے اندر کی عورت اسی وقت سامنے آ سکے گی جب اسے قاسم کی موت کا یقین ہو جائے گا۔"

کار میں ایک بار پھر گمبھیر خاموشی چھا گئی۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ میں نے اس مظلوم قیدی کے بارے میں جو کچھ سوچا، وہ کہاں تک درست تھا۔ وہ بے چارا مجبور اور محصور میرے رحم و کرم پر تھا، موت کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ اس نے ہر بات اُگل دی تھی۔ اپنی بہن رخشی سے لے کر قاسم تک ہر کردار کی اصلیت اور ڈرامے میں شرکت کا اعتراف کر بیٹھا تھا، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اس نے اپنی زندگی کا ہر راستہ مسدود کر کے میرے لیے کامیابیوں کی راہ کھول دی تھی۔

میری کار۔ بلکہ کرنل زوار زیدی کی سالخوردہ کار ڈیفنس کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ عقبی نشست پر نہ صرف سلطان شاہ خاموش تھا بلکہ قیدی بھی خاموش ہی تھا۔ پھر آخر کار میں نے اپنی کار جیوا ہاؤز کے پھاٹک سے ذرا آگے گزر کر فٹ پاتھ کے کنارے روک دی۔

قیدی کی سرسراتی ہوئی آواز کار میں گونجی۔ "فی امان اللہ۔"

مجھے صدمہ سا ہوا کہ ایک قاتل اور مجرم بھی اپنے انجام کو لبیک کہتے ہوئے ان ہی کلمات کا سہارا لینے پر مجبور تھا جو مظلوم اور معصوم لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

کار سے اُتر کر وہ جیوا ہاؤز کے آہنی پھاٹک کی طرف بڑھا پھر شاید اس نے پھاٹک پر دستک دی کیونکہ فضا میں آہنی ارتعاش کی آواز بلند ہوئی۔

بڑے پھاٹک کے بجائے ذیلی دروازہ کھلا، اس میں ایک انسانی ہیولا نظر آیا جو دستک دینے والے کے مقابل جما رہا پھر دستک دینے والا اچانک ہی لہرانے لگا۔ شاید اسے کسی شدید ضرب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

میں نے بے دریغ دستک دینے والے، لہراتے ہوئے ہیولے پر فائر کر دیا اور اپنی کار تیزی سے آگے بڑھاتا چلا گیا۔

چند منٹ بعد میں ایک ویران پبلک بوتھ سے پولیس کو اس حادثے سے باخبر کر رہا تھا۔ میں نے صرف اسی قدر بتانے پر اکتفا کیا تھا کہ جیوا ہاؤز کے پھاٹک پر دو فریقوں میں خونریز فائرنگ کا تبادلہ جاری تھا اور قرب و جوار کے مکینوں کی زندگیاں بدترین خطرات سے دوچار تھیں۔

اس کے بعد نتائج کا مشاہدہ کرنے کے لیے وہاں نہیں رُکا تھا بلکہ تیز رفتاری کے ساتھ غزالہ کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

وہ واقعہ چونکہ صبح سویرے پیش آیا تھا لہٰذا صبح کے اخبارات میں اس کے بارے میں کوئی خبر موجود نہیں تھی۔ اسی طرح یونیورسٹی کے قریب قاسم کی لاش کے بارے میں بھی کوئی اشارہ نہ تھا۔

غزالہ کو میں نے پچھلی رات کے واقعات سے من و عن آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن کرنل زوار زیدی سے میں کنی کترا رہا تھا اور اس سے اس موضوع پر گفتگو کی نوبت ہی نہ آنے دی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس بارے میں وہ غزالہ سے بات کرنے کے بجائے مجھ سے تبادلۂ خیال کو ترجیح دے گا یا پھر سلطان شاہ کو گھیرنے کی کوشش کرے گا لہٰذا میں سلطان شاہ کو ساتھ لے کر گھر سے روانہ ہو گیا۔

تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں اسی رات لاہور جانے والی نائٹ کوچ پر دو نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس مرحلے پر میری دانست میں غزالہ کو ساتھ لینا خطرات کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

نشستوں کی بکنگ کے بعد واپس لوٹتے ہوئے ہاکروں کے شور سے اندازہ ہوا کہ شہر میں شام کے اخبارات ہنگامہ خیز خبروں کے ساتھ شائع ہو چکے تھے۔ میں نے ایک ٹریفک سگنل پر ہاکر سے شام کے تینوں مقامی اخبارات خرید لیے۔

سلطان شاہ انگریزی سے نابلد تھا اور میں ڈرائیونگ میں مصروف تھا لہٰذا وہ اخبارات ہوٹل پہنچنے تک میری گود میں ہی پڑے رہے۔ اس بار میں نے غزالہ کے گھر کے بجائے ایئرپورٹ کے نواح میں واقع ہوٹل کا رُخ کیا تھا جہاں میں پچھلی شام ہی ایک کمرہ کرلئے پر حاصل کر چکا تھا۔

کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے شام کے اخبارات کا جائزہ لیا تو چیختی چنگھاڑتی سرخیوں میں دو واقعات نمایاں تھے، جن کے پس پردہ میرا ہاتھ کارفرما تھا۔

یونیورسٹی سے ذرا آگے، ویران سڑک کے کنارے سرخ کرولا کے قریب جھاڑیوں سے ایک ناقابل شناخت لاش برآمد ہوئی تھی، جسے گوشت خور کتوں اور بھیڑیوں نے مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ دوسری طرف پولیس نے کسی نامعلوم کال پر بھاگ دوڑ کی تو ڈیفنس کے پرسکون علاقے میں جیوا ہاؤز نامی عمارت سے ایک لاش برآمد ہوئی تھی۔ جیوا ہاؤز کے محافظوں کے بیان کے مطابق متوفی نے زبردستی عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی پھر محافظوں کی کسی بازپرس سے پہلے ہی باہر سے ایک بے خطا فائر ہوا اور متوفی نے ان کے سامنے گر کر دم توڑ دیا۔

خبر کا سنسنی خیز پہلو یہ تھا کہ پولیس نے جائے واردات پر پہنچی تو متوفی کی لاش جائے وقوعہ سے عمارت میں گھسیٹی جا چکی تھی۔

لاش کی اس غیرقانونی چھیڑ چھاڑ کے بارے میں جیوا ہاؤز کے محافظ کوئی معقول جواب نہیں دے سکے تھے۔

”یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔“ خبروں کا خلاصہ سُن کر سلطان شاہ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

”یہی تو غلط فہمی ہے تمھاری۔“ میں نے فراخدلانہ لہجے میں کہا۔ ”سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جیوا ہاؤز کی عمارت پولیس کی نگاہوں میں آگئی ہے اور اب توقیر کو واپس لوٹنے کی ہی سُوجھے گی۔“

”اور آج ہم بھی لاہور جا رہے ہیں؟“ اس نے استفسار طلب لہجے میں کہا۔

”پہلے میرا ارادہ غزالہ کو لے جانے کا تھا لیکن اب تمھیں لے جاؤں گا۔ فی الحال اس کی گوشہ نشینی ہی بہتر رہے گی۔ لاہور میں جو کچھ کرنا ہوگا، وہ وہیں جا کر طے کیا جائے گا۔“ اس نے کہا۔

”ظاہر ہے۔ میری کوشش تو یہی ہوگی کہ اوّلین فرصت میں توقیر اور تصویر پر ہاتھ ڈال سکوں، اصل صورتِ حال تو وہاں جانے کے بعد ہی سامنے آسکے گی۔“

”لیکن ابھی تک ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔“ اس نے مجھے یاد دلایا۔ ”پہننے کے کپڑوں کا بھی کال پڑا ہوا ہے۔ خالی ہاتھ جہاز پر چڑھے تو بلاوجہ نگاہوں میں آجائیں گے۔“

اس کی بات معقول تھی۔ میں نے اسے ساتھ لیا اور مہاں سے روانہ ہو گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ واپسی میں کرنل کی کار گھر پر چھوڑنے کے ساتھ ہی غزالہ وغیرہ سے بھی الوداعی ملاقات ہو جائے گی۔

بظاہر مہم آسان تھی لیکن اس کے مضمرات مہلک بھی ہو سکتے تھے اور میں شہر چھوڑنے سے پہلے اپنا ہر حساب بیباق کرنا چاہتا تھا تاکہ بعد میں کوئی خلش باقی نہ رہے۔

سلطان شاہ لاہور روانگی کے خیال سے بہت مگن تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی کھلنڈرے بچّے کو اس کا پسندیدہ کھلونا ملنے کی نوید دے دی گئی ہو لیکن میری نگاہوں میں وہ مہیب خطرات منڈلا رہے تھے جو توقیر یا تصویر سے ان کے اپنے شہر میں تصادم مول لینے کی صورت میں جنم لے سکتے تھے۔

غزالہ کے گھر پہنچتے ہی وہی ہوا جس سے میں گریز کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے باپ نے پھاٹک ہی پر مجھے خوش آمدید کہا۔ اس وقت وہ اپنی بیوی کے ساتھ لان پر کرسیاں ڈالے بیٹھا ہوا تھا اور غزالہ شاید اندر تھی۔ میں گاڑی سے اترا تو کرنل نے پھاٹک بند کرتے ہوئے مجھے وہیں لان پر بیٹھنے کی دعوت دی جو ناچار مجھے قبول کرتے ہی بنی کیونکہ کرنل اس وقت وہاں اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ غزالہ کی ماں بھی موجود تھی اور پچھلے چند دنوں میں مجھے اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ دکھی دل عورت میرے رویّے میں بے اعتنائی محسوس کر کے مزید اداس ہو جائے۔ اپنے پس منظر اور اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی تلخیوں نے شمع کو بہت حسّاس بنا دیا تھا لیکن اپنے ردِعمل کے اظہار میں وہ ہمیشہ تحمل سے کام لیتی تھی کیونکہ اپنی کوکین خوری کی عادتِ بد کے باعث اس کے دل میں سنگین احساسِ جرم پرورش پا کر اس حد تک پختہ ہو چکا تھا کہ وہ بظاہر خود کو ہر جائز اور ناجائز ملامت کا سزاوار سمجھنے لگی تھی۔ ہر تلخی کو اپنی پھیکی سی مسکراہٹ میں گھول کر پی جاتی تھی مگر میں جانتا تھا کہ ایسے مواقع پر وہ اندر سے ضرور افسردہ ہو جاتی ہوگی۔

”تم اندر کمرے میں چلو، میں ابھی آتا ہوں۔“ میں نے سلطان شاہ سے کہا اور خود لان کی طرف بڑھ گیا۔

”کہاں ہو بیٹے، تمھیں تو دیکھنے کو ہماری آنکھیں ترس گئی ہیں؟“ شمع نے مجھے سلام کے جواب میں دعائیں دیتے ہوئے کہا۔

”چشمہ لگا کر دیکھا کرو۔“ کرنل نے ہلکا سا قہقہہ مار کر کہا۔ ”میری تو روز ملاقات ہو رہی ہے تنویر سے۔“

”غزالہ بتا رہی تھی کہ تم کل رات یہیں تھے۔“ وہ اپنی بڑی بڑی خوابناک نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کر کے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ کچھ پریشان سے ہو تم؟“

”ن... نہیں، پریشانی کی تو کوئی بات نہیں۔“ کرنل کے بجائے شمع کو گلے پڑتے دیکھ کر میں گڑبڑا گیا۔ ”سوچا تھا کہ دو چار روز یہاں رہ لوں گا، میرے گھر میں مرمّت وغیرہ ہو رہی ہے۔“

”دوسرا کون ہے تمھارے ساتھ؟“ اس نے ایسے عارفانہ لہجے میں سوال کیا جیسے مجھے جتا رہی ہو کہ میرے بتلائے بغیر وہ اپنے قیاسات کے سہارے صورتِ حال کا صحیح اندازہ کر سکتی ہے۔

”تنویر کا ایک مُنہ چڑھا نوکر ہے۔“ میرے جواب دینے سے پہلے کرنل بول پڑا اور میں دل ہی دل میں غصّے سے کھول کر رہ گیا۔ اس ایک معاملے میں کرنل کی کھوپڑی میں شاید کوئی بنیادی فتور واقع ہو چکا تھا اور وہ میرے بار بار کے اعتراض اور وضاحت کے باوجود سلطان شاہ کے مرتبے میں کوئی اضافہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”تنویر کے ساتھ ہر وقت سائے کی طرح لگا رہتا ہے، یہ خوشامدی لوگ اپنے آزمودہ حربوں سے ہوشیار سے ہوشیار آدمی کے بھی دل میں جگہ بنا لیتے ہیں اور اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔“

”وہ اُلّو سیدھا نہیں کر رہا کرنل صاحب!“ میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ ”وہ حقیقی معنوں میں میرا دستِ راست ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ بعض معاملات میں میں اس کا احسان مند رہا ہوں۔“

”چلو دوست اور دستِ راست ہی سہی۔“ شمع موقع کی نزاکت بھانپ کر دخل انداز ہوتے ہوئے بولی۔ ”لیکن وہ تمھارے ساتھ کیوں ہے؟“ پھر کسی خیال کے تحت فوراً ہی اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اس کے یہاں آنے یا رہنے پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ مجھے خوشی ہے کہ تم اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگے ہو لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کسی غیرمعمولی صورتِ حال کے رُونما ہوئے بغیر تم اسے ہرگز اپنے ساتھ یہاں نہ رکھتے اور میں یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ تم کرنل صاحب کی کار استعمال کر رہے ہو... یہ نہ بھولو بیٹے! کہ میرا ذہن پوری طرح جاگتا رہتا ہے، تمھاری ہر الجھن کو ہم اپنی پریشانی سمجھتے ہیں۔ تمھارے بالوں کی بدلی ہوئی رنگت بھی بہت کچھ کہہ رہی ہے۔“

”ارے بھئی ہیں کچھ الجھنیں۔“ کرنل نے میری مدد کے لیے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا اور پھر گویا شمع پر اپنی اہمیت جتانے کے لیے بولا۔ ”اب تم تنویر کی الجھنیں جان کر کیا کرو گی، مردوں کے معاملات ہیں، ان میں نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں، دو چار روز میں ہم لوگ سب ٹھیک کر لیں گے۔“

”بس بس میں یہی جاننا چاہ رہی تھی۔“ وہ مسکراتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ ”ہم کو تنویر میاں کا ہاتھ بٹانا چاہیے میں دیکھ رہی ہوں کہ یہ پریشان ہیں۔ اگر انھوں نے آپ کو اعتماد میں لیا ہوا ہے تو ٹھیک ہے، مجھے کوئی فکر نہیں۔“

”جاؤ۔ تم تھک گئی ہوگی۔“ کرنل نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اندر جا کر آرام کرو، میں ذرا تنویر سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

کرنل کا وہ فرمان سنتے ہی میں پریشان ہو گیا۔ شمع کی آڑ میں اس وقت مجھے کھسکنے کا موقع مل گیا تھا اور وہ غالباً گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں مجھ سے تفصیلی گفتگو کرنے کے لیے بے چین تھا۔ میں نے وہیں لان میں بیٹھے بیٹھے پُرامید نظروں سے عمارت کے برآمدے کی طرف دیکھا لیکن وہاں سناٹا تھا۔ اس وقت صرف غزالہ کی آمد ہی مجھے کرنل کی زبانی جرح سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

”کامران سے کب ملے تھے تم؟“ شمع نے اپنی کرسی میں پہلو بدلتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

”کل۔“ میں نے صفائی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ”کل ہی کرنل صاحب بھی اس سے ملنے گئے تھے، ابھی تک تو وہ دواؤں کے زیرِاثر زیادہ وقت بے ہوشی کے عالم میں گزارتا ہے، کوئی دورے کی کیفیت طاری نہیں ہوئی ہے لیکن صحیح اثرات چند ہفتوں کے بعد ہی سامنے آسکیں گے۔ اس سے پہلے کچھ کہنا مشکل ہے۔“

”آپ گئے تھے کل وہاں؟“ شمع نے شکایت آمیز لہجے میں اپنے شوہر سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے نہایت سعادت مندی کے ساتھ اقرار

کرلیا۔" گھر سے ارادہ کرکے نکلا ہوتا تو تمھیں بھی ساتھ لے جاتا، تنویر نے تو مجھے بھی دو تین روز کے لیے ادھر جانے سے منع کیا تھا لیکن میں باہر گیا تو دل نہ مانا اور علاج گاہ جا پہنچا... بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں نے تنویر کا مشورہ قبول نہ کرکے ایک سنگین غلطی کی تھی۔"

"لیکن کیوں؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوگئی۔ "وہاں جانے پر کیوں پابندی ہے؟"

"یہ تو ڈاکٹر ہی جانتا ہے، میں نے اس کی ہدایت کرنل صاحب تک پہنچا دی تھی۔" میں نے بے چارگی کے ساتھ کہا۔

کرنل مجھے گھورنے لگا۔ شاید وہ اپنی بیوی کو پورا قصہ بلا کم و کاست سنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ قدرے توقف کے بعد وہ پھر اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "اگر تم رات کو بے سُدھ نہ سو رہی ہوتیں تو تمھیں اندازہ ہوتا کہ تنویر کا مشورہ کس قدر برمحل تھا۔"

"رات کیا ہوا تھا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "مجھ سے معموں میں بات نہ کریں، صاف صاف بتائیں۔ جب کامران سارا دن دواؤں کے اثر سے بے ہوش رہتا ہے تو کسی کے جانے یا نہ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

کرنل کا منہ کُھلا لیکن میں جلدی سے بولنے لگا اور وہ میرا مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ میں نے فوراً ہی ایک فی البدیہہ کہانی شروع کردی۔ "کامران کی بے ہوشی مسلسل نہیں ہے۔ اسے وقفوں کے ساتھ دوائی دی جاتی ہے، ہوش میں آتا ہے تو خورد و نوش کے ساتھ اس کی دوسری ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ اس کا نفسیاتی علاج کیا جاتا ہے اور وہ پھر سو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسے اپنے ماحول سے بالکل الگ رکھنا چاہتا ہے۔ اگر ہوش میں آنے پر کامران کو کوئی شناسا چہرہ نظر آ جائے تو علاج میں دشواریاں پیدا ہوسکتی ہیں، اس کے لاشعور کی گرہیں اور اُلجھ سکتی ہیں۔"

"شعور، لاشعور، تحت الشعور اور بے شعور سب خرافات ہیں۔ مجھے ان سے کوئی غرض نہیں، بس میرا بچّہ تندرست ہونا چاہیے جس دن وہ مجھے ماں کہہ کر پہچان لے گا، میں سمجھوں گی کہ مجھے اپنی کھوئی ہوئی کائنات واپس مل گئی۔" پھر یک بیک چونک کر بولی۔ "لیکن وہ رات کی بات پھر رہ گئی۔"

"اسے چھوڑو۔" کرنل گہرا سانس لے کر بولا۔ "رات گئی، بات گئی، بس ہنگامہ ہی کھڑا ہوگیا تھا۔"

"اب تو میں ضرور سنوں گی۔" وہ کسی ضدی بچّے کی طرح بولی۔ "کیسا ہنگامہ تھا، کس نے کھڑا کیا تھا؟"

"کرنل صاحب آپ کو چڑا رہے ہیں۔" میں نے پُر مسکراہٹ کے ساتھ بات سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "صرف اتنی سی بات ہے کہ رات ڈاکٹر، کرنل صاحب سے شکایت لے کر آیا تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ مریض کے متعلقین اگر تعاون نہ کریں تو معالج ایسے پیچیدہ مریض کا کوئی کامیاب علاج نہیں کرسکتا، میں نے سمجھا بجھا کر اسے رخصت کردیا تھا۔"

"یہ تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔" شمع مسکراتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں ڈر گئی تھی، نجانے کیا ہنگامہ تھا؟ کون گھس آیا تھا گھر میں۔ جوان بیٹے بیٹی کے باپ ہیں مگر مذاق اب تک نہیں گیا مزاج سے۔" وہ یہ کہتی ہوئی عمارت کی طرف چل دی۔

"یہ کیا چکّر شروع کردیا تم نے؟" شمع کے جاتے ہی کرنل نے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔ "شمع سے آج تک میں نے کوئی بات نہیں چھپائی ہے، وہ اچھے وقت کے ساتھ میرے بُرے وقت کی بھی ساتھی رہی ہے۔"

"اگر بتانے سے کوئی فائدہ ہو تو مجھے قائل کردیں، میں خود ان سے اپنے جھوٹ کا اعتراف کرکے ٹھیک ٹھیک واقعات سے آگاہ کردوں گا۔" میں نے اسے سنجیدہ پاکر خشک لہجے میں کہا۔

"قائل کردوں۔" وہ احمقانہ لہجے میں بولا۔ "قائل کرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے؟ باہمی اعتماد بھی کوئی چیز ہوتی ہے یا نہیں۔ وہ میری بیوی ہے اور میرا فرض ہے کہ اسے یہاں سے پوری طرح باخبر رکھوں۔"

"پھر ضرور بتادیں، پوری کہانی سن کر ان کی راتوں کی نیند اُڑ جائے گی۔" میں نے بے پروائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"اپنا نشہ لینے کے بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتی ہے... خیر وہ بعد کی بات ہے، یہ بتاؤ کہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟ وہ کون لوگ ہیں جو تمھارے دشمن ہو رہے ہیں؟"

"میری کچھ خطرناک لوگوں سے ٹھن گئی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے منشیات فروشوں کے ایک بڑے اور منظم گروہ سے ٹکر لے لی ہے اور اب وہ مجھے راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔"

"اسی لیے تم نے اپنا گھر چھوڑ دیا ہے؟" اس نے مستفسرانہ لہجے میں کہا۔

"چھوڑا نہیں ہے بلکہ اسے جلا کر راکھ کردیا گیا ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اوہ! تو وہ اخبارات میں تمھارے ہی مکان کا قصہ چھپ رہا تھا۔" اس کی آنکھیں حیرت سے پیشانی پر جا چڑھیں۔ "تو تم نے اب تک مجھے کیوں اندھیرے میں رکھا؟ اخبارات میں تو کسی قاتل اور اسمگلر کا حوالہ تھا۔"

"وہ خبر میں نے ہی پولیس کو دی تھی کیونکہ اس وقت منشیات فروشوں کا سرغنہ میرے گھر میں موجود تھا۔"

"اس کا وہاں کیا کام تھا؟" میرے انکشافات اس کی حیرت میں اضافہ کرتے جارہے تھے۔

"میری تلاش کے علاوہ اور کیا مقصد ہوسکتا تھا مگر میں بروقت ہوشیار ہوگیا اور وہ مکان میں آگ لگا کر پولیس کے نرغے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسے کسی طرح علم ہوگیا ہے کہ کامران کو میں نے ہی علاج کے لیے داخل کرایا ہے لہٰذا کامران کی نگرانی شروع کرادی گئی۔ میں نے اسی اندیشے کے تحت آپ کو ادھر جانے سے منع کیا تھا پھر آپ نے دیکھ ہی لیا کہ آپ کا پیچھا کرتا ہوا، ایک آدمی کل رات یہاں آگھسا۔ اگر ہم سب حاضر دماغی سے کام نہ لیتے تو وہ کامیاب ہوگیا تھا۔"

"تم اسے کہاں لے گئے تھے؟"

"اسے سرغنہ کے ایک خفیہ ٹھکانے میں گھسنے پر مجبور کیا تھا۔"

"اس سے کیا حاصل ہوا تمھیں؟" اس کے چہرے پر تجسّس گہرا ہوتا جارہا تھا۔

"سرغنہ کو صرف یہ جتانا چاہ رہا تھا کہ میرے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔ اگر وہ میرے گھر میں گھس سکتا ہے تو میری رسائی بھی اس تک ہوسکتی ہے لیکن اس کے ٹھکانے پر حفاظتی انتظام اتنا مضبوط ہے کہ ہمارا قیدی اندر گھسنے سے پہلے ہی پھاٹک پر محافظوں کی گولی کا نشانہ بن گیا اور اب پولیس اس قصّے کی چھان بین کررہی ہے۔"

اس وقت کرنل سے گلو خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی، اس کے ذہن میں میری طرف سے شبہات سر اُبھارنے لگے تھے۔ ایسے موقع پر اگر میں اسے ٹالنے کی کوشش کرتا تو وہ میری طرف سے بدظن ہوسکتا تھا۔ ویسے بھی پچھلی رات اس کے سامنے قاسم کے ایک آدمی سے ٹکراؤ کے بعد بات خاصی کُھل چکی تھی، لہٰذا میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اپنے کسی جرم کا اعتراف کیے بغیر اسے زیادہ سے زیادہ تفصیلات سے آگاہ کردیا جائے۔ اسی فیصلے کے تحت میں نے قیدی کے قتل کا الزام محافظوں کے سر ڈال دیا تھا تاکہ اگلے دن کے اخبار میں اگر مقتول کی کوئی تصویر شائع ہو تو اس معاملے میں میری طرف سے کرنل کا ذہن بالکل صاف ہو۔

جب تک کرنل کو اپنے ہر سوال کا تسلی بخش جواب نہ مل گیا اس وقت تک وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اسی موضوع میں اُلجھا رہا۔ آخر مطمئن ہونے کے بعد اس نے ایک نازک سوال کر ڈالا۔ "غزالہ ان سب واقعات سے کس حد تک باخبر ہے؟"

"شاید تھوڑا بہت اندازہ ہے اسے۔" میں نے سوچ سمجھ کر جواب دیا۔ "منشیات کے خلاف نفرت تو پہلے بھی موجود تھی میرے ذہن میں لیکن اس نفرت کو ایک مشن کا رُخ اسی وقت نصیب ہوا جب میری غزالہ سے ملاقات ہوئی۔"

"ہوں۔" اس نے حلق سے غراہٹ نما آواز نکالتے ہوئے تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔ "اس نے شمع اور کامران کی کہانی سنائی ہوگی تم کو... لیکن تم دونوں عقل سے بالکل کورے ہو۔ اس مشن میں مجھ سے بڑا ساتھی تم کو رُوئے زمین پر نہ مل سکے گا۔ تمھیں اور اسے ابتدا ہی میں مجھے اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔"

"اعتماد!" میں نے ہلکے سے دُہرایا۔ "بُرا نہ منائیں تو میں کہنا چاہوں گا کہ میری مداخلت سے پہلے تو شاید غزالہ آپ دونوں سے بہت دور تھی جب رشتوں کے اعتماد ہی کو ٹھیس لگی ہوئی ہو تو دوسرے مسائل پس پُشت چلے جاتے ہیں۔ اسے تو یہ تک نہیں بتایا گیا تھا کہ کامران کا ذہنی توازن بگڑنے کی وجہ کیا تھی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ بوجھل لہجے میں بولا۔ "ہم جو فصل بوتے ہیں وہی کاٹنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ ایک آفاقی کلیہ ہے جسے ہر ایک، دوسرے انسانوں پر بڑے اعتماد کے ساتھ چسپاں کردیتا ہے لیکن اپنی ذات کو اس سے مستثنےٰ سمجھتا ہے، ہم نے غزالہ پر اعتماد نہیں کیا اور وہ ذہنی طور پر ہم سے دور ہوتی چلی گئی، ہم تو شاید اس کا اعتماد اس حد تک کھو بیٹھے تھے کہ وہ ماں باپ سے محبت کے بجائے دھیمی دھیمی سی نفرت کرنے لگی تھی اور یہ سب کوکین کی لعنت ہے۔ شہر شہر میں اور کوچے کوچے میں تمھیں ہزاروں منشیات خور ملیں گے جو جانتے بوجھتے اپنی جانوں کو ہلاکت کا روگ لگائے چلے جارہے ہیں لیکن میرا گھرانہ ان سب میں سے

عجیب ہے۔ شمع کوکین کی عادی ہے اور ایک زندہ لاش کی طرح میرے ساتھ جیے جا رہی ہے کامران نا سمجھی میں کوکین کی زیادہ مقدار کھا کر پاگل ہو گیا۔ بیٹی برسہا برس اپنے والدین سے بدظن رہی... ایک نشے نے میرے پورے گھر کو الیوں کی آماجگاہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ ان حالات میں مجھ سے بڑا منشیات کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟"

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا!" میں نے سگریٹ سُلگانے کے بعد کہا۔ "یہ اچھی بات ہے کہ میں کُھل کر کام کر سکوں گا، آپ کے مشورے میرے لیے رہنما ثابت ہوں گے۔ اتنی بڑی مہم میں کہیں نہ کہیں میں ضرور تنہائی کا شکار ہو جاتا۔"

"بس ایک چیز ذرا پریشان کُن ہو گی میرے لیے" وہ تشویش زدہ لہجے میں بولا۔

"وہ کیا؟" میں نے ہمہ تن گوش بن کر نیاز مندانہ لہجے میں سوال کیا لیکن وہ بولا تو میری کھوپڑی بھنا گئی اور اس وقت پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ بظاہر سمجھدار اور معقول نظر آنے والے لوگ بھی بعض خاص معاملات میں بہکے ہوئے ہوتے ہیں۔

"وہی تمہارا ملازم۔ کیا نام ہے اس کا؟" وہ سادگی کے ساتھ کہہ رہا تھا شاید سلطان شاہ کی اہمیت گھٹانے کے لیے اس کا نام تک لینا گوارا نہیں کیا تھا۔ "اب جب میرے اور تمہارے درمیان کوئی پردہ نہیں رہا ہے تو اس پر اتنا زیادہ انحصار کرنا مناسب نہیں ہو گا، میرا خیال ہے کہ اسے حساب کتاب کر کے الگ ہی کر دو۔"

"میں اسے ایک پیسا بھی نہ دوں تو بھی وہ میرا ساتھ نہیں چھوڑے گا کرنل صاحب!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "آپ اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں، میرے لیے اس کی افادیت بہت زیادہ ہے وہ میرے لیے بہتیرے ایسے کام کر گزرتا ہے جن کے لیے شاید آپ اور میں ہفتوں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکیں۔"

"خیر اب میں آئندہ اس مسئلے پر زبان نہ کھولوں گا۔" کرنل نے میرے جواب پر مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "میں اس جیسے لوگوں کی فطرت سے خوب واقف ہوں۔ تمہاری کمزوریاں بھانپ کر اس نے تمہیں اپنا عادی بنا لیا ہے اور جب کوئی شخص دوسرے کی عادت یا مجبوری بن جائے تو علیحدگی ناممکن ہو کر رہ جاتی ہے، شمع کوکین کی عادی ہے اور تم سلطان شاہ کے عادی ہو گئے ہو۔ یہ خیال رکھنا کہ کسی دن وہ کوئی بڑی چوٹ دے کر ایک دم لاپتا نہ ہو جائے۔"

میں نے غصّے کے اظہار میں اَدھ جلی سگریٹ ... کر جوتے سے مسل دی۔ ابتدا میں مَیں خود ہی اس مسئلے پر ... رکھنے کا عہد کر رہا تھا اور آخر میں پھر ایک مشورہ دے ... اس کی سوچ میں جو بنیادی ٹیڑھ آ چکی تھی اسے سیدھا ... شاید خود اس کے بس سے باہر تھا کیونکہ کتّے کی دم کبھی ... ہوتی نہیں دیکھی۔

میں خاموش ہی رہا۔ کرنل نے شاید میری ناگواری ... بھانپ لی اور فوراً ہی وہاں سے اُٹھ گیا۔ "آؤ! اندر آ جاؤ ... جائے بیٹھیں گے۔"

ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی وہ مجھے چھوڑ کر ... اندر روپوش ہو گیا اور میں غزالہ کی تلاش میں چاروں طرف ... نگاہیں دوڑاتا کامران کے کمرے کی طرف ہو لیا۔ میرے اندازے کے مطابق سلطان شاہ وہیں موجود تھا لیکن غزالہ کو اس کے ساتھ محو گفتگو دیکھ کر مجھے شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔

"میں باہر انتظار کرتے کرتے اُکتا گیا اور تم یہاں ... گپّیوں میں مصروف ہو۔"

"میں ڈیڈی کو آپ سے گفتگو کا موقع دینا چاہ رہی تھی، صبح سے میں ان کے سوالات سنتے سنتے تنگ آ گئی ... اسی لیے یہاں سلطان شاہ سے تازہ ترین صورت حال کا خُلاصہ سن رہی تھی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کرنل کے سوالات کے جواب میں کیا کہا تم نے؟" ... نے وہیں ایک کرسی سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

"کہتی ہی کیا؟ بس آپ کے نجی معاملات سے لاعلمی کا اظہار کرتی رہی۔ کچھ کہہ بیٹھتی تو آپ کے لیے اسے ... دشوار ہو جاتا۔ ویسے آپ کے مذاکرات کیسے رہے ...؟"

"میں نے انھیں تقریباً سب کچھ ہی بتا دیا ہے ... اور توقیر کے رشتے کے ساتھوں نے جاننا چاہا تھا کہ تم ان ... حالات سے کہاں تک واقف ہو تو میں نے یہی کہا ... کی بات مختلف ہے ورنہ میری زبان سے کبھی کوئی بات ... تک نہیں پہنچی۔" اسی کے ساتھ میں نے اسے پوری گفتگو کا خلاصہ سنا ڈالا اور وہ مطمئن نظر آنے لگی۔

"آپ دونوں آج رات لاہور جا رہے ہیں؟" ... خاموش ہونے پر اس نے سوال کیا۔

"ہاں، میں اسے زیادہ مہلت نہیں دینا چاہتا۔" ... نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ جیوا ہاؤز ... پھاٹک پر رخشی کے بھائی کے قتل نے توقیر کو حواس باختہ ... نہیں تو پریشان ضرور کر دیا ہو گا اور وہ یہاں قیام کو طول ... کے بجائے چند روز کے لیے لاہور لوٹ گیا ہو گا۔"

"لاہور میں آپ اسے کہاں تلاش کریں گے؟ پچھلی بار پوری کوشش کے باوجود آپ لاہور میں بڑی ماں اور اپنے سوتیلے بھائیوں کا سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ اس بار تو آپ کے اور ان دونوں کے درمیان کھلی لڑائی ہے انھیں بھنک بھی مل گئی تو وہ پوری وحشیانہ قوت کے ساتھ وار کریں گے۔"

"ذہن میں ایک مبہم سا خاکہ ہے اسے آخری صورت لاہور پہنچ کر ہی دے سکوں گا۔ ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ سے مجھے بہت امید ہے، اس ادارے کے سہارے میری رسائی کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔"

"نصیر خان بھی کام آئے گا۔" سلطان شاہ نے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ میں ٹی اے ملک کے مختار عام کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "اسے ہم نے اسی شرط پر زندہ چھوڑا تھا کہ وہ ہمارے لیے کام کرتا رہے گا۔"

"میں اسے بھولا نہیں ہوں، وہ میری بساط کا ایک اہم مُہرہ ہے لیکن دیکھنا یہ ہو گا کہ ابھی تک اس کی حیثیت برقرار ہے یا وہ معزول و معتوب ہو چکا ہے۔ ایسے دھندوں میں قریبی حلقے کے لوگ اچانک ہی گردش میں آتے ہیں۔ ان کا انجام عام طور پر حیران کُن اور عبرتناک ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ نصیر خان اس انجام سے دوچار نہ ہوا ہو۔"

"ڈیڈی کو تو آپ نے معالج کا بہانہ کر کے سمجھا دیا۔" چند ثانیوں کے فکر انگیز سکوت کے بعد غزالہ نے زبان کھولی۔ "لیکن مجھے بتا دیں کہ کامران سے ملنے میں کیا خطرہ ہے؟"

"کامران پر نگاہ رکھی جا رہی ہو گی، ادھر کا رُخ کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ تم ان کی نگاہوں میں آ جاؤ گی جب تک سارے شبہات زائل نہ ہو جائیں، ادھر کا رُخ بھی نہ کرنا وہاں اس کی بہت اچھی دیکھ بھال کی جا رہی ہے۔ خرچ کے معاملے میں چھوٹ مل جانے پر اکبر بھی اس پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔"

"لیکن کامران کا قصّہ تو قاسم تک محدود تھا۔ آپ نے اسے راستے سے ہٹا دیا۔ اس کا آدمی جو کامران کے ملاقاتیوں کی نگرانی پر مامور تھا وہ بھی یہاں گرفتار ہو کر جیوا ہاؤز کے پھاٹک پر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ پھر اب کون وہاں نگرانی کر رہا ہو گا؟"

"شاید تم سلطان شاہ سے یہی سمجھنا چاہ رہی تھیں۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "اگر بات اتنی ہی ہو تو مجھے بے حد خوشی ہو گی لیکن سلطان شاہ یہ بتانا بھول گیا کہ رخشی قاسم سے بہت قریب تھی۔ اگر کامران کا معاملہ قاسم نے اپنی موت سے پہلے رخشی کو بتا دیا تھا تو اپنے محبوب کی موت کے بعد وہ انتقام کی آگ میں جل رہی ہو گی۔ وہ عام گھریلو عورت نہیں ہے بلکہ تنظیم کے لیے کام کرتی رہی ہے، وہ کامران پر نگاہ رکھے گی۔ اس بارے میں شبہات صاف کیے بغیر پیش قدمی خطرناک ہو گی، زندگی رہی تو لاہور سے واپسی پر اس معاملے کو کسی طرح نمٹانے کی کوشش کروں گا۔"

کہنے کو تو میں غزالہ سے وہ سب کہتا چلا گیا لیکن رخشی کے انتقام کا ذکر آتے ہی میرے ذہن میں ایک ہولناک کوندا سا لپکا اور میں جُھرجُھری سی لے کر رہ گیا۔ رخشی حسین اور مکّار ہونے کے ساتھ ہی سنگدل اور سفّاک بھی تھی بہت جلد غصّے میں آ جانا اس کے مزاج میں شامل تھا۔ اگر قاسم نے مرنے سے قبل اسے بتا ہی دیا تھا کہ کامران کو ایڈکشن کیور سوسائٹی کی معرفت اکبر کی علاج گاہ میں مَیں نے داخل کرایا تھا تو قاسم کی موت کے بعد وہ اپنی تمام تر توجہ کامران پر ہی مرکوز کر دیتی کیونکہ ان دنوں قاسم میرے پیچھے لگا ہوا تھا اور رخشی کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا قطعی دشوار نہ ہوتا کہ قاسم کی موت میرے ہاتھوں واقع ہوئی ہوتی وہ مغلوب الغضب عورت تھی۔ اسے کامران کی ذات سے، شکار کے لیے ڈالے ہوئے چارے سے زیادہ دلچسپی نہ ہوتی۔ وہ دو چار دن انتظار کرتی اور جب کامران کی عیادت کے لیے کوئی بھی ادھر کا رُخ نہ کرتا تو جھنجلا کر وہ انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے بے ہوش کامران کو کسی بھی بہانے سے اس کے کمرے میں بآسانی ختم کر سکتی تھی۔ اس کے اس اقدام کا جواز بہت قوی ہوتا کیونکہ کامران کی موت کے بعد مَیں خود یا کامران کے رشتے داروں میں سے کوئی لاش کی بازیابی کے لیے سامنے آنے پر مجبور ہو جاتا اور رخشی کا کام سہل ہو جاتا۔ کامران کی موت کے ذریعے وہ مجھ تک رسائی حاصل کر سکتی تھی اور اگر وہ ایسا کر گزرتی تو میرے پاس زندگی بھر کے پچھتاوے کے سوا کچھ باقی نہ رہتا۔ غزالہ زبان سے خواہ کچھ نہ کہتی لیکن کامران کے قتل کے بعد اس کے لیے بھی کڑیاں ملانی دشوار نہ ہوتیں۔

غزالہ کچھ کہتی رہی جو میرے پلّے نہ پڑ سکا۔ اس وقت میرا ذہن گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، مجھے اپنے خیالات میں گم دیکھ کر سلطان شاہ اس سے گفتگو میں مصروف ہو گیا تھا۔ ادھر میں جتنا غور کرتا رہا، اسی ایک نتیجے کو سامنے پایا کہ اگر رخشی میرے اور کامران کے تعلق سے واقف تھی تو اس کے

صبر کو آزمانا حماقت کے مترادف ہوتا۔ اس مسئلے کو فوری طور پر حل کرنا ضروری تھا ورنہ فاترالعقل کامران کا خون میری گردن پر سوار ہو جاتا۔

سارے معاملے کا کٹھن پہلو یہ تھا کہ زخشی میرے اور کامران کے تعلق سے واقف بھی ہوتی تو براہِ راست خود نگرانی کا خطرہ مول نہ لیتی۔ اپنے مقتول بھائی کے بقول وہ عورت تھی اور جہاں چاہے پناہ لے سکتی تھی، بالکل اسی کُلیے کے تحت وہ زیرِ زمین دنیا کے جس آدمی سے چاہتی، کام لے سکتی تھی کیونکہ قدرت نے اسے صورت کے ساتھ سراپا کا حسن بھی بہت فیّاضی کے ساتھ عطا کیا تھا۔ اگر معاملہ زخشی کے لیے کام کرنے والے کی گرفت پر ٹھپ ہو کر رہ جاتا تو خطرات مزید بڑھ سکتے تھے راستہ صاف ہونے کی واحد صورت یہی تھی کہ براہِ راست زخشی پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل سکے۔

"آج رات لاہور جانے کا ارادہ ملتوی سمجھو!" طویل سکوت کے بعد میں نے غزالہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کامران کا معاملہ توقیر سے زیادہ اہم ہے۔ اسے نمٹانے کے بعد ہی کچھ سوچا جائے گا۔"

"یہ ایک دم پروگرام کیسے بدل گیا آپ کا؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔ "یا تو آج رات لاہور جا رہے تھے اور اب یک بیک کامران کا خیال آگیا ہے... آپ میری وجہ سے اپنی ترجیحات میں ردّو بدل نہ کریں۔ جہاں اتنے دن دل پر پتھر رکھا ہے تو دو چار دن اور کامران کو دیکھے بغیر گزار لوں گی، آپ بتا ہی چکے ہیں کہ وہاں اس کی گھر سے کہیں بہتر دیکھ بھال ہو رہی ہے پھر ہمیں حد سے زیادہ فکرمندی کی کیا ضرورت ہے؟"

"شاید تمھیں نہ ہو مگر مجھے ہو گئی ہے۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "بات چل نکلی ہے تو اب اپنے منطقی انجام کو پہنچ کر ہی ختم ہو گی، میں دو چار دن کے لیے بھی کامران کو اپنے امکانی دشمنوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ طویل انتظار اور ناکامی پر جھلّا کر وہ کوئی گھٹیا حرکت بھی کر سکتے ہیں۔"

"ایسا تو نہیں کہ آپ زخشی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہوں؟" اس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "لاکھ مجرم سہی مگر ہے وہ ایک عورت ہی، شاید اس حد تک نہ جا سکے جو آپ سوچ رہے ہیں۔"

"معاملہ کامران کا ہے، کوئی ہوش مند آدمی ہوتا تو کسی وار سے خود بھی اپنا بچاؤ کر سکتا تھا، اس کے معاملے میں میں کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔ ایک فیصد امکان کو بھی نظر انداز نہیں کروں گا۔"

"لیکن آپ کیا کر سکیں گے؟" اس نے اُلجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔" میں نے بات ختم کرنے کی نیّت سے کہا۔ "اس بارے میں کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہ ہو سکے گا، حالات کے مطابق فوری فیصلہ کرنا ہو گا۔"

"کیوں نہ جہانگیر کو ٹٹولا جائے؟" سلطان شاہ نے زبان کھولی۔ "اس درمیان میں جو کچھ ہوا ہے اُس پر اس کا ردِعمل سامنے آئے گا تو شاید کوئی بات سمجھ میں آسکے۔"

"کامران والے قصّے سے تو اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" غزالہ بولی۔ "توقیر اور تنظیم کے بارے میں ضرور کچھ اندازہ ہو سکے گا۔"

سلطان شاہ احمقانہ انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ "یہ تو بھول ہی گیا تھا۔"

"لیکن پھر بھی میں تمھارے مشورے پر عمل کروں گا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے ذہن میں شروع سے یہ خدشہ پرورش پا رہا ہے کہ توقیر جس غلط فہمی کی بنا پر زخشی کی جان کا دشمن ہوا تھا وہ دور ہو چکی ہے دوسری طرف توقیر اپنے کئی ساتھیوں سے محروم ہو چکا ہے۔ تنظیم کا ڈھانچہ برقرار رکھنے کے لیے اسے قابلِ اعتماد ساتھیوں کی ضرورت ہے جب کہ زخشی بڑی حد تک دیکھی بھالی اور آزمودہ عورت ہے۔ کہیں وہ دوبارہ تنظیم میں شامل نہ کر لی گئی ہو۔"

"ایسا ہوا تو دشواریاں بڑھ جائیں گی۔" غزالہ تشویش زدہ لہجے میں بولی۔ "سہارا مل جانے کے بعد وہ اپنی تمام تر توجہ کامران پر مرکوز کر دے گی...!"

"زیادہ نہ سوچو۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "محض زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلے گا۔ میں ابھی جہانگیر سے بات کیے لیتا ہوں، اس وقت وہ گھر پر ہی ہو گا۔"

یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ گیا فون پر نمبر ملاتے ہی دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"کیا فون کے سرہانے ہی بیٹھے ہوئے تھے؟" میں نے جہانگیر کی آواز پہچان کر خوش دلی کے ساتھ کہا۔

"اوہ! تم ہو۔" دوسری طرف سے ایک گہرے سانس کے ساتھ کہا گیا۔ "میں بہت بے چین تھا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تم سے کہاں اور کیسے رابطہ قائم کروں، تمھارے دفتر والے تو کچھ بتاتے ہی نہیں۔"

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے جہانگیر ڈیئرسٹ" میں نے ہلکا سا قہقہہ مار کر کہا۔ "لیکن تمھاری بے چینی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آسکی... تمھاری دو ٹوک باتیں سن کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ اے ٹو نے تمھارا خون سفید کر دیا ہے۔"

"وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گہری نیند سے اٹھا ہے، سرد اور سپاٹ لہجے سے اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کب خوش ہے اور کب ناراض..."

"تو مجھے تلاش کر کے اسے خوش کرنا چاہ رہے تھے؟"

"بکواس مت کرو!" مانوس لہجے میں اس کی غراہٹ سنائی دی۔ "وہ اس قدر غیر متوقع طور پر میرے سامنے آیا تھا کہ میں بدحواس ہو گیا اور ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا، تم یقین نہیں کرو گے کہ جتنی دیر میں اس کے ساتھ رہا، خود کو ایک چلتی پھرتی لاش سمجھ رہا تھا۔ ان حالات میں اس نے تمھارے خلاف جو کچھ کہا وہ کچھ اس طرح میرے ذہن میں پیوست ہو گیا جیسے وہ میرے اپنے خیالات ہوں، اسی رو میں میں نے تم سے ساری بات کی تھی کیونکہ اس وقت اے ٹو شہر میں تھا اور مجھ پر اس کا خوف سوار تھا۔"

"اس کا مطلب ہوا کہ اب وہ شہر چھوڑ چکا ہے؟"

"وہ کل ہی لوٹ گیا... لیکن تم نے میری بات نہ مان کر اچھا نہیں کیا۔"

"کون سی بات کا ذکر کر رہے ہو؟ تم نے تو اچھی خاصی تقریر کر ڈالی تھی۔ کوئی ایک آدھ بات میرے ذہن سے بھی پھسل گئی ہو گی۔" میں نے اس کے بدلتے ہوئے رویّے پر دل میں خوشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تاکید کی تھی کہ قاسم کو نہ چھیڑنا اور تم نے اس کا پتّہ ہی صاف کر دیا۔"

"اس بارے میں تم پر آنچ بھی نہ آسکے گی، میں اسے تمھارے گھر سے ہانک کر بہت دور لے گیا تھا۔"

"وہ میرا دیکھا بھالا تھا، اس سے ایک سمجھوتہ ہو گیا تھا، جانتے ہو اب کس نے اس کی جگہ لی ہے؟"

"بھلا میں کیسے جان سکتا ہوں؟"

"زخشی کو قاسم کی جگہ دے دی گئی ہے مجھے بہت محتاط رہنا ہو گا۔"

"خاصی خوبصورت اور زندہ دل ہے، تمھارا وقت اچھا گزرے گا، بس ذرا بھابی کو ہوا نہ لگنے دینا اس کی۔" میں نے قہقہہ مار کر کہا۔ میں اسے یہ تاثر دینا چاہ رہا تھا کہ تنظیم سے ٹکر لینے کے باوجود میں حالات سے ذرا بھی خائف نہیں تھا۔ "ایک دو ملاقاتوں میں اسے بھی تفصیل سے دیکھ بھال لینا، وہ تمھارے لیے نسبتاً سہل ثابت ہو گی کیونکہ قاسم کے سازشی منصوبے میں وہ بھی برابر کی شریک تھی۔" پھر میں نے چونک کر سوال کیا۔ "بڑی بے فکری سے اپنے فون پر کھل کر باتیں کر رہے ہو۔ کیا اب گفتگو سنے جانے کا ڈر دل سے نکل گیا ہے؟"

"وہ سب اضطراری ردِعمل تھا۔" ریسیور پر اس کی خفّت آمیز آواز سنائی دی۔ "وہ ڈرامائی انداز میں سامنے آیا تھا چہرہ نقاب میں تھا پھر میری لاعلمی میں میرے گھر میں آ گھسا اور اسی طرح واپس بھی چلا گیا... تم خود سوچو کہ میری جگہ ہوتے تو تمھاری کیا حالت ہوتی؟"

"سب تمھارے سامنے ہے، میرے تو ساتھ رہا ہے وہ میرے گھر میں۔"

"نہیں!" اس کی بے ساختہ آواز سنائی دی۔

"بالکل! وہ میرا مہمان بن کر رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ آخری لمحے تک مجھے اس کی اصلیت کا اندازہ نہ ہو سکا ورنہ وہ میرے ہاتھوں سے بچ نہ پاتا۔"

تم بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہو... اسے پوری شدّت سے تمھاری تلاش ہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو محسوس کیا کہ تمھارے ساتھ میرا رویّہ نامناسب تھا۔ وہ سب کچھ سہی لیکن ہے تو ہم جیسا ایک انسان ہی۔ اس سے کسی آسیب کی طرح ڈرنا بے سود ہے۔ آج وہ اچانک تمھارے خون کا پیاسا ہو گیا ہے کل میری بھی باری آسکتی ہے۔ طارق بے چارہ تو خیر اس کا لقمہ بن ہی گیا۔ پھر اس کے مفادات کے لیے ہمیں آپس میں بگاڑ پیدا کرنے سے کیا فائدہ ہے؟"

"تمھارے اقوالِ زرّیں سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ اب تم بالغوں کے سے انداز میں سوچنے لگے ہو لیکن مجھ سے میرا ٹھکانہ نہ پوچھ بیٹھنا، میں تم پر اب آنکھ بند کر کے بھروسا نہیں کر سکتا۔"

"ٹھکانے سے میرا کیا واسطہ۔" اس نے فوراً ہی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں میل جول تو ترک کرنا ہی ہو گا۔ نہ جانے کب نگاہوں میں آ جائیں، ہاں فون نمبر ضرور دے دو تاکہ ضرورت پڑنے پر رابطہ قائم کر سکوں۔"

"نہیں دوست!" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "فون نمبر

اور ٹھکانہ ایک ہی بات ہے۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب میں اس حماقت کا ارتکاب ہرگز نہیں کروں گا۔ کیا پتا کہ کل پھر اے ٹو کراچی آکر تمھارے سر پر مسلط ہوجائے اور ایک مرتبہ پھر تمھارا دماغ میری طرف سے سنک جائے اور تم مجھے تھالی میں سجا کر اس کے حضور پیش کر دو۔ یہ غلطی نہیں ہوگی ہاں میں خود ہی تم کو فون کرتا رہوں گا... یہ میرا وعدہ ہے۔"

"جیوا ہاؤز والے قصے میں بھی شاید تمھارا ہی ہاتھ تھا؟" اس نے بحث کو طول دیے بغیر فوراً موضوع بدل دیا۔

"جو میری طرف ہاتھ بڑھائے گا، میں اس کے گریبان کے چیتھڑے اڑا ڈالوں گا، وہ میرے گھر میں گھسا تھا اور میں نے اسے اے ٹو کی چوکھٹ پر موت کے گھاٹ اتار دیا..."

"تم واقعی بہت چھپے ہوئے ہو۔" اس کے گہرے سانس کی آواز سنائی دی۔" اس وقت اے ٹو وہیں مقیم تھا۔ جیوا ہاؤز کے محافظوں نے اس خیال سے لاش اندر گھسیٹی تھی کہ خاموشی کے ساتھ اسے کہیں دفن کر کے خون کے نشانات صاف کر دیں گے۔ فائر کے بارے میں پوچھ گچھ کی نوبت آئی تو انجان بن جائیں گے۔ ویسے بھی اس علاقے میں یہ تعین کرنا دشوار ہوتا کہ فائر کہاں ہوا ہوگا مگر خلافِ توقع پولیس فوراً ہی وہاں آ پہنچی اور اب دشواریاں کھڑی ہوگئی ہیں۔ تم کہتے ہو کہ وہ شخص تمھارے گھر میں گھسا تھا لیکن ہم سب کے لیے وہ اجنبی ثابت ہوا ہے۔ جیوا ہاؤز میں اے ٹو کی موجودگی کے باعث حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے اسی لیے نورے نے دستک کے جواب میں پھاٹک پر ایک اجنبی کو دیکھتے ہی اس کی کھوپڑی پر ضرب لگائی تھی لیکن اس کے گرتے گرتے گولی چلی اور اپنا کام دکھا گئی، نشانہ تمھارا بھی بے خطا ہوتا ہے۔"

"یہ تمھاری رخشی خانم کہاں مل سکے گی؟" میں نے سرسری لہجے میں سوال کیا۔

"پتا نہیں، ابھی تک اس سے رابطہ نہیں ہوا میرا، دوپہر ہی میں اسے ٹو نے اس کے تقرر کی خبر دی ہے۔"

"تو کیا اسے قاسم کے انجام کی اطلاع مل گئی تھی؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں — شہر چھوڑنے سے پہلے اسی نے مجھے بتایا تھا، میرا اندازہ ہے کہ وہ ہم لوگوں پر ہی انحصار نہیں کرتا بلکہ یہاں اس کے اپنے بھی کچھ روابط ہیں، مگر تمھیں ایک دم رخشی کیسے یاد آگئی؟"

"جیوا ہاؤز کے پھاٹک پر مرنے والے کی لاش دیکھی تھی اس نے؟" میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

"عجیب بات کرتے ہو۔" اس کی آواز میں چڑچڑا پن عود کر آیا۔" بتا رہا ہوں کہ اس کے تقرر کی خبر دوپہر میں ملی ہے۔ اس سے میرا رابطہ نہیں ہوا پھر وہ لاش کیسے دیکھ لیتی اور لاش سے اس کا تعلق بھی کیا، وہ تو اب پولیس کی تحویل میں ہے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ اس کا کھوج لگاؤ اور اسے سرکاری مُردہ خانے پہنچنے کا مشورہ دو، ایسا نہ ہو کہ اس کا بھائی لاوارث قرار دے کر خیراتی کھاتے میں دفنا دیا جائے۔"

"رخشی کا بھائی؟" وہ شدید حیرت سے چیخ پڑا تھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تمھیں کیسے علم ہوا اس رشتے کا؟"

"میں نے باقاعدہ باز پرس کی تھی اس سے، وہ قاسم کے لیے کام کرتا تھا اور اسی کے ایما پر میری تلاش میں نکلا ہوا تھا، وہ نہ مارا جاتا تو شاید اس کے ذریعے میں مار لیا جاتا۔"

"تم اپنے دشمنوں کی تعداد بڑھاتے جا رہے ہو۔" میری وضاحت کے بعد اس کی آواز سے جوش کافور ہوگیا۔" تنظیم سے تصادم ایک الگ بات ہے لیکن تم نے رخشی سے ذاتی پرخاش بھی مول لے لی ہے۔ ایک ہی رات میں تم نے اس کے بھائی کے علاوہ محبوب کا بھی خون کیا ہے۔ شاید اے ٹو اس بات سے واقف ہے، اسی لیے اس نے رخشی کو اپنے ساتھ ملایا ہے۔ اے ٹو اس کے انتقامی جذبے سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

"لیکن اے ٹو کا رخشی سے رابطہ کیسے ہوگیا کہ اس نے لاہور سے رخشی کے تقرر کا حکم جاری کر دیا؟"

"میں نے بتایا نا کہ اسے کسی ذریعے سے قاسم کے انجام کی خبر بھی مل گئی تھی، شاید شہر میں اس کے کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ ان ہی کے ذریعے رخشی سے بھی رابطہ ہوگیا ہوگا۔"

"یہ تم... آج اتنی بے فکری سے باتیں کیسے کر رہے ہو؟" میں نے اچانک ہی چونک کر سوال کیا۔" بھابی کہاں ہیں؟"

"خدا کا شکر ہے کہ اب رفتہ رفتہ اس کی تنہائی دور ہوتی جا رہی ہے، کسی سہیلی کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی ہے ورنہ تو واقعی بات کرنا دشوار ہوجاتی۔"

"ٹھیک ہے، پھر میں دو ایک روز میں فون کروں گا۔"

"وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔" واپس آکر میں نے غزالہ اور سلطان شاہ کی استفسار طلب نگاہوں کے جواب میں تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔" جہانگیر سے بات کرنا مفید ثابت ہوئی، آج ہی رخشی کو باقاعدہ تنظیم میں شامل کر لیا گیا ہے۔"

"جہانگیر آج کیسے مہربان ہوگیا؟" غزالہ نے پوچھا۔

"اپنے پچھلے رویّے پر نادم تھا۔ اے ٹو سے اچانک سامنا ہوجانے پر بوکھلایا ہوا تھا لیکن اب اسے اندازہ ہوگیا ہے کہ میری ہی طرح کسی وقت اس کی بھی باری آسکتی ہے۔"

"یعنی لاہور جانے کا پروگرام اب ملتوی ہی ہوگیا؟" سلطان شاہ نے سوال کیا۔

"ہاں۔ بدقسمتی سے جہانگیر کا ابھی تک رخشی سے کوئی رابطہ نہیں ہوا ورنہ میں براہِ راست اس سے دو ٹوک بات کر لیتا۔ اب ذرا لمبے طریقۂ کار پر عمل کرنا ہوگا۔"

غزالہ نے میرے پروگرام کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا چاہی لیکن میں نے اسے ٹال دیا اور پھر سلطان شاہ کو ساتھ لے کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

اپنے حلیے میں چند نمایاں ظاہری تبدیلیوں کے باعث مجھے پورا یقین تھا کہ رخشی سمیت کوئی بھی شناسا مجھے دور سے پہلی نظر میں نہیں پہچان سکے گا اس لیے میں نے کوئی نیا سوانگ رچانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ گلشنِ اقبال میں اکبر کی علاج گاہ تک پہنچتے ہوئے میں نے پورے پروگرام کی جزئیات سلطان شاہ کو ذہن نشین کرا دی تھیں پھر میں نے اسے علاج گاہ سے کچھ دور کار سے اتار دیا اور وہ پیدل ہی اس طرف روانہ ہوگیا۔ اسے وہاں پہنچ کر کامران کو دیکھنا تھا اور اسپتال کے عملے سے اس کے بارے میں دو چار سوالات کر کے باہر لوٹ آنا تھا۔ میں نے اپنی کار علاج گاہ سے کچھ دور ایسی جگہ روک لی جہاں سے میں علاج گاہ کے پھاٹک سے آنے جانے والوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا اگر میری طرف کوئی خاص طور پر متوجہ نہ ہوتا۔

اس پروگرام کو طے کرتے ہوئے میرے ذہن میں ایک موہوم سا خطرہ موجود تھا کیونکہ تو قیر سے بچنے کے لیے میں زخمی سلطان شاہ کو گھر سے اسی علاج گاہ میں لے آیا تھا مگر بعد میں قاسم کے مذموم عزائم کا اندازہ لگانے کے بعد ہم دونوں کو ہنگامی طور پر وہاں سے ایمبولینس لے کر فرار ہونا پڑا تھا۔ گو ایمبولینس جناح اسپتال کے احاطے میں چھوڑ دی گئی تھی لیکن علاج گاہ میں سلطان شاہ کی شناخت مسائل کھڑے کر سکتی تھی۔ جب وہ وہاں سے میرے ساتھ فرار ہوا تو ڈریسنگ کی وجہ سے ناقابلِ شناخت ہو کر رہ گیا تھا۔ اس وقت کے مقابلے میں اس کے زخم تیزی سے مندمل ہوئے تھے لیکن چہرے اور پیشانی پر نشانات واضح تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس بنا پر اسے پہچانا نہ جا سکے گا، دوسری طرف سلطان شاہ نے اس مسئلے کا ذکر ہی نہیں چھیڑا تھا۔ وہ دلیری اور وفاداری کا مفہوم ہی کچھ اور سمجھتا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ یہی سوچ رہا ہوگا کہ کہیں اس کی زبان سے کسی امکانی دشواری کا ذکر سن کر میں یہ نہ سمجھ بیٹھوں کہ وہ اس مہم سے دامن بچانا چاہ رہا ہے۔

اس مقام پر سلطان شاہ کے نمودار ہونے کا انتظار کرتے ہوئے مجھے وہ اندیشے کچھ زیادہ ہی قوی محسوس ہونے لگے۔ سلطان شاہ کے مقابلے میں شاید میری ذات زیادہ محفوظ تھی۔ سر کے بالوں کی رنگت سے وضع قطع تک ہر شناخت میں تبدیلی رونما ہوچکی تھی اور محض خدوخال کی بنا پر میرا پہچانا جانا شاید ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسی طرف روانہ ہوگیا، جدھر سے سلطان کو وہاں پہنچنا تھا۔ دور سے کار پہچانتے ہی وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گیا۔" اندر آجاؤ۔" میں نے گاڑی اس کے قریب روکتے ہوئے کہا۔ اور اس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پسنجر سیٹ سنبھال لی۔

"کیا پروگرام منسوخ ہوگیا؟" کار کے حرکت میں آتے ہی اس نے متحیرانہ لہجے میں سوال کیا۔

"منسوخ نہیں، کچھ تبدیل ہوا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔" یہاں سے ایمبولینس لے کر فرار ہونے والا قصہ ابھی زیادہ پرانا نہیں ہوا ہے۔ تمھارے چہرے پر زخموں کے تازہ نشانات کی بنا پر تمھارے ہاتھوں زک اٹھانے والے ایمبولینس ڈرائیور یا اسپتال کے عملے کے کسی فرد نے تمھیں پہچان لیا تو تم دشواریوں میں پڑ جاؤ گے۔"

"مجھے خود بھی یہ خیال آیا تھا۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ تم پروگرام بنا رہے ہو تو اس پہلو پر بھی غور کر لیا ہوگا۔ اپنی زبان سے خطرے کا اظہار کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔"

"تم نرے احمق ہی ہو۔" میں نے کہا۔ "میں نے سوچا ضرور تھا لیکن اس معاملے کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی — منزل پر پہنچ کر اپنی غلطی کا اندازہ ہوا اور میں واپس لوٹ آیا، اب تم کار میں رہو گے، تمھاری جگہ میں اندر جاؤں گا۔"

"یہ تو اس سے بھی بُرا ہوگا۔" اس نے بلا تامّل کہا۔ "صرف بال رنگ لینے سے تم بچ نہیں سکو گے اور اگر رخشی خود وہاں موجود ہوئی تو تمھیں پہلی ہی نگاہ میں پہچان لے گی۔"

"ان میں سے کوئی پہچان لے تو فرق نہیں پڑتا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اس چال کا مقصد بھی یہی ہے کہ اگر کوئی کامران پر نگاہ رکھ رہا ہے تو وہ سامنے آنے پر مجبور ہو جائے۔"

"اور اگر تمھیں پہچان کر انھوں نے اسپتال ہی میں قصّہ نمٹانے کا فیصلہ کر لیا تو میں باہر ہاتھ پر ہاتھ رکھے انتظار ہی کرتا رہ جاؤں گا اور وہ ہاتھ جھاڑ کر صاف نکل جائیں گے۔"

"علاج گاہ کو اس حد تک ملوّث کرنا ناممکن ہوگا، ایسا صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب اکبر خود اس گروہ کا سرگرم رکن ہو، بس تمھیں باہر رہ کر آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی۔"

"باہر رہ کر آنکھیں کھلی رکھنے سے کچھ بھی نہ ہوگا۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "کامران کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہے۔ ان میں سے کسی کو اگر یہ اچھوتا خیال سُوجھ گیا تو کامران کے کمرے میں بے خبری میں تمھاری کھوپڑی پر ضرب لگا کر تمھیں بے ہوش کر دے گا اور اسپتال کے عملے کو بتائے گا کہ تم کامران کے حملے کا شکار ہوئے ہو پھر تم بند ایمبولینس میں اغوا کر لیے جاؤ گے اور میں آنکھیں کھولے کھولے سوکھ جاؤں گا۔ پتا بھی نہ چل سکے گا کہ تم کب اور کہاں لے جائے گئے ہو۔"

"تمھیں سُوجھی دور کی ہے۔" مَیں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمھارا خیال ہے کہ میں بالکل ہی بودا ثابت ہوں گا۔"

"یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" اس نے بوکھلا کر جلدی سے وضاحت کی۔ "بے خبری میں وار کیا جائے تو ساری دلیری اور ہوشیاری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ یہ دُو بدُو مقابلے کی باتیں ہیں۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے فیصلہ اسی پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

"ہم دونوں ہی الگ الگ رہتے ہوئے اندر گھسیں۔" اس نے تجویز پیش کی۔ "تم اندر چلے جانا، میں احاطے میں منتظر رہوں گا۔ اس طرح کوئی بھی گڑبڑ میری نظر سے نہ بچ سکے گی۔ اگر تم زیر ہی کر لیے گئے تو کم از کم احاطے تک تو لائے ہی جاؤ گے۔"

"یہ بات کچھ معقول لگتی ہے۔" میں نے کار ایک گلی پر موڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ یاد رکھنا کہ ناگزیر صورتِ حال پیدا ہوئے بغیر تم سامنے آنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

اس بار میں ایک جگہ ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر اتر گیا اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔ میں نے رک کر سگریٹ سلگائی اور پھر آہستہ آہستہ علاج گاہ کی طرف چل دیا۔

احاطے میں داخل ہو کر میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا تو کرنل کی کار ایک گوشے میں کھڑی نظر آئی۔ غالباً سلطان شاہ ڈرائیونگ سیٹ پر ہی جما ہوا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا اور کسی کی توجہ کا مرکز بنے بغیر کامران کے فلور پر پہنچ گیا۔ اس علاج گاہ میں تمام یا کم از کم چند کمرے ضرور ایسے تھے جن کو اندر سے بولٹ یا مقفل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شاید یہ بندوبست خطرناک ذہنی مریضوں کے لیے رکھا گیا تھا کہ کہیں وہ جنون میں آکر.... کمرے میں محبوس نہ ہو جائیں اور خود کو شدید نقصان پہنچا بیٹھیں۔ ایسے کمروں میں عملے کے اراکین بلا روک ٹوک اندر داخل ہو سکتے تھے اور شاید اسی وجہ سے اس فلور پر مستعد عملہ رکھا گیا تھا جو فلور پر پہنچنے والے ہر ملاقاتی کا سوالیہ نظروں کے ساتھ استقبال کرتا تھا تاکہ ملاقاتی کسی دوسرے مریض کی خلوت میں دخل انداز نہ ہو سکے۔

نرس کو کامران کا نام بتا کر میں اس کے کمرے کی طرف چل دیا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر میں بلا توقف اندر داخل ہوا تو فوری طور پر ایک خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔

کامران کے بستر کے قریب ہی کرسی ڈالے ایک خوبصورت درمیانی عمر کی نرس گود میں رنگ برنگی مختلف چیزیں لیے بیٹھی تھی اور کامران کے ہاتھ میں گتّے کے چند چھپے ہوئے ٹکڑے موجود تھے جنھیں بستر کی شفاف چادر پر جوڑ کر غالباً وہ کوئی تصویر یا خاکہ مکمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری مداخلت پر وہ دونوں ہی اپنی محویت سے چونک کر میری طرف متوجّہ ہو گئے تھے۔

نرس ہوش مند تھی لہٰذا اس کی نگاہوں میں مچلتی ہوئی زندگی کی چمک میرے لیے کوئی خاص مفہوم نہیں رکھتی تھی لیکن کامران دیوانہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں مَیں نے ہمیشہ ہی دہشت ناک بے رونقی اور ویرانی رچی ہوئی دیکھی تھی لہٰذا اس کی آنکھوں میں ناگواری کے ساتھ زندگی کی چمک دیکھ کر میرے دل میں اکبر کے لیے تشکر کا احساس اُمڈ آیا۔

کامران کوکین کا مارا تھا اور برسوں سے اس ایک غلطی کا عذاب سہہ رہا تھا کہ اس نے اپنی ماں کی لاعلمی میں کوکین کی بھاری مقدار کھا لی تھی مگر اس وقت وہ نرس کے ساتھ جس انداز میں کھیل میں منہمک تھا وہ میرے لیے بہت حوصلہ افزا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اپنے محبوب شغل میں اسے میری مداخلت ناگوار گزری ہے۔

"ہیلو کامران! کیا حال ہے؟" میں نے آگے بڑھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

نرس اپنی گود میں رکھی ہوئی چیزیں میز پر ڈال کر اٹھ چکی تھی۔ کامران نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے نرس کی طرف دیکھا پھر اس کی سرسراتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "یہ کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟"

"تم سے ملنے آئے ہیں، خود ہی پہچاننے کی کوشش کرو۔" نرس نے مسکراتے ہوئے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" اس نے اچانک دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں تھام لیں۔ "میرا سر پھٹ رہا ہے... میں مر جاؤں گا، میں مر جاؤں گا، تم سب پاگل ہو، چلے جاؤ یہاں سے۔"

"سب جا رہے ہیں، تم ذہن پر زور نہ دو۔" نرس نے جلدی سے اسے سہارا دے کر لٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور میں نے بڑھ کر بستر پر پڑے ہوئے رنگین ٹکڑے ہٹا دیے۔ میرا خیال تھا کہ وہ لیٹنے میں مزاحمت کرے گا لیکن اس نے حیرتناک سعادت مندی کا مظاہرہ کیا اور کنپٹیاں ہتھیلیوں میں دبائے ہوئے تکیے پر گر گیا۔ ساتھ ہی وہ دھیمی آواز میں کچھ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔

نرس نے ٹرالی سے ایک نئی سرنج لے کر ایک شیشی سے اس میں کوئی سیّال منتقل کیا اور کامران کو پُچکارتے ہوئے بہت آرام سے وہ سیّال اس کے داہنے بازو میں اتار دیا۔

کامران کی آواز فوراً ہی دھیمی ہونے لگی، عضلات کا تناؤ ڈھیلا پڑنے لگا اور چند ہی سیکنڈ میں دوا کے زیرِ اثر وہ گہری نیند یا بے ہوشی میں ڈوب گیا۔

"بہت دردناک حالات سے دوچار ہے آپ کا مریض۔" نرس نے استعمال شدہ خالی سرنج ٹرالی کے نچلے خانے میں پھینکتے ہوئے کہا۔ "دو چار دن میں کبھی کبھار ذہن تھوڑا سا بیدار ہوتا ہے لیکن ذرا بھی زور پڑے تو یہی کیفیت ہوتی ہے۔ اگر میں انجکشن نہ دیتی تو اس پر بتدریج خطرناک دورے کی حالت طاری ہو سکتی تھی۔"

"میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک دیکھی ہے۔" میں نے امید افزا لہجے میں کہا۔

"علاج مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔ "ڈاکٹر اکبر اس پر بہت محنت کر رہے ہیں لیکن بگڑا ہوا کیس ہے، بالکل صحت مند ہونے کے لیے خاصی مدّت درکار ہوگی۔"

"سنبھلنے کی امید ہو تو طویل انتظار بھی کیا جا سکتا ہے۔ آپ سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تین نرسیں اس کے ہاتھوں پٹ چکی ہیں مجھ میں نجانے کیا بات نظر آئی ہے کہ میرے ساتھ کبھی بدتمیزی نہیں کی بلکہ کبھی کبھی بڑے شوق سے مجھے گھورتا رہتا ہے، ہو سکتا ہے کہ مجھ میں اسے ماضی کی کسی مانوس شباہت کی جھلکیاں ملتی ہوں، وہ بس لاشعوری سی حرکت ہوتی ہے اس کی، جب بھی میں نے اس انہماک پر اسے ٹوکا تو فوراً ہی سنبھل جاتا ہے۔ جیسے خواب دیکھتے دیکھتے اچانک جاگ اٹھا ہو۔"

"لاشعور کام کرنے لگا ہے تو انشاءاللہ شعور بھی بحال ہو جائے گا۔" مَیں نے پُر امید لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر اکبر کی ہدایت پر درمیان میں ایک مرتبہ پھر ان تینوں میں سے ایک نرس اس کے پاس بھیجی گئی تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی بھڑک اٹھا تھا اور مجھے پکارنے لگا تھا۔ مَیں آئی تو میرے ساتھ بالکل نارمل رہا بلکہ کچھ دیر تک کھیلتا بھی رہا۔"

"آپ کا نام کیا ہے سسٹر؟"

"میرا نام تو بس سسٹر ہی سمجھیے۔" اس نے مسکراتے ہوئے گفتگو کو نجی حدود میں داخل ہونے سے روک دیا۔ "لیکن کامران مجھے از خود گڈّی کہنے لگا ہے... کہیں ایسا تو نہیں کہ بچپن میں یہ نام اس کے لیے مانوس رہا ہو؟"

"کم از کم میرے علم میں نہیں۔" میں نے اعتراف کیا۔

"آپ ڈاکٹر اکبر سے ضرور مل لیں۔" اس نے اپنا سامان سمیٹ کر ٹرالی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ان کا خیال ہے کہ گڈّی کا سامنے لایا جانا مریض کے حق میں بہت بہتر ثابت ہوگا۔ آپ کو دیکھنا ہوگا کہ ذہنی توازن بگڑنے سے پہلے مریض کس کو گڈّی کہتا تھا۔ ایسے معاملات میں سب کچھ ڈاکٹر نہیں کر سکتا، مریض کے ہمدردوں کو بھی تعاون کرنا پڑتا ہے۔"

"میں ضرور ملوں گا ڈاکٹر سے۔" میں نے کہا اور وہ ٹرالی سمیت کمرے سے چلی گئی اور میں کامران کے بستر کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں اس نرس کے لیے تشکر کے جذبات اُمڈے چلے آ رہے تھے جو کسی صلے یا ستائش کی پروا کیے بغیر اپنے فرض کی حدود سے بڑھ کر ذاتی سطح پر ایک دیوانے کی دل جُوئی کی کوششیں کر

رہی تھی۔
معاً کمرے کا دروازہ کھلا اور میرے دل کی دھڑکن یک بیک تیز ہو گئی۔ آنے والا مضبوط ڈیل ڈول کا ایک طویل قامت شخص تھا۔ اس کے چوڑے چہرے کی ساخت سے خشونت اور سرد مہری ٹپک رہی تھی۔ داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا جہاں کسی نال کا ابھار بالکل واضح نظر آ رہا تھا۔

"ذرا بھی حرکت کی تو بے دریغ گولی مار دوں گا۔" وہ سرد مگر دھیمی آواز میں بولا۔

"کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" میں نے اپنی جگہ سے جنبش کیے بغیر سوال کیا۔ "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے پہلے کبھی تمھیں دیکھا ہو۔"

"یہ نہ بھولو کہ ریوالور تمھارے نہیں، میرے پاس ہے۔" اس نے ہتک آمیز لہجے میں کہا۔

"پہاڑ جیسا وجود رکھتے ہوئے بے عقلی کی باتیں کر رہے ہو۔" میں نے بھی ترکی بہ ترکی اہانت آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں ریوالور کی نمائش کرنے تو نہ آئے ہو گے، کوئی نہ کوئی مقصد بھی رہا ہو گا۔"

"مقصد بھی سامنے آ جائے گا، فی الحال تمھیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"بہت کور ذوق آدمی ہو۔ صنفِ نازک کے ہوتے ہوئے مجھے لے جانے پر تلے ہوئے ہو۔"

"زیادہ خوش دلی دکھانے کی ضرورت نہیں۔" وہ دانت پیس کر غرایا۔ "مجھ سے دو قدم آگے چلو گے، جو کہوں اسی پر عمل کرتے رہنا ورنہ کھوپڑی میں روشندان نمودار ہو جائے گا۔"

"خوب! خوش دلی خود دکھا رہے ہو، الزام مجھ پر لگا رہے ہو۔ میں پھر کہتا ہوں کہ مجھے لے جانے کا ارادہ ترک کر دو، جو پوچھنا ہے میں یہیں بتانے کو تیار ہوں۔"

"زبان بند رکھو اور اب چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"کسی کے مُہرے معلوم ہوتے ہو۔" میں نے سلگانے کی نیت سے کہا۔ "مقصد معلوم ہی نہیں تو مجھے کیا بتا سکو گے، بہتر یہی ہے کہ تمھارے کسی ذمے دار آدمی سے مل لیا جائے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے کرسی چھوڑ دی۔

اس کے چہرے پر غصے کے کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

"تمھارے آگے ہاتھ اٹھا کر چلنا ہے یا ہاتھ گرا کر؟" میں نے ہلکی سی انگڑائی لیتے ہوئے مضحکانہ لہجے میں سوال کیا۔

"اگر کسی کو تمھارے زبردستی لے جائے جانے کا شبہ بھی ہو گیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔" وہ غرایا۔

"وہ تو صورت ہی سے ظاہر ہو رہا ہے۔ میں تیار ہوں، چلنا ہو تو بتا دینا۔" میری کوشش تھی کہ کمرہ چھوڑنے سے پہلے ہی اس کے ذہن پر اس قدر جھلاہٹ طاری ہو جائے کہ ضرورت پیش آنے پر اس کی کھوپڑی اعتدال پر نہ رہے۔

"نکلو!" اس نے گالی دینے کے سے انداز میں کہا اور میں دروازہ کھول کر کمرے سے باہر راہداری میں نکل آیا۔ وہ سائے کی طرح میرے پیچھے ہو لیا۔

اگر کامران کی دیکھ بھال پر مامور نرس کہیں نظر آ جاتی تو میرا ارادہ تھا کہ رک کر اس سے کچھ بات کرتا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی مگر جب میں فلور اسٹاف کے کاؤنٹر کے قریب سے گزرا تو ایک ادھیڑ عمر نرس نے مجھے روک لیا۔ "آپ کامران کو دیکھنے آئے تھے؟"

"جی ہاں!" میں نے اس کی مداخلت پر خوشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر اکبر اس کی فیملی کے کسی فرد سے ملنا چاہتے ہیں، شاید تنویر علی صاحب نے گارجین کے طور پر مریض کو یہاں داخل کرایا تھا۔ آپ انھیں یہ پیغام دے سکیں گے؟" اس نے ایک کاغذ دیکھتے ہوئے کہا۔

"ضرور دے دوں گا۔" میں نے خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں خود بھی ابھی ڈاکٹر سے ملنا چاہ رہا تھا لیکن یہ غیر متوقع طور پر آ موجود ہوئے۔" میں نے پیچھے کھڑے ہوئے نووارد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اس صورتِ حال پر سخت مضطرب نظر آ رہا تھا۔ "مجھے فوری طور پر ان کے ساتھ جانا پڑ رہا ہے۔"

"اگر آپ اجازت...!" ادھیڑ عمر نرس ملتجیانہ لہجے میں نووارد سے مخاطب ہوئی لیکن میں نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی۔ "نہ نہ.... ان کو نہ چھیڑیں، یہ گٹھیا کے مریض ہیں۔ اگر تاخیر کے باعث ان پر دورے کی کیفیت طاری ہو گئی تو ان کے بھاری بھرکم وجود کو یہاں سے لاد کر لے جانا بھی میرے لیے محال ہو جائے گا، میں تنویر صاحب کو بھیج دوں گا۔"

نووارد بے بسی کے عالم میں بس منہ بگاڑ کر رہ گیا۔ کاؤنٹر سے آگے بڑھتے ہی اس کے منہ سے بامحاورہ اور پیچیدہ قسم کی گالیوں کا طوفان امڈ پڑا کیونکہ اس نے گٹھیا کے مرض کو ان مغلظات میں سمونے کی بھونڈی کوشش کی تھی۔

علاج گاہ کی عمارت سے باہر نکلتے ہی بے اختیار میری نگاہیں اس گوشے کی طرف اٹھ گئیں جہاں سلطان شاہ نے کار پارک کی ہوئی تھی اور مجھے یہ دیکھ کر سکون ہوا کہ دروازے سے کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا سلطان شاہ صاف نظر آ رہا تھا۔

"داہنی طرف گھوم کر نیلی گاڑی کی طرف بڑھتے جاؤ۔" برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے نووارد نے سخت لہجے میں کہا اور میں اس کے حکم کی تعمیل میں بے چوں و چرا داہنی طرف مڑ گیا۔

میرا خیال تھا کہ نووارد اکیلا ہی ہو گا ایسی صورت میں اس کے لیے گاڑی چلانے کے ساتھ مجھ پر نگاہ رکھنا دشوار ہوتا لیکن وہ بھی کم چالاک نہیں تھا۔ اس نے مجھے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا حکم دیا اور خود پھرتی سے پسنجر سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی حرکت میں آئی تو میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت ستارے ہی یاوری کر رہے ہیں۔ شاید نووارد کو خوش فہمی ہو کہ اس نے مجھے ریوالور کے بل پر اغوا کر لیا تھا جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اگر میں مزاحمت پر تل جاتا تو اس کے فرشتے بھی مجھے کہیں نہ لے جا سکتے بلکہ کامران کے کمرے میں ہی میں اسے زیر کر سکتا تھا اور اب اس نے اپنی دانست میں مجھے ڈرائیونگ پر مجبور کر کے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی تھی لیکن یہ بھول گیا تھا کہ کار کے اندر اور فینڈرز پر لگے ہوئے تینوں عقب نما آئینوں کے رُخ ڈرائیور کی رہنمائی کے لیے ایسے زاویوں پر سیٹ تھے کہ مجھے پیچھے آتی ہوئی سلطان شاہ کی کار مسلسل نظر آ رہی تھی اور بار بار مُڑ کر دیکھے بغیر اسے تعاقب کا شبہ تک نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو بس گود میں ریوالور ڈالے مطمئن بیٹھا تھا کہ اس نے مجھے پوری طرح بے بس کر لیا تھا۔

"اجازت ہو تو ایک سگریٹ سلگا لوں؟" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

"اگر میں نے مار مار کر گٹھیا کا مریض ہی نہ بنا ڈالا تو میرا نام نہیں۔" وہ ایک گالی دے کر بولا۔ وہ شروع ہی سے بھرا بیٹھا تھا، میرے چھیڑتے ہی پھٹ پڑا۔

"تم ہی بتاؤ کہ میں اس سے کیسے پیچھا چھڑاتا۔" میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے معصومانہ لہجے میں سوال کیا۔ "اصولاً تو اس وقت میرے لیے مریض سب سے زیادہ اہم تھا اور مجھے فوراً ڈاکٹر سے ملنا چاہیے تھا جب کہ تم مجھے ذرا بھی ڈھیل دینے پر آمادہ نہیں تھے، اسی لیے مجھے اس سے ایک سنگین بہانا تراشنا پڑ گیا۔"

"وہ بے وقوف بھی زیرِ لب مسکرائی تھی۔" وہ بھناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "گٹھیا کوئی دورہ نہیں ایک مستقل مرض ہوتا ہے۔"

"اوہ! مجھے معلوم نہیں تھا۔" میں نے ایک بے ساختہ قہقہے کا صفائی سے خون کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔ "دراصل اس معاملے میں میری معلومات بالکل صفر ہیں، تم میری تصحیح کر سکتے تھے۔ وہ بے چاری پھر تو میری حماقت پر ٹھیک ہی مسکرائی تھی۔"

میں نے آنکھوں کے گوشوں سے دیکھا کہ وہ مجھے پھاڑ کھانے والی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ پھر میرے بشرے پر سنجیدگی کا گہرا پرتو دیکھ کر وہ پُرسکون ہوتا چلا گیا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، میں سگریٹ پینا چاہ رہا تھا۔" اسے خاموش پا کر میں نے ٹوکا۔

"ہم پکنک پر نہیں جا رہے، تمھارے ساتھ جو کچھ ہونا ہے اس کا تصور بھی تمھاری ساری خواہشات فنا کرنے کے لیے کافی ہو گا۔" وہ تلخ اور غصیلے لہجے میں بولا۔

"جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔" میں نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔ "تم بلاوجہ بات بات پر بھڑک رہے ہو جب کہ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ تم درمیان کے آدمی ہو، جو کہا گیا، ایمانداری کے ساتھ کر گزرے۔ میرا ٹکراؤ تو اسی سے ہے جو تم سے کام لیتی رہی ہے۔"

"تو تم بھی اس سے واقف ہو؟" اس نے تانیث کا صیغہ سنتے ہی چونک کر سوال کیا۔

"دوستی اور دشمنی کے رشتے اجنبیوں کے ساتھ نہیں ہوتے۔" میں نے بے پروایانہ انداز میں کہا۔ "مگر میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ یوں مجھے اٹھوا کر وہ کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔"

اس نے اپنی جیب سے پیکٹ نکال کر دو سگریٹ سلگائے اور ایک میری طرف بڑھا دیا جو میں نے خاموشی سے لے لیا۔

"تم اسے کب سے جانتے ہو؟" چند ثانیوں کے بعد اس نے سوال کیا۔

"اگر وہ وہی ہے تو خاصی پرانی آشنائی ہے۔"

"پورے شہر کی آبادی میں ایسی ایک آدھ ہی عورت ہو گی جو کسی پرخاش کی بنا پر کسی مرد کو اٹھوا سکے۔ نام کیا ہے اس کا؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "اس کے لیے کام کر رہے ہو تو تمھیں نام بھی معلوم ہونا چاہیے۔"

"اسی کی تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔" تھوڑی دیر کی گفتگو کے نتیجے میں اس کے لہجے میں مصالحانہ رنگ غالب

آگیا تھا۔

"ہر بار وہ ایک مختلف نام سے سامنے آئی لیکن اس کا اصلی نام شاید بابی ہے۔" میں نے دانستہ جھوٹ کا سہارا لیا۔"تم اسے کس نام سے جانتے ہو؟"

"صرف آواز ہی سنی ہے فون پر۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔"کام کا آدھا معاوضہ پیشگی مل چکا ہے۔"

"پھر اسے کام پورا ہونے کی اطلاع کیسے دو گے، بقیہ رقم کیسے ملے گی؟" میں نے اس کے اعتماد کو متزلزل کرنے کی نیت سے کہا۔

"تمھیں اسٹون ہاؤس میں قید کرنا ہے، وہیں ایک مخصوص جگہ پر بقایا رقم مل جائے گی۔ کام پورا ہونے کی اطلاع دینا میری ذمے داری نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ تمھیں اس ویران عمارت میں بھوکا پیاسا سسکا سسکا کر مارنا چاہتی ہو۔"

"پھر تم مجھے کس مار پیٹ اور تشدد کی دھمکی دے رہے تھے؟"

"اس سے مجھے کون روک سکتا ہے، اسٹون ہاؤس کی ویران عمارت میں تم میرے ہی رحم وکرم پر ہوگے۔"

"پیشگی معاوضہ کیسے ملا تھا؟" میں نے اس طریقۂ کار میں دلچسپی محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

"آمادگی ظاہر کرنے کے بعد مجھے اسٹون ہاؤس کا جائزہ لینے کا مشورہ دیا گیا تھا، وہیں ایک مقفل کمرے میں پیشگی رقم کا لفافہ موجود تھا۔ پوری عمارت ویران پڑی ہوئی تھی۔"

"اور تم یہ جاننا بھی نہ چاہو گے کہ تم سے کام لینے والی کون ہے؟"

"فطری تجسس کی بات اور ہے ورنہ یہ بات معاہدے میں شامل ہے کہ کامران کی عیادت کے لیے آنے والے شکار کو اسٹون ہاؤس میں قید کرنے کے بعد میں تاحکم ثانی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔" وہ اندر سے خاصا سلجھا ہوا آدمی نظر آرہا تھا۔

"میرے بارے میں خاص ہدایت دی گئی تھی؟" میں نے اس کے بدلے ہوئے مصالحانہ رویّے سے فائدہ اٹھانے کی نیت سے سوال کیا۔

"شاید اسے تمھارے اور کامران کے تعلق کا علم تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ جو بھی پہلا شخص وہاں پہنچے اس پر ہاتھ ڈال دوں، تمھاری جگہ کالا چور بھی ہوتا تو میرا یہی اقدام ہوتا۔"

"اور اگر میں تمھیں دگنی رقم کی پیش کش کروں تو؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک ابھر کر فوراً ہی معدوم ہوگئی اور وہ مضبوط لہجے میں بولا۔"جو ہو چکا سو ہو چکا، چار گنا بھی میرے لیے قابلِ قبول نہ ہوگی۔ ایسے دھندوں میں ساکھ اور بھرم کی بہت زیادہ وقعت ہوتی ہے۔"

"اور اگر میں اسٹون ہاؤس میں تمھیں زک دے کر بھاگ نکلا؟"

"کوشش کرلینا، میرا نشانہ بے خطا ہے۔" اس نے بے پروا لہجے میں کہا۔"اسپتال کی بھیڑ میں سے تمھیں یوں نکال لانے کے لیے غیر معمولی دل گردے کی ضرورت تھی۔ اب تو تم بالکل ہی بے بس ہو۔"

پھر اُس سے غیر ضروری سی گفتگو ہوتی ہی رہی حتیٰ کہ اس کے اشارے پر میں نے دوسرے مکانات سے الگ تھلگ بنے ہوئے ایک ویران مکان کے پھاٹک کے قریب کار روک دی۔ اس نے اگنیشن آف کر کے چابی نکالی اور اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ پھر اُس کی تقلید میں میں بھی کار سے اتر آیا۔ اُس کا داہنا ہاتھ بدستور جیب میں تھا۔ مجھے پورا الیقین ہوگیا تھا کہ ضرورت پیش آنے پر وہ گولی چلانے میں لحظہ بھر کی بھی تاخیر نہیں کرے گا۔

دوسری طرف وہ راستے بھر باتوں میں اتنا منہمک رہا تھا کہ تعاقب کے امکانات پر سوچ بھی نہ سکا تھا۔ سلطان شاہ نے یہ عقل مندی کی تھی کہ ہمارے رُکنے کا اندازہ لگاتے ہی اپنی کار ایک طرف گھمائے گیا تھا اور اس وقت تاحدِ نظر ویرانی کا راج نظر آرہا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جنگ وجدل کے خوگر قبائلی معاشرے میں آنکھ کھولنے والے سلطان شاہ نے کار چھوڑ کر فوراً ہی مورچہ سنبھال لیا ہوگا اور ضرورت پڑنے پر خود بخود حرکت میں آجائے گا۔

آہنی پھاٹک کی ذیلی کھڑکی ایک بیرونی میکینزم کو گھماتے ہی کھل گئی اور وہ میرے پیچھے اندر داخل ہوگیا۔ پختہ راہداری کے اختتام پر پتھروں سے بنی ہوئی کشادہ عمارت واقعی اپنے نام کے عین مطابق تھی۔ مجھے لانے والے نے داخلی دروازے کا قفل کھولا اور اندر داخل ہونے کے بعد ہم ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوگئے۔ وہ سیدھا آتش دان کی طرف گیا تھا جس کے اوپر ایک پھولا ہوا لفافہ موجود تھا۔ اس نے لفافہ دیکھے بغیر کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔

"اب تم یہاں آرام کرو۔" اس نے ریوالور کو گردش دیتے ہوئے کہا۔"میرا کام پورا ہوگیا۔"

میں خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا اُسے گھورتا رہا۔ وہ ریوالور کی نال میری طرف اٹھائے اُلٹے قدموں دروازے کی

طرف بڑھنے لگا اور پھر باہر نکل کر اُس نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔ میں بجلی کی سی سرعت سے دروازے کی طرف لپکا تھا لیکن دستے پر زور آزمائی بے سود ثابت ہوئی۔ اتنی دیر میں وہ باہر سے دروازہ مقفل کرچکا تھا اور مکان میں بس اُس کے دور ہوتے ہوئے قدموں کی ہلکی سی دھمک گونج رہی تھی۔

میں تشویش زدہ انداز میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں ایک وسیع و عریض مسہری، ایک کرسی اور لکھنے کی میز کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک کونے میں غالباً ملحقہ باتھ روم کا دروازہ نظر آرہا تھا۔

مجھے نہایت اطمینان کے ساتھ قید کیا جاچکا تھا اور اگر اس کارروائی کے پیچھے رخشی ہی کا ہاتھ تھا تو مجھے پورا یقین تھا کہ سلطان شاہ نہایت آسانی کے ساتھ اندر آگھسے گا اور محتاط انداز میں مجھ تک رسائی کی کوشش کرے گا۔

رخشی نے توقیر کے لیے کام کرتے کرتے خاصے گر سیکھ لیے تھے اور اس بار خود سامنے آئے بغیر نہایت پیشہ ورانہ انداز میں مجھے اغوا کرالیا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ رہا ہوگا کہ اس طرح اپنے کسی آدمی کے بجائے میں خود اُس کے دام میں آجاؤں گا جب کہ میں نے اُس تک رسائی کے لیے دیدہ و دانستہ وہ راہ اختیار کی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ شکار پھنس جانے کی اطلاع پاکر وہ کب تک ادھر کا رُخ کرتی ہے۔ اس سے آمنا سامنا ہونے تک میں وہاں سے رہائی کے بجائے اسی کمرے میں مقید رہنا پسند کرتا۔

اس کمرے میں خورد ونوش کے سامان کی غیر موجودگی سے اندازہ ہورہا تھا کہ مجھے زیادہ طویل عرصے تک انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ اس نے اسٹون ہاؤس کی عمارت شاید اسی مقصد کے لیے کرائے پر حاصل کی تھی کہ کامران کے کسی ملاقاتی کو گھیر گھار کر میرے بارے میں معلومات حاصل کرسکے۔

کمرے کی تفصیلی تلاشی لینے پر مجھے وہاں ایک پرانا رسالہ مل گیا اور میں بستر پر دراز ہوکر اُس کی ورق گردانی میں مصروف ہوگیا۔ ابھی میں نے اس شغل کا آغاز ہی کیا تھا کہ اچانک دروازے پر ہلکے سے کھٹکے کی آواز ہوئی اور میں بستر سے اچھل کر فرش پر آگیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں دوڑ کر دروازے کی آڑ میں پناہ لیتا، کمرے کا دروازہ کُھل گیا اور پھر رخشی کی تحیر آمیز آواز سنائی دی۔

"اوہ! اس بار تو واقعی قسمت نے ساتھ دیا ہے۔ تم خود ہی آپھنسے ہو۔" وہ داہنے ہاتھ میں خودکار پستول لیے راہداری میں کھڑی ہوئی تھی اور اس آتشیں ہتھیار کا مہیب دہانہ میری طرف اٹھا ہوا تھا۔

"سب تمھاری کشش کا نتیجہ ہے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔" یہ دوسرا موقع ہے کہ تم نے مجھ پر ہتھیار اٹھایا ہوا ہے۔ باہر کیوں کھڑی ہو؟ اندر آجاؤ۔"

"تم تو بہت ہی سُست نکلے، مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں قیدی آہٹ پاتے ہی دروازے کی اوٹ میں نہ چھپ جائے۔" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ مجھے دیکھ کر اُسے حیرت ضرور ہوئی تھی لیکن قریب آنے پر میں نے اس کے چہرے پر حزن و ملال کے سائے رقصاں دیکھے۔

"مجھے معلوم تھا کہ میں کس کا قیدی ہوں اسی لیے چھپنے کی کوشش نہیں کی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

وہ سرد اور جذبات سے عاری نگاہوں سے مجھے گھورتی رہی، پھر کرب آلود لہجے میں بولی۔"جی چاہتا ہے کہ تمھارے ٹکڑے اُڑا دوں۔"

"کس کے لیے؟" میں نے بھی گمبھیر سنجیدگی اختیار کرلی۔"میں نے کیا بگاڑا ہے تمھارا؟"

"تمھارے بدن سے قاسم کے خون کی بُو آرہی ہے، میرے نزدیک یہ جُرم ناقابلِ معافی ہے۔ ہم دونوں ایک اَن کہے خاموش معاہدے کے تحت زندگی گزار رہے تھے اور ایک دوسرے کے لیے سب کچھ تھے۔ اس خلا کو شاید میں کبھی پورا نہ کرسکوں گی۔"

"تم جانتی ہو کہ وہ میری بُو پر لگا ہوا تھا، اس کی نیت بدل چکی تھی اور وہ مجھے دست و پابستہ، اسے لُوٹ کے قدموں میں ڈال کر اس کی خوشنودی حاصل کرنے پر تُل گیا تھا۔" میں نے نپے تُلے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا۔" اگر وہ نہ مارا جاتا تو میری باری آجاتی۔ بدلے ہوئے حالات میں ہم میں سے ایک ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ اب یہ اُس کی بدقسمتی تھی کہ وہ میرے ایک ہمدرد کے ہاتھ لگ گیا اور مارا گیا۔ میں شاید اُسے فوری طور پر ختم نہ کرتا۔"

"تم جھوٹے ہو؟" وہ بے یقینی کے عالم میں بولی۔" وہ نسیر تھا، آسانی کے ساتھ کسی کے بس میں آنے والا نہیں تھا۔ اُس کا حشر بھی راجہ سکندر جیسا ہی ہوا تھا۔ مجھے تو اب شبہ ہونے لگا ہے کہ سکندر بھی تمھارے ہی ہاتھوں مارا گیا تھا۔"

"نہ تم عدالت، نہ میں قانون کا قیدی۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔" یہ اٹل حقیقت ہے کہ قاسم مرچکا، اُسے زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب میں بتا رہا ہوں کہ وہ میرے آدمی کے ہاتھوں مارا گیا تو مجھے اپنا اعتراف کرنے میں کیا تامل ہوتا۔ میرے آدمی نے جو کچھ کیا، میرے ہی ایما پر کیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اُسے زندہ نہیں پکڑ سکا تو جوش میں اُس کا قصہ ہی تمام کردیا۔"

”کون ہے وہ؟“ اس کی آواز کسی گہرے کنویں کی تہ سے آتی محسوس ہوئی۔ ”میں نے قسم کھائی ہے، میں قاسم کے خون کا انتقام اپنے ہاتھوں سے لوں گی، وہ بچ نہ سکے گا۔“

”پھر تو تمہارا بنیادی مجرم میں ہی ہوں، مجھے گولی مار دو۔“ میں نے اٹل اور مضبوط لہجے میں کہا۔

”ضرور مار دیتی … کاش تم نے اعتراف کرلیا ہوتا۔ اگر آج کی رات گزر جاتی اور تم ہاتھ نہ آتے تو تمھیں اپنے بل سے باہر نکالنے کے لیے میں اس پاگل لڑکے کو مروانے کا فیصلہ کرچکی، تم نے مجھے دکھ پہنچایا، میں تمہاری زندگی عذاب بنا دیتی۔“

میں اندر ہی اندر کانپ کر رہ گیا۔ وہ کسی زخم خوردہ ناگن کی طرح خطرناک ہوچکی تھی اور اس کے عزائم کے بارے میں میرے اندازے درست ثابت ہو رہے تھے۔ اسے قابو میں رکھنے کے لیے مجھے ہر قدم پر محتاط رہنا تھا۔ مجھے جہانگیر سے معلوم ہوچکا تھا کہ وہ توقیر بالے لوٹو سے مل گئی تھی اور قاسم کا منصب اسے سونپ دیا گیا تھا لیکن میں وہ تذکرہ چھیڑ کر جہانگیر کے لیے خطرات پیدا کرسکتا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک اور پہلو سے وار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

”قاسم معاہدے سے مکر گیا تھا۔ اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہا۔ اس معاہدے کے بارے میں تمہارے کیا عزائم ہیں؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کون سا معاہدہ؟“

”دلاور خان کے ذریعے اپنا مال بازار میں پھیلانے کا منصوبہ۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”سب بھول جاؤ۔“ مجھے محسوس ہوا جیسے … ذہنی طور پر وہ کہیں اور ہو۔ ”قاسم کو پیسے کی ہوس تھی اور وہ اپنی اسی ہوس کی بھینٹ چڑھ گیا۔ میری آرزو تو بڑی مختصر سی ہے۔ آزاد اور خوش حال زندگی کی آرزو! وہ میں ان دھندوں میں پڑے بغیر بھی پوری کرسکتی ہوں۔ پھر اس وقت تم دونوں اندر کے آدمی تھے جو چاہتے کرسکتے تھے۔ اب تم معتوب ہوچکے ہو، میں بھی باہر ہوں۔“ وہ تھکے ہوئے انداز میں بستر پر بیٹھ گئی۔ پستول والا ہاتھ بھی اس کی گود میں جاگرا۔ اس وقت وہ مکمل شکست کی ایک زندہ تصویر نظر آرہی تھی۔

”تو کیا اب میں تمہارا قیدی نہیں ہوں؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اس نے اپنا سر نفی میں ہلادیا۔

پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”نہ قیدی ہو نہ دوست، میں ان سنگین دیواروں کے حصار میں تنہا رہ گئی ہوں۔ کیا کیا خواب دیکھے تھے میں نے قاسم کے ساتھ! لیکن ہم شہروں اور بستیوں میں ہیروئن کا زہر پھیلا کر ہنستے کھیلتے گھروں کو اجاڑ رہے تھے اور پھر ہمارے ہی خواب اجڑ کر رہ گئے۔ شاید یہ اوپر والے کی قدرت کا انتقام تھا۔“

میں آہستگی سے اس کے قریب جا بیٹھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس قدر شدید جذباتی گرداب میں مبتلا ہونے کے باوجود اس نے خود کو تنظیم سے باہر ہی ظاہر کیا تھا جب کہ جہانگیر مجھے اوپر کے فیصلے سے آگاہ کرچکا تھا اور یہ بات ذرا بھی قرینِ قیاس نہیں لگتی تھی کہ توقیر نے رخشی کو اس کے منصب سے آگاہ کیے بغیر جہانگیر کو اپنے فیصلے کی اطلاع دے دی ہو۔ میں نے اسے ٹٹولنے اور اس کے دل میں توقیر کی طرف سے نفرت کا بیج بونے کا فیصلہ کرلیا۔

”جانے والے چلے جاتے ہیں، وقت ان کا زخم مندمل کردیتا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر تمہیں سہارے ملیں گے۔ شاید ان ہی میں سے کوئی تمھیں قاسم کا دکھ بھلا دے۔“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

”قاسم کا دکھ کوئی نہیں بھلا سکتا۔“ اس نے رندھے ہوئے اور مغموم لہجے میں کہا۔ ”وہ ایک بے لوث چاہنے والا تھا، اس نے کبھی مجھ پر عام مردوں کی طرح ملکیت جتانے کی کوشش نہیں کی اور پھر اپنا سمجھتا تھا۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم دونوں کے تعلق کا یہ فلسفہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکا۔“

”آ ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ تم سب ایک جیسے ہو۔ دلوں کے بجائے جسموں پر حکمرانی کو محبت کہتے ہو مگر وہ بہت ہی عجیب تھا اور مجھے والہانہ انداز میں چاہتا تھا، میرے نزدیک وہ مردانگی کا شاہکار تھا۔ کتے کو پٹے میں باندھ کر یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اسے چوکھٹ سے محبت ہے۔ ہاں، زنجیر کھلنے کے بعد بھی وہ وہیں منڈلاتا رہے تو وفا کا یقین ہوتا ہے۔ میں اس سے دستبردار ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔“

اس کا انکشاف سن کر میں دنگ رہ گیا اور پھر ساری بات سمجھ میں آگئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بے خبری میں کسی نے عقب سے میرے سر پر لٹھ دے مارا ہو، میں کئی منٹ تک گفتگو کا سلسلہ جاری کرنے کے قابل نہ ہوسکا اور وہ سر جھکائے سسکتی رہی۔

”شاید الیاس بھی اس راز سے واقف نہ تھا۔“ آخر کار میں نے نامید طلب لہجے میں اس کے بھائی کا ذکر چھیڑ دیا۔

اس بار اس کے چونکنے کی باری تھی۔ اس نے اپنی نمناک اور ورم آلود نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ ”تم اسے کیا جانو؟ اسے دکھ تھا کہ قاسم تمھیں مسلسل فریب دے رہا ہے۔“

”مگر اسے تو میں نے بتایا ہوا تھا کہ میں قاسم سے شادی کرچکی ہوں۔“ اس نے میری بات کاٹ کر تحیر زدہ لہجے میں کہا۔

”سن لینا اور بات ہے لیکن اسے یقین نہیں آسکا تھا۔ وہ بظاہر قاسم کے ساتھ تھا لیکن مجھ سے مل گیا تھا۔ جس رات قاسم مارا گیا، اسی رات الیاس نے مجھ سے رجوع کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ رات بہت اہم ہے، جیوا ہاؤز میں کوئی اہم ہستی مقیم ہے۔ وہ اندر گھس کر سب کچھ تہ و بالا کردے گا …“

”اوہ میرے خدا! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے بے اختیار چیخ پڑی۔ ”تو کیا جیوا ہاؤز کے پھاٹک پر کسی گمنام قاتل کی گولی کا نشانہ بننے والا وہی تھا؟“

میں نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ ”گمنام قاتل نہیں بلکہ تمہارے بھائی پر گولی چلانے والا لے لوٹو کا کوئی خاص آدمی تھا جو جیوا ہاؤز سے دور رہ کر اس عمارت کی نگرانی کررہا تھا اور اس نگرانی کا جواز بھی سامنے آگیا ہے۔ مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت لے لوٹو بذاتِ خود جیوا ہاؤز میں مقیم تھا۔“

”تمہاری اطلاع درست تھی۔“ وہ جھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”یہ سب میری غلطی کی وجہ سے ہوا … الیاس کے خون کی ذمہ دار میں ہوں۔ شاید اسے بھنک مل گئی تھی کہ میں قاسم کے ایما پر لے لوٹو سے ملنے اس رات جیوا ہاؤز گئی ہوں۔ وہ ساری رات میں نے وہیں بسر کی تھی۔ پھر منہ اندھیرے کسی اجنبی کے اندر گھسنے کی ناکام کوشش اور اس کے پُراسرار قتل کا ہنگامہ کھڑا ہوتے ہی اس نے مجھے ایک چور راستے سے باہر نکال دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ مرنے والا الیاس رہا ہوگا۔“

میری ہر ضرب کاری ثابت ہو رہی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ بکھرتی جارہی تھی۔ میرے نپے تلے جھوٹ تیزی کے ساتھ اس کی خود اعتمادی کو نگلتے جارہے تھے۔ میں نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے سوال کرڈالا۔ ”تم؟ تم لے لوٹو سے ملنے کیسے گئی تھیں۔ ابھی تو تم نے خود کو تنظیم سے باہر کا فرد کہا تھا اور میری دانست میں تم معتوب بھی تھیں۔“

"تمھارے رُوپوش ہوتے ہی سب کچھ صاف ہوگیا تھا۔ لے ٹو نے قاسم کو پیغام دیا تھا کہ میری طرف سے غلط فہمیاں رفع ہوچکی ہیں۔ مجھے معاف کردیا گیا ہے اور وہ براہِ راست مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ جب راجہ سکندر کے زمانے میں اُس سے ملتی رہی تھی۔ لہٰذا طے شدہ پروگرام کے مطابق جیوا ہاؤز پہنچ گئی۔ وہاں لے ٹو نے بتایا کہ میری طرف سے ساری غلط فہمیاں تمھاری پیدا کردہ تھیں۔ سازش تم خود کررہے تھے لیکن شبہات کا رخ میری اور قاسم کی طرف کردیا تھا۔"

"پھر تو تم لے ٹو کو ہزاروں کی بھیڑ میں بھی پہچان لوگی۔" میں نے پُراُمید لہجے میں کہا۔

اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔"وہ نقاب پہنے بغیر کبھی میرے سامنے نہیں آیا۔ ہمیشہ ہی مضحکہ خیز نظر آتا ہے اور شاید تمھیں علم نہ ہو کہ وہ بلا کا مےنوش ہے مگر ہر وقت اوسان میں رہتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم تنظیم میں واپس لوٹ چکی ہو؟" میں نے تائید طلب لہجے میں سوال کیا۔

"واپس ہی نہیں لوٹی بلکہ لے ٹو کے وعدے کے مطابق منصب دار بھی ہوگئی ہوں۔" اس کی آواز میں غصہ اور تنفر سمٹ آیا۔"شاید اُس کی زبان ہی کالی ہے۔"

"میں سمجھ نہیں سکا.....!"

"یہاں سے اُٹھو!" وہ میری بات کاٹ کر اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔"میرے اعصاب بکھر کر رہ گئے ہیں۔ شاید یہ میری زندگی کا بدترین دن ہے۔ مجھے بڑا قلق ہورہا ہے کہ الیاس جیسا دردمند بھائی مار ڈالا گیا اور مجھے خبر تک نہ مل سکی۔"

"تم سے وہ خبر دانستہ چھپائی گئی ہوگی۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے شوشا چھوڑا لیکن وہ خاموش ہی رہی۔

راہداری میں آکر وہ نکاسی کے بجائے اندر جانے والے راستے پر مڑی تو میں چونک پڑا۔"ادھر کہاں جارہی ہو؟"

"پھر کہاں جاؤں؟" اُس نے اُلٹا مجھ ہی سے سوال کردیا۔

"میرا مطلب ہے کہ یہ تو شاید ویران عمارت ہے۔" میں نے ٹپٹپا کر کہا۔

"اسٹون ہاؤس قاسم کی ملکیت ہے۔ مجھے اسپتال سے نکال کر وہ یہیں لایا تھا۔ تمھیں لانے والا اسے ویران ہی سمجھتا رہا ہے کیونکہ سامنے کے رُخ سے یہ ویران ہی نظر آتی ہے۔ صرف عقبی دو کمرے میرے استعمال میں ہیں، اور میں آمد و رفت کے لیے اسی طرف کھلنے والا راستا استعمال کرتی ہوں۔"

اُس طرف پہنچ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ اُن میں ایک کمرہ نشست گاہ کے طرز پر شاہانہ انداز میں آراستہ تھا اور دوسرا خواب گاہ پر مشتمل تھا۔ وہاں بھی تعیش کے سارے لوازمات موجود تھے لیکن جابجا بےترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی اشیا سے اندازہ ہورہا تھا کہ رخشی ان دنوں واقعی پراگندہ خاطر تھی۔

خواب گاہ میں دیوار گیر کیبنٹ بار کا دروازہ کھول کر اس نے استفسار طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو اس کا ہاتھ کالے کُتّے کی گردن پر تھا۔ میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا اور وہ دیوار خوابگاہ کے ایک گوشے میں پڑے ہوئے نرم صوفے پر جا بیٹھی۔ بھرا ہوا خودکار پستول اس نے سیفٹی کیچ چڑھا کر بےپروائی سے مسہری پر ڈال دیا تھا۔

میں اسے ہمدردی کا تاثر دینے کی نیت سے بھاری قدموں سے چلتا ہوا وہیں جا بیٹھا۔ اس نے ابتدا قاسم کی یاد سے کی اور یہ اپنے جملہ گناہوں کے باوجود سوچا کہ مرنے والا کس قدر خوش نصیب تھا کہ اُس کی محبوب ترین ہستی اس کا نام لال پری میں گھول رہی تھی۔

"منصب داری کی بات رہ گئی تھی۔" دوسرے دور کی ابتدا میں میں نے اُسے یاد دلایا۔

"ہیروئن کی سوداگری بھی لاشوں کی سوداگری ہوکر رہ گئی ہے!" وہ بُرا سامنہ بنا کر بولی۔ اس کی آواز میں سرور کے ہلکورے فوراً ہی نمودار ہوچلے تھے۔"لے ٹو نے کہا تھا کہ اگر کسی مرحلے پر قاسم مارا گیا تو میں اس کی جانشین مقرر کردی جاؤں گی۔ شاید وہ قبولیت کی کوئی ساعت تھی کیونکہ قاسم اُسی رات بلکہ شاید اسی گھڑی مار ڈالا گیا، سمجھو تو اب مجھے بی فور ہوئے چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔"

"اس دوران میں لے ٹو سے رابطہ قائم نہیں ہوا تمھارا؟"

"شاید تم پہلے شناسا ملے ہو تو دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا ہے ورنہ مجھ پر تو بس خون اور جنون سوار تھا۔ نجانے کیا بات تھی کہ تمھیں دیکھتے ہی گولی نہ چلائی، ورنہ میں تو تمھارے خون کی پیاسی ہورہی تھی۔"

"مجھے مار کر تمھیں زیادہ دکھ ہوتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔"شاید ہمارے مقدر میں یہی لکھ دیا گیا ہے کہ لڑتے بھڑتے زندہ رہیں۔ پتا نہیں اس بار کی مصالحت کتنے دن چلتی ہے پھر ریوالور بدست سر پر سوار نظر آؤ گی؟"

"میں بہت دُکھی ہوں ڈینی!" وہ خالی گلاس تپائی پر لڑھکا کر صوفے کی پشت گاہ سے ٹک گئی۔"قاسم میری زندگی کا نچوڑ تھا۔ اس کے بعد میں اندر سے بالکل خالی ہوگئی ہوں۔ وہ اکثر بڑے اچھے شعر سناتا تھا، قاتل اور منشیات فروش ہونے کے باوجود اسے اچھے شعر یاد رہتے تھے۔ کچھ کچھ مجھے بھی یاد رہ گئے ہیں۔ کہتا تھا:

زندگی تیرے تصوّر میں فنا ہوجائے گی
تو مرا شوقِ عبادت دیکھتی رہ جائے گی

اور دیکھ لو کہ جو کہتا تھا اس نے وہی کر دکھایا۔ کھیل ہی کھیل میں اپنی جان پر کھیل گیا۔ اب کہاں جاؤں؟ کہاں تلاش کروں اُسے؟"

اس نے تیسرا دور شروع کردیا۔ رفتار کی تیزی اپنا رنگ دکھانے لگی تھی مگر میں نے اُسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اس سے پہلے بھی میں ایک بار اس کے ساتھ اس تجربے سے گزر چکا تھا۔ ہوش اور مدہوشی کے دوران اس پر وہ وقت ضرور آتا تھا جب وہ سچ اُگلنے کی مشین بن کر رہ جاتی تھی اور میں پوری توجہ کے ساتھ اس مرحلے کا منتظر تھا۔

"گھر ہوتا تو گھر ہی چلی گئی ہوتی۔" وہ لُکنت آمیز اور اُداس لہجے میں کہہ رہی تھی۔"اب نہ تو بابل کی چوکھٹ رہی نہ چاہنے والے کا سایہ۔ لگتا ہے کہ راستے کا ایک پتھر بن کر رہ گئی ہوں جس کا جب اور جدھر دل چاہے ٹھوکر مار کر لڑھکا دے۔" پھر گنگنانے لگی۔

ع شام ہونے کو ہے کدھر جائیں؟ اپنا گھر ہو تو اپنے گھر جائیں؟

"کیوں مجھے بھی اُداس کررہی ہو — یہ گھر تو ہے تمھارا، زندگی سے سمجھوتہ کرلو گی تو ان سنگین دیواروں میں تنہائی کا احساس بھی جاتا رہے گا۔ قاسم چلا گیا مگر لے ٹو زندہ ہے اور تم پر مہربان بھی، پھر تمھیں کس بات کا غم ہے؟" میں نے چابکدستی کے ساتھ موضوع کو اپنی مرضی کے رُخ پر لاتے ہوئے کہا۔

"اُسے لکھ لو کہ وہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔" وہ ترنگ میں بولی۔ معدے میں اُتری ہوئی مے سر چڑھ کر بولنے لگی تھی۔ اور دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی نفرت الفاظ کے قالب میں ڈھلنے لگی تھی۔"تمھارا قاسم سے سمجھوتہ ہوچکا تھا۔ اُسی نے دوبارہ قاسم کو تمھارے خلاف اُکسایا اور پھر بعد میں نہ وہ مجھے جیوا ہاؤز طلب کرتا نہ الیاس میری تلاش میں وہاں گھستے ہوئے مارا جاتا۔ وہ سازشی ہے، خونی ہے۔ میں نے تمھیں معاف کردیا لیکن اُسے ہرگز معاف نہیں کروں گی۔"

"اور کامران؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"اوہ!" اس نے خلا میں اپنا ہاتھ لہرایا۔"وہ پاگل بچہ! اُس سے مجھے کوئی پرخاش نہیں۔ اسے تو میں نے چارا بنانا چاہا تھا۔ ہائے وہ بےچارا! اس سے بھلا مجھے کیا لینا ہے؟"

پھر اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کی حرکات و سکنات سے بینائی کا ابہام بھی واضح ہونے لگا لیکن وہ لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں مسلسل بولے جارہی تھی۔ پھر اچانک ہی وہ شکستہ ٹکڑوں میں بولی۔ ع

ساقی ترے کرم پہ بڑا ناز تھا مجھے
ناکام جارہا ہوں، مقدر کی بات ہے

دوسرے مصرعے کی ابتدا کرتے ہی اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور پھر اُس نے زہرہ گداز انداز میں بلک بلک کر رونا شروع کردیا۔

وہ بے راہ رو اور جرائم پیشہ تھی لیکن اس کے ماضی سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود اُسے یوں پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر میں بھی دل گرفتہ ہوگیا۔ اسے تسلیاں دینا بےسود تھا، لہٰذا میں وہیں بیٹھا اُس کے بےسُدھ ہونے کا منتظر رہا اور تھوڑی دیر تک روتے روتے وہ وہیں صوفے پر بےہوش ہوگئی۔

کالے کُتّے کا معدہ خالی ہوچکا تھا اور رخشی کا معدہ حلق تک بھرا ہوا تھا۔ میں نے خواب گاہ کے دروازے میں لگے ہوئے ہضمی قفل کا اندرونی بٹن دبایا اور باہر نکل کر دروازہ بند کردیا۔ اب وہ دروازہ اندر ہی سے کھولا جاسکتا تھا۔ باہر سے کھولنے کے لیے چابی ضروری تھی۔ دروازہ بند کرکے میں پلٹا تو سلطان شاہ کو ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر براجمان دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"آؤ آؤ۔" مجھے دیکھتے ہی وہ خوش دلی کے ساتھ چہکا۔ "میں نے کی ہول سے جو کچھ دیکھا اس کی بنیاد پر سوچ رہا تھا کہ میری تو چوکیداری کرتے ہی رات کالی ہوگی — وقفہ ہوا ہے یا روانگی کی اجازت لے آئے ہو!"

"گدھے ہو تم۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔"اب سیدھے باہر نکل چلو، یہاں ٹھہرنا خطرناک ہوسکتا ہے۔"

"باہر نکلتے ہی پہلے پیاز خریدنا پڑے گی۔" وہ میرے سانسوں کی بُو پر بُرا سا منہ بنا کر بولا۔"کسی سنتری سے ملاقات ہوگئی تو شامت ہی آجائے گی۔ اس وقت تم پر تین قانون لاگو ہوتے ہیں۔"

"کی ہول سے جھانکتے جھانکتے قانون دان بھی ہوگئے کیا؟"

"پہلا اصول یہی ہے کہ جو کام کرو اس کی اُونچ نیچ دیکھ لو۔ جس دن ہیروئن بیچنے کا ارادہ کیا تھا اسی دن پتا چلا لیا تھا کہ نشےباز پر شہری قانون کے ساتھ مارشل لا ء ایکٹ کے تحت بھی جُرم عائد ہوسکتا ہے، یہ شوق ہے تو پیاز بھی جیب میں لے کر گھوما کرو۔ میرے گاؤں میں تو یہ ایک بنیادی اصول ہے۔"

"مجھے لانے والے کا کیا ہوا؟" میں نے اُس کی رہنمائی میں باہر

نکلتے ہوئے سوال کیا۔

"واپسی میں اکیلا تھا لہٰذا میں نے نکل جانے دیا، چاہتا تو بے خبری میں اُسے چھاپ سکتا تھا۔ تم تک پہنچنے سے پہلے میں نے عمارت کا بھرپور جائزہ لیا تو پتا چلا کہ پچھلے کمروں میں وہ رہتی ہے۔ لہٰذا تمہیں بھول کر اُسی کی نگرانی شروع کر دی۔ آخر ہوا کیا کہ پستول سے شروع ہونے والی گفتگو دعوت پر ختم ہوئی؟"

"یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سامنا ہونے سے پہلے وہ میرے خون کی پیاسی ہو رہی تھی مگر باتوں کے اُلجھاوے میں رفتہ رفتہ ساری دُشمنی بھول بیٹھی۔"

"مجھے بڑا ترس آرہا تھا بے چاری پر، آخر میں تو یوں بلک بلک کر رو رہی تھی جیسے باہر سے مار کھا کر آنے والا کوئی بچہ اپنے بزرگ کے سامنے جاتے ہی بکھر کر رہ جاتا ہے۔"

"یہ مشینی دور ہے سلطان شاہ۔" میں نے عمارت سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "دور سے ہر ایک بہت خوش حال، مطمئن اور اپنی ذات میں مگن نظر آتا ہے، لیکن جیسے ذرا قریب سے دیکھو یا کریدو، وہی دکھی نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس عہد کا ہر انسان اندر ہی اندر مشینی دور کا عذاب جھیل رہا ہے اور یہ کربِ ذات جب حد سے بڑھنے لگتا ہے تو لوگ اپنے ماحول سے فرار کی کوشش کرنے لگتے ہیں مگر پیٹ کا دوزخ بڑا ہی نابکار ہے۔ دو وقت کی روٹی کا حصول اس قدر مشکل اور پیچیدہ ہو کر رہ گیا ہے کہ ماحول سے جسمانی فرار ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ لہٰذا اوسط اور کم آمدنی والے طبقے ذہنی فرار پر ہی گزارا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ذہنی فرار کے لیے نشہ سب سے ضروری ہے۔ کوئی وڈیو کا نشہ کر رہا ہے، کوئی ہر وقت مخرب اخلاق لٹریچر کا تلذذ آمیز لیکن تباہ کُن نشہ کر رہا ہے۔ کوئی سنسنی خیز کہانیوں میں ڈوبا ہوا ہے اور جن کے لیے یہ نشے ناکافی یا بے اثر ہونے لگتے ہیں، وہ تیز نشوں کی طرف راغب ہونے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں کی ہر منڈی میں ہیروئن کی زبردست مانگ ہے۔ جو دام چاہو، مل جاتے ہیں، جتنی چاہو ملاوٹ کر لو، کوئی آنکھیں نکال کر شکایت نہیں کرتا۔ ہیروئن کی تجارت تمام تر مخالفتوں کے باوجود فروغ پذیر ہے کیونکہ تاثیر میں سب سے آگے ہے۔"

کرنل نوار زیدی کی کار کے قریب پہنچ کر مجھے خاموش ہونا پڑا۔ سلطان شاہ میرے لیے دروازہ کھولنے کے بعد گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"بات ختم ہو گئی تمھاری؟" کار میں بیٹھنے کے بعد اُس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"یہ سب بھابی ہی کو سنایا کرو۔ مشینی دور، کربِ ذات، ذہنی فرار اور تلذذ مجھ سے ہضم نہیں ہوتا۔ دماغ کی چولیں ہلا دیں تم نے ذرا سی دیر میں۔" اور میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بے اختیار ہنس پڑا۔ اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا تلذذ اُسے واقعی ہضم نہیں ہو سکا تھا۔ غنیمت یہی تھا کہ اس نے اس کے اظہار کے لیے کوئی مہمل لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔

"آپ کا تو پروگرام بھی پل پل میں بدلتا ہے۔" غزالہ نے میرا نیا فیصلہ سُن کر کہا۔ "میں ڈیڈی سے بھی کہہ چکی ہوں کہ آپ نے آج رات روانگی کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔"

"مجھے صرف کامران کی فکر تھی۔ میں نے تمھیں بلا کم و کاست ہر بات سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر آج رخشی سے میرا ٹکراؤ نہ ہوتا تو طلوع ہونے والی صبح کامران کے لیے خوشگوار نہ ہوتی، وہ اُسے مروانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔"

"خدا کرے کہ وہ اپنے وعدے پر قائم رہے۔" اُس نے دُعائیہ انداز میں کہا۔

"میں اسے خاصا سمجھنے لگا ہوں، میرا خیال ہے کہ اب وہ کامران کو بھول جائے گی۔ اس طرف سے بے فکر ہونے کے بعد ہی میں نے لاہور روانہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"تم اُسے سمجھنے لگے ہو اور وہ تمھیں ڈھیل دیتی ہے۔ یہ ذرا غور کرنے کی بات ہے!" سلطان شاہ نے معنی خیز لہجے میں دخل اندازی کی۔

"حیرت ہے کہ تم بھی مذاق کر لیتے ہو۔" میں نے خوشدلی کے ساتھ کہا۔ "میرا تو خیال تھا کہ مزاح کی حس تمھیں دور سے بھی چھو کر نہ گزری ہو گی۔"

"پیٹ بھرے کی باتیں ہیں یہ سب۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "روزی کی فکر انسان کی ہر صلاحیت کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے ــــ ویسے اس وقت میں مذاق نہیں کر رہا بھابی کو غور کرنا چاہیے کہ وہ تمھیں چھوٹ کیوں دیتی ہے جبکہ وہ اے لوڈ سے ملی ہوئی ہے اور اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ ہر قیمت پر تمھاری گرفتاری کا خواہاں ہے۔"

"شاید اُس وقت تم اُونگھ رہے تھے جب میں نے اے لوڈ کے خلاف اس کی گہری نفرت کا ذکر کیا تھا۔ وہ دراصل مجھے کوئی رعایت نہیں دے رہی تھی بلکہ اے لوڈ کی حکم عدولی کر کے اپنی اَنا کو تسکین پہنچا رہی تھی۔"

"آپ صفائی پیش نہ کریں، مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔" غزالہ نے مسکراتے ہوئے خوش گوار لہجے میں کہا اور میں نے ان دونوں کے اتحاد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

ہم دونوں کو ۔ ۔ ۔ لاہور جانے کے لیے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہیں تھی۔ بس ہوٹل پہنچ کر مختصر سا سامان لینا تھا اور تیاری مکمل تھی لیکن اوّل تو کرنل کی کار گھر پر چھوڑنا تھی، دوئم غزالہ کو سمجھانا تھا کہ رخشی کی طرف سے لاحق خدشات رفع ہو چکے تھے لیکن پھر بھی بہتر یہی تھا کہ ان لوگوں میں سے کوئی کامران کا رُخ نہ کرے۔ ورنہ امکان تھا کہ وہ لوگ بھی کسی کی نگاہوں میں آجاتے اور ان سے میرے تعلق کا راز فاش ہو جاتا جس کے تمام تر بُرے اثرات غزالہ پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔

ہم روانگی کے لیے تیار تھے کہ اچانک ہی کرنل کہیں سے اِدھر آنکلا۔ "بھئی کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے آتے ہی بلند آواز میں کہا۔

"بس لاہور روانگی کا ارادہ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہائیں!" اس کی تحیّر آمیز نگاہیں غزالہ کے چہرے پر جا رکیں۔ "تم نے تو ۔ ۔ ۔ ۔"

"جی جی۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔ "اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم نے اب پروگرام بدل لیا ہے۔"

"عجیب بات ہے۔" وہ شانے اُچکا کر بولا۔ "کبھی کسی وقت تو تم بہت ہی زیادہ پُراسرار نظر آنے لگتے ہو۔ لاہور جانا ہے، نہیں جانا اور اب پھر ضرور جانا ہے ــــ" پھر وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "ذرا تم اِدھر تو آؤ میرے ساتھ۔"

میں اُس کے پیچھے دوسرے کمرے کی طرف ہو لیا۔

"سچ سچ بتاؤ کہ لاہور جانے کا کیا چکر ہے؟" دوسرے کمرے میں پہنچ کر اس نے سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔ "مجھے دال میں کچھ کالا نظر آرہا ہے۔ کیا کوئی مار دھاڑ کا معاملہ ہے؟"

"ارے نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "منشیات فروشوں کی تنظیم کا سربراہ بوکھلا کر شہر چھوڑ بھاگا ہے اور اس نے لاہور کا رُخ کیا ہے۔ اگر اس کا کھوج مل گیا تو پولیس کو اُس کے پیچھے لگا کر لوٹ آؤں گا۔"

"اور وہ تمھارے ساتھ جا رہا ہے؟" کرنل کے مستفسرانہ لہجے میں حسد کی بُو نمایاں تھی۔ اُس نے سلطان شاہ کا نام لینا بھی گوارا نہ کیا تھا۔

"پہلے آپ کو لے جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن خاصے غور کے بعد اُسے ترک کر دینا پڑا۔" میں نے اُس کا دل رکھنے کے لیے سنجیدگی سے کہا۔

"چلو، میں تو اب بھی تیار ہوں۔" کرنل کا چہرہ خوشی سے کِھل اٹھا۔

"میں کُھل کر کام نہ کر سکوں گا۔" میں نے بے بسی کے ساتھ کہا۔ "آپ میرے بزرگ ہیں، یہ لحاظ ہر وقت سر پر سوار رہے گا۔ اس سے تو میں ہر کام لے لیتا ہوں۔ وہ آقا سے ادنیٰ خدمت گار تک بنایا جا سکتا ہے۔"

"ہاں یہ مشکل تو رہے گی۔" وہ مربیانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا، بات بس تمھاری سوچ کی ہے۔"

نائٹ کوچ کی روانگی میں خاصا وقت تھا لہٰذا میں نے کرنل سے جان چھڑا کر دوبارہ اندر کا رُخ کیا اور سلطان شاہ کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد ہم وہاں سے ٹیکسی میں روانہ ہو گئے۔ کرنل نے بہت ضد کی کہ وہ ہمیں اپنی کار میں ائیرپورٹ چھوڑ آئے گا لیکن میں نے سختی کے ساتھ اس پیش کش کو رد کر دیا۔

ٹیکسی کو انتظار کرنے کی ہدایت کر کے میں نے ہوٹل کا حساب بے باق کیا اور ہلکا پھلکا سوٹ کیس لے کر اسی میں ائیرپورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں نے تو خیر ضرورت کے تحت نائٹ کوچ پر نشستیں مخصوص کرائی تھیں لیکن قومی ائیرلائن کے اس عظیم الجثہ جہاز کی تمام نشستوں کو بھرا دیکھ کر مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ ملک میں ہر طرف فضول خرچی کے عمومی رجحان کے باوجود انفرادی سطح پر بہتیرے لوگ کفایت کی طرف مائل تھے۔

ہم لاہور ائیرپورٹ پر اُترے تو اس شہرِ خوباں کی فضا پر رات کے گہرے سناٹے کی حکمرانی تھی۔ وسیع و عریض، جگمگاتے ہوئے رن وے پر کھڑے جہازوں کے انجنوں کے شور پر بھی تکان کے غلبے کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید سلطان شاہ کو لاہور کی مٹی سے میرے والہانہ لگاؤ کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ اپنے خیالات کی رو میں ڈوبا ہوا تھا اور میں اپنے آبائی مسکن کی خاک کے ایک ایک ذرّے سے اپنی روح کی گہرائیوں میں لطافتیں سموتا ائیرپورٹ کی عمارت سے باہر آگیا۔

ایک عمدہ ہوٹل میں رہائش کا بندوبست کرنے کے بعد ہم کمرے میں پہنچے تو سلطان شاہ سیدھا بستر پر پہنچ گیا۔ چند ثانیوں بعد اُسے احساس ہوا کہ میں آرام کرنے کے بجائے کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہوں تو وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

"کک ۔ ۔ ۔ کہاں جا رہے ہو؟"

"تم تھک گئے ہو تو آرام کرو، میں اُجالا پھیلنے سے قبل کچھ ضروری کام نمٹانے جا رہا ہوں۔"

"میں بھی چلتا ہوں۔ اکیلے پڑا پڑا تمہارے ہی بارے میں سوچتا رہوں گا۔ جب جاگنا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ تمہارے ساتھ ہی چلوں۔"

"تمہاری ضرورت نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "میں رمضان چاچا کی طرف جا رہا ہوں۔ اس مہم میں وہ سب سے اہم شخص ہے ۔۔۔ اتنی رات گئے وہاں میدان صاف ہوگا۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوسکے گی۔ دن کے اُجالے میں محلّوں کی کوئی بات دوسروں سے نہیں چھپی رہتی۔ لوگ رمضان چاچا سے کُرید کُرید کر بہت کچھ معلوم کرلیں گے۔"

"تو کیا توقیر نے یہ امکان فراموش کر دیا ہوگا کہ تم ایک بار پھر رمضان کے دروازے پر دستک دے سکتے ہو؟"

"یہ کراچی نہیں، لاہور ہے۔" میں نے اُسے یاد دلایا۔ "شاید توقیر سوچ بھی نہ سکے گا کہ میں اُس کا پیچھا کرتا ہوا اتنی جلدی لاہور پہنچ جاؤں گا۔"

یوں وہ ناچار وہیں رکنے پر مجبور ہوگیا اور میں وہاں سے نکل آیا۔

اس وقت رات اپنے آخری سانسوں پر تھی۔ سڑکیں تاحدِ نظر ویران پڑی ہوئی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے خلافِ توقع مجھے بہت جلد مطلوبہ علاقے میں پہنچا دیا اور میں ٹیکسی محلّے سے دور چھوڑ کر پیدل ہی تنگ و تاریک گلیوں میں داخل ہوگیا۔

تیسری دستک کے جواب میں اندر سے کسی کی نیند میں ڈوبی ہوئی بیزار سی آواز سنائی دی۔ پھر کئی ثانیوں کے انتظار کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ بوسیدہ پردے کے پیچھے سے رمضان چاچا نیند کے خمار میں دُھت، آنکھیں ملتے ہوئے نمودار ہوئے تو ان کے بدن پر صرف بنیان اور تہمد موجود تھا۔

میں نے انھیں سلام کیا تو گلی میں دور ایستادہ کھمبے سے آنے والی، اسٹریٹ لیمپ کی یرقان زدہ مدّھم روشنی میں آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا اور پہچان کر حیران رہ گئے۔ "ارے تنویر بیٹا تم! اتنی رات گئے کیسے آنا ہوا؟"

"معاف کرنا چاچا جی! تمہیں نیند سے اٹھا دیا۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "بات کچھ ٹیڑھی ہی تھی جو اس وقت پریشان کرنا پڑا۔ ذرا تمہارا تھوڑا سا وقت خراب کروں گا۔"

"آؤ آؤ ۔۔۔ اندر آجاؤ۔" انھوں نے میرے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ میں تو خود دعائیں مانگ رہا تھا کہ کہیں تم سے ملاقات ہوجائے۔ پچھلی بار نہ تم نے اپنا کراچی کا پتا دیا، نہ مجھے پوچھنے کا خیال آیا ۔۔۔ دوبارہ واپس آئے ہو یا جب ہی سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

مجھے پہچانتے ہی ان پر چھایا ہوا نیند کا خمار یکسر غائب ہوگیا تھا اور وہ چونچال نظر آنے لگے تھے۔

"دوبارہ آیا ہوں۔" میں نے پردہ ہٹا کر اندر صحن میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور پھر وہیں ٹھٹک گیا۔ صحن میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے برابر برابر چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، جن پر رمضان چاچا کا پورا گھرانہ سویا ہوا تھا۔ ان میں عورتیں اور لڑکیاں بھی تھیں۔ میں رمضان چاچا کے دوبارہ ٹوکے بغیر آگے بڑھنے کی ہمّت نہ کر سکا۔

"آجاؤ، آجاؤ۔" رمضان چاچا نے کنڈی لگا کر رہنمائی کا فرض سنبھالتے ہوئے کہا۔ "سب گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ ان کے سروں پر نوبت بھی بجاؤ گے تو فجر کی اذان سے پہلے نہیں اٹھیں گے۔"

میں اُن کے پیچھے پیچھے بیٹھک میں داخل ہوگیا۔

"روٹی کھاؤ گے؟" وہاں بیٹھتے ہی اُنھوں نے محبت آمیز لہجے میں پہلا سوال کیا۔ اور میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے بات ٹال دی۔

وہ پرانی وضع کے آدمی تھے، لہٰذا ادھر اُدھر کی باتوں میں بھٹکتے رہے جب کہ میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟ مجھے پورا یقین تھا کہ ان کی اس خواہش کا محرّک توقیر یا تصویر ہی رہا ہوگا۔

"آپ مجھے کیسے یاد کر رہے تھے چاچا جی!" مجبور ہو کر مجھے ہی انھیں ٹوکنا پڑ گیا۔

"ہاں! عجیب بات ہوئی تھی۔" وہ چونک کر بولے۔ "تم آئے اور چلے بھی گئے، میں اس قصّے کو بھول گیا۔ پھر ایک دن میں سائیکل پر گھر لوٹ رہا تھا کہ کچہری کے پاس تصویر کو ایک بڑی سی کار میں بیٹھے دیکھا اور سائیکل سے اتر کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے پہچان تو گیا تھا لیکن شاید اس بات سے اس کی شان میں فرق آگیا تھا کہ ایک سائیکل سوار اس کی چمکتی ہوئی موٹر کے پاس آگیا تھا۔ اس نے میرے سلام کا جواب بہت رُکھائی سے منہ بنا کر دیا۔ اس کی یہ حرکت مجھے بہت بُری لگی اور میں نے بھی کہہ دیا کہ میں اس کی حیثیت دیکھ کر اس سے کچھ مانگنے نہیں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ اُس کا سوتیلا بھائی اپنی بڑی ماں کی تلاش میں بھٹک رہا ہے ۔۔۔ اب پتا نہیں کہ اس نے اپنی غلطی محسوس کرلی یا یہ تمہارے ذکر کا اثر تھا کہ وہ فوراً ہی موٹر سے نیچے آگیا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ اتنی دیر میں کچہری کے پھاٹک سے ایک لفنگا بھی وہیں آگیا۔ شاید تصویر موٹر میں بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ تصویر میرے پیچھے ہی پڑ گیا اور مجھے سائیکل وہیں چھوڑنے

پر مجبور کر کے موٹر میں بٹھا کر مال روڈ کے ایک بڑے ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں اُس نے میری خوب تواضع کی اور گھما پھرا کر تمہارے بارے میں سیکڑوں سوال کر ڈالے۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے بتا دیا کیونکہ بچھڑے دلوں کو ملانا بھی ثواب کا کام ہوتا ہے۔ تمہارا پتا مجھے معلوم نہیں تھا اس لیے میں اُسے نہ بتا سکا۔ میری آنکھیں تو اُس وقت کھلیں جب تصویر نے اپنے دوست سے لے کر دس کے نوٹوں کی ایک گڈی زبردستی میری جیب میں ڈال دی اور کہا کہ میں جب بھی تمہیں دیکھوں یا تم مجھ سے ملنے آؤ تو میں تمہارا پتا معلوم کر کے اُسے خبر دوں۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ اس نے ہزار روپے صرف تمہارا پتا معلوم کرنے کے دیے تھے۔ میں نے اس بوجھ سے بہت جان چھڑانا چاہی لیکن وہ رقم واپس لینے پر آمادہ ہی نہیں ہوا۔ جب وہ مجھے واپس کچہری کے باہر کھڑی ہوئی سائیکل کے پاس چھوڑنے جا رہا تھا تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں اپنی اور اُس کی ملاقات کے بارے میں ہرگز کچھ نہ بتاؤں کیونکہ وہ تمہارا پتا معلوم کر کے اچانک ہی بڑی ماں کو تمہارے پاس لے جا کر تمہیں حیران کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے بالکل ہی بے وقوف سمجھ رہا تھا لیکن میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بس میں تمہیں یہی بتانے کے لیے بے چین تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ تمہارے سوتیلے بھائیوں کے دلوں میں ابھی تک تمہاری طرف سے میل ہے۔ تم ان سے ملنے کا خیال ہی دل سے نکال دو۔"

"اور تم اُسے میرے پتے کی خبر کیسے دیتے چاچا؟" میں نے پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔

"اسی نے ایک کاغذ پر کوئی نمبر لکھ کر دیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں اس لاٹ صاحب کو فون کر کے بتا دوں۔" رمضان چاچا نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"وہ نمبر یاد ہے تمہیں؟" میں نے پُرامید لہجے میں سوال کیا۔

"وہ پرچہ میں نے روپوں کی گڈی کے ساتھ احتیاط سے رکھ چھوڑا ہے۔" رمضان چاچا ہاتھوں سے گھٹنے تھام کر اُٹھتے ہوئے بولے۔ "میں نے گھر تک میں کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ تیری چاچی بہت لالچی عورت ہے، بچیوں کے دان دہیز کے بہانے سارے ہی پیسے ہتھیا لیتی۔"

کس قدر سادہ لوح اور بے لوث تھا وہ انسان اور اس کے ارد گرد کچھ ایسے بھی تھے جنھیں انسانیت چھو کر بھی نہ گزری تھی اور اسی کا نام دنیا تھا۔ سب رمضان چاچا کی طرح نیک خصلت ہوتے تو پھر نیکی کا احساس کیسے اجاگر ہوتا۔ وہ بُرے لوگ ہی تو تھے جو اپنے نامۂ اعمال میں گناہوں کی سیاہی لتھیڑ کر اچھائیوں کو دوام کی منزل پر شناخت کراتے تھے۔

رمضان چاچا ٹین کے ایک صندوق کا ڈھکن اٹھائے اس میں کچھ ٹٹولتے رہے اور پھر نوٹوں کی گڈی لا کر میری گود میں ڈال دی۔

"یہ کیا ہے چاچا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اسی کے ربر میں وہ پرچا لگا ہوا ہے، نکال کر پڑھ لو۔ اس سے ملو تو یہ پیسے اس کے منہ پر دے مارنا۔ نہ ملنا چاہو تو کسی معذور کو دے دینا، میرے لیے یہ حرام ہیں۔"

لاہور کی سرزمین پر پہنچتے ہی وہ کامیابی کی پہلی کرن تھی، ایسا سرا مل گیا تھا جس کے سہارے پیش قدمی کی جا سکتی تھی۔ میں نے گڈی پر چڑھے ہوئے ربر بینڈ میں پھنسا ہوا رقعہ نکال کر کھولا تو اس پر ایک نامانوس نمبر درج تھا۔ ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے فون نمبر مجھے زبانی یاد تھے۔ وہ نمبر ان سے مختلف تھا۔ یعنی اس بار لے ٹو کے ایک نئے ٹھکانے کا سراغ ملا تھا۔

رمضان چاچا خود بھی ناسمجھ نہیں تھے۔ تصویر کے خود غرضانہ رویّے سے خود بھی صحیح نتائج اخذ کر چکے تھے لیکن میں نے ضروری سمجھا کہ ان پر حالات کی نزاکت پوری طرح واضح کر دوں، ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں وہ کہیں مار کھا جائیں۔

"میں رات کے اندھیرے میں اسی لیے آیا تھا کہ کسی کو تمہارے گھر میں میری آمد کی خبر نہ مل سکے۔"

"کیوں؟ چوری ہے کسی کی؟ یہ بھی تیرا ہی گھر ہے، کیا ضرورت ہے کسی سے چھپنے کی؟" رمضان چاچا کو طراوہ آگیا۔

"چوری نہیں مصلحت بھی ہوتی ہے چاچا۔" میں نے انھیں سمجھایا۔ "وہ دونوں اب اچھے آدمی نہیں رہے ہیں، بگڑے ہوئے بدمعاش بن گئے ہیں اور ابھی تک میرے دُشمن ہیں۔ اگر انھیں معلوم ہوگیا کہ تم میرے ہمدرد ہوگئے ہو تو تمہاری زندگی اجیرن کر دیں گے۔ ہاں بچّے دار آدمی کے لیے ایسے موقع پر مصلحت ہی اچھی ہوتی ہے۔"

"تو بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔" وہ پُرخیال انداز میں بڑبڑائے۔ "بڑے ہی بدذات لڑکے ہیں۔ جب تک اس محلّے میں رہے سر پر چڑھ کر ہی رہے۔ دبنا تو بڑی بات ہے، بڑے چھوٹے کا لحاظ بھی نہیں کرتے تھے۔" پھر وہ ایک دم چونک پڑے۔ "ارے میں نے تجھے اپنی رام کہانی میں اُلجھا لیا، یہ تو بتا کہ تو اس وقت کیسے آیا تھا؟" باتیں کرتے کرتے ان کے لہجے میں محبّت کا رچاؤ غالب آتا جا رہا تھا اور وہ تم سے باقاعدہ تُو پر آگئے تھے جو ان کے منہ سے بہت بھلا لگ رہا تھا۔

"شاید یہی سب سُننے آیا تھا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔"کراچی میں کچھ دنوں سے کوئی میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ بہت سوچا مگر کوئی دُشمن یاد نہیں آیا۔ پھر خیال آیا کہ ذرا یہاں چکّر مار کر تم سے بھائیوں کی خبر بھی لے لوں، کہیں وہ مجھ پر مہربان نہ ہو رہے ہوں۔"

"تو وہ تیرا پیچھا کرتے کراچی تک جا پہنچے؟" چاچا نے حیرت سے کانوں کی لویں چھوتے ہوئے کہا۔

"دُشمنی تو قبر تک چلتی ہے چاچا اور میں ابھی زندہ ہوں۔"

"لیکن بگاڑا کیا ہے تُو نے اُن کا؟ تیرا باپ کون سی جاگیر چھوڑ گیا تھا جو تُو نے دبالی۔ سچ پوچھو تو اُنھوں نے تیری ماں کو نکال کر بڑا ظلم کیا تھا۔ ہم سب بھی اس ظلم میں شریک تھے، اللہ ہمیں معاف کرے سارے محلے میں کسی نے بھی اس ظلم پر آواز نہیں اٹھائی تھی۔"

"سوچ رہا ہوں اب تک نہیں بگاڑا تو اب کچھ بگاڑ لوں اُن کا، کم از کم دل میں خلش تو نہیں رہے گی۔"

"وہ بدمعاش ہو گئے ہیں تو اُن سے سنبھل کے رہنا۔ کچہری سے جو آدمی آیا تھا صورت ہی سے گرہ کٹ لگ رہا تھا، ایسے لوگوں کے سینے میں دل نہیں پتھر ہوتا ہے، پتھر۔"

"تم فکر نہ کرو، آدمی لڑتا ہے تو ہاتھ پاؤں بچا کر ہی لڑتا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا اور پھر وہاں سے اُٹھ گیا۔

رقم میں نے لاکھ چھوڑنا چاہی لیکن رمضان چاچا اس گڈی کو فساد کی جڑ قرار دیتے رہے اور میں اُن کی قناعت پر رشک کرتا نوٹوں سمیت واپس ہو لیا۔

ٹیکسی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا میں وہاں سے کافی دور نکل گیا۔ اندھیرا دھیمے دھیمے دم توڑ رہا تھا اور جب مجھے ایک رکشا ملا تو قریبی مساجد سے اذانوں کی آواز گونجنے لگی تھی۔

❧

میں دن چڑھے سو کر اٹھا تو سلطان شاہ سر سے پیر تک تیار، جوتوں سمیت پاؤں پسارے صوفے پر دراز تھا۔ میں نے سرہانے رکھی ہوئی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو وہ دو بجا رہی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" میں نے انگڑائی لے کر بستر چھوڑتے ہوئے سلطان شاہ سے سوال کیا۔

"جا نہیں رہا بلکہ ابھی واپس آیا ہوں۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔"تم اندھیرے میں کام دکھاتے ہو، میں نے دن کے اُجالے میں کچھ ضروری کام نمٹائے ہیں۔ دیکھو گے تو طبیعت

خوش ہو جائے گی۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے قریب رکھا ... میری طرف سرکا دیا۔

اور میں نے دیکھا کہ اُس نے واقعی بہت عمدہ ... سرانجام دیا تھا۔ رمضان چاچا کے پاس سے واپس لو... میں نے سرسری طور پر اسے اپنی روداد سے آگاہ کر ... لیا تھا۔ اس بارے میں تبادلۂ خیال کی نوبت ہی نہیں ... مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ تصادم میں ہتھیار فیصلہ کن کر... کرتے ہیں جبکہ ہم بالکل نہتے تھے۔

وہ چھوٹی نال اور بڑے بور والے دو بہترین ج... ریوالور، فاضل راؤنڈز کی بھاری تعداد کے ساتھ کہیں ... لے آیا تھا۔ اگر وہ کام مجھے سرانجام دینا پڑتا تو شاید میں ... دن ہی بغیر لائسنس کے ہتھیار بیچنے والوں کے ٹھکانے ... تلاش میں لاہور کی خاک چھانتا رہتا لیکن اُس نے پیش قد... وہ اہم مسئلہ حل کر دیا تھا۔

وہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا میرے ردِّ عمل کا جائز... رہا۔ میں نے بیگ کی زپ بند کی تو وہ بول پڑا۔"ایک گاڑی لے آیا ہوں، نیچے ہی موجود ہے۔"

"اوہ!" میرا حیرت زدہ ہونا لازمی امر تھا۔"کہاں ... صاف کر آئے؟"

وہ ہنسنے لگا۔"ہتھیاروں کی تلاش میں ٹرکوں کے اڈے پر گیا تھا۔ اپنے لوگ لائن پر درّے کے بنے ہوئے ہتھیا... سے لے کر قیمتی ولایتی اسلحہ تک لے کر چلتے ہیں۔ وہیں ... شناسا مل گئے۔ ان ہی سے تین دن کے لیے گاڑی کرا... پر لی ہے۔"

"تمھارے گاؤں کے آدمی ہیں۔"

اس نے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔"سمجھ لینا کہ ہمارا گاؤں بہت خوش حال ہے۔ گاڑی چوری ... ہے اور کراچی سے آزاد علاقے کی طرف جانے والی ہے۔ ... لوگ دو تین دن یہیں رہیں گے۔"

"چوری کی گاڑی دشواریوں میں بھی ڈال سکتی ..." میں نے کہا۔

"وہ کراچی سے لاہور آ گئے اور تم اُسے شہر میں استعما... کرنے سے ڈر رہے ہو۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔"تجربہ ... لوگ کوئی کام کچا نہیں کرتے۔ اس کی نمبر پلیٹ جعلی ہے، گا... اٹھائی تو عام ماڈل کی تھی مگر اب ڈیلکس ہو گئی ہے۔ ڈ... اٹھاتے ہیں تو اس کا سامان نکال کر وہیں بیچ دیتے ہیں ... اور اسے اسٹینڈرڈ بنا کر نکال لے جاتے ہیں۔ پولیس ...

نمبروں اور اسٹینڈرڈ ڈیلکس کے چکر میں ٹاپتی رہ جاتی ہے۔"

"تو یوں کہو کہ گاڑی لانے کے ساتھ ہی گاڑی اٹھانے کے گُر بھی سیکھ آئے ہو۔"

"اب کوئلوں کی دلالی کی ہے تو دل کھول کر کریں گے۔ سواری کے بغیر اسے ڈھونڈ تو کیا ہم شاید اُس کے کُتّے کو بھی نہ مار سکیں گے، وہ مکان کے بجائے قلعے میں رہتا ہے۔"

"میں منہ ہاتھ دھونا بھول کر وہیں بیٹھ گیا۔" تو تم اس کا ٹھکانا بھی دیکھ آئے؟"

"ترکیب تم ہی سے سیکھی ہے۔ فون نمبر سے پتا تلاش کیا تھا۔ پھر گاڑی ملنے کے بعد اُدھر کا ایک چکر بھی لگا لیا۔ کم سے کم ایک ایکڑ زمین پر حویلی بنی ہوئی ہے۔ وہاں گھسنے کے لیے کوئی خاص ترکیب سوچنی پڑے گی۔ احاطے کی دیواروں پر خاردار تاروں کی دوہری باڑھ لگی ہوئی ہے اور اُسی پر جگہ جگہ کتوں سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔"

"تم نے خاصا کام نمٹا لیا۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔"ہو سکتا ہے کہ ان تاروں میں بھی رات کو برقی رو دوڑا دی جاتی ہو۔ جو لوگ طاقتور ٹرانسمیٹرز، خودکار کیمروں اور جدید سائنسی ایجادات سے کام لے رہے ہوں، ان کے نزدیک کوئی بھی شعبدہ مشکل نہیں ہے۔"

"شاید ان تاروں میں بجلی نہ ہو۔" اس نے اظہارِ خیال کیا۔"خطرے کا بورڈ لگائے بغیر حفاظتی تاروں میں بجلی چھوڑنا تو کُھلا جُرم ہے۔"

"اور ہیروئن بیچنا شاید جُرم نہیں ہے۔" میں اسے لاجواب کرتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔

دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد ہم دونوں مسلسل اپنی حکمتِ عملی کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ سلطان شاہ کا خیال تھا کہ غیر معمولی تیاریوں کے بغیر اس عمارت میں پھٹکنا بھی محال تھا اور اگر کسی طرح ایک بار اندر گھس بھی جاتے تو کسی کارروائی کے بعد وہاں سے زندہ بچ نکلنا معجزے سے ہرگز کم نہ ہوتا۔

آخر کار طے یہ پایا کہ جب تک دونوں مل کر اس سنگین قلعے کا جائزہ نہ لے لیں، کوئی حکمتِ عملی بنانا ممکن نہ ہو گا۔

چھ بجے ہم ہوٹل سے نکل آئے۔ سلطان شاہ نے گاڑی بہت عمدہ تلاش کی تھی اور دیکھنے میں تقریباً نئی نظر آتی تھی۔ میں اُس کے بتائے ہوئے راستوں پر ڈرائیو کرتا ہوا جب اُس علاقے میں پہنچا تو وہ منفرد عمارت دور ہی سے نگاہ میں آ گئی

اپنے پُرشکوہ طرزِ تعمیر کی بنا پر وہ بلاشبہ ہزاروں میں ایک ہی رہی ہو گی۔

یہ بات پوری طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ ملک میں وسیع ترین پیمانے پر ہیروئن کی تجارت میرے سوتیلے بھائیوں کے ہاتھوں میں تھی اور وہ اس دھندے میں بلا مبالغہ کروڑوں کما رہے تھے لیکن اس خطیر آمدنی کا کوئی قانونی جواز نہیں تھا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ کالا دھن تھا اور کالا دھن رکھنے والے نمود و نمائش سے گریز ہی کرتے ہیں کہ کہیں وہ کسی سخت گیر محکمے کی نظروں میں نہ آ جائیں۔ اگر تو قیر اور تصویر اسی قلعے کے حصار میں رہ رہے تھے تو مجھے حیرت تھی کہ وہ قانون کے شکنجے سے کیسے محفوظ تھے۔ کسی کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ عمارت کیسے اور کس کے سرمائے سے تعمیر کی گئی تھی۔

میں سُست رفتاری سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ اس میں سامنے کے رُخ پر دونوں سروں پر دو بلند اور وزنی آہنی پھاٹک تھے جنھیں جنبش دینا شاید ایک آدھ آدمی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ عقبی سمت میں ایک چھوٹا پھاٹک تھا جو بظاہر ویران اور غیر مستعمل نظر آ رہا تھا۔ اس کے پہلوؤں میں بنے ہوئے دوسرے مکانات اس کے سامنے بالکل دب کر رہ گئے تھے۔ سڑک کی دوسری جانب ڈھلان کا سلسلہ تھا جس میں خودرو جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔

"درّے والے تو بلاوجہ بدنام ہیں۔" سلطان شاہ تلخ لہجے میں کہہ رہا تھا۔"اپنے ملازموں کو فراخ دلی سے تنخواہ بھی نہیں دے سکتے اور یہ لوگ اُن کی محنت سے سونا بنا رہے ہیں۔ خدا کی قسم مومن خان اور پائندہ گل کو معلوم ہو جائے کہ یہ حویلی ان ہی کے مال کی تجارت سے تعمیر ہوئی ہے تو وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی فیکٹریاں پھونک دیں گے۔"

"سکون... سکون سے کام لو۔" میں نے اُسے ٹوکا۔"شاید ہماری گاڑی نوٹ کر لی گئی ہے کیونکہ ہم پورا چکر کاٹ کر دوبارہ اسی سڑک پر آ نکلے ہیں۔"

"کیسے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔"پھاٹک تو سب ہی بند ہیں، باہر کوئی بھی نہیں ہے۔"

"یہی تو قابلِ غور بات ہے۔" میں نے عقبی آئینے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔"پھاٹک شاید برقی موٹروں سے کُھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ اس بار ہمارے گزرتے ہی اندر سے ایک ... کار نکلی تھی جو ہماری ہی رفتار سے پیچھے چلی آ رہی ہے۔"

اس سے قبل کہ ہماری کار دوسرے پھاٹک کے سامنے

سے گزرتی اچانک ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ ہماری کار کا عقبی حصہ داہنی طرف سے نیچے جھک گیا اور کار اچھلنے لگی۔ میں نے فوراً ہی بریک لگا کر کار روک دی، پیچھے آنے والی سبز کار ہمارے قریب سے گزر کر آگے نکلتی چلی گئی۔ اس میں چار آدمی سوار تھے۔

میں نے اتر کر دیکھا تو ہماری کار کا پچھلا ٹائر پھٹ چکا تھا۔ دوسری طرف سے سلطان شاہ بھی نیچے آ گیا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" اس نے پھٹے ہوئے ٹائر کا جائزہ لیتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"ہوشیار رہنا۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آہستہ سے کہا۔ "شاید کھیل شروع ہو چکا ہے۔" اس وقت میری رگ و پے میں سنسنی سی سرایت کرتی جا رہی تھی۔ میں نے غیر محسوس طریقے پر قرب و جوار کا جائزہ لیا تو ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ آگے نظر آنے والا آہنی پھاٹک بدستور بند تھا لیکن پھر بھی میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ نادیدہ نگاہیں ہماری ایک ایک نقل و حرکت کا جائزہ لے رہی ہیں۔

"مگر یہ ٹائر پھٹا کیسے؟" وہ متوحش نظروں سے سڑک کے دوسری جانب پھیلی ہوئی ڈھلان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس کے ٹائر تو بالکل نئے تھے۔"

"شاید سبز کار سے بے آواز فائر کیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں دیدہ و دانستہ یہاں روکنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس وقت تیزی سے اندھیرا اترتا چلا آ رہا ہے۔ جلدی ٹائر تبدیل کرو ورنہ ہم یہیں گھیر لیے جائیں گے۔"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ پھرتی کے ساتھ کار کو جیک پر چڑھانے لگا اور میں پانا سنبھال کر وھیل نٹ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

"آخر ہمارے ساتھ یہ حرکت کیوں کی گئی؟" اس نے جیک پڑھاتے ہوئے ہیجان آمیز لہجے میں کہا۔

"بظاہر کوئی نہیں دکھائی دیتا لیکن اس سڑک کی کڑی نگرانی ہوتی ہے۔ اس کارروائی کا ایک ہی جواز سمجھ میں آتا ہے کہ ہم دوسری بار اس سڑک پہ آئے تھے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" وہ بڑبڑایا۔ "یہ عمارت ہی ایسی ہے کہ کوئی اس کا چار بار بھی طواف کرے تو کم ہو گا۔"

"معاً میرے ذہن میں ایک خیال کوندا اور مجھ پر وحشت سی طاری ہو گئی۔ اگر صرف کار ہی روکی جانی تھی تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ لوگ جرائم کے ارتکاب میں جدید ترین ایجاد سے استفادہ کرنے کے عادی تھے۔ ان کے لیے یہ دشوار نہ تھا کہ بے آواز فائر کے ذریعے ٹائر ناکارہ کر کے جاتے جاتے سبز کار سے وہیں کوئی ننھا سا مگر طاقت ور لاسلکی ٹرانسمیٹر پھینک جاتے اور پھر اس کے ذریعے ٹائر کی تبدیلی کے دوران میں ہونے والی ہماری گفتگو اندر اس آلے سے منسلک ریسیور پر غور سے سنی جاتی اور اسی کی بنیاد پہ ہمیں نظر انداز یا گھیرنے کی کوشش کا کوئی فیصلہ کیا جاتا۔

میں قرب و جوار میں دیوانہ وار ایسے کسی آلے کو تلاش کرنے لگا جو میرے شبہات کی تائید کر سکے۔

"کیا کر رہے ہو تم — گاڑی کے آگے پتھر لگا دو ورنہ یہ جیک پر سے گر جائے گی۔" سلطان شاہ نے ہانک لگائی۔

"پیشاب کر کے آ رہا ہوں۔" میں نے اس قطعہ کلام کو ختم کرتے ہوئے کہا اور تیزی سے اس کے نزدیک پہنچ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرنے لگا۔

ایک ثانیے کے لیے اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر میرا مدعا سمجھ کر سر ہلانے لگا۔ مجھے احساس تھا کہ مجھ سے خطرہ بھانپنے میں تاخیر ہو چکی تھی۔ ابتدا میں ہم دونوں کے درمیان ایسے مکالموں کا تبادلہ ہو چکا تھا جن کی بنا پر ہمارے مشکوک عزائم کی نشاندہی ہو سکتی تھی لیکن اب اس کا توڑ کرنا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

"شاباش جلدی ہاتھ چلاؤ۔" میں نے سکوت کو خطرناک سمجھتے ہوئے زبان کھولی۔ "ہو سکا تو اس عمارت کے محافظ سے درخواست کریں گے کہ ہمیں اندر کا ایک چکر لگانے کی اجازت دے دی جائے۔" میں بول ضرور رہا تھا لیکن پوری طرح چوکنا تھا اور میری نگاہیں اس عمارت کے اگلے پھاٹک پر ہی مرکوز تھیں جس کی روشنیاں اندھیرا ہونے کے باوجود معدوم تھیں۔

پھر جیسے ہی سلطان شاہ نے جیک اتار کر باآواز بلند کام ختم ہونے پر اطمینان کے کلمات ادا کیے، بند پھاٹک کے کسی حصے سے ایک بے آواز شعلہ تیرتا ہوا سرعت سے کار کی طرف آیا اور اس بار اگلا ٹائر دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔

ہم دونوں کی جیبوں میں بھرے ہوئے ریوالور موجود تھے۔ میں نے دروازہ کھول کر فاضل راؤنڈز کی پیٹی اٹھائی اور ہم دونوں بیک وقت پوری رفتار کے ساتھ سڑک کے ساتھ ڈھلان میں پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں گھستے چلے گئے۔

جھینگروں کا شور یکلخت تھم گیا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے قدموں کی آواز کے سہارے آگے دوڑتے رہے۔ ابھی رات کا اندھیرا پوری طرح نہیں پھیلا تھا لیکن اس گھنے جنگل میں گھور تاریکی کا راج ہو چکا تھا۔ گھنے درختوں کے سائے میں پھیلی ہوئی بے ترتیب جھاڑیاں ہماری پیش قدمی میں بری طرح مزاحم ہو رہی تھیں۔ مجھے اپنی پنڈلیوں پر خراشیں پڑنے کا احساس ہو رہا تھا، جن میں خاصی سوزش ہو رہی تھی۔ میں بس دل ہی دل میں یہ دعا مانگ رہا تھا کہ اس اندھادھند بھاگ دوڑ میں ہم دونوں میں سے کوئی کسی زہریلی خاردار جھاڑی کی زد میں نہ آنے پائے۔ اس صورتِ حال میں اگر ہم میں سے کوئی بھی سست پڑتا تو وہ دوسرے کے لیے ناقابلِ بیان مصائب کھڑے کر دیتا۔

"رک جاؤ! ورنہ گولی مار دی جائے گی۔" اچانک ڈھلان کے اوپر سڑک کے کنارے سے اندھیرے میں کسی کی تحکمانہ آواز گونجی۔ "یہاں سے تم بچ کر نہیں نکل سکتے۔"

غیر ارادی طور پہ میرے قدم رک گئے اور میں نے اپنے ساتھ سلطان شاہ کو بھی ایک تناور درخت کی اوٹ میں کھینچ لیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" سلطان شاہ نے مضطربانہ انداز میں سرگوشی کی۔

"ذرا رکے رہو، اندھادھند بھاگتے رہے تو پیچھے سے آنے والی گولیاں چاٹ جائیں گی۔"

وہ عجیب ہذیانی انداز میں ہنسا۔ "شاید تم خوف زدہ ہو گئے ہو، ہم سڑک سے کافی دور آ گئے ہیں۔ اتنے فاصلے سے ان کا باپ بھی ہمیں نہ دیکھ سکے گا۔ یہ سب گیدڑ بھبکیاں ہیں اور تم وہی کر رہے ہو جو وہ چاہتے ہیں۔"

میرے ذہن سے کہر صاف ہونے لگی۔ سلطان شاہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس اعلان کے ذریعے وہ ہمیں خوفزدہ کرنا چاہتے تھے تاکہ ہم پیش قدمی ترک کر کے کسی گوشے میں چھپ جائیں اور چند لمحوں بعد وہ پوری تیاری کے ساتھ اس گھنے جنگل میں داخل ہوں تو زیادہ بھاگ دوڑ کے بغیر آسانی کے ساتھ ہم پر ہاتھ ڈال سکیں۔

اسی لمحے بلندی پر روشنی نمودار ہوئی اور طاقتور دستی سرچ لائٹ کا ہالہ مختلف سمتوں میں گردش کرنے لگا لیکن ہم اس کی زد سے خاصے دور تھے۔ "میں فائر کر رہا ہوں... وہ میری رینج میں ہے۔" سلطان شاہ کی آواز ابھری۔

"طاقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے سختی سے اس کا شانہ دبا کر اسے روک دیا۔ "وہ تعداد میں کئی ہوں گے۔ اس وقت ہمارا مسئلہ انہیں زک پہنچانا نہیں بلکہ اس دشواری سے زندہ سلامت نکلنا ہے۔ وہ اوپر کھڑے جائزہ لے رہے ہیں اور شاید اندر گھسنے کے لیے تیار ہیں لیکن ابھی تک ہمارے فرار کی سمت کا تعین نہیں کر سکے ہیں۔ اس بے یقینی کے باعث وہ مختلف سمتوں میں منتشر ہو کر آگے بڑھیں گے۔ فائر ہوا تو انہیں ہماری پوزیشن کا اندازہ ہو جائے گا اور سب سیدھ باندھ کر اسی طرف ہو لیں گے۔"

بات سلطان شاہ کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے اپنا ہاتھ جھکا لیا۔ اسی لمحے چکراتی ہوئی روشنی کے عقب سے کھٹ کی ہلکی سی مگر گونجیلی آواز کے ساتھ ایک شعلہ نمودار ہوا اور بہت تیزی کے ساتھ اس خودرو جنگل کے بیکراں سناٹے میں معدوم ہو گیا۔ پھر تو بے آواز فائروں کا ایک تسلسل سا قائم ہو گیا۔ وہ لوگ محتاط انداز میں آگے بڑھنے کے ساتھ مختلف سمتوں میں بے مقصد فائر کر رہے تھے۔ مدعا یہی رہا ہو گا کہ ہماری طرف سے بھی ایک آدھ جوابی فائر ہو اور وہ ہمارا رخ بھانپ لیں لیکن ہم دونوں ہی خاموشی کے ساتھ چند سیکنڈ تک ان کے اسلحے کی بربادی کا تماشا دیکھتے رہے پھر آگے کی طرف قدرے جھک کر، حتی الامکان تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ان اطراف میں اندھیرے کی چادر اتنی دبیز تھی کہ ہمارا دیکھ لیا جانا ناممکنات میں سے تھا اور اگر ہمارے نامعلوم دشمن بھی روشنی کا سہارا نہ لیتے تو شاید ہمیں ان کی موجودگی کا ادراک بھی نہ ہو پاتا لیکن وہ تعداد میں ہم سے بہت زیادہ تھے کیونکہ مختلف سمتوں سے ان کے بولنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ سڑک سے اترنے کے بعد شاید وہ جنگل میں اندر ہی اندر پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ بیشتر آوازیں مغلظات اور گالیوں پر مشتمل تھیں۔ شاید انہیں وہ بے وقت کی مشق خاصی ناگوار گزر رہی تھی۔

ان کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہمارے مقابلے میں ان کی رفتار خاصی سست تھی کیوں کہ انھیں اپنی عددی برتری اور اسلحے کی قوت پر ناز تھا۔ اور ان کے دلوں میں جارحانہ جذبہ موجزن تھا جب کہ ہم دونوں اپنی بقا کے لیے اس خون آشام ویرانے میں جدوجہد کر رہے تھے۔ اسی دوران میں ان کی چند ٹولیاں غالباً بھٹک کر دور نکل گئیں، کیوں کہ فضا میں بتدریج خاموشی غالب آنے لگی تھی۔

"کب تک اسی طرح دوڑتے رہو گے؟" اچانک

سلطان شاہ کراہا۔

"جب تک ہمت ساتھ دیتی رہے گی۔"

"تو پھر رک کر ہی کمر سیدھی کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ بھاگتے بھاگتے میں منہ کے بل کہیں ڈھیر ہو جاؤں۔"

"پھر یہیں بیٹھ جاؤ۔" وہ میرا فقرہ پورا ہونے سے قبل وہیں بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ "اور اب اسی طرح کسی تنے کی اوٹ میں پہنچنے کی کوشش کرو۔" میں نے اُسے ہدایت کی۔

فضا پر سناٹا طاری تھا اور ہم مضحکہ خیز انداز میں ایک تنے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"آخر ہوا کیا تھا وہاں؟" مناسب جائے پناہ میسر آجانے کے بعد سلطان شاہ نے پوچھا۔ "دوسرا ٹائر کیسے پھٹ گیا تھا؟"

"پھاٹک کی طرف سے بے آواز فائر ہوا تھا۔"

"لیکن اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر محافظ اسی قدر مستعد تھے تو گولی کا رُخ میری یا تمہاری طرف بھی ہو سکتا تھا۔"

"شاید وہ عمارت کے سامنے غیر ضروری خون خرابا نہیں کرنا چاہتے، پہلے ایک کار سے بے آواز فائر کر کے ہمیں وہاں رکنے پر مجبور کیا گیا، مجھے پورا یقین ہے کہ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر وہیں کوئی چھوٹا سا مگر حساس مائیکروفون بھی پھینکا گیا ہوگا جس کے ذریعے دوسرے پھاٹک کے پیچھے موجود محافظ ہماری گفتگو سنتے رہے ہوں گے۔ ٹائر بدلنے کے دوران ... ہم نے جو گفتگو کی، اس کی بنا پر ان لوگوں نے اندازہ لگا لیا کہ ہم عمارت میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ لہٰذا عین اس وقت جب تم ٹائر بدل چکے تھے، اندر سے کسی نشانے باز نے دوسرا ٹائر پھاڑ دیا۔ اس طرح وہ ہمیں وہیں روکے رکھ کر زندہ پکڑنا چاہ رہے تھے تاکہ اندر لے جا کر باز پُرس کر سکیں مگر ہم نے خوش قسمتی سے صورتِ حال بھانپ لی اور دوسرے ٹائر میں الجھنے کے بجائے کار چھوڑ کر بھاگ نکلے۔"

"اور وہ چوری کی ہے۔" سلطان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "کار سے وہ عمر بھر بھی ہمارا سراغ نہ لگا سکیں گے۔"

"آواز دھیمی رکھو۔" میں نے اضطراری طور پر اسے ٹوکا۔ "مکمل سناٹا بھی خطرناک ہو سکتا ہے، ممکن ہے قرب و جوار ہی میں ان کی کوئی ٹولی خاموشی سے ہماری تلاش میں مصروف ہو۔"

"تم میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ کبھی زیادہ دیر خوش نہیں رہنے دیتے۔" اس کا لہجہ بگڑا ہوا تھا۔

میں نے اس کے تبصرے کا کوئی جواب نہیں دیا اور تھوڑے سے توقف کے بعد وہاں سے اٹھ گیا۔ "اب یہاں سے نکلنے کی فکر بھی کرو، ہم ساری رات یہیں نہیں بسر کریں گے یہاں موذی حشرات الارض بھی ضرور پائے جاتے ہوں گے۔"

"ضرور پائے جاتے ہوں گے مگر انسان ان سب سے زیادہ موذی ہے۔" وہ بادلِ ناخواستہ اٹھتے ہوئے بولا اور اچانک ہی ہم دونوں کسی سرچ لائٹ کی تیز روشنی میں نہا گئے۔

"ہینڈز اَپ۔" روشنی کے عقب سے ایک کرخت آواز گونجی۔ "ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا لو، ورنہ بے دریغ گولی مار دوں گا۔"

تیزی کے ساتھ دو تین مرتبہ پلکیں جھپکانے کے بعد میری آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ روشنی کا رُخ ہمارے ہاتھوں کی طرف تھا اور اس ہالے کے عقب میں مجھے دو انسانی ہیولے نظر آرہے تھے یعنی مقابلہ برابر کا تھا۔

میں نے کسلمندانہ انداز میں ہاتھ بلند کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے اچانک ہی سرچ لائٹ پر فائر کر دیا۔ ہولناک دھماکے کے ساتھ نہ صرف دوبارہ گھور اندھیرا ہو گیا، بلکہ ایک دل خراش چیخ بھی سنائی دی۔ شاید گولی سرچ لائٹ کو ادھیڑتی ہوئی اسی شخص کے جسم کے کسی حصے میں پیوست ہو گئی تھی جو سرچ لائٹ تھامے ہوئے تھا۔

فائر کرتے ہی میں بجلی کی سی سُرعت سے نیچے گر گیا تھا کھٹ کی آواز کے ساتھ ایک فائر ہوا مگر گولی کا رُخ آسمان کی طرف تھا۔ میں نے زمین پر پڑے پڑے دیکھا کہ سلطان شاہ وحشیانہ انداز میں دوسرے شخص سے الجھا ہوا تھا۔ زخمی ہونے والا شاید گولی کھانے کے ساتھ ہی اپنا اسلحہ بھی گنوا بیٹھا تھا، کیونکہ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبائے غالباً زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، اگر وہ مسلح ہوتا تو یقیناً سب سے پہلے اپنے ساتھی کی مدد کرنے کی کوشش کرتا اور سلطان شاہ پر فائر کر دیتا۔

اس جنگل میں فائر اور چیخ کے بعد دوسری ٹولیاں بھی تیزی سے اِدھر کا رُخ کر سکتی تھیں، لہٰذا میں پھرتی سے اٹھا اور سلطان شاہ سے لپٹے ہوئے حریف کی کھوپڑی پر نال رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ سلطان شاہ تھوتھو کرتا ہوا پیچھے اُچھلا تھا۔ شاید اس کے حریف کی کھوپڑی کے کچھ حصے اُدھڑ کر اس کے چہرے سے جا ٹکرائے تھے۔ اس دوران میں میری نگاہ اس شخص کے بے آواز ریوالور پر جمی رہی تھی، جب وہ چند ثانیوں تک کسی اندھے کی طرح لہرانے کے بعد زمین پر ڈھیر ہوا تو میں نے گرنے والا ریوالور اٹھا لیا، اسی اثنا میں سلطان شاہ پہلے شکار کی مشکل آسان کرنے پر تل گیا تھا۔ اس نے حریف کی پشت پر سوار ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے نرخرے پر جما دیے تھے اور وہ بُری طرح مچل کر سلطان شاہ کی بے رحمانہ گرفت سے نکلنے کے لیے کوشاں تھا۔

حالات اس قدر سنگین نہ ہوتے تو شاید میں مخل انداز نہ ہوتا لیکن ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تصادم کا شور سننے کے بعد ان دونوں کے ساتھی کسی بھی لمحے ہمیں آلیں گے۔ لہٰذا میں نے بڑھ کر مضبوطی سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور سلطان شاہ نے چند ہی سیکنڈ میں اُسے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

دوسرے بے آواز ریوالور کی تلاش میں وقت برباد کیے بغیر ہم وہاں سے بہت تیزی سے فرار ہوئے تصادم اور گہری تاریکی کے باعث ہم سمت کا احساس کھو چکے تھے بس جدھر منہ اٹھا، اسی طرف ہو لیے۔ نہ جانے ہم کتنی دیر تک اسی طرح رکاوٹیں عبور کرتے پوری قوت کے ساتھ دوڑتے رہے پھر اچانک ہی ایک طرف جھاڑیوں میں روشنی چکراتی نظر آئی۔ اسی کے ساتھ کچھ دھیمی دھیمی انسانی آوازیں بھی ہوا کے دوش پر تیرتی سنائی دیں اور ہم نے رفتار سُست کر کے اپنا رُخ محتاط انداز میں تبدیل کر لیا۔

کچھ دیر پہلے جو کچھ ہوا اس میں ہماری نیّت یا ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس پُرشکوہ عمارت کے سامنے ہمیں جس دیدہ دلیری کے ساتھ الجھا کر روکا گیا تھا، اس کی بنا پر ہم شدید اعصابی دباؤ کا شکار ہو گئے تھے۔ پھر جنگل میں گھسنے کے بعد ہمیں للکارا گیا تو اُن کی نفری کا اندازہ ہوتے ہی ہم نے تصادم سے گریز کرتے ہوئے نکل بھاگنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور شاید ہم اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتے لیکن ان دونوں نے اچانک ہی ہمارے سروں پر مسلط ہو کر ہمارے لیے فرار کی راہ مسدود کر دی۔ ہمارے سامنے اس وقت دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ ان کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنے دردناک انجام کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول کر لیں یا پھر ان سے ٹکرا کر بے خوفی کے ساتھ بساط اُلٹنے کی کوشش کریں۔ اب یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہم نے دوسرے راستے پر عمل کیا اور آناً فاناً میں وہ دونوں ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ اس ناگہانی خونریزی کے بعد میں مزید کوئی تصادم مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

سڑک سے گزرتے ہوئے ہمیں ڈھلان میں پھیلے ہوئے ... خودرو جنگل کی وسعت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا لیکن کافی دیر تک دوڑنے اور چلتے رہنے کے باوجود ہمیں اس سلسلے کے ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو مجھے تشویش ہونے لگی، جہاں تک مجھے علم تھا، لاہور کی مضافاتی آبادیوں سے ملحق کہیں بھی اتنا وسیع جنگل موجود نہیں تھا۔

تو کیا ہم اندھیرے اور اپنی حد سے زیادہ احتیاط کے باعث کسی محدود علاقے میں چکراتے پھر رہے ہیں؟ میرے ذہن میں اچانک خیال آیا اور میں نے فوراً ہی سلطان شاہ پر اس کا اظہار بھی کر ڈالا۔

"ہو سکتا ہے۔" اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "لیکن یہ خِطہ اتنا مختصر بھی نہیں ہے۔ ورنہ وہ بہت دیر پہلے ہمیں ہر طرف سے گھیر چکے ہوتے۔ اب تو ہر طرف سناٹا ہی محسوس ہو رہا ہے۔"

"تمہاری آواز کو کیا ہوا! کیا تھک گئے ہو؟" میں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

اندھیرے میں اُس کی تلخ آواز اُبھری۔ "ایک بار اُونچی آواز میں بولنے کا نتیجہ بُھگت چکا ہوں، دوسرے تجربے کی ہمت نہیں ہے۔"

اچانک میرے کانوں میں ایک مانوس سی آواز آئی اور سلطان شاہ بھی چلتے چلتے رک گیا۔ چند ثانیوں تک کان لگائے رکھنے کے بعد میں سمت کا اندازہ کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ ہمارے بائیں جانب کافی دور سے گھنٹی کی آواز ایک خاص تسلسل کے ساتھ کبھی کبھار سنائی دے جاتی تھی۔

"بس اسی طرف نکل چلو۔" سلطان شاہ نے کہا۔ "ادھر یقیناً کوئی راستہ ہے۔"

وہ دُرست ہی کہہ رہا تھا۔ اس علاقے میں چوپایوں کے گلے میں گھنٹی ڈالنے کا رواج عام تھا اور شاید وہ کسی بیل گاڑی میں جُتے ہوئے بیلوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز تھی۔

ہم فوری طور پر بائیں طرف مُڑ گئے۔

اس بار قسمت ہم پر کچھ مہربان ہی تھی کیونکہ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جنگل کا وہ لامتناہی سلسلہ یکایک ہی ختم ہو گیا اور ہم ایک نیم پختہ سڑک کے کنارے پہنچ گئے۔ بیل گاڑی غالباً کہیں دور نکل چکی تھی اور ہوا کی مخالف سمت میں ہونے کی بنا پر اس کی کوئی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی لیکن مجھے خوشی تھی کہ ہمیں جنگل سے نجات مل گئی تھی

اور ہمارے سروں پر تاروں بھرا شفاف آسمان چمک رہا تھا۔
میرے دل میں اچانک ہی سگریٹ پینے کی شدید خواہش جاگ اٹھی۔

اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ انسان کی فطرت میں کس قدر تضادات یکجا ہیں۔ جان کو خطرہ لاحق ہو تو اپنے دفاع کی حیوانی جبلت ہر طلب اور خواہش پر غالب آجاتی ہے اور خطرہ ٹلنے کے ذرا بھی آثار نمودار ہوں تو مزاج اپنا رنگ دکھانے لگتا ہے۔

جب تحفظ کا فطری جذبہ اتنا شدید ہے تو لوگ خودکشی کی طرف کیوں مائل ہوتے ہیں؟ ہیروئن جیسا موذی نشہ جو گھن کی طرح انسانی وجود کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرکے قبر میں اُتار دیتا ہے کیوں مقبول ہو رہا ہے؟ سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی ذات کے تحفظ اور بقا کے لیے سب کچھ تج دینے کا جذبہ صرف اور صرف صحت مند ذہنوں میں ہی جنم لے سکتا ہے جن ذہنوں پر کھولت کا زنگ چھا رہا ہو یا جو روزمرہ کے مسائل کی چکّی میں پستے پستے بیمار ہو چکے ہوں، ان کے نزدیک تحفظ، بقا اور زندگی جیسے طویل المیعاد الفاظ اپنا مفہوم کھو بیٹھتے ہیں۔ انہیں نہ پیش قدمی کا اندازہ ہوتا ہے نہ پسپائی کا احساس... یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ گرداب میں پھنسے بس ایک ہی جگہ چکرائے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں ایسے سوختہ جاں آنے والے لمحوں کا سامنا کرنے کے بجائے اپنے گرد و پیش اور مسائل سے فرار کے لیے نشے کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں، ان کے نزدیک مصائب میں گزارے ہوتے دنوں سے کہیں بہتر وہ چند گھنٹے ہوتے ہیں جو وہ ایک "خوراک" کے زیرِ اثر خوابوں کے جزیروں کی سیر میں گزارتے ہیں اور یوں بیمار ذہن اپنے معاشی، معاشرتی اور مالی مسائل کی ہولناک یلغار سے بچنے کے لیے خودکشی کی راہ پر چل پڑتے ہیں اور مختصر سی مدت میں ایڈکشن کے کرب ناک عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

"کیا سو رہے ہو؟" سلطان شاہ نے میرا شانہ ہلا کر مجھے چونکا دیا۔

"کاش سو سکتے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس خیالات کی رو تمہارے دوست کی طرف جا رہی تھی۔"

"میرا دوست!" اس نے حیرت سے کہا۔ "کون!"

"وہی اپنا کرنل زوار زیدی۔"

اس بار وہ اپنی بے ساختہ ہنسی نہ روک سکا۔ "اس وقت وہ ساتھ ہوتا تو مزہ ہی آجاتا۔ اتنی دیر میں پتلون نیکر میں تبدیل ہو گئی ہوتی اور شاید وہ تمہیں اپنی دامادی سے خارج کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوتا۔"

"بس سوچ ہی سکتا ہے بے چارہ۔ اس کی بیٹی بہت سمجھدار ہے۔"

"شادی کے بعد بھی تمہاری یہی راتیں رہے تو بات ہے۔ سُنا ہے شہروں میں شادی کے بعد میاں بیوی کے خیالات ایک دوسرے کے بارے میں بہت بدل جاتے ہیں۔"

"اور تمہاری طرف کیا ہوتا ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"وہاں پہلے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جو کچھ ہوتا ہے، شادی کے بعد ہی ہوتا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے فراخدلانہ لہجے میں بولا۔

"یہاں دور تک ویرانہ ہی ویرانہ نظر آتا ہے۔" میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "ہم جنگل میں بھٹکتے ہوئے آبادی سے اتنی دور تو نہیں آئے ہوں گے؟"

"پختہ سڑک سے جنگل میں گھسے تھے اور اس ٹوٹی پھوٹی سڑک پر نکلے ہیں۔" وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ "میرا تو اندازہ ہے کہ ہم جنگل پار کرکے دوسری طرف نکل آئے ہیں، اُسی طرف ہوتے تو آبادی ہی میں ہوتے۔"

"تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "اس طرف خطرہ کم ہے، وہ لوگ جنگل میں جھک مارنے کے بعد اُسی طرف ہمارے نکلنے کے منتظر ہوں گے۔"

"یہاں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے رہے تو ٹھنڈی ہوا میں آنکھ لگ جائے گی، اب تکان بھی رنگ دکھانے لگی ہے۔"

"پھر چلتے ہی رہو۔" میں انگڑائی لے کر اُٹھ گیا۔ سمت کے بارے میں ہم دونوں نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر ایک طرف بڑھنے لگے۔

"ویسے ہمیں چوکنّا ہی رہنا ہوگا۔ ان میں سے کسی کو ہمارے جنگل کے پار نکلنے کا خیال آگیا تو ان کی گاڑیاں ادھر کا طواف بھی شروع کر دیں گی۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"یہ رات بھی یاد رہے گی۔" وہ تکان کے احساس کو زندہ دلی کی آڑ میں چھپاتے ہوئے بولا۔ "چلے تھے شان کے ساتھ جوہری کی کار میں اور اب جنگل میں دھکے کھانے کے بعد یہ ویران سڑک ناپتے پھر رہے ہیں۔"

"اگر بروقت جنگل میں نہ گھس پڑتے تو اس وقت ہم بھی کسی کے جبری مہمان ہوتے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ توقیر اور تصویر کیا بلا ہیں؟" وہ تحیر آمیز لہجے میں بولا۔ "ایک طرف ان دونوں میں سے کوئی اے ٹو بن کر ہیروئن کی تجارت چلا رہا ہے۔ دوسری طرف لاہور میں ان کے ایسے ٹھاٹ ہیں، وہ مکان واقعی محل سے کم نہیں معلوم ہوتا۔ مجرموں کے ایسے شاندار ٹھکانے تو بس انگریزی فلموں میں ہی نظر آتے ہیں۔"

"یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ توقیر ہی اے ٹو ہے اس نے کراچی میں کھل کر اپنی اس حیثیت میں احکام جاری کیے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تصویر اس سے واقف نہ رہا ہو۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟ محل تو معمولی سی بات ہے، ان کا ہر فعل انگریزی فلموں کا جیتا جاگتا شاہکار نظر آتا ہے۔ کئی بار تو مجھے جیمز بانڈ کی فلمیں یاد آگئیں۔ پیغام رسانی طاقتور ٹرانسمیٹروں سے ہوتی ہے، خودکار حفاظتی نظام کا تجربہ تمہیں پہلی بار قاسم کے مکان میں گھسنے پر ہو گیا تھا۔" میں نے پھریری سی لیتے ہوئے کہا۔ "اور ابھی کا تجربہ تمہارے سامنے ہے، مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے قرب و جوار میں کوئی حساس مائیکروفون پھینکا گیا تھا۔ ابھی تک یہ سارے طریقے ہمارے یہاں رائج نہیں ہوئے ہیں۔ حیرت بس اس بات کی ہے کہ وہ لوگ یوں کھل کر شاہانہ ٹھاٹ سے کیسے رہ رہے ہیں۔ سرکاری اہلکار کہاں سوئے ہوئے ہیں؛ کوئی ان کی آمدنی کے ذرائع کی پڑتال کیوں نہیں کرتا؟"

"کہیں تمہارے دونوں سوتیلے بھائی مافیا کے مقامی سربراہ تو نہیں ہیں؟" اس نے سوال کیا اور میں چونک کر تاروں کی چھاؤں میں اسے گھورنے لگا۔ وہ سادگی سے ہنس پڑا۔ "کیا کہہ دیا میں نے؟"

"تم کیا جانو کہ مافیا کیا بلا ہے؟" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"میں جاہل ضرور ہوں ڈپٹی صاحب، مگر اتنا نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔ تم سے ٹکرانے سے پہلے میں ہر دوسرے دن فلمیں دیکھتا تھا، انگریزی فلموں سے میں نے بڑے گُر سیکھے ہیں میں انگریزی نہیں جانتا لیکن ایکشن اور میوزک سے پوری اسٹوری سمجھ لیتا ہوں... مافیا پر میں نے بہت فلمیں دیکھی ہیں۔ وہ لوگ سہارا دے دیں تو دو ٹکے کے مجرم صنعت کار، سیاستدان اور کاروباری بن جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے بھائیوں کے سروں پر بھی مافیا کا سایہ پڑ گیا ہے۔ جبھی وہ بادشاہی کر رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" میں نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔ "میں اُن کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اپنی محنت سے وہ ایسی قابلِ رشک مالی کامیابیاں حاصل نہیں کر سکتے تھے۔"

اے ٹو... میرے ذہن میں وہ لقب کسی بچھو کے ڈنک کی طرح چبھنے لگا۔

محمود آباد کے ایک غیر آباد مکان میں ایک فرماں بردار ہرکارے سے گفتگو کے بعد پہلی بار میں نے فون پر اے ٹو سکندر علی کی آواز سُنی تھی اور تنظیم کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ طارق، نادر اور جہانگیر نے بھی اس دن میرے ساتھ ہی تنظیم میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ان دنوں ہر طرف چرس کا ڈنکا بج رہا تھا۔ عالمی شہرت کے مصوّر، گلوکار، اداکار، فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے بے شمار پیشہ ور اور جوان باغی نسل کے نمائندے چرس کے نشے میں ڈوب کر اپنے فن یا اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے کے دعوے دار تھے اور اس لہر میں ہم چاروں بھی چرس فروشی پر مامور کر دیے گئے۔ ان دنوں تنظیم مختصر سی تھی، اور شاید اپنی جڑیں پھیلا رہی تھی۔ بتدریج شہر میں چرس کی ترسیل اور تقسیم کے بیشتر کاروبار پر ہماری اجارہ داری قائم ہو گئی۔ زیرِ زمین دنیا میں ہمارے ناموں کی دھاک بیٹھ گئی اور منڈی کے حریفوں نے سمجھ لیا کہ ہمارا راستہ کاٹنے والا اپنی گردن نہ بچا سکے گا۔ وقت گزرتا رہا، تنظیم ترقی کرتی رہی۔ پھر میرے ہاتھوں پہلی بار تجارتی پیمانے پر ہیروئن کی فروخت کی مہم کے آغاز کے لیے مفت پڑیاں شہر میں تقسیم ہوئیں اور وقت کو پر لگ گئے۔ سیکڑوں سے شروع ہونے والا کام کروڑوں کو روندنے پر آمادہ ہو گیا۔ ماسی کے ساتھ اعتماد اور منصب بھی ملتا چلا گیا لیکن تنظیم میں شرکت کی پہلی شام سے کھلی بغاوت کے آخری لمحے تک بار بار یہی حقیقت سامنے آتی رہی کہ اے ٹو تنظیم کا مختارِ کل تھا اس کا ہر فیصلہ اٹل اور ناقابلِ تنسیخ ہوتا تھا۔

لیکن وہ اے ٹو کیوں کہلاتا تھا؛ اے ون کیوں نہیں تھا؛ اپنے کوڈ کے انتخاب میں اُس نے دوسرے درجے کا ہندسہ کیوں پسند کیا تھا؟ مجھے ان سوالات کا جواب کبھی نہ مل سکا اور اب پھر ذہن میں ان ہی سوالات کی تکرار ہو رہی تھی۔

اگر وہ مافیا یا اسی جیسے کسی بین الاقوامی گروہ کا جال تھا تو یقیناً اے ٹو یعنی توقیر کسی اے ون کو جوابدہ تھا اور یہ ضروری نہیں تھا کہ اے ون ہر وقت اُس پر مسلط رہتا ہو۔ وہ نہ جانے توقیر جیسے کتنے مقامی سربراہوں پر بالادستی رکھتا ہو... جدید ترین مواصلاتی رابطے اور نت نئے حفاظتی انتظامات توقیر یا

تصویر کی بنجر کھوپڑی سے ہرگز جنم نہیں لے سکتے تھے، میں جس قدر سوچتا رہا، اسی قدر یہ خیال مستحکم ہونے لگا کہ توقیر کو ہانکنے والا کوئی اور ہی تھا جو قابلِ رشک معلومات اور ذہنی صلاحیتوں کا مالک تھا۔

جب تک میرے لیے لے ٹو کی ذات ایک سربستہ راز بنی رہی، میں اس موضوع پر کھل کر نہ سوچ سکا۔ ہر طریقۂ کار اور ہر فیصلے کی خوبی لے ٹو سے منسوب کرتا رہا، لیکن توقیر کا راز کھل جانے کے بعد میرے لیے لے ٹو سے آگے سوچنا ناگزیر ہو چکا تھا۔

وہ کون تھا؟ کیا کہلاتا تھا؟ اس کا ٹھکانا کہاں تھا؟ اس کا طریقۂ کار کیا تھا...؟

”وہ مارا!“ اچانک سلطان شاہ نے مسرت آمیز نعرہ لگایا اور پھر میں نے بھی موڑ پر ٹیلوں کی اوٹ سے آنے والی روشنی کا انعکاس دیکھ ہی لیا۔

غالباً مخالف سمت سے کوئی گاڑی ہماری طرف آ رہی تھی۔ اگرچہ گاڑی ابھی تک نظر نہیں آئی تھی، نہ اس کے انجن کی گونج سنائی دے رہی تھی لیکن اس کے طاقتور ہیڈ لیمپس کا انعکاس اس اندھیری رات میں بہت امید افزا تھا۔

”آؤ۔“ میں نے پھرتی سے سڑک کی دوسری جانب ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس کار سے ہر قیمت پر لفٹ لینی ہوگی ورنہ اس غیر مصروف سڑک پر ہم ساری رات ہی پیدل چلتے رہیں گے۔“

”لیکن سڑک کیوں پار کر لی تم نے؟“ سلطان شاہ نے جھلاّئے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اسی طرف جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے تو کون سی قیامت نازل ہو جاتی۔“

”کھوپڑی ٹھنڈی رکھو۔“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”ایک موہوم سے خدشے کی بنا پر احتیاطی قدم اٹھا بیٹھا تو اس پر چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”میری کھوپڑی ٹھنڈی ہی ہے۔“ وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔ ”لیکن یہ احتیاط میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ خود جھاڑیوں اور جنگل کا رخ چھوڑ کر تم ادھر کھلے میدان کی طرف آ گئے ہو، کوئی بری گھڑی آ ہی گئی تو سڑک پار کر کے جنگل تک پہنچنے کی مہلت بھی مشکل ہی سے مل سکے گی۔“

”اسے کھلا میدان نہ کہو۔“ میں نے اسے چڑانے کے انداز میں کہا۔ ”ہر طرف چھوٹے بڑے ٹیلے بکھرے ہوئے ہیں جو بوقتِ ضرورت ہمارے لیے پناہ گاہ ثابت ہو سکتے ہیں۔“

”لیکن لفٹ لینے کا موقع آتے ہی تمھیں خطرے کی کیا سوجھ گئی....؟“ ابتدا اس نے جھلاّئے ہوئے لہجے میں کی مگر درمیان ہی میں اس کا لہجہ بےجان ہو گیا پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”اوہ! تو کیا تمھیں شبہ ہے کہ آنے والی گاڑی میں ہمارے دشمن بھی موجود ہو سکتے ہیں؟“

”ایک امکان ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”یہ سڑک ایسی نہیں کہ ادھر سے ٹریفک گزرتا ہو... موجودہ حالات میں ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”تو تم اس کار سے لفٹ نہیں لو گے؟“ اس نے آگے دیکھتے ہوئے کہا جہاں روشنی کا انعکاس تیز ضرور ہو گیا تھا لیکن آنے والی گاڑی سامنے نہیں آئی تھی، البتہ اس کے انجن کا ہلکا سا شور سنائی دینے لگا تھا۔ اس شور کی آواز کی بنا پر قیاس کیا جا سکتا تھا کہ آنے والی سواری کار نہیں بلکہ کوئی بھاری انجن والی لاری وغیرہ ہو سکتی تھی۔

”لفٹ نہ لی تو ہم سے بڑا احمق کوئی نہیں ہوگا۔ کم از کم میں تو ساری رات پیدل چلنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”اگر وہ دشمن ہی ہوئے تو ہمیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ ہم نے انہیں کافی زک پہنچائی ہے، بس یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری اصلیت جاننے کے لیے وہ ہمیں ہلاک کرنے کے بجائے فی الحال زخمی کرنے پر ہی اکتفا کریں۔“

”ان پر ان ہی کا حربہ آزمائیں گے۔“ میں نے ایک کھاڑی دار ٹیلا نظر آتے ہی اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”جس طرح انھوں نے ٹائر ناکارہ کر کے ہمیں رکنے پر مجبور کیا تھا، اسی طرح ہم بھی کارروائی کریں گے، ایک بےآواز ریوالور ہمارے پاس بھی موجود ہے۔“

”فائر بےآواز ہی سہی لیکن شعلہ تو اگلی نشست والوں کی نگاہ سے نہ چھپ سکے گا۔“

”یہ جگہ مناسب رہے گی۔“ میں نے ٹیلے کی آڑ میں پوزیشن لیتے ہوئے کہا۔ ”میں اگلے ٹائر کو نشانہ بنانے کی حماقت نہیں کروں گا۔ یہ جگہ بھی ایسی ہے کہ آگے بڑھنے کے بعد بھی وہ ہمیں نہ دیکھ سکیں گے، میرا ارادہ پچھلے ٹائر کو نشانہ بنانے کا ہے۔ انھیں زیر کرنے کے بعد گاڑی پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر آنے والے غیر متعلقہ لوگ ہوئے تو ٹائر کی تباہی کو اتفاقی حادثہ سمجھیں گے۔ ان کے ردِعمل کا جائزہ لے کر ہم اطمینان سے باہر نکل سکیں گے، اور کوئی معقول کہانی سنا کر لفٹ لے لیں گے۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دشمن ہوں اور ٹائر پھٹنے پر

خطرہ بھانپ لیں، ایسی صورت میں وہ رکنے کے بجائے سفر جاری بھی رکھ سکتے ہیں، پچھلے ٹائر کی تباہی ڈرائیونگ پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتی۔“

”اب تو ان کے ردِعمل ہی کا انتظار کرنا ہوگا۔“ میں نے سڑک پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آ سکی کہ تم نے سڑک کیوں عبور کی ہے؟“

”اگر وہ مخالف کیمپ کے آدمی ہیں تو دوسری طرف پھیلا ہوا جنگل ہی ان کی توجہ کا مرکز ہوگا۔ وہ سوچ بھی نہ سکیں گے کہ ہم اسے چھوڑ کر ادھر ٹیلوں میں چھپے ہوئے ہیں۔“

”اوہ... وہ آ رہے ہیں!“ گاڑی کے ہیڈ لیمپس نظر آتے ہی وہ اضطراری انداز میں بول پڑا اور ساتھ ہی اس نے اپنا پستول بھی سنبھال لیا۔

”جیپ معلوم ہوتی ہے۔“ میں نے ہیڈ لیمپس کے درمیانی فاصلے اور ان کی بلندی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”رفتار بھی خاصی سست ہے... خیر آنے دو، دیکھا جائے گا، لیکن میرا اشارہ ملے بغیر تم فائر نہیں کرو گے۔“

میں سائلنسر لگے ہوئے ریوالور کا جائزہ لینے لگا جس کے چیمبر میں پانچ گولیاں موجود تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ تصادم کی نوبت آ ہی گئی تو وہ پانچ گولیاں خاصی فیصلہ کن ثابت ہوں گی۔ ان کے بعد مجھے اپنے پستول پر انحصار کرنا پڑتا جس کے لیے ہمارے پاس خاصی تعداد میں فاضل راؤنڈز موجود تھے۔

”تمھارا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔“ وہ اپنے چڑچڑے پن پر نادم سا نظر آنے لگا۔ ”وہ دشمن ہی معلوم ہوتے ہیں، سست روی کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے آ رہے ہیں۔“

”میری کوشش ہوگی کہ پیچھے دوسری سمت کے ٹائر کو نشانہ بناؤں تاکہ انھیں خطرے کا احساس ہو بھی جائے تو توجہ جنگل ہی کی طرف مرکوز رہے۔“

”کامیابی کا دارومدار تمھارے نشانے پر ہے جو عموماً بےخطا ہوتا ہے۔“ اس کے لب و لہجے سے دبے دبے جوش کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ”وہ یقینی طور پر تعداد میں کئی ہوں گے۔ انھیں سنبھلنے کا موقع مل گیا تو ساری رات اسی ویرانے میں چاندماری کی مشق کرتے گزر جائے گی۔“

”اس خوش فہمی میں بھی نہ رہنا۔“ میں نے اسے متنبہ کیا۔ ”یہ سو فیصد گوریلا کارروائی ہوگی۔ پہلے ہی ہلّے میں کامیابی نہ ہوئی تو بربادی ہمیں گھیر لے گی۔ ذرا بھی چوک ہوئی تو تھوڑی ہی دیر میں چپے چپے سے ان کے آدمی اگل پڑیں گے۔ اس عمارت میں حفاظتی انتظامات کے لیے کوئی نجی فوج بھی پل رہی ہو تو مجھے حیرت نہ ہوگی۔“

جیپ اس نیم پختہ سڑک پر اچھلتی، لہراتی آگے بڑھی آ رہی تھی۔ انجن کے شور اور رفتار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے شاید فور وہیل ڈرائیونگ گیئر میں چلایا جا رہا تھا، حالاں کہ اس سڑک پر اس مخصوص گیئر کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ شاید آنے والوں کا یہ مدعا رہا ہو کہ شبہ ہوتے ہی جیپ کو بلا تامل کچے راستے یا جنگل میں اتارا جا سکے کیونکہ ادھر کا رخ کرتے ہی عام گیئر یقینی طور پر ناکارہ ہو جاتا ہے۔

جوں ہی مجھے محسوس ہوا کہ اب کسی بھی ہچکولے کے ساتھ جیپ کے ہیڈ لیمپس کی روشنی ہماری طرف بھی پڑ سکتی ہے تو میں بےآواز ریوالور سنبھال کر کھاڑی میں دبک گیا۔

رات کے سناٹے میں گاڑی کا شور گونجتا رہا، اسی کے ساتھ میرے اعصاب پر تناؤ طاری ہونے لگا۔ آخرکار وہ مہیب مشینی شور بالکل قریب آ گیا اور روشنی کی چادر تیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ میں نے کھاڑی میں سے سر ابھار کر دیکھا تو جیپ کا ہیولا روشنی کے عقب میں بڑھا جا رہا تھا۔ کھلی ہوئی جیپ میں نشستوں پر چار انسانی ہیولے براجمان تھے۔

میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر ریوالور کی نال سیدھی کی اور جیپ کی داہنی ٹیل لائٹ کے سہارے عقبی ٹائر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گھوڑا چلنے کا دھیما سا کھٹکا ہوا، میرے ہاتھ کو جھٹکا لگا اور بےآواز شعلہ نشانے کی طرف تیر گیا... میں فوراً کمین گاہ میں دبک گیا اور اسی لمحے فضا ٹائر پھٹنے کے پرشور دھماکے سے گونج اٹھی۔

سلطان شاہ نے اضطراری طور پر میرا شانہ دبا کر پہلی کامیابی کی مبارک باد دی مگر میرے کان تبدیلیوں پر مرکوز تھے۔ دھماکا ہوتے ہی جیپ کی آواز بدلنے لگی۔ پھر شاید جیپ روک دی گئی لیکن اس کا انجن بدستور چلتا رہا۔

”یہ کیسے پھٹ گیا؟“ انجن کے شور پر حاوی ایک کرخت اور تحیر آمیز آواز سنائی دی۔

جواب میں کسی نے نہایت ہتک آمیز انداز میں ٹائر پھٹنے کا تعلق ماضی قریب میں سوال کرنے والے کی کسی بزدلی سے قائم کر دیا۔

”بکواس مت کر او بیدے۔“ کسی تیسرے نے غرا کر تبصرہ کرنے والے کو پھٹکارا۔ ”دیکھنا یہ ہے کہ ٹائر اتفاقاً پھٹا ہے یا یہ کسی کی شرارت ہے۔“

اسی لمحے انجن بند کر دیا گیا اور آوازیں واضح تر ہو گئیں۔

"شرارت کیا ہوسکتی ہے؟ فائر ہی کیا ہوگا نا کسی نے لیکن ہم نے تو کوئی آواز نہیں سُنی۔" بولنے والے کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے اپنی رائے کی تائید کا خواہاں ہے۔

"آواز بے شک نہیں سُنی لیکن ٹائر سب نئے ہیں... کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ان دونوں کے پاس بھی بے آواز اسلحہ ہو۔" اس بار شاید جیپ چلانے والے نے رائے زنی کی تھی۔

"ہوں۔" ایک طویل غراہٹ اُبھری۔ "داہنا ٹائر پھٹا ہے اگر یہ بدمعاشی ہی ہے تو وہ زیادہ دور نہ نکلے ہوں گے، جتنی دیر میں ہم جنگل چھان کر لوٹیں گے، یہ ٹائر بدل لے گا... کیوں اکیلے بدل لو گے نا؟"

"ہاں ہاں ـــ تم جلدی کرو، وہ دُور نکل گئے تو پھر رات کالی ہو گی۔" وہی پہلی آواز سنائی دی اور پھر کئی دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز نیم پختہ سڑک پر گونجتی ہوئی کچی زمین پر معدوم ہو گئی۔

میرے ساتھ آہستہ آہستہ سلطان شاہ نے بھی سر ابھارا تھا۔ جیپ کی روشنیاں گُل تھیں اور اُس کے پیچھے ایک تنومند سایہ شاید جیک اور وھیل پانا تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے داہنی طرف سر گھمایا تو جنگل میں مختلف مقامات پر تین متحرک روشنیاں نظر آئیں۔ وہ لوگ حیرت ناک سُرعت کے ساتھ اُدھر کافی دور تک پھیل چکے تھے۔

"یہ بُرا ہوا۔" سلطان شاہ میرے کان کے نیچے منمنایا۔ "وہ سڑک پر بیٹھ کر ٹائر بدلے گا، اُس کی نظر ہم پر پڑ سکتی ہے۔ بایاں ٹائر ہوتا تو وہ کچے میں بیٹھ کر جیک لگاتا اور ہم بے خبری میں پشت سے اُسے قابو میں کر لیتے۔"

"باہر نکلنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "انتظار کرتے رہو، ٹائر تبدیل ہو جائے تو ایک گولی اُس کے نام کی بھی سہی۔ ابھی بے آواز ریوالور میں چار گولیاں موجود ہیں... اس کے ساتھیوں کو پتا بھی نہ چل سکے گا کہ اس کا کیا حشر ہوا؟"

"میں اس پر گولی چلانے کے خلاف ہوں۔"

"دماغ خراب ہوا ہے تمہارا؟"

"تمہارا لباس ٹھیک ٹھاک ہے، میرے کپڑوں پر خون کے خاصے دھبے ہیں، لباس تبدیل کیے بغیر میں ہوٹل کا رُخ نہ کر سکوں گا۔ میں اُسے طاقت کے بل پر زیر کرنا چاہتا ہوں تاکہ اُس کا لباس داغدار نہ ہو اور میرا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔"

"اوہ!" میں بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر گیا کیونکہ اُس کی بات بہت معقول تھی۔ "پھر تمہیں پیچھے سے گھوم کر جانا ہوگا۔ بہتر یہ ہوگا کہ کسی چوپائے کی طرح رینگتے ہوئے جاؤ، میں یہیں مورچہ سنبھالے رہوں گا، اگر ضرورت پڑی تو تمہاری مدد کر سکوں گا۔"

"وہ خاصا پھرتیلا نظر آتا ہے، ٹائر جلد ہی بدل لے گا، بس میں نکلتا ہوں۔" سلطان شاہ نے کہا اور گھٹنوں اور ہتھیلیوں کے بل زمین پر جھک کر چلتا ہوا ٹیلے کی اوٹ سے نکل کر جیپ کی مخالف سمت میں ہو لیا۔

اس ٹیلے کی اوٹ میں رہتے ہوئے میں بے خوف و خطر جیپ اور ٹائر بدلنے والے پر نگاہ رکھ سکتا تھا لیکن اپنی کمین گاہ سے نکلنے کے بعد اس کی نگاہوں میں آنے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا میں دبکا سڑک کی دوسری جانب کسی چوپایہ انسان کے ظہور کا انتظار کرنے لگا۔

شاید سلطان شاہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی محتاط تھا کیونکہ تقریباً پانچ چھ منٹ بعد میں نے ایک تاریک انسانی ہیولا جیپ کے عین مقابل جھاڑیوں سے نمودار ہوتے دیکھا۔ شاید سلطان شاہ سڑک عبور کرنے کے بعد کنارے کنارے خود رو جھاڑیوں میں چھپتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور اس طرح اس نے اپنی ہتھیلیوں کو غیر ضروری مشقت سے بچا لیا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ جُھکا اور چوپائے کی پوزیشن لے کر تیزی سے سڑک عبور کرنے لگا۔ اس وقت جیپ کا ڈرائیور ٹائر تبدیل کرنے کے بعد نٹ لگانے میں اتنا منہمک تھا کہ اُسے عقب سے آتی ہوئی مصیبت کا احساس تک نہ ہو سکا۔

سلطان شاہ اس سے چند فٹ دور دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا، اس کا داہنا ہاتھ سر سے بلند ہوا اور کھٹاک کی آواز سُنتے ہی میں پھریری لے کر رہ گیا۔ شاید سلطان شاہ نے پوری قوت سے اپنے پستول کا آہنی دستہ ڈرائیور کے سر پر رسید کیا تھا۔ اس کے حلق سے ایک مختصر سی بے معنی آواز نکلی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میں نے فوراً ہی اپنی جگہ سے دوڑ لگا دی۔ سلطان شاہ اپنے شکار کو سڑک سے ایک طرف گھسیٹ رہا تھا۔

"تم اس کے کپڑے اتار دو، میں نٹ کستا ہوں۔" میں نے وھیل پانا سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اپنا لباس راستے میں بدل لینا، اس کے ساتھیوں کے لوٹنے سے پہلے یہاں سے بھاگ لو ورنہ یہ موقع ضائع ہو جائے گا۔"

بمشکل تین منٹ بعد میں نے اچھل کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کر کے جیپ آگے بڑھا دی۔ سلطان شاہ اپنے شکار کے جسم سے اتارے ہوئے کپڑے لے کر عقبی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔

جیپ چوتھے گیئر میں ڈالتے ہوئے میں ڈیش بورڈ سے آنے والی ایک آواز سُن کر چونک پڑا۔ اتنی دیر میں سلطان شاہ بھی لباس بدل چکا تھا، لہٰذا وہ بھی اُچھل کر میرے برابر والی سیٹ پر آ گیا۔

"کیسی آواز تھی یہ؟" اس نے اپنے گریبان کے بٹن لگاتے ہوئے سوال کیا۔

"ایس او کالنگ ڈولی... اوور۔" قدرے توقف کے بعد وہی مدہم آواز دوبارہ اُبھری تو اس بار متوجہ ہونے کے باعث مفہوم پلے پڑ گیا اور اُسی کے ساتھ خانے میں رکھا ہوا دستی ٹرانسمیٹر بھی نظر آ گیا جس پر روشن ننھے سے سُرخ بلب سے ظاہر ہو رہا تھا کہ آپریٹس مسلسل آن تھا۔

میں نے آپریٹس اٹھا کر آواز قدرے بڑھا دی، کیونکہ وہ آلہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ اس قسم کا سگنل فری کوئنسی ٹرانسمیٹر کافی عرصہ میرے اور راجہ سکندر علی کے درمیان... زیرِ استعمال رہا تھا۔

پیغام آ رہا تھا، لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ جیپ پر آنے والوں میں سے کسی کے لیے ہوتا۔ نجانے اس قسم کے کتنے آپریٹس بیک وقت زیرِ استعمال تھے

"نجانے یہ ڈولی کون ہے؟" میں آہستہ سے بڑبڑایا۔

ڈیش بورڈ کی روشنیوں کے انعکاس میں سلطان شاہ کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔ "تمہاری آواز دوسری طرف سنی نہیں گئی ہو گی۔"

"اس وقت یہ آلہ صرف پیغام وصول کر رہا ہے جب تک اس کا یہ بٹن نہ دبایا جائے ہماری آواز دوسری طرف نہیں سُنی جا سکے گی۔"

"ایس او کالنگ ڈیوٹی روم..." "اوور!" آپریٹس پر نیا پیغام سُنتے ہی مجھے خاموش ہو کر ادھر متوجہ ہو جانا پڑا۔ ڈولی سے مایوس ہونے کے بعد وہی آواز ڈیوٹی روم کو کال کر رہی تھی۔

"ڈیوٹی روم آن لائن... اوور۔" لحظہ بھر کے بعد آپریٹس پر نئی آواز سنائی دی۔

"ہم ان دونوں کی تلاش میں جنگل کے پیچھے گشت پر تھے کہ ہالٹ فورس سے ذرا آگے ہماری جیپ کا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا۔" ایس او کہہ رہا تھا۔ "ہمیں کسی فائر یا شرارت کے آثار نہیں ملے لیکن میں نے ڈولی کو ٹائر تبدیل کرنے کے لیے چھوڑ کر قریبی علاقہ دیکھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت ہم تینوں اندر گھسے ہوئے ہیں لیکن میری بار بار کی کوششوں کے باوجود ڈولی کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے... اوور۔"

"شاید تم نے جنگل میں داخل ہو کر بدترین غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہمارے دو آدمیوں کی لاشیں ملی ہیں، ایک کا بے آواز ریوالور بھی غائب تھا۔ شاید تمہاری جیپ پر وہی آزمایا گیا ہو گا... فوراً واپس لوٹو اور ڈولی کے بارے میں اطلاع دو، باس ناکامی پر بہت برہم ہے... اوور!"

"میں لوٹ رہا ہوں۔" ایس او کی آواز سنائی دی۔ "اگر وہ دونوں جیپ پر سوار ہو گئے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ یہ گفتگو سن رہے ہوں... اب میں تم ہی سے مخاطب ہوں، جیپ فوراً چھوڑ دو، ورنہ اس میں ایسا نظام نصب ہے کہ ہر بار انجن اسٹارٹ کرنے کے ساتھ سیکنڈ کے اندر ایک مخصوص بٹن نہ دبایا جائے تو ایک خودکار میکنزم حرکت میں آ جاتا ہے۔ انجن اسٹارٹ کرنے کے صرف دس منٹ بعد پوری جیپ ایک ہولناک بارودی دھماکے سے اُڑ جائے گی۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے، سیاہ بٹن دبا کر کہہ سکتے ہو، بات پوری کرنے کے بعد بٹن چھوڑ دینا... اوور۔"

ایس او کا وہ پیغام سُن کر سلطان شاہ پریشان ہو گیا۔

"بس یہیں روک لو۔" وہ بیتابانہ انداز میں اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"دس منٹ تو ہو لینے دو، ابھی تو ہمیں چلے تین چار منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے۔" میں نے اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"تو پھر وہی بٹن تلاش کرو جسے دبانے سے دھماکے کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔"

"اب وہ بھی بے سود ہے۔ اُسے انجن اسٹارٹ کرنے کے ایک منٹ کے اندر اندر دبانا ضروری ہوتا ہے۔" میں نے اُسے یاد دلایا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "سکون سے بیٹھے رہو، ایسے لوگوں کے لیے ایسے انتظامات بہت سہل ہیں لیکن اس وقت یہ محض گیدڑ بھبکی ہے... وہ ہماری راہ روکنا چاہتے ہیں... ایس او کو اچانک ہم سے ہمدردی کیوں ہو گئی؟ ان کے نکتۂ نظر سے سوچو تو ہم زندہ ہاتھ نہ آ سکیں تو ہمارا مر جانا ہی بہتر ہے اور وہ ہمیں زندہ رہنے کا گر بتا رہا ہے۔"

”ان لوگوں کو تم ہی سمجھتے ہو... میں تو بس تمہارے ساتھ ہوں“ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تنظیم میں باس کا لفظ پہلی بار سنا ہے، پتا نہیں یہ کون ذات شریف ہے۔“

”کوئی بھی ہو لیکن یہ ایس او بہت چالاک آدمی ہے۔“ سلطان شاہ نے تعریفی لہجے میں کہا۔

”یہ اندازہ کیسے لگا لیا تم نے؟“

”ڈیوٹی روم سے بات ہوتے ہی اس نے اندازہ لگایا کہ ہم ساری باتیں سن رہے ہوں گے۔“

میں دل ہی دل میں اس کی کم فہمی پر ہنس دیا۔ ”بڑی معمولی بات ہے یہ آپریٹس بہت سے لوگوں کے پاس ہوں گے۔ ہنگامی حالات میں انہیں ہر وقت آن رکھا جاتا ہے جس کسی کو بات کرنا ہو وہ بٹن دبا کر اپنا کوڈ بتاتے ہوئے مطلوبہ آدمی کو پکارتا ہے۔ یہ پیغام ہر ایک اپنے آپریٹس پر سنتا ہے اور مطلوبہ آدمی جوابی سگنل دیتا ہے۔ وہ بھی ہر آپریٹس پر سنا جاتا ہے اُسے معلوم تھا کہ ڈولی کا آپریٹس آن ہے اور اگر جیپ ہمارے قبضے میں ہے تو ہم ساری گفتگو سن رہے ہوں گے۔“

”یہ تو بڑی سیدھی سی بات ہے۔“ وہ جھینپے ہوئے انداز میں ہنسا۔ ”تم بات کرو گے اس سے؟“

”ذرا حکمہ دوں گا انہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ باس کہاں سے پیدا ہو گیا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اگنیشن آف کر دیا تاکہ گفتگو کے دوران انجن کا شور نہ سنائی دے لیکن جیپ اپنے زور میں بے آواز سڑک پر بڑھتی رہی۔

”ڈولی نمبر دو کالنگ ڈیوٹی روم... اوور۔“ میں نے پیغام نشر کیا۔

”ڈیوٹی روم ریسیونگ... شاید تم ان ہی دونوں میں سے ایک ہو جن کی تلاش جاری ہے... اوور۔“

”ہاں — میں نے جیپ چھوڑ دی ہے، میرا دوسرا ساتھی لاپتہ ہے، اس کے بارے میں میں تمہارے باس سے بات کرنا چاہتا ہوں... اوور۔“ میں نے اندھیرے میں سلطان شاہ کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

”باس سے رابطہ ہونا مشکل ہے — تمہارا پیغام پہنچا دیا جائے گا... اوور۔“

”میری بات صرف اُسی سے ہو سکتی ہے... اوور۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”میں معلوم کرتا ہوں، تھوڑی دیر انتظار کرو... اوور۔“

”میں نے ایک بہترین پناہ گاہ تلاش کر لی ہے اور [illegible] چاہتا ہوں، زیادہ دیر انتظار نہ کر سکوں گا... اوور۔“

”تم اس وقت کہاں سے بول رہے ہو؟ اوور۔“ سوال کیا گیا۔

”فی الحال منہ سے بول رہا ہوں، غیر ضروری باتوں میں وقت ضائع نہ کرو — اگر تمہارا باس بات نہیں کرنا چاہتا تو یہ آپریٹس میرے لیے بے سود ہے۔ میں اسے [illegible] کر اپنی راہ لوں گا۔ مجھے جلد از جلد تمہارا جواب چاہیے۔ اگر تم نے تین منٹ میں کال نہ کیا تو میں یہ آپریٹس تباہ کر دوں گا... اوور۔“

”شاید تمہیں اپنے ساتھی سے ہمدردی [illegible] ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”میں تین منٹ میں [illegible] دینے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے جیپ چھوڑ دی ہے یا نہیں؟ چھوڑ دی ہے تو اب کہاں ہو؟ اوور۔“

”شاید تمہارے کان خراب ہیں، ورنہ تم سمجھ [illegible] سکتے کہ اس وقت جیپ کے انجن کا شور مفقود ہے۔ ایک خطرے سے واقف ہو جانے کے باوجود اسے [illegible] رکھنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں اس [illegible] جیپ سے بہت دور ایک ایسی پناہ گاہ میں موجود ہوں جہاں تمہارے آدمی قیامت تک [illegible] سراغ نہ لگا سکیں گے... اوور۔“

”تم جہاں ہو وہیں ٹھہرو، میں باس کو تلاش کرتا ہوں۔ اوور اینڈ آل۔“

میں نے گفتگو ختم ہوتے ہی دوبارہ رینگتی ہوئی جیپ کا انجن اسٹارٹ کیا اور گیئر ڈال کر گاڑی کی رفتار بڑھا [illegible]

”تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟“ سلطان شاہ نے [illegible] آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”محض انہیں اُلجھا رہا ہوں، ہم آرام سے [illegible] پہنچ کر سو جائیں گے اور ان کے آدمی ساری [illegible] اور ویرانے میں ہماری تلاش میں بھٹکتے رہیں گے۔“

”وہ تو ظاہر ہے لیکن میرا سوال [illegible] میں تھا۔ کیا تم واقعی اسے تباہ کر دو گے؟“

”کیا میں اسی قدر احمق نظر آتا ہوں تمہیں؟“ [illegible] نے شگفتہ لہجے میں سوال کیا۔ ”میں تو انہیں یہ جتانا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں ہے اور اسے ساتھ لے کر پھرنے کے بجائے میں اسے تباہ کرنے کو ترجیح دوں گا۔ اس طرح شاید وہ اس آپریٹس کا استعمال ترک نہ کریں اور ہم ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہیں۔“

”ہاں یہ بات تو ہے، اس پہلو پر میں نے غور ہی نہیں کیا تھا... وہ ہمیں دھوکا دینا چاہتے ہیں اور تم انہیں بیوقوف بنا رہے ہو۔“ میری وضاحت پر سلطان شاہ خوش ہو گیا۔

رات کے سناٹے میں جیپ آگے بڑھتی رہی۔ وہ راستہ میرے لیے بالکل غیر معروف اور اجنبی تھا لیکن میں مسلسل اسی نیم پختہ سڑک پر ڈرائیونگ کرتا رہا اور آخر کار ہمیں شہری آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ اس دوران میں سلطان شاہ خاصا مضطرب رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار اپنی رسٹ واچ کا جائزہ لے رہی تھیں، لیکن میں اس بارے میں خاموش ہی رہا۔ ویسے مجھے اندازہ تھا کہ وہ وقت کے حوالے سے دو باتوں کا منتظر تھا۔

اوّل تو اُسے تین منٹ کی مدّت گزرنے کے بعد ڈیوٹی روم سے پیغام ملنے کی اُمید تھی لیکن وہ وقت خاموشی سے گزر گیا۔ اس کے بعد سلطان شاہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جیپ کا انجن اسٹارٹ ہونے کے دس منٹ بعد کیا ہوتا ہے لیکن اس بارے میں بھی اُسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار نظر آنے لگے مگر میں نے سختی کے ساتھ اپنی زبان بند ہی رکھی۔

”کیا میری عقل میں بھُس بھرا ہوا ہے؟“ آبادی کے درمیان ایک سڑک سے گزرتے ہوئے اس کی غصیلی آواز اُبھری تو میں بوکھلا گیا۔ اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے گھورے جا رہا تھا۔

”میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی سلطان شاہ۔“ میں نے نرم اور تحمل آمیز لہجے میں کہا۔

”تم کہو یا نہ کہو، لیکن رویّے سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔“ اس کی آواز سے غصّے سے زیادہ جھلاہٹ عیاں تھی۔

میں نے پل بھر میں اپنے دل ہی دل میں گزرے ہوئے رویّے اور کہے ہوئے الفاظ کا جائزہ لے ڈالا، لیکن اپنی کوئی غلطی دریافت نہ کر سکا۔ پھر بھی اس کی دل جوئی کی خاطر میں نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے دانستہ تمہاری دل آزاری کی کوشش نہیں کی سلطان شاہ! نادانستگی میں کچھ ہو گیا ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔“

”اوئے معافی کو غرق کرو۔“ وہ یک بیک اپنے قبائلی خول میں سمٹ گیا۔ ”یہ بتاؤ کہ ایک بات تم بھی سنتے ہو، میں بھی سنتا ہوں۔ تم فوراً جھوٹ کو پکڑ کر صحیح نتیجے پر پہنچ جاتے ہو اور میں دھوکا کھا جاتا ہوں — ایسا کیوں ہوتا ہے؟ میرے مغز میں کہاں خرابی ہے؟“

اس کی وضاحت سن کر میرے ذہن سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ ”یہ مغز کی خرابی نہیں، تجربے کی کمی ہے — میں انہیں اور اُن کی رگ رگ کو مدّت سے جانتا ہوں، تمہارے لیے یہ لوگ نئے ہیں...“

”میں ایک ایک سیکنڈ گن رہا تھا کہ کب دس منٹ پورے ہوتے ہیں اور جیپ دھماکے سے اُڑتی ہے۔“ وہ میری بات کاٹ کر تلخ لہجے میں بولا۔ ”مگر کچھ بھی نہ ہوا، سارا انتظار غارت ہو گیا۔“

میں زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔ اونچی آواز میں ہنستا تو وہ مجھے ہی پھاڑ کھانے کو دوڑ پڑتا۔ ”کچھ ہو ہی جاتا تو اس وقت ہم دونوں یوں باتیں کرنے کے لیے زندہ نہ ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمہاری ذہنی رو کچھ بھٹکی ہوئی ہے۔“

اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔ اُسے یوں چُپ لگی، جیسے اس نے اپنی غلطی کا احساس کر کے سرے سے زبان نہ کھولنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

شہر کے ایسے حصے میں داخل ہونے کے بعد، جہاں سے مجھے سواری ملنے کی اُمید تھی، میں جیپ سے جان چھڑانے کے امکانات پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک آپریٹس پر پیغام سنائی دینے لگا۔

”ہیلو ڈولی نمبر دو — ڈیوٹی روم کالنگ... اوور۔“

میں خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ میں نے اُسے دوبارہ رابطے کے لیے تین منٹ کی مہلت دی تھی اور وہ پیغام کم و بیش پندرہ منٹ بعد سنائی دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھ سے وقت لینے کے بعد اس عمارت سے میری اور جیپ کی تلاش میں کوئی دوسری گاڑی جنگل کے پار نیم پختہ سڑک کی طرف بھیجی گئی ہو گی۔ اس دوران میں ان لوگوں نے باہمی پیغام رسانی کے لیے بھی آپریٹس کا استعمال ترک کیے رکھا تاکہ مجھے ان کی حکمتِ عملی اور سرگرمیوں کا اندازہ نہ ہو سکے۔ پھر جب تلاش کی مہم ناکام ہو گئی اور جیپ کا کہیں سراغ نہ مل سکا تو انھوں نے آپریٹس پر دوبارہ مجھ سے رجوع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس آلے پر تین بار وہی پیغام من و عن دُہرایا گیا۔ چوتھی بار اس میں یہ اضافہ بھی کر دیا گیا کہ ان کا باس مجھ سے گفتگو کرنا چاہتا تھا، لیکن میں نے ہر پیغام کو نظر انداز کر دیا۔ اس دوران میں سلطان شاہ کسی پتھر کے بُت کی طرح لاتعلقانہ انداز میں بیٹھا ونڈ شیلڈ کے پار سڑک کو گھورتا رہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ اس کال کا جواب دوں یا نہ دوں؟“ میں نے جمود توڑنے کی نیّت سے اس سے سوال کیا۔

"پتا نہیں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آج کی رات مجھے معاف رکھو، میری کھوپڑی پر شاید برف جم گئی ہے۔ میں کوئی ڈھنگ کا مشورہ نہ دے سکوں گا۔"

جیپ کو غائب پا کر وہ لوگ سمجھ چکے ہوں گے کہ جیپ چھوڑنے کے معاملے میں میں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں پہلی بار انجن اسٹارٹ کرنے کے بعد سے ٹھیک دس منٹ تک انتظار کرتا رہا لیکن جب ایس او کے بیان کے مطابق کوئی دھماکا نہ ہوا تو دوبارہ جیپ لے بھاگا۔ میں نے دوسری بات آپریٹس کے بارے میں کہی تھی کہ تین منٹ تک جواب نہ ملا تو اسے تباہ کر دوں گا، ایسے پیغامات نشر کر کے شاید وہ یہی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں نے آپریٹس تباہ کر دیا تھا یا اس پر بدستور ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

متعدد کوششوں کے بعد بھی میں نے کوئی جواب نہ دیا تو آپریٹس پر خاموشی چھا گئی اور میں یکسوئی کے ساتھ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں مصروف ہو گیا جہاں جیپ سے پیچھا چھڑانے کے بعد دوسری سواری آسانی مل سکے۔

■

کمرے میں مکمل تاریکی کا راج تھا۔ ہم دونوں ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں مقیم تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ سلطان شاہ روشنیاں بجھانے کے بعد فوراً ہی سو گیا تھا لیکن میری آنکھوں میں دور دور تک نیند کا پتا نہیں تھا۔

ہم دونوں کسی دشواری کے بغیر ہوٹل پہنچے تو رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ خورد و نوش کی خواہش پہلے سے موجود ہی نہیں تھی، دوسری طرف سلطان شاہ کو مسلسل چپ لگی ہوئی تھی۔ لہٰذا ہم دونوں خاموشی سے لباس تبدیل کر کے اپنے اپنے بستر پہ دراز ہو گئے تھے۔ جیپ سے حاصل ہونے والا لاسلکی آپریٹس بدستور آن تھا، اسے میں نے سرہانے تپائی پر رکھ لیا تھا جہاں گھور اندھیرے میں چمکنے والا ننھا سا سرخ بلب آپریٹس کی سپلائی آن ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

جیپ میں مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی ناکام کوششوں کے بعد دوسری طرف سے مسلسل سناٹا طاری تھا۔ جیپ چھوڑنے کے بعد ٹیکسی میں سفر کرتے ہوئے میں نے آپریٹس مختصر سی مدت کے لیے آف کر دیا تھا تاکہ ٹیکسی ڈرائیور میری طرف سے شبہات کا شکار نہ ہو، لیکن کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے اسے آن کرتے ہوئے اس کا تفصیلی جائزہ بھی لے ڈالا تھا۔ جس کے نتیجے میں انکشاف ہو[illegible] وہ لاسلکی آلہ اپنے نشریاتی مرکز سے پندرہ میل قطر میں کارآمد تھا۔ گو ہوٹل تک واپسی کے لیے ہم نے بہت طویل سفر طے کیا تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ ہم اس وقت بھی اس عمارت سے کسی بھی طرح سات آٹھ میل سے زیادہ دور نہیں تھے اور میں بے چینی کے ساتھ اس آپریٹس پر ان لوگوں کی گفتگو سننے کا منتظر تھا۔

میری آنکھوں میں دور تک نیند کا پتا نہیں تھا۔ لہٰذا میں سگریٹیں پھونک کر وقت گزاری کر رہا تھا۔ ایش ٹرے میں تیسری سگریٹ مسلنے کے چند منٹ بعد میں نے چوتھی سگریٹ سلگائی تو اچانک ہی سلطان شاہ بول پڑا۔

"کب تک سگریٹیں پھونکتے رہو گے؟ تم سو کیوں نہیں جاتے؟"

"اوہ — تو تم بھی جاگ رہے ہو؟" میں نے خوشگوار حیرت کے ساتھ کہا۔ "میں دراصل ان کی جانب سے کسی ردِعمل کا منتظر ہوں جو اس ٹرانسمیٹر پہ ہونے والی گفتگو سے ظاہر ہو سکے گا۔"

اس نے اپنے سرہانے لگا ہوا سوئچ دبا کر نائٹ لیمپ آن کر دیا اور مسہری سے اٹھ گیا۔ "اس عمارت کے پاس ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ مجرموں کا گڑھ ہے لیکن میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ کار کا وہاں سے تعلق کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔"

"یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تم نے رمضان چاچا سے ملنے والے فون نمبر کے ذریعے اس عمارت کا سراغ لگایا تھا اور وہ نمبر انھیں تصویر نے دیا تھا تاکہ رمضان چاچا مجھ سے مڈبھیڑ ہوتے ہی اسے میری موجودگی سے آگاہ کر سکیں۔"

"ایسی صورت میں تو رمضان چاچا کو بھی خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔" اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"یہ اسی وقت ممکن ہے جب انھیں شبہ ہو جائے کہ میں اس عمارت کے اطراف میں موجود تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں کوئی قدم اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور عمارت والوں نے ہمارے خلاف کارروائی کا آغاز کر دیا۔ ان حالات میں اس بات کا تعین کرنا بہت دشوار ہو گا کہ گھیرے جانے والے کون تھے۔" پھر میں نے چونک کر سوال کیا۔ "گاڑی تو ہاتھ سے گئی، اب اس کا کیا کرو گے؟"

"کچھ بھی نہیں، جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"لیکن تمھارے دوستوں نے محض اعتماد کی بنا پر وہ گاڑی تمھیں دی تھی۔ اسے چرانا ان کا اپنا فعل تھا۔ چوری کے بعد انھوں نے اس پر خاصی رقم بھی صرف کی ہو گی، سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے وہ یہاں تک آئے تھے اور تم نے انھیں یکسر محروم کر دیا۔"

"تفصیل جاننے کے بعد وہ مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کریں گے، کچھ رقم دینا چاہی تو میری اس حرکت کو وہ دوستی کی توہین قرار دیں گے، یہ نہ سہی وہ کسی کی دوسری کار اڑا لیں گے۔ وہ خالی ہاتھ لوٹنے سے تو رہے۔"

"اگر یہی بات ہے تو کیوں نہ اس کار کے حوالے سے پولیس کی توجہ ادھر مبذول کرا دی جائے، بہرحال وہ کراچی سے چرائی گئی ہے۔"

"پولیس کو اس چکر میں نہ ڈالو تو بہتر ہے۔ میں ان لوگوں کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دوں گا، ہو سکتا ہے کہ وہ کار حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں، پولیس درمیان میں آ گئی تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔"

"وہاں تو جس نے بھی کار کا رخ کیا وہ ان کا نشانہ بن جائے گا۔" میں نے کہا۔

"وہ لوگ اتنے بودے نہیں ہیں... خود کوئی راہ نکال لیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ براہِ راست اسی پھاٹک پر پہنچ کر عمارت کے مکینوں سے دریافت کر بیٹھیں کہ وہ کار وہاں کب اور کیسے پہنچی۔ اگر انھوں نے مالکانہ انداز اختیار کیا تو اس عمارت کے مکینوں کو بآسانی یہ باور کرا سکیں گے کہ وہ درحقیقت ان کی کار ہے جو چرا لی گئی تھی۔"

"تم جو چاہو کر سکتے ہو۔" میں نے بحث ختم کرتے ہوئے کہا۔ "اب تو یہ سوچو کہ اس عمارت میں داخلہ کیسے ہو گا؟"

"مجھے تو یہ اقدام ناممکن ہی نظر آتا ہے... کسی طرح گھس بھی گئے ت[illegible] نکلنا دشوار ہو جائے گا۔"

"صبح میں رمضان چاچا سے ملوں گا۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اور ان سے تصویر کو فون کراؤں گا... دیکھنا ہے کہ ادھر سے کیا جواب ملتا ہے اور وہاں تصویر کی کیا حیثیت ہے؟"

"ڈیوٹی روم کالنگ فار ایس او... اوور۔" اچانک کمرے کی محدود فضا میں ریڈیائی شور کے ساتھ مانوس سی آواز ابھری اور ہم دونوں خاموش ہو گئے، میرے دل کی دھڑکنیں یک بیک تیز تر ہو گئی تھیں۔

"ایس او اسپیکنگ... اوور۔" فوراً ہی دوسری تھکی ہوئی آواز ابھری۔

"پوری فارمیشن کو سمیٹ کر واپس لوٹ آؤ، وہ دونوں چکمہ دے کر نکل گئے ہیں۔ باس کا خیال ہے کہ تم نے انھیں سواری سے محروم کرنے کے لیے بہت عمدہ دھمکی دی تھی لیکن دس منٹ کا تعین کر کے تم نے موقع گنوا دیا، ان میں سے ایک سے ٹرانسمیٹر پہ بات ہوئی تھی تو پس منظر میں جیپ کے انجن کا شور نہیں تھا۔ شاید اس نے بوکھلا کر گاڑی چھوڑ دی تھی۔ اس نے دس منٹ تک دھماکے کا انتظار کیا، جب کچھ نہ ہوا تو دوبارہ جیپ لے بھاگا، دوسری گاڑی ادھر دیر سے پہنچی تھی... اوور!"

"مم... مگر اس کا دوسرا ساتھی؟" آپریٹس پر ایس او کی ہکلاتی ہوئی آواز ابھری۔ "وہ تو اپنے ساتھی سے بھٹک گیا تھا۔ اسے کیوں نہ تلاش کیا جائے؟ اوور۔"

"تین ٹرینر کتے لے کر اس کی تلاش میں نکلنے والے ہیں۔" ڈیوٹی روم سے ناخوشگوار لہجے میں کہا گیا۔ "اپنے آدمیوں کی موجودگی میں کتوں کا کام دشوار ہو جائے گا، ہو سکتا ہے وہ تمھارے ہی کسی آدمی کی بو پر ہو لیں... اوور اینڈ آل۔"

"ایک بات اور پوچھنی تھی — اوور۔" ڈیوٹی روم سے سلسلۂ کلام ختم کیے جانے کے باوجود ایس او کی آواز سنائی دی، اس کے لہجے میں خوف کا عنصر غالب ہو چلا تھا۔

"دو پوچھ لو... لیکن وقت برباد نہ کرو۔ اوور۔" جواب نہایت خشک لہجے میں دیا گیا۔

"ٹرانسمیٹر بدستور زیرِ استعمال رہے گا؟ اوور۔"

"احمقانہ سوال مت کیا کرو۔" اس بار اسے بری طرح پھٹکار دیا گیا۔ "اس وقت ہدایات کسی غیبی ذریعے سے نہیں دی جا رہیں۔ جیپ لے کر بھاگنے والا بہت محتاط تھا، اس نے ٹرانسمیٹر تلف کر دیا ہو گا کہ کہیں اسی میں کوئی دھماکا خیز مادہ پوشیدہ نہ ہو — ٹرانسمیٹر اس کے پاس ہوتا تو وہ ہمارے رابطے کی کوششوں کا جواب ضرور دیتا — وہ خود باس سے بات کرنے کے لیے بے چین تھا لیکن ہمیں وقت دینے کے لیے آمادہ نہیں تھا — یہ وضاحت شاید تمھارے لیے کافی ہو گی — اوور اینڈ آل۔"

اس بار ایس او نے زبان نہ کھولی اور لائن پر سکوت چھا گیا۔

"تو اب کتے میدان میں لائے جا رہے ہیں۔" کافی دیر کے بعد پہلی بار سلطان شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار

ہوئی۔

"کتے بھی ایسے خونخوار جو دوست یا دشمن کی تمیز کیے بغیر انسانی بو پر جھپٹتے ہیں۔" میں نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "آج ستارے ہی اچھے تھے جو ہم زندہ سلامت وہاں سے لوٹ آئے۔"

"بس قدم کچھ دیر پہلے اٹھا لیا جاتا تو ہم بے موت مارے جاتے۔"

"ابتدا میں ان کے آدمی ہمارے پیچھے نکلے تو انھیں ہمارے پکڑے جانے کی پوری اُمید رہی ہوگی، بس اسی میں ہمیں وقت مل گیا کیونکہ اپنے آدمی واپس بلائے بغیر وہ کتے نہیں نکال سکتے تھے۔ اب دو باتیں صاف ہوگئیں۔ اوّل تو یہ کہ اس عمارت میں گھسنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ آدمیوں کی نگاہوں سے بچ گئے تو رکھوالی کے کتے بھی ضرور ہوں گے، دوئم یہ کہ ٹرانسمیٹر کا استعمال بدستور جاری رہے گا۔ اس بارے میں وہ غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے کہ معاملہ تمہارے اندازے کے بالکل ہی برعکس ہو۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"کتوں کو لانے کا فیصلہ چھ سات گھنٹے بعد کیا گیا ہے یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس وقت ٹرانسمیٹر پر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہمیں سنانے کے لیے گفتگو کی گئی ہو۔ ورنہ ڈیوٹی روم والے کو گرمی دکھانے کے باوجود یہ وضاحت کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ تم نے ٹرانسمیٹر تلف کردیا ہوگا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا، اس کی بات میں خاصا وزن تھا اور اگر اس کا نظریہ درست تھا تو اس عمارت کے مکین اپنے تمام تر وسائل کے باوجود ہم سے خائف تھے اور ہمیں عمارت سے دور رکھنے کے لیے ان خونخوار کتوں کا افسانہ تراشا گیا تھا جن کا غالباً سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔

میں ان خطوط پر غور کرتا رہا اور میرے ذہن میں نئے دریچے وا ہوتے چلے گئے۔ آپریٹس ہماری تحویل میں تھا لیکن انھوں نے ہمیں یہ تاثر دینا چاہا تھا کہ وہ اسے فراموش کرچکے ہیں۔ یوں کسی وقت وہ اسی آپریٹس پر باہمی گفتگو کے ذریعے ایسا جال ترتیب دیتے کہ ہم اپنی دانست میں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں کہیں کوئی کارروائی کرنے پہنچتے اور نہایت آسانی کے ساتھ اُن کے ہاتھوں میں پڑ جاتے۔

میں نے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا تو سلطان شاہ کے چہرے کی رونق قابلِ دید تھی۔ اسے خوشی ہوئی کہ میں نے اس کی رائے کو اس حد تک قبول کرلیا تھا کہ ساری حکمتِ عملی ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ اس وقت میری طبیعت تو یہی چاہ رہی تھی کہ ان لوگوں سے رابطہ قائم کرکے انھیں جتا دوں کہ ہم اتنے احمق نہیں تھے جتنا ہمیں سمجھا جارہا تھا لیکن سلطان شاہ نے اس فیصلے سے شدّت کے ساتھ اختلاف کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں خاموشی اختیار کرکے انتظار کرنا چاہیے کہ وہ ہم پر کس طرح سے جال ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں پھر اسی کے مطابق ہمیں اپنے اقدامات کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

اسی دوران میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے مختلف آوازوں کے ساتھ ایس او کے مکالمات آپریٹس پر سنائی دیتے رہے لیکن میں نے ان پیغامات پر کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ ان کے ذریعے یہ تاثر پیدا کیا جارہا تھا کہ عمارت کے اطراف میں پھیلے ہوئے لوگوں کو سمیٹ کر واپس لے جایا جارہا ہے۔

میں نے سونے کی پوری کوششیں کرڈالیں لیکن وہ ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی اور صبح کا اُجالا پھیلتے ہی میں نے بستر چھوڑ دیا۔ اس وقت سلطان شاہ گہری نیند سو رہا تھا۔

میں نے اس کی نیند میں خلل ڈالے بغیر اپنی تیاری مکمل کی اور ہوٹل سے روانہ ہوگیا۔ پچھلی رات کے واقعات کے بعد مجھے رمضان چاچا کی سلامتی کی طرف سے فکر لاحق ہو چلی تھی اور میں ان سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔

ہوٹل سے روانگی کے بعد میں اپنے پرانے آبائی محلّے کی حدود میں داخل ہوا تو مجھے چوکنا ہوجانا پڑا کیونکہ غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں پر مشتمل اس آبادی میں سنسنی خیز سراسیمگی سی نظر آرہی تھی اور لوگ گھروں کو چھوڑ کر ٹولیوں کی صورت میں سر جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کس طرح اس افراتفری کے اسباب دریافت کروں۔

باہر سے آنے والے کسی اجنبی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تو وہاں غیر معمولی بات کوئی نہ تھی۔ ان تبدیلیوں کو وہی بھانپ سکتا تھا جو اس محلّے اور اس جیسی دوسری آبادیوں کے معاملات اور ماحول سے بخوبی واقف ہو۔ میں محسوس کررہا تھا کہ میں نے اگر اس صورتِ حال کے بارے میں زیادہ تجسس کا اظہار کیا تو بلاوجہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاؤں گا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ اس طرح میرے لیے کوئی بڑی دشواری کھڑی ہوجاتی۔

پیش قدمی کرتے ہوئے میں گلی میں گھسا تو کچھ آگے رمضان چاچا کے مکان کے قریب بھیڑ نظر آئی۔ کسی مکان سے عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں ... میرے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ شاید رمضان چاچا کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا لیکن ذہن نے فوراً ہی اس نظریے کی نفی کردی۔

اگر وہاں قتل کی واردات کا ارتکاب ہوا ہوتا تو سیکڑوں کی بھیڑ میں دس پانچ پولیس والے بھی نظر آرہے ہوتے جبکہ مجھے دور دور تک کوئی باوردی سرکاری اہلکار نظر نہیں آرہا تھا۔

میں کسی حیران و پریشان اجنبی کی طرح صورتِ حال کا جائزہ لیتا ہوا سست روی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا، اس دوران میں یہ واضح ہوگیا کہ گریہ و بین کی آوازیں رمضان چاچا کے مکان ہی سے آرہی تھیں۔

جب مجھے اپنے بڑھتے ہوئے تجسس پر قابو پانا دشوار ہوگیا تو میں جائزہ لے کر سنجیدہ رو لوگوں کی ایک ٹولی کی طرف بڑھ گیا جو اپنے چہروں پر تشویش کے آثار لیے، سرگوشیانہ لہجے میں تبادلہ خیال میں مصروف تھے۔

میرے قریب پہنچتے ہی بیک وقت سب کی خشک اور سرد نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں۔

"کیا ہوگیا ہے یہاں؟" میں نے اپنے لب و لہجے کو حتی الامکان نرم اور مصالحانہ رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہوا ہے؟" ایک ادھیڑ عمر شخص غم و غصے سے مغلوب لہجے میں پھٹ پڑا۔ "اندھیر ہے اندھیر — پہلے صرف چوری ہوتی تھی، اب سینہ زوری ہونے لگی ہے اور حالت یہ ہے کہ پولیس کا اب تک پتا نہیں ہے۔"

میں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بے چارگی کے ساتھ باری باری دوسروں کی طرف دیکھا اور ان میں سے ایک کو شاید مجھ پر رحم آگیا۔ "جاؤ بھائی، اپنا وقت خراب نہ کرو ... کیا پتا کہ اس بھیڑ میں سے تم بھی اٹھا لیے جاؤ اور تمہارا کوئی پُرسانِ حال نہ ہو .... یہ بیسویں صدی ہے، جو کچھ ہو، وہ بھی کم ہے۔"

"کیا اغوا ہوگیا کسی کا؟" اس کی ہمدردی سے موقع پا کر میں نے فوراً ہی سوال جڑ دیا۔

"اغوا؟" ان میں سے ایک تلخ لہجے میں بولا۔ "رمضان چاچا اغوا ہی ہوگیا ہوتا تو کم از کم تھانے والے رپٹ تو لکھ ہی لیتے۔ اب تو وہ کہتے ہیں کہ بندہ غائب ہوا اور پھر لوٹ آیا تو رپورٹ کس بات کی؟ جس کو زیادہ ہمدردی ہے وہ پہلے رمضان چاچا کا دماغی معائنہ کرائے، رپورٹ ٹھیک ٹھاک نکلی تو تھانے والے سوچیں گے۔"

"کیا کوئی غائب ہوکر لوٹ آیا؟" میں نے اندرونی تجسس کو دباتے ہوئے انجان بن کر سوال کیا۔

"ارے بھائی! رات گئے کوئی رمضان چاچا کو بلانے آیا تھا اور وہ گانٹھ کا پورا کسی کو بتائے بغیر اجنبی کے ساتھ ہولیا اور گھر والے اس کے انتظار میں سوکھتے رہے، ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے وہ لنگڑاتا ہوا، ہانپتا کانپتا واپس پہنچا ہے اور کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ بظاہر وہ ٹھیک ٹھاک لگتا ہے لیکن اس کی لنگڑاہٹ اور چہرے کی رنگت سے پتا چل رہا ہے کہ اسے بُری طرح اندرونی چوٹیں آئی ہیں لیکن وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ گھر والوں نے پڑوسیوں کو بلا کر زیادہ پوچھ گچھ کی تو اس نے خود کو ایک کوٹھری میں مقفل کرلیا ہے۔ کہتا ہے کہ اسے اس کے حال پر نہ چھوڑا گیا تو وہ اپنی زندگی ختم کرلے گا۔ محلّے کے سیانوں نے پولیس کو خبر دی تو وہ رپٹ لکھنے کو ہی تیار نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان چاچا کسی سے ڈرا ہوا ہے۔"

"میں دراصل ایک اخبار سے آیا ہوں۔" میں نے ان میں رسائی ...... حاصل کرنے کے لیے فی البدیہہ ایک عمدہ بہانا تراشتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ بھنک ملی تھی کہ اس علاقے میں گڑبڑ ہے اور میں اپنے فوٹوگرافر کا انتظار کیے بغیر دوڑا چلا آیا۔ مجھے تفصیلات مل جائیں تو میں کل ہی پولیس کی دھجیاں اڑا کر رکھ دوں گا ... کیسا اندھیر ہے کہ رپورٹ درج کرنے سے انکار کرکے تھانے کا کاغذی ریکارڈ صاف ستھرا رکھا جائے، خواہ اس میں کسی شہری کو کیسا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔"

اخباری تعلق کا بہانا بہت زیادہ کارگر ثابت ہوا۔ اور مجھے فوری طور پر ایک خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی پیشکش کی کہ میں رمضان چاچا سے ملنے کی کوشش کروں شاید وہ ملنے پر آمادہ ہو ہی جائے لیکن میں نے اس پیشکش کو ٹال دیا۔ مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ رمضان چاچا محض میری مدد کرنے کی بنا پر تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ نجانے تشدد کے دوران میں اس پر کیا گزری اور وہ کیا کچھ اُگل آیا تھا یہ سب معلوم کرنے کے لیے تخلیہ ضروری تھا۔

میں مجمع سے معلومات حاصل کرکے واپس روانہ ہوگیا۔

اس وقت لاہور میں اے لُوٹیا تو جب کے دو ٹھکانے میری نظروں میں آچکے تھے۔ پہلا ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا

دفتر تھا اور دوسرا وہی قلعہ نما رہائشی مکان جہاں پچھلی رات ہم مشکلات سے دوچار ہوئے تھے۔ اور قرائن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ منشیات کی تجارت میں کاغذی یا زبانی کارروائیوں کا مرکز وہی مکان تھا جہاں جنگی پیمانے پر حفاظتی انتظامات پائے جاتے تھے اور ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کی آڑ میں منشیات کا برآمدی دھندا چلایا جا رہا تھا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ رمضان چاچا سے مجھے ایک فون نمبر مل گیا تھا جس کے ذریعے ہماری رسائی اس عمارت تک ہو گئی تھی جو غالباً تو فیر اور تصویر کی رہائش گاہ کے طور پر زیرِ استعمال تھی لیکن اس کا محلِ وقوع کچھ ایسا تھا کہ ہمارے لیے وہاں سے براہِ راست معلومات حاصل کرنا ناممکن نظر آرہا تھا۔ لہٰذا میں نے اس بارے میں نصیر خان کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا جو ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائرکٹر ڈی۔ اے ملک کے مختارِ عام کے طور پر ادارے کے معاملات چلاتا تھا لیکن اس نے خود کبھی اپنے ایم ڈی کو نہیں دیکھا تھا۔

لاہور کے پچھلے پھیرے میں خوش قسمتی سے نصیر خان پوری طرح ہمارے شکنجے میں پھنس گیا تھا اور اس نے بہت کچھ اعترافات کیے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اسے بلیک میل کر کے ڈی۔ اے ملک نے خود سامنے آئے بغیر اپنے لیے کام کرنے پر مجبور کیا تھا اور دفتری معاملات کے سلسلے میں عموماً وہ خود ہی نصیر خان کو فو[illegible] پر ہدایات دیتا رہتا تھا۔

روزمرہ معاملات سے باخبر رہنے کے لیے اس کا طریقۂ کار عجیب تھا۔ عملے کے کسی بھی رکن کو دفتری اوقات کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی وہاں رکنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی اور نصیر خان ڈی اے ملک کی ڈاک اپنی میز پر چھوڑ کر واپس چلا جاتا تھا اور اگلے دن دفتر کھلنے سے قبل پُراسرار طریقے پر وہ ڈاک [illegible] دفتر سے اٹھوا کر تازہ ترین تحریری ہدایات وہاں رکھوا[illegible] جاتی تھیں یوں ادارے کا سربراہ خود سامنے آئے بغیر کامیابی کے ساتھ نصیر خان سے کام چلا رہا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ باس کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

میں نے پہلے براہِ راست ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے دفتر جانے کا فیصلہ کیا لیکن اچانک ہی مجھے غزالہ کا تجربہ یاد آگیا اور میں نے وہ ارادہ ترک کر دیا کیونکہ نصیر خان کے دفتر میں کسی جگہ ایک ایسا خفیہ کیمرہ نصب تھا جو وہاں آنے والے ہر ملاقاتی کی تصویر لے لیتا تھا۔ نصیر خان کے لیے وہ کیمرا شجرِ ممنوعہ تھا۔ اس میں سے رول نکالنے اور نیا فلم رول ڈالنے کی ذمے داری اسی شخص کے سر تھی جو دفتر بند ہونے کے بعد سب کی لاعلمی میں وہاں داخل ہوتا تھا۔

میں نے ایک پبلک بوتھ سے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ فون کیا تو دوسری طرف سے غالباً نصیر خان نے خود ہی کال ریسیو کی کیوں کہ میں نے اس کا ڈائریکٹ نمبر ڈائل کیا تھا۔

"نصیر خان پلیز!" یقین کے باوجود میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"بول رہا ہوں!" دوسری طرف سے پُراعتماد لہجے میں کہا گیا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں دوست!" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم کون ہو؟ میں تمھیں پہچان نہیں سکا۔" اس کی الجھن کی آواز سنائی دی۔

"ذہن پر زور دو گے تو پہچان لو گے، نشاط کے ساتھ محفلِ نشاط جما کر سونے کے بعد تمھاری آنکھ ہمارے ساتھ ہی کھلی تھی۔ ہم نے وعدے کا پاس کیا ہے، امید ہے کہ تم بھی تعاون کرو گے۔"

"اوہ! تو تم پھر آگئے ہو۔" اس کی مضطربانہ آواز سنائی دی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا حافظہ خاصا اچھا تھا اور ایک معقول حوالہ دیتے ہی اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"آئے نہیں، مجبوری لائی ہے، کتنی دیر میں اور کہاں مل رہے ہو؟" میں نے اسی لہجے میں سوال کیا۔

"دفتری اوقات میں ناممکن ہے۔" اس کی آواز دھیمی اور فکر آمیز ہو گئی "یہ میرے لیے کسی بھی وقت کوئی اہم کال آسکتی ہے، میں چھٹی کے بعد ہی مل سکتا ہوں، کیونکہ دفتر آنا تمھارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

"چھ بجے تمھارے ہی گھر پر ملاقات ہوگی!"

"یہ بہتر رہے گا۔" اس نے فوراً ہی جواب دیا "میں چھ بجے تمھارا انتظار کروں گا۔"

"یہ یاد رکھنا کہ کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو خسارے میں رہو گے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہمم... میں جانتا ہوں۔"

میں نے سلسلہ منقطع کیا اور بوتھ سے باہر نکل آیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا جہاں سلطان شاہ میرے یوں غائب ہو جانے پر اکتاہٹ اور بیزاری کا شکار ہو رہا تھا لیکن اپنے کمرے ہی میں موجود تھا۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے؟" مجھے دیکھتے ہی اس نے بُرا سا منہ بنا کر سوال کیا۔ "شہر کی خاک چھانتے نکل گیا تھا، تم گہری نیند سوئے ہوئے تھے اس لیے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"آپریشن پر دو بار تمھارے لیے پیغام نشر کیا گیا ہے، تمھارے لیے مستقل ڈولی نمبر دو کا کوڈ استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ لوگ تم سے بات کرنے کے لیے بے چین ہیں۔"

میں بے اختیار مسکرا دیا۔ "تو ہمارا اندازہ درست ہی تھا۔ پچھلی رات کی ساری حکمتِ عملی ہمیں فریب دینے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ رات انھوں نے اپنی گفتگو میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ آپریشن کے بارے میں انھوں نے مفروضہ قائم کر لیا ہے کہ ہم اسے تباہ کر چکے ہیں پھر اب براہِ راست پیغام کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"

"یقینی طور پر اس دوران میں حالات نے کچھ نیا رُخ اختیار کیا ہو گا جب ہی وہ براہِ راست رابطے کے لیے کوشش کر رہے ہیں ورنہ اصولاً تو ہمیں نظر انداز ہی کرنا چاہیے تھا۔" اس نے کہا۔

"اوہ! تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" میں نے چونک کر کہا۔ "تبدیلی تو واقعی رونما ہوئی ہے... میرا خیال ہے کہ وہ لوگ رمضان چاچا کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں؟ اس سے پہلے انھیں اندازہ نہیں تھا کہ مقابلہ کس سے ہے۔"

"یہ رمضان چاچا کا ذکر کہاں سے آگیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا اور میں اسے اپنی معلومات سے آگاہ کرنے لگا۔

"اب تو یہ سامنے کی بات ہے کہ وہ تمھارے بارے میں اندازہ لگا چکے ہیں۔" اس نے میرے خاموش ہوتے ہی دو ٹوک لہجے میں کہا "جس وقت ہم ان اطراف میں ان کے آدمیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار کی راہ بنا رہے تھے، شاید اسی وقت رمضان چاچا کو اٹھوایا گیا ہو گا کیونکہ تمھارے بھائی نے اسی کو اس عمارت کا فون نمبر دیا تھا۔"

"اس نے گھر واپسی کے بعد جس طرح سختی سے زبان بند کر کے خود کو گوشہ نشین کیا ہے، اس سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اسے بدترین دھمکیوں کے ساتھ محض اس امید پر رہا کیا گیا ہے کہ میں اس سے دوبارہ رجوع کروں گا اور وہ اسے چارہ بنا کر مجھ پر ہاتھ ڈال دیں گے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ ان کی دھمکیوں سے خائف رمضان چاچا خود ہی تمھاری مخبری کرنے پر مجبور ہو جائے، غریب اور کمزور آدمی کے لیے اپنی مجبوریوں کو نظر انداز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے... تمھارے سوتیلے بھائی من مانی پر اتر آئیں تو رمضان چاچا کے پورے گھرانے کا صفایا کر سکتے ہیں۔ شاید تم ہی نے مجھے بتایا تھا کہ رمضان جوان بیٹیوں کا باپ بھی ہے۔"

"کہا تو تھا۔" میں نے اعتراف کیا "لیکن وہ میرا قیاس تھا کیونکہ اس نے تصویر کے دیے ہوئے ہزار روپے لوٹاتے ہوئے اپنی بیوی کی حریص طبیعت کا حوالہ بھی دیا تھا جو لڑکیوں کا جہیز بنانے کے لیے وہ پیسے ہتھیا سکتی تھی۔"

"پھر تم خود ہی غور کرو کہ اگر تصویر نے اسے یہ دھمکی دی ہو کہ رمضان نے اس کی ہدایت سے ذرا بھی اختلاف کیا تو اس کی بیٹیوں کو اٹھوا کر بالاخانوں پر بٹھا دیا جائے گا تو وہ بے چارہ کیا کر سکے گا؟ تمھاری ہمدردی میں وہ اپنی آبرو تو نیلام نہیں کرا سکتا۔ پولیس کے بارے میں تم خود ہی بتا رہے ہو کہ وہ اپنے ریکارڈ کو وارداتوں کے اندراج سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔"

"رمضان چاچا سے ملنے کا مقصد اسے امتحان میں ڈالنے کے مترادف ہو گا۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا "بہتر ہو گا کہ میں اسے بھول ہی جاؤں۔ اگر ہم اس کی مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کے مصائب میں اضافہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہی بہتر ہو گا۔ تم ایشین سنڈیکیٹ والے نصیر خان کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟"

"شاید یہی چیز ہمیں چلا رہی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم دونوں کی سوچ کا انداز تقریباً ایک جیسا ہی ہے۔ میں اس سے بات کر کے آرہا ہوں، شام کے چھ بجے اس کے گھر پر ملاقات طے پائی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس بار وہ زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ خود بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ اگر کسی مرحلے پر وہ قربانی کا بکرا بن گیا تو شاید ہمیں اتنا افسوس نہیں ہو گا۔"

میرے لیے یہ اندازہ کرنا ہی دشوار تھا کہ مجھے کس فیصلے پر خوشی اور کس پر افسوس ہو گا۔

برسہا برس پہلے میں نے وہ تنظیم کسی خارجی دباؤ کے بغیر اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے، اپنی مرضی سے اپنائی تھی اور چرس کی ترسیل و تقسیم سے گزر کر ہیروئن کی غیر قانونی تجارت میں اس حد تک ملوث ہو گیا کہ نچلے درجے کے ایک کارندے کے بجائے کلیدی حیثیت میں معاملات کی نگرانی کرنے لگا پھر نجانے وہ غزالہ کی محبت تھی یا فاتر العقل کامران کی ہمدردی یا میرے اندر کی آواز کہ میں ان سرگرمیوں کے خلاف دھیمی دھیمی نفرت سے بڑھ کر بغاوت کی راہ پر

چل پڑا اور آخر کار تنظیم میری اور میں تنظیم کا بدترین دشمن بن چکا تھا۔

بدقسمتی یہ تھی کہ اس دشمنی میں میرے مدِمقابل کوئی اجنبی نہیں تھا بلکہ میرے دونوں بڑے، سوتیلے بھائی تھے جو نجانے کس طرح اس تنظیم کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے تھے۔ ان میں توقیر اسے کوٹ کے منصب کا دعویدار تھا اور بڑا بھائی تصویر شاید اس کے دستِ راست کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ میرے معاملے میں رمضان چاچا کو ملوّث کرنے والا وہی تھا۔

اب انھوں نے میرے خلاف دو محاذ کھولے ہوئے تھے۔ ایک طرف رمضان چاچا کو دھونس، دھمکی اور تشدد کے ذریعے اپنی راہ پر لے آئے تھے۔ اس بارے میں سلطان شاہ کی رائے بہت زیادہ قرینِ قیاس لگتی تھی۔ ایک عمر رسیدہ اور خدا ترس شخص کے لیے جوان بیٹیوں کی عزت کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں ہو سکتی تھی جو اسے اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کر سکے اور دوسری طرف وہ کسی طویل منصوبہ بندی کو ترک کر کے ٹرانسمیٹر پر براہِ راست مجھ سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ اس بار پھر میں ہی ان کے مقابل تھا لیکن وہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بدستور مجھے ڈولی نمبر دو کے نام سے مخاطب کر رہے تھے۔

"کیوں نہ ان سے رابطہ قائم کر ہی لیا جائے؟" سلطان شاہ نے رائے پیش کی۔ "کم از کم معلوم تو ہو کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔"

"یہ سرد جنگ ہے، ہماری مسلسل خاموشی ان کے اعصاب پر سوار رہے گی۔ اس لیے میں فی الحال چپ سادھے رکھنا چاہتا ہوں۔ نصیر خان سے ملاقات کے بعد دیکھا جائے گا کہ کیا کرنا ہے۔"

"جب بات کھل ہی گئی ہے کہ اس پورے کھیل کی پشت پر تمھارے سوتیلے بھائیوں کا ہاتھ ہے تو تمھیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو... اس بھاگ دوڑ اور آنکھ مچولی میں ان کا بھی کچھ نہ بگڑے گا۔ بس ہم اپنا وقت اور صلاحیتیں ضائع کرتے رہیں گے، ان کا کام بدستور چلتا رہے گا۔"

"حیرت ہے کہ تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسی بات کر رہے ہو، یہ بھاگ دوڑ ہم نے شغل کے طور پر تو نہیں اپنائی ہے۔ وہ لوگ روپوش رہ کر کام کرنے کے عادی ہیں۔ انھیں اسی طرح سامنے آنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔"

"میرا سوال بھی دراصل یہی تھا جسے میں ٹھیک طرح ادا نہیں کر سکا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "وہ سامنے آ بھی گئے تو کیا ہوگا... تم نے ٹھنڈے دل سے سوچا ہے کہ ان کی مخالفت پر تم کس حد تک جا سکو گے؟"

میں اس کے لفظوں میں پوشیدہ حقیقی سوال کو سمجھ کر مسکرا دیا۔ "وہ لوگ موت کے سوداگر ہیں، دولت کی ہوس میں اندھے ہو چکے ہیں اور ملک کے چپّے چپّے میں ہیروئن کے زہر کو فروغ دے رہے ہیں۔ ان کا نظام اس قدر محفوظ اور مکمل ہے کہ بنیادوں سے اکھاڑے بغیر اس کا خاتمہ ناممکن ہے۔ میرا مشن تو یہی ہے کہ ان دونوں کی حقیقت معلوم کر کے انھیں جہنم واصل کر دوں۔ میرے لیے اب رشتے کا عنصر بے معنی ہو کر رہ گیا ہے اور اس رویے کا جواز خود انھوں نے فراہم کیا ہے۔ جب میرے گھر کو آگ لگاتے ہوئے توقیر کو ذرا بھی خیال نہ آیا کہ وہ اپنے بھائی کا گھر جلا رہا ہے تو مجھے کیا چیز روک سکے گی؟"

"بس بس، میں یہی سننا چاہ رہا تھا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش کر دیا۔ "دراصل اس حد تک جائے بغیر کامیاب ہونا ناممکن ہے، میرے ذہن میں کئی بار اس خیال نے سر ابھارا ہے کہ کہیں عین وقت پر تمھارے دل میں برادرانہ محبت کے جذبات نہ بھڑک اٹھیں اور سارا معاملہ ہی خراب ہو جائے۔"

"اس کار کے بارے میں کیا سوچا تم نے؟" چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد میں نے سوال کیا۔

"تمھاری غیر موجودگی میں وہ قصہ بھی نمٹا دیا... تھوڑی دیر پہلے گل ریز خان کا فون آیا تھا، وہ لوگ کار لے آئے ہیں۔ وہ اسی حالت میں سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی، کسی نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میں نے جا کر اسے پوری تفصیل بتا دی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت عمارت میں گیا تھا اور اسے اپنی چرائی ہوئی کار قرار دے کر یہ معلوم کرنا چاہا تھا کہ وہ کار وہاں کس نے اور کیسے چھوڑی لیکن عمارت کے ملازمین نے اس بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا اور وہ پنکچر لگوا کر کار واپس لے آئے۔"

"اب تمھارا اپنے ان دوستوں سے رجوع کرنا خطرناک ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی نگرانی کی جا رہی ہو۔"

"کیوں؟ ان سے کیا کام آ پڑا؟" اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

"چند پٹرول بم درکار ہیں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "میں انھیں احساس دلانا چاہتا ہوں کہ ان کے زبردست حفاظتی انتظامات کے باوجود میں ان پر ہاتھ ڈال سکتا ہوں۔"

"میرے خیال میں یہ اشتعال انگیزی غیر ضروری ہوگی۔ اتنا ہی کافی ہے کہ رات ہم ان کے تین آدمی مار کر صاف نکل آئے۔"

"تین؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔ "تو کیا ڈولی کو بھی مار دیا تھا تم نے؟"

"ہاتھ کچھ ضرورت سے زیادہ تگڑا پڑ گیا۔ ڈر تھا کہ اس نے ذرا بھی آواز نکالی تو کہیں اس کے ساتھی چوکنّے ہو کر ہماری طرف نہ لوٹ پڑیں۔" اس نے خفت آمیز انداز میں کہا۔

ہماری بات وہیں رہ گئی کیونکہ اسی وقت ٹرانسمیٹر ریسیور پر آواز سنائی دی۔ سلطان شاہ نے آپریٹس کا والیوم بہت کم کیا ہوا تھا، میں نے اٹھ کر آواز بڑھا دی۔

"کنٹرول روم کالنگ فار ڈولی نمبر دو.... اوور!" پیغام کے بعد لائن پر چند منٹ کے لیے سکوت چھا گیا پھر وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ "ہم نے پورے علاقے کا الیکٹرونک سروے کرایا ہے لیکن کہیں بھی تباہ شدہ آپریٹس کا سراغ نہیں ملا۔ اس کا مطلب ہے کہ رات سے وہ آپریٹس تمھارے قبضے میں ہے اور تم ہماری گفتگو سنتے رہے ہو لیکن ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری تم سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ کل جو کچھ ہوا، وہ غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ ہمیں آج علم ہوا کہ تم لوگ کار چُرانے کے بعد ادھر سے گزر رہے تھے اور ہمارے آدمیوں نے غلط فہمی کی بنا پر تمھیں رُکنے پر مجبور کر دیا اور اس محاذ آرائی میں تم نے ہمارے تین آدمیوں کو بھی ختم کر دیا لیکن ہمیں اس کا کوئی گلہ نہیں ہے کیونکہ تصادم عموماً جان لیوا ہوا کرتے ہیں..... لیکن ہم اپنا آپریٹس کسی غیر متعلقہ آدمی کی تحویل میں نہیں چھوڑ سکتے.... اگر تم ہماری آواز سن رہے ہو تو ہم تمھیں آپریٹس کے لیے منہ مانگا معاوضہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ تم جو جگہ مقرر کرو وہاں ہمارا آدمی تمھیں رقم دے کر آپریٹس لے جائے گا.... یہ واضح رہے کہ تمھاری چھوڑی ہوئی مسروقہ کار اس کے پٹھان مالکان واپس لے گئے ہیں۔ ان کا قیام ٹرکوں کے اسٹینڈ کے قریب واقع ایک ہوٹل میں ہے.... اوور!"

سلطان شاہ نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔ "یہ لوگ ہمیں بالکل ہی احمق سمجھ رہے ہیں.... اگر ہم معاملہ کر بیٹھے تو مجھے پورا یقین ہے کہ ان کے مسلح بھیڑیوں کا پورا غول ہمیں گھیرنے کی کوشش کرے گا۔"

"شاید آج رات میں ان سے بات کر ہی لوں۔" میں نے اسے آنکھ مارتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "پھر ان کے بھیجے ہوئے آدمیوں سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔"

"تین آدمی مرے ہیں لیکن اخبار میں کہیں کوئی خبر نہیں چھپی۔" سلطان شاہ نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ پولیس کو خبر دیے بغیر ہی لاشیں اٹھوا لی گئی ہوں گی۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے ذہن میں نصیر خان سے ملاقات کا خاکہ گھوم رہا تھا۔

◆

میں نے گلاس سے اپنے لبوں کو تر کر کے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو پانچ بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔

"ہم نے یہاں آنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے۔" سلطان شاہ نے تبصرہ کیا۔ "وہ ساڑھے پانچ سے پہلے نہیں آئے گا۔"

"مجھے موہوم سا اندیشہ تھا کہ کہیں وہ قبل از وقت گھر لوٹ کر ہمارے لیے کوئی جال تیار کرنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہے، موقع ملتے ہی ہم سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے گا۔"

"تمھیں تو یہاں بھی اپنے لیے شغل مل گیا لیکن مجھے سوکھا انتظار کرنا پڑے گا۔" اس نے میرے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

ہم دونوں کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے مسلح ہو کر وہاں پہنچے تھے۔ نصیر خان کا گھر ہمارے لیے نیا نہیں تھا لیکن دل میں ایک ہی اندیشہ تھا کہ گھر میں کوئی عورت موجود نہ ہو، لیکن ایک مڑے ہوئے تار سے قفل شکنی کر کے ہم گھر میں داخل ہوئے تو میدان صاف تھا اور نصیر خان کی بے ترتیب خوابگاہ میں رکھی ہوئی بجانت بھانت کی بوتلیں شاید میری ہی منتظر تھیں۔

وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا پھر بیرونی دروازے پر آہٹ سنائی دی اور ہم دونوں چوکنّے ہو گئے۔ سلطان شاہ لپک کر ایک دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ تاکہ نصیر خان مجھے دیکھ کر کسی چالبازی کی کوشش کرے تو وہ اس کا سدِّباب کر سکے۔

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازوں کے بعد فرش پر بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر نصیر خان کمرے میں آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر تحیّر اور خوف کے آثار ابھرے تھے جو منجمد ہو کر رہ گئے پھر اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

"تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اس کے دونوں ہی سوال معقول تھے کیونکہ پچھلی بار ہم نے اسے گھیرا تو ہمارے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے وہ میرا صورت آشنا نہیں تھا پھر ملاقات کا وقت چھ بجے قرار پایا تھا جس کے مطابق مجھے مقررہ وقت پر دروازے پر دستک دے کر اندر آنا چاہیے تھا لیکن میں اس سے

پہلے مقفل مکان میں براجمان تھا۔

”میں ہی نہیں، دوسرا بھی موجود ہے۔“ میں نے اس کے عقب میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بوکھلا کر پیچھے مڑا اور سلطان شاہ دروازے کی اوٹ سے باہر آ گیا۔

”ہم تمہارے پرانے دوست ہیں اور تمہارے ہی منتظر تھے۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا پھر سلطان شاہ سے مخاطب ہو گیا۔ ”ذرا اپنے میزبان کی تلاشی لے ڈالو تاکہ ہم دوستانہ فضا میں بے خوف و خطر ہو کر گفتگو شروع کر سکیں۔“

سلطان شاہ جیسے ہی اس کی طرف بڑھا وہ احتجاج کرتا ہوا مدافعانہ انداز میں پیچھے ہٹنے لگا۔ ”یہ سراسر زیادتی ہے۔ میں حفاظت کے لیے پستول ہر وقت ساتھ رکھتا ہوں مگر تمہیں اس سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے....“

”مجھے واقعی اس سے کوئی سروکار نہیں ہے، گولیاں نکال کر واپس کر دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے سلطان شاہ نے باہر سے ٹٹولنے کے بعد کوٹ کی اندرونی جیب سے اعشاریہ دو دو کا اسمتھ اینڈ براؤنی نکال لیا۔

”دلکش کھلونا ہے۔“ اس نے چیمبر خالی کرتے ہوئے حریصانہ انداز میں تبصرہ کیا اور نصیر خان فوراً ہی بول پڑا۔

”یہ تم نہیں لے سکتے.... یہ مجھے دفتر کی طرف سے ملا ہوا ہے، اس سے محروم ہونے کی صورت میں میرے لیے جوابدہی مشکل ہو جائے گی۔“

میری اور سلطان شاہ کی نگاہیں چار ہوئیں تو میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے ہتھیار لوٹانے کا اشارہ کیا اور نصیر خان نے وہ واپس لیتے ہی یوں دوبارہ جیب میں ڈالا جیسے تاخیر کی صورت میں وہ اس کی ملکیت سے محروم کر دیا جائے گا۔

میرا خیال تھا کہ نصیر خان گفتگو شروع کرنے سے پہلے لباس تبدیل کرنا چاہے گا لیکن وہ اسی حالت میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”پچھلی بار ہم بے اعتمادی کی فضا میں متعارف ہوئے تھے اور ہمارے چہرے نقابوں میں پوشیدہ تھے لیکن اس بار نقابوں کی غیر موجودگی ہماری طرف سے خیر سگالی کی مظہر ہے، امید ہے کہ تم اپنے رویے سے اس فضا کو مجروح نہیں کرو گے۔“ میں نے سگریٹ سلگانے کے بعد تمہید کے طور پر کہا۔

”مجھے آج تک تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ پچھلے دنوں تمہاری وجہ سے شہر میں خاصی خونریزی ہوئی اور مجھے اپنے عملے کے دو ارکان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔“

”یہ بڑی اچھی بات ہے۔“ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ تم سے ہمیں کوئی عداوت نہیں ہے، ہماری لڑائی تمہارے باس سے ہے۔“

”لیکن بڑے کبھی سامنے نہیں آتے، وہ پس پشت رہ کر نیچے والوں کو خطرات کی بھٹی میں جھونکتے رہتے ہیں، کیا پتا کب مجھے تمہارے خلاف صف آرا ہونے کا حکم مل جائے۔“

”اگر تم اپنے باس کی صحیح نشاندہی کر سکو تو شاید اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔“

”پچھلی بار میں تمہیں اس فرم میں اپنی شمولیت کا پورا پس منظر بتا چکا ہوں، جسے میں خود نہیں جانتا اس کے بارے میں بھلا تمہیں کیا بتا سکوں گا.... میرے لیے تو وہ بس ایک نادیدہ ہستی کا نام ہے۔“

”میں یہ مان سکتا ہوں کہ تم نے اس کی دھمکیوں سے خائف ہو کر کھلے بندوں اس کی سراغرسی کی کوئی کوشش نہ کی ہو لیکن فرم کے سارے کاغذات تک تمہاری رسائی ہے، عملاً تم وہاں سیاہ و سفید کے مالک ہو، میں یہ نہیں مان سکتا کہ تم نے ان کاغذات کی چھان بین نہ کی ہو۔“

”کرنا چاہی تھی لیکن خوفزدہ ہو کر ارادہ ترک کر دیا۔“

”وہ کیوں؟“

”خفیہ کیمرے کے بارے میں میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”مجھے پہلے ہی دن اس کے بارے میں بتا دیا گیا تھا اور میں اس بارے میں محتاط رہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کیمرا کہاں نصب ہے پھر میں نے یہ سراغ بھی لگا لیا کہ وہ کن زاویوں سے اور میرے کمرے کے کن حصوں کی تصاویر لے سکتا ہے اور ان ہی کوششوں کے درمیان انکشاف ہوا کہ اس کا خودکار نظام بہت حساس ہے۔ وہ کیمرا کمرے میں آنے والے کسی بھی ملاقاتی کو دروازے میں نصب ایک فوٹو سیل کی غیر مرئی شعاعوں سے دیکھتا ہے اور ایک منٹ بعد مخصوص زاویے سے اس کی تصویر لے لیتا ہے۔ اسی کے ساتھ کیمرے سے ایک ٹائمر منسلک ہے جس کے ذریعے وہ ایک مقررہ وقفے کے بعد میری تصاویر لیتا رہتا ہے جو یقینی طور پر باس کے لیے ہوتی ہیں اور ٹائمر کا وقفہ روزانہ بدلا ہوا ہوتا ہے تاکہ میں اپنا کوئی معمول نہ بنا سکوں۔ دفتر بند ہونے کے بعد خفیہ طریقے سے وہاں آنے والا باس کا ہرکارہ کیمرے میں فلم کی تبدیلی کے ساتھ ہی ٹائمر کی سیٹنگ بھی بدل دیتا ہے۔“

”تمہاری ان تمام معلومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کچھ نہ کچھ مواد حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہو اور میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی معلومات میں ہمیں بھی شریک کر لو، یہ میرا وعدہ ہے کہ ہم سے تعاون کرنے کے سلسلے میں تم اپنے باس کے کسی عتاب کی زد میں نہیں آؤ گے۔“

”میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکا۔ آخر تم کیا جاننا چاہتے ہو مجھ سے؟“ اس نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”تمہارے باس کا ٹھکانا۔ ہمارے لیے بس یہی ایک بات اہم ہے۔“

اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نظر آئے پھر اس نے جھک کر اپنا سر ہتھیلیوں کے درمیان دبا لیا، میں غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔

”تم یقین کرو کہ مجھے اس کا ٹھکانا معلوم نہیں ہے۔“ تھوڑی دیر بعد اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ ”تم مجھ سے ایک ایسی بات معلوم کرنا چاہ رہے ہو جس سے میرے فرشتے تک لاعلم ہیں۔“

”پھر ہمیں آخری چارۂ کار استعمال کرنا ہوگا۔“ میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ”محض تمہاری وجہ سے ہم اب تک اس سے گریز کرتے آئے ہیں۔“

”میری پروا کیے بغیر، تم جو کرنا چاہو کر لو۔“ اس کے لب و لہجے سے سچائی کی بو آ رہی تھی۔ ”میں تمہاری راہ میں حائل ہونے کی کوشش نہیں کروں گا..... مجھے بھی اپنی آزادی عزیز ہے۔“

”اتنی عجلت میں یہ اختیار نہ دو۔“ میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے تعاون نہ کیا تو ہم زیادہ وقت برباد نہیں کریں گے۔ ہمارا اگلا نشانہ تمہارا دفتر ہوگا..... کاغذات کو الٹ پلٹ کر کے ہم مطلوبہ معلومات حاصل کر ہی لیں گے اور اس بارے میں تم اپنے باس کی جوابدہی سے نہ بچ سکو گے۔“

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ”نہیں تم ایسا نہیں کر سکو گے۔“ اس کی آواز کمزور ہو گئی تھی۔ ”وہ بہت سفاک اور خودغرض آدمی ہے۔ اس تلاشی کی تمام تر ذمے داری میرے سر تھوپ دے گا۔“

”اس سے بچنے کے لیے تمہیں زبان کھولنی پڑے گی۔“

”جو کچھ میں جانتا ہوں، وہ تمہارے لیے بے سود ہوگا کیونکہ مجھے اندازہ ہے کہ وہ پتا غلط استعمال کیا گیا ہے۔“

”صحیح اور غلط کا انتخاب تم ہم پر چھوڑ دو۔ جو جانتے ہو وہ بتاتے چلے جاؤ۔“

”ایکسپورٹ رجسٹریشن فارم میں لائیڈز کاٹیج کا نام میری نگاہ سے گزرا تھا لیکن وہ عمارت ہرگز اس کی رہائش گاہ نہیں ہو سکتی، میں نے اپنے طور بھی اس کی تصدیق کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔“

”یہ لائیڈز کاٹیج کیا بلا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”شہر کی ایک مشہور عمارت ہے جہاں پہلے ایک مغربی ملک کا سفارتخانہ ہوا کرتا تھا لیکن پچھلے کئی برسوں سے وہ عمارت ایک دولت مند غیر ملکی کی ملکیت ہے جو عموماً خود باہر ہی رہتا ہے لیکن اس کے ملازموں کی فوج ہر وقت لائیڈز کاٹیج میں مقیم رہتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے عمارت کا پتا اور محلِ وقوع بتانا شروع کیا تو میرے ساتھ ہی سلطان شاہ کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار نمودار ہو گئے کیونکہ وہ پتا اسی عمارت کا تھا جس کے قریب ہمیں رکنے پر مجبور کیا گیا تھا۔

”کیا یہ ممکن نہیں کہ تمہارا باس لائیڈز کاٹیج کے ملازمین کی بھیڑ میں مل کر وہاں رہ رہا ہو۔ وہ تو ویسے بھی دوہری زندگی گزار رہا ہے، اس کے لیے ایک اور روپ سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”جو نتیجہ چاہو اخذ کر سکتے ہو لیکن تم اس سے واقف نہیں ہو۔ وہ لب و لہجے سے ہی آمرِ مطلق محسوس ہوتا ہے، اسے کیا ضرورت ہے کہ عام زندگی میں ایک محکوم کی صورت اختیار کرے۔“

”خیر ہم اسے دیکھ لیں گے لیکن تم جانتے ہو کہ اس وقت دو دھاری تلوار پر چل رہے ہو، ہمارے مفاد کے خلاف کوئی حرکت کی تو ہم سے کہیں نہ بچ سکو گے۔ یہ اطلاع تم اپنی ذات تک ہی محدود رکھو گے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ اپنے لیے ایک گلاس تیار کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے، میں خودکشی سے نفرت کرتا ہوں، میرا مفاد بھی اسی میں ہے کہ میرا اور تمہارا تعلق پردۂ راز میں رہے۔“

”اپنی فرم سے تم ہیروئن کے علاوہ اور کونسی منشیات برآمد کرتے ہو؟“

”ہیروئن کے علاوہ ہم کسی اور نشے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔“

”تمہاری سب سے بڑی درآمدی منڈی کون سی ہے؟“

"منڈی تو بہت وسیع ہے مگر بہت سے ملکوں کے تجارتی اور حفاظتی ضابطے خطرناک ہیں اس لیے ہم گنے چنے علاقوں ہی میں آپریٹ کرتے ہیں۔ فرینکفرٹ، روم، ایتھنز، اور کوپن ہیگن میں ہمارے ڈسٹری بیوشن آفس قائم ہیں جہاں سے مال یورپ اور امریکا میں پہنچایا جاتا ہے۔"

"امریکا کے لیے براہِ راست یہاں سے مال نہیں جاتا؟"

اس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "ہیروئن کے بارے میں وہاں کے حکام بہت حساس ہیں اور پاکستان سے جانے والے ہر تجارتی مال کو شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کڑی جانچ پڑتال سے بچنے کے لیے مال یورپ سے ری ایکسپورٹ کیا جاتا ہے۔ امریکا کے لیے یہ طریقہ اب تک سو فی صد کامیاب ثابت ہوا ہے۔"

"مجھے اُن تمام دفاتر اور اداروں کی فہرست درکار ہے، جنھیں تم ہیروئن برآمد کرتے ہو۔"

"تم مقامی منڈی کے آدمی ہو، یہاں ہماری اجارہ داری کو توڑ کر اپنا حصّہ کمانا چاہتے ہو پھر باہر کے بزنس سے تمھارا کیا واسطہ؟ اس معاملے کو الگ ہی رکھو تو بہتر ہوگا کیونکہ ایسے تمام نام اور پتے میری ذاتی تحویل میں رہتے ہیں اور اگر کسی وقت مجھے موجودہ حالات سے نجات ملی تو میں ان رابطوں سے ذاتی سطح پر فائدہ اٹھانا چاہوں گا۔" اس نے پچھلی بار میری کہی ہوئی باتوں کی بنا پر مجھے بھی منشیات فروش سمجھتے ہوئے مفادات کی تقسیم پر سمجھوتا کرنا چاہا۔

"مقامی منڈی اور برآمدی تجارت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لمبے چوڑے پھیلاوے کے بعد یہاں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کام کرنے اور کمانے کا گُر یہی ہے کہ حکّام کو مقامی چکروں میں الجھا کر باہر سے کمایا جائے۔"

"یہ باتیں میرے لیے نئی نہیں ہیں، میں بھی جانتا ہوں کہ مقامی آبادیوں میں ہیروئن کی فراہمی رائے عامّہ کا شدید دباؤ پیدا کرتی ہے اور ذرا ذرا سی مقدار کے لیے مختلف ایجنسیوں کی بھاری مقدار مسلسل مصروف رہتی ہے لیکن میرا طریقۂ کار مختلف ہوگا۔ میں مقامی بکھیڑوں میں پڑنا ہی نہیں چاہتا۔ حکّام کو الجھانے کے لیے دوسرے لوگ کافی ہیں۔"

"یہ سب قیاسات اور منصوبے ہیں، ہو سکتا ہے کہ تم ساری عمر اپنے باس کے دباؤ سے نہ نکل سکو مگر میں اس کے بیرونی مفادات پر بھی فوری وار کروں گا..... میرے کیریئر آئے دن جاتے رہتے ہیں وہ اس طرح کام کریں گے کہ تم پر حرف بھی نہ آسکے گا۔"

مزید کچھ بحث کے بعد اس نے اگلے دن فہرست فراہم کرنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ معقولیت کے ساتھ تعاون کر رہا تھا لہٰذا اس سے ترش روئی مناسب نہیں تھی۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ سلطان شاہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا جائے تاکہ میں خلوت میں اس کے فون سے دو تین نجی کالز کر سکوں اور اس نے بلا چوں و چرا اپنی نشست چھوڑ دی۔

چند ثانیوں تک ترجیحات پر غور کرنے کے بعد میں نے سب سے پہلے جہانگیر کو فون کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ میری خوش نصیبی تھی کہ جہانگیر گھر پر ہی مل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے لُوٹے براہِ راست تصادم مول لینے کے بعد میں نے روپوشی اختیار کی ہوئی تھی لہٰذا وہ یہی سمجھا کہ میں کراچی سے فون کر رہا تھا۔

چند رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد میں نے اس سے کام کے بارے میں سوال کیا تو اس نے بتایا کہ چند روز کے تعطل کے بعد مال کی ترسیل اور فراہمی دوبارہ بحال ہو چکی تھی اور اس بار نرخ بھی ذرا بڑھے ہوئے تھے لیکن وہ انتظامی دشواریوں سے دوچار تھا کیونکہ جیوا ہاؤز کے داخلی پھاٹک پر میرے ہاتھ رخشی کے بھائی، الیاس کے قتل کے معاملے میں پولیس کو کوئی تسلی بخش جواز فراہم نہیں کیا جا سکا تھا۔ مرنے والا میری گولی سے پھاٹک سے باہر فٹ پاتھ پر ہلاک ہوا تھا لیکن میری اطلاع پر پولیس وہاں پہنچی تو لاش اندر احاطے میں گھسیٹی جا چکی تھی جب کہ فٹ پاتھ پر واردات کے نشانات موجود تھے لہٰذا شہادتیں مسخ کرنے کے الزام میں پولیس نے جیوا ہاؤز کے دو ملازمین کو تحویل میں لے لیا تھا اور تنظیمی معاملات میں اس عمارت کا استعمال ترک کیا جا چکا تھا۔

اس بارے میں جہانگیر دوہری مشکل میں پھنسا ہوا تھا۔ اوّل تو یہ کہ مال کی وصولیابی اور ذخیرہ اندوزی کے لیے فوری طور پر دوسرے ٹھکانے کا بندوبست کرنا پڑا تھا۔ دوسری طرف دو ملازمین کی گرفتاری کے بعد جیوا ہاؤز کی عمارت ویران پڑی ہوئی تھی۔ اس بارے میں اسے لُوٹے نے اسے حکم دیا تھا کہ عمارت میں آتش گیر مادہ ڈال کر فوری طور پر اس طرح آگ لگائی جائے کہ گرین روم اور اس میں موجود ہر شے جل کر راکھ ہو جائے۔

جہانگیر جانتا تھا کہ جیوا ہاؤز کے گرین روم میں رسائی کا اختیار صرف مجھ ہی کو حاصل تھا لیکن وہ خود اس کمرے کی حقیقی اہمیت سے لاعلم تھا۔ اس کے استفسار پر میں نے اسے بتا دیا کہ گرین روم دراصل تنظیم کا ایک اہم مواصلاتی مرکز تھا جہاں ایم ٹی تھری ہنڈرڈ ساخت کا ایک ٹرانسمیٹر ناقابلِ شکست حفاظتی انتظامات کے ساتھ موجود تھا۔

"اور تمھاری ننھی سی دن کا کیا حال ہے؟" میں نے خوش دلی کے ساتھ سوال کیا۔

"اوہ! وہ تو مجھے پاگل کر دے گی، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر خطرناک کام اس جیسی خوبصورت اور سُبک اندام عورت کو کیوں سونپا گیا ہے، اسے اپنے بھائی کی ہلاکت کا علم ہو چکا ہے، مجھ سے جاننا چاہ رہی تھی کہ اس قتل میں کون ملوّث تھا لیکن میں لاعلمی کا اظہار کر کے اپنی جان بچا گیا۔ کل سے جیوا ہاؤز کے متبادل کے طور پر رخشی کا مکان ہی زیرِ استعمال ہے۔ تین بار اسٹون ہاؤز جا چکا ہوں لیکن اس سے وہاں ملاقات نہ ہو سکی۔"

"مجھے اندازہ ہے..... اب تو تم بات بے بات اسٹون ہاؤز کے چکر کاٹو گے، یہ خیال رکھنا کہ رخشی بہت خطرناک عورت ہے۔ اپنے حسن سے بہتیرے ایسے کام نکالنے میں ماہر ہے جن کے لیے عموماً آتشیں ہتھیار درکار ہوتے ہیں۔" میرے تبصرے پر اس نے دل کھول کر قہقہہ لگایا تھا۔

"جب سے اس نے رجوع کر کے قاسم کی جانشینی کا دعویٰ کیا ہے، میری کام میں کھوئی ہوئی دلچسپی پھر سے بحال ہونے لگی ہے لیکن تم میرے لیے ہر جگہ کباب میں ہڈی ثابت ہوتے ہو۔"

"کیوں؟ اب میرا ذکر کہاں سے آ گیا؟"

"رخشی کے سر پر تمھاری تلاش کا بھوت سوار ہے۔ اس سے دو مرتبہ ملاقات ہوئی اور دونوں مرتبہ بیشتر وقت تمھارا ہی ذکر کرتی رہی، معلوم ہوتا ہے کہ اس سے تمھارے خاصے قریبی مراسم رہ چکے ہیں۔"

"میرے قریبی مراسم تو تم سے بھی ہیں، یہ بتاؤ کہ اس سے ملاقاتیں کہاں ہو رہی ہیں؟"

"ایک بار ہوٹل میں ملا تھا، دوسری بار تمھاری بھابی نہیں تھی تو گھر بلا لیا تھا، پینے کی بھی بہت شوقین ہے۔"

"وہ ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی اُن گنی چنی عورتوں جیسی ہے جو ملازم کو ساتھ لے کر محض شوقیہ مردوں کو لوٹتی پھرتی ہیں یا چھینتی ہوئی کاروں میں تفریح کو مشغلہ سمجھتی ہیں۔"

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا لہٰذا پہلا موقع ملتے ہی میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرے نکتہ نظر سے دو باتیں اہم تھیں، اوّل تو یہ کہ دل گرفتہ رخشی نے اسے لُوٹے سے کیے ہوئے معاہدے کی روشنی میں قاسم کی موت سے خالی ہونے والا اسی دن کا منصب سنبھال لیا تھا۔ میں تنظیم اور اسے لُوٹے کے بارے میں اس کے باغیانہ خیال سے اچھی طرح واقف تھا اور میرے لیے یہ بات حوصلہ افزا تھی کہ تنظیم میں درمیانی سطح پر ایسے لوگوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا تھا جو بظاہر جان کے خوف یا دوسری مجبوریوں کے باعث اسے لُوٹے کے مفادات کے لیے کام کر رہے تھے لیکن اندر سے اس سے متنفّر تھے۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ کراچی میں تنظیم کے اراکین کو میری لاہور میں موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔ شاید توقیر اب میرے اور اپنے تصادم کو ذاتی سطح تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔

دوسری کال میں نے غزالہ کے گھر ملائی تاکہ اس سے کچھ باتیں ہو سکیں لیکن ریسیور پر اس کے باپ کی چنگھاڑتی ہوئی ہیلو سنتے ہی مجھے ریسیور کان سے دور ہٹانا پڑ گیا۔ میری آواز پہچانتے ہی وہ یوں چہکا تھا جیسے مدتوں سے بچھڑے ہوئے کسی دوست کو اچانک دریافت کیا ہو لیکن میں نے گفتگو کو اختصار دینے کی نیت سے فوراً ہی اسے آگاہ کر دیا کہ میں کسی دوست کے گھر سے فون کر رہا ہوں۔

"غزالہ کو آج مجبوراً گھر سے نکلنا پڑا ہے۔" میرے استفسار پر اس نے بتایا۔ "عنقریب اس کی کسی سہیلی کی شادی ہونے والی ہے اور اسی سلسلے میں وہ صبح گئی تھی۔ اب تک اسے لوٹ آنا چاہیے تھا۔ ویسے تم مطمئن رہو، اسے تمھاری ہدایات یاد تھیں، وہ شمع کا برقع پہن کر گئی ہے، بس کسی بھی وقت آسکتی ہے۔"

"ذرا یہ تو بتائیے کہ آپ کے گھرانے میں گُڈّی کون کہلاتی ہے؟" میرے ذہن میں اچانک ہی کامران کا خیال آیا اور میں وہ اہم سوال کر بیٹھا جس کا جواب ڈاکٹر اکبر کو مطلوب تھا۔

جواب میں کرنل کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔ "پرانی یادیں تازہ کر دیں تم نے یہ سوال پوچھ کر... ارے یہ تو برسوں پرانی بات ہے۔ بچپن میں ہم لوگ غزالہ ہی کو گُڈّی کہتے تھے..... یہ نام تم نے کہاں سن لیا؟"

"یہ نام کامران کے لاشعور سے چپکا ہوا ہے۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ اسے مطلع کیا۔ "علاج گاہ میں ایک نرس سے اس کی دوستی ہو گئی ہے اور وہ اسے گُڈّی ہی کہتا ہے۔ اس کے معالج کا خیال ہے کہ اس مرحلے پر گُڈّی کو بار بار اس کے سامنے لایا جائے تو اس کی بہتیری ذہنی گرہیں خود بخود سلجھ جائیں گی اور شاید مکمل صحت یابی کا مرحلہ مختصر ہو سکے۔"

"میں آج ہی غزالہ کو وہاں بھیج دوں گا......" کرنل نے پُرجوش لہجے میں پیشکش کی لیکن میں نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرے آنے تک غزالہ کو وہاں بھیجنے کی ضرورت نہیں، کامران کی صحت کے ساتھ غزالہ کی سلامتی بھی ضروری ہے، کچھ لوگ ابھی تک اس کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں، میرا مقصد صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ گڈّی کون ہے؟ وہ معلوم ہو گیا لہٰذا اب کوئی راہ نکال لی جائے گی۔"

"اور تم کب تک واپس آ رہے ہو؟" میرے خشک جواب پر اس کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔

"شاید دو تین روز میں۔"

"تمھارا فون نمبر کیا ہے؟ تاکہ بوقتِ ضرورت رابطہ قائم ہو سکے۔" اس نے پژمردہ لہجے میں سوال کیا۔

"کوئی نہیں۔ ہوٹل میں مقیم ہوں اور وہاں آپریٹر کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کی جا سکتی۔"

"تمھارا نوکر بھی تمھارے ساتھ رہ رہا ہے؟" اس کے لہجے سے رقیبانہ جلن کی بُو آ رہی تھی۔ نجانے سلطان شاہ کیوں جونک بن کر اس کے ذہن میں چپک گیا تھا؟ اس کی کوئی گفتگو سلطان شاہ کے تحقیر آمیز تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔

"ہاں ساتھ ہی رہ رہا ہے اور اس دوران میں اس نے میرے لیے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔" میں نے اُسے سُلگانے کی نیّت سے کہا اور پھر فوراً موضوع بدل دیا۔ "اب غزالہ کو گھر سے نہ نکلنے دیں، جس وقت بھی موقع ملا میں دوبارہ رِنگ کروں گا۔"

سلسلہ منقطع کر دینے کے بعد میرے ذہن پر ایک بے نام سا بوجھ طاری ہو گیا جس کا میرے نزدیک کوئی مفہوم نہیں تھا اور اسی عالم میں میں رمضان چاچا سے ملا ہوا تصویر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

نمبر ملنے پر دوسری طرف گھنٹی بجی اور فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا گیا۔ کال ریسیو کرنے والی کی مترنم آواز سن کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ رخشی کی کہانیاں میں سن ہی چکا تھا لہٰذا اس نسوانی آواز کو سن کر میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ اپنی تمام تر مجرمانہ سرگرمیوں کے باوجود میرے سوتیلے بھائی رنگین مزاجی میں انتہا پسند تھے۔

"تصویر علی صاحب سے بات ہو سکے گی؟" میں نے نرم اور شائستہ لہجے میں سوال کیا۔

"میں دیکھتی ہوں۔ کون صاحب بول رہے ہیں؟" اس نے مبہم سا جواب دے کر ایک واضح سوال کر ڈالا۔

"کئی نام ہیں۔ تمھیں کیا کیا بتاؤں گا۔ بہتر ہوگا کہ تصویر کو بلا دو۔"

"ہولڈ کریں، میں بلاتی ہوں۔" اس نے میری بات کا بُرا منائے بغیر کہا۔

"کیا وہ آپ کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں؟" میں نے اس کی بات ختم ہوتے ہی گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔" ریسیور میں اس کی تحیر آمیز آواز ابھری۔

"مطلب یہ ہے کہ وہ اس دفتر میں آپ ہی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔" میں نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہوگا کہ یہ سوالات آپ اُن ہی سے کریں۔" اس کے لہجے سے خوش مزاجی یک بیک کافور ہو گئی اور یوں محسوس ہوا جیسے اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا ہو۔ میں ایک گہرا سانس لے کر ریسیور کان سے لگائے تصویر کی آواز کا انتظار کرتا رہا۔

"ہیلو۔ تصویر اسپیکنگ۔" چند لمحوں کے بعد ریسیور میں ایک سخت اور سنجیدہ مردانہ آواز گونجی۔

"تصویر!" میں نے مضحکانہ انداز میں دُہرایا۔ "خوب تصویر بنائی میرے بہلانے کو۔ اب تو دیوانے بھی آنے لگے سمجھانے کو۔"

"کون ہو اور کیا بک رہے ہو۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔" دوسری طرف سے غصیلے لہجے میں کہا گیا۔

"سمجھنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ رمضان چاچا کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اسے میں معاف نہیں کروں گا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اوہ! تو یہ تم بول رہے ہو تنویر۔" دوسری طرف سے مسرت آمیز آواز ابھری۔ "ہم لوگ تو تڑپ رہے ہیں تم سے ملنے کے لیے اور تم ہمیں دھمکیاں دے رہے ہو۔ کیا ہوا رمضان چاچا کو؟ اسے تو بس میں نے اپنا نمبر دیا تھا کہ تم دوبارہ اس سے ملو تو وہ اس فون نمبر پر مجھے اطلاع دے دے... بڑی ماں کو بہت حسرت ہے تم سے ملنے کی۔"

"تنویر مدّتوں پہلے مر چکا ہے یا مارا جا چکا ہے تصویر صاحب!" میں نے اس کی گرمجوشی کا نوٹس لیے بغیر سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میرا نام اب ڈینی ہے اور شاید تم بھی اسی

نام سے واقف ہو۔"

"ڈینی؟" اس نے تحیر آمیز لہجے میں دہرایا۔ "بڑا عجیب نام ہے، پہلی بار سن رہا ہوں۔ کیا مذہب بدل لیا ہے تم نے؟"

"مذہب نہیں، صرف مسلک بدلا ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں رمضان چاچا سے ملا نہیں ہوں لیکن میں نے اس کے محلے میں جمع ہونے والی ٹولیوں کے تبصروں سے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسے ناقابلِ دید تشدّد کا نشانہ بنا کر ایسی بدترین دھمکیوں کے ساتھ رہا کیا گیا ہے کہ وہ اس بارے میں ایک لفظ بھی بتانے کو آمادہ نہیں ہے۔"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ میری تو اس کے بعد رمضان چاچا سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ تمھیں سُنی سُنائی پر یقین کرنے کے بجائے اس سے ملنا چاہیے تھا، وہ خود ہی بتا دیتا کہ وہ کیا بکتا پھر رہا ہے۔"

"کراچی میں توقیر سے بھی ملاقات ہوئی تھی میری۔" میں نے تلخ اور معنی خیز لہجے میں کہا۔ "وہ میرے گھر بھائی بن کر آیا تھا اور میرے زندگی بھر کے اثاثوں کو پھونک کر فرار ہو گیا۔ اس نے کس جرم کی پاداش میں یہ سزا دی مجھ کو؟"

"کب کی بات ہے یہ؟"

"بمشکل ایک ہفتہ ہوا ہوگا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک باپ کی اولادیں ایک دوسرے کی دشمنی میں اس حد تک جا سکتی ہیں، توقیر تو برادرانہ رشتے کے نام پر ایک گالی بن کر رہ گیا ہے میرے لیے۔"

میرے خاموش ہوتے ہی ریسیور پر ایک گہرے سانس کی آواز ابھری پھر وہ بولا۔ "تمھارے دل میں ہماری طرف سے بدترین غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں، تم ملو گے تو دیکھو گے کہ تمھارے معاملے میں ہم کتنے فراخ دل ہیں اور توقیر بے چارہ تو پچھلے دو مہینوں سے باہر گیا ہوا ہے۔ بھلا ہزاروں میل دور سے وہ کیسے آ سکتا ہے۔ کل ہی اس کا فون آیا تھا، وہ اوٹاوا میں مقیم ہے۔"

"سنو تصویر!" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تم میرے بڑے بھائی ضرور ہو لیکن ہمارے درمیان رشتوں کا احترام کبھی پیدا نہ ہو سکا بلکہ تم اس احترام کو مٹانے کے لیے ہی کوشاں رہے......"

"وہ سب بچپن کی باتیں تھیں۔" اس نے میری بات کاٹ کر صفائی پیش کی۔ "ہم اب بھی تمھیں اپنے گلے سے لگانے کے لیے تیار ہیں، فیصلہ کرنا تمھارا کام ہے۔ نجانے وہ کون ہے جس نے توقیر کا نام استعمال کر کے تمھیں ہم سے بدظن کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"اگر اجازت ہو تو یہ بھی پوچھ لوں کہ تمھارا ذریعۂ معاش کیا ہے؟" میں نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"تمھارا لہجہ بہت گستاخانہ ہے لیکن پھر بھی میں بتائے دیتا ہوں کہ رزقِ حلال سے ہمارے لیے زندہ رہنا محال تھا۔ شاید اس لیے کہ آنکھ کھولتے ہی ہمیں حرام کی روزی سے زندہ رکھا گیا تھا اور اسی روزی کے بل پر ابّا جان تمھاری ماں کو ہماری ماں پر لے آئے تھے۔ ہماری بنیاد ہی ٹیڑھی تھی اور ہم آج تک سیدھے راستے سے روزی کمانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میں نوکری کر رہا ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ ہم غلط راستوں کے مسافر ہیں۔"

"اور توقیر؟ وہ کیا کر رہا ہے؟" میں نے تجسّس آمیز لہجے [illegible] تصویر نے جو کچھ کہا تھا اس نے میرے سارے [illegible] ن بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

"اطمینان رکھو، ملو گے تو تفصیلات بتاؤں گا، [illegible] نہ آنا چاہو تو اپنا [illegible] بتاؤ تاکہ میں بڑی ماں کو ساتھ لے کر خود کسی وقت تمھارے پاس آ سکوں۔"

"رہائش کہاں ہے تمھاری؟" میں نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

"لائیڈز کا ٹیج۔" اس نے بلا توقف جواب دیا۔ "شہر کی مشہور عمارت ہے۔ عمارت کا انتظام و انصرام میرے ہی پاس ہے۔ میں اسٹیٹ منیجر کے طور پر یہاں کام کرتا ہوں۔"

"پھر کل رات کے واقعات سے بھی واقف رہے ہو گے؟"

"کیسے واقعات؟" اس کے لہجے میں تحیّر نمایاں تھا۔

"بیرونی مداخلت، کچھ تشدّد، تلاش کی مہم، دو تین قتل اور کچھ ایسے ہی واقعات۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"پتا نہیں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔" دوسری طرف سے معصومانہ لہجے میں کہا گیا۔ "اگر کچھ ہوا بھی ہوگا تو میں اس سے لاعلم ہوں..... لائیڈز کاٹیج کے حفاظتی معاملات کا ذمّے دار سیکیورٹی آفیسر ہے جو پوری طرح خود مختار ہے لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟ ان واقعات سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

"بہت کچھ تعلق ہے اور شاید کچھ بھی نہیں۔" میں نے مُبہم سا جواب دیا۔ "لیکن میں تمھیں یہ ضرور بتانا چاہوں گا کہ میرے پاس بہتیری معلومات موجود ہیں جو میرے چند ساتھیوں کے بھی علم میں ہیں اور اگر مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو وہ تمام

معلومات سرکاری حکام تک پہنچا دی جائیں گی۔"

"مجھے یہ سب سنانا بے سود ہے۔" میری دھمکی کا کوئی اثر لیے بغیر کہا گیا۔ "میری تم سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ لائیڈز کالج میں تمہاری دیکھ بھال کی ذمے داری میری ہو گی۔" پھر اس نے ایک دم ہی بدلے ہوئے تحیّر آمیز لہجے میں کہا تھا۔ "تمہاری باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم بھی سیدھے راستے پر نہیں ہو... آخر یہ چکر کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے تلخ ہنسی کے ساتھ کہا۔ "ہم تینوں کی پرورش ایک ہی خمیر سے ہوئی ہے لہٰذا تینوں کو ایک ہی راہ اختیار کرنی ہے... اب وہ گناہ کی ہو یا ثواب کی۔"

"پھر تم کب آ رہے ہو؟" اس کے لہجے سے تجسّس جھانک رہا تھا۔

"جب وقت ملا آ جاؤں گا... لیکن میں ایک بار پھر یہ جاننا چاہوں گا کہ کل رات رمضان چاچا پر کیا گزری ہے، میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ واپسی کے بعد سے اس نے اپنی زبان سختی سے بند کی ہوئی ہے۔ زیادہ باز پُرس کی صورت میں اس نے خود کو ایک کمرے میں قید کر لیا ہے۔ اس کی حالت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس پر خاصا تشدّد کیا گیا ہے لیکن اس کی علامات نظر نہیں آ رہیں۔"

"تمہارے لب و لہجے سے شبہات کی بُو آ رہی ہے۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔ "تمہارے بارے میں پہلی بار میں نے خود ہی اس کی حوصلہ افزائی کی تھی میرا مقصد صرف یہ تھا کہ آخری وقت آنے سے پہلے بڑی ماں کو تم سے ملوا سکوں، یہ میری بدقسمتی ہے کہ وہ کسی ناخوشگوار واقعے کا نشانہ بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہمارے اور تمہارے درمیان غلط فہمیوں کی خلیج بڑھانے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ شاید ہمیں یکجا ہو کر اس کا سدِّباب کرنا ہو گا ورنہ کسی دن تم ہتھیار بدست ہمارے سروں پر مسلّط ہو گے۔"

"میں تم سے ضرور ملوں گا لیکن یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ میں اگر اپنی مرضی کے مطابق واپس نہ لوٹ سکا تو ہر طرف تباہی کا دور دورہ ہو گا اور اس کا مرکز تمہاری ذات سے زیادہ دور نہ ہو گا۔" میں نے اسے یاد دہانی کراتے ہوئے کہا۔

"پھر بہتر ہو گا کہ تم ملاقات کا یہ ارادہ ترک کر دو۔" دوسری طرف سے پہلی بار ترش لہجہ اختیار کیا گیا۔ "اگر میری تمام یقین دہانیوں کے باوجود تمہارے دل میں میری طرف سے اس قدر شبہات جاگزیں ہیں تو ہمارا نہ ملنا ہی بہتر ہو گا۔"

"تم نے میرے دل سے بڑا بوجھ دور کر دیا۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ کسی نہ کسی موڑ پر ہم خود ہی ایک دوسرے کے سامنے آ جائیں..... دوستی اور دشمنی کا فیصلہ وقت خود کر لے گا، موجودہ حالات میں میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ تمہارے کہنے کے مطابق اس وقت کوئی ایسی ہستی بھی سرگرم عمل ہے جو میرے اور تمہارے رشتے سے باخبر ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر ہمارے درمیان غلط فہمی پیدا کرنا چاہتی ہے۔"

"پھر مجھے اپنا پتا بتاؤ۔" اس کے لہجے میں برہمی عود کر آئی۔ "میں ڈرائیور کے ساتھ بڑی ماں کو تمہاری قدم بوسی کے لیے بھیج دوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس بے چاری کی روح ماضی کے گناہوں کے بوجھ تلے سسک رہی ہو اور وہ تم سے مل کر ان گناہوں کی معافی مانگنا چاہتی ہو جو اس نے تمہاری ماں کے ساتھ کیے تھے۔"

"تم بار بار بڑی ماں کا نام لے کر میرے خوابیدہ جذبوں کو بھڑکا رہے ہو۔" میں نے سرد اور سپاٹ لہجے [illegible] دوستوں اور محافظوں کے ہجوم میں اپنا وقت گزار رہا ہوں۔ مجھے تو اپنے ٹھکانوں کا علم نہیں ہوتا..... تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم نے کبھی میری ماں کو ماں کی حیثیت میں قبول نہیں کیا لیکن میں ہمیشہ تمہاری ماں کو بڑی ماں سمجھتا رہا ہوں، اگر وہ مجھ سے ملنے کی خواہش مند ہیں تو میں اپنا فرض پورا کروں گا اور اگر لائیڈز کالج کے حفاظتی ضابطے آڑے نہ آئے تو ان سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"

"لائیڈز کالج خوالبوں کی ایک اجنبی سی دنیا ہے جس کے اپنے ضوابط ہیں۔" ریسیور پر اس کی تھکی ہوئی آواز اُبھری۔ "لیکن میں بندوبست کر دوں گا کہ تم جب بھی یہاں آؤ تمہیں کوئی دشواری نہ ہو..... تم ہر وقت میرے لیے ایک پسندیدہ مہمان ثابت ہو گے۔"

"میں کوشش کروں گا کہ تمہاری ان توقعات پر پورا اُتر سکوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد میں کئی ثانیوں تک خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تصویر سے میری کیا گفتگو ہوئی تھی اور اس کا کیا پس منظر تھا۔

اس نے تمام واقعات اور شبہات کے خلاف ایسی خوبصورت موشگافیوں کا سہارا لیا تھا کہ مجھے اپنے تمام مفروضات ریت کے گھروندوں کی طرح ڈھیر ہوتے نظر آ رہے تھے۔ اس کے بیان کے مطابق نہ وہ میرا دشمن تھا اور نہ توقیر کسی گروہ کا سرغنہ۔ بلکہ وہ محض ہمدردی اور محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھ سے ملنا

چاہ رہا تھا اور میں اپنے دل میں ان دونوں کے خلاف بُغض و عناد کی ایک دنیا بسائے بیٹھا تھا۔

"یہ تخلیہ کتنی دیر جاری رہے گا؟" سلطان شاہ نے اندر سے ہانک لگا کر مجھے چونکا دیا۔ "ہم دونوں انتظار میں سوکھے جا رہے ہیں۔"

"چلے آؤ۔ بات ختم ہو چکی ہے۔" میں نے اونچی آواز میں کہا اور سلطان شاہ، نصیر خان کے پیچھے چلتا ہوا وہاں آ موجود ہوا۔

نصیر خان سے گفتگو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی لہٰذا اسے اگلے دن مطلوبہ فہرست کی فراہمی کی یاد دہانی کے بعد ہم دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ پُرپیچ گلیوں سے گزرتے ہوئے سلطان شاہ خاموش رہا۔ اسے فکر لاحق تھی کہ کہیں نصیر خان نے ہم لوگوں کے تعاقب کا بندوبست نہ کیا ہوا ہو اور جب اسے نگرانی کی طرف سے بے فکری ہو گئی تو اسے میری فون کالز یاد آئیں۔

"تین فون کیے تھے۔ ان میں سے دو رسمی سے تھے تیسرا تصویر کو کیا تھا۔ اس کا تو رویہ ہی عجیب تھا، سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے دوست سمجھوں یا دشمن۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تمہیں کوئی گہری پٹی پڑھائی ہے۔" سلطان شاہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"وہ لائیڈز کالج میں اسٹیٹ منیجر کے طور پر ملازم ہے اور پچھلی رات وہاں رونما ہونے والے واقعات سے بالکل لاعلم ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ پرانی رنجشوں کو بھلا کر دوبارہ برادرانہ رشتہ استوار کرنا چاہتا ہے۔"

"اور تم توقیر کی زیادتیاں بھی فراموش کر دو گے؟"

"میں اس بارے میں بھی بے یقینی کا شکار ہو گیا ہوں۔ میں نے برسوں پہلے ان دونوں کو دیکھا تھا اور اب حافظہ بالکل صاف ہے، اگر میرے گھر آنے والا خود ہی توقیر کی حیثیت سے اپنا تعارف نہ کراتا تو میرا پہچاننا ناممکنات میں سے تھا لیکن تصویر کا کہنا ہے کہ توقیر پچھلے دو مہینوں سے غیر ملکی دورے پر نکلا ہوا ہے اور آج کل اوٹاوا میں مقیم ہے۔"

اس کے استفسار پر میں نے اسے اپنی اور تصویر کی گفتگو کی تفصیلات سُنا ڈالیں۔

"بظاہر تو اس کی کسی بات پر شبہ کرنے کا جواز نظر نہیں آتا۔" میری پوری کہانی سن کر سلطان شاہ بڑبڑایا۔ "تمہارا کیا اندازہ ہے اس بارے میں؟"

"خدا کرے کہ وہ سچ بول رہا ہو، مجھے تو اس کی کسی بات میں جھول نظر نہیں آیا۔"

"اور مجھے پوری کہانی میں سازش کی بُو آ رہی ہے۔" اس نے طویل سانس لے کر کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ لائیڈز کالج کے تین ملازم مار دیے جائیں اور اسٹیٹ منیجر کو اس کی ہوا بھی نہ لگ سکے..... ان معاملات سے اپنی لاتعلقی ظاہر کر کے وہ تمہیں گھیرنا چاہ رہا ہے۔ جہاں طاقت کام نہ دے، وہاں جھوٹ بڑے کام نکال دیتا ہے۔"

"یہ شبہ میرے ذہن میں بھی ہے، وہ لوگ میرا سراغ کھو چکے ہیں اور ہمارے ہاتھوں زک بھی اٹھا رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اب اس نے ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر جال ڈالنے کا فیصلہ کیا ہو۔"

"پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اسے موقع فراہم کرو گے یا اپنی کارروائیوں میں شدّت پیدا کرو گے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا، پہلے ہوٹل پہنچ کر آپریٹس پر ان لوگوں سے رجوع کروں گا، دیکھنا یہ ہے کہ تصویر سے میری گفتگو کے بعد ان کے رویے میں کیا تبدیلی رونما ہوتی ہے، اسی کی بنیاد پر آگے کی حکمتِ عملی مرتب کرنا ہو گی۔"

اسی اثنا میں ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور ہماری گفتگو کا سلسلہ وہیں منقطع ہو گیا۔

"تم مانو یا نہ مانو، مجھے تو یہ گہری چال نظر آ رہی ہے۔" ہوٹل پہنچنے کے بعد سلطان شاہ نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔ "اس گفتگو کے ذریعے تم نے اسے یہ جتا دیا ہے کہ تم لاہور میں موجود ہو اور تمہیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ لائیڈز کالج میں مقیم ہے۔ نصیر خان کے بیان کے مطابق بھی سنڈیکیٹ کے سربراہ کا ٹھکانہ وہی ہے۔ اتنے اتفاقات آسانی کے ساتھ یکجا نہیں ہو سکتے۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ تنظیم کے کسی گمنام کارندے کا توقیر بن کر میرے گھر آنا، ایشین سنڈیکیٹ کے سربراہ کے نام کا مخفف توقیر اور تصویر سے مشابہ ہونا، رمضان چاچا کا درمیان میں پڑ کر ایک تلخ تجربے سے گزرنا اور لائیڈز کالج کا مجرمانہ وارداتوں میں ملوّث ہونا محض اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا تھا..... مٹھی جو بند تھی اب بڑی حد تک کھل گئی تھی، دونوں فریق ایک دوسرے سے واقف ہو چکے تھے لیکن فریقِ ثانی لومڑی کی سی مکاری سے کام لیتے ہوئے کھلے اعترافات سے گریزاں تھا تاکہ مجھے اپنے ڈھب پر لا کر وار کر سکے۔

کمرے میں لباس وغیرہ بدلنے کے بعد بستر پر دراز ہو کر میں نے آپریٹس سنبھال لیا۔

"ڈولی نمبر دو کالنگ!" میں نے آپریٹس آن کر کے ٹرانسمیٹنگ بٹن دباتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ "جو بھی میری آواز سن رہا ہو،

وہ کال کا جواب دے... اوور!"

"ڈیوٹی روم ریسیونگ!" فوراً ہی دوسری طرف سے جواب ملا تھا۔ "بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم نے آپریٹس کی تباہی کا سوانگ ختم کر کے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا... ہم تم سے رجوع کرنا چاہ رہے تھے... اوور!"

"مجھے اپنے آدمیوں سے ابھی معلوم ہوا ہے، انھوں نے تمھارا وہ پیغام سنا تھا جس میں کار کی واپسی کی اطلاع دی گئی تھی، میں مصروفیت کی بنا پر رابطہ قائم نہیں کر سکا لیکن اپنی شرط کے ساتھ اب لائن پر موجود ہوں۔ اوور!"

"شرط؟ کیسی شرط؟ اوور!" تحیر آمیز لہجے میں سوال کیا گیا۔

"میں صرف اور صرف تمھارے باس سے بات کرنا چاہتا ہوں، یہ ممکن نہ ہوا تو میں ابھی گفتگو ختم کر کے تمھارے اس آپریٹس کو برقی آتش دان کی نذر کر دوں گا... اوور!"

"تم باس کو نہیں جانتے... اگر میں کسی اور سے تمھاری بات کرا دوں تو تمھیں علم بھی نہ ہو سکے گا، آخر تم اس شرط پر کیوں اڑے ہوئے ہو؟ میں تم سے بات کرنے کے لیے پوری طرح با اختیار ہوں... اوور!"

"باس خارش زدہ چوہوں کی فوج کا ہو یا تم جیسے انسانوں کا، اپنے تحکم اور لب و لہجے سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ میرا اور اپنا وقت برباد نہ کرو۔ تم میرے سوالات کا جواب نہیں دے سکو گے.... اوور!"

"ہماری دشواری کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" دوسری طرف سے عاجزانہ لہجے میں کہا گیا۔ "اس وقت کم از کم ہمارے بیس آدمیوں کے پاس یہ آپریٹس موجود ہے۔ باس اس رابطے پر تم سے کھل کر بات نہیں کر سکتا... اوور!"

"وہ حاکم ہے اور بیس اس کے محکوم۔ اگر وہ اسی قدر ناقابلِ اعتماد ہیں تو ان سے کچھ دیر کے لیے آپریٹس واپس لیے جا سکتے ہیں۔" میں نے موقع پاتے ہی ان لوگوں میں بددلی پھیلانے کی نیت سے شوشا چھوڑا جو اس وقت اپنے اپنے آپریٹس پر ہماری گفتگو سن رہے تھے۔ "یا پھر مجھے اس سے رابطے کا کوئی دوسرا ذریعہ بتا دو... اوور!"

"دوسرا ذریعہ!" اس طرف سے گہرا سانس لے کر حسرت آمیز لہجے میں کہا گیا۔ "کاش مجھے پہلا ذریعہ ہی معلوم ہوتا اور میں اسے تمھاری خواہش سے باخبر کر سکتا.... میرے لیے یہ ناممکنات میں سے ہے۔ اوور!"

"اور اسی پر تمھیں با اختیار ہونے کا دعویٰ تھا۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "وہ نہیں تو پھر اپنے ایس او یا سیکیورٹی آفیسر سے بات کراؤ کیونکہ آنے والا وقت اس پر بہت بھاری پڑ رہا ہے۔ طبل بج چکا ہے اور لائیڈز کالج کی پُرہیبت و پُراسرار عمارت میرے ہاتھوں کسی وقت بھی کھنڈر ہو سکتی ہے... اوور!"

"ایس او آن لائن۔" میرے خاموش ہوتے ہی آپریٹس پر ایک نئی آواز ابھری جو میرے لیے اجنبی نہیں تھی کیونکہ اسے میں پچھلی رات کے معرکے میں کئی بار سن چکا تھا۔ "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ اوور!"

"ایک اجنبی ہوں اور کل شام تک کچھ نہیں چاہتا تھا لیکن لائیڈز کالج کے سامنے جس توہین آمیز انداز میں مجھے روکا گیا اس کے بعد میں تمھاری اس مختصر سی کائنات کو فنا کرنے کا خواہاں ہوں...... میں بہت کچھ جان چکا ہوں، صبح کا سورج تمھارے لیے بربادیوں کی کئی کہانیاں لے کر طلوع ہو گا، یہ خوشخبری میں اس کو سنانے میں خوشی محسوس کرتا جس کے اشارے پر مجھے روکا گیا تھا... وہ نہیں ملتا تو تم ہی یہ نوید اسے سنا دینا... اوور!"

"خاصے بے جگر معلوم ہوتے ہو۔" دوسری جانب سے تبصرہ کیا گیا۔ "جس وقت بھی آ ڈٹ گئے، ہمیں اپنے استقبال کے لیے تیار پاؤ گے۔ اعلان کر کے وار کرنے والوں کی میں تہہ دل سے قدر کرتا ہوں، کوشش کروں گا کہ تمھیں زندہ ہی پکڑا جائے۔ ایسے نوادر ذرا کم ہی ہاتھ آتے ہیں۔ اور ہاں، یہ بھی سن لو کہ تمھیں رکوانے والا میں خود تھا، تمھاری کار کو دوسری مرتبہ اس سڑک سے گزرتے دیکھ کر میں نے خود ہی تمھیں چیک کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا فیصلہ درست ثابت ہوا۔ اوور!"

"تم نرے گدھے ہو مائی ڈیر ایس او۔" میں نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ "تم ہمیں نہ چھیڑتے تو ہم خود واپسی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ہمیں تو اس شخص کی تلاش تھی جو خود کو لائیڈز کالج کا اسٹیٹ منیجر ظاہر کر کے ایک محفل میں جوئے میں پندرہ ہزار روپے ادھار ہارا تھا اور اس کے بعد سے لاپتا تھا..... وہ عمارت دیکھنے کے بعد ہم نے سمجھ لیا تھا کہ وہاں ہماری دال نہ گل سکے گی اور تمھارے اسٹیٹ منیجر کو ہمیں باہر ہی کہیں گھیرنا ہو گا لیکن بدقسمتی سے تم خود ہی ہم سے الجھ بیٹھے اور اب میرا اندازہ ہے کہ اپنے اسٹیٹ منیجر کے گھپلوں میں تم لوگ برابر کے شریک ہو، اگر آج رات دس بجے تک ہمیں ادھار کی رقم نہ ملی تو انجام بہت برا ہو گا..... پندرہ لاکھ بھی ہمارے پندرہ ہزار کا ازالہ نہ کر سکیں گے.... اوور!"

وہ بہانہ مجھے فی البدیہہ سوجھا تھا لیکن دوسرے بہرے بولنے والے کا ردِعمل حیران کن تھا۔ وہ اپنے بارے میں گئے تبصرے کو بالکل فراموش کر بیٹھا تھا۔ "ہمارا اسٹیٹ منیجر، پندرہ ہزار ادھار ہار رہا ہے؟ شاید تم اس کے رتبے سے لاعلم ہو جو اس پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہو...... وہ لائیڈز کالج کا بے تاج بادشاہ ہے.... نجانے کتنے پندرہ ہزار وہ اپنے ایک اشارے سے ادا کر سکتا ہے، اس بارے میں یقیناً تمھیں بے وقوف بنا گیا ہے.... اوور!"

"خوب!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنی سرگرمیوں کے لیے تم اسی بے تاج بادشاہ کے سامنے جواب دہ ہو۔ اپنے بل میں وہ کتنا ہی فراخ دل کیوں نہ ہو، باہر بالکل کنگال ہوتا ہے..... تم رُتبے کی بات کر رہے ہو، میں اس کے نام سے لے کر شجرے تک سے پوری طرح واقف ہوں.... اوور!"

"تمھارا پیغام اس تک پہنچا دیا جائے گا، تمھارے دعوے میں کوئی حقیقت ہوئی تو وہ خود ہی تم سے رجوع کر لے گا..... لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم کون ہو؟ اوور!"

"میں صرف قرض خواہ ہوں، میرا معاملہ اسی سے ہے... کیا یہ درست ہے کہ تمھارا آقا وہی ہے؟ اوور!"

"غیر ضروری باتوں میں الجھانے کی کوشش مت کرو، اگر تمھاری دھمکیوں میں ذرا بھی وزن ہے تو میں تمھارا منتظر رہوں گا... مجھے یقین ہے کہ ہمارا اسٹیٹ منیجر مقروض نہیں ہو سکتا... یہ سب تمھارے حیلے ہیں... اوور اینڈ آل۔"

اس نے اپنی جانب سے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں چاہتا تو بات آگے بڑھا سکتا تھا لیکن اس میں کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ میرے علم میں آ چکا تھا۔

ایک طرف تصویر نے اپنی اسٹیٹ منیجر کی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ پچھلی رات کے واقعات سے لاعلم تھا کیونکہ لائیڈز کالج کا سیکیورٹی آفیسر اپنے معاملات میں خودمختار تھا اور دوسری طرف سیکیورٹی آفیسر تصویر کو اس عمارت کا بے تاج بادشاہ قرار دے رہا تھا.... مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب حالات تیزی سے رُخ بدلنے والے تھے اور ایک بار حالات کے دھارے پر بہہ نکلنے کے بعد واقعات کو لگام دینا میرے یا کسی کے بھی بس سے باہر ہو سکتا تھا۔

◆

نصیر خان دفتر سے برآمد ہونے والا آخری آدمی تھا۔ اس وقت میری رسٹ واچ میں پانچ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے اور میرے ذہن میں نفرت اور انتقام کے کوندے لپک رہے تھے۔ اس وقت میں اپنی زد میں آنے والی ہر اس چیز کو نیست و نابود کر دینے پر تلا ہوا تھا جس کا تو قیر، تصویر یا اے ٹو کی تنظیم سے کوئی واسطہ ہو۔ سلطان شاہ نے بہت کوشش کی تھی کہ مجھے اس موڈ میں تنہا نہ چھوڑے لیکن میں نے اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا کیونکہ یک بیک میرے پاس وقت نہیں رہا تھا اور میں ہر قیمت پر جلد از جلد کراچی پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔

پچھلی رات سونے سے پہلے ہم نے پروگرام طے کیا تھا کہ سلطان شاہ لاہور میں اپنے مراسم کو بروئے کار لا کر مناسب مقدار میں آتش گیر مادہ اور چند متفرق نوعیت کے بم حاصل کرے گا پھر ہم سارا دن اپنے کمرے میں آرام کرنے کے بعد شام پانچ بجے سے پہلے ایتھین سنڈیکیٹ کے دفتر پہنچیں گے اور دور سے اس کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ نصیر خان کے دفتر سے برآمد ہوتے ہی سلطان شاہ اس کا تعاقب شروع کر دیتا اور اس کے پیچھے پیچھے گھر پہنچ کر اس سے وہ فہرست حاصل کر لیتا جس کا وعدہ ہو چکا تھا۔ اس دوران میں میں دفتر کے قریب چھپ کر اس شخص کا انتظار کرتا جو نصیر خان کے بیان کے مطابق دفتر بند ہونے کے بعد پُراسرار طور پر وہاں آ کر باس کے لیے رکھی ہوئی ڈاک اور کیمرے کا استعمال شدہ رول نکال لے جاتا تھا۔ مجھے اس شخص کے پیچھے اندر گھسنا تھا اور اس سے بازپرس کے بعد اسے ہلاک کر دینا تھا، ساتھ ہی اپنی جیبوں میں موجود مادے کے ذریعے فرم کے دفتر کو نذرِ آتش کر دینا تھا۔ اس دوران میں سلطان شاہ نصیر خان سے جلد از جلد فارغ ہو کر واپس لوٹتا اور مداخلت کیے بغیر باہر میرے اشارے کا منتظر رہتا۔ کسی دشواری کی صورت میں میرا ہاتھ بٹانے کے لیے وہ بھی اندر گھس پڑتا ورنہ تنظیم کے اس اہم کاروباری ٹھکانے کو نذرِ آتش کر کے ہم واپس ہو لیتے۔

لیکن وہ دن ہی شاید کچھ خراب تھا۔ صبح سلطان شاہ پروگرام کے مطابق روانہ ہو گیا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ وقت گزاری کے لیے نیچے اُتر کر کسی کال آفس سے غزالہ کے گھر بات کی جائے۔ ویسے بھی وہ پچھلے دن کافی عرصے کی نظربندی کے بعد اپنے مکان کی چار دیواری سے نکلی تھی، اور میری بات ہونے تک واپس نہیں لوٹی تھی۔

فون کا سلسلہ ملتے ہی میری آنکھوں کے آگے تاریک دائرے ناچنے لگے۔ فون پر میری آواز پہچانتے ہی کرنل کسی بچے کی طرح بلک کر رو پڑا تھا۔ سہیلی کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں گئی ہوئی غزالہ نہ گھر لوٹی تھی، نہ شہر میں اس کا

کوئی پتا تھا۔ اس سے آگے نہ میں کرنل سے کچھ پوچھ سکا اور نہ وہ مجھ سے بات کر سکا، میں نے بوتھ میں ریسیور کریڈل سے لٹکا کر کاؤنٹر پر کال کی رقم ادا کی اور واپس ہوٹل کی طرف چل دیا۔

وہی شہر تھا، وہی سڑکیں تھیں اور میں دوسری بار اپنی ذات کے اس ناقابلِ بیان کرب سے آشنا ہوا تھا جب مجھے اپنی کوکھ سے جنم دینے والی ماں لاپتا ہوئی تھی تو میں کسی اندھے، بہرے اور گونگے کی طرح مسلسل کئی دن اور کئی راتیں تک لاہور کی سڑکوں اور گلیوں میں چلتا رہا تھا۔ مجھے نہ بھوک لگی تھی نہ پیاس نے ستایا تھا۔ بس ذہن میں ایک بھیانک سی گونج تھی، تنہا رہ جانے کا ایک ناقابلِ بیان خوف تھا جو میری رگوں میں گہرا... اور گہرا اُترتا جا رہا تھا اور غزالہ کی گمشدگی کی خبر بھی میرے لیے اسی قدر کربناک تھی وہ خبر سن کر میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے تھے، دماغ ماؤف ہو گیا تھا، یوں معلوم ہوا تھا جیسے زندگی کے دامن میں میرے لیے کچھ بھی نہ رہا ہو، مجھے بھرے بازار میں بے دردی کے ساتھ لوٹ لیا گیا ہو۔ شاید اس بار بھی میں صدمے اور سکتے کی کیفیت میں اس بے رحم شہر کی فٹ پاتھوں اور گلیوں میں چلتا ہی رہتا لیکن ماں کی موت کی خبر پانے والے تنویر علی کے مقابلے میں منگیتر کی گمشدگی کی اطلاع سننے والا تنویر علی زیادہ پختہ کار اور جہاندیدہ تھا جو یوں ہی گم رہتا تو غزالہ کا مستقبل کیا ہوتا؟ اس کی روشن پیشانی پر مکروہ اور ہوسناک ہاتھوں کے غلیظ نشانات کا تصور کر کے میرے وجود کی گہرائیوں میں ایک بھیانک عفریت جاگ اٹھا جو سراپا تباہی تھا جس کے ہر نفس میں نفرت اور انتقام کے اژدھے پھنکار رہے تھے۔

عورت جس روپ میں بھی ہو، بظاہر صرف عورت ہوتی ہے لیکن یہ ایک سرسری سا فلسفہ ہے عورت کے پانچ روپ ہوتے ہیں، ماں، بہن، بیٹی، بیوی اور محبوبہ۔ اور ان میں سے ہر روپ کا اپنا ہی ایک اثر ہوتا ہے۔ غزالہ کیا گم ہوئی تھی، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا کا پورا انتظام بگڑ گیا ہو، ارذل اور حقیر لوگوں کو ثقہ لوگوں کی پگڑیاں اچھالنے کا اختیار مل گیا ہو... پھر جو جو نام میرے سامنے تھے، ذہن ان کے فیصلے صادر کرنے لگا۔ حالاں کہ نہ میں ثقہ تھا اور نہ غزالہ کو اغوا کرنے والے اتنے ارذل!

رخشی سے تصویر تک، سب ہی میرے مجرم تھے اور ان کا انجام عبرتناک تھا۔

سلطان شاہ مطلوبہ سامان لے کر خوشی خوشی واپس آیا تو میرے سُتے ہوئے چہرے اور انتقام سے جلتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر سہم گیا۔ میری حالت شاید اس قدر ابتر تھی کہ وہ مجھ سے سوال کرنے کی ہمت بھی نہ کر سکا مگر میں نے اسے جذبات سے عاری، کھوکھلے لہجے میں اس سچائی سے آگاہ کر دیا جو اس وقت میری روح کا عذاب بنی ہوئی تھی اور وہ پورے وجود سے کانپ کر رہ گیا... اس کی زبان سے میری ہمدردی میں ایک لفظ بھی نہ نکل سکا کیونکہ وہ ان لوگوں سے خوب واقف تھا جن سے ہماری ٹھنی ہوئی تھی۔ وہ جان و مال ہی نہیں، میری آبرو کے بھی بدترین دشمن تھے۔

وہ کمرے میں بیٹھا ایک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔ نہ دلاسا دے سکا نہ انتقام پر اُکسا سکا اور جب دن ڈھلنے لگا تو میں اس کا لایا ہوا سامان ایک تھیلے میں سمیٹنے لگا۔ اس وقت سلطان شاہ نے پہلی بار زبان کھولی اور مجھے اپنا پروگرام ملتوی کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ اس وقت اس کی دانست میں میں ذہنی تعطل کا شکار تھا اور کسی بڑی کارروائی کے نتیجے میں کامیابی کے بجائے نئے مصائب مول لے سکتا تھا لیکن مجھ پر دیوانگی طاری تھی، میں نے اسے پھٹکار دیا۔ جب اس کا اصرار بڑھا تو شاید میں نے اسے توقیر اور تصویر کا ایجنٹ بھی قرار دے ڈالا۔ یہ الزام ایسا تھا کہ اس کی زبان بند ہو گئی اور وہ حکم کی تعمیل پر اُتر آیا۔

مجھے معلوم تھا کہ اس وقت وہ مجھ سے کچھ دور ایک گلی میں چھپا نصیر خان کا منتظر تھا۔ اس کی عادات کے پیشِ نظر مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ شاید نصیر خان کے گھر پہنچنے تک صبر نہ کر سکے بلکہ میری تنہائی کے خیال سے نصیر خان کو راستے ہی میں روک کر مطلوبہ فہرست کا مطالبہ کر بیٹھے لیکن اس وقت وہ سب سلطان شاہ کے مسائل تھے۔ میری پوری توجہ سنڈیکیٹ کے دفتر پر مرکوز تھی جس کا غزالہ کے اغوا کنندگان سے گہرا تعلق تھا۔

نصیر خان نے دفتر کا بیرونی دروازہ مقفل کر کے چابیاں جیب میں ڈالیں اور عجلت کے ساتھ فٹ پاتھ پر ایک طرف ہو لیا۔ اسی لمحے ایک قریبی گلی سے سلطان شاہ نمودار ہوا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا ان لوگوں کی بھیڑ میں مدغم ہو گیا جو دفتروں سے چھٹی ہونے کے بعد اپنے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے..... سب اپنے اپنے گھر جا رہے تھے لیکن میں کہاں جاؤں؟

بے اختیار میرے ذہن میں رخشی کا سنایا ہوا ایک شعر در آیا ہے

شام ہونے کو ہے، کدھر جائیں؟
اپنا گھر ہو تو اپنے گھر جائیں!

گھر جل چکا تھا [illegible] پھونک دیا تھا لیکن غزالہ کی صورت میں [illegible] امید زندہ تھی، ظالموں نے [illegible] کو اغوا کر لیا تھا... اسے کبھی نہ چھوڑا [illegible] مجھے اپنے شانے پر [illegible] گراں محسوس ہونے لگا۔ اس بیگ میں [illegible] کی چنگاریاں [illegible] سے لوٹے [illegible] تھا۔

یہ شاید [illegible] زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا [illegible] سے تیسرے میں ملبوس ایک [illegible] دار [illegible] سنڈیکیٹ کے دفتر کا بیرونی تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ دی۔

فٹ پاتھ عبور کرنے میں نے دروازے پر زور آزمائی کی تو وہ خود کار سسٹم کے تحت دوبارہ مقفل ہو چکا تھا۔ میں نے جیب سے ایک مڑا ہوا تار نکال کر قفل پر قسمت آزمائی کی اور چند ثانیوں بعد میں بھی اندر داخل ہو چکا تھا۔

دروازہ بند ہوتے ہی باہر سے آنے والی آوازوں سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ دفتر کی عمارت میں گہرے سناٹے کا راج تھا البتہ آگے [illegible] کے کھلے ہوئے دروازے سے روشنی آ رہی تھی۔

میں نے اپنے شانے سے لٹکا ہوا بیگ اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور [illegible] کے ایک حفاظتی جیب سے بے آواز ریوالور نکال کر دبے قدموں روشن کمرے کی طرف ہو لیا۔

میں پنجوں کے بل دروازے کے سامنے پہنچا تو وہی قوی الجثہ شخص دروازے کی طرف پشت کیے میز پر کچھ کام کرتا نظر آیا اور اچانک ہی میری ذہنی رو بہک گئی۔ وہ میرے دشمنوں کا ہرکارہ تھا۔ دشمن میرے جانے پہچانے تھے لہٰذا مجھے اس سے کسی پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر پوری قوت سے اس کی پشت پر لات رسید کی اور وہ حلق سے کریہہ سی آواز نکالتا ہوا منہ کے بل زمین پر گر گیا، اس سے پیشتر کہ وہ سنبھل کر میز کی سطح سے اٹھتا، میں نے ریوالور کے آہنی دستے سے پوری قوت سے اس کے سر کے عقبی حصے پر ضرب لگائی اور اس نے کراہتے ہوئے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔

غزالہ کے اغوا کے بعد وہ دشمن کا پہلا آدمی تھا جو میرے قبضے میں آیا تھا۔ اس وقت مجھ پر درندگی سوار ہو رہی تھی اور میں اسے اپنے ہاتھوں سے اُدھیڑنا چاہتا تھا لیکن کھوپڑی پر چوٹ کھاتے ہی اس نے جس انداز میں ہاتھ پیر ڈالے اس نے مجھے شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور میں نے بددلی کے عالم میں ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

کیمرا جو میرے حملے کے وقت شاید اس کے ہاتھ میں تھا، فرش پر گر کر چکنا چور ہو چکا تھا۔ میں مایوسانہ انداز میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے کیونکہ وہ شخص میری بے خبری میں کسی ہلکے پرندے کی طرح فضا میں اڑتا ہوا میرے اوپر آ پڑا تھا اور میں اس کی جھونک میں عقبی دیوار سے ٹکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ غنیمت تھا کہ میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا تھا اگر وہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو اس شدید جسمانی تصادم میں یقیناً میرے قبضے سے نکل گیا ہوتا۔

میں فرش پر پڑا ہوا تھا اور وہ کسی دیوپیکر عفریت کی طرح دونوں ہاتھ پھیلائے دوبارہ مجھ پر ٹوٹ پڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے ان چند ہی ثانیوں میں اس کی وحشیانہ قوت کا اندازہ لگا لیا تھا اور اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر وہ اس بار مجھے چھاپ بیٹھا تو میرے لیے اس کے وحشیانہ چنگل سے نکلنا محال ہو جائے گا لہٰذا میں نے پھرتی سے ریوالور نکالا اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے سینے پر فائر کر دیا۔

اس کے حلق سے ایک سسکاری نکلی اور وہ غضبناک انداز میں مجھ پر ٹوٹ پڑا۔

گولی اگر اس کے دل میں نہیں تو دل کے آس پاس ہی لگی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی پھرتی برقرار نہ رکھ سکا۔ میں فرش پر پڑے پڑے ایک طرف سرک گیا اور وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح منہ کے بل فرش پر آ رہا۔

میں نے پھرتی کے ساتھ اُٹھ کر ایک بے آواز گولی اس کی کھوپڑی میں بھی اُتار دی۔

جب وہ تڑپ تڑپ کر میری نگاہوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا تو اچانک مجھے باہر ایک آہٹ سنائی دی اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا! نجانے وہ کون تھا اور کیسے وہاں گھس آیا تھا؟

ایک شکار تو میں نے نیم بے خبری میں مار لیا تھا لیکن دوسرے کے بارے میں مجھے زیادہ خوش فہمی نہیں تھی لہٰذا میں اپنی جگہ چھوڑ کر تیزی سے دروازے کی [illegible] میں ہو گیا۔

آہٹ

معدوم ہو گئی تھی۔ سانس روکے دروازے کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ میرا شکار آخری سانسوں پر تھا۔ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا اور وہ کسی بھی لمحے زندگی کا ساتھ چھوڑ سکتا تھا لیکن وہ آہٹ؟

مجھے پورا یقین تھا کہ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ اپنے شکار کے تڑپنے کی سرسراہٹوں میں وہ آواز میں نے واضح طور پر سنی تھی۔ میرے اور دم توڑنے والے کے علاوہ کوئی اور بھی اس چھت کے نیچے موجود تھا۔ لیکن وہ کون تھا؟

ایک ثانیے کے لیے میرا ذہن سلطان شاہ کی طرف منتقل ہوا لیکن اس کی فتے داری خاصی دشوار تھی۔ اسے نصیر خان کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے گھر جانا تھا اور وہاں اس سے فہرست لینے کے بعد دوبارہ واپس آنا تھا۔ واپسی کے بعد اسے سنڈیکیٹ کے دفتر سے باہر رک کر میرا یا میرے اشارے کا انتظار کرنا تھا۔ اُسے طلب کرنے کے لیے مجھے اپنے ذاتی پستول سے فائر کرنا تھا اور وہ دھماکے کی آواز سنتے ہی میری مدد کے لیے دفتر میں داخل ہو جاتا۔

اوّل تو اس مختصر سی مدت میں سلطان شاہ کا واپس لوٹنا محال تھا۔ دوئم یہ کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے اُسے مداخلت کا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ لہٰذا اس عمارت میں میرے اور مرنے والے کے علاوہ اگر کوئی تیسرا موجود تھا تو کم از کم وہ سلطان شاہ ہرگز نہیں تھا۔ ذہن میں یہ خیال واضح ہوتے ہی بے آواز پستول کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی لیکن دفتر کی محدود فضا میں سناٹا ہی گونجتا رہا۔ نہ کوئی آواز تھی، نہ آہٹ۔ میرا شکار دم توڑ چکا تھا اور میرے کانوں میں بس اپنے ہی سانسوں کی بکھری بکھری بے ترتیب سی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے بیگ احتیاط سے وہیں فرش پر رکھ دیا۔

مجھے انتظار کرتے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن ماحول کے تناؤ سے میرے اعصاب چٹخنے لگے۔ دل چاہا کہ ساری احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر پستول کی نال سیدھی کر کے باہر نکال جاؤں لیکن اسی لمحے ایک آواز پیدا ہوئی جیسے چلتے چلتے اچانک ہی کسی کے جوتے کا تلا پختہ فرش سے رگڑ کھا گیا ہو۔

میں دروازے کی اوٹ میں چوکنا ہو گیا۔ لحظہ بھر بعد ہی مجھے اپنے سانسوں پر قابو پانا پڑا کیونکہ کوئی کھلے ہوئے دروازے کے عین باہر موجود تھا۔ میں نے سر گھما کر اپنے دشمن کی بے جان لاش کا جائزہ لیا اور نو وارد کے اندر داخل ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مرنے والے کی لاش ایسی جگہ پڑی ہوئی تھی کہ دروازہ کھلا ہونے کی صورت میں اُسے باہر سے بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ منہ کے بل غیر فطری انداز میں مڑا تڑا ہوا فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے زخم سے بہنے والا تازہ تازہ خون قالین کے خاصے بڑے حصّے کو داغدار کر چکا تھا۔ ان علامتوں کو دیکھ کر دور ہی سے لگایا جا سکتا تھا کہ وہ زندگی سے اپنا ہر رشتہ منقطع کر چکا تھا۔

"اندر کون ہے؟" اچانک باہر کی راہداری سے ایک تحکمانہ آواز گونجی اور میں اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ آواز کی سمت سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ دروازے کے عین سامنے ہی موجود تھا۔

"تم جو کوئی بھی ہو، مجھے معلوم ہے کہ اندر ہی ہو... دونوں ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ، ورنہ میں تمھیں باہر نکالنے کی ترکیبیں بھی جانتا ہوں۔ یہ نہ بھولو کہ ایک خون کرنے کے بعد تم مجھ سے کوئی رعایت حاصل نہ کر سکو گے۔" میرے جواب کا انتظار کرنے کے بعد اس نے دوبارہ تلخ اور غصیلے لہجے میں زبان کھولی لیکن میں اس بار بھی خاموش ہی رہا۔

صورتِ حال بہت نازک تھی۔ میں کمرے میں دروازے کی اوٹ میں مقید تھا اور وہ باہر اسلحہ بدست پوری طرح آزاد تھا۔ جنگی اصطلاح میں اُسے پیش قدمی کا فائدہ حاصل تھا۔ اگر اُسے ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ میں دروازے کی آڑ میں چھپا ہوا تھا تو وہ اس کھوکھلے چوبی دروازے پر گولیاں برسا کر ان میں سے ایک آدھ میرے بدن میں بھی اتار سکتا تھا۔

چند ثانیوں کے لیے فضا پر بوجھل سکوت چھا گیا۔ پھر وہ اچانک ہی کسی دیوانے کی طرح دوڑتا ہوا اندر گھستا چلا آیا۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر جب تک وہ پلٹتا، مجھے مہلت مل گئی اور میں نے اس کے پچھلے دھڑ میں بے آواز گولی اتار دی۔ وہ بُری طرح غراتا ہوا مڑا اور فضا میں بیک وقت دو بے آواز فائروں کے کھٹاکے گونج اٹھے۔

میری گولی نے اس کے داہنے ہاتھ کو..... چاٹ لیا تھا اور اس کا فائر کافی بلندی پر دیوار میں لگا تھا۔ وہ زخمی ہونے سے پہلے ہی اپنے پستول کا ٹریگر دبا چکا تھا کیونکہ زخمی ہوتے ہی پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور میں نے جست لگا کر پوری قوت سے اس کے پیٹ میں لات رسید کر دی۔ وہ بظاہر خاصا جسیم اور شہ زور نظر آ رہا تھا لیکن پے در پے وار ہوتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے وحشیانہ انداز میں میری ٹانگ سے لپٹ پڑنے کی کوشش کی اور شاید پنڈلی کو دانتوں سے اُدھیڑنا بھی چاہا لیکن اس کی ران پر آیا ہوا زخم میری مزاحمت کا بوجھ نہ سہار سکا اور وہ لڑکھڑا کر نیچے ڈھیر ہو گیا۔

میں نے بڑھ کر اُس کا بے آواز ریوالور بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔

"کھڑے نہیں ہو سکتے تو شرافت سے نیچے بیٹھ جاؤ۔" میں نے اسے اٹھنے کی ناکام کوشش سے باز رکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ یاد رکھنا کہ حکم عدولی کی صورت میں سارا بدن زخموں سے داغدار کر کے سسکتا ہوا چھوڑ جاؤں گا اور اس دفتر میں لگنے والی آگ کے شعلے آہستہ آہستہ تمھارے وجود کو چاٹ جائیں گے۔"

اس کے نقطۂ نظر سے صورتِ حال بہت سنگین تھی۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کے بجائے خوف کی کیفیت نمودار ہوئی اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

"کس کے لیے کام کرتے ہو؟" میں نے پستول کی نال کو جنبش دیتے ہوئے سرد اور سفاکانہ لہجے میں سوال کیا۔

"تت... تم کون ہو؟ اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟" الٹا اسی نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"لینے نہیں موت کا پیغام دینے آیا تھا، عافیت چاہتے ہو تو سوال کرنے کے بجائے سیدھے سیدھے جواب دیتے چلے جاؤ..."

"تو تم مجھے زندہ چھوڑ دو گے؟" اس کے خوفزدہ لہجے میں اُمید کی کرن عود کر آئی۔

"پھر وہی سوال؟" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "میں بتلائے دیتا ہوں کہ تمھاری زندگی کا انحصار صرف اور صرف تمھارے جوابات پر ہو گا۔ ہر جھوٹ کا انعام تمھارے بدن پر ایک زخم کی صورت میں ہو گا لہٰذا جس قدر بول سکتے ہو، بولے جاؤ... کوشش کرو کہ مجھے کوئی سوال نہ کرنا پڑے۔"

"میں کسی کے لیے کام نہیں کرتا۔ بہادر نے تین سال سے مجھے ساڑھے تین ہزار تنخواہ پر رکھا ہوا تھا۔" اس نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا کام بس اتنا تھا کہ سوا پانچ سے واپسی تک دور رہ کر اس کا انتظار کروں اور جب یہ فارغ ہونے کے بعد اپنی گاڑی میں جا بیٹھے تو میں آزاد ہو جاتا تھا... میرا کام بس اس کی حفاظت کرنا تھا تاکہ جب وہ دفتر میں گھسا ہوا ہو تو کوئی اور مداخلت نہ کر سکے... کسی بُرے وقت پر استعمال کرنے کے لیے یہ بے آواز پستول بھی اسی نے دیا تھا لیکن تین برس میں آج پہلی بار اس کے استعمال کی نوبت آئی تھی۔"

"صرف آدھے پونے گھنٹے کے ساڑھے تین ہزار ملتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"عام طور پر وہ جلد ہی فارغ ہو جاتا تھا، کبھی کبھار دیر بھی ہو جاتی تھی۔"

"وہ روزانہ یہاں آتا تھا؟"

"روزانہ!" اس نے جلدی سے سر ہلا کر کہا۔ "چھٹیوں والے دن ناغہ ہوتا تھا۔"

"اور یہاں آنے کا مقصد کیا ہوتا تھا؟"

"نہ اس نے کبھی بتایا، نہ میں نے جاننے کی کوشش کی... ہم جیسے لوگوں کو اچھی تنخواہ پر ایسی بچی نوکری کہاں ملتی ہے جو میں زیادہ جاننے کی کوشش کرتا۔ ہر مہینے کی آخری تاریخ کو تنخواہ مل جاتی تھی۔ ایک آدھ گھنٹے کی اس نوکری کو میں تو مقدر کا انعام ہی سمجھتا تھا۔ دوسرے دھندوں میں خطرات کے باوجود اتنی آمدنی نہیں ہوتی۔"

"کرتے کیا ہو؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"کاچھا پہلوان کے اڈے سے شہر میں ہیروئن سپلائی کرتا ہوں۔"

"بہادر سے کہاں ملاقات ہوئی تھی؟"

"ایک ہوٹل میں وہ خود ہی آ ٹکرایا تھا... پتا نہیں اُسے کس نے میرے بارے میں بتایا تھا؟"

"تم میرے پیچھے دفتر میں گھسے تھے؟"

"مجبوری تھی۔" اس نے بے بسی کے ساتھ کہا۔ "شاید وہ اسی دن کے لیے مجھے پال رہا تھا۔"

"نقب زنی بھی کر لیتے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے... چھوٹے موٹے تالے تو لائن کا ہر آدمی آسانی کے ساتھ کھول لیتا ہے... کیا تم اس دفتر میں کام کرتے ہو؟" اس نے چونک کر سوال کیا تھا۔ شاید وہ بھول گیا تھا کہ میں ذرا دیر پہلے دفتر کو نذرِ آتش کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکا تھا۔

"ہوں۔" میں نے غراتے ہوئے کہا۔ "یہ تین برس سے اس دفتر کے راز چرا رہا تھا اور تم اس کی مدد کر رہے تھے...؟"

"مم... میں نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے تو آج پہلی بار اندر قدم رکھا ہے۔"

"اگر میں تمھیں زیر نہ کر لیتا تو تم ہرگز مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔"

"میں تمھیں جان سے ہرگز نہ مارتا۔" اس نے بوکھلا کر جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔ "اگر دور سے مجھے اندازہ ہو جاتا کہ بہادر مر چکا ہے تو شاید دخل دیے بغیر خاموشی سے واپس لوٹ جاتا۔ میں سمجھا تھا کہ وہ صرف زخمی ہوا ہے اور بے ہوش ہے۔ نوکری کے علاوہ نہ مجھے اس سے کوئی ہمدردی تھی، نہ تم سے دُشمنی ہے۔ جب وہی مر گیا تو پھر میرا کسی سے کیا واسطہ؟"

اس وقت میرے وجود میں رہ رہ کر غیظ و غضب اور انتقام کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ کراچی میں غزالہ کی گمشدگی کی خبر

سُننے کے بعد میرے ذہن پر ایک سیاہ چادر سی آگری تھی جو ہر احساس پر غالب آگئی تھی اور اس چادر پر بس ایک ہی نقش نمایاں تھا کہ میں ہر اس بے جان اور ذی روح شے کو فنا کر دوں جس کا لالے۔ ٹویا اُس کے گرگوں سے کوئی تعلق ہو، کیونکہ میری دانست میں وہی لوگ عزالہ کے اغوا کے ذمے دار تھے، انھوں نے لاہور میں اپنی ناکامی کا بدلہ کراچی میں چکا دیا تھا۔

لیکن اس شدید ہیجانی کیفیت میں بھی میری عقل ماؤف نہیں ہوئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ نووارد قیدی جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سچ پر مبنی تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں تنظیم کا باقاعدہ کارندہ نہیں تھا۔ بہادر نے اپنے مخصوص مقصد کے لیے اس کی خدمات حاصل کی تھیں لہٰذا وہ میرے دشمنوں کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔

"اب میں اس دفتر کو آگ لگانے جا رہا..."

اس نے بوکھلا کر میری بات کاٹ دی اور گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا کیا ہوگا؟"

"اپنی حماقت سے زخمی نہ ہوئے ہوتے تو تمہیں بھی ساتھ ہی لے کر نکلتا۔ موجودہ حالت میں تمہارے لباس پر آئے ہوئے خون کے دھبے اشتہار بن جائیں گے۔ میرے نکلنے کے بعد تم بھی آسانی سے فرار ہو سکو گے۔"

"لل... لیکن تم آگ کیوں لگا رہے ہو... دفتر تو تمہارا اپنا ہے نا؟ تم یہیں کام کرتے ہو نا؟"

"احمق آدمی! میں اس دفتر کا مالک ہوں۔" میں نے دروازے کی اوٹ سے اپنا بیگ نکالتے ہوئے کہا۔ "بہادر کی لاش میرے لیے مصیبت بن گئی ہے۔ تفتیش کے لیے پولیس یہاں پہنچے گی اور پھر میرا سارا ریکارڈ ان کی دسترس میں ہوگا۔ میرے لیے یہ بھی ناممکن ہے کہ عملے کی مدد کے بغیر صبح ہونے سے پہلے سارا اہم ریکارڈ تلاش کر کے تلف کر سکوں۔ لہٰذا دفتر کو آگ لگانا پڑے گی تاکہ پولیس کو یہاں خاک کے سوا کچھ نہ مل سکے۔"

"لاش میں غائب کر دوں گا۔" اس نے پیش کش کی۔ "اس کی گاڑی سامنے والی گلی میں موجود ہے۔ رات میں کسی بھی وقت لاش اس کار میں ڈال کر لے جاؤں گا۔"

"نہیں... زیادہ وفاداری دکھانے کی کوشش نہ کرو۔ قالین پر خون کے داغ ہیں۔ عملے کی زبان بند رکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس واقعے کی بھنک بھی پولیس کو مل گئی تو لاش غائب ہونے کے باوجود جواب دہی مشکل ہو جائے گی۔"

وہ احمقانہ انداز میں سر ہلا کر رہ گیا جیسے اپنی کم عقلی کا اعتراف کر رہا ہو۔

پھر میں نے اس کی مدد سے پورے دفتر میں آتش گیر مادہ اس طرح پھیلانا شروع کر دیا کہ ایک جگہ دیا سلائی دکھائی جائے تو آگ کے شعلے دفتر کے ہر گوشے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔ اس کارروائی میں صرف داخلی دروازے کے قریب کا کچھ حصہ میں نے دانستہ محفوظ چھوڑا تھا تاکہ نووارد میرے نکلنے کے بعد وہاں ٹھہر کر انتظار کر سکے، دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ میں دفتر سے باہر نکلوں تو باہر سے کسی کو شعلے نظر نہ آسکیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نکاسی کے راستے کے قریب آیا اور ایک دیا سلائی جلا کر آتش گیر سیال میں بھیگے ہوئے فرش پر اچھال دی۔ ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ شعلہ لپکا اور ہر سمت میں پھیلنے لگا۔ میں وقت ضائع کیے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

میرے کندھے سے لٹکا ہوا تھیلا وزن میں کافی ہلکا ہو چکا تھا لیکن اب بھی اس میں خطرناک آتش گیر بم موجود تھے اور میں انہیں جلد از جلد اُن کے ٹھکانے پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔

میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ سلطان شاہ راہگیروں کی بھیڑ میں سے نمودار ہو کر مجھ سے آملا۔ اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں آگ آگ کا شور سنائی دیا اور فٹ پاتھ پر بڑھتا ہوا ہجوم یک بیک ٹھہر گیا۔ ہر شخص مڑ مڑ کر اسی طرف دیکھ رہا تھا جدھر سے آگ کا شور سنائی دے رہا تھا۔ جو زیادہ پُرجوش تھے انھوں نے ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے اسی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اس صورت حال میں اگر ہم لاتعلقانہ انداز میں پیش قدمی جاری رکھتے تو شاید لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے لہٰذا ہم دونوں بھی وہیں رک گئے۔

"کہاں آگ لگی ہے؟ ہمیں تو کہیں نظر نہیں آرہی۔" سلطان شاہ نے قریب کھڑے ہوئے آدمی سے کہا۔

"شاید ادھر کچھ ہوا ہے۔" اس نے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے دفتر کی سمت میں اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں بڑھتی ہوئی بھیڑ کے باعث ٹریفک کی روانی میں خلل پڑنا شروع ہو گیا تھا۔

پھر فضا میں دھوئیں کے کثیف بادل بھی امڈنے لگے اور ہم دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ اسی دوران ہجوم میں پھیلنے والی باتوں سے علم ہوا کہ ایک دفتر سے کوئی آدمی عجلت میں باہر نکلا تھا۔ اسی لمحے کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ سے کچھ راہگیروں کی نگاہ اندر لپکتے ہوئے شعلوں پر پڑ گئی اور وہ شور مچاتے ہوئے اس شخص کی طرف لپکے لیکن وہ کسی چھلاوے کی طرح بھیڑ میں روپوش ہو گیا۔ قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں کہ وہ ہی دفتر میں آگ لگا کر بھاگا تھا۔

"یہ کس کا ذکر ہو رہا ہے بھئی؟" بھیڑ بھاڑ سے نکلنے کے بعد سلطان شاہ نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"شاید تم دیر سے لوٹے تھے، اسی لیے لاعلم ہو۔" میں نے کہا۔

"دیر سے!" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "میں بمشکل دس منٹ

میں لوٹ آیا تھا۔ مجھے تمہاری فکر تھی لہٰذا گھر تک نصیر خان کا پیچھا کرنے کے بجائے اسے پارکنگ لاٹ میں اپنی کار کے قریب ہی جالیا تھا اور وہیں سے فہرست لے کر لوٹ آیا۔"

"اور اسی مدت میں ایک سنگین خطرہ پیدا ہو کر ٹل گیا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "دفتر میں آنے والا اکیلا نہیں ہوتا تھا، ایک آدمی پوشیدہ رہ کر اس کی حفاظت کیا کرتا تھا... میں اس کے پیچھے اندر گھسا تھا اور اسے مار ڈالا، اسی لمحے دوسرا آدمی میرے پیچھے اندر آگھسا۔ ستارے ہی اچھے تھے کہ اسے بھی زیر کر لیا... وہ زخمی تھا، اس لیے میں اُسے اندر چھوڑ کر نکلا تھا۔ وہ میرے بعد فرار ہوتے ہوئے دیکھ لیا گیا ہوگا۔ شاید لوگ اُسی کو آتش زنی کا ذمے دار سمجھ رہے ہیں۔"

"تم نے اُسے زندہ کیوں چھوڑ دیا؟"

"غیر متعلق آدمی تھا، تنظیم سے اُس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بلاوجہ اس کا خون بہانا میں نے پسند نہیں کیا۔ جب ایک مقصد سامنے ہو تو اصول خود بخود متعین ہو جاتے ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تم اپنے آپے میں نہیں ہو... میں مانتا ہوں کہ بھابی کی گمشدگی بہت تشویش ناک واقعہ ہے۔ لیکن اس کی بازیابی کے لیے تمہاری سلامتی بہت اہم ہے... خود پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی الجھن مول لے بیٹھو۔"

"میں ٹھیک ہوں اور اب جلد از جلد کراچی پہنچنا چاہتا ہوں... یہاں ٹھہر کر ہم انہیں عزالہ کے ساتھ زیادتیوں کا موقع فراہم کریں گے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"چلو ابھی ایئرپورٹ چلتے ہیں۔" سلطان شاہ تو واپسی پر تُلا ہی ہوا تھا۔ "جو بھی پہلی پرواز ملی، اسی سے کراچی روانہ ہو جائیں گے۔ اس وقت وہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔"

"ابھی نہیں... جانے سے پہلے ایک کام اور کرنا ہے۔" میں نے سرد اور خیال انگیز لہجے میں کہا۔

"پھر وہی ضد۔" وہ چڑ کر بولا۔ "اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ تم اپنے آپے میں نہیں ہو، محبت کی طرح انتقام کا جذبہ بھی انسان کو اندھا کر دیتا ہے... لائیڈز کاٹیج ایک وسیع و عریض محل ہے، وہاں کوئی اچٹتی ہوئی کارروائی کر کے تم تنویر یا تصویر کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے..."

"تصویر نے اپنی معصومیت اور لاعلمی ظاہر کر کے مجھے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کی ہے، واپسی سے پہلے میں اسے جتانا چاہتا ہوں کہ میں اس کی نیت سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"پھر اب کدھر کا ارادہ ہے؟"

"بس ٹیکسی روکو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد ہم ایک ٹیکسی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سلطان شاہ نے ڈرائیور کے پہلو میں نشست سنبھال لی اور میں عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ جاڑوں کے دن تھے اور چھ بجے ہی سے فضا میں گہرا دھندلکا پھیل چلا تھا جو میری دانست میں کام کرنے میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔

شہر کے ہنگاموں سے گزرنے کے بعد ٹیکسی ملتان روڈ کے ویران علاقے میں پہنچی تو میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "بس کچھ دور چل کر تم ٹیکسی ہمارے حوالے کر کے چپ چاپ نیچے اتر جاؤ گے۔"

"دماغ خراب ہوا ہے تمہارا؟" ڈرائیور میری بات کاٹ کر بُری طرح بھڑک اٹھا۔ اسی کے ساتھ اس نے بریک لگا کر ٹیکسی روک دی۔ اس کے تیور خاصے جارحانہ نظر آرہے تھے۔

"چلتے رہو۔" میں نے پستول کی سرد آہنی نال اس کی گردن سے لگاتے ہوئے کہا اور اس سنگین صورتِ حال کا احساس ہوتے ہی اس کی آنکھیں فرطِ خوف سے پھیل گئیں۔ "شریفانہ گفتگو کا یہ مطلب نہ لو کہ ہم طاقت کے زور پر تمہیں ٹیکسی سے محروم نہیں کر سکتے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ پھر بائیں ہاتھ سے سو روپے کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ "ہمیں صرف آدھے گھنٹے کے لیے سواری کی ضرورت ہے اور یہ اس مختصر سی مدت کا معاوضہ ہے کیونکہ ہمیں تم سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ آٹھ بجے کے لگ بھگ تمہاری ٹیکسی شہر کے کسی مصروف علاقے میں چھوڑ دی جائے گی۔ چابی اگنیشن کے پائدان کے نیچے ہوگی۔"

"مم... میں ٹیکسی نہیں چھوڑ سکتا۔" پستول کا لمس محسوس کر کے اس کی آواز پر لکنت طاری ہو گئی۔ "جہاں چاہو، میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں، کوئی کرایہ بھی نہیں لوں گا۔"

"ہم چاہتے تو تمہیں ہوشیار کیے بغیر چلتی گاڑی میں بے بس کر سکتے تھے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "پھر تمہیں بے ہوش کر کے راستے میں کہیں بھی پھینک دیتے، لیکن ہم بلاوجہ کسی کو ایذا پہنچانے کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی تمہاری ٹیکسی قتل یا ڈکیتی جیسی کسی سنگین واردات میں ملوث ہوگی۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ جو کہا جا رہا ہے اُس پر عمل کرو۔"

اس نے بادلِ نخواستہ میرے ہاتھ سے دونوں سُرخ نوٹ لے لیے۔ "لیکن لاہور کوئی چھوٹا شہر نہیں ہے بابو۔" اس نے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔ "میں گاڑی کی تلاش میں کہاں کہاں دھکے کھاؤں گا؟ جب زبردستی پر اتر آئے ہو تو اتنی مہربانی اور کرو کہ میری ٹیکسی پرانی انارکلی کے اڈے پر چھوڑ دینا، میں وہیں سے لے لوں گا۔"

"یہ مشکل ہے، اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ پُرانی انارکلی

کے اڈے پر پولیس ہمارے استقبال کے لیے تیار نہ ہوگی۔"
"میں وعدہ کرتا ہوں کہ دس بجے تک تھانے میں رپورٹ نہیں کروں گا۔" اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "مجھے گاڑی تم اس سے پہلے ہی لوٹا دوگے۔"

"ٹھیک ہے . . . اب تم اتر دو۔" سلطان شاہ اچانک دخل دے بیٹھا۔

"یہاں! اس ویرانے میں؟" وہ بوکھلا کر بولا "یہاں تو شہر کے لیے کوئی سواری مشکل ہی سے ملے گی، مجھے شہر میں کہیں بھی اتار دینا۔"

میں سلطان شاہ کی دخل اندازی پر بیزار ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تھا میرے کانوں میں قدرے توقف کے بعد اس کی آواز آئی "اچھا تو واپس ہی چلو۔"

اور ٹیکسی واپس شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔

چوبرجی سے گزرنے کے بعد ڈرائیور نے ایک نیم تاریک مقام پر ٹیکسی سڑک کے کنارے روک دی اور معتاسفانہ انداز میں اپنی نشست سے نیچے اتر گیا۔ سلطان شاہ نے اس کی جگہ سنبھالی اور ٹیکسی برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھا لے گیا۔

"بڑی اچھی اور بے ضرر ترکیب سوچی تم نے۔" سلطان شاہ نے کچھ دیر کے بعد کہا "میں یہی سوچ رہا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں ہم اپنے منصوبے پر کیسے عمل کر سکیں گے۔"

"غنیمت ہے کہ میری ترکیب تمہیں پسند آگئی۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ میری دخل اندازی تمہیں ناگوار گزری ہے۔" اس نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد افسردہ لہجے میں کہا "اس کے نزدیک ٹیکسی اس کی کل کائنات ہے، وہ بلاوجہ گفتگو کو طول دے رہا تھا۔ میں نے تو محض بات ختم کرنے کے لیے زبان کھولی تھی۔"

"زبان کھولنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں تو خود ہمیشہ تمہاری حوصلہ افزائی کرتا ہوں . . . بات صرف اتنی تھی کہ وہ ایک سادہ دل مزدور تھا اور میں اُسے دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔"

"تو میں نے کب اُسے دھوکا دیا؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"دھوکا اور جھوٹ، دونوں ایک ہی زمرے میں آتے ہیں۔"

"لیکن میں نے کون سا جھوٹ بولا اس سے!"

"ہم اُسے مقررہ مقام پر ٹیکسی نہیں لوٹائیں گے، میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ وہاں ہمارے لیے پھندا تیار ہوگا۔"

"اس وقت تم بہت حساس ہو رہے ہو۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "میں کہہ رہا ہوں کہ تم خود پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ آج تم مجھے دھوکا دہی پر ملامت کر رہے ہو لیکن ٹھنڈے دل سے غور کرو تو اس سے پہلے ہم بھی کیسے کیسے جھوٹ اور سچ بولتے رہے ہیں۔"

وہ واقعی صحیح الاصل پٹھان تھا، جو دل میں آتا تھا بے دھڑک کہہ ڈالتا تھا اور اس وقت بھی اس نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ میں اُس کی بات کا جواب تو نہ دے سکا لیکن دل ہی دل میں یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہو گیا کہ غزالہ کی گمشدگی کی خبر نے میرے اعصاب کو اس حد تک کیوں متاثر کیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑی نظر آنے لگی ہیں۔

"یوں چپ چپ نہ رہو۔" سلطان شاہ نے طویل ہوتے ہوئے سکوت کو توڑتے ہوئے خوش دلانہ لہجے میں کہا "کچھ نہ کچھ بولتے رہو ـــ خاموش رہو گے تو سوچو گے اور جتنا سوچو گے اسی قدر اُداسی بڑھتی جائے گی۔"

"اس وقت تم نے کرنل کی یاد تازہ کر دی۔" میں نے اپنے لب و لہجے میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ایسا ناصحانہ رویّہ اسی کو زیب دیتا ہے۔"

"اس سے کیا بات ہوئی تھی تمہاری؟" اس نے چونک کر سوال کیا، جیسے اس موضوع کو اب تک بھولا رہا ہو۔ اس بارے میں سلطان شاہ سے میری سرسری سی گفتگو ہی ہو سکی تھی کیونکہ جذباتی اُبال نے میرے ذہن کو ناکارہ کیا ہوا تھا۔

"غزالہ کی گمشدگی کی خبر سُنا کر بلک کر رو پڑا تھا اور میں نے فون بند کر دیا تھا۔" میں نے وہ جواب دیتے ہوئے اپنے وجود میں ایک بار پھر تلاطم سا اُبھرتا محسوس کیا۔

"اور تم نے دوبارہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی؟" اس نے تائید طلب لہجے میں سوال کیا۔

"بے سود ہوتا ـــ بات صرف اسی قدر ہے کہ وہ غائب ہوگئی۔ اس سے آگے کرنل بیچارے کو کچھ بھی معلوم نہ ہوگا۔"

"کم از کم اس کے دل کا غبار ہی ہلکا ہو جاتا تم سے بات کر کے . . . گھر میں تو وہ بیوی سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، ہر وقت خیال رکھتا ہے کہ کسی بات سے اس کی بیوی کے ذہن پر زیادہ زور نہ پڑے۔"

"قاسم مارا جا چکا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ غزالہ کے اغوا میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟" میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"قاسم مر گیا لیکن اس کی جگہ رخشی نے سنبھال لی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غزالہ کی تصاویر جہانگیر کو بھی فراہم کر دی گئی ہوں اور وہ بھی تلاش کی مہم میں شامل ہو گیا ہو۔"

"جہانگیر یہ جرأت نہیں کر سکتا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتا؟ اسے کیا معلوم کہ تصویر والی لڑکی کون ہے اور اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔ یہ نہ بھولو کہ دل میں نفرت رکھنے کے باوجود وہ فی الحال ٹوڈ کے احکام کی تعمیل پر مجبور ہے۔"

"غزالہ سے واقفیت کی بات دوسری ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ کسی لڑکی کو اغوا کرانا جہانگیر کے لیے قتل سے زیادہ دشوار کام ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی معلومات رخشی یا کسی اور تک پہنچا دے۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس مشن پر لاہور ہی سے خاص آدمی بھیجے گئے ہوں۔"

"کوئی اور بات کرو سلطان شاہ۔" میں نے کرب آلود اضطراری لہجے میں کہا "بعض حقائق ایسے اذیت ناک ہوتے ہیں کہ انھیں جانتے بوجھتے ہوئے بھی ہم اُن کے تذکرے سے فرار چاہتے ہیں جب تک میں اُسے بازیاب نہ کرا لوں، میں اس کی گمشدگی کی جزئیات پر غور نہیں کرنا چاہتا۔"

سلطان شاہ خاموش ہو گیا اور میں اپنے خیالات کا دھارا غزالہ کے بجائے لائیڈز کالج کی طرف مرکوز کرنے کی کوشش کرنے لگا جہاں مجھے ایک فوری مہم درپیش تھی۔

ٹیکسی لائیڈز کالج کے نواح میں داخل ہوئی تو لمحہ بھر کے لیے میں نے سوچا کہ ٹیکسی رکوا کر اگلی نشست پر منتقل ہو جاؤں لیکن فوراً ہی یہ ارادہ ترک کر دیا کیونکہ پچھلی نشست پر مجھے کارروائی کے لیے زیادہ رُخ میسر تھے جبکہ اگلی نشست پر جانے کے بعد لے دے کر ایک ہی کھڑکی میرے تصرف میں آ سکتی تھی۔

میں نے دستی بموں کا تھیلا کھول کر اپنے قریب سیٹ پر رکھ لیا اور تین اقسام کے بموں کو الگ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے نووارد سے چھینے ہوئے دوسرے بے آواز پستول کا خیال آیا اور میں نے فوراً ہی وہ سلطان شاہ کے حوالے کر دیا۔ "شاید اس میں پانچ گولیاں ہوں گی، دو میرے مقابلے میں چلائی گئی تھیں۔"

پستول دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں "یہ کہاں سے ہاتھ آ گیا۔۔۔؟ اس کا تو بڑا ارمان تھا مجھے۔"

"بہادر نے اپنے محافظ کو دیا ہوا تھا۔ بہادر کی تلاشی کا خیال آ جاتا تو شاید تیسرا پستول بھی ہاتھ آ جاتا۔" میں نے کہا۔

"بس یہی فرق ہے ہم میں اور تم میں۔" اس کے لہجے میں جنگجویانہ غرور عود کر آیا "ہم قبائلی لوگ دشمن کو زیر کرنے کے بعد سب سے پہلے اس کے ہتھیاروں پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ دشمن کو نہتا کرنا ہی ہماری برتری اور جیت کی پہلی علامت ہوتی ہے کیونکہ ہتھیار سے محروم ہونا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔"

"ہم لائیڈز کالج کے بہت قریب آ گئے ہیں۔" میں نے اُسے یاد دلایا "یہ خیال رکھنا کہ ہم سامنے کے رُخ پر پھاٹک کے آگے سے گزرنے کے بعد عمارت کے عقب میں جائیں گے۔"

"پھر تو ہم آگے نکل آئے ہیں۔" اس نے ٹیکسی کی رفتار کم کرتے ہوئے اُسے واپس گھما لیا۔

دوسرا موڑ گھومنے کے بعد ہی کچھ دور بائیں طرف لائیڈز کالج کے احاطے کی پُرشکوہ دیواریں نظر آنے لگیں۔ اور وہیں ایک جگہ کسی جیپ کا دُھندلا دُھندلا ہیولا بھی نظر آیا۔ سلطان شاہ نے میرے اشارے پر ایکسیلریٹر پر پاؤں کا دباؤ کم کر کے کار کی رفتار کم کی اور میں نے بیگ سے ایک طاقتور گرینیڈ نکال لیا۔

"جیپ لائیڈز کالج کے پھاٹک پر ہی کھڑی ہے۔" سلطان شاہ نے ہیجان آمیز لہجے میں کہا "اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو اس میں دو آدمی بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"اسی رفتار سے بڑھتے رہو، میں جیپ پر گرینیڈ ماروں گا دھماکا ہوتے ہی رفتار تیز کر دینا۔"

"بے چاروں کے چیتھڑے بھی نہ مل سکیں گے۔"

"خون ریزی ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھی، اب یہ خود ہی جانیں ہتھیلیوں پر لیے سامنے موجود ہیں تو انھیں معاف نہیں کیا جا سکتا . . . میری نگاہ میں اب ٹوڈ کا ہر ساتھی بدترین سزا کا مستحق ہے۔"

پھر ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ اسی سنسنی کے عالم میں کار لائیڈز کالج کے دیو ہیکل آہنی پھاٹک کے سامنے پہنچی جو حسبِ سابق اس وقت بھی بند تھا اور اس کے سامنے کھڑی ہوئی جیپ میں دو آدمی بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں نے دانت سے گرینیڈ کی پن کھینچی اور کھڑکی سے وہ بم جیپ پر اُچھال دیا۔

زمین لرز اُٹھی، نگاہیں خیرہ ہو گئیں اور سلطان شاہ نے یک بیک ٹیکسی کی رفتار بڑھا دی۔

"روشنیاں گُل کر دو۔" میں نے اُسے ہدایت کی اور سامنے سڑک پر پھیلی ہوئی روشنی کی چادر معدوم ہو گئی۔

لائیڈز کالج کے کونے پر ایک کھمبے سے یرقان زدہ روشنی والا بلب جھول رہا تھا۔ سلطان شاہ نے ادھر ہی ٹیکسی گھمائی اور چند ہی منٹ بعد ہم اس عمارت کی عقبی سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ کچھ دور آگے بڑھنے کے بعد سلطان شاہ نے ٹیکسی روک دی اور میں نے نیچے اتر کر ایک آتش گیر بم پوری قوت سے عمارت کے احاطے میں اچھال دیا۔ ایک دھماکے کے

ساتھ فضا میں شعلوں کا انعکاس چمکنے لگا۔ اسی اثناء میں میں نے پنیں نکال کر یکے بعد دیگرے باقی ماندہ چار دستی بم احاطے میں مختلف سمتوں میں پھینک دیے اور اندر ایک کہرام سا سنائی دینے لگا لیکن میرے لیے وہاں رک کر اس صورتحال کا جائزہ لینے کا موقع نہیں تھا۔ میں پھرتی سے ٹیکسی میں بیٹھا اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔

سلطان شاہ شاید عقب نما آئینے میں تعاقب کے امکانی خطرے کا جائزہ لے رہا تھا اور میں گردن گھما کر بار بار پیچھے دیکھ رہا تھا۔ جب ہم خاصی دور نکل آئے اور پیچھے کوئی نمودار نہ ہوا تو سلطان شاہ گہرا سانس لے کر بولا۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ ہم اتنی آسانی کے ساتھ ان کے چنگل سے بچ نکلیں گے۔“

”دیکھا جائے تو ہمارا کام انھوں نے خود ہی آسان کیا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

”شاید میری دھمکی کے پیش نظر سیکیورٹی آفیسر نے پھاٹک کے باہر اپنے دو آدمی جیپ سمیت تیار رکھے تھے تاکہ وہ کسی بھی مشتبہ گاڑی کو روک سکیں لیکن ان کی بدنصیبی کہ وہ حرکت میں آنے سے پہلے ہی مارے گئے۔ دھماکے کے ساتھ ہی جیپ نے آگ پکڑ لی تھی۔ اس پر قابو پائے بغیر اندر سے باہر نکلنے کا راستہ ملنا محال ہے کیونکہ وہ عین پھاٹک کے آگے کھڑی تھی۔“

”تمھارا اندازہ درست ہے۔“ وہ بولا۔ ”ورنہ اتنی دیر میں وہ تمام ملحقہ گلیوں اور سڑکوں کو گھیر چکے ہوتے۔“

”اور اب سیکیورٹی آفیسر کے ساتھ ہی تصویر بھی اپنے زخم چاٹ رہا ہو گا۔“

”کاش اس وقت ٹرانسمیٹر ہمارے پاس ہوتا تو ان کی مزاج پرسی میں مزہ آجاتا۔“ اس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

”خوب یاد دلایا، وہ تو میرے ساتھ ہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے آپریٹس نکال کر تھیلا خالی کر دیا۔

سوئچ آن کیا تو فوری طور پر سناٹا ہی رہا لیکن چند ثانیوں بعد ”کاکا کالنگ.... یہاں بہت تیزی سے دھواں بھر رہا ہے.... کچھ سجھائی نہیں دے رہا، کوئی میری آواز سن رہا ہے تو میری مدد کرے ورنہ میں آگ میں زندہ جل جاؤں گا.... اوور!“ اس کی آواز پر خوف اور ہراس کا غلبہ تھا۔ پس منظر میں کچھ شور بھی گونج رہا تھا۔ شاید وہ عمارت کے کسی حصے میں آگ میں گھرا ہوا تھا اور باہر لوگ آگ پر قابو پانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

”تم ولدالحرام!“ کاکا کے خاموش ہوتے ہی آپریٹر کے ریسیور پر دوسری بپھری ہوئی آواز ابھری اور میں نے پہچان لیا کہ اس بار بولنے والا سیکیورٹی آفیسر یا ایس او تھا۔ ”توڑ دو اس آپریٹس کو.... منع کیا ہوا ہے کہ اگلی ہدایات تک کسی بھی قیمت پر اس فریکوئنسی کو استعمال نہ کرنا.... اوور اینڈ آل!“

”سوری ایس او۔“ دوسری طرف سے پھٹکار کے ساتھ سلسلہ ختم کیے جانے کے اشارے کے باوجود کاکا کی نقاہت زدہ آواز ابھری۔ ”اس وقت میرے پاس رابطے کے لیے اس آپریٹس کے سوا کچھ نہیں ہے.... دھواں..... کثیف دھواں بھر رہا ہے..... مجھے کچھ نظر نہیں آرہا..... تمھارا آپریٹس آن ہے تو خدا کے لیے تم ہی کچھ کرو، اوور!“ اس کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ زہریلے دھوئیں کے اثرات سے اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

”اب بکواس کی تو دھوئیں سے بچانے کے بعد تمھیں اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں گا۔“ ایس او آپے سے باہر ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ”دو آدمی اندر گھس چکے ہیں، ان کا انتظار کرو... اور بس۔“

”فریکوئنسی کا استعمال ممنوع ہے تو ایس او اپنا آپریٹس کیوں آن کیے بیٹھا ہے؟“ سلطان شاہ نے مجھ سے سوال کیا۔

”سامنے کی بات ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اسے معلوم ہے کہ ایک آپریٹس ہمارے پاس بھی ہے۔ ہم نے اسے چیلنج کر کے لائیڈز کاٹیج پر شب خون مارا ہے لہٰذا اسے انتظار ہو گا کہ ہم ٹرانسمیٹر پر کب اس سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔“

”کاکا پر اسے غصہ آنے کی وجہ بھی یہی تھی۔“ سلطان شاہ تفہیمی لہجے میں بولا۔ ”وہ نہیں چاہتا کہ اپنی کامیاب کارروائی کے نتائج سے ہم واقف ہو سکیں اور کاکا ساری پول کھولے دے رہا تھا۔“

”میرا تو اندازہ تھا کہ احاطے کی دیوار کے قریب کوئی بھی عمارت نہ ہو گی، کچھ جھاڑیاں وغیرہ جلیں گی، دھماکے ہوں گے، دھواں پھیلے گا اور ان کی برتری کا زعم خاک میں مل جائے گا۔“

”ہاتھی درندوں سے لڑتا ہے اور انھیں تہس نہس کر دیتا ہے لیکن پاؤں کی چیونٹی اسے نظر نہیں آتی جب کہ ہاتھی کے لیے صحیح معنوں میں جان لیوا وہی ہوتی ہے.... بات کیوں نہیں کرتے اس سے؟“

”تھوڑی دیر بعد بات کروں گا... اسے جتانا نہیں چاہتا کہ میں کاکا کی زبانی بربادی کی کہانی سن چکا ہوں۔ یہ لوگ بھیڑیے ہیں، کچھ عجب نہیں کہ وہ اسی جرم کی پاداش میں کاکا کو گولی مار دے... پھر یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے حملے کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔“

وہ خاموش ہو گیا لیکن اسٹریٹ لیمپس کے گھٹتے بڑھتے انعکاس میں مجھے اس کے چہرے پر تردد کے آثار نظر آرہے تھے۔

آپریٹس آن رہا لیکن اس پر سکوت طاری تھا۔

تقریباً دس منٹ تک ٹیکسی شہر کی ویران سڑکوں پر بے مقصد چکراتی رہی۔ آخر کار میں نے ان لوگوں کو چھیڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ٹرانسمیٹنگ بٹن دبا کر پیغام نشر کرنے لگا۔

”ڈولی ٹو کالنگ ایس او... اوور!“

چند ثانیوں کے توقف کے بعد میں نے پیغام دوبارہ نشر کیا اور جواب میں ایس او کی کسلمندانہ آواز سن کر حیران رہ گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری کال سے اس کے آرام میں خلل پڑا ہو۔ اس کی آواز میں پریشانی یا اس اعصابی دباؤ کا شائبہ تک نہ تھا جس کا اظہار اس نے کاکا سے بات کرتے ہوئے کیا تھا۔

”مجھے امید تھی کہ تم کال کرو گے۔“ وہ بول رہا تھا۔ ”شاید تم اپنی چھچھوری حرکت کے ردعمل کا جائزہ لینا چاہتے ہو تو سنو کہ جیپ ضرور تباہ ہو گئی ہے لیکن آدمی صاف بچ گئے، غلطی میری تھی کہ تمھیں سورما سمجھ بیٹھا تھا، میرا خیال تھا کہ تم سامنے سے للکارتے ہوئے آؤ گے لیکن تم تو نرے بزدل ثابت ہوئے... پچھلی سمت سے پٹاخے تو بچے بھی اندر پھینک سکتے ہیں... اوور!“

”وہ تعارفی پٹاخے تھے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”چاہو تو سورج طلوع ہونے سے پہلے فرمائشی بم بھی پھینکے جا سکتے ہیں یہ خوشی کی بات ہے کہ تمھارے آدمی بچ گئے۔ اب میں علاقے کے ایک مکین کی حیثیت سے پولیس کو لائیڈز کاٹیج میں ہونے والے پے در پے دھماکوں کی طرف متوجہ کرنے جا رہا ہوں۔ صبح کے اخبارات میں ان کی تفتیش کے نتائج ہی سے اندازہ ہو سکے گا کہ ہمارے ساتھ کہاں دھوکا دہی ہوئی؟ بموں کی قیمت لے کر ہمیں پٹاخے کیوں دیے گئے... اوور!“

”پولیس اندر قدم بھی نہ رکھ سکے گی۔ جمی لائیڈز خود یہاں نہیں رہتا لیکن اس کی ساکھ زبردست ہے۔ پولیس کی پشت پناہی سے تم کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکو گے..... ویسے بھی آپس کے معاملات میں پولیس کو ملوث کرنا بدترین اصول شکنی ہے۔ اوور!“

میں نے محسوس کیا کہ پولیس کے حوالے پر وہ بوکھلا گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر وہی رگ دبانے کا فیصلہ کر لیا۔

”آپس کے معاملات؟ کہاں کا تعلق اور کیسے معاملات؟ تم تو بلاوجہ ہی پانچویں سوار بن رہے ہو.... ہمارا معاملہ تمھارے اسٹیٹ منیجر سے تھا لیکن تم بلاوجہ اپنی ٹانگ اڑا بیٹھے اور اس قدر ڈھیٹ ہڈی کے بنے ہوئے ہو کہ پے در پے ٹھوکریں کھانے کے باوجود سرخروئی کے دعوے دار بنے ہوئے ہو... جب تک میں تمھارے اسٹیٹ منیجر سے اپنی ایک ایک پائی وصول نہیں کر لیتا، تمھیں معاف نہیں کروں گا۔ اگر وہ عورتوں کی طرح محافظوں کی بھیڑ میں اندر جا چھپا ہے تو میں پولیس کے ہاتھوں ہانک کر اسے باہر لے آؤں گا اور اس کی کھوپڑی پر اتنے جوتے ماروں گا کہ آئندہ کبھی ادھار میں جوا کھیلنے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکے گا... اوور!“

”تم بلاوجہ بات بڑھا رہے ہو۔“ اس کا لہجہ مصالحانہ ہو گیا۔ ”کسی نے ہمارے اسٹیٹ منیجر کے نام سے تمھیں دھوکا دیا ہے۔ لائیڈز کاٹیج کے ملازمین سخت ضابطوں کے پابند ہیں اور پھر اسٹیٹ منیجر کے رتبے کا آدمی ایسے چکر میں ملوث ہی نہیں ہو سکتا ورنہ اس کی شاہانہ نوکری جاتی رہے گی۔ یہاں وہ لاکھوں کے معاملات چٹکیوں میں طے کرتا ہے.... اوور!“

”تمھاری یہ تمام لاف و گزاف بے سود ہے، میرا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ لائیڈز کاٹیج جھوٹوں اور چوروں کا مسکن بنا ہوا ہے، جمی لائیڈز کے نام کی آڑ میں تم سب اپنا حلوا مانڈا سیدھا کر رہے ہو... اوور!“

اس بار ایس او کو طرارہ آگیا۔ ”تمھاری اس بات کا جواب یہ ہے کہ جھوٹ ہو یا سچ، میں تمھیں اسی وقت پندرہ ہزار دینے کو تیار ہوں، جہاں چاہو ادائیگی کر دی جائے گی!“

”وہ بات پرانی ہو گئی۔ پندرہ ہزار کی واپسی کے لیے کل رات دس بجے تک کا وقت دیا گیا تھا جو گزر گیا۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”شاید تمھیں یاد نہیں، میں نے کہا تھا کہ مہلت گزرنے کے بعد پندرہ لاکھ بھی میرے پندرہ ہزار کا ازالہ نہ کر سکیں گے۔ اب تو سودا ہی کچھ اور ہو گا۔“

”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ شاید وہ زچ ہو کر بولا تھا۔

"تیس لاکھ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔

"تیس لاکھ؟" وہ حیرت سے چیخ پڑا تھا۔ "پندرہ ہزار کے تیس لاکھ چاہئیں تم کو؟"

"پندرہ ہزار کو تو بھول ہی جاؤ، وہ میں نے تمہارے اسٹیٹ منیجر کو انعام میں معاف کر دیے کیونکہ اسی کی وعدہ خلافی نے مجھے تم لوگوں سے روشناس کرایا ہے اور میرا خیال ہے کہ لائیڈز کاٹیج کی نیک نامی برقرار رکھنے کے لیے تیس لاکھ کی رقم زیادہ نہیں ہے۔"

"لائیڈز کاٹیج کی نیک نامی کو تمہاری کسی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔" ترش لہجے میں کہا گیا۔

"تمہاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں جو ایسی بات کہہ رہے ہو۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "پولیس اور سینٹرل انٹیلی جنس کے علاوہ انٹر سروسز سیکرٹ سروس والے بھی اس آپریشن میں گہری دلچسپی لیں گے جو میرے پاس موجود ہے۔ اب تک تم سے جو گفتگو ہوتی رہی ہے، میں اسے ریکارڈ کرتا رہا ہوں۔ ان کے لیے یہ مواد بھی خاصا اہم ہوگا۔ اس میں یہ نکتہ بھی ہے کہ لائیڈز کاٹیج میں ایک باقاعدہ نجی فوج پل رہی ہے ایسے کتے موجود ہیں جو انسانی بُو پر جھپٹتے ہیں پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ تمہارے آپریشن کا دائرہ کار پندرہ میل طویل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم لاہور کے مضافات میں کار ڈرائیو کرتے ہوئے سرحد پار کیے بغیر اپنے غیر ملکی آقاؤں سے پیغام رسانی کر سکتے ہو۔ جنگل سے ان گولیوں کے خول ملیں گے جو تمہارے آدمیوں نے اندھا دُھند ہم پر برسائی تھیں پھر تم کم از کم دو لاشوں کو چھپانے کے مجرم بھی ہو۔ جنگل میں میرے ہاتھوں تمہارے دو جاں نثار مارے گئے تھے تم نے پولیس یا کسی اور ایجنسی کو اس کی اطلاع دیے بغیر خاموشی سے لاشیں غائب کر دیں۔ یہ سب باتیں نشاندہی کر رہی ہیں کہ لائیڈز کاٹیج میں کوئی غیر قانونی کام ہو رہا ہے اور ان معلومات کے حصول کے بعد اب میں اپنے حصے کا طلب گار ہوں... اوور!"

"تمہاری کہانی واقعی بہت دلچسپ ہے۔ تم نے واقعات کو یکجا کر کے بعض ایسے نتائج اخذ کیے ہیں جن پر ہماری توجہ نہیں تھی لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم اپنی اس ذہنی مشقت کی کوئی قیمت وصول نہ کر سکو گے۔"

"مفت میں ایک معقول رقم ہاتھ آتی کسی کو بری نہیں لگتی ورنہ میں بھی لمبا کھیل کھیلنے کا عادی ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں رقم پر اُدھار کھائے بیٹھا ہوں... راضی نہ ہوئے تو پھر قانون کا جنگل تمہاری ننھی سی دنیا کا سکون غارت کر دے گا... اوور!"

چند ثانیوں کے لیے لائن پر سکوت چھا گیا پھر ایس او کی آواز اُبھری۔ "تم نے بے سوچے سمجھے منہ کھولا ہے۔ رقم دی جا سکتی ہے مگر اتنی نہیں۔ ہمیں قانون کا کوئی خوف نہیں کیونکہ ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے بس یہ اپنے آدمیوں کی حماقتوں کی قیمت ہوگی کیونکہ ہم ان واقعات کو بھی لائیڈ کے علم میں لانا پسند نہیں کریں گے۔ وہ بہت سنکی آدمی ہے بھڑک گیا تو سارے عملے کی چھٹی کر کے لائیڈز کاٹیج کو مویشی خانہ بنا ڈالے گا۔"

"میں ضرورت مند نہیں ہوں جو مول تول کروں... مجھے صرف ہاں یا نا میں جواب چاہیے!"

"پھر تمہیں وقت دینا ہوگا، میں مشورے کے بعد ہی کوئی جواب دے سکوں گا۔ اوور!" اس بار اس کا لہجہ فکر آمیز تھا۔

"کتنی مہلت چاہیے؟"

"کم از کم چار دن۔"

"میں دو دن سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور یہ بھی بتا دوں کہ میرے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش کی گئی تو انجام تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا، نہ ہی میں تمہیں شہادتیں مٹانے کی اجازت دوں گا۔ ان دو دنوں میں میرے مسلح آدمی لائیڈز کاٹیج کے مقابل والے جنگل میں مامور رہیں گے۔ اگر تمہارے آدمیوں نے وہاں گھس کر گولیوں کے خالی خول سمیٹنے کی کوشش کی تو بے دریغ مار دیے جائیں گے۔ اوور!"

"کیا تم اب بھی اپنی پرانی کہانی پر مُصر ہو؟"

"کون سی پرانی کہانی؟" میں نے انجان بن کر سوال کیا۔

"ہمارے اسٹیٹ منیجر کے پندرہ ہزار ہارنے والا قصہ!" اس نے یاد دلایا۔

"وہی تو بنیاد ہے سارے قضیے کی۔" میں نے پُرزور لہجے میں کہا۔ "ورنہ مجھے پاگل کتے نے تو نہیں کاٹا تھا کہ میں لائیڈز کاٹیج کے کاوے کاٹنے شروع کر دیتا... اصل میں مجھے اسی کی تلاش تھی لیکن اب وہ پس منظر میں چلا گیا ہے... اوور!"

"تو یہ بات طے ہے کہ اس دو دن کے عرصے میں تم کوئی کارروائی کرو گے نہ پولیس سے رجوع کرو گے؟" اس نے تائید طلب لہجے میں سوال کیا۔

"اس کا انحصار میری شرائط کی پابندی پر ہے۔" میں نے اس کی کمزوری بھانپتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہارے آدمی جنگل میں گھسے تو محاذ دوبارہ کھل جائے گا۔"

"تم بچوں جیسی بات کر رہے ہو... خول سمیٹنے سے زیادہ آسان یہ ہوگا کہ میں وہ تمام اسلحہ یہاں سے ہٹوا دوں جو اس بات استعمال کیا گیا تھا... اب تم سے دو دن بعد بات ہوگی... اوور اینڈ آل!"

میں نے [illegible] کا بٹن آف کر دیا۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔" سلطان شاہ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "ہم ان پر دباؤ ڈالنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں؟"

میں نے سوال کیا۔ "ہم جو کچھ کر گزرے ہیں اس سے زیادہ ہمارے بس سے باہر ہے۔ اب وہ ہوشیار بھی ہو گئے ہیں۔ ہم نے دوبارہ اس عمارت کا رُخ کیا تو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر پولیس کو درمیان میں لانا بھی بے سود ہوگا۔ وہ لوگ بارسوخ اور وسائل کے مالک ہیں۔ بآسانی اس معاملے کو دبا دیں گے۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہم اپنی دھمکی کا بھرم برقرار رکھیں۔"

"پھر اب کدھر کا ارادہ ہے؟"

"ہوٹل سے فارغ ہو کر سیدھے ایئرپورٹ چلیں گے، ٹیکسی وہیں کسی پارکنگ لاٹ میں چھوڑ دیں گے۔"

"اور وہ پرانی انارکلی کے اڈے پر انتظار میں سوکھتا رہے گا!"

"اس وقت ہماری سلامتی ہر معاملے سے زیادہ اہم ہے، وقت ہوا تو اس کا بھی کوئی حل نکال لیں گے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ وہاں ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

پرواز کی روانگی میں دو گھنٹے باقی تھے، ہمیں نشستیں بآسانی مل گئی تھیں میں نے اندر لاؤنج میں جانے کے بجائے باہر وقت گزاری کو بہتر سمجھا اور ایک گوشے میں جا بیٹھا۔

میرا ذہن [illegible] غزالہ کی روپوشی میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں نے اس بارے میں سلطان شاہ سے زیادہ کھل کر بات نہیں کی تھی لیکن لائیڈز کاٹیج والوں سے چھیڑ چھاڑ کا مقصد یہ بھی تھا کہ انھیں زک پہنچا کر ان کی انا پر تازیانے لگائے جائیں۔ اگر غزالہ ان کے قابو میں ہوتی تو میری ہرزہ سرائی کے جواب میں وہ ضرور اس کا حوالہ دیتے۔

وہاں میرے دو حریف تھے، ایک تصویر اور دوسرا ایس او۔ ایس او سے شروع ہی سے میں نے مختلف حیثیت سے بات کی تھی اور اس نے کسی بھی مرحلے پر ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ وہ میری اصلیت سے واقف ہو چکا تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ لائیڈز کاٹیج میں رہنے والا ہر شخص تصویر کو جواب دہ تھا اور اپنی کارکردگی کے لیے اسی سے ہدایات حاصل کرتا تھا اور اسے پوری طرح علم تھا کہ میں اس عمارت میں دلچسپی لے رہا تھا لیکن مجھے گھیرنے کے لیے تصویر نے مجھ سے اپنی اصل حیثیت کا اعتراف نہیں کیا تھا بلکہ ملنے کو ترسے ہوئے بھائی کا روپ دھار کر مجھے اپنے بھٹے میں مدعو کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

میری معلومات اور قیاسات کے مطابق تصویر خود ہی اے ٹو تھا۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن تھا کہ اس کا کوئی ہرکارہ غزالہ کو اغوا کرتا اور وہ اس سے لاعلم ہوتا۔ ایسی صورت میں یہ فطری تقاضا تھا کہ میرے ہاتھوں جانی و مالی تباہی اور عمارت میں آتش زنی کے بعد وہ یقیناً... غزالہ کی قید کی اطلاع دے کر میری کمزوری سے کھیلنے کی کوشش کرتا۔

تصویر نے مجھ سے یہ تو کہہ دیا تھا کہ توقیر ان دنوں پاکستان میں نہیں بلکہ ہزاروں میل دور اوٹاوا میں مقیم تھا اور کسی نے اس کا نام لے کر غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے دور دور تک ایسے کسی آدمی کی موجودگی کا کوئی منطقی جواز نظر نہیں آتا تھا۔ صاف اور سیدھی بات یہ تھی کہ توقیر نے مجھ پر کراچی میں ہاتھ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی اور بُری طرح ناکام رہا۔ اس ناکامی کے بعد تصویر نے دوستی اور برادرانہ محبت کے رشتے سے وار کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کے لیے لازمی تھا کہ توقیر کی خونریز کارروائیوں سے خود کو بری الذمہ ظاہر کرتا لیکن اس نے ضرورت سے زیادہ ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے توقیر کی ملک میں موجودگی سے ہی انکار کر دیا۔

توقیر کو پچھلی بار لاہور میں میری موجودگی کا علم ہو چکا تھا جس کا اقرار رمضان چاچا کر چکا تھا پھر کراچی میں توقیر نے غزالہ سے ملنے کے پورے جتن کر ڈالے۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ میرے ساتھ اس لڑکی کو بھی پکڑ سکے جو ملازمت کی تلاش میں ایشین سنڈیکیٹ کے دفتر میں پہنچی تھی اور وہاں خفیہ کیمرے سے اس کی تصویریں لے لی گئی تھیں۔

ان لوگوں کے پاس میرے خلاف پہلا اور آخری ثبوت غزالہ کی تصویر کی صورت میں محفوظ تھا۔ اگر وہ میرے ذریعے پکڑی جاتی یا اس سے میرا تعلق ثابت ہو جاتا تو توقیر اور تصویر بلاتامل میرے بارے میں کوئی بدترین فیصلہ صادر کر سکتے تھے۔

سوچتے سوچتے اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور میرے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی پھر میرے ذہن میں جبرس سے ہیرونئن کے کاروبار کی طرف منتقلی کے دنوں کے

ایک خوشگوار سفر کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ جب میں نے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے سیلز آفیسر کی حیثیت سے مخصوص شناختی علامات، کاغذات اور ایک دھماکا خیز محفوظ بریف کیس کے ساتھ مشرقِ بعید کا سفر کیا تھا اور دورانِ پرواز مغرب سے آنے والی ایک حسین و جمیل، سفید فام دوشیزہ بحرے کے سے والے نقرئی ٹائی پن کی وجہ سے مجھے پہچان کر پہلے مجھ سے الجھی تھی اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہی ایشلے ہاؤز کی نمائندگی کر رہی تھی اور میرے سفر کا مقصد محض اسی سے ملاقات کرنا تھا۔ اور اس کا نام ویرا لائیڈ تھا۔

ایک اہم منصب کی مالک ہونے کے باوجود ویرا لائیڈ بہت خوش مزاج اور فراخ دل لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے جو چند دن گزارے وہ میری زندگی کے یادگار دنوں میں شمار کیے جاسکتے تھے۔

ویرا لائیڈ سے وہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی پھر ڈاکٹر وسیلر کی سربراہی میں ہونے والی انسدادِ منشیات کی بین الاقوامی کانفرنس میں اس کے نام کا شہرہ سنائی دیا۔ کانفرنس میں ہونے والے انکشافات کی روشنی میں پاکستان کے قبائلی علاقے میں قائم ہونے والی مومن خان کی پہلی ہیروئن تیار کرنے والی لیبارٹری کے لیے ویرا لائیڈ نامی ایک سفید فام لڑکی ہی نے تیس ہزار کے خطیر معاوضے پر ڈاکٹر پی جے ڈالٹن نامی جرمن کیمسٹ کو کام کرنے پر آمادہ کیا تھا اور ڈاکٹر ڈالٹن نے اپنی نگرانی میں ہماری سرزمین پر ہیروئن کی تیاری کی بنیاد رکھ کر خاموشی سے اپنے ملک لوٹ گیا تھا لیکن اپنی تیار کی ہوئی ہیروئن کا نمونہ ساتھ لے جانے کے جرم میں اپنے ملک کے ہوائی اڈے پر پکڑا گیا۔

ویرا لائیڈ برائے ایشلے ہاؤز، ویرا لائیڈ برائے مومن خان اور اب جمی لائیڈ کا نام لائیڈز کاٹیج کے مالک کے طور پر سامنے آیا تھا۔ کیا یہ محض ایک اتفاق ہوسکتا تھا؟

میرے ذہن نے اس اتفاق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یقینی طور پر ہمارے ملک میں ہیروئین کی پیداوار، تجارت، فروغ اور برآمدات میں لائیڈز خاندان کے مفادات ناقابلِ تردید تھے اور جمی لائیڈ شاید اس جرائم پیشہ خاندان کا سربراہ تھا جو لاہور میں ایک محل نما عمارت میں جرائم پیشہ لوگوں کی فوج پال رہا تھا۔

وہ اس قدر چالاک تھا کہ اپنے نام اور ساکھ کے تحفظ کے لیے خود پسِ پردہ رہ رہا تھا اور سارا کاروبار مقامی مُہروں کے ذریعے اس قدر پُراسرار اور پیچیدہ انداز میں چلا رہا تھا کہ کسی بھی مرحلے پر اس کی ذات کے بے نقاب ہونے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ توقیر یا تصویر کو مالی آسائشوں کے عوض اے ٹو کا منصب دے دیا تھا۔ اور وہ دونوں جمی لائیڈ کی ملی ہوئی ہدایات کی روشنی میں کامیابی کے ساتھ موت کی سوداگری میں مصروف تھے۔

اور شاید اسی نکتے میں میرے ایک پرانے سوال کا جواب بھی موجود تھا۔

میرے ذہن میں یہ خیال ہمیشہ کسی نیشِ عقرب کی طرح چبھتا رہا تھا کہ تنظیم کا پُراسرار اور آمرِ مطلق سربراہ آخر خود کو اے ٹو کیوں کہلواتا تھا۔ اسے اے یا اے ون کیوں نہیں کہا جاتا تھا؟ جمی لائیڈ کی ذات نے اس نکتے کو بھی بے نقاب کر دیا تھا۔

اے ٹو یا تصویر یا توقیر میں سے کوئی اتنا آزاد اور بااختیار نہیں تھا جتنا باہر سے نظر آتا تھا۔ جو اختیارات اور دائرہ کار انھیں فراہم کر دیا گیا تھا وہ اسی میں رہتے ہوئے اپنے فرائض بجالاتے تھے اور حد یہ تھی کہ تصویر یا توقیر میں سے کسی ایک کو مقامی سربراہ کے طور پر اے ٹو کا خطاب بھی اوپر والے ہی کی طرف سے دیا گیا تھا تاکہ اس کی نمائندگی کرنے والے کو کسی بالادست کی موجودگی کا احساس رہے اور وہ احکام سے سرتابی کی جرأت نہ کر سکے۔

جمی لائیڈ کی ذات نے میرے بہت سے سوالات کے جواب فراہم کر دیے تھے۔ مجھے تصویر اور توقیر کے بارے میں کچھ کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی۔ جب سے مجھے اطلاعات ملی تھیں کہ توقیر نے کراچی میں رہتے ہوئے اے ٹو کا کردار ادا کیا تھا مجھے یہی خلش تھی کہ وہ دونوں اتنے ذہین اور ہوشیار کیسے ہو گئے کہ جدید ترین ایجادات سے استفادے کے ساتھ تنظیم کا بندوبست چلانے لگے۔

جمی لائیڈ نے ایک طرف ویرا لائیڈ کے ذریعے ایک جرمن کیمسٹ کو مومن خان کے لیے کام کرنے پر آمادہ کیا تاکہ دنیا میں افیون کی کاشت سے بہترین اور دنیا کے ہر قانون سے ماورا علاقے میں اعلیٰ ترین ہیروئن تیار کرا سکے پھر مقامی فراہمی اور برآمدات کے لیے اپنی تنظیم کو استعمال کر سکے۔

"میں بھی تمھارے ساتھ ہی بیٹھا ہوا ہوں۔" میری طویل ہوتی ہوئی فکر آمیز خاموشی کا تسلسل سلطان شاہ نے ختم کر دیا۔

"میں سارے واقعات پر ایک نئے زاویے سے غور کر رہا تھا۔" میں نے آس پاس میدان صاف دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا۔

"ہم یہاں سے بالکل ہی ناکام نہیں لوٹ رہے ہیں۔"

"خیر ناکامی تو کسی بھی طرح نہیں ہوئی۔" اس نے کہا۔ "بنیادی کامیابی یہ ہوئی ہے کہ اب تم تصویر کے ٹھکانے سے واقف ہو چکے ہو۔ اس سے براہِ راست بات کر چکے ہو۔ اب یہ امر بات ہے کہ وہ قلابازی کھا گیا ہے۔ شاید وہ اندازہ کر چکا ہے کہ تم بآسانی سے ہاتھ نہ ڈال سکے گا پھر اب تک کے تمام نقصانات بھی اس کے سامنے ہیں۔"

"شاید وہ کوئی بڑا فیصلہ بھی آزادانہ طور پر نہیں کر سکتا۔ اب تک وہ ایک مطلق العنان سربراہ نظر آتا تھا لیکن اس بار میری رائے تبدیل ہو چکی ہے اور شاید یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"یعنی وہ بھی کسی کو جواب دہ ہے؟" سلطان شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا اندازہ یہی ہے۔" میں نے کہا۔ "سارا کھیل وہی چلا رہا ہے جو لائیڈز کاٹیج کا مالک ہے۔"

اس کے استفسار پر میں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے اسے اپنے نظریات سے آگاہ کر دیا۔ اسی ضمن میں مجھے ویرا لائیڈ اور اپنے غیر ملکی سفر کا ذکر بھی کرنا پڑا اور اس کی آنکھیں حیرت سے کشادہ ہو گئیں۔

"تو کیا ایس او نے تمھارے تیس لاکھ کے مطالبے پر اسی لیے دو دن کی مہلت مانگی ہے کہ اس دوران میں جمی لائیڈ... شاید یہی نام لیا تھا اس نے عمارت کے مالک کا؟" وہ لحظہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور میرے سر کا تائیدی اشارہ پا کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جمی سے رابطہ قائم کر کے ہدایات لے سکے؟"

"ایس او کو تو شاید علم بھی نہ رہا ہو کہ جمی لائیڈ اس کھیل میں ملوث ہے۔ مجھے تو محض اس لیے شبہ ہوا کہ میں ویرا لائیڈ کے ساتھ چند دن گزار چکا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ جمی لائیڈ کی بیٹی یا بیوی ہو۔"

"ضروری نہیں کہ کوئی اتنا قریبی رشتہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ محض گروہ کے آدمیوں میں اپنی شناخت کے لیے لائیڈ کا دُم چھلا لگاتی ہو اور پاکستان سے باہر تنظیم کے مفادات کے لیے کام کرتی ہو۔"

"لیکن تم تو بتا رہے ہو کہ وہ تم سے ہیروئن کی خریداری کا سودا کرنے آئی تھی۔" اس نے چونک کر سوال کیا۔ "اگر وہ ان ہی سے ہے تو سودے بازی کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں سے تو سیدھا مال بھیجا جا سکتا تھا۔ نفع اِدھر سے ہوا یا اُدھر سے، جانا ایک ہی جیب میں ہے تو پھر اتنے طویل طریقۂ کار کی کیا ضرورت تھی؟"

"شدید ضرورت تھی۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ اس تنظیم میں رازداری کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، جو جس کو جواب دہ ہے بس اسی کو جانتا ہے، اسے آگے پیچھے کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ جو شخص نچلی سطح پر اتنی احتیاط کا عادی ہو وہ اپنے بارے میں بے پروائی کیسے برت سکتا ہے۔ وہ اپنے بین الاقوامی مفادات سے اپنے مقامی کارندوں کو باخبر کیوں کرے گا؟ اگر ایشلے ہاؤز بھی اسی کی فرم ہے تو باقاعدہ سودے بازی کیے بغیر مال بھیجنے کی صورت میں جو شخص بھی اے ٹو ہے، اسے علم ہو جاتا کہ ایشلے ہاؤز کا تنظیم سے تعلق ہے اور کسی وقت مقامی تنظیم گردش میں آتی تو لامحالہ ایشلے ہاؤز بھی ڈوب جاتی پھر شاید وہاں سے دوسرے بین الاقوامی ٹھکانے بھی نظر میں آجاتے۔"

"بات سمجھ میں آرہی ہے۔" وہ پُرخیال لہجے میں بولا۔ "یہ تو مختلف ملکوں میں پھیلا ہوا کوئی بین الاقوامی گروہ معلوم ہوتا ہے جو ہر ملک میں بظاہر خودمختار ہے لیکن ہر ایک کی باگ جمی لائیڈ کے ہاتھ میں ہے اور وہی ان کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ ہے۔"

"یہ لوگ تو پھر بھی غیر قانونی کام کر رہے ہیں اس لیے ان کے طریقے پیچیدہ اور مشکوک ہونے لازمی ہیں لیکن تم قانونی کاروبار کرنے والی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا طریقۂ کار دیکھو تو اس سے زیادہ پُراسرار نظر آئے گا۔ بڑے بڑے گروپ سیکڑوں بڑی اور چھوٹی کمپنیوں کے مالک ہوتے ہیں اور اپنے حلقے سے باہر کسی کو حقیقی ملکیت کا علم نہیں ہونے دیتے حتیٰ کہ ان کمپنیوں کے اعلیٰ ملازمین ایک دوسرے کے خلاف رقابت کے جذبے سے کام کرتے ہیں، ایک دوسرے کی بیخ کنی پر تلے رہتے ہیں۔ آپس کے سودوں میں مالکان کے اشارے پر کہیں ایک کا مال سو میں بیچا جاتا ہے اور کہیں دس کا ایک میں۔ اس سارے جوڑ توڑ کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ مختلف ناموں کے باوجود عالمی منڈی میں خفیہ اجارہ داریاں قائم کر لی جائیں جنھیں کوئی قانون بھی چیلنج نہیں کر سکتا۔"

"یہ سب بہت دور کی اور میری عقل سے باہر کی باتیں ہیں۔ خلاصہ تو پھر بھی یہی ہوا نا کہ تصویر اور توقیر کا صفایا ہونے کے بعد تنظیم ختم ہو جائے گی۔"

"یہی تو نہیں ہوگا۔" میں نے وضاحت کی۔ "اگر ساری منصوبہ بندی توقیر یا تصویر کی ہوتی تو ان کے بعد تنظیم کا شیرازہ

بکھر جاتا۔ ہیروئن کی جو مقامی منڈی پیدا ہوئی ہے، وہ چھوٹے چھوٹے لوگوں میں تقسیم ہو جاتی لیکن اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ توقیر اور تصویر کے بعد شاید تھوڑے دن کے لیے بحران پیدا ہو گا پھر ان سب کا باپ ان ہی میں سے کسی نیچے والے کو منتخب کر کے اسے ٹو کے منصب پر فائز کر دے گا اور گاڑی پھر چل پڑے گی۔"

وہ شاید مزید کچھ کہتا لیکن اسی وقت ایئرپورٹ کے پیجنگ سسٹم پر کراچی کے لیے روانہ ہونے والے مسافروں کی اطلاع کے لیے پرواز کی تیاری کا اعلان ہوا اور ہم دونوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

گو ہمارے پاس سامان نہ ہونے کے برابر تھا اور جو کچھ تھا، وہ اس قدر نا کافی تھا کہ ہم بآسانی اپنے ساتھ کیبن میں لے جا سکتے تھے لیکن دو بے آواز پستولوں کی وجہ سے میں نے اپنا سوٹ کیس بورڈنگ کارڈ لیتے ہوئے کاؤنٹر پر دے دیا تھا اور اسلحہ بھی اسی میں ڈال دیا تھا کیونکہ آئے دن ہونے والی فضائی قزاقیوں کی بنا پر ہر مسافر کے دستی سامان کی سخت جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ ایسے مرحلے پر میرے لیے نہ صرف ان ہتھیاروں کے لائسنس کی فراہمی دردِ سر بن جاتی .... بلکہ میں ناگفتہ مشکلات سے دوچار ہو سکتا تھا۔

"یقین نہیں آتا کہ ہم جیتی جاگتی دنیا میں ان حالات سے دوچار ہیں۔" طویل خاموشی کے بعد طیارے کے ٹیک آف کرتے ہی سلطان شاہ نے بات وہیں سے شروع کر دی جہاں چھوڑی تھی۔

"شاید تم نے کبھی مافیا کا نام سنا ہو ۔۔۔" میں نے نشست پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "اٹلی کے بدنام مجرموں سے شروع ہونے والا یہ گروہ مغرب میں آج اتنا بااثر اور طاقتور ہے کہ اپنی دریردہ ریشہ دوانیوں سے حکومتوں تک کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ان کا سربراہ گاڈ فادر کہلاتا ہے جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ مافیا کا قانون ہوتا ہے۔ شاید یہ لوگ بھی ان ہی خطوط پر چل رہے ہیں۔"

"اب تمہارا نشانہ کون ہے؟ اے ٹو یا جمی لائیڈ؟" اس نے دھیمی سرگوشیانہ آواز میں پوچھا۔

"دونوں میں سے جو پہلے ہاتھ آجائے لیکن اس سے پہلے غزالہ کو تلاش کرنا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں یہ خلش زندگی بھر نہ بھلا سکوں گا کہ وہ میری وجہ سے اس مصیبت میں مبتلا ہوئی ہے۔"

پھر میں نے اسے اشارے سے خاموش کر دیا کیونکہ دوسری نشستوں کی اگلی صف میں بیٹھا ہوا ایک شخص بار بار پہلو بدل کر شاید ہماری گفتگو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

طیارے نے کراچی کی زمین چھوئی تو رات گہری ہو چکی تھی۔ اترنے سے قبل طیارے نے بلندی کم کرتے ہوئے شہر کا چکر کاٹا تو نیچے تاحدِ نظر شہرِ نگاراں کی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ شہر میں رہتے ہوئے ہمیشہ اور ہر مقام پر یہی احساس رہتا ہے کہ شہر کو کسی ترتیب اور منصوبے کے بغیر من مانے طریقے پر آباد کیا گیا ہے لیکن رات کے اس سمے، فضا سے شہر میں ایسے ایسے مثلث، مربعے اور مستطیل دمکتے نظر آرہے تھے کہ سلطان شاہ حیران ہوا جا رہا تھا۔ روشن، سیدھی اور بل کھاتی ہوئی سڑکوں کی ایسی بہتات نظر آرہی تھی کہ مواصلاتی مجبوریوں کے تجربات خواب محسوس ہو رہے تھے اور جب طیارہ دھیمی رفتار سے رن وے پر ٹیکسی کرتا ہوا مقررہ مقام پر رکا تو سلطان شاہ میری طرف دیکھ کر احمقانہ انداز میں ہنس پڑا۔

"کیا ہوا؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ تو کراچی ہی ہے۔" اس نے خفت آمیز ہنسی کے ساتھ کہا۔

"پھر تم کیا سمجھے تھے؟"

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رات کے وقت جہاز سے یہ شہر اتنا خوبصورت نظر آتا ہو گا۔۔۔ بس یوں ہی خیال ہوا تھا کہ کہیں پائلٹ غلطی سے کسی اور شہر میں نہ جہاز اتار رہا ہو۔"

میں اپنے بدترین ذہنی الجھاوؤں کے باوجود اس کی معصومانہ سوچ پر زیرِ لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

جہاز سے اترنے کے بعد ہال میں کنویئر سے سوٹ کیس اٹھاتے ہی میرے ذہن میں زخشی کا سنایا ہوا شعر پھر ناچ اٹھا۔ شام گجا، رات ہو چلی تھی، گھر خاکستر ہو چکا تھا اور میں سامان بدست سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جاؤں؟

پہلے میرا ارادہ کسی ہوٹل کا رخ کرنے کا تھا لیکن باہر نکلنے تک میں نے ارادہ تبدیل کر دیا۔ غزالہ کی گم شدگی کے بعد اس کا باپ بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ جوان بیٹا مفلوج ذہن کے ساتھ علاج کے لیے داخل تھا۔ بیوی اپنے تمام تر احساسات کے باوجود کوکین کے نشے کی عادی تھی اور دن کا بیشتر وقت نشے میں ڈوب کر کسی جذباتی تلاطم کے بغیر گزارتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ غزالہ کے گھر میں رہ کر ہم دونوں نہ صرف کرنل کا دکھ بانٹ سکیں گے بلکہ وہاں رہتے ہوئے آزادی کے ساتھ اپنا کام بھی کر سکیں گے۔

سلطان شاہ نے بھی میرے اس خیال کی تائید کی اور ہم دونوں ایئرپورٹ سے سیدھے غزالہ کے گھر جا پہنچے۔ کرنل نوازش مہدی سامنے آیا تو اس کا چہرہ فرطِ غم سے ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں خوف اور ویرانی رچی ہوئی تھی۔ نہ اس نے زبان کھولی نہ ہم دونوں ہی اس سے کچھ کہہ سکے اور یوں تینوں خاموشی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا پہنچے جہاں شمع ..... خلافِ معمول ایک صوفے پر اداس بیٹھی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی اس کی مخمور نگاہیں کشادہ ہو گئیں، لبوں کے گوشے کپکپائے اور بے اختیار وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ "میری بچی .... تنویر بیٹے! میری بچی مجھے لادو .... وہ کہاں رہ گئی؟ کہاں چلی گئی؟ وہ تو کبھی اجازت لیے بغیر گھر سے کالج بھی نہیں جاتی تھی ... ہم کہاں جائیں؟ کہاں تلاش کریں اسے؟"

"رونے سے کچھ حاصل نہ ہو گا شمع!" کرنل نے بھرائی ہوئی آواز میں بیوی کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھے بھی اسی قدر عزیز تھی لیکن دیکھو کہیں میں رو رہا ہوں۔"

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کی آواز گلوگیر تھی، آنکھوں سے موتی ٹپک رہے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ آواز سے نہیں، دل کی گہرائیوں سے رو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جذباتی فضا قدرے سازگار ہوئی تو کرنل کی زبانی مجھے پورے واقعے کا علم ہوا۔

اس کی کسی قریبی سہیلی کی شادی تھی، اس سلسلے میں پچھلے دن دو مرتبہ اس کے پاس فون بھی آیا اور وہ اپنے باپ کی اجازت سے اپنی سہیلی کی شادی کی تیاریوں میں ہاتھ بٹانے چلی گئی البتہ اس نے یہ احتیاط کی تھی کہ گھر سے جاتے ہوئے اپنی ماں کا برقع اوڑھ لیا تھا تاکہ بآسانی پہچانی نہ جا سکے۔

پچھلی شام کرنل کے مجھ سے ٹیلی فون پر رابطے کے بعد جب چھ بج گئے اور غزالہ واپس گھر نہ پہنچی تو کرنل نے غزالہ کی سہیلی کے گھر فون کیا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ غزالہ سرے سے وہاں پہنچی ہی نہیں تھی۔ یہ اطلاع پاتے ہی صدمے سے کرنل کی حالت ابتر ہو گئی۔ جب وہ کچھ سنبھلا تو اس کے پاس میرا کوئی سراغ نہیں تھا لہٰذا مجبوری کی حالت میں اس نے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی۔

واردات سنگین تھی لہٰذا تھانے سے فوراً ہی ایک افسر اس کے گھر آپہنچا۔ کرنل کے بقول اس کی تفتیش کا انداز جارحانہ بلکہ ایک حد تک ہتک آمیز تھا۔ اس وقت تک اس نے تھانے کے روزنامچے میں غزالہ کی گم شدگی کا اندراج نہیں کیا تھا اور مصر تھا کہ اگر اغوا کی رپورٹ درج کرانی ہے تو ایک دو ایسے نام بھی رپورٹ میں شامل ہونے چاہئیں جن پر اغواء میں ملوث ہونے کا شبہ ہو اور اگر کسی پر شبہ نہیں ہے تو اغواء کے بجائے گھر سے فرار کی رپورٹ درج کرائی جائے۔

اس ضمن میں تفتیشی افسر کا سارا زور اسی ایک نکتے پر رہا کہ غزالہ کا میل جول کن مردوں سے تھا۔ ہم جماعتوں میں کس سے اس کی بے تکلفی تھی؟ شادی اور منگنی کے سوال کو کرنل نے صفائی سے اڑا دیا کیونکہ غزالہ کی مجھ سے نسبت کا اقرار کرنے کے بعد اسے میرے بارے میں بھی بہت کچھ بتانا پڑتا جس سے وہ گریز کرنا چاہ رہا تھا۔

"آپ فکر مند نہ ہوں، میں اپنے طور پر اسے تلاش کراؤں گا۔ شہر میں میرے بھی کچھ وسائل ہیں۔ اب ان سے کام لینے کا وقت آگیا ہے۔" میں نے پوری کتھا سننے کے بعد کہا۔

"لیکن کب؟" کرنل کربناک آواز میں بولا۔ "میرے لیے تو ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا ہے ۔۔۔ اس کی گم شدگی کے بعد مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اس دور میں درندہ صفت لوگوں کے درمیان ایک بیٹی کا باپ ہونا کتنا بڑا عذاب ہے۔"

میں پھریری لے کر رہ گیا۔ "اس قدر مایوسی بھی اچھی نہیں۔ میں اپنی مہم کا آغاز اسی وقت کر رہا ہوں۔"

شمع کی آنسوؤں سے جھلملاتی ہوئی آنکھوں میں امید کی چمک نمودار ہو گئی اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم ہی کچھ کر سکو گے بیٹا! یہ تو اس حادثے پر اپنی رہی سہی ہمت بھی ہار بیٹھے ہیں۔"

میں وہاں سے اٹھ کر فون کے قریب جا بیٹھا۔ کرنل نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور اپنی بیوی کو وہاں سے اٹھا لے گیا۔

میں نے جہانگیر کا نمبر ملایا تو تیسری گھنٹی پر دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا اور میرے کانوں میں جہانگیر کی بیوی سلمیٰ کی خوابناک آواز آئی۔ "میں ڈینی بول رہا ہوں جہانگیر کہاں ہے؟" میں نے نرم اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اوہ، ڈینی۔" مجھے پہچانتے ہی اس کی آواز سے نیند کے اثرات فوراً کافور ہو گئے۔ "کہاں غائب ہیں آپ اتنے دن سے؟" وہ حسبِ معمول میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے میری ذات میں الجھ گئی۔

"اسی شہر میں ہوں، کئی بار فون کیا لیکن تم گھر پر ہوتی ہی نہیں ہو.... ذرا جہانگیر سے میری بات کرا دو، بہت ضروری کام ہے۔"

"لیکن مجھے تو کسی نے نہیں بتایا کہ تم فون کرتے رہے

ہو۔" وہ بے تکلفانہ لہجے میں بولی اور میں حیران رہ گیا کہ جہانگیر اس معنی خیز لب و لہجے کو کیسے نظر انداز کر سکے گا۔

"بتا تا کون ہے تم نہیں تھیں تو جہانگیر سے گپ شپ کر لی اور اب اس کو فون کیا تو تم سے گپ شپ کرنا پڑ رہی ہے۔"

"وہ اپنی خواب گاہ میں پڑے ہوں گے۔" اس نے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے تم انھیں بھول کر مجھ ہی سے باتیں کرتے رہو... تم سے بات کر کے میرے دل کا غبار ہلکا ہو جاتا ہے ورنہ اس شہر میں تو تمھارے دوست کی وجہ سے مجھے دق ہو جائے۔"

"میں پھر فون کر لوں گا۔" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "اس وقت ایک ضروری بات کرنی ہے... آج کل تم دونوں علیحدہ کمروں میں کیوں رہ رہے ہو؟"

"بس اسی سے اندازہ لگا لو کہ بات کس قدر سنگین ہو گی۔"

"اس کے کمرے میں فون نہیں ہے کیا؟"

"ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔" ریسیور پر اس کی تلخ آواز ابھری۔ "جو شخص معدے سے کھوپڑی تک وہسکی میں غرق ہو کر سوتا ہو، اسے فون کی گھنٹی تو کیا، توپ کا دھماکا بھی نہیں اٹھا سکتا۔ تم لائن ہولڈ کرو، میں کسی ملازم کے ہاتھ فون ان کے کمرے میں بھجوا کر انھیں اٹھواتی ہوں۔ ہوش میں ہوئے تو بات کر لینا... لیکن میں کل تمھارے فون کا انتظار کروں گی۔"

لائن پر سناٹا چھا گیا۔ خاصے طویل سکوت کے بعد نیند اور نشے سے لڑکھڑاتی ہوئی جہانگیر کی آواز سنائی دی۔

"میں ڈینی بول رہا ہوں... کیا تم اس وقت بات کرنے کے قابل ہو؟"

"ڈینی!... آہا... میرے دوست۔" اس کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس وقت وہ بری طرح نشے میں تھا۔ "میں تو بہت قابل ہوں... صرف سات جماعت پڑھا ہوا ہوں اور تو... سالے دوست بن کر میری قابلیت پوچھ رہے ہو۔"

"تمھاری بیوی کہاں ہے؟" میں نے غصے میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے اس کی دماغی کیفیت آزمانے کے لیے پوچھا۔

"ہو گی کہیں پڑی ہوئی..... اس سے کیا لینا ہے تمھیں؟"

وہ بہکا ہوا ضرور تھا لیکن کھوپڑی سے بالکل ہی باہر نہیں تھا۔ میں نے پتے تلے الفاظ میں اپنا سوال مرتب کیا پھر پوچھا۔ "پچھلے چھتیس گھنٹوں میں تم نے اسے ٹو کے لیے کیا کام سرانجام دیے ہیں؟"

جواب میں اس نے اسے ٹو کو ایک گندی سی گالی دی پھر بولا۔ "وہ برا یا بھلا جو کچھ بھی ہے یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے، تم کون ہوتے ہو اس بارے میں پوچھ گچھ کرنے والے؟"

"تمھارے ہی بھلے کو پوچھ رہا ہوں ـــ"

اس نے بھناتے ہوئے لہجے میں درمیان سے میری بات کاٹ دی۔ "زیادہ خیر خواہی جتانے کی کوشش نہ کرو، میں اپنا برا بھلا خود سمجھتا ہوں، اپنا مطلب بتاؤ، اتنی رات گئے میری نیند کیوں خراب کی ہے؟"

نشے کی جھونک میں وہ اکھڑ گیا تھا لہٰذا اس سے مزید بات کرنا بیکار تھی۔ "اس وقت تمھیں چڑھی ہوئی ہے، نشہ اترے گا تو صبح بات کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"اسے کیوں فون کیا تھا؟" سلطان شاہ نے فوراً ہی سوال داغ دیا۔

"غزالہ سے کسی کو کوئی پرخاش نہیں تھی۔ اسے اے ٹو ہی کے کسی ہرکارے نے اغوا کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید جہانگیر کو اس بارے میں کچھ علم ہو اور اس سے مجھے کوئی سراغ مل سکے لیکن وہ اس وقت نشے میں بدحال ہو رہا ہے۔"

"اور رخشی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اب اسی کی طرف جاؤں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "وہ بہت مکار عورت ہے، فون پر ٹال دے گی۔ دوبدو بات ہو گی تو وہ مجھ سے کچھ نہ چھپا سکے گی۔"

میں وہاں بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا اسی اثنا میں کرنل شمع کو اس کی خوابگاہ میں چھوڑ کر واپس آ گیا میں نے اسے اپنے جانے کے بارے میں بتایا تو وہ بھی ساتھ چلنے پر مصر ہو گیا لیکن میں کسی نہ کسی طرح اسے ٹالنے میں کامیاب ہو ہی گیا پھر اپنے سوٹ کیس سے ایک بے آواز پستول اور کچھ فاضل راؤنڈز لے کر وہاں سے رخشی کے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

*

اسٹون ہاؤس ایک وسیع و عریض عمارت تھی اور اس اعتبار سے شاید منحوس بھی کہ اسے اپنی بن بیاہی بیوی کے نام پر خریدنے کے چند ہی روز بعد قاسم اسے آباد کرنے کی آرزو دل میں لیے جہنم واصل ہو گیا۔

جہاں تک مجھے علم تھا رخشی اس عمارت کے ایک حصے میں تنہا رہتی تھی اور مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی رات گئے اپنے پھاٹک پر ابھرنے والی کسی اجنبی دستک کا جواب دے گی لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دوسری ہی دستک پر دروازہ کھول

دیا گیا اور ایک ادھیڑ عمر لیکن توانا شخص گیٹ لیمپس کی روشنی میں میرا جائزہ لینے لگا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کے آثار باقی تھے لیکن ایک اجنبی کو اپنے مدمقابل پا کر وہ پوری طرح مستعد اور چوکنا نظر آ رہا تھا۔

"مجھے مس رخشی سے ملنا ہے، میرا نام ڈینی ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

میرا نام سن کر اس شخص کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی اور یکایک مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے کیونکہ اس نے غیر متوقع طور پر کسی وحشی سانڈ کی طرح سر جھکا کر پوری قوت سے میرے سینے پر ٹکر رسید کی تھی اور میں سنبھلنے کی ہر کوشش میں ناکام ہو کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گر گیا۔ اس شخص نے مہلت دیے بغیر پھرتی کے ساتھ میری پنڈلیاں پکڑ کر مجھے اندر گھسیٹ لیا۔

میں نے پوری قوت سے فضا میں ٹانگیں چلائیں اور اس کی گرفت سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر میں پھرتی سے لوٹ لگا کر بختہ فرش سے اٹھا تو اس کے ہاتھ میں لمبے پھل والا ایک چاقو چمکتا ہوا نظر آیا۔ اس وقت اس ادھیڑ عمر آدمی کا چہرہ بالکل ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ آنکھوں میں خون کی پیاس اتر آئی تھی اور وہ داہنے ہاتھ میں کسی پیشہ ور مشاق قاتل کی طرح چاقو تول رہا تھا۔

وہ انہماک اور توجہ کی جنگ تھی جس میں ایک لحظے کے لیے بھی اس کے چاقو والے ہاتھ سے نگاہ ہٹاتا تو پورا پھل میرے بدن میں اتر جاتا۔ میں نے اپنی جیب سے بے آواز پستول نکالنے کا ارادہ عارضی طور پر ملتوی کر دیا اور اس کے حملے کے انتظار میں اپنی جگہ تبدیل کرنے لگا۔ اس نے کئی بار فضا میں چاقو کو میری طرف لہرا کر جھکیاں دیں لیکن میں نے اس کا مدعا سمجھتے ہوئے ہر بار مختلف ردعمل کا مظاہرہ کیا اگر اسے میرے کسی مخصوص ردعمل کا اندازہ ہو جاتا تو وہ اسی پہلو کو دبا کر مجھ پر کامیاب وار کرنے کی کوشش کرتا لیکن میں نے اس کا وہ آزمائشی حربہ یکسر ناکام بنا دیا۔

اس وقت مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی کہ بظاہر سیدھا اور بے ضرر نظر آنے والا وہ شخص کس قدر خطرناک ثابت ہوا تھا پھر یہ کہ رخشی اسے کہاں سے پکڑ لائی تھی اور یہ کہ اسے مجھ سے کیا پرخاش تھی جو وہ میرا نام سنتے ہی لڑنے مرنے پر اتر آیا تھا۔

میرے لیے وہ شخص قطعی اجنبی تھا پھر یہی ہو سکتا تھا کہ رخشی نے اسے ملازم رکھتے ہوئے میرے بارے میں کچھ خطرناک ہدایات دی ہوں اور وہ ان ہی پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

رخشی سے میری آخری ملاقات بہت خوشگوار اور دوستانہ فضا میں ہوئی تھی اور ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی کہ اس کے بعد وہ اچانک ہی میرے خلاف ہو گئی ہو بجز اس کے کہ غزالہ پر اسی نے ہاتھ ڈالا ہو اور اب میری طرف سے کسی انتقامی کارروائی سے خائف ہو کر اس نے مجھ سے دور رہنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

رخشی کے بارے میں وہ خیال بہت اشتعال انگیز تھا۔ میرے جی میں آیا کہ جیب سے پستول نکال کر اس شخص کا خاتمہ کر دوں لیکن یہ امر مانع رہا کہ ہاتھ جیب میں ہوا تو میں پوری طرح مدافعت نہ کر سکوں گا۔

آخر کار ادھیڑ عمر کو شاید وہ موقع نظر آ ہی گیا جس کا وہ متلاشی تھا وہ کسی چھلاوے کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور تیر کی طرح میرے اوپر آیا تھا، میں نے پھرتی کے ساتھ اپنے بدن کو بائیں طرف جھکائی دی اور اس کی داہنی کلائی اپنے جسم سے دور ہی گرفت میں لینے میں کامیاب ہو گیا پھر میں نے تیزی کے ساتھ اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر بدن کو ایک چکر دیا اس کی کلائی مڑ گئی، میں نے اس پر مزید زور ڈالا اور وہ کراہتا ہوا نیچے جھکتا چلا گیا، میں نے اس کے ہاتھ سے چاقو چھین کر پوری قوت سے اس کے پیٹ میں ٹھوکر رسید کی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام کر غراتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

اس بار میری باری تھی لہٰذا اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا اور اس کی طرف لپکا۔ اس نے شاید پستول کی جھلک دیکھ لی تھی کیونکہ وہ وہیں پڑے پڑے کسی بے آب مچھلی کی طرح تڑپا اور پھر جونک کی طرح میری پنڈلیوں سے لپٹ گیا۔ بظاہر وہ ادھیڑ عمر تھا لیکن بے پناہ جسمانی طاقت کا مالک تھا، میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے فوری کارروائی نہ کی تو وہ میری پنڈلیوں پر دباؤ بڑھا کر مجھے نیچے گرا دے گا۔

میں نے اطمینان سے نال سیدھی کی اور اس کے داہنے شانے میں پگھلا ہوا سیسہ اتار دیا۔ وہ ایک کریہہ چیخ مار کر اچھلا اور میں اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ اس پر نگاہ رکھتے ہوئے میں نے بڑھ کر کھلا ہوا دروازہ بند کر دیا تاکہ کسی کی اتفاقی دخل اندازی کا امکان نہ رہے۔ وہ علاقہ زیادہ آباد نہیں تھا لیکن مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس کی چیخ کسی کو متوجہ کرنے کا سبب نہ بن جائے۔

"اداکاری ختم کرو اور اپنے قدموں پر کھڑے ہو جاؤ۔"

میں نے غراتے ہوئے اسے حکم دیا۔

اس نے سر اٹھا کر مجھے تحقیر آمیز نگاہوں سے گھورا۔ ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہتھیلیوں اور پنجوں کے بل فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن وہ بہت ہی ڈھیٹ اور بے خوف ثابت ہوا اور..... اچھل کر دوبارہ مجھ پر آ پڑا۔

میری نیت اسے کچھ دیر زندہ رکھ کر باز پرس کرنے کی تھی لیکن اسے مسلسل مزاحمت پر آمادہ پا کر مجھے اپنی گلوخلاصی کی فکر لاحق ہو گئی اور میں نے پستول کی نال اس کی بائیں پسلیوں میں اڑا کر ٹریگر دبا دیا۔ اس کے جسم کو ایک شدید جھٹکا لگا اور وہ میرے بدن پر اپنی گرفت کھو بیٹھا۔ اس بار وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پُرشور آواز کے ساتھ فرش پر گرا تھا۔

جلد ہی اس نے میری نگاہوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا اور میں گیٹ لیمپس کی ناکافی روشنی میں اس کی تلاشی لینے کی نیت سے اس پر جھک گیا۔

"ختم کر دو یہ کھیل، اس کے پاس کچھ نہیں ملے گا۔" اچانک کسی سمت سے ایک نسوانی آواز آئی اور میں بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ اسی لمحے ترنم ریز ہنسی کے ساتھ دوبارہ آواز ابھری۔ "تم نہیں دیکھ سکو گے، میں ادھر تاریک راہداری میں ہوں۔" میں نے اس بار رخشی کی آواز صاف پہچان لی، وہ سرگوشیانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "اسے گھسیٹ کر مالتی کی جھاڑیوں کے پیچھے ڈال دو اور بے دھڑک میری طرف چلے آؤ، میں باہر روشنی نہیں کرنا چاہتی۔"

وہ ہمیشہ ہی میرے لیے ناقابلِ فہم ثابت ہوتی رہی تھی۔ پہلے اس کے دربان نے میرا نام سنتے ہی مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا اور جب میں نے اسے زیر کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تو وہ یوں مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی جیسے اندھیرے میں چھپی شروع سے سارا کھیل دیکھتی رہی ہو۔

"میں مُردے نہیں ڈھوتا۔" میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ادھر روشنی نہیں کرنا چاہتیں تو باہر کھلے آسمان کے نیچے آ کر بات کرو، میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"چچ چچ....." اس کی متاسفانہ آواز ابھری۔ "احمق نہ بنو، جو کہہ رہی ہوں اس پر عمل کرو۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت باہر کوئی اور بھی موجود ہو، میں اس کی نگاہوں میں نہیں آنا چاہتی۔"

میں نے بیزاری کے عالم میں مرنے والے کا ہاتھ تھاما اور اسے زمین پر ہی گھسیٹتا ہوا مالتی کی جھاڑیوں تک لے گیا پھر بے رحمی کے ساتھ اسے اٹھا کر دوسری طرف کچی زمین پر لڑھکا دیا۔

میں ہاتھ جھاڑتا ہوا اندھیرے میں پہنچا تو مجھے اپنے قریب ہی رخشی کی آواز سنائی دی۔ "میرے پیچھے چلے آؤ۔ تم نے وہی کیا جس کی مجھے امید تھی۔ اگر وہ تم پر قابو پا لیتا تو مجھے ہی اندھیرے میں سے اس پر گولی چلانا پڑتی۔"

"تم روز بروز پیچیدہ ہوتی جا رہی ہو۔" میں نے اس کے قدموں کی آواز پر اندھیرے میں آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "پہلے اپنے آدمی سے قاتلانہ حملہ کرا کے خاموشی سے تماشا دیکھتی رہیں اور جب میں نے اسے زیر کر لیا تو اب ہمدردی جتا رہی ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں اپنا دوست سمجھوں یا دشمن؟ پل پل میں رنگ بدلنے لگی ہو۔"

اندھیرے میں اس کی مختصر سی ہنسی ابھر کر رہ گئی۔

ایک موڑ گھوم کر ہم روشن کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں پہلے اس سے مل چکا تھا۔ روشن خوابگاہ میں داخل ہو کر وہ میری طرف گھومی تو اس کے ہاتھ میں ریوالور موجود تھا جس کی نال جھکی ہوئی تھی۔

"اب پوچھو کیا پوچھ رہے تھے تم؟" اس نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دوست نہ سمجھتے تو تم مجھ سے ملنے یہاں کیوں آتے اور اگر میں تمھیں دشمن سمجھتی تو اپنے آدمی کو تمھارے ہاتھوں یوں آسانی سے کیوں مرنے دیتی؟"

"پھر وہ میرا نام سنتے ہی مجھ پر کیوں ٹوٹ پڑا تھا؟"

"اوہ! تو تم نام بتا بیٹھے تھے اسے اپنا۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ "یہی تو میں سوچ رہی تھی کہ وہ اچانک تم سے کیوں بھڑ گیا تھا۔ میں دوسری دستک ہونے تک وہاں پہنچ گئی تھی اور میں نے شروع سے آخر تک ساری کارروائی دیکھی تھی۔"

"میں تمھاری وضاحت کا منتظر ہوں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں تمھارے سامنے کسی وضاحت کی پابند تو نہیں ہوں لیکن پھر بھی بتاتی چلوں کہ مرنے والا میرا آدمی نہیں تھا۔ مجھے اوپر سے ہدایت ملی تھی کہ آج کل آدمیوں کی کمی ہے لہٰذا قاسم کے کارکنوں کو سمیٹنے کی کوشش کروں، خاص طور پر اقبال کو اپنے قریب رکھنے کی کوشش کروں۔ پھر دو دن پہلے یہی شخص اقبال کے نام سے یہاں آ پہنچا۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے یہ ٹھکانا کیسے معلوم ہوا لیکن میں ان لوگوں کے طریقۂ کار سے واقف ہوں، انھوں نے میری نگرانی کے لیے یہاں تک اس کی رہنمائی کی ہو گی، دوسری بات یہ تھی کہ آج کل ہر طرف تمھاری تلاش جاری ہے۔ زندہ نہیں تو تمھیں مُردہ ہی پکڑنے کے احکام جاری ہو گئے ہیں۔ اس بارے میں میں نے اقبال کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن وہ ان کا خاص آدمی تھا، شاید اسے براہِ راست ہدایت ملی ہو اسی لیے وہ تم پر حملہ آور ہوا ہو گا۔ میں نے اسے چوکیدار بنایا ہوا تھا، اچھا ہوا کہ اس کالی بھیڑ سے نجات مل گئی۔"

"گویا یہ تمھیں اسے ٹو سے جہیز میں ملا تھا۔"

"یہی سمجھ لو۔" وہ ہنسنے لگی۔ "اس قدر ملعون تھا کہ چھپ کر میرے کمرے میں بھی تاک جھانک شروع کر دی تھی۔"

"اور وہ باہر سے کسی اور کی نگرانی کا کیا قصہ تھا؟"

"بس ایک موہوم سا امکان تھا، بلاوجہ خطرہ کیوں مول لیا جائے۔ واقعی کوئی موجود ہوتا تو اتنی دھماچوکڑی کے بعد ضرور دخل دے بیٹھتا لیکن میں اپنی جانب سے کوئی بے احتیاطی نہیں کرنا چاہتی۔"

"میرے بارے میں جاری ہونے والی ہدایات تو تم نے سنا ڈالیں لیکن اس لڑکی کا کیا ہوا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"کون سی لڑکی؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"جس کی تصویریں بانٹی گئی ہیں۔"

"اچھا ہوا کہ تم ذکر نکال بیٹھے، یہ تو بتاؤ کہ وہ ہے کون؟" اس کے لہجے میں تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ "سنا ہے کہ تمھارے ساتھ اس کا کوئی گہرا تعلق ہے اور شاید وہ تمھارے ساتھ کام کر رہی ہے۔"

رخشی بھی ایک عورت ہی تھی اور اس کے ساتھ میرے مراسم میں ہلکا سا قربت کا پہلو بھی تھا، میں نے محسوس کیا کہ آخری سوال کرتے ہوئے اس کے لہجے میں رقیبانہ جلن پیدا ہو گئی تھی، لہٰذا میں نے سرسری انداز اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ "میں نے تو دیکھا بھی نہیں ہے اس کو۔ معتوب ہونے سے پہلے لاہور سے اس کی تصویر آئی تھی میرے پاس، خاصی خوبصورت لڑکی ہے۔ بُرا فلسفہ تو یہ ہے کہ اگر اسے ٹو کو اس کی تلاش ہے تو لڑکی نے یقیناً اسے چونا لگایا ہو گا، میں اسے اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہوں۔"

"دباؤ خاصا ہے لیکن کوئی کامیابی نہیں ہو سکی۔ کہا جا رہا ہے کہ وہ کراچی ہی میں ہے، مل جائے جب کی بات ہے۔"

"تمھارے علاوہ بھی کوئی اور اس کی تلاش میں ہے؟"

"تنظیم سے متعلق سارے ہی لوگ اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ لڑکی کے لیے لاہور سے بھی ایک آدمی آیا ہوا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ لڑکی کچھ اہم راز معلوم کر لینے میں کامیاب ہو گئی ہے جب ہی اس کی تلاش پر اتنا زور دیا جا رہا ہے۔"

"لاہور سے کون آیا ہوا ہے؟"

"کوئی سلام ہے۔ بلیو اسٹار کے کمرہ نمبر سات میں ٹھہرا ہوا ہے۔ قتل اور اغوا کے معاملات کا خصوصی ماہر سمجھا جاتا ہے اور آج کل مجھ ہی کو جوابدہ ہے، سوچ رہی ہوں کہ اسے مستقل طور پر یہیں روک لوں۔" آخری فقرہ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ملاقات ہو گئی ہے۔" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمھارے بارے میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ تم میں عزتِ نفس کا ذرا بھی احساس باقی نہیں ہے۔"

"بے کار باتیں ہیں۔" وہ بے پروایانہ انداز میں بولی۔ "نفس کی اس سے بڑی عزت افزائی کیا ہو گی کہ اس کی تسکین کا سامان ہوتا ہے۔ میں اس سے ایک عام عورت کی طرح ہوٹل ہی میں ملی تھی۔ اسے شبہ بھی ہو جاتا کہ میں ہی سی ون ہوں تو شاید وہ مر کر بھی اپنے خول سے باہر نکلنے کی جرأت نہ کرتا۔"

"باہر پڑی ہوئی لاش کا کیا ہو گا؟" میں نے موضوع بدلنے کی نیت سے سوال کیا۔

"کسی سے ٹھکانے لگوا دوں گی۔ اسے ٹو کے لیے یہ خبر دلچسپ ہو گی کہ اس کا فرستادہ میرے گھر میں کسی بزدل چوہے کی طرح ایک نامعلوم حملہ آور کا نشانہ بن گیا۔"

"پھر تم اس کا بندوبست کرو، میں چلتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ایسے کہاں جاؤ گے۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "میری نیند خراب کی ہے تو تھوڑی دیر شغل بھی کرنا ہی پڑے گا۔ ویسے اس وقت تمھاری آمد کا مقصد کیا تھا؟" وہ کیبنٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"ملنے آیا تھا لیکن خون خرابے نے طبیعت مکدر کر دی۔" میں نے نیم دلی کے ساتھ کہا۔

"مجھے تو محسوس ہو رہا ہے اس وقت تمھارے سر پر وہی تصویر والی لڑکی سوار ہے اور شاید تم اسی کے کھوج میں آئے تھے۔" اس نے آئس کین سے برف کے ڈلے گلاسوں میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس کی تلاش ضرور ہے لیکن اتنی بھی نہیں۔" میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

رخشی سے مجھے ایک اہم سراغ مل چکا تھا۔ میرے دل و دماغ میں غزالہ کی طرف سے واقعی ایک طوفان برپا تھا اور میں جلد از جلد بلیو اسٹار پہنچ کر سلام سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ

کر چکا تھا لیکن وہ مجھے روکنے پر مُصر تھی اور میں اسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا اُس لیے مجھے ناچار وہاں ٹھہرنا پڑ گیا۔

زخشی کا تعلق عورتوں کی اس واہیات قسم سے تھا جن کے نزدیک عزت، آبرو اور وقار کا مفہوم بالکل ہی مختلف ہوتا ہے۔ وہ کسی کو بھی اپنی خواہشات کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کرنے کو اپنی فتح سمجھتی تھی اور اس وقت بھی اپنی دانست میں فتحیاب رہنا چاہتی تھی لیکن مجھے اس کی اوقات معلوم تھی۔ تڑپتا، مچلتا سیّال اس کے دہانے سے معدے میں اترنے کے بجائے دماغ میں چڑھتا تھا اور مجھے امید تھی کہ میں تھوڑی ہی دیر میں اسے اپنے خوابوں کے جزیروں کی سیر میں مصروف چھوڑ کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

☆

اس رات زخشی نے میرے تمام اندازوں کو شکستِ فاش دے دی۔ باہر تپتی ہوئی لاش کی فکر اس کے ذہن پر سوار تھی لہٰذا وہ اعتدال کی حد سے تجاوز پر آمادہ نہ ہوئی اور میں اسے چھوڑ کر نکل بھاگنے کے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

میری رسٹ واچ صبح کے تین بجا رہی تھی اور وہ وقت سلام سے ملنے کے لیے قطعی نامناسب تھا لہٰذا میں زخشی کو الوداع کہہ کر واپس غزالہ کے گھر لوٹ گیا۔

دل شکستہ اور سوختہ جاں کرنل میرے انتظار میں تھک ہار کر گہری نیند سو چکا تھا۔ البتہ سلطان شاہ میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں امید کی چمک لہرائی تھی لیکن میرے سُتے ہوئے چہرے پر ناکامی کی لکیریں دیکھ کر اس نے سب کچھ سمجھ لیا۔

"پھر کیا کیا جائے؟ کدھر کا رُخ کیا جائے؟ اس طرح تو بھابی کا سراغ ملنے سے رہا۔" اس نے دھیمی آواز میں بوجھل سکوت کو توڑتے ہوئے سوال کیا۔ اور میں نے اسے سلام کی دریافت سے آگاہ کر دیا۔

"صبح بہت دور ہے، کیوں نہ اسے فون ہی کر لیا جائے۔" اس نے تجویز پیش کی۔

"فون پر کوئی بات نہ ہو سکے گی، اُلٹا وہ ہوشیار ہو جائے گا، میں اسے بے خبری میں گھیرنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور بات وہیں ختم ہو گئی۔

وہ فکر مند تھا اور میں دل ہی دل میں فکر مند ہونے کے ساتھ نادم بھی تھا کیونکہ زخشی کے ساتھ میں نے جو وقت گزارا، وہ تمام تر مجبوریوں کے باوجود سراسر زیاں ثابت ہو رہا تھا ورنہ میں اسی رات سلام سے مل لیا ہوتا۔

ہم دونوں وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھے صورتِ حال پر مغز زنی کرتے رہے اور ایش ٹرے میں سگریٹوں کے مسلے ہوئے ٹکڑوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ آخر کار اُجالا پھیلنے کے بعد میں نے منہ ہاتھ دھویا اور لباس تبدیل کر کے روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ اس اثنا میں سلطان شاہ نے چائے تیار کر لی تھی۔ چائے پینے کے بعد میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

بلیو اسٹار متوسط درجے کا ایک مصروف ہوٹل تھا۔ وہاں پہنچ کر میں کاؤنٹر سے رجوع کرنے کے بجائے سیدھا سیڑھیاں طے کرتا چلا گیا اور پہلی ہی منزل پر مجھے راہداری میں لگی ہوئی تختی سے ساتویں کمرے کا محل وقوع معلوم ہو گیا۔

میں نے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی جواب نہیں ملا بلکہ تیسری دستک کے بعد کسی نے خوابیدہ آواز میں بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا اور پھر ایک اجنبی کو سامنے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

وہ سلیپنگ سوٹ میں ملبوس ایک توانا شخص تھا اور چہرے سے ہی جہاندیدہ نظر آ رہا تھا۔

"میں تمہاری طلبی کا پیغام لایا ہوں۔" میں نے اس کی استفسار طلب نگاہوں کے جواب میں آہستگی سے کہا۔ "مجھے سی ون نے بھیجا ہے۔ کیا تم اندر آنے کو نہیں کہو گے؟"

"سی ون!" اس نے متحیر آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ کیا بلا ہے! میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔"

"تمہارا نام سلام ہی ہے نا؟" اس کے انداز پر میں نے بے چینی سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔" اس نے دانت پیس کر غصیلے لہجے میں کہا۔ "اگر دروازہ پیٹنے سے پہلے تم نیچے کاؤنٹر پر رجوع کر لیتے تو یوں میری نیند خراب نہ ہوتی۔"

صورتِ حال اتنی مضحکہ خیز ہو گئی تھی کہ میں چکرا کر رہ گیا اور ہکلاہٹ کی آڑ لینے کے باوجود مجھے بات بڑھانے کا کوئی معقول عذر نہ سوجھ سکا لیکن میں نے دیکھا کہ بظاہر بات ختم ہو جانے کے باوجود اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا تھا اور مسلسل گھورے جا رہا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ میرے قدم بھی واپسی کے لیے نہیں اُٹھ سکے تھے۔

اس نے سچویشن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال کر مجھے اندر گھسیٹ لیا اور پھر مجھے دیوار سے لگاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ "ہاں، میرا نام سلام ہی ہے، اب بتاؤ کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"سی ون نے۔" میں نے اپنے سینے پر اس کے دباؤ کے باوجود پُرسکون لہجے میں کہا۔

"وہ کون ہے؟" وہ سانپ کی طرح پھنکارا۔

"اگر تم سلام ہو تو جانتے ہی ہو گے کہ وہ ایک عورت ہے۔ میں نے بھی اسے کبھی نہیں دیکھا بلکہ صرف نسوانی آواز۔" میں نے اپنی کھوپڑی پر..... عورت پر حتی الامکان قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت مجھے اپنے حریف کی چالاکی سے زیادہ اپنی حماقت پر تاؤ آ رہا تھا کہ میں کس قدر آسانی سے اس کی باتوں سے بے وقوف بن گیا تھا۔

"اسے کیا ضرورت پڑ گئی ہے میری؟" اس نے میرا گریبان چھوڑتے ہوئے سوال کیا۔

"وہی بتا سکے گی۔ اب تو شاید تمہیں اس سلوک کی جوابدہی بھی کرنا ہو گی۔" میں نے اپنا لباس درست کرتے ہوئے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"غیر معمولی طریقۂ کار اختیار کرنے میں یہی خرابی ہوتی ہے۔" وہ بولا۔ "وہ براہِ راست بھی مجھے پیغام دے سکتی تھی۔"

"مجھ سے جو کچھ کہا گیا، وہ کر رہا ہوں۔ چل رہے ہو تو باقی سوالات خود کر لینا۔"

"کہاں جانا ہو گا؟"

"تمہیں ایک عمارت تک پہنچانے کے بعد میری ذمے داری ختم ہو جائے گی۔"

"بیٹھو۔" اس نے پہلی بار شریفانہ لہجے میں کہا اور میں کمرے میں پڑی ہوئی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ بہت پھرتی کے ساتھ کپڑے تبدیل کر کے میرے ساتھ روانگی کے لیے تیار ہوا تھا۔ میلے کپڑوں سے تولیے تک ہر چیز اس نے بے ترتیبی کے ساتھ کمرے میں بکھیر دی تھی۔ اس کے اشارے پر میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور وہ اندر کی ہول سے چابی نکال کر میرے پیچھے ہو لیا۔

"ہمارا ایک ساتھ باہر نکلنا مناسب ہو گا۔" میں نے راہداری میں اس سے کہا۔ "ہوٹل سے نکل کر میں داہنی طرف رُکوں گا تم مجھ سے وہیں آ ملنا اس طرف میری گاڑی موجود ہے۔"

یہ کہہ کر میں تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے چلا گیا اور چند ثانیوں بعد وہ مقررہ جگہ پر مجھ سے آ ملا۔

غزالہ کے گھر کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ تنظیم کے طریقۂ کار کے بارے میں میری پچھلی معلومات اس وقت بھی کارآمد تھیں۔ شاید زخشی ہی سلام سے یکطرفہ رابطہ رکھتی تھی اور سلام کو اس سے رابطے کا طریقہ نہیں معلوم تھا ورنہ وہ میرے ساتھ روانہ ہونے سے پہلے اس سے تصدیق کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ ہارن کی آواز سُن کر سلطان شاہ نے تقریباً فوراً ہی پھاٹک کھولا تھا پھر لورچ میں گاڑی روک کر جیسے ہی میں نیچے اُترا تو سلطان شاہ پھاٹک بند کر کے اپنا بے آواز پستول تھامے ہماری طرف چلا آیا تھا۔ سلام نے اس پر نگاہ پڑتے ہی استفسار طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور میں نے شانے اُچکا کر بے پروائی سے کہا۔ "یہاں کا کوئی اپنا طریقۂ کار ہو گا۔"

"ہاتھ اوپر اُٹھاؤ۔" اسے متذبذب پا کر سلطان شاہ نے قریب پہنچ کر غراتے ہوئے کہا۔ سلام ہاتھ اٹھائے بغیر اسے سرد اور قہر آلود نگاہوں سے گھورتا رہا اور سلطان شاہ اس پر ہاتھ چھوڑ بیٹھا۔

اس کا بایاں ہاتھ پوری قوت سے سلام کے جبڑے پر پڑا تھا اور وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے غضبناک لہجے میں مجھ سے سوال کیا تو اس کے دہانے کے دونوں طرف سے خون کی پتلی پتلی دھاریں بہہ رہی تھیں۔

"استقبال!" میں نے سرد لہجے میں کہا اور اسی کے ساتھ اس کی پنڈلی پر ایک ٹھوکر رسید کی۔ وہ بلبلا کر نیچے جھکا اور اگر سلطان نے جھپٹ کر اسے فوراً ہی نہ دبوچ لیا ہوتا تو اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا ہوتا۔

اسے بے کر بخت روش پر گرتے ہوئے سلطان شاہ نے اپنا بے آواز پستول میری طرف اچھال دیا اور پھر وحشیانہ انداز میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ وہ بھی کمزور نہیں تھا اس نے زور کر کے تقریباً فوراً ہی خود کو سلطان شاہ کے نیچے سے نکال لیا لیکن سلطان شاہ پر اس وقت جنون کی سی کیفیت طاری تھی، وہ سلام کو مہلت دیے بغیر پلٹا اور اس کے دونوں جبڑوں کو تابڑ توڑ مکوں پر رکھ لیا۔

وہ دھما چوکڑی اتنی شدید تھی کہ اندر سے کرنل بھی بلبلا کر باہر آ گیا۔ اس وقت تک سلطان شاہ سلام کو بُری طرح لہولہان کر چکا تھا اور اس کے چہرے پر جا بجا نیل نمودار ہو چکے تھے۔ اس کوشش میں سلطان خود بھی زخمی ہوا تھا لیکن مجموعی طور پر اس کا پلا بھاری رہا تھا۔ نتیجے کے پیشِ نظر میں دخل اندازی کیے بغیر تماشا دیکھتا رہا تاکہ وہ دل کی بھڑاس نکال سکے۔ کرنل نے آتے ہی بیچ بچاؤ کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے بھی سختی سے روک دیا اور سلطان شاہ نے ذرا ہی دیر میں سلام کے سارے کس بل ڈھیلے کر کے اس کے ریوالور پر قبضہ کر لیا۔

"یہ... یہ کون ہے؟ یہاں کیا ہو رہا ہے؟" کرنل نے کپکپاتی ہوئی تحیر آمیز آواز میں پوچھا۔

"غزالہ کے بارے میں اسی سے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔"

میں نے سرد لہجے میں کہا "آپ اندر جاکر آرام کریں، تھوڑی دیر میں یہ سچ بولنے کی مشین بن جائے گا تو آپ کو بلا لیا جائے گا۔"

"عزالہ!" وہ خون تھوکتے ہوئے تنفر آمیز لہجے میں بولا۔ "شاید تم لوگ بالکل ہی پاگل ہو گئے ہو، جو ایک شریف شہری کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو، میں کسی عزالہ کو نہیں جانتا۔"

"اندر چلو، تھوڑی دیر میں جان جاؤ گے ــــ" میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سی ون کے لیے کام کرنے والے لوگ کتنے شریف ہوتے ہیں۔"

اس نے اندر چلنے میں تردد کا اظہار کیا تو سلطان شاہ نے پھر اس کا چہرہ اُدھیڑ ڈالا۔ اسے یوں رہ رہ کر غصہ آرہا تھا، جیسے سلام نے اس کی کوئی پرانی جاگیر ہتھیالی ہو۔ اس بار سلطان شاہ کے ہاتھ اسی وقت رُکے تھے، جب اس کا شکار تیورا کر دوبارہ نیچے ڈھیر ہو گیا تھا۔ چند ثانیوں کے انتظار کے بعد جب سلام پر مزید کوئی مصیبت نازل نہ ہوئی تو وہ کسی اندھے کی طرح ٹٹولتا ہوا فرش سے اُٹھ گیا۔ زخموں اور خون کی وجہ سے اس کا ورم آلود چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ دونوں آنکھوں کے نیچے نیل پڑ گئے تھے اور نچلے ہونٹوں کی سوجن نے اس کی دونوں آنکھیں تقریباً بند کر دی تھیں۔ سیدھا کھڑا ہو جانے کے باوجود وہ یوں لہرا رہا تھا جیسے اس کی کھوپڑی چکرا رہی ہو۔

ہم دونوں اسے ہانکتے ہوئے اندر کی طرف لے چلے۔ کرنل ہمارے پیچھے آرہا تھا، اس کے چہرے پر پٹنے والے کے لیے ترحم کے آثار نمایاں نظر آرہے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ جنگوں کا آزمودہ، ریٹائرڈ کرنل ہونے ہوئے بھی وہ اس قدر نرم دل واقع ہوا تھا۔

کرنل کو راستے میں چھوڑ کر ہم سلام کو اسی کمرے میں لے گئے، جہاں کامران قید رہتا تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد سلطان نے دروازہ اور کھڑکیاں بند کر دیں تاکہ باہر سے کسی مداخلت کا... امکان باقی نہ رہے۔

"اب بتاؤ کہ عزالہ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے قیدی کے سر پر مسلط ہو کر سرد لہجے میں سوال کیا۔

"میں کسی عزالہ کو نہیں جانتا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"پھر لاہور سے یہاں کیوں آئے تھے؟" میں نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔ اس کا چہرہ ستھرا ہوا اور بُری طرح مسخ تھا، جس کی بنا پر اس کے تاثرات کا اندازہ لگانا دشوار تھا لیکن پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا سوال سُن کر چونک پڑا تھا۔

"لل... لاہور سے میرا یہاں تبادلہ ہوا ہے۔ آخر تم کون ہو اور مجھ پر کس بات کا شبہ کر رہے ہو؟"

"اگر تنظیم میں تم ذرا سے بھی اہم مقام کے حامل ہو تو ضرور پہچان لو گے... میرا نام ڈینی ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے بلاتامل اقرار کیا "یہ تمہارا نام میرے لیے نیا نہیں ہے۔ مجھے تمہاری ہی تلاش میں سی ون کا سلسلہ دینے کے لیے سی ون کے پاس بھیجا گیا ہے... شاید پہلے تم بھی ہمارے ہی ساتھ تھے؟"

"اور وہ تصویر جو تمہیں دی گئی تھی؟"

"مجھے کوئی تصویر نہیں دی گئی۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

"اس چھت کے نیچے ہم تمہیں ذبح بھی کر دیں گے تو کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "بہتر یہی ہے کہ جو کچھ جانتے ہو، بلا تکلف بتاتے چلے جاؤ ورنہ آرزو کے باوجود آسانی کے ساتھ موت کو بھی گلے سے نہ لگا سکو گے۔"

"زبردستی جو کہلوانا چاہو کہنے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے بے بسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "ورنہ سچی بات یہ ہے کہ میں نہ عزالہ کو جانتا ہوں اور نہ کسی تصویر کے وجود سے واقف ہوں۔"

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ اگر وہ عزالہ سے لاعلمی کے ساتھ یہ مان لیتا کہ اسے لاہور سے چلتے ہوئے ایک تصویر دی گئی تھی تو شاید میں فریب کھا جاتا کیونکہ رخشی مجھے بتا چکی تھی کہ سلام قتل اور اغوا کے معاملات میں ماہر تصور کیا جاتا تھا اور اسے لاہور سے خاص طور پر عزالہ کی تلاش کے لیے بھیجا گیا تھا۔ وہ جس طرح اپنی آمد کے بنیادی مقصد سے گریز کر رہا تھا، اس کی بنا پر مجھے قوی شبہ ہونے لگا کہ عزالہ کی گمشدگی میں اگر اس کا ہاتھ نہیں تھا تو وہ اس بارے میں کم از کم کوئی اہم بات ضرور جانتا تھا۔

"یہ اس طرح نہیں مانے گا۔" سلطان شاہ نے غصیلے لہجے میں کہا "مار کھانے کے معاملے میں بہت ڈھیٹ اور پکا معلوم ہوتا ہے، میں اس کے کان کاٹنے سے ابتداء کرتا ہوں، پھر دیکھوں گا کہ کب تک خاموش رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ چھری اور پسی ہوئی مرچیں لے آؤ۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔ اور وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

"میں پھر کہہ رہا ہوں کہ تم اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔" سلطان شاہ کے چلے جانے کے بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "تشدد کے بعد تم اگر کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو بھی گئے تو وہ جھوٹ اور گمراہ کن ہو گا۔"

"جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنا میرا کام ہے اور میں تمہارے منحوس پیشوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ ایک قاتل کو اذیت دیتے ہوئے ہلاک کرنے میں مجھے کوئی تامل نہ ہو گا۔ یہ یاد رکھنا کہ مرنے کے بعد تمہارے وارث بھی تمہاری لاش کو شناخت نہیں کر سکیں گے اور تم لاوارث قرار دے کر کسی گڑھے میں دبائے جاؤ گے۔"

نہ جانے یہ میری روح فرسا منظر کشی کا ردِعمل تھا یا وہ پہلے ہی آخری کوشش کا فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا اور اسی ہلے میں پستول میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے چھوٹتے ہی میری گردن دبوچنے کی کوشش کی تھی لیکن اپنی ناک پر پڑنے والی بھرپور ٹکر سے تیورا کر غراتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں لات ماری اور وہ حلق سے کریہہ آوازیں نکالتے ہوئے ماہیٔ بے آب کی طرح فرش پر تڑپنے لگا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ تڑپتے ہوئے میرے پستول پر ہاتھ نہ ڈال دے لہٰذا میں پستول اٹھا کر دروازے میں جم گیا۔

اسی اثنا میں سلطان شاہ چھری سمیت بوکھلایا ہوا وہاں آپہنچا۔ زخمی کے شور نے کرنل کو بھی ادھر کا رُخ کرنے پر مجبور کر دیا۔

"آپ پھر چلے آئے؟" میں نے ناگوار لہجے میں کرنل سے کہا۔ اس بے چارے نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی خاموشی سے دُم دبا کر واپس لوٹ گیا۔

"کیا پھر کچھ ہوا ہے؟" سلطان شاہ نے چھری کا پھل بائیں ہتھیلی پر صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ مرنا ہی چاہتا ہے۔ مجھ پر حملہ کر بیٹھا تھا۔" میں نے کہا "میں اب تماشا دیکھوں گا، تم اپنا کام شروع کر دو۔"

سلطان شاہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے تشدد کی انتہا کے بارے میں سوال کیا اور میں نے اسے کھلی چھوٹ دے دی۔ وہ چھری سنبھال کر کمرے میں لپکا اور کسی ماہر قصاب کی طرح سلام پر چڑھ بیٹھا۔ وہ پوری قوت سے مچلا تھا لیکن سلطان نے پہلے ہی وار میں اس کا داہنا کان جڑ سے کاٹ لیا اور فاتحانہ انداز میں اس پر سے اتر آیا۔

سلام کے حلق سے غراہٹوں کے ساتھ گالیوں کا طوفان اُمڈ پڑا۔

"قتل، اغواء اور بردہ فروشی۔" میں نے بے رحمانہ لہجے میں کہا "تمہارے تینوں ہی جرم بہت سنگین ہیں۔ میری نگاہ میں ان میں سے ہر جرم کی سزا موت ہے۔ اگر تم ہمارے ہاتھوں مارے گئے تو مجھے خوشی ہو گی کہ جو کام قانون نہ کر سکا وہ میں نے پورا کر دکھایا ہے۔"

"صرف چار منٹ باقی ہیں۔" سلطان شاہ اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا "زبان نہ کھولی تو وقت پورا ہوتے ہی دوسرا کان کاٹ لوں گا اور اس بار چھری کے پھل پر مرچیں لگی ہوں گی۔"

"تم... تم... سنگدل بھیڑیے ہو۔" وہ ہانپتے اور کراہتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

"کسی رحمدل بھیڑیے کا پتا معلوم ہو تو وہ بھی بتا دو، شاید ہم اسی سے کچھ سیکھ سکیں۔" مار دھاڑ اور جسمانی ورزش کے بعد سلطان شاہ کی شگفتگی بھی عود کر آئی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس نے چند منٹ قبل کسی زندہ شخص کے عضو کے بجائے کسی سیب سے ایک ٹکڑا تراشا ہو، اور اب دوسرے کا منتظر ہو۔

"تین منٹ!" تھوڑے سے توقف کے بعد سلطان شاہ نے ہانک لگائی "ہر پانچ منٹ بعد ایک عضو سے محروم ہوتے جاؤ گے اور آخر میں بے دست و پا دھڑ پر صرف کھوپڑی جمی رہ جائے گی۔"

"ہم اس پر زیادہ وقت برباد نہیں کر سکتے۔" میں نے سلطان شاہ کو آنکھ مارتے ہوئے خشک لہجے میں کہا "اس بار اس کا داہنا بازو کہنی سے الگ کر دینا۔ شاید اس کا ذہن تیزی سے فیصلہ کر سکے۔"

"نہیں!" وہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑا "تم یہ وحشیانہ ظلم نہیں کر سکتے۔"

"صرف سوا دو منٹ رہ گئے ہیں، خود ہی پتا چل جائے گا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔" سلطان شاہ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر ہمیں گالیاں دینے لگا۔ اس دوران میں سلطان شاہ ہر تیس سیکنڈ بعد بلند آواز میں اسے باقی رہ جانے والی مدت سے آگاہ کرتا رہا اور ہر بار اس کی حالت میں نمایاں تغیر نمودار ہوتا رہا۔ پھر جب پانچ منٹ پورے ہونے پر... سلطان شاہ چھری تان کر اس پر جھپٹا تو اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ دونوں ہاتھ فضا میں لہرا کر چیخ پڑا۔

"ٹھہرو... ٹھہرو! میں بتا دوں گا، سب بتا دوں گا۔"

"اب یہ اگلے پانچ منٹ میں سوچنا، داہنا بازو تو ہر صورت میں کٹے گا۔" سلطان شاہ اس پر سوار ہو کر زور آزمائی کرتے ہوئے بولا مگر میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ ہاتھ کاٹنے کے بجائے اس کے اوسان خطا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہٹو... میں ہاتھ نہیں کٹنے دوں گا، جو پوچھو گے بتا دوں گا۔" وہ بُری طرح زور آزمائی کرتے ہوئے وحشت زدہ آواز میں چیخا۔

"اسے چھوڑ دو!" میں نے فرمان جاری کیا اور سلطان شاہ

اس پر سے فوراً ہی اُتر گیا۔

سلام اپنے ہاتھ پیر، بدن کے ساتھ سمیٹے فرش پر پڑا ہانپتا کانپتا رہا۔ جب تک بات تشدد تک تھی، وہ سب کچھ سہتا رہا لیکن دھمکیوں کے سامنے اس کا سارا حوصلہ پانی ہو گیا تھا۔

"غزالہ کہاں ہے؟" میں نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"میں نام نہیں جانتا، مجھے بس ایک لڑکی کی تصویر دی گئی تھی، جسے تلاش کرنا تھا۔" اس نے سسکتے اور ہکلاتے ہوئے اٹک اٹک کر کہا۔

بے اختیار میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ "اب وہ کہاں ہے؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"مم... میں نہیں جانتا۔" وہ اذیت ناک لہجے میں بولا۔ "میں تمھیں سب کچھ بتا دوں گا، لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ معلومات حاصل کرنے کے بعد تم مجھے زندہ چھوڑ دوگے؟"

"نہ کوئی ضمانت ہے نہ وعدہ۔ تمھارے مستقبل کا انحصار صرف ہماری مرضی پر ہوگا۔"

"یہ ظلم ہے، یہ اندھیر ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر کراہا۔

"لڑکی کو تم نے اغوا کیا تھا؟" میں نے اپنی آواز کسی کنوئیں کی تہہ سے اُبھرتی محسوس کی۔ میرے لیے یہ تصور ہی کربناک تھا کہ غزالہ غائب تھی اور اسے اغوا کرنے والا میرے سامنے موجود تھا۔

"ہاں۔ میرا خیال تھا کہ تقدیر میری یاوری کر رہی ہے، اس بُرے وقت کا اندازہ ہوتا تو وہاں سے انجان بن کر گزر جاتا۔"

"کہاں سے اغوا کیا تھا؟" میں نے اپنے وجود میں غبار سا اُبھرتا ہوا محسوس کیا۔ وہ سوالات کرتے ہوئے میرے لیے خود پر قابو پائے رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے اعتراف نے تو میرے اندر لگی ہوئی آگ کو اور بھڑکا دیا تھا۔

"اس کی ٹیکسی خراب ہو گئی تھی۔ وہ آدھے چہرے پر نقاب ڈالے ہراساں انداز میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھیں پہچان لیں۔ وہ اپنی ٹیکسی کا حساب کر کے دوسری سواری کی تلاش میں آگے بڑھی تو میں نے اسے جالیا...!"

میں نے بڑھ کر اضطراری طور پر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی اور وہ بلبلا اُٹھا۔ "مجھے مت مارو، خدا کی قسم میں نے کوئی زیادتی نہیں کی تھی، جو کچھ ہوا، آناً فاناً میں ہوا تھا، کسی کو شبہ تک نہ ہو سکا کہ وہاں اغوا کی واردات ہوئی ہے۔"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟" سلطان شاہ نے آگے بڑھ کر مجھے بُری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ میں نے قہر بار نظروں سے اس کی طرف گھورا تو وہ آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے اسی غصیلے لہجے میں بولا۔ "جب وہ خود ہی سب کچھ بتا رہا ہے تو پھر درندگی دکھانے کی کیا ضرورت ہے، تم جاؤ یہاں سے، میں خود سب کچھ معلوم کر لوں گا۔"

میں کوئی جواب دیے بغیر خاموش کھڑا رہا اور سلطان شاہ سلام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اغوا کر کے اسے کہاں لے گئے تھے؟"

"جیوا ہاؤز۔" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ میں دل ہی دل میں اپنی کم نگاہی پر کھول کر رہ گیا۔ پورے شہر میں گھپلے کے کاموں کے لیے تنظیم کے پاس وہی ایک عمارت تھی جہاں کسی کو اغوا کر کے قید کیا جا سکتا تھا اور میں غزالہ کی تلاش کی مہم میں اسے یکسر بھلا بیٹھا تھا۔

"وہاں تک تمھاری رسائی کیسے ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کراچی پہنچنے کے بعد سی ون نے مجھے ایک کوڈ ورڈ بتایا تھا، جسے محافظوں کے سامنے دُہرا کر میں کسی بھی وقت جیوا ہاؤز کی عمارت کو استعمال کر سکتا تھا۔"

"اور اپنی اس کامیابی کی اطلاع کس کس کو دی تھی؟"

"کسی کو بھی نہیں۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "ہمارے یہاں رابطے کا نظام یک طرفہ ہے۔ مجھے کسی بڑے کا ٹھکانا معلوم نہیں ہے، جب بھی کوئی مجھ سے رجوع کرتا میں اسے لڑکی کے حصول سے باخبر کر دیتا۔ میں محض اسی دھوکے میں مارا گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید سی ون کو جیوا ہاؤز میں لڑکی کی موجودگی کی اطلاع مل گئی ہے اور اس نے اسی لیے بلایا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اب بھی وہیں ہے؟" میں نے مسرت اور سنسنی کے احساسات کو چھپاتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں، شاید تم نے کل شام کے اخبار نہیں دیکھے۔" اس کے جواب نے میری ہر خوشی پر اوس بکھیر دی۔ "میں نے پرسوں صبح لڑکی کو وہاں پہنچایا تھا اور کل صبح جیوا ہاؤز میں خوفناک آتش زنی ہوئی تھی، مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ عمارت ہی میں جل گئی یا زندہ بچا لی گئی۔"

اس انکشاف پر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ غزالہ کے زندہ جل مرنے کا تصور میری برداشت سے باہر تھا۔ پھر اسی لمحے مجھے جہانگیر سے ہونے والی گفتگو یاد آئی اور واقعات کی کڑیاں یکجا ہونے لگیں۔

لاہور سے میں نے جہانگیر کو فون کیا تو اس نے بتایا تھا کہ جیوا ہاؤز کے پھاٹک سے اندر گھسیٹی جانے والی لاش کے بارے میں پولیس نے سخت تفتیشی رویہ اختیار کیا ہوا تھا اور ایسے امکانات نظر آ رہے تھے کہ کہیں پولیس کسی وقت عمارت کی تلاشی لینے پر نہ تل جائے، جب کہ وہاں ایم تھری ہنڈرڈ کے متروک اپریٹس سمیت دوسرے بہت سے ایسے لوازمات موجود تھے، جن کے بارے میں پولیس حکام کو مطمئن کرنا ناممکنات میں سے تھا، لہٰذا اس خطرے کے پیشِ نظر سے ٹو نے جہانگیر کو حکم دیا تھا کہ جیوا ہاؤز میں اس طریقے سے آگ لگائی جائے کہ وہاں خاص طور پر گرین سلم کا ایک تنکا بھی نہ بچ سکے۔

یادداشت تازہ ہوتے ہی خیال آیا کہ جہانگیر کے بیان کے مطابق الیاس کے قتل اور فسادیں ملنے کے جرم میں جیوا ہاؤز کے دونوں ملازمین حراست میں لے لیے گئے تھے اور عمارت کسی نگرانی کے بغیر ویران پڑی ہوئی تھی، پھر سلام نے کوڈ کسے بتایا تھا اور وہاں کیسے داخل ہوا تھا؟

"وہ عمارت تو کم از کم پچھلے تین دن سے متروک پڑی ہے، پھر تم وہاں کیسے پہنچے تھے؟" اس بار میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"اس کا مجھے کوئی علم نہیں، میں پانچ دن پہلے کراچی آیا تھا، اسی وقت سی ون نے مجھے جیوا ہاؤز کے بارے میں بتایا تھا۔ اس کے بعد کوئی تبدیلی ہوئی ہو تو میں اس سے لاعلم ہوں۔"

"پھر اس ویران عمارت میں تم نے کوڈ کہاں استعمال کیا تھا؟"

"اس کی نوبت ہی نہیں آئی — جب ہارن بجانے پر کوئی نہ آیا تو میں میدان صاف پا کر دیوار سے اندر کود گیا، پھاٹک کھولا اور گاڑی اندر لے گیا، لڑکی بے ہوش تھی، اس لیے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔"

"یعنی تم اسے ویران عمارت میں ڈال آئے ہو؟"

"اندر کا قفل بھی مجھے مڑے ہوئے تار سے کھولنا پڑا لیکن میرے پاس اس شہر میں کوئی متبادل ٹھکانا نہیں تھا۔" اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ "میں زیادہ دیر تک اسے ساتھ لیے کر بھی نہیں گھوم سکتا تھا۔ مجھے عمارت کے چھوڑے جانے کا علم نہیں تھا، میں سمجھا کہ شاید محافظ مقررہ اوقات میں وہاں رہتے ہوں، باقی وقت یوں ہی ویران رہتی ہوگی۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ جو کچھ ہوا، بہت غیر متوقع طریقے سے ہوا تھا۔ زخشی نے سلام کو جیوا ہاؤز استعمال کرنے کی اجازت دے دی، اسے ٹو نے جہانگیر کو وہاں آگ لگانے کا حکم دے دیا۔ عمارت کے محافظ حراست میں تھے، سلام نے غزالہ کو وہاں بند کیا اور اگلے دن جہانگیر نے عمارت کو آگ لگا دی۔ اسے علم بھی نہ ہو سکتا ہوگا کہ ان شعلوں میں کوئی زندہ وجود بھی بھسم ہو گیا ہوگا۔ اگر وہاں محافظ ہی موجود ہوتے تو وہ جہانگیر کو بتا دیتے کہ عمارت میں کوڈ ورڈ کے سہارے ایک قیدی لڑکی لائی گئی ہے اور غزالہ شاید بچ جاتی۔

مجھ پر نقاہت سی طاری ہونے لگی۔ سلطان شاہ مجھے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ سلام کے بدن پر پٹرول چھڑک کر دیا سلائی دکھا دوں کیونکہ اس نے غزالہ کو جیوا ہاؤز میں نہیں بلکہ جلتی چِتا میں لے جا پھینکا تھا۔

"مجھے پیاس لگ رہی ہے، پانی پلا دو۔" کمرے میں سلام کی پھنسی پھنسی آواز اُبھری۔

"پانی پلانے کے بجائے کیوں نہ تمھیں آگ میں بھونا جائے۔" میں نے شکست اور غصے کے ملے جلے جذبات کے تحت دانت پیس کر کہا۔ "تم اس کے قاتل ہو، میں تمھیں معاف نہیں کروں گا۔"

"تمھارے لہجے سے خون کی بو آ رہی ہے، مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے مارنے کے بہانے تلاش کر رہے ہو اور ہرگز زندہ نہیں چھوڑو گے لیکن میری سب اطلاعات سچی ہیں۔ آگ لگنے کی خبر شام کے اخباروں میں آئی تھی، اس کی تفصیل صبح کے اخباروں میں ہوگی، ہو سکتا ہے کہ وہ بچا لی گئی ہو۔"

اس کی بات معقول تھی، میں جانے کے لیے پلٹا تو اسی وقت سلطان شاہ آ موجود ہوا۔ اس کے ہاتھ میں تازہ اخبار دبا ہوا تھا۔

"بہت بھیانک آگ لگی تھی جیوا ہاؤز میں۔" اس نے بتایا۔ "لیکن اخبار کے مطابق عمارت ویران پڑی ہوئی تھی لہٰذا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا، ہو سکتا ہے کہ بھابی کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا ہو۔"

"نہ وہ ناسمجھ ہے، نہ یہ شہر اس کے لیے اجنبی۔" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "اگر وہ بچ ہی نکلی تھی تو اب چوبیس گھنٹے پورے ہونے والے ہیں، وہ گھر کیوں نہیں پہنچی؟ تم جیوا ہاؤز سے واقف نہیں ہو، وہ بھی کمروں اور تہہ خانوں کی ایک بھول بھلیاں ہے، جب تک ملبہ پوری طرح صاف نہیں ہوگا، کچھ معلوم نہیں ہو سکے گا۔"

"میں نے تمھیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے، میری ہڈیاں تک دُکھنے لگی ہیں، اب تو مجھے جانے دو۔" سلام فرش سے اُٹھتے ہوئے بولا تو اس کی حالت اس قدر ابتر تھی کہ مجھے شدید نفرت کے باوجود جھرجھری سی آ گئی۔ خون آلود فرش پر کھڑا ہوا اس کا زخموں سے چُور چُور ہیولا کسی بھی طرح قابلِ شناخت نہیں رہا تھا۔ یہ شاید اس کی قوتِ ارادی ہی تھی کہ اس قدر خون بہہ جانے کے باوجود وہ اپنے قدموں پر اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور ہوش و حواس کی باتیں کر رہا تھا۔

"فی الحال تم اسی کمرے میں قید رہو گے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں اسے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ "جب تک تمھارے بیان کی تصدیق نہ ہو، تم کو رہا نہیں کیا جا سکتا۔"

اس نے بہتیری خوشامدیں کیں لیکن میں نے اس کی ایک

نہ سنی اور اسے وہیں مقفل کر کے ہم دونوں ڈرائنگ روم میں آگئے جہاں کرنل ایک صوفے پر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا رہا؟" اس نے میری آہٹ پاتے ہی بے تابانہ لہجے میں سوال کیا۔

"کچھ سراغ تو ملا ہے۔" میں نے کسی قسم کی گرمجوشی کا اظہار کیے بغیر کہا "لیکن ابھی تک صورتِ حال واضح نہیں ہے۔"

"کیا اس نے زبان کھولی ہے؟"

"عزالہ کو اسی نے اغوا کیا تھا۔" میں نے بات مختصر کرنے کی نیت سے کہا "لیکن یہ معلوم نہیں کہ اب وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ وہ فی الحال یہیں قید رہے گا، ہم عزالہ کا کھوج لگائیں گے۔"

"تم دونوں نے اس کا حشر خراب کر دیا ہے۔" کرنل نے کہا "اسے مار ڈالتے تو شاید ملال نہ ہوتا لیکن ایسا بھیانک تشدد میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔"

میں برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ اسے کیا بتاتا کہ تشدد کے بغیر سلام ایک لفظ بھی اُگلنے پر آمادہ نہ ہوتا۔

سلام سے جو کچھ معلوم ہونا تھا، وہ معلوم ہو چکا تھا۔ اب سارے معاملے کی کلید جہانگیر کے پاس تھی جس نے جیوا ہاؤز میں آگ لگائی تھی۔ میں نے فون پر نمبر ملایا تو دوسری طرف سے سلمیٰ کی آواز سُنائی دی۔ میں نے جہانگیر کے بارے میں... دریافت کیا تو وہ میری آواز پہچانتے ہی چہکنے لگی۔

"میں تو خوش ہو گئی تھی کہ تمھیں اپنا وعدہ یاد رہا اور تم نے میرے لیے فون کیا ہے۔"

"میں اس وقت پریشان ہوں سلمیٰ!" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "جہانگیر کہاں ملے گا؟ اس سے مجھے بہت ضروری بات کرنا ہے۔"

"پتا نہیں کہاں ہوں گے۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولی تھی "مجھے تو تم دونوں ہی پیدائشی پریشان نظر آتے ہو، اگر ہو سکے تو فوراً یہاں آجاؤ، تمھارے دوست کے ایسے کرتوت دکھاؤں گی کہ طبیعت صاف ہو جائے گی۔"

"سلمیٰ پلیز!" میں نے سخت لہجے میں کہا "آپس کے جھگڑوں کو اپنے تک محدود رکھو، مجھے اس میں ملوث کرنے کی کوشش نہ کرو، دوستی کا مطلب ذاتی مسائل میں دخل اندازی کرنا نہیں ہوتا۔ جہانگیر کا فون آئے تو معلوم کر لینا کہ وہ کہاں مل سکے گا۔ مجھے ناکامی ہوئی تو تھوڑی دیر بعد پھر فون کروں گا۔"

"ان کا فون آنے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ کل سے ہماری بول چال بند ہے۔ میں پھر کہہ رہی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے آجاؤ ورنہ ایک بہترین تماشے سے محروم رہ جاؤ گے۔"

میں نے جواب دیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کی جہانگیر سے ٹھنی ہوئی تھی اور وہ اس کی غیر حاضری میں مجھے گھر بلانا چاہ رہی تھی۔ اس وقت تو خیر میں پراگندہ خاطر تھا، اگر پُرسکون بھی ہوتا تو اس کی دعوت ہرگز قبول نہ کرتا کیونکہ اس کی رفاقت سے جہانگیر کی دوستی مجھے بدرجہا عزیز تھی۔

میں ہر اس نمبر پر رِنگ کرتا رہا جہاں جہانگیر کے ملنے کے ذرا بھی امکانات تھے لیکن اس کا پورے شہر میں کہیں پتا نہیں تھا۔ نمبر ختم ہو گئے اور میں تھکے ہوئے انداز میں سگریٹ سُلگانے لگا۔

پھر اچانک ہی مجھے رخشی کا خیال آیا۔ جہانگیر کی اپنی بیوی سے ان بن تھی اور اتنی شدید کہ...... دونوں الگ الگ کمروں میں رہ رہے تھے۔ دوسری طرف رخشی کے سی ون بننے کے بعد دونوں میں نیا نیا تعارف ہوا تھا۔ ایک طرف جہانگیر بیوی کا ندیدا واقع ہوا تھا تو دوسری طرف مردوں کے بارے میں رخشی کا رویہ بلا امتیاز حوصلہ افزا ہی ہوا کرتا تھا۔ اس معاملے میں اس کا کوئی خاص معیار نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ کہیں جہانگیر اپنی کوفت دُور کرنے اسی طرف نہ نکل گیا ہو۔

میرے پاس رخشی کا نمبر نہیں تھا، لہٰذا میں کرنل کو قیدی کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ہدایت دے کر سلطان شاہ کے ساتھ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

"کیوں نہ جیوا ہاؤز کی طرف سے ہوتے چلیں۔" سلطان شاہ نے رائے دی۔

"بے سُود ہو گا، میں جلد از جلد جہانگیر سے ملنا چاہ رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ وہ اسٹون ہاؤس میں رخشی کے پیر چاٹ رہا ہو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم اس علاقے میں پہنچے تو اسٹون ہاؤس کے عقبی راستے کے قریب پارک کی ہوئی جہانگیر کی سیاہ بلٹ پروف کار دُور ہی سے نظر آگئی۔

"تمھارے قیاس کی داد دینا پڑے گی۔" سلطان شاہ نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "تم واقعی اس کی رگ رگ کو پہچانتے ہو۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ اسے اندر سے کیسے نکالا جائے۔" میں نے فکرمندانہ لہجے میں کہا "میں اندر گیا تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"تم اگلے پھاٹک کی طرف مجھے اُتار دو۔" وہ سوچتے ہوئے بولا "وہ حصہ تو استعمال ہی نہیں ہوتا، میں اندر گھس کر کوئی چکر چلاتا ہوں، شاید وہ بوکھلا کر نکل ہی بھاگے۔"

"اس معاملے میں بہت ڈھیٹ ہے، رخشی کی خاطر کے بہانے یہیں جما رہے گا۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"اور تمھارا کیا ہو گا؟"

"جہانگیر باہر نکلے تو تم اسے گھیر لینا، میں فارغ ہو کر سیدھا گھر چلا جاؤں گا۔"

ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کوئی ترکیب آزمانا ہر طرح سُودمند تھا لہٰذا میں نے چکر کاٹ کر سلطان شاہ کو اسٹون ہاؤس کے مین گیٹ سے ذرا دُور اُتار دیا اور گلی سے ہو کر دوبارہ عقبی سمت میں پہنچ گیا۔ اس بار میں نے اپنی کار جہانگیر کی بلٹ پروف سے خاصی دُور اس طرح کھڑی کی تھی کہ فوری طور پر تعاقب کے آغاز میں کوئی دُشواری نہ ہو۔

مجھے انتظار کرتے بمشکل پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ فٹ پاتھ پر جہانگیر عجلت کے عالم میں اپنی کار کی طرف بڑھتا نظر آیا اور چند ہی ثانیوں میں اس کی کار برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور میں دل ہی دل میں سلطان شاہ کی نامعلوم ترکیب کی داد دیتا اس کے پیچھے ہو لیا۔

تعاقب کا سلسلہ ہوٹل میٹرو پول کے سگنل تک جاری رہا، جہاں ہماری سمت کی بتی سرخ تھی اور میں اپنی کار جہانگیر کے پہلو میں لے گیا۔ میرے ہارن بجانے پر اس نے سر گھمایا اور مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

"میرے پیچھے چلے آؤ۔" میں نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا اور وہ فوراً ہی راضی ہو گیا۔

سگنل کی بتی سبز ہوئی تو میں سیدھا پی آئی ڈی سی ہاؤس کی طرف ہو لیا۔ وہاں ایک خالی جگہ پر کار پارک کر کے میں نے دروازے مقفل کیے اور جہانگیر کی کار کی طرف بڑھ گیا۔

میں اس کے پہلو والی نشست پر بیٹھا تو اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔

"بہت خوش ہو، کہاں سے آ رہے ہو؟" میں نے سلمت آمیز انداز میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔

"قدرت واقعی بہت مہربان ہوتی ہے، گھر میں نحوست منڈلانے لگے تو باہر تفریح کا کوئی بندوبست ہو جاتا ہے، سی ون کے پاس سے آ رہا ہوں۔ اس قدر خوش مزاج اور ہم خیال عورت میں نے پہلی بار دیکھی ہے۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ اس کے حُسن میں زہر بھی پوشیدہ ہے۔"

"رہ رہ کر تمھاری وہی بات یاد آجاتی ہے اور عین موقع پر پیش قدمی کی ہمت ختم ہو جاتی ہے ورنہ وہ تو مجھے بے حد پسند کرنے لگی ہے۔ بات بات پر ریشہ خطمی ہوئے جاتی ہے۔"

"وہاں کیوں گئے تھے؟"

"ایک بڑی اُلجھن میں پڑ گیا ہوں۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "اسی سلسلے میں رخشی سے مشورے کی نیت سے گیا تھا لیکن کام کی بات شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں گڑبڑ ہو گئی اور مجھے بھاگنا پڑ گیا۔"

"کیسی گڑبڑ؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"گھر میں کچھ آہٹیں سی سُنائی دی تھیں، رخشی کو شبہ ہے کوئی چھپ کر اس کی نگرانی کرتا ہے۔ کل رات کسی نامعلوم آدمی نے اس کے چوکیدار کو بھی مار دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی وجہ سے کہیں میں عتاب میں نہ آجاؤں، اسی لیے خاموشی سے نکل آیا۔"

"جیوا ہاؤز کو بھی جلا ہی دیا تم نے؟" میں نے تھوڑے توقف کے بعد اپنے مطلب کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"وہیں سے تو ساری اُلجھن شروع ہوئی ہے۔" اس نے کہا اور میں چونکتا ہو کر بیٹھ گیا۔

"وہ کیسے؟"

"عمارت ویران اور مقفل پڑی ہوئی تھی، میں نے آگ لگانے کے لیے ہر طرف پٹرول بہانا شروع کیا تو شاید اسی کی بُو سے خوفزدہ ہو کر اندر سے کسی نے مدد کے لیے چلانا شروع کر دیا۔ میری عقل چکرا کر رہ گئی کہ بند کمروں میں عورت کہاں سے گھس پڑی؟" وہ اپنی رو میں بولے جا رہا تھا اور میرا دل فرطِ جوش سے کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔ "دروازہ کھول کر اندر گھسا تو ایک بے حد حسین لڑکی سہمی ہوئی کھڑی تھی اور ہو بہو وہی تھی جس کی اسے ٹو کو تلاش ہے۔ مجھے چند ہی روز پہلے اس کی تصویر بھیجی گئی تھی۔ میں نے لڑکی سے بازپرس کرنا چاہی تو اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اسی جدوجہد میں نجانے کیسے ماچس اس کے ہاتھ لگ گئی پھر جوں ہی میں فرش پر پھیلی ہوئی پٹرول کی چادر میں پھنسا اُس نے دیا سلائی جلا کر اچھال دی۔ بس زندگی ہی تھی جو میں آگ کی چادر پھاند کر نکل آیا۔ وہ بھی زیادہ دور نہ جا سکی۔ اسے بے ہوش کر کے میں نے گاڑی میں ڈالا اور غلطی یہ کی کہ اسے بوکھلاہٹ میں سیدھا گھر لے گیا بس جب ہی سے گھر کی فضا خراب ہے۔ سلمیٰ سخت ناراض ہے اور کئی بار مجھے بردہ فروشی کے طعنے دے چکی ہے۔"

"اور لڑکی کہاں ہے؟" میں نے اپنی بے پایاں مسرت کو سرگوشی میں چھپاتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ میرے گھر ہی کے ایک کمرے میں قید ہے۔ کچھ اُگل کر نہیں دیتی اور میں اس مخمصے کا شکار ہو گیا ہوں کہ اسے اُلّو کے حوالے کروں یا نہ کروں کیونکہ صورت سے بے چاری بہت معصوم لگتی ہے۔ یہ تک بتانے کو تیار نہیں کہ جیوا ہاؤز کیسے پہنچی تھی۔"

"کار اسٹارٹ کرو اور فوراً گھر چلو۔" میں نے اضطراری انداز میں اس کا شانہ دباتے ہوئے کہا۔

"اور تمھاری گاڑی؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"چلو، جلدی چلو، وہ بعد میں لے لی جائے گی۔" میں نے بے تابانہ لہجے میں کہا اور اس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر جھٹک کر اگنیشن آن کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"آخر اس لڑکی میں یک بیک تمھیں کیوں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے؟" اس نے اپنی کار ٹریفک کی قطار میں داخل کرتے ہوئے پوچھا۔

"گھر پہنچ کر بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ اس بارے میں رخشی سے کیا بات ہوئی؟"

"بتایا تو کہ بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آسکی۔" اس نے تنک کر کہا۔ "مجھے نظر آ رہا ہے کہ فوری طور پر لڑکی کا کوئی بندوبست نہ کیا تو سلمٰی بیگم مجھے پورے خاندان میں بدنام کر کے میکے جا بیٹھیں گی۔"

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ سلطان شاہ نے اس مردود کو بروقت رخشی کے گھر سے نکال بھگایا تھا۔ اگر اس معاملے میں تاخیر کے باعث وہ خبر رخشی تک پہنچ جاتی تو صورتِ حال قابو سے باہر ہو جاتی۔

جہانگیر کی سبک رفتار کار میں ہم جلد ہی اس کے گھر پہنچ گئے۔

"سلمٰی سے سامنا ہو تو ذرا اسے سنبھال لینا، کل سے بہت خراب موڈ میں ہے۔" اس نے گاڑی پورچ میں لے جاتے ہوئے کہا اور میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس وقت مجھے اس کی خانگی زندگی یا سلمٰی سے زیادہ غزالہ کی فکر تھی۔

وہ مجھے ساتھ لے کر راہداری سے ہوتا ہوا ایک طرف مڑا اور پھر ایک کمرے کے سامنے پہنچتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار تحیر آمیز آواز نکلی "نکل گئی!"

میں نے بڑھ کر دیکھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر کوئی بھی نہیں تھا۔

میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا ناچنے لگا۔

"**نکل** گئی سونے کی چڑیا۔" اچانک عقب سے سلمٰی کی زہریلی آواز سنائی دی اور میرے ساتھ ہی ساتھ جہانگیر بھی چونک کر اسی طرف گھوم پڑا۔ سلمٰی راہداری کے کونے پر کمر پر ہاتھ رکھے تضحیک آمیز نگاہوں سے جہانگیر کو گھور رہی تھی۔

جہانگیر اپنی بیوی سے ڈرتا بھی تھا لیکن اس وقت سلمٰی کے اس جلے کٹے تبصرے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ دانت پیستا ہوا پھاڑ کھانے والے انداز میں اس کی طرف جھپٹا۔

"بتاؤ، کہاں گئی وہ؟" اس نے غراتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے کیا معلوم۔" وہ گردن جھٹک کر اس کے تیوروں کا اثر لیے بغیر بے پروایانہ لہجے میں بولی۔ "جہاں سے اٹھا کر لائے تھے، موقع پا کر وہیں چلی گئی ہو گی۔ مقدر کی اچھی تھی ورنہ تمھارے ہاتھوں نہ جانے کیا کیا ذلّت اٹھانا پڑتی اسے۔"

"میں پوچھتا ہوں کہ دروازہ باہر سے مقفّل تھا، اسے کس نے کھولا؟" جہانگیر کے لہجے میں غصے کے ساتھ بے بسی بھی سمٹ آئی۔

"نشے میں تھے۔ تمھیں بند اور کھلے کا ہوش کہاں رہا ہو گا۔" اس نے ترکی بہ ترکی طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آئندہ ذرا احتیاط رکھنا ورنہ یہ کاروبار کامیابی سے نہ چلا سکو گے۔"

جہانگیر یوں جھپٹا جیسے اس پر ہاتھ چھوڑ بیٹھے گا لیکن میں نے لپک کر اسے تھام لیا۔ "احمق نہ بنو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا اب اپنے گھر کی فضا برباد نہ کرو۔ ہمیں سکون سے بیٹھ کر بات کرنا چاہیے۔"

"نہیں نہیں۔ تم انھیں چھوڑ دو۔" سلمٰی غضبناک لہجے میں بولی۔ "بس یہی ایک کسر رہ گئی تھی کہ کبھی مار نہیں کھائی تھی۔ آج انھیں یہ ارمان بھی پورا کرنے دو۔ جو دوسروں کی بہن بیٹیوں کو بیچنے کے لیے اٹھا سکتا ہے اس کے لیے اپنی بیوی کو مارنا کوئی کمال نہیں ہو گا۔"

ان دونوں ہی کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے غبار بھرا ہوا تھا اور یہ آثار بتا رہے تھے کہ ان کی بحث آناً فاناً میں سنگین رخ اختیار کر سکتی تھی لہٰذا مجھے بادلِ ناخواستہ زیادہ سرگرمی دکھانا پڑی کیونکہ اُن کے باہمی مراسم کی سرد مہری سے میں اچھی طرح واقف تھا اور جانتا تھا کہ ان کے اختلافات دور کرانا میرے بس سے باہر ہے لیکن اس وقت میں چند ثانیوں کی مہلت حاصل کر کے سلمٰی سے غزالہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں بھابی سے بات کرتا ہوں۔" میں نے جہانگیر کو سمجھاتے ہوئے کہا اور وہ تھوڑی سی بحث کے ساتھ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی سلمٰی کے خشمناک چہرے پر بشاشت چھاتی چلی گئی۔ اور اس کی نگاہوں میں شوخ اور فاتحانہ سی مسکراہٹ ناچنے لگی۔ "یہ تم نے اچھا کیا کہ انھیں چلتا کر دیا۔"

"وہ تمھارا مجازی خدا ہے۔" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمھیں اس کے ساتھ ایسا رویّہ زیب نہیں دیتا۔"

"مجازی خدا بردہ فروش بن جائے تو بھنگی بن کر رہ جاتا ہے... چھوڑو یہ قصہ کہاں لے بیٹھے۔ تم نے تو آج ان کی موجودگی ہی میں مل بیٹھنے کا موقع نکال لیا۔ میں بُلا رہی تھی تو ٹالے جا رہے تھے۔"

"تمھارے ساتھ مجھے جہانگیر کی دوستی بھی عزیز ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اگر اسے علم ہو جائے کہ میں اس کی لاعلمی میں تم سے ملتا ہوں تو ہماری دوستی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ بس اسی لیے آنے سے گریز کرتا ہوں۔"

"وہ لڑکی کل سے یہاں قید تھی۔ خوف اور دہشت سے اس کی خوبصورتی گہنا کر رہ گئی تھی۔ میں تمھیں بُلا کر اسی سے ملوانا چاہ رہی تھی تاکہ تم اپنی نگاہوں سے اپنے دوست کے کرتوت دیکھ سکو۔"

"لیکن وہ گئی کہاں؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "وہ کچھ بتانے کو تیار ہی نہیں تھی۔ ہر وقت خوفزدہ اور سہمی ہوئی رہتی تھی۔ آج جہانگیر اپنی پینک میں چابی ڈریسنگ ٹیبل پر بھول گئے اور میں نے اسے آزاد کر دیا۔"

"تم نے اسے کس وقت رہا کیا تھا؟"

"خاصی دیر ہو گئی۔ اب تک تو وہ نجانے کہاں پہنچ چکی ہو گی، تمھارے ہاتھ ہرگز نہ آسکے گی۔" اس کا لہجہ بدستور فتحمندانہ تھا۔

"لیکن یہ تو بتاؤ کہ وہ کون تھی اور جہانگیر نے اسے کہاں سے اٹھایا تھا؟"

"وہ ایک شریف لڑکی ہے، جہانگیر نے اسے اغوا نہیں کیا تھا بلکہ اس کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اسے یہاں نہ اٹھا لاتا تو وہ شاید شعلوں میں جل کر بھسم ہو جاتی۔"

"کہانی سنا کر بہلا رہے ہو؟" وہ دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ارے باپ رے!" میں نے بوکھلا کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جہانگیر نے تمھاری یہ مسکراہٹ دیکھ لی تو بے دریغ مجھے گولی مار دے گا۔ اپنا نہیں تو میرا ہی کچھ خیال کرو۔"

"میں بیوی ہو کر اُن سے ٹکر لیتی ہوں اور تم دوست ہو کر اتنا ڈرتے ہو۔" اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے کمرے میں چلو وہیں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔"

"پھر کبھی آؤں گا۔" میں نے دھیمے مگر حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "اس وقت جہانگیر بھڑک گیا تو تمھاری جھنجلاہٹ مجھ پر اتار بیٹھے گا۔ تمھارے پاس اسے سنانے کے لیے کوئی کہانی بھی تو نہیں۔"

"کہانی کہاں سے بنتی؟ وہ تو شاید کچھ نہ بتانے کی قسم کھائے بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی یوں اچٹ کر بھاگی کہ میں زیادہ مزاحمت کرتی تو وہ میرے ساتھ بھی مار پیٹ کر بیٹھتی۔"

اس سے بمشکل گلو خلاصی حاصل کر کے میں جہانگیر کے پاس پہنچا تو وہ بستر پر پڑا غصّے میں کھول رہا تھا۔ اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد میں نے ٹھنڈا رہنے کی تلقین کی تو وہ مجھ سے بھی اُلجھ پڑا۔

"مجھے تو تمھاری نیّت میں بھی فتور نظر آ رہا ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں بولا اور میرے دل کی دھڑکنیں بے اختیار تیز ہوتی چلی گئیں۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ کہیں اُس نے سلمٰی کی کوئی بات نہ سُن لی ہو۔

"کیسا فتور؟ کیا پاگل ہو گئے ہو؟" میں نے کھوکھلے انداز میں اُس کی بات اڑانے کی کوشش کی۔

"تم اس لڑکی کے بارے میں کیوں بے چین تھے؟" اس نے غراتے ہوئے سوال کیا اور میں نے دل ہی دل میں اپنے خدشات کی تردید پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔

"میں اُس سے صرف اس لیے ملنا چاہ رہا تھا کہ اُلّو ابھی تک اسے میری ساتھی سمجھ رہا ہے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس کے لیے اور کیا کام کر رہی ہے لیکن تم نے عاقبت نااندیشی سے یہ موقع ضائع کرا دیا۔"

"اور اب تم سارے شہر میں میری نااہلی کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرو گے؟" اس کے جارحانہ لہجے میں تشویش بہرحال نمایاں تھی۔ کیونکہ وہ ابھی تک اُلّو کے سحر میں گرفتار تھا اور اس امر سے خائف تھا کہ اگر اُلّو کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کو مطلوب لڑکی پکڑے جانے کے باوجود جہانگیر کی تحویل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تو وہ جہانگیر کے لیے کوئی معقول سزا بھی تجویز کر سکتا تھا۔

"میں کہاں ڈھنڈورا پیٹوں گا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "تمھیں معلوم ہے کہ اپنے بڑوں سے مخاصمت مول لینے کے بعد میں بہت ہی محدود زندگی گزار رہا ہوں۔ پھر میں کہیں زبان کھول بھی بیٹھا تو تمھارا کیا بگڑ جائے گا؟"

"تم بھول رہے ہو کہ وہ لڑکی اُلّو کو شدت سے مطلوب ہے۔ اگر اسے بھنک بھی مل گئی کہ وہ میری غفلت سے فرار ہوئی ہے تو وہ میری کھال اُدھڑوا دے گا۔ ابھی تک تم اس لڑکی کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکے ہو۔"

"اگر یہ بات اسی قدر سنگین ہے تو میرے چپ رہنے یا نہ رہنے

سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟" اس نے بدک کر سوال کیا۔

"تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ وہ تمھاری لاعلمی میں جیوا ہاؤز پہنچائی گئی تھی۔" میں نے اُسے یاد دلایا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بستر سے اُٹھ گیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ نقاہت آمیز اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "تم لوگوں سے الگ ہونے سے میں بالکل یتیم ہو کر رہ گیا ہوں۔ اس بارے میں تو میں نے کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ جانے اس کو کس نے جیوا ہاؤز پہنچایا تھا؟"

"اگر تم اس سے لاعلم ہو تو وہ یقینی طور پر لے ٹو کا فرستادہ رہا ہوگا اور اس نے لڑکی کو جیوا ہاؤز پہنچانے کے بعد لے ٹو کو اپنی کارگزاری سے باخبر کر دیا ہوگا۔" میں نے اس کی نبض کی رفتار تیز تر کرانے کی نیت سے کہا۔

"میں تو بے موت مارا گیا۔" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں کراہا۔ "میرے لیے جوابدہی مشکل ہو جائے گی، تم اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو۔"

میں کچھ دیر تک پُرخیال انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس دوران میں جہانگیر کی حالت لمحہ بہ لمحہ پتلی ہوتی چلی گئی پھر آخر میں نے ہی سکوت توڑا۔

"لڑکی تمھیں آتش زنی کے دوران ملی تھی۔ تم اس قصے کو سرے ہی سے گول کر جاؤ۔ یہی سمجھا جائے گا کہ لڑکی آگ سے بوکھلا کر خود ہی نکل بھاگی تھی۔"

"بچت کی یہ پہلی اور آخری صورت ہے۔" وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھاری کھوپڑی کس چیز سے بنی ہوئی ہے جو ہر بات بروقت سوچ لیتے ہو۔"

میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اسے اپنی کھوپڑی کی ساخت سے آگاہ کرتا لہٰذا میں گفتگو کو اختصار دے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں غزالہ سمائی ہوئی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ جہانگیر کے گھر سے فرار ہو کر کہاں گئی ہوگی؟ میں جلد از جلد اس تک پہنچ کر اس کی کہانی سننے کے لیے بے چین تھا۔ اس سے پہلے میرے لیے کوئی اور کام کرنا بظاہر ناممکن نظر آ رہا تھا۔

جہانگیر کے گھر سے نکل کر میں نے ٹیکسی پکڑی تا کہ پی آئی ڈی سی ہاؤس کے قریب پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوئی گاڑی حاصل کر سکوں۔ گاڑی لے کر میں غزالہ کے گھر پہنچا تو وہاں کی سوگوار فضا میں خوشگوار تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔

سلطان شاہ سمیت وہ سب ڈرائنگ روم میں موجود تھے اور غزالہ کو اغوا کرنے والا اسی گھر کے ایک کمرے میں مقید تھا، لیکن غزالہ کو شاید اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اضطراری طور پر اپنی جگہ سے اُٹھ کر دو قدم آگے بڑھی تھی مگر پھر ٹھٹک کر وہیں رُک گئی کیونکہ دوسروں کی موجودگی میں کسی قسم کا جذباتی ردِعمل ہمارے معاشرے میں بالعموم پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔

غزالہ کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔ اس کی سُرخ اور ورم آلود آنکھیں طویل بے خوابی کی کہانی سُنا رہی تھیں لیکن مجھے اس کے باوجود اس کے چہرے پر عجیب سے اعتماد کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ بیٹے!" کمرے کی بوجھل فضا میں شمع کی نقاہت زدہ آواز اُبھری۔ "خدا کا شکر ہے کہ غزالہ صحیح سلامت گھر لوٹ آئی۔ نہ جانے وہ کون بدبخت تھے جنھوں نے اسے قید کیا ہوا تھا۔"

میرے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ تیر گئی اور میں غزالہ سے مخاطب ہو گیا۔ "بیٹھ جاؤ۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کہاں سے اور کیسے آ رہی ہو۔ ذرا سی دیر نہ ہو جاتی تو تم سے وہیں ملاقات ہوتی۔"

"کہاں؟" اس نے تحیّر زدہ لہجے میں سوال کیا۔ "کیا آپ وہاں پہنچ گئے تھے؟"

"تمھیں راستے سے اغوا کر کے جیوا ہاؤز پہنچانے والا کامران کے کمرے میں قید ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔ "میں نے تمھیں تاکید کی تھی کہ گھر سے باہر نہ نکلنا مگر تم خود اعتمادی میں مار کھا گئیں۔ یہ غنیمت ہوا کہ سلام نے تمھیں براہِ راست لاہور پہنچانے کے بجائے جیوا ہاؤز میں چھوڑ دیا اور وہاں سے تم جہانگیر کے ہاتھ لگ گئیں۔۔۔"

"اوہ! تو وہ جہانگیر تھا؟" غزالہ نے میری بات کاٹ کر حیرت زدہ انداز میں کہا۔ "جب ہی اس نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بس قید کر کے یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کس کے لیے کام کر رہی ہوں۔"

"میرے اور تمھارے تعلق کا اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے۔ وہ بس اپنی بیوی سے ڈرتا ہے اسی لیے تم اس کی زیادتیوں سے بچی رہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں سلمٰی نے قفل کھول کر تمھیں فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا ورنہ اس وقت میں وہاں بیٹھا تمھاری رہائی کے لیے مذاکرات کر رہا ہوتا۔"

"آپ پوری طرح باخبر ہیں۔" وہ کھلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "میں تو سمجھ رہی تھی کہ میں نے اپنی کوششوں سے فرار کا کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"جاؤ پہلے تم نہا دھو کر اپنا حلیہ درست کرو۔" کرنل نے دخل انداز ہوتے ہوئے کہا۔ "تمھاری حالت ابتر ہو رہی ہے۔"

"پہلے میں اس قیدی کو دیکھنا چاہتی ہوں جس نے مجھے راستے سے اغوا کیا تھا۔" وہ اپنے باپ سے بولی۔ "اس نے مجھے اتنی پھرتی کے ساتھ بے ہوش کر کے گاڑی میں ڈالا کہ میں آواز تک نہ نکال سکی۔ میں جب تک اسے اپنے ہاتھوں سے جوتیاں نہیں ماروں گی، مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"وہ کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔" میں نے کہا۔ "تم شاید بھوکی بھی ہو۔"

"ہاں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "جہانگیر نے مجھے کھانا اور ناشتا فراہم کیا تھا لیکن میں نے اسے ہاتھ تک نہ لگایا۔ مجھے ڈر تھا کہ کھانے میں کہیں خواب آور دوا نہ ملی ہوئی ہو۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تو سلطان شاہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "اب کیا پروگرام ہے؟"

"یہ مسئلہ تو خلافِ توقع بہت آسانی سے نمٹ گیا۔۔۔ اس معاملے میں رخشی نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔ اگر وہ زبان نہ کھولتی تو سلام کا ہاتھ آنا ناممکن تھا۔" اس اثنا میں کرنل بھی اپنی بیوی کو وہاں سے اٹھا لے گیا۔

"میں اسی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو وہ جلد یا بدیر غزالہ کے اغوا کی کہانی اوپر والوں تک پہنچا دے گا۔۔۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس معاملے میں جہانگیر کا نام بھی ملوث ہو جائے گا۔ اسے میں نے مشورہ دیا ہے کہ وہ غزالہ کے بارے میں لاعلمی ظاہر کر لے۔ اس طرح یہی سمجھا جائے گا کہ قیدی لڑکی جیوا ہاؤز میں آتش زنی کے بعد خود ہی فرار ہو گئی ہو گی۔"

"پھر میں لے جاؤں اسے؟" سلطان شاہ نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ "کہاں لے جاؤ گے؟"

"شہر کے مضافات میں بہتیرے ویران مقامات ہیں۔"

پھر ہم دونوں سلام کے بارے میں جزئیات طے کرنے لگے۔

غزالہ نہا دھو کر لباس تبدیل کر کے آئی تو معمولی سی کمزوری کے سوا اغوا اور قید کی صعوبتوں کے سارے آثار اس کے چہرے سے مفقود ہو چکے تھے۔ اور اس کے بشرے پر پہلے جیسی رعنائی بحال ہو چکی تھی۔

"بہت پریشان کیا ہے تم نے ہم سب کو۔" میں نے اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اگر جیوا ہاؤز کو آگ لگانے کی مجبوری آڑے نہ آ گئی ہوتی تو اس وقت تم نہ جانے کہاں ہوتیں۔"

"سارا فتور ٹیکسی کی خرابی سے پیدا ہوا تھا۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ "ہونے والی بات ہر صورت میں ہو کر رہتی ہے ورنہ کیا ضروری تھا کہ جب ٹیکسی خراب ہوئی اسی وقت وہ شخص ادھر آ نکلا۔"

"اور میرے خیال میں فساد کی بنا تم نے اس وقت ڈالی جب میرے مشورے کو نظر انداز کر کے تم نے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی لیے بڑوں کی بات ماننے پر زور دیا جاتا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا پھر وہاں سے اُٹھ گیا۔ سلطان شاہ ہمارے ساتھ تھا۔

سلطان شاہ نے کامران کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر کوئی نظر نہ آیا اور میری استفسار طلب نگاہیں بے اختیار سلطان کی طرف اٹھ گئیں۔

"وہ شاید دروازے کی اوٹ میں پڑا ہوگا۔" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "صبح میں نے دروازہ کھول کر ناشتا دیا تو اس کی حالت بہت ابتر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ بے ہوش ہی ہو گیا ہو۔"

"چلے آؤ، میں ابھی زندہ ہوں۔" اندر سے اس کی کانپتی ہوئی کمزور آواز ابھری اور ہم تینوں اندر داخل ہو گئے۔

وہ دروازے کے پیچھے گدے پر زخموں کی گٹھری کی صورت میں سُکڑا سمٹا ہوا نظر آیا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی غزالہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ قیدی نے گردن اُٹھا کر ورم آلود نیلے پپوٹوں میں جھری پیدا کر کے ہماری طرف دیکھا اور غزالہ کو دیکھتے ہی اس کے اُدھڑے ہوئے چہرے پر سکون کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"خدا کا شکر ہے کہ یہ مل گئی۔" وہ کراہتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "شاید اب میری گلو خلاصی ہو جائے گی۔"

"ہم تمھاری گلو خلاصی ہی کرانے آئے ہیں۔" سلطان شاہ نے کہا۔ "روانگی کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

وہ لڑکھڑاتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"تم اسے چھوڑ کر آؤ۔ ہم تمھارے منتظر ہیں۔" میں نے سلطان شاہ سے کہا اور غزالہ کو لے کر وہاں سے نکل آیا۔

"سلطان شاہ اسے کہاں لے جا رہا ہے؟" کمرے سے نکل آنے کے بعد غزالہ نے اشتباہ آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"شہر میں کہیں بھی چھوڑ آئے گا۔" میں نے اسے ٹالنے کی نیت سے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ بولی۔ "اب میں بھی اسے خوب سمجھنے لگی ہوں۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت وحشیانہ چمک کوند رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

"ایسا فیصلہ کر بھی چکے ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ یہ سب تمھارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔"

"اسے زندہ چھوڑنے میں کیا قباحت ہے؟" اسے شاید کوئی خلش ستا رہی تھی۔

"قباحت صرف اتنی سی ہے کہ وہ یہ گھر دیکھ چکا ہے۔

لاہور سے آیا ہوا اسے ٹو کا خاص کارندہ ہے۔ آج زخمی اور قابلِ رحم نظر آرہا ہے کل ذرا سی جان پکڑے گا تو پوری کہانی اوپر والوں تک پہنچا دے گا۔ اگر آنے والی تمام دشواریوں سے نمٹنے کے لیے تیار ہو تو پھر اسے ابھی رہا کیے دیتے ہیں۔ زندگی بھر ہماری اس حماقت کو دعا دیتا رہے گا۔"

"یہ صرف میری وجہ سے مارا جائے گا۔" وہ اُداس لہجے میں بولی۔

"تمھاری وجہ سے نہیں بلکہ اپنی جسارت کی بنا پر مارا جائے گا۔ اس کی نشاندہی رخشی نے کی تھی کیونکہ قاسم کی موت کے بعد اس کا منصب رخشی کو دے دیا گیا ہے۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ شخص قتل اور اغوا کے معاملات میں پیشہ ورانہ مہارت رکھتا ہے۔ تمھارا قصہ الگ بھی کر دیا جائے تو اس کا پچھلا کھاتا اس قدر ضخیم ہوگا کہ موت اس کی سب سے کم سزا ثابت ہوگی۔"

وہ خاموش ہوگئی اور ہم دونوں نشست گاہ میں آ بیٹھے۔

"لاہور میں آپ کیا کر آئے؟" طویل سکوت کے بعد اسی نے زبان کھولی۔ "سب کام ادھورا ہی رہ گیا ہوگا۔"

"خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "تمھارے اغوا کی خبر ملنے کے بعد میں نے کئی سنگین اقدامات بھی کیے تھے۔ ایشین سنڈیکیٹ کے دفتر کو آگ لگا دی، خاصے معرکے ہوئے اور ان سب کا نچوڑ یہ ہے کہ تصویر اور توقیر کسی اور کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں جمی لائیڈ کا ایک نیا نام سامنے آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تنظیم کی پشت پر اسی کا ذہن کارفرما ہے۔"

"آپ کے اس خیال کی تائید کون کر سکے گا؟"

"شاید تصویر یا توقیر ہی سے کچھ معلوم ہو سکے۔ امکان تو یہی ہے کہ وہ بھی لاعلم ہوں گے۔ دوبارہ لاہور جا کر ہی از سرِ نو معاملات دیکھنے ہوں گے۔"

پھر اس کے استفسار پر میں اسے لاہور میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔

"یعنی تصویر لائیڈز کالج میں اسٹیٹ منیجر کے طور پر رہ رہا ہے۔" میری کہانی سننے کے بعد اس نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ "اور توقیر کی ملک میں موجودگی سے انکار کر رہا ہے۔۔۔ آخر اس طرح وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہ رہا ہے؟"

"وہ لوگ اس وقت میرا سراغ کھو چکے ہیں۔ وہ برادرانہ محبت جتا کر کسی نہ کسی طرح مجھے اپنے جال میں پھانسنا چاہتا ہے کیونکہ میری وجہ سے کاروبار کے ساتھ ہی تنظیم کا ڈھانچا بھی متاثر ہونے لگا ہے۔"

"اس طرح تو تصویر پر ہاتھ ڈالنا محال ہی نظر آرہا ہے۔"

"محال ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔" میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ لائیڈز کالج میں بھی دوہری زندگی گزار رہا ہے۔ بظاہر جمی لائیڈ کا اسٹیٹ منیجر بن کر عملے میں گھلا ملا ہوا ہے لیکن درپردہ باس بن کر ان پر سوار ہے۔ وہاں کے ملازمین شاید یہی سمجھتے ہوں گے کہ اپنے اسٹیٹ منیجر سمیت وہ سب باس کو جواب دہ ہیں۔ ایسے حالات میں اُن میں سے کسی کو توڑ کر اپنے ساتھ ملانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان تک رسائی کیسے حاصل کی جائے؟"

"اس بار مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے؟" اس نے پُرامید لہجے میں سوال کیا۔

"ہرگز نہیں۔" میں نے سختی کے ساتھ کہا۔ "ایک بار ساتھ لے گیا تھا تو اس کے نتائج آج تک بھگتنا پڑ رہے ہیں۔ دوبارہ ایسی غلطی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ انھیں تمھاری لاہور میں موجودگی کی بھنک بھی مل گئی تو وہ اپنے سارے وسائل ہمارے خلاف مرکوز کر کے کہیں نہ کہیں ہمیں ضرور گھیر لیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ان کی توجہ لاہور کے ساتھ کراچی میں بھی بٹی رہے۔"

"جہانگیر کو میرے اور آپ کے تعلق کا علم ہو گیا ہے؟"

"نہیں۔ تمھارے نکل جانے کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاں، تم سے اس کے گھر میں ملاقات ہو جاتی تو مجھے اس کو بھی اعتماد میں لینا پڑ جاتا۔ ابھی تک وہ میرے ساتھ [illegible] تعاون کر رہا ہے۔"

"اور رخشی؟" اس نے دبے دبے لہجے میں سوال کیا۔

میرے لیے اس کا وہ سوال غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ لاکھ روشن خیال اور تعلیم یافتہ سہی لیکن بنیادی طور پر ایک عورت ہی تھی۔ اور میرے ساتھ اپنی وابستگی کی بنا پر ہرگز اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی دوسری عورت مجھ سے ضرورت سے زیادہ قریب ہو سکے۔ خاص طور پر رخشی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم کر چکی تھی کہ وہ حسین اور چالاک ہونے کے ساتھ ہی اس حد تک اخلاق باختہ تھی کہ عملاً بازار کی ایک سستی جنس بن کر رہ گئی تھی۔ اس کو لازماً یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں ان معرکہ آرائیوں میں رخشی کو میرے دل و دماغ پر اس حد تک قابض ہونے کا موقع نہ مل جائے کہ میں اس سے بے پروائی برتنا شروع کر دوں۔

"تعاون وہ بھی کر رہی ہے۔" میں نے لاپروایانہ انداز میں کہا لیکن میں نے ایک ایک لفظ تول کر منتخب کیا تھا۔ "لیکن اس کی وجہ میری ذات نہیں ہے۔ اس کے تعاون کے محرکات

محبت کے بجائے منفی جذبات پر مبنی ہیں۔ وہ اسے ٹو کو اپنے محبوب اور پھر اپنے بھائی کے قتل کا ذمہ دار سمجھتی ہے اور اس کا انتقام لینے کے لیے اس کے ہر ایسے دشمن سے تعاون کر سکتی ہے جس کے لیے میں اسے پورا یقین ہو کہ وہ اس کے باغیانہ کردار کو کسی بھی مرحلے پر بے نقاب نہیں کرے گا۔"

"لیکن میرے بارے میں وہ سلام جیسے اہم آدمی کی نشاندہی کیسے کر بیٹھی؟"

"میرے اور تمھارے رشتے کا علم ہو جاتا تو شاید زبان ہی نہ کھولتی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے یہی بتایا کہ میں تم سے بالکل ناواقف ہوں اور ملنا چاہتا ہوں۔"

"ملنے کا کوئی سبب بھی بتایا ہوگا؟" اس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"اس سے بہتر سبب کیا ہوتا کہ اسے ٹو کو جس شدت سے تمھاری تلاش ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمھارے پاس کچھ اہم معلومات ہیں اور میں اُن سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس ساری بھاگ دوڑ میں کامران بے چارہ بالکل ہی پس منظر میں چلا گیا۔" چند ثانیوں کے بعد اس نے اُداس لہجے میں کہا۔

"وہ حیرت ناک طور پر رُوبصحت ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر اکبر نے اس کی ایک ذہنی گرہ پکڑ لی ہے جس کی کلید تمھارے پاس ہے۔"

"میرے پاس؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"یہاں تم ہر وقت اس کے سامنے رہتی تھیں لہٰذا تمھارے لیے اس کی پسندیدگی کی انتہا سامنے نہ آسکی۔ اسپتال میں کئی نرسیں اس کے ہاتھ سے پٹی ہیں اور آخرکار ایک نرس صاحبزادی اسے پسند آگئی ہے جو اس کی تمام تر دیکھ بھال کرتی ہے۔ کامران اسے گڈی کہہ کر پکارتا ہے۔ ڈاکٹر اکبر کا خیال تھا کہ وہ کسی بہت ہی قریبی لڑکی کا نام ہے جو کامران کو بہت عزیز تھی، اس کے لاشعور میں جم کر رہ گیا۔ کرنل صاحب سے بات ہوئی تو پتا چلا کہ تم بچپن میں گڈی کہلاتی تھیں۔ اکبر کی رائے ہے کہ اب اگر تم طے شدہ وقفوں سے مناسب مواقع پر بار بار اس کے سامنے آتی رہو تو اس کی یادداشت پر حیرت انگیز اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔"

"آپ اجازت دیں تو میں ابھی اور اسی وقت اسپتال جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"اتنی عجلت مناسب نہیں۔ پہلے میں اکبر سے بات کروں گا ویسے اب حالات خاصے سازگار ہیں۔ میرے اور کامران کے تعلق سے مخالف کیمپ میں صرف رخشی واقف ہے۔ وہی اسپتال سے بھی باخبر ہے لیکن وہ زبان کی پکی ہے، وعدہ کر چکی ہے کہ اب اس ذہنی معذور کو بھول جائے گی لہٰذا تمھارے وہاں جانے میں حرج بھی نہیں ہے۔"

"پھر آپ اکبر کو کب فون کریں گے؟"

"ابھی اور اسی وقت۔" میں نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میری نگاہیں بے اختیار اس کے رخساروں پر پڑنے والے گڑھوں پر جم کر رہ گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے ایک مدت کے بعد اسے یوں بے حجابانہ انداز میں ہنستے دیکھا ہو۔

"کیا گھور رہے ہیں؟" مجھے یوں اپنی طرف متوجہ پا کر اس کی ہنسی یک بیک تھم گئی۔

"چاہِ غبغب میں دفن ہونے کے بارے میں غور کر رہا تھا۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"غبغب!" اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ کیا بلا ہے؟"

"پرانے ادیبوں اور شاعروں کی زیادتی ہے کہ ایسے حسین جلووں کو اس قدر غیر شاعرانہ نام دیے ہیں۔" میں نے اس کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہنستے ہوئے رخساروں پر گڑھا ہو تو چاہِ غبغب اور ٹھوڑی پر ہو تو چاہِ ذقن کہلاتا ہے۔ حالاں کہ یہ دونوں تو وہ مقامات ہیں جہاں سمرقند و بخارا تو کیا، پوری دنیا کی بادشاہت قربان کی جا سکتی ہے۔"

"آپ بھی نرے مرد ہی ٹھہرے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "بھلا ان مشاہداتی نکتوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟ عورت تو بس عورت ہی ہوتی ہے۔ کانی ہو، لولی ہو، گوری ہو یا کالی ہو۔ اس کے سینے میں دل تو وہی عورت کا ہوتا ہے۔ مہربان اور محبت پرور۔۔۔ لیکن مرد دل نہیں، بس عورت کا ظاہر دیکھتا ہے اور حسن کی نزاکتوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے، اندر جھانکنے کی زحمت نہیں کرتا۔"

"کم از کم تمھارے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ "میں نے اندر کے حسن پر نثار ہو کر باہر کی خوبیاں تلاش کی ہیں، گڑھے گوسڑے تو بعد کی دریافتیں ہیں۔"

"بحث میں آپ سے جیتنا ممکن نہیں، یہ بتائیں اکبر کو فون کب کریں گے؟"

میں نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی اور فون پر ڈاکٹر اکبر کے نمبر ملانے لگا۔ غزالہ ہمہ تن اشتیاق بنی میرے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ اسپتال سے سلسلہ ملنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اسپتال میں موجود نہیں تھا۔ میں نے آپریٹر سے اس کے گھر کا نمبر لیا اور اس پر رابطہ قائم کرنے لگا۔ میری دوسری کوشش بارآور ثابت ہوئی اور تعارف ہوتے ہی ڈاکٹر کامران کے بارے میں حوصلہ افزا

تفصیلات سُنانے لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر سلطان شاہ میرے سامنے آ بیٹھا اور خالی خالی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس نے منگھو پیر روڈ پر گندھک کے چشموں سے آگے جانے والے راستے پر ایک جگہ سلام کو نہایت اطمینان سے گاڑی سے اتار کر گولی کا نشانہ بنا دیا تھا اور پھر سکون سے واپس لوٹ آیا تھا لیکن اپنی اس کامیابی کے باوجود وہ اُداس تھا۔

"کیا بات ہے؟ تم کچھ چپ چپ سے ہو؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"دل پر بوجھ ہے۔" اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں نے پہلی بار کسی زخمی اور نہتے دشمن کو دھوکے سے مارا ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے اُسے واقعی اس ویرانے میں آزاد کر دیا ہے لیکن پیچھے سے پگھلا ہوا سیسہ اس کے دل میں اتر گیا۔"

"پھر تم یہیں رہنا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں اپنے ساتھ لاہور لے گیا تو ایسے دو چار واقعات تمھیں ناکارہ کر کے رکھ دیں گے۔"

"میں لاہور چلوں گا۔" وہ تڑپ اٹھا۔ "اس ایک واقعے سے اثر لینے کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو گیا ہوں۔"

"تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہم لوگ شوقیہ خونریزی نہیں کر رہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "انھوں نے ہمیں روکنے کی کوشش کی اور ہم نے انھیں بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچا کر یہ یقین دلا دیا کہ وہ ہمیں اپنی مرضی کے مطابق نہ ہانک سکیں گے۔ وہاں سے واپسی پر ہم دوسرے مرحلے کی داغ بیل ڈال آئے ہیں۔ اب دیکھو اس کے نتائج کیا رہتے ہیں۔"

"دوسرا مرحلہ؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں۔ تم اسے ایک طرح کی سرد جنگ بھی کہہ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "لائیڈز کالج کے ایس او یا سیکورٹی آفیسر کو شاید ہماری حقیقت کا علم نہ ہو لیکن تصویر اچھی طرح سمجھ چکا ہوگا کہ ان واقعات کے پس پشت میرا ہاتھ کارفرما ہے۔ اسی پس منظر میں میں نے اُن سے تیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ہے۔ دیکھنا ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔"

"اگر وہ تیس لاکھ کی ادائیگی پر آمادہ ہو گئے؟"

"تو میں تصویر کو عقل کا اندھا کہوں گا۔ وہ رقم ہرگز نہیں دیں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ رقم کی ادائیگی کا عندیہ ظاہر کر کے مجھے گھیرنے کی کوئی منظم کوشش کر ڈالیں۔"

"میری بات کا جواب اب تک نہیں ملا۔" اس نے احتجاج کیا۔

"کون سی بات؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"لاہور کب جانا ہے ہو؟" اس نے اپنا پرانا سوال دہرایا۔

"آج رات یا شاید کل تک۔" میں نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "ایس او کو میں نے دو روز کی مہلت دی تھی جو کل ختم ہو گی۔" اس اثنا میں وقت برباد کرنے کے بجائے ہم یہاں کچھ کارروائیاں کر سکتے ہیں۔

میں اچانک ہی دل گرفتہ سا ہو گیا۔

ملک میں استعمال ہونے والی منشیات کی فہرست بہت طویل تھی۔ افیم، شراب اور چرس سے لے کر کوکین اور ہیروئن تک سیکڑوں نشے تھے جو نوجوان طبقے کی بنیادوں کو غیر محسوس طریقے سے کھوکھلا کر رہے تھے۔ اور ان سب میں ہیروئن کا نشہ سرِ فہرست تھا۔ یہ جدید دور کا وہ منہ زور نشہ تھا جو انسانوں کو مفلوج کر کے اپنا غلام بنا رہا تھا۔ میں اس بھیانک جنس کے بڑے تاجروں سے واقف تھا لیکن وہ اس طرح حصار در حصار کام کر رہے تھے کہ میرے پاس اُن کے خلاف کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا جو قانون کی نظروں میں قابلِ قبول ہوتا۔ میں انفرادی سطح پر تو اُن سے لڑ سکتا تھا لیکن قانون کی مدد لینے کا ارادہ بھی کرتا تو خود اس بُری طرح قانون کے شکنجے میں پھنستا کہ گلو خلاصی محال ہو جاتی کیونکہ یہی ہمارا اور ہمارے ملک کا المیہ تھا۔ چند گرام کی پڑیاں بیچنے والے اور ڈرائیور وغیرہ کی سطح کے کارندے ہر روز پکڑے جاتے تھے اور ان گرفتاریوں کے اندراج سے قانون کا پیٹ بھر دیا جاتا تھا لیکن اُن کے پشت پناہ برسوں گزرنے کے بعد بھی گرفت میں نہ آ سکے تھے۔

منشیات فروشوں کی زیرِ زمین دنیا میں بڑے بڑے ناموں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ تاجروں اور صنعت کاروں سے لے کر اعلیٰ سرکاری اہل کاروں تک کے نام ایسے محبت آمیز انداز میں لیے جاتے تھے کہ ان ناموں پر رشک آتا تھا لیکن اندھا اور بہرا قانون نہ اُن چہروں کو دیکھ سکتا تھا نہ وہ نام سُن سکتا تھا اور ملک میں گناہوں کی فصل تیزی سے پروان چڑھتی جا رہی تھی۔

"ہم یہاں کیا کارروائیاں کر سکتے ہیں؟" سلطان شاہ کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔

"موتی دادا اور دوسرے لوگوں سے تم واقف ہو، اُن کی مخبری کر کے انھیں پکڑوا دو تاکہ نچلی سطح پر بھی کام ٹھنڈا ہو جائے۔"

"مخبری کے چکر میں خود ہی پھنسنے کے امکانات زیادہ ہیں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔ "وہ باقاعدہ بھتہ دیتا ہے، اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ وہاں تو ہمیں خود ہی گھس کر افراتفری پھیلانا ہو گی۔"

اُس کے جواب سے مایوس ہو کر میں نے ٹیلیفون ڈائرکٹری سے موتی دادا کے علاقے کے پولیس اسٹیشن کا نمبر تلاش کر کے تھانے کے انچارج کا نمبر ملانے لگا۔

سلسلہ مل جانے پر دوسری طرف سے ایک کرخت سی آواز سنائی دی لیکن بولنے والے نے اپنے لہجے کی ناشائستگی خوبصورت الفاظ میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔

"جی میں ایک شریف شہری بول رہا ہوں۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "عرض یہ کرنا ہے کہ آپ کے علاقے میں مارکیٹ سے ذرا آگے بس اسٹاپ کے قریب موتی دادا نامی ایک بدمعاش کا اڈا ہے۔ وہ وہاں کھلے بندوں ہیروئن بیچ کر قوم کا مستقبل تباہ کر رہا ہے۔ وہاں اس وقت بھی چھاپا مارا جائے تو ہیروئن کی بھاری مقدار برآمد کی جا سکتی ہے۔"

"تمھارا نام پتا کیا ہے؟" میرا مدعا سنتے ہی اس آواز سے ساری خوش دلی کافور ہو گئی۔

"نام پتا بتانا ہوتا تو فون کرنے کے بجائے خود ہی تھانے چلا آتا۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "موتی دادا کو میرا سراغ بھی مل گیا تو وہ میری زندگی جہنم بنا دے گا۔"

"سنو جی!" ریسیور پر کرخت آواز ابھری۔ "ہمارے پاس موتی دادا نام کے کسی آدمی کی ہسٹری شیٹ نہیں ہے۔ پھر ہمیں اوپر سے حکم ملا ہے کہ گمنام اطلاعات پر کوئی کارروائی نہ کی جائے کیونکہ لوگ پولیس کو بے وقوف بنا کے ذاتی دشمنیاں نکالتے ہیں۔ ہم بلا وجہ کسی شریف آدمی کے ٹھکانے پر دھاوا نہیں بول سکتے۔ اطلاع درست ہے تو تھانے آ کر رپورٹ درج کراؤ۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ کیا کارروائی ہو سکتی ہے۔ قانون اتنا آسان نہیں ہے کہ تم فون کرو اور ہم رائفلیں سنبھال کر دوڑ لگا دیں۔"

"چھاپا نہ مارا جائے تو تم وہاں جعلی گاہک بھیج کر میری بات کی صداقت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔"

اس نے صداقت کے بارے میں نہایت نازیبا الفاظ استعمال کیے پھر غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "چوروں کی طرح چھپ کر ہمیں پٹی پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔ ہمیں سب معلوم ہے کہ ہمیں کب کیا کرنا ہے۔ تم جیسے اچکوں کو میں خوب جانتا ہوں۔ موتی دادا نے مال دینے سے انکار کیا ہو گا تو اب پولیس کو اس کے خلاف اکسا رہے ہو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم موتی دادا اور اس کے دھندے سے خوب واقف ہو...!"

"بکواس بند کر او خنزیر۔" میری بات پوری ہونے سے قبل دوسری طرف سے چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ "اُلّو کا پٹھا، ہمارے ساتھ وکالت بگھار رہا ہے۔ میں......"

مجھے معلوم تھا کہ اب گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گی لہٰذا فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"کیا ہوا؟" سلطان شاہ نے فوراً ہی سوال داغ دیا۔

"گالیاں کھا کے بے مزہ ہو گیا۔" میں نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آج موتی دادا کے اڈے پر ہنگامہ نہ ہوا تو سمجھو کہ کچھ بھی نہ ہوا۔"

"ایسے کاموں میں تو میں ماہر ہوں۔ بس ذرا تفصیل سمجھا دو مجھے۔"

"تفصیل کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم ساتھ چلیں گے۔"

اس کے بعد ہم دونوں کو کہیں مل بیٹھنے کا موقع نہیں مل سکا لیکن میں نے اُسے یہ ضرور بتا دیا کہ ہم اسی رات لاہور کے لیے روانہ ہو جائیں گے اور اس اطلاع پر وہ خاصا خوش نظر آنے لگا تھا۔

شام ڈھلے ہم دونوں گھر سے نکلے تو ماحول خاصا کشیدہ تھا۔ کرنل بھی کچھ رُوٹھا روٹھا سا نظر آ رہا تھا۔ غزالہ تنہا رہ جانے پر آزردہ تھی لیکن یہ بات سب ہی کو معلوم تھی کہ میرے لیے لاہور کو بھول کر کراچی میں رہنا تقریباً ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

گھر سے روانہ ہونے کے بعد میں نے گاڑی ایک محفوظ علاقے میں چھوڑ دی اور سلطان شاہ کے ساتھ ٹہلتا ہوا اس طرف ہو لیا جہاں موتی دادا کا ہیروئن فروشی کا اڈہ تھا۔

لاکھوں کا دھندا فراہم کرنے والا اڈہ ایک نیم تاریک اور مفلوک الحال کوارٹر میں قائم تھا جہاں بوسیدہ احاطے کے ساتھ بچھی ہوئی تین چار پائیوں پر غالباً موتی دادا کے پروردہ غنڈے آرام کر رہے تھے۔ اور اُن کے زیرِ سایہ احاطے میں مشکوک لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

"ہمارا براہِ راست موتی دادا سے تو کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" وہاں پہنچنے کے بعد سلطان شاہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

"تمھیں یہ خیال کیسے آگیا؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔ "ویسے تمھارا سوال خاصا معقول ہے۔"

"اگر ہنگامہ ہی کرنا ہے تو ہم براہِ راست اس سے رجوع کیے بغیر اُدھم مچا کر فرار ہو سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں، یہ بات بھی معقول ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کارروائی کے آغاز سے پہلے ذرا گھوم پھر کر اندازہ لگا لینا چاہیے کہ یہاں کیا صورتِ حال درپیش ہے۔"

ہم دونوں ایک متفقہ پروگرام کے تحت ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اور جب دوبارہ یکجا ہوئے تو دونوں ہی اس بات پر متفق تھے کہ موتی دادا کے اڈے پر یہ خبر گرم تھی کہ اس کے کسی مخالف نے علاقے کی پولیس کو اس کے اڈے پر چھاپا مارنے کی ترغیب دی تھی لیکن موتی دادا کے وسائل نے وہ کوشش ناکام بنا دی۔

صاف ظاہر تھا کہ علاقے کی پولیس ان لوگوں سے ملی ہوئی تھی اور انھیں پل پل کی خبریں پہنچائی جاتی تھیں۔ وہاں وسیع پیمانے پر کوئی کارروائی کرنا دشواریاں مول لینے کے مترادف ہوتا۔ لہٰذا ہم دونوں نے دُور رہتے ہوئے اڈے کے اطراف میں دو چار ہوائی فائر کیے اور کسی کی نگاہوں میں

آئے بغیر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔

ہم اپنا کام دکھا کر واپس لوٹ رہے تھے لیکن اس علاقے کی فضا شور و غل سے گونج رہی تھی۔ اور اِکا دُکا فائر بھی سُنائی دے رہے تھے۔ شاید موتی دادا کے حامیوں نے اپنے خیالی مخالفین کو خوفزدہ کرنے کے لیے آتشیں اسلحہ نکال لیا تھا۔

"یہ تو کبھی نہ ہُوا۔" سلطان شاہ نے گاڑی روانہ ہونے کے بعد کہا۔

"ہماری طرف سے اتنا ہی کافی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اب وہ اندھیرے میں آپس ہی میں لڑ پڑیں۔ اس وقت ہم انھیں یہ جتلانے میں کامیاب رہے ہیں کہ کوئی ان کے پیچھے لگ گیا ہے۔"

"پھر اب باقی وقت کہاں گزارو گے؟" اس نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے رخشی سے ملنا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"لیکن گھر سے چلتے وقت تو تم نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

میں مسکرا دیا۔ "غزالہ کے سامنے دانستہ اس کے ذکر سے گریز کر رہا تھا۔ کوئی نام بار بار سامنے آتا رہے تو ذہن میں بلا وجہ شبہات سر ابھارنے لگتے ہیں۔ وہ تعاون کر رہی ہے تو میں سوچ رہا ہوں کہ اس سے کھل کر بات کرلی جائے۔"

وہ خاموش ہوگیا اور میں نے تھوڑی دیر بعد کار اسٹون ہاؤس سے کچھ فاصلے پر پارک کردی۔ "تم یہیں انتظار کرو، میں فارغ ہوکر جلد ہی واپس لوٹنے کی کوشش کروں گا۔"

اس وقت رخشی اپنے گھر پر شاید تنہا تھی کیونکہ دوسری دستک کے بعد اس نے خود ہی پھاٹک کھولا تھا اور مجھے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا مگر میں وہاں رکے بغیر اسے ساتھ لیے اندر بڑھتا چلا گیا۔

"کیا بات ہے آج کچھ زیادہ ہی جوش میں نظر آرہے ہو۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں بولی۔

"اس وقت محض تم سے ملنے کی نیت سے آیا ہوں، ماضی کی باتیں رہ رہ کر ذہن میں ڈنک مارتی رہتی ہیں اور میں ہمیشہ صبر کرکے رہ جاتا ہوں، سچ پوچھو تو تم ایک بدروح بن کر میرے ذہن سے چمٹ گئی ہو۔"

"بدروح!" وہ کھنکتی ہوئی آواز میں ہنس پڑی۔ "بدروح ہوتی تو تمھارے دل میں چھپے ہوئے خیالات بھی پڑھ لیتی لیکن تم ہمیشہ مجھے بے وقوف بنا کر اپنا کام نکال لیتے ہو اور میں سوچتی رہ جاتی ہوں۔"

"میں نے تمھیں بے وقوف بنا کر کون سا کام نکالا اپنا؟" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جارحانہ لہجے میں سوال کیا۔

"پرانی باتوں پر خاک ڈالو اور صرف اتنا بتادو کہ سلام کہاں ہے؟" اس کی تیکھی نگاہیں دلکش انداز میں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"مجھے کیا پتا؟ میں تو خود اس کی تلاش میں ہوں۔ کل رات ڈھلے اس کا پتا لے کر تمھارے پاس سے روانہ ہوا تھا، آج صبح بلیوا سٹار پہنچا تو وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی کہیں نکلا ہوا تھا۔"

"مجبور کرو گے تو مان لوں گی۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُسے آج دس بجے تک اپنے کمرے میں رک کر میری کال کا انتظار کرنا تھا۔ میں نے نو بجے فون کیا تو وہ غائب تھا۔"

"میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی تو نہیں ہے کہ کسی ہٹے کٹے آدمی کو یوں پلک جھپکتے میں غائب کرسکوں۔" میں نے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم ہوٹل سے معلوم کرسکتی ہو کہ وہ کن حالات میں وہاں سے روانہ ہوا تھا۔"

"اسے جہنم میں ڈالو۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ "میں معلوم کرچکی ہوں، وہ تنہا ہی گیا تھا لیکن اس پر کوئی بہت ہی خاص ترکیب آزمائی گئی ہوگی ورنہ وہ کسی قیمت پر دس بجے سے پہلے اپنا کمرہ نہ چھوڑتا۔"

"میری طرف سے اس قدر بدظن ہو تو میرا یہاں آنا ہی بے کار ہے۔" میں نے اُچاٹ لہجے میں کہا۔ "میں سمجھ رہا تھا کہ تم نے خود ہی سلام کو ہوٹل سے ہٹا دیا ہے تاکہ میں اس تک نہ پہنچ سکوں۔"

اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور بولی۔ "تو یوں کہو کہ اس وقت بھی سلام کی تلاش میں آئے ہو۔"

"وہ میرا سسرالی نہیں ہے کہ میں اس کی تلاش میں یوں خوار ہوتا پھروں۔" میں نے ترش لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہ خرافات سوچو گی تو بھول کر بھی ادھر کا رُخ نہ کرتا۔"

"پھر سچ سچ بتاؤ کہ کیوں آئے ہو؟" اس کا لہجہ مصالحانہ ہوگیا۔

"دوستی کی تجدید کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ سوچا تھا کہ میرا اور تمھارا دشمن ایک ہی ہے تو کیوں نہ ہم باقاعدہ مل کر کام کرنا شروع کردیں۔ لے ٹو سے تو تمھیں کوئی صلہ نہ مل سکے گا جب بھی موقع آیا وہ بے دریغ تمھاری گردن کٹوا دے گا۔"

"آہستہ بولو، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، اس کی رسائی دُور دُور کی بات ہے، وہ اونچے لہجے میں بولنے والوں کو بھی معاف نہیں کرتا۔"

"تمھارے تو اُس سے بہت قریبی مراسم رہے ہیں۔"

"بہت زیادہ قریبی۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "لیکن اس کا چہرہ پھر بھی نہ دیکھ سکی۔"

"ٹھکانا تو معلوم ہوگا اس کا؟"

"نوبت ہی نہیں آئی، ہمیشہ خود ہی آکر ملتا تھا اور ہمیشہ کیا میری تو اس سے کُل تین ملاقاتیں ہوئی تھیں اور تینوں بار وہ غیر متوقع طور پر خود ہی پہنچا تھا۔"

"یعنی تم اُس کے بارے میں میری زیادہ مدد نہیں کرسکتیں۔"

"مجبوری ہے۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔ "ہاں، یہ ضرور کرسکتی ہوں کہ کراچی میں اس کے کام کو بگاڑنا شروع کردوں۔"

"یہ بھی خاصا اہم کام ہوگا۔"

"میری ایک کوشش ناکام ہوچکی ہے۔" اس کا انکشاف سُن کر میں حیران رہ گیا۔

"پرسوں ہی ایک چھوٹی سی کھیپ آزاد علاقے سے یہاں پہنچی ہے۔" میرے استفسار پر اُس نے بتایا۔ "میں نے ایک اہم سرکاری افسر کو فون پر مال لانے والے ٹرک کی ساری تفصیلات بتادیں لیکن کوئی کارروائی نہیں کی گئی، مال بحفاظت مقررہ اڈے پر پہنچ گیا جبکہ میرے ذریعے اس مد میں یہاں کسی کو کوئی رقم ادا نہیں کی جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بندوبست اوپر سے براہِ راست ہوتا ہے۔"

"پھر تم یہاں کا کام کیسے بگاڑ سکو گی؟"

"نچلے درجے کے ملازمین عام طور پر ایسی ملی بھگت میں کم ہی ملوث ہوتے ہیں، ان کا دارومدار چھوٹے موٹے چھاپوں پر ہوتا ہے۔ اب اُن ہی میں سے کسی کو اکسانے کی کوشش کروں گی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آج سے ہمارے درمیان تعاون کا باقاعدہ معاہدہ ہوگیا۔" میں نے داہنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اور اب اس کا ایک چھوٹا سا جشن بھی ہوجائے۔" وہ تپاک کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔

ہم دونوں ایکبار پھر لاہور کی سرزمین پر کھڑے تھے۔

لاہور روانگی سے پہلے سلطان شاہ کا موڈ خاصا خراب ہوگیا تھا کیونکہ مجھے رخشی کے پاس کافی دیر لگ گئی تھی لیکن جب میں نے اُسے رخشی کے ساتھ ہونے والے نئے معاہدے سے آگاہ کیا تو اس کا غصہ فرو ہوگیا اور پھر ہمارا سفر خاصا خوشگوار گزرا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اس بار کچھ ہوکر ہی رہے گا۔" سلطان شاہ نے میرے ہمراہ ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"کیا کوئی الہام ہوا ہے؟" میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

"چھٹی حس۔" اس نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس بار ضرور کوئی بڑا تصادم ہوگا، اس بار وہ لوگ بہت چوکنے ہوں گے۔ ہمیں ہر قدم پھونک کر اُٹھانا ہوگا۔"

"شاید اس بار لاہور کی فضا نے تمھارے اعصاب پر کچھ ناگوار اثرات مرتب کیے ہیں۔" میں نے اس کی سنجیدگی کا مضحکہ اڑاتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

"ذرا اپنے دائیں طرف نگاہ ڈالو، سُرمئی سوٹ میں چشمے والا دراز قد آدمی لاؤنج سے نکلتے ہی ہمارے ساتھ ہولیا تھا۔" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "وہ بار بار ہماری ہی طرف دیکھ رہا ہے۔"

میں نے بے پروایانہ انداز میں سر گھمایا تو سُرمئی سوٹ والا ہم سے چند قدم پیچھے چلا آرہا تھا۔ میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگانے کے بہانے چلتے چلتے وہیں رک گیا۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین دیاسلائیاں جلائیں جو میرے نتھنوں سے خارج ہونے والی تیز ہوا سے بجھ گئیں۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ سرمئی سوٹ والے نے اپنی رفتار سُست کردی تھی لیکن دیاسلائیاں بجھنے کے باعث اس کی سُست روی اس کے کام نہ آسکی اور وہ اسی انداز میں چلتا ہوا ہم سے آگے نکل گیا۔

چوتھی تیلی نے سگریٹ کا سرا روشن کردیا۔

"تم بلاوجہ چھٹی اور ساتویں حس کو بدنام کررہے ہو۔" میں نے اسی سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "جب ایک مشتبہ آدمی سامنے نظر آرہا ہے تو گھما پھرا کر بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اس وقت تک ذہن پر زور دینے کے باوجود میں اُسے شناخت نہیں کرسکا تھا۔ تمھارے رکنے کے بعد اچانک یاد آیا ہے کہ پہلی بار جب ہم لاہور آئے تھے تو الشین سنڈیکیٹ کے دفتر سے واپسی پر بھابی کو اغوا کرنے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔"

"کیا تمھیں پورا یقین ہے؟" میں نے آگے بڑھتے ہوئے سوال کیا۔

"اب کوئی شبہ ہی نہیں رہا۔ یہ اغوا کرنے والوں میں شامل رہا ہو یا نہ رہا ہو، اس بھیڑ میں ضرور پیش پیش تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ شہر میں کڑی نگرانی ہورہی ہے۔"

غالباً اسے اسی خاص مقصد سے ائیرپورٹ پر متعین کیا گیا ہوگا — خیر اسے ابھی دیکھے لیتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں اچانک ہی بیت الخلا کی نشاندہی کرنے والے اشارے کی سمت میں مڑ گیا۔

" ادھر کہاں ؟" سلطان شاہ میرا عندیہ نہ سمجھ سکا اور کھڑے کھڑے اپنی جگہ گھوم کر رہ گیا۔

" تم یہیں کہیں اوٹ میں ہو جاؤ۔" میں نے جلدی سے کہا" میں بیت الخلا کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ ہمیں دیر ہونے پر بو کھلا کر پلٹے گا، ہو سکتا ہے کہ سیدھا بیت الخلا کا ہی رُخ کرے، بس تم ہوشیاری سے اس کے پیچھے ہو لینا۔"

میں اپنی سمت میں بڑھتا چلا گیا، بیت الخلا میں پہنچ کر میں چند منٹ تک بلا وجہ ایک کیبن میں بند رہا، اس دوران میں میرے کان باہر کی آہٹوں پر جمے ہوئے تھے، مجھے محسوس ہوا کہ کوئی وہاں بے آواز قدموں کے ساتھ داخل ہوا' میں کنڈی کھول کر باہر نکلا اور سرمئی سوٹ والا جو وہاں کھڑا حیران و پریشان نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا' سٹپٹا کر رومال سے اپنی عینک کے عدسے صاف کرنے لگا۔

میرا ارادہ اس سے بھڑ جانے کا تھا مگر اسی لمحے سلطان شاہ سرمئی سوٹ والے کے عقب میں نمودار ہوا' اس کے ہاتھ میں کسی واش بیسن سے نکلا ہوا ناکارہ ڈرین پائپ دبا ہوا تھا۔

اس سے قبل کہ سرمئی سوٹ والے عینک باز کو صورتحال میں کسی تبدیلی کا احساس ہوتا، سلطان شاہ نے آہنی پائپ دونوں ہاتھوں میں تھام کر بلند کیا اور پوری قوت سے اس کی گردن پر رسید کر دیا۔

اس کے حلق سے ایک شدید ہچکی سی بلند ہوئی، گردن ایک طرف لٹک گئی اور وہ یوں فرش پر آ رہا جیسے اس کی پنڈلیوں کی ہڈیاں یک بیک گل گئی ہوں۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ سلطان شاہ کی نپی تلی ضرب کے نتیجے میں اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

نائٹ کوچ سے لاہور پہنچنے والے مسافروں کو منزل پر پہنچنے کی عجلت تھی اور اتنی رات گئے ائیرپورٹ کی عمارت کے اس حصے میں تقریباً سناٹا ہی نظر آ رہا تھا لہٰذا اس دوران میں بیت الخلا کی حدود میں بھی کوئی مداخلت نہ ہوئی۔ کوئی مسافر یا عملے کا رکن اگر ادھر آ نکلتا تو ہم دونوں کے لیے ناقابلِ بیان دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

سلطان شاہ نے بھی اس وقت بہت عقل مندی کا ثبوت دیا کہ عینک کے سر پر وار کرنے کے بجائے اس کی گردن توڑنے کا حملہ کیا اور یوں خون پھیلنے کے امکانات ختم ہو کر رہ گئے۔ ہم دونوں نے پھرتی کے ساتھ اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے ایک باتھ روم میں گھسیٹا پھر میرے اشارے پر سلطان شاہ باہر نکل گیا، میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر سارے کاغذات اور رقم پر قبضہ کر لیا۔ کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک بھرا ہوا ریوالور بھی موجود تھا لیکن میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا اور خود بھی ہاتھ دھو کر باہر آ گیا۔

سلطان شاہ مختصر سا سوٹ کیس سنبھالے باہر میرا منتظر تھا اپنے دشمن پر وار کرتے ہوئے سوٹ کیس اس نے شاید باہر ہی چھوڑ دیا تھا جو ہمارے لیے بہت اہم تھا کیونکہ ہمارا سارا اسلحہ اسی میں مقفل تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ داہنی آنکھ دبا کر مسکرایا اور میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

جو کچھ ہوا وہ اس قدر آناً فاناً... اور ایسے پُرسکون طریقے پر ہوا کہ مجھے خود حیرت ہو رہی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے قتل کی اس واردات کے لیے پہلے سے ریہرسل کر کے موافقانہ حالات پیدا کیے گئے تھے تاکہ نہ مرنے والے کو زیادہ اذیت کا سامنا کرنا پڑے نہ ہم کو کوئی قابلِ ذکر دشواری پیش آسکے۔

" تمہاری چھٹی حس کا اندازہ آج ہوا مجھ کو۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا" اس بار لاہور — آتے ہی ایک بھینٹ لے لی اُس نے۔"

" دوسری کہو۔" وہ مسکرایا" آج کا پہلا شکار تو سلام تھا جو وہیں رہ گیا۔"

" تاریخ بدلے دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں۔" میں نے اسے رسٹ واچ دکھلاتے ہوئے کہا اور وہ بس مُنہ چلا کر رہ گیا۔

سُرمئی سوٹ والا میرے لیے قطعی اجنبی تھا اور اگر وہ ہماری تلاش میں باہر سے لوٹ کر بیت الخلا کا رُخ نہ کرتا تو شاید میں سلطان شاہ کے شبہے کو بہت زیادہ وزن نہ دیتا لیکن مقتول نے واپس لوٹ کر سلطان شاہ کے قیاس پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ اس بار لائیلڈ کالج والے چاروں کھونٹ چوکس تھے۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ انھوں نے ائیرپورٹ کی نگرانی کب سے اور کیوں شروع کرائی تھی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔

ایک امکان یہ بھی تھا کہ شاید پچھلے چھتیس گھنٹوں میں انھوں نے ٹرانسیٹر پر مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہا ہو اور مسلسل خاموشی سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہو کہ میں شہر چھوڑ چکا ہوں۔ سیکیورٹی افسر کی حیثیت سے میں پوری طرح باخبر نہیں تھا لیکن مجھے یہ اندازہ تھا کہ تصویر اپنے طور پر واقعات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا اور خوب سمجھ رہا تھا کہ ان پے در پے وارداتوں کے پیچھے لائیڈز کالج کے اسٹیٹ منیجر کا کوئی قرض خواہ نہیں بلکہ میں خود سرگرم تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میرا اصل ٹھکانا کراچی میں ہے لہٰذا میری خاموشی سے اس نے بتانی یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہوگا کہ سیکیورٹی افسر کو دی گئی دو روز کی مہلت پوری ہونے سے پیشتر میں دوبارہ لاہور کا رُخ کروں گا اور اس مختصر مدت میں کراچی تک دو طرفہ سفر کے لیے ملک میں فضائی سفر کا ایک ہی راستہ میسر تھا لہٰذا اس نے اپنے آدمی ائیرپورٹ پر آنے والے مسافروں کی جانچ پڑتال پر مامور کر دیے۔

اب یہ میری خوش نصیبی تھی کہ سلطان شاہ کے عقابی مشاہدے کی بنا پر تصویر کا وار بُری طرح ناکام ہو گیا تھا۔ میں ان ہی خیالات کی رو میں ڈوبا' آنے والی گمبھیر دشواریوں سے بے خبر سلطان شاہ کے ہمراہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھا اور کسی جانب سے ایک ٹیکسی ہمارے قریب آ رکی۔

ڈرائیور پھرتی کے ساتھ اپنی نشست سے اترا اور منزل یا کرائے کے بارے میں کوئی استفسار کیے بغیر ہمارا سوٹ کیس ٹیکسی کی ڈکی میں ڈال دیا۔ ہم دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے اور اُس نے ہوٹل کا نام سنتے ہی ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

ائیرپورٹ اور پھر چھاؤنی کی حدود سے نکلنے کے بعد ڈرائیور نے سیدھا راستہ چھوڑ کر ٹیکسی گلیوں میں گھمانی شروع کی تو مجھے دوبارہ ہوٹل کا نام دہرانا پڑا۔

" صاب' آپ بے فکر رہیں، میں اسی طرف نکلوں گا۔ آج ٹیلیفون والوں نے جگہ جگہ سے سڑک کھود کر ادھر کے راستے بند کیے ہوئے ہیں، نیا آدمی تو یہاں چکرا کر رہ جاتا ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے ملتجیانہ لہجے میں کہا اور میں خاموش ہو گیا۔

پھر ٹیکسی براہِ راست مال روڈ پر نکلنے کے بجائے ایک اجنبی سڑک پر بڑھتی نظر آئی تو میں چونک پڑا اور اعصاب پر عجیب سی بے چینی طاری ہونے لگی۔" یہ تم کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو؟" اس بار میں نے ڈرائیور کو ترش لہجے میں مخاطب کیا تھا۔

" خاموش بیٹھے رہو!" وہ بدلے ہوئے تحکمانہ لہجے میں غرّایا اور میری نگاہیں بے اختیار پیچھے گھوم گئیں۔

ٹیکسی کے تعاقب میں ایک اور کار بھی اسی سڑک پر بڑھی چلی آ رہی تھی۔ ڈرائیور ہم دونوں کے مقابلے میں کمزور تھا لیکن اس کے لہجے میں چھپا ہوا اعتماد بتا رہا تھا کہ پیچھے آنے والی گاڑی میں بھی اسی کے ساتھی سوار تھے۔

ایک لمحے کے لیے میرا ذہن سُن ہو کر رہ گیا۔

اس بار ہم پر بھرپور جال ڈالا گیا تھا۔ سُرمئی سوٹ والے کو ہم نے بے شک موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اپنی دانست میں گلو خلاصی حاصل کر لی تھی لیکن وہ ہماری تلاش میں اندر لوٹنے سے پہلے اپنا کام دکھا چکا تھا۔ اس کی نشاندہی کی بنا پر ہم باہر قدم رکھتے ہی پہچان لیے گئے اور ان کے ایک آدمی نے نہایت اطمینان سے ہمیں اپنی ٹیکسی میں سوار کرا لیا جبکہ باقی آدمی مناسب موقعے کی تلاش میں دوسری کار میں ہمارے پیچھے ہو لیے۔

وہ صورتِ حال ہمارے لیے بہت سنگین تھی۔ اس وقت ہم دونوں بالکل غیر مسلح تھے۔ ہمارے ہتھیار سوٹ کیس میں مقفل تھے جو ہماری دسترس سے باہر کار کی ڈکی میں بند تھا جبکہ پچھلی کار تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ لوگ آباد علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں بے دست و پا کر کے اپنا قیدی بنانے کی کوشش کریں گے اور راستے کی تبدیلی بھی اسی مقصد کے لیے کی گئی تھی۔

ڈیش بورڈ سے آنے والی مدّھم روشنی کے انعکاس میں میری اور سلطان شاہ کی آنکھیں چار ہوئیں اور میں نے اس کے بُشرے پر ایک بار پھر خون کی پیاس مسلّط دیکھی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک خونخوار بھیڑیا تھا جو کسی مشکل میں پھنسنے کے بعد سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔

میں اُچھل کر ڈرائیور کے برابر والی نشست پر پہنچا اور سلطان شاہ نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ ٹیکسی جھٹکا لے کر سڑک پر لہرائی، اسی لمحے ایک ہلکے سے کھٹکے کی آواز ہوئی اور اس سے قبل کہ ڈرائیور اپنے بائیں ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کا پھل میرے بدن کے کسی حصے میں اتارنے میں کامیاب ہوتا' میں نے پوری سختی کے ساتھ اس کا بازو گرفت میں لے کر مروڑنا شروع کر دیا۔

وہ دونوں طرف سے اس بُری طرح شکنجے میں آیا کہ اسٹیئرنگ اس کی گرفت سے نکل گیا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ ٹیکسی کے اگلے پہیّوں اور اسٹیئرنگ کا میکینزم قابلِ رشک حالت میں تھا ورنہ ٹیکسی اسی رفتار سے کسی بھی ڈھلان پر اتر کر الٹ سکتی تھی۔

میرا اندازہ تھا کہ سلطان شاہ ڈرائیور کو پچھلی نشست پر اٹھا لے گا لیکن اس نے نہ جانے کیا دیکھا کہ جھک کر چلتی ہوئی ٹیکسی کا ڈرائیور کی سمت والا دروازہ کھولا اور

اگلے ہی لمحے ڈرائیور ہولناک چیخوں کے ساتھ چلتی کار سے نیچے لڑھک گیا۔

گرتے ہوئے اس نے سنبھالا لینے کی سر توڑ کوشش میں اپنا چاقو اگلے پائیدان میں پھینک دیا اور اسٹیئرنگ تھامنے کی کوشش کی اگر میں بروقت اسٹیئرنگ نہ سنبھال لیتا تو ٹیکسی بُری طرح داہنی طرف دائرے کی صورت میں گھوم جاتی۔

چند ثانیوں کے لیے ٹیکسی کو بُری طرح دھچکے لگے لیکن میں نے سرعت کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر رفتار ایک دم بڑھا دی۔

ٹیکسی کے لہرانے کی بنا پر پچھلی گاڑی والوں نے شاید گڑ بڑ کا اندازہ لگا لیا تھا اور رفتار بڑھا کر ٹیکسی کے بالکل عقب میں آپہنچے تھے لیکن ٹیکسی کے سڑک پر لہرانے کے باعث وہ آگے نکلنے کی ہمت نہ کر سکے تھے جس وقت سلطان شاہ نے ڈرائیور کو سڑک پر دھکیلا تو پچھلی گاڑی داہنی سمت سے گھس کر آگے نکلنے کے لیے کوشاں تھی۔ اگر اس کو پوری قوت سے بریک لگا کر نہ روکا گیا ہوتا تو ٹیکسی ڈرائیور اسی گاڑی کے پہیوں تلے روندا جا چکا تھا۔

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ پچھلی گاڑی اس مقام پر رک گئی تھی جہاں ڈرائیور کو بے رحمی کے ساتھ پھینکا گیا تھا۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ایک تندرست انسانی ہیولا سڑک پر پڑے ہوئے ساتھی کو سہارا دیتا نظر آیا پھر پچھلی گاڑی ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر آندھی اور طوفان کی رفتار سے ہمارے پیچھے بڑھنے لگی۔

"پچھلی سیٹ اکھاڑ دو۔" میں نے پائیدان سے چاقو اٹھا کر سلطان شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور سوٹ کیس اِدھر کھینچ کر اسلحہ نکالو ورنہ آج کی رات ہم بے موت مارے جائیں گے۔"

پچھلی نشست سے ریکسین پھٹنے اور بند ٹوٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔

میری ہدایت محدود اور مختصر سی تھی لیکن سلطان شاہ کی عقل اس وقت بہت اونچی پرواز کر رہی تھی۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس نے پچھلے دروازے سے ٹیکسی کی عقبی نشست اور اس کی پُشت گاہ سڑک پر لڑھکا دی۔

پیچھے آنے والی گاڑی کے ڈرائیور کے لیے وہ ناگہانی رکاوٹیں ایک امتحان بن گئیں۔ بریک چرچرانے کی آوازوں سے ویرانہ گونج اٹھا اور ہمارے درمیان کم ہوتا ہوا فاصلہ ایک بار پھر بڑھ گیا۔

"جیتے رہو برخوردار!" میں نے نعرہ لگایا۔ "آج تو تم کمال ہی کیے جا رہے ہو۔"

"میں تیار ہوں۔" قدرے توقف کے بعد سلطان شاہ کی بوجھل آواز سنائی دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کھلی خونریزی کا موقع پا کر اس پر نشہ سا چڑھنے لگا ہو۔ "انھیں قریب آنے دو، میں ایک ایک کو چھلنی کر دوں گا۔"

"خونریزی کی ضرورت نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ کوشش کرو کہ وہ خوفزدہ ہو کر فرار کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں۔"

"میرا بس چلے تو ان کی چڑیا کے بچّے کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔" اس کی تلخ اور بھرّائی ہوئی آواز ابھری۔ "آج کی رات میں ان کے لیے یادگار بنا دوں گا۔ اب تو اسلحہ بھی موجود ہے میرے پاس۔"

میں نے اپنے وجود کی گہرائیوں میں اداسی کی ایک لہر سی اُبھرتی محسوس کی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو سلطان شاہ! لیکن یہ بھی انسان ہیں کوئی گاجر مولی تو نہیں کہ انھیں بلا امتیاز نیست و نابود کر دیا جائے۔"

"ذرا کامران کو یاد کرو۔" اس کی آواز میں تلخی گہری ہو گئی۔ "وہ میرا نہیں، تمھارا ہونے والا سالا ہے۔ یہ زندہ لاشوں کے پروردگار ہیں صاحب!" فرطِ جذبات سے وہ تقریباً چیخ پڑا۔ "یہ ہیروئن نہیں، موت بلکہ بدترین موت بیچتے ہیں اور ان کے خریدار اس موت کو گلے لگانے پر مجبور ہیں۔ قسم پروردگار کی، میں ان میں سے کسی کو اور کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

"اتنا اونچا نہ بولو سلطان شاہ۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "شاید تم ہی نے بتایا تھا کہ تمھاری زمینوں پر بھی افیون کی کاشت ہوتی ہے۔"

"افیم، چرس، بھنگ، گانجا، شراب سب بیکار باتیں ہیں ڈپٹی صاحب۔" اس وقت وہ شاید زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ "یہ سب نشے ہیں جنھیں تم جب چاہو چھوڑ سکتے ہو لیکن ہیروئن؟ غلامی ہے غلامی۔ آدمی مر سکتا ہے لیکن اُسے چھوڑ نہیں۔۔۔"

پھر اچانک ہی ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ ٹیکسی میں بارود کی بُو بھر گئی۔ پیچھے آنے والی کار اس فائر کی زد میں آئی تھی کیونکہ دونوں کا درمیانی فاصلہ ایک بار پھر گھٹنے لگا تھا۔

"سائلنسر کیوں نہیں چڑھا لیا سلطان شاہ؟" میں نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے سوال کیا۔

"دھماکا جب تک کان گرم نہ کرے، گولی چلانے میں مزہ نہیں آتا صاحب۔" وہ اس وقت ہر زاویے سے کٹر قبائلی بنا ہوا تھا۔ "دھماکے میں ذرا مردانہ شان ہوتی ہے اور دل بھی بڑھتا ہے۔"

"چلو تو پھر یوں ہی سہی۔" میں نے اس کے جنگی فلسفے کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں پچھے میں ٹیکسی روکنے جا رہا ہوں۔ سوٹ کیس سنبھال کر نیچے آجانا، اب وہ زندہ لوٹیں گے یا ہم دونوں۔"

"میں مر بھی جاؤں تو پروا نہ کرنا۔" اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ "میں گاؤں سے ہیروئن بیچنے کے خواب لے کر کراچی آیا تھا لیکن اب اس سے نفرت ہو چکی ہے، اس سے جس کا بھی رشتہ ہے یوں سمجھو کہ وہ میرا کھلا دشمن ہے۔"

پھر پیچھے سے فائر ہوا اور گولی ہماری ٹیکسی کی آہنی باڈی سے ٹکرا کر رہ گئی۔

عقب نما آئینے میں پچھلی کار کی روشنیوں کا انعکاس کبھی قریب اور کبھی دور ہوتا نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ لوگ تعاقب جاری رکھنے یا متصادم ہونے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں۔

"ہوشیار!" میں نے آواز لگائی اور ٹیکسی اچانک داہنی طرف کچی ڈھلان پر اتار دی اور شدید جھٹکوں کے درمیان کچھ دُور جا کر بریک لگا دیے۔

سلطان شاہ مجھ سے پہلے ہی نیچے کود چکا تھا۔ میں بھی اگنیشن کی چابی جیب میں ڈالتا ہوا نیچے آگیا۔ اس اثنا میں دوسری کار سڑک پر رک چکی تھی لیکن اس میں سے کوئی اترتا ہوا نظر نہیں آیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ان سے ٹکرانے کے بجائے ہم بچ کر کسی طرف نکل جائیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔" میں نے تاروں کی چھاؤں میں سڑک پر کھڑی ہوئی کار کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میری دانست میں مقابلہ سود مند رہے گا۔" اُس نے فکر آمیز لہجے میں کہا۔ "ان میں سے کوئی ہاتھ آگیا تو خاصی معلومات حاصل ہو سکیں گی، ہو سکتا ہے کہ مقابلہ برابر ہی کا ہو۔"

"مجھے بھی کار میں دو ہی ہیولے نظر آ رہے ہیں۔" میں نے ادھر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "لیکن وہ کار میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟"

اسی لمحے وہ دونوں محتاط طریقے سے کار سے نکلتے نظر آئے۔ سلطان شاہ کا ارادہ گولی چلانے کا تھا لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے میں نے اسے روک دیا۔

میرے ایما پر سلطان شاہ نے دوسرا پستول سائلنسر لگا کر میرے حوالے کر دیا۔ ادھر سڑک پر پھیلی ہوئی تاریکی میں وہ دونوں غائب ہو چکے تھے اور سڑک کے کنارے کار کا ہیولا رات کی تاریکی میں آسیبی منظر پیش کر رہا تھا۔

میں نے سلطان شاہ کے ساتھ سرگوشیوں میں پروگرام طے کیا۔ اسے میری ایک تجویز پر شدید اعتراض تھا لیکن میرے اصرار پر اسے خاموشی اختیار کرنا پڑی اور میں ٹیکسی کی چابی اُس کے حوالے کر کے ایک طویل چکر کاٹتے ہوئے سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ اس دوران میں ان دونوں کی جھلک تک نہ دکھائی دی تھی۔ بس ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُنھیں زمین نگل گئی ہو لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ وہ تاریکی اور جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے ٹیکسی تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔

رات کے یکساں سنّاٹے میں جھینگروں کے مسلسل شور میں آخر کار میں سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ دیر تک میں اُن کی سیاہ مزدا سے کچھ دور سینے کے بل سڑک پر پڑا کار کا جائزہ لیتا رہا۔ جب مجھے وہاں زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو میں محتاط انداز میں کار کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے ہر لمحے یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں وہ دور سے اپنی کار کے نزدیک ایک انسانی ہیولے کو حرکت کرتے دیکھ کر میری حکمتِ عملی کا اندازہ نہ لگا لیں۔

کار خالی پڑی ہوئی تھی، دروازے غیر مقفل تھے اور اگنیشن سے چابی غائب تھی۔ میں نے وہیں پڑے پڑے حلق سے کسی خارش زدہ کتے کی سی بلبلاتی ہوئی آواز بلند کی۔ اس کی بازگشت معدوم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ویرانے میں آتشیں اسلحے کا نغمہ گنگنا اٹھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ سلطان شاہ نے اشارہ سُنتے ہی کارروائی کا آغاز کر دیا تھا۔

پھر یکے بعد دیگرے مزید دو فائر ہوئے۔ پُرشور دھماکوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ حریفوں کے پاس بھی بڑے بور کا اسلحہ موجود تھا۔ اس کے بعد تو دونوں ہی طرف سے فائرنگ میں تواتر آگیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دونوں فریقوں میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ راؤنڈز فائر کرنے کا مقابلہ شروع ہو گیا ہو۔

معاً مجھے ٹیکسی ڈرائیور کا خیال آیا جسے ہم نے کافی دور چلتی ہوئی ٹیکسی سے نیچے پھینک دیا تھا اور پھر اس کی دیکھ بھال کے لیے سیاہ مزدا سے ایک آدمی وہاں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اگر اس وقت وہ دونوں بھی اس طرف آنکلتے تو میری چال بُری طرح ناکام ہو سکتی تھی۔

مجھے بے چینی سی ہونے لگی۔ سلطان شاہ ضرورت سے زیادہ وقت برباد کر رہا تھا۔ اس کی فائرنگ میں طویل وقفے آنے لگے تھے جب کہ اس کے حریف پورے جوش و خروش سے گولیاں چلا رہے تھے۔ اگر فائروں کے شور کی ہی بنا پر کوئی اندازہ قائم کرنا ہوتا تو یہی کہا جا سکتا تھا کہ ایک فریق کے پاس میگزین کی کمی واقع ہو گئی تھی اور وہ کفایت پر اتر آیا تھا۔

آخر کار وہ واقع ظہور پذیر ہو ہی گیا جس کا مجھے شدت

سے انتظار تھا۔ فضا ایک ہولناک انسانی چیخ سے لرز اٹھی تھی۔ یوں معلوم ہوا تھا جیسے کوئی گولی کی زد میں آگیا ہو۔ دونوں طرف سے فائرنگ تھم گئی، فضا پر چھایا ہوا سکوت اعصاب شکن سا محسوس ہونے لگا پھر یکایک کسی انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور ٹیکسی نصف دائرے میں گھوم کر تیزی کے ساتھ سڑک کی طرف آنے لگی۔ اس پر پے در پے کئی فائر کیے گئے لیکن ناہموار کچی زمین پر دوڑنے کے باعث اس اندھیرے میں کسی بہترین نشانے باز کے لیے بھی اس کے کسی مخصوص حصے کو نشانہ بنانا ناممکن تھا۔ ہاں اتفاقاً کوئی گولی کسی ٹائر یا انجن کے حساس حصے کو چاٹ جاتی تو اور بات تھی۔

خود کو ٹیکسی کے ہیڈ لیمپس سے بچانے کے لیے میں سینے کے بل پتھریلی زمین پر گر گیا۔ آناً فاناً میں ٹیکسی سڑک پر آئی اور تیزی کے ساتھ آگے روانہ ہوگئی اور میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حملہ آوروں کے ردِ عمل کا انتظار کرنے لگا۔

ٹیکسی کے پیچھے اڑتے ہوئے غبار کے دھندلاتے ہی مجھے وہ دونوں بے تحاشا سڑک کی طرف آتے نظر آئے، شاید ان کے فرشتوں کو بھی توقع نہیں تھی کہ اُن کا مدِ مقابل جم کر مقابلہ کرتے کرتے یوں اچانک کسی چوہے کی طرح بھاگ نکلے گا۔ اب غالباً وہ جلد از جلد اپنی کار تک پہنچ کر تعاقب شروع کرنا چاہتے تھے۔

میں کار کی آڑ میں چھپا ان دونوں کا انتظار کرتا رہا

پھر جوں ہی وہ زد میں آئے میں نے پستول سیدھا کر کے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور وہ دونوں ہی بھاگتے بھاگتے خاک میں لوٹ گئے۔ ان میں سے ایک کی چیخیں بہت دردناک تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ زندہ نہ بچ سکے گا اور چند سیکنڈ میں اس کی آواز خرخراہٹوں میں تبدیل ہو کر معدوم ہوگئی۔ دوسرا بدستور وہیں پڑا کراہ رہا تھا۔

"ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ ورنہ تمہیں بھی بھون ڈالوں گا۔" طویل سکوت کے بعد میں نے قہر بار لہجے میں وارننگ دی۔

"میں اُٹھ نہیں سکتا، گولی میرے پیٹ میں لگی ہے۔" کراہتے ہوئے جواب دیا گیا۔

"دوسرا کس حال میں ہے؟"

"پتا نہیں، بے ہوش ہوا ہے یا شاید مر ہی چکا ہو... تم کون ہو؟ اور کیا چاہتے ہو؟"

"یہ تو تم ہی بتاؤ گے کہ کیا سمجھ کر ہمارے پیچھے لگے تھے؟" یہ کہتے ہوئے میں نے اندھیرے میں نظریں جما کر ان دونوں کا جائزہ لیا تو ایک بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور دوسرا پیٹ دبائے پہلو بدل رہا تھا۔

جب مجھے ان کے بے ضرر ہونے کا یقین ہو گیا تو میں آگے بڑھا اور زخمی کا کالر پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا مزدا کے سامنے لے آیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں اس کی تفصیل جامہ تلاشی لوں گا لیکن جب اس نے گڑگڑا کر مبرا مدعا دریافت کیا تو مجھے فی البدیہہ ایک مؤثر دھمکی سُوجھ گئی۔

"وہ گولی سے مرگیا، تمہارے چہرے پر سے کار کا پہیہ گزاروں گا تاکہ تمہارا آقا ایک جیسی لاشیں دیکھ کر الجھن کا شکار نہ ہو سکے۔"

"نہیں!" وہ دہشت زدہ آواز میں چیخا اور پھر زمین پر کروٹیں لیتا ہوا پھرتی کے ساتھ کار کے سامنے سے ہٹ گیا۔ "تم یہ درندگی نہیں کر سکتے..."

"کیوں نہیں کر سکتا؟" میں نے زہریلے لہجے میں سوال کیا۔ "تم ماموں تو نہیں ہو میرے۔"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" وہ خوف زدہ انداز میں بولا۔ "ہمیں صادق نے معاوضے پر بلایا تھا، ہم کل سے اسی کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔"

"یہ صادق کون ہے اور تمہیں کس لیے رکھا گیا تھا؟"

"وہ اس وقت بھی ایئرپورٹ پر ہوگا... تم دونوں کا حُلیہ بتا کر دوبارہ اندر گیا تھا پھر واپس نہیں لوٹا۔ ہمیں اس کے ایما پر کسی کو اغوا کرنے کے لیے تیار رہنا تھا۔ تم اتفاقاً درمیان میں آگئے یا سارا بکھیڑا ہی تمہارے لیے تھا۔"

میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ سرمئی سوٹ والا ہی صادق رہا ہوگا جس کی لاش ایئرپورٹ کے ایک بیت الخلا میں پڑی ہوئی تھی۔ "ٹیکسی ڈرائیور کس کا آدمی تھا؟"

"وہ بھی ہمارا ہی ساتھی ہے۔" وہ مشینی انداز میں ہر بات اگلنے کے لیے تیار تھا۔ "ہم تعداد میں چار تھے۔ چوتھے کو ڈرائیور کی دیکھ بھال کے لیے وہیں اتار دیا جہاں تم نے ڈرائیور کو پھینکا تھا۔"

"اسلحہ کس نے فراہم کیا تھا؟"

اسلحہ ہمارا اپنا ہے۔ تم نہ آتے تو ہمیں بغیر کام کے دس ہزار معاوضہ ملتا، کامیاب اغوا کی صورت میں معاوضے کی رقم پانچ گنا ہو جاتی۔ بس اسی لالچ میں جان ہتھیلی پر رکھ کر تمہارے پیچھے ہو لیے تھے۔"

"معاوضہ کیسے ملنا تھا؟"

"دس ہزار پیشگی مل گئے تھے، چالیس ہزار تمہیں پہنچانے پر ملتے۔"

"مجھے کہاں پہنچانا تھا؟"

"بے ہوش کر کے مصری شاہ کے ایک ویران کارخانے میں پہنچانا تھا جہاں صادق خود ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔"

انتظار تو وہ جہنم ہی میں کر رہا ہوگا ــــ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور پیچھے ہٹ کر سیاہ مزدا کے بونٹ کے سہارے ٹک گیا۔

زخمی نے جو کچھ بتایا وہ درست ہی معلوم ہو رہا تھا۔ تنظیم کے بڑوں کی یہ حکمتِ عملی کئی مواقع پر سامنے آچکی تھی کہ بھیڑ بھاڑ کے عارضی کاموں میں وہ کبھی اپنی باقاعدہ نفری نہیں جھونکتے تھے بلکہ ایک آدھ آدمی کے ذریعے زیرِ زمین دنیا کے پیشہ وروں کی عارضی خدمات حاصل کرنے کو ترجیح دیتے تھے کام ہوا اور بھیڑ بھاڑ ختم۔

اس اعتبار سے زخمی اتنا بڑا مجرم نہیں تھا کہ اسے مار ہی دیا جاتا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی اپنی بدقسمتی کی بناء پر مارا گیا ورنہ میری دانست میں وہ دونوں زندہ چھوڑے جانے کے مستحق تھے۔ بس ذرا سی گوشمالی کی ضرورت تھی جو پہلے ہی ہو چکی تھی۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق سلطان شاہ کو ٹیکسی لے کر پانچ سات منٹ تک تیز ڈرائیونگ کرنا تھی اور اس دوران میں اگر اس کا تعاقب نہ کیا جاتا تو اسے واپس لوٹ آنا تھا۔

"صادق کس کے لیے کام کرتا ہے؟" میں نے وقت گزاری کے لیے اس سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"معلوم نہیں ــ لیکن سُنا ہے کہ کسی بڑے آدمی کا کارندہ ہے پہلے دو کوڑی کا آدمی تھا لیکن پچھلے ایک ڈیڑھ برس سے کوئی اس سے اُلجھنے کی ہمت نہیں کر سکا ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"صادق اچانک ہی اُبھرا تھا۔ اس کے منہ لگنے والے دو تین داداؤں کا حشر بہت خراب ہوا تھا۔ ایک رات بھر چوک رنگ محل پر بے ہوش پڑا رہا اور کُتے اس کا منہ چاٹتے رہے۔ بس اسی دن سے سب نے سمجھ لیا تھا کہ صادق کسی زبردست کی پناہ میں چلا گیا ہے ورنہ پہلے تو وہ ہمارے ساتھیوں کی سا ہوا کرتا تھا۔"

"اس کی رہائش کہاں ہے؟"

"وہ بہت اُونچا اُڑ رہا ہے۔" وہ نقاہت زدہ مگر تلخ لہجے میں بولا۔ "کہاں رہتا ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ کس کا ملازم ہے؟ اسے لاہور میں کوئی بھی نہ بتا سکے گا۔ بس یہ معلوم ہے کہ آج کل ہیروئن کی خرید و فروخت میں وہ کہیں نہ کہیں ملوث ہے۔"

اسی لمحے دور سڑک پر مخالف سمت سے آتی ہوئی کسی کار کی روشنیاں دکھائی دیں اور میں بونٹ سے ہٹ کر نشیب میں اُتر گیا۔ "اسی طرح چپ چاپ زمین سے چپکے پڑے رہنا، کار کو اشارہ کرنے کی کوشش کی تو بے دریغ بھیجا اُڑا دوں گا۔"

"اب تمہارے معاوضے کا کیا ہوگا؟" کار دور تھی اس لیے میں نے اپنی جگہ سے گفتگو کا سلسلہ تھوڑے سے توقف کے بعد دوبارہ شروع کر دیا۔

"اگر تم چھوڑ دو گے تو بس ایڈوانس کے دس ہزار پر گزارا کرنا ہوگا۔" اس نے بے بسی کے ساتھ کہا۔

"ایک کے مرجانے کے بعد تمہارے حصے میں ویسے بھی اضافہ ہو چکا ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مُردوں کا مال ہم لوگوں کو راس نہیں آتا۔" وہ اداس لہجے میں بولا۔ "ویسے ایڈوانس کی رقم ہم پہلے ہی آپس میں بانٹ چکے تھے۔"

میں اس سے گفتگو کرتا رہا اور اسی اثنا میں وہ گاڑی قریب آ کر رُک گئی اور سلطان شاہ پستول تھامے نیچے اتر آیا۔ اس نے صورتِ حال دیکھ کر نہایت آسودہ ردِ عمل کا اظہار کیا گا

"یہ سب کرائے کے آدمی ہیں۔" میں نے اُسے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "اصل آدمی وہی سرمئی سوٹ والا تھا۔ اغوا کا معاوضہ پچاس ہزار طے ہوا تھا جس میں سے چالیس ہزار باقی ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ ہم اغوا ہو ہی جائیں تو بہتر رہے گا۔"

"مرجانا اس سے بھی بہتر رہے گا۔" وہ جل کر بولا اور میں بے اختیار مسکرا دیا۔

"تم سمجھے نہیں۔" میں نے زخمی شکار کی پروا کیے بغیر کہا۔ "دیکھنا چاہیے کہ سرمئی سوٹ والے کی عدم موجودگی میں مقررہ ٹھکانے پر ہماری وصولیابی کا کیا انتظام ہے۔ وہاں ہمیں تحویل میں لے کر چالیس ہزار کی ادائیگی بھی ہونی ہے۔"

"سرمئی سوٹ والے کو کیا ہوا؟" زخمی نے چونک کر سوال کیا۔

"ایئرپورٹ پر دلاتی کموڈ پر سر رکھے ابدی نیند سو رہا ہے۔" سلطان شاہ نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "الجھنا ہی چاہتے ہو تو دوسری بات ہے ورنہ وہاں بھی کوئی تیسرے درجے کا مُہرہ ہی ہاتھ آئے گا۔"

"صادق مرگیا ہے تو سمجھو ہماری رقم ڈوب گئی۔" زخمی کی افسردہ آواز اُبھری۔ "اس معاملے کو وہ تنہا چلا رہا تھا اب مصری شاہ کے اس ویران گودام میں کوئی نہ مل سکے گا۔"

سلطان شاہ پر اس وقت سنگدلی طاری ہو رہی تھی۔ وہ ہر اس شخص کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا تھا جس کا

موت کے سوداگروں سے ذرا بھی تعلق ہو لیکن میں نے سمجھا بجھا کر اسے زخمی کے ساتھ رعایت سے کام لینے پر آمادہ کر ہی لیا اور ہم دونوں اُسے وہیں بے ہوش کر کے ٹیکسی سے روانہ ہو گئے۔

جو کچھ ہو رہا تھا، ہمارے حق میں بہتر ہی ہو رہا تھا لیکن ہم صحیح سمت میں پیش قدمی کرنے کے بجائے بار بار اپنا راستہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوئے جا رہے تھے۔ ہمارا اصل مدعا یہ تھا کہ لے۔ لو کی سحر انگیز شخصیت کا طلسم توڑ کر تنظیم کا شیرازہ بکھیر دیا جائے لیکن درمیان میں دوسرے ضمنی واقعات ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ہم ذاتی طور پر تو لے لو کی شخصیت سے واقف ہو گئے تھے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تنظیم کی بیخ کنی کیسے کی جائے۔

پھر پچھلے چکر میں بات ذرا اور آگے بڑھ گئی تھی۔ لائیڈز کالج کے سیکیورٹی آفیسر نے اپنی گفتگو میں جمی لائیڈ کا حوالہ دیا جو اس کے بقول اس عمارت کا مالک تھا لیکن میں اپنی پرانی معلومات کی بنا پر اس بارے میں پُر یقین تھا کہ جمی لائیڈ اس گھناؤنے کھیل میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ یوں بظاہر ہمارا ٹارگٹ بھی تبدیل ہو چکا تھا۔

"یہ سب دقیانوسی باتیں ہیں۔" میری اُلجھن سے واقف ہونے کے بعد سلطان شاہ نے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔ "ناموں کے پیچھے بھاگیں گے تو ہم اپنا سر اندھی دیواروں سے ٹکراتے رہ جائیں گے۔ تنظیم کی تباہی ہمارا مقصد ہے۔ اب راستے میں جو بھی مزاحم ہونے کی کوشش کرے، اسے بے رحمی کے ساتھ روندتے ہوئے آگے بڑھ جاؤ۔"

"ہر ایک کو روندنے پر تُل گئے تو بھول بھلیوں میں کھو جاؤ گے۔ میری حکمتِ عملی یہ ہے کہ ہم غیر اہم لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اصل مقاصد پر توجہ مرکوز رکھیں۔"

"خیر جو کچھ بھی ہو، وہ تمہارا اپنا دردِ سر ہے۔" اس نے بحث سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "قاسم، سلام، صادق اور بہتیرے دوسرے لوگ غیر اہم تھے لیکن انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے تو یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

اس وقت ہم دونوں ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ صبح نمودار ہونے والی تھی لیکن ہم دونوں کی نگاہوں میں دور تک نیند کا پتا نہیں تھا۔ سلطان شاہ کا بس چلتا تو وہ اسی وقت اسلحہ سنبھال کر لائیڈز کالج کی طرف مارچ شروع کر دیتا۔

"ہمارا کام بہت پیچیدہ ہے" سلطان شاہ نے مجھے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میں توقیر سے مل چکا ہوں اور تصویر سے فون پر بات ہو چکی ہے۔ ان دونوں کی آوازوں میں گہری مماثلت ہے اور وقتِ ضرورت ان میں سے کوئی بھی لے لو کا کردار سنبھال لیتا ہے۔ اب تم خود غور کرو کہ تصویر کسی محفل میں بیٹھا ہو اور وہاں لے۔ لو فون پر کسی اور کو بلا کر ہدایات دینا شروع کر دے تو تصویر پر شبہ کون کر سکتا ہے۔ اسی طرح توقیر بھی شبہات سے بچا رہتا ہے۔ میں اس راز کی تہہ تک پہنچ چکا ہوں لیکن ان دونوں سے بات کروں تو کوئی لے لو ہونے کا اقرار نہیں کرے گا کیونکہ قانون کی طاقت میری پُشت پناہی نہیں کر رہی۔ یہی دشواری جمی لائیڈ کے بارے میں ہے۔ وہ لوگ مر جائیں گے لیکن اس کے بارے میں ہرگز زبان نہیں کھولیں گے۔ ان میں گھُسے بغیر کوئی بڑی کامیابی دشوار ہی نظر آتی ہے۔"

"میں تم سے پوری طرح متفق ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم جانتے ہو کہ ہاتھ پیروں کے مقابلے میں میری عقل کافی کم ہے۔ تم سوچو اور خوب سوچو پھر ایک فیصلہ کر کے مجھے حکم دو۔ پورا نہ کروں تو سُولی پر لٹکا دینا۔"

"میں اکیلا تمام فیصلے نہیں کر سکتا۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم بھی مجھے کوئی مشورہ دو کہ کون سا راستہ سب سے بہتر رہے گا۔"

وہ کسی بچے کی طرح معصومانہ انداز میں ہنس دیا۔

"مذاق اُڑا رہے ہو؟" میں نے اُسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"توبہ! میری یہ مجال۔" وہ کان تھامتے ہوئے بولا۔ "یہ سوچ کر ہنس پڑا تھا کہ ایسے معاملوں میں ہمارا حساب ٹھیک رہتا ہے۔ جو کچھ کرنا ہو، پہلے کر گزرتے ہیں، بعد میں سوچتے ہیں اور تم سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جا رہے ہو۔"

میں بھی بے اختیار ہنس دیا۔ اس کی بات دُرست ہی تھی، جہاں عمل کی کھُلی آزادی نہ ہو وہاں منصوبہ بندی بھی عموماً ناکام ثابت ہوتی ہے۔ حالات ایسے تھے کہ ہمیں پل پل پر فیصلے بدلنے کی ضرورت محسوس ہو سکتی تھی۔

"ٹرانسمیٹر سے ابتدا کرو، دیکھو کہ کیا جواب ملتا ہے۔" سُلطان شاہ نے قدرے توقف کے بعد اُکسایا اور میں نے فوری طور پر اس کا مشورہ قبول کر لیا۔

ٹرانسمیٹر آن کرتے ہی چند ثانیوں کے ریڈیائی شور کے بعد ریسیور پر ایک عجیب سی آواز سنائی دی اور ہم دونوں چونک پڑے۔ ابتدا میں تو ایک مردانہ آواز میں کہے ہوئے مہمل

الفاظ کے سوا کچھ پلے نہ پڑ سکا لیکن دو تین بار غور کرنے کے بعد ان مہمل الفاظ کا مفہوم سمجھ میں آ گیا۔

"بیبل ٹاک ... تھری کلاک ... ڈیڈلی راک ... شوگر کوئین ... اوور!" غیر ملکی لب و لہجے میں کوئی مردانہ آواز تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہی پیغام دہرا رہی تھی لیکن دوسری جانب سے جواب مفقود تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" سلطان شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

"سُنتے رہو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "ستارے اچھے ہی تھے کہ میں تمہارے مشورے پر ٹرانسمیٹر آن کر بیٹھا۔ دیکھو دوسری جانب سے ان کوڈ ورڈز کا کیا جواب آتا ہے؟"

"شوگر کوئین ہے تو اُن میں شوگر کنگ بھی ہو گا۔" وہ بولا۔ "مجھے تو ابنِ صفی مرحوم، کا لکھا ہوا ناول 'شوگر بینک' یاد آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ ہیروئن کے ذخیرے کو شوگر بینک ہی کہتے ہوں۔"

"جاسوسی ناول پڑھ کر منشیات فروشی نہیں کی جاتی، یہ کوئی اور ہی چکر ظہور میں آ رہا ہے ... پورے معاملے میں پہلی بار کوئی غیر ملکی آواز سنائی دی ہے۔ لب و لہجہ غیر ملکی معلوم ہوتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہی جمی لائیڈ ہو۔" اُس نے رائے زنی کی۔

"مجھے کچھ اور ہی نظر آ رہا ہے۔" میں نے ریسیور سے اُبھرنے والی اس مشینی آواز سے دھیان ہٹائے بغیر کہا۔ "شاید ہماری وجہ سے یہ آپریٹس واپس لے لیے گئے ہوں گے پھر ہمیں لائن سے مسلسل غائب پا کر اُنھوں نے محدود پیمانے پر مخصوص لوگوں کے لیے اس کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ انہیں دھوکے میں رکھنے کے لیے ہمیں اس کے استعمال سے احتراز کرتے ہوئے انہیں یہ تاثر دینا ہو گا کہ ہم اپنی کسی حماقت کی بنا پر آپریٹس تلف کر چکے ہیں۔"

"شوگر کوئین ریسپونگ اولڈ ڈارلنگ!" کافی دیر بعد آپریٹس پر دوسری سمت سے بولنے والی کی خوابیدہ آواز اُبھری اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ اگر میرا حافظہ دھوکا نہیں دے رہا تھا تو وہ ایمسٹرڈم کی فرم ایشلے ہاؤز کی نمائندگی کرنے والی غیر ملکی دوشیزہ ویرا لائیڈ کی آواز تھی۔

"فری لانس ... زیرو تھری ٹو ایکس اے بی ... فری اسٹائل ڈیڈلی راک ... اوور!" خوابیدہ نسوانی آواز شاید نشر ہونے والا پورا پیغام سُن چکی تھی کیونکہ اس نے کوڈ ورڈز میں فوراً اسی کا جواب دیا تھا۔

"ٹو لے ... زیرو تھری ٹو گاما فائیو ... آرمی سی او آر ... فری لانس ... اوور!" مردانہ آواز میں اس بار احترام نمایاں تھا۔

"او کے ... جے سی نائین ... اوور اینڈ آل۔" ویرا لائیڈ کی آواز سے مشابہت رکھنے والی نے دوسری طرف سے غالباً ہدایات جاری کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کی طرف سے ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو؟" سلطان شاہ نے آپریٹس پر خاموشی چھا جانے کے بعد پُر تشویش لہجے میں کہا۔

"دونوں ہی باتیں ممکن ہیں۔ یہ گفتگو کسی کامیابی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے ... اگر گمراہ ہی کرنا ٹھہرا ہوتا تو پھر شوگر کوئین کی صورت میں ویرا لائیڈ کی ہی آواز کیوں سنائی دی۔ اُس سے تو ہزاروں میل دور صرف میری ملاقات ہوئی تھی۔"

"یہ کیوں بھول رہے ہو کہ وہ مومن خان کی لیبارٹری کے لیے بھی کام کر چکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری لاعلمی میں پہلے سے یہاں آتی رہی ہو اور تنظیم کے لیے اجنبی نہ ہو۔"

ٹرانسمیٹر پر شوگر کوئین کے حوالے سے جو گفتگو ہوئی، وہ ناقابلِ فہم کوڈ ورڈز میں ہوئی تھی، لہٰذا میری دانست میں سلطان شاہ کا اندازہ دُرست نہیں تھا۔ ہاں اگر وہ گفتگو عام فہم زبان میں ہوتی اور اس کے ذریعے ہم کو کسی نئی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی تو میں ضرور شبہات کا شکار ہو جاتا۔ بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت کسی مجبوری کے تحت ٹرانسمیٹر کا سہارا لیا گیا تھا اور یہ اتفاق تھا کہ ہم آپریٹس آن کر کے وہ گفتگو سُننے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

بظاہر خفیہ اشاروں پر مشتمل وہ تمام گفتگو شوگر کوئین کے نام کے علاوہ ہمارے لیے بے سود تھی۔ اس سے بس یہی پتا چل سکا تھا کہ تنظیم کے مقامی معاملات میں بھی بعض غیر ملکی ملوث تھے۔

تھوڑی دیر کی سوچ بچار کے بعد میں نے آپریٹس پر سیکیورٹی آفیسر سے رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

دوسری طرف سے خلافِ توقع دوسری کال پر ہی جواب مل گیا۔ اس وقت میری رسٹ واچ صبح کے ساڑھے پانچ بجا رہی تھی لیکن دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ صبح خیز تھا یا پھر کسی وجہ سے اس رات جاگتا ہی رہا تھا۔

"دوسری مہلت بھی ختم ہو رہی ہے ... مجھے اپنے مطالبے

کا جواب چاہیے ــ اوور !" رابطہ قائم ہو جانے پر میں نے براہِ راست خشک لہجے میں مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"اچھی طرح تحقیقات کر لی گئی ہیں۔ ہمارا اسٹیٹ آفیسر جوئے کا شوقین نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس مد میں کسی کے پندرہ ہزار روپے کا مقروض ہے۔ تمہاری پوری کہانی سراسر جھوٹ پر مبنی ہے ــ اوور۔"

"وہ پرانی بات ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "پندرہ ہزار کی رقم میں تمہارے اسٹیٹ آفیسر کو انعام میں معاف کر چکا ہوں، اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ اب تو تیس لاکھ کی بات کرو۔ اوور !"

"تیس لاکھ !" ایک گہرے سانس کے ساتھ آواز ابھری۔ "لیکن کس لیے؟ اوور !"

"تمہارا حافظہ کمزور معلوم ہوتا ہے ایس او۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کوئی مقوی اعصاب دوا استعمال کیا کرو۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ فیس اب لائیڈز کالج کی ساکھ اور نیک نامی کی قیمت کے طور پر ادا کرنا پڑے گی۔ ورنہ پچھلے دنوں میں نے جو کچھ دیکھا اور بھگتا ہے، وہ تمام معلومات سرکاری اداروں کو فراہم کر دی جائیں گی جو تم سب کی زندگی عذاب بنا دیں گے ــ اوور !"

"تیس لاکھ بہت بڑی رقم ہے ــ اوور۔"

"ٹھیک ہے ــ اوور اینڈ آل۔" میں نے خشک لہجے میں بات ختم کر دی۔

"ایس۔ او کالنگ ڈول نمبر دو ... اوور !" رابطہ منقطع ہونے سے پہلے ہی اس کی آواز پھر سنائی دی۔

"اب کیا مصیبت ہے؟ اوور !" میں نے بگڑے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"تم تو ناراض ہو گئے ــ بات پوری بھی نہیں کرنے دی مجھے ــ اوور !" اس کی آواز میں مصالحت سے زیادہ خوشامد کا عنصر نمایاں تھا۔

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مجھے پیسے کا لالچ نہیں ہے۔ یہ رقم میں تم سے تمہاری کمزوریوں کی قیمت کے طور پر وصول کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں کسی محتاج گھر کو ہی دے دوں ــ اوور !"

"ٹھیک ہے، تو کب آ رہے ہو رقم لینے؟ اوور !"

"تمہیں اپنا آدمی بھیجنا ہوگا ــ دوپہر تین بجے میں منٹو پارک کی پارکنگ لاٹ میں انتظار کروں گا، تمہارا آدمی اکیلا ہوگا، کوئی چال چلنے کی کوشش کی گئی تو نتائج کی ذمے داری خود تم پر ہوگی ــ اوور۔"

"لیکن وہ تمہیں کیسے پہچانے گا؟ اوور !"

"میرے گلے میں سُرخ مفلر لپٹا ہوا ہوگا ــ وہ مجھے شوگر کوئین کہے گا اور میں جواب میں شوگر کنگ کہوں گا ــ اوور !" میں نے سلطان شاہ کو آنکھ سے اشارہ کر کے معنی خیز لہجے میں کہا اور میری بات کا اثر توقع کے عین مطابق رہا۔

"تو تم وہ گفتگو سُن چکے ہو۔" اس نے شاید گہرا سانس لے کر کہا تھا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ تم ہم سے تعاون کرو۔ ہم ذہین لوگوں کی قدر کرتے ہیں ــ ہمارے ساتھ کام کر کے تم تیس لاکھ کو بھول جاؤ گے ــ اوور !"

"تیس لاکھ وصول کرنے کے بعد سوچا جا سکتا ہے۔" میں نے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔ "اس بارے میں تمہارے کسی بڑے کو سامنے آنا ہوگا۔ اس کے بغیر بات نہیں بن سکے گی ــ اوور !"

"میں تمہارا پیغام باس تک پہنچا دوں گا۔" قدرے توقف کے بعد کہا گیا۔ "میرا آدمی مقررہ وقت پر منٹو پارک پہنچ جائے گا۔ اس کے پاس براؤن رنگ کے چرمی بریف کیس میں رقم ہوگی اور سر پر نیلی ٹوپی اوڑھے ہوئے ہوگا ــ اوور !"

"لگے ہاتھوں یہ بھی سُن لو کہ اگر صادق تمہارا آدمی تھا تو ایئرپورٹ کے ایک بیت الخلا میں تمہارا یا کسی حاجت مند کا منتظر ہے۔ اسے وہاں سے اٹھوا لینا ــ اوور !" میں نے وہ شوشا بھی چھوڑ دیا۔

"اوہ !" اس کی اضطراری آواز سنائی دی۔ "وہ زندہ ہے نا؟ اوور !"

"ڈھیٹ ہوا تو گردن ٹوٹنے کے بعد بھی زندہ رہ گیا ہوگا۔ یہ یاد رکھنا کہ میں ہر وقت آنکھیں کھلی رکھنے کا عادی ہوں۔ اوور اینڈ آل۔" اس بار میں نے ٹرانسمیٹنگ بٹن چھوڑنے کے ساتھ ہی اپریٹس آف کر دیا۔

"یہ تم نے اچھا کیا کہ اُسے ہر بات جتا دی۔" اِدھر سے فارغ ہوتے ہی مجھے سلطان شاہ کا تبصرہ سنائی دیا۔ "شوگر کوئین اور صادق کے حوالے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیں گے۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ میں ابھی تک ان کا رازداری کا طلسم توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔" میں نے گہرا سانس لے کر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بس جس دن یہ طلسم ٹوٹا تنظیم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔"

"ہم خود ہی نیچے والوں کو ان رازوں سے آگاہ کر سکتے ہیں۔"

"مشکل ہے، کوئی یقین نہیں کرے گا۔ تصویر پوری تنظیم کے لیے لے ڈوبے۔ لائیڈز کالج والوں پر نادیدہ باس بن کر حکمرانی کر رہا ہے لیکن عملاً اسی عمارت میں اسٹیٹ منیجر کی حیثیت سے رہ رہا ہے۔ میں نے تو اندازہ لگایا ہے کہ سیکیورٹی آفیسر بھی اہم معاملات میں اپنے اسٹیٹ منیجر کو گھاس نہیں ڈالتا بلکہ خود کو باس کا جوابدہ سمجھتا ہے۔"

"تصویر تو خود تم سے ملنے کی فکر میں ہے، اسی کو چارہ کیوں نہیں ڈالتے؟"

"یہ بھی کرنا پڑے گا۔ میں اس سے دامن بچانا چاہ رہا تھا، ہو سکتا ہے کہ وہ میری جان ہی لینے کے درپے ہو رہا ہو۔"

ناشتے تک باقی وقت ہم نے مشوروں میں صرف کیا پھر کمرے ہی میں ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نیچے اتر گیا۔ ویسے تو ہوٹل کے کمرے میں بھی فون موجود تھا لیکن میں آپریٹر کی وساطت سے تصویر کو فون کر کے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

نیچے پبلک ٹیلی فون بوتھ سے میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لائیڈز کالج کا وہ نمبر ملایا جس پر براہِ راست تصویر سے بات ہو سکتی تھی۔ اس بار پھر اسی نسوانی آواز سے واسطہ پڑا جو میں اسی نمبر پر پہلے بھی سُن چکا تھا۔

"میں تصویر علی صاحب سے بات کر سکتا ہوں؟" میں نے خوشگوار لہجے میں دریافت کیا۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟" اس کی مترنم آواز میں بلا کا اعتماد نمایاں تھا۔

"اگر آپ ان کی بیوی ہیں تو میں آپ کا دیور بول رہا ہوں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میں سیکریٹری ہوں اُن کی۔" اس نے میری تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "نام کیا ہے آپ کا؟"

"سیکریٹری ! اچھا تو آپ سیکریٹری ہیں۔" میں نے خوشدلی کے ساتھ کہا۔ "میرا نام ڈینی ہے۔"

"ڈینی؟" حیرت کے ساتھ دہرایا گیا، پھر فوراً ہی جواب ملا۔ "ذرا لائن ہولڈ کریں۔"

"ہاں بھئی تنویر۔" چند ثانیوں کے بعد ہی ریسیور میں تصویر کی کھنکتی آواز سنائی دی۔ "کیسے خیال آ گیا ہمارا؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم بڑی ماں سے ملے بغیر لاہور چھوڑ چکے ہو اور اب شاید ہی مجھ سے رجوع کرو۔"

"میں نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلسل پریشانیوں نے میری قوتِ فیصلہ سلب کر لی ہے۔ اب پتا نہیں یہ اتفاق ہے یا حقیقت کہ میری بیشتر پریشانیوں کا تعلق لائیڈز کالج سے ہے اور تم وہیں موجود ہو۔"

"مجھے خوشی ہے کہ اس اُلجھن میں تم نے مجھ سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔" اس کی مسرت آمیز آواز سنائی دی۔ "یہ سب باتیں فون پر نہ ہو سکیں گی، تم مجھ سے کہیں مل کیوں نہیں لیتے؟"

"تم میری مجبوریوں کا اندازہ نہیں کر سکو گے۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "میں اپنے مشیروں کی بھیڑ میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا ہوں۔ ان کے نزدیک میری سلامتی ہر معاملے اور رشتے پر مقدم ہے۔"

"ایسی بھی کیا بے بسی کہ تم اپنے بڑے بھائی سے ملنے بھی نہ آ سکو۔"

"وہ میری لاعلمی میں بھی ہر وقت میری حفاظت کرتے ہیں۔" میں نے پھر پُر اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "پھر لائیڈز کالج ان کے نزدیک میرا مقتل قرار پا چکا ہے۔ میرا وہاں آنا مشکل ہوگا۔"

"تو پھر کہیں بھی مل لو ــ جہاں تمہیں سہولت ہو۔" اس نے پیشکش کی۔

میں نے چند ثانیوں کے لیے خاموشی اختیار کر لی، جیسے سوچ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہا ہوں، پھر بولا۔ "اس وقت نو بجے ہیں، دس بجے کانٹی نینٹل کے ریستوران میں آ سکو گے؟"

"میں پہنچ جاؤں گا۔" اس نے بلا توقف جواب دیا۔ "بلکہ ہم کھانا بھی وہاں ساتھ ہی کھائیں گے۔"

"کھانے کے لیے میں نہ رُک سکوں گا۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے ڈھائی بجے ایک ضروری کام نمٹانا ہے۔"

"خیر خیر ــ وہ دیکھ لیں گے، میں ٹھیک دس بجے وہاں پہنچ رہا ہوں۔"

"یہ دلیرانہ فیصلہ کیا ہے تم نے۔" تصویر سے گفتگو کی تفصیل سُنتے ہی سلطان شاہ نے بے اختیار کہا۔ "گھر میں بندرہ کر سوچنے اور رسکنے سے بہتر ہے کہ بڑھ کر دشمن سے دو دو ہاتھ کیا جائے۔"

"تم پر بہت بھاری ذمے داری آ گئی ہے۔"

"میں ذمے داری سے منہ نہیں موڑوں گا ــ بس تم شارٹ تا بتا دو۔"

"میں نے اسے یہ تاثر دیا ہے کہ میں ہمدردوں اور بہی خواہوں کی ایک بھیڑ میں رہ رہا ہوں جو ہر وقت میری سلامتی کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں جب کہ میرے ساتھ تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہے، تمہیں بہت چوکنا رہنا ہوگا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں تمہارے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

میں برآمدے میں پام کے گملوں کی اوٹ میں یوں کھڑا ہوا تھا جیسے کسی کا انتظار ہو۔ میں تصویر کو خود ہی خوش آمدید کہنا چاہ رہا تھا تاکہ اس کے ساتھ آنے والوں کی تعداد سے باخبر رہ سکوں۔

ٹھیک دس بجنے میں تین منٹ پر ایک لمبی چوڑی سیاہ فورڈ فالکن سڑک پر تیرتی ہوئی نمودار ہوئی اور ہلکے سے ہچکولے کے ساتھ ہوٹل کے پورچ میں آرکی۔

آنے والا شاید ہوٹل والوں کے لیے اجنبی نہیں تھا کیونکہ دربان نے شناسائی کے انداز میں احتراماً سر جھکاتے ہوئے چھپائی ہوئی کار کا عقبی دروازہ کھولا تھا اور ایک دراز قامت و توانا شخص سر ہلاتا ہوا کار سے نیچے اترا تھا۔

وہ کار سے اتر کر سیدھا اندر چلا گیا۔ اس کے ڈرائیور نے مٹھی میں دبا ہوا ایک نوٹ ہوٹل کے دربان کی طرف بڑھایا اور کار پارکنگ کے لیے آگے لیتا چلا گیا۔ کار میں ڈرائیور اور اس دراز قامت کے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں تھا۔

میں ایک لمحے کے لیے الجھن کا شکار ہو گیا کیونکہ میں تصویر کو نہیں پہچانتا تھا۔ لڑکپن کی یادوں کے مطابق تصویر اور توقیر کے خدوخال میں بہت فرق تھا جس کی وجہ سے اندازے سے کام چلانا بھی دشوار تھا۔ آخر میں نے ہوٹل کے دربان ہی سے مدد لینے کا فیصلہ کیا اور میرے استفسار کے جواب میں اس نے بتایا کہ آنے والا ہی ٹی۔ اے ملک تھا۔

وہ مخفف نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے معاملے میں میں نصیر خان کی زبانی وہ نام پہلے بھی سن چکا تھا۔ یوں تو ہم تینوں ہی بھائیوں کے نام کے ابتدائی حروف ٹی۔ اے بنتے تھے لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ تصویر اور توقیر نے اپنے ناموں کے ساتھ ملک کا اضافہ کب سے اور کیوں کیا تھا۔

میں لاؤنج سے گزر کر ریستوران میں داخل ہوا اور وہیں رک کر طائرانہ انداز میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا جن کی تعداد قابلِ ذکر نہیں تھی۔ میں نے حکمت عملی کے طور پر دانستہ فورڈ فالکن والے کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے خود ہی ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور میں اسی کی میز کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

"ڈینی؟" میرے قریب پہنچنے پر اس نے کرسی سے اٹھ کر استفسار طلب لہجے میں کہا اور میرے سر کی تائیدی جنبش کی صورت میں جواب پاتے ہی اس نے والہانہ انداز میں مجھے اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔

وہ حقیقت رہی ہو یا اداکاری لیکن چند ثانیوں کے لیے میرے دل و دماغ پر ایسی رقت سی طاری ہوئی کہ میں اس کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا اور آخر کار اس نے میرے بدن کے گرد اپنی مضبوط گرفت ڈھیلی کر دی۔

"میرا خیال تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔" وہ بولا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔ "بڑی ماں بھی آنے کے لیے تڑپ رہی تھیں لیکن یہاں آکر وہ تماشا بن جاتیں، اسی لیے گھر چھوڑ آیا۔"

"کیا بڑی ماں واقعی زندہ ہیں؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پہلا چبھتا ہوا سوال کر ہی ڈالا کیونکہ اس وقت تک میں اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پا چکا تھا۔

"یہ بڑی ماں کا ہی دم ہے کہ میں اس وقت یہاں نظر آرہا ہوں، ورنہ میں تو تمہاری طرف سے صبر کر چکا تھا۔ وہ عورت آج بھی تمہیں یاد کر کے تڑپتی ہے۔" اس نے کہا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کے سامنے اپنے جارحانہ تیور زیادہ دیر تک برقرار نہ رکھ سکوں گا۔ توقیر کے برعکس اس کی شخصیت بہت بارعب اور کشش انگیز تھی۔

"لائیڈز کالج میں کیا کھیل ہو رہا ہے؟" ویٹر کو کافی کا آرڈر دینے کے بعد میں نے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"کچھ ہو ضرور رہا ہے لیکن میں اس سے بالکل لاعلم ہوں۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "وہاں مجھے اتنی خطیر تنخواہ ملتی ہے کہ میں غیر متعلقہ معاملات میں ٹانگ اڑانے سے گریز ہی کرتا ہوں لیکن جو کچھ ہوا وہ پچھلے دو چار روز ہی میں ہوا ہے۔ اس سے پہلے وہاں کبھی کوئی گڑبڑ سننے یا دیکھنے میں نہیں آئی۔"

"اور وہاں باس کون کہلاتا ہے؟"

"تمہاری معلومات قابلِ رشک ہیں۔" اس نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔ "باس کا نام لیا ہے تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ اس سے کوئی واقف نہیں۔"

"پھر بھی وہ جو کوئی ہے، اندر ہی کا آدمی ہو سکتا ہے۔" میں نے تائید طلب لہجے میں کہا۔

"لائیڈز کالج ایک سرپھرے غیر ملکی کی جاگیر ہے

وہاں رہنے اور کام کرنے والوں کا عام خیال ہے کہ جمی لائیڈ اپنے شوق اور خبط کی خاطر انہیں بڑی بڑی تنخواہیں ادا کر رہا ہے، وہاں بدترین حالات سے نمٹنے کے لیے بہترین افراد ملازم رکھے گئے ہیں لیکن پچھلے چند دن کے استثنا کے علاوہ کبھی انہیں کھلے بندوں استعمال نہیں کیا گیا۔ باس جو بھی ہو لوگ اس کا حکم بجالاتے ہیں، اس کا کھوج لگانے کی ہمت آج تک کوئی نہیں کر سکا۔"

"لیکن شبہات تو پائے جاتے ہوں گے اس کے بارے میں؟"

"فطری بات ہے لیکن لوگ ایک دوسرے سے اس کا اظہار بھی کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں شاہانہ نوکری سے جواب نہ مل جائے۔" اس نے کہا۔ پھر چونک کر سوال کیا۔ "لیکن تم ان معاملات میں اس قدر کیوں الجھ گئے ہو؟"

میں کچھ کہے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ وہ یا تو بہت زبردست اداکار تھا یا پھر سچ ہی بول رہا تھا کیونکہ اس کے لب و لہجے میں مجھے بھرپور سچائی رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں ان معاملات میں گلے گلے ملوث ہوں تصویر صاحب!" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "جب تک مجھے اپنے ہر سوال کا جواب نہ مل جائے، میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکوں گا۔"

"میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

"تمہیں میری تلاش کس لیے تھی؟"

"صرف بڑی ماں کے لیے۔ باپ کے سائے سے محرومی کے بعد میں نے کبھی ان کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کی، ہر خواہش کو حکم تصور کیا ہے۔"

"رمضان چاچا پر تشدد کیوں کیا گیا تھا؟"

"میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ مجھے کسی تشدد کا علم نہیں۔ ایک مرتبہ اس سے ملاقات ضرور ہوئی تھی اور اس نے تمہارے بارے میں بتایا تھا اور میں نے اسے اپنا فون نمبر دے دیا تھا کہ تمہارا پتا چلے تو خاموشی سے مجھے خبر کرے۔ میں اچانک ہی بڑی ماں کو تمہارے سامنے لانا چاہتا تھا۔"

"اور اس کے لیے تم نے رمضان چاچا کو دس ہزار کی رشوت بھی دی تھی؟" اس کے لب و لہجے میں سچائی کی بُو محسوس کرنے کے باوجود میں نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

"اس دور میں دوسروں کی طرح میں بھی بہت خودغرض ہوں۔" اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن وہ بڑی ماں کی ایک حسرت کا معاملہ تھا۔ میں صاحبِ حیثیت تھا اور رمضان چاچا ایک عیال دار غریب آدمی، لہٰذا میں نے خلوصِ دل سے اس کی مالی اعانت کی نیت سے وہ رقم اسے دی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے میری کسی بدنیتی کی قیمت ہی سمجھا ہو کیونکہ پرانے محلے کو خیرباد کہنے تک ہم دونوں بھائیوں کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔ محلے کے شرفا بھی ہم سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتے تھے۔"

"توقیر کہاں ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر سوال کیا۔

"کینیڈا کے شہر اوٹاوا میں مدت سے مقیم ہے۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں، یقین نہ ہو تو میں فون نمبر دیتا ہوں، ابھی اس سے بات کر لو۔ تمہاری تسلی ہو جائے گی۔"

باتیں یکے بعد دیگرے صاف ہوتی جا رہی تھیں اور اگر میری عقل پر پردے ہی نہیں پڑ گئے تھے تو بظاہر وہ سچ بول رہا تھا۔ اس کا ہر لفظ میرے قیاسات کی بنیادوں کو ہلائے دے رہا تھا۔

"پھر کراچی میں مجھ سے توقیر کے روپ میں ملنے والا کون تھا؟"

"حاشا و کلا مجھے نہیں معلوم۔" اس نے کہا۔ "پھر وہی بات آجاتی ہے کہ ہمارے درمیان میں کوئی ایسا شخص آیا ہوا ہے جو تمہاری غلط فہمیوں کا رُخ ہماری طرف منتقل کرنے پر تلا ہوا ہے۔"

"توقیر کی کوئی تصویر ہے تمہارے پاس؟"

"گھر چلو، ایک نہیں دسیوں دکھا دوں گا۔ ہم دونوں کی بڑی ماں کے ساتھ بے شمار تصویریں ہیں، تمہاری بھی بچپن کی دو چار موجود ہوں گی۔ ان ہی سے تم اندازہ لگا لو گے کہ تم سے ملنے والا کون تھا۔ توقیر یا کوئی فریبی۔"

"لیکن ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے ایم ڈی تو تم ہی ہو۔" میں نے اچانک ہی سوال کیا۔

"صرف کاغذات کی حد تک، عملی معاملات سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ وہاں کا سارا کام نصیر خان چلاتا ہے لیکن تم لائیڈز کالج میں نوکری کے ساتھ وہاں کیسے ملوث ہو؟" میں نے تیکھے لہجے میں چبھتا ہوا سوال کیا۔

"اس کا مجھے کوئی اضافی معاوضہ نہیں ملتا۔ ملازم رکھنے والا جہاں جو کام چاہے لے سکتا ہے۔ وہ ذمے داری میں نے باس کے حکم پر ہی سنبھالی تھی جو صرف کاغذات تک محدود ہے۔ کبھی کبھار بہادر خان کاغذات لے کر آتا ہے اور مجھ سے دستخط کرا کے لے جاتا ہے، مجھے تو آج تک یہی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ فرم کیا کام کرتی ہے۔ چند روز پہلے اخبارات میں پڑھا تھا کہ اُسے

بھی آگ لگادی گئی۔ ملبے سے ایک مسخ شدہ، جلی ہوئی لاش بھی برآمد ہوئی تھی۔"

"وہ بہادر خان تھا۔" میرے انکشاف پر اس کی آنکھیں حیرت سے کشادہ ہوگئیں۔" نصیر خان سمیت دفتر کے ملازمین میں سے کسی نے فرم کے مالک کو نہیں دیکھا تھا۔ بس بہادر خان روزانہ چوری چھپے ڈاک اور ضروری کاغذات نکال لاتا تھا۔"

"یہ تو بالکل وہی طریقۂ کار تھا جو لائیڈز کالج میں رائج ہے لیکن بہادر خان کو مارنے والا کون تھا؟"

"وہی رہا ہوگا جس نے دفتر کو آگ لگائی تھی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔" لیکن یہ اطلاع تمہارے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ ایشین سنڈیکیٹ ہیروئن کی غیر قانونی برآمد میں ملوث تھی۔"

"تم مجھے پاگل کردو گے۔" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں یہ سب معلومات کن ذرائع سے حاصل ہوئیں؟"

"میرے ساتھ بہت سے لوگ کام کرتے ہیں۔ یہ معلومات ان ہی کی مہینوں کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ اس دوران... کراچی میں نام نہاد توقیر نے نمودار ہوکر کچھ ایسی حرکات کیں کہ میرے تمام تر شبہات کا رُخ تمہاری طرف ہوگیا ـــ میں بلاوجہ ہی تم سے بدظن نہیں تھا۔"

"بات سمجھ میں آتی ہے۔" وہ سر ہلا کر بولا۔" ان حالات میں لائیڈز کالج میں میری موجودگی تمہارے شبہات کو تقویت دینے کے لیے کافی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شخص ہمارے درمیان غلط فہمیاں پھیلا کر کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے؟"

"وہ صرف میرے شبہات کا رُخ اپنی ذات سے ہٹانا چاہتا تھا ـــ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس ضمن میں اسے تمہاری مضبوط ذات کا سہارا مل گیا۔ میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس دوران میں تمہاری نگرانی بھی ہوتی رہی ہے۔"

"یہ کس بنا پر کہہ رہے ہو؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"تم رمضان چاچا سے ملے تھے اور وہ اس کی نگاہوں میں آگیا۔ پھر جب میں رمضان چاچا سے ملا تو میرے جانے کے بعد اسے اٹھوا لیا گیا۔ اس نے زبان تو نہیں کھولی لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ رمضان کو یہی تاثر دیا گیا ہوگا کہ تشدد کے پسِ پشت تمہارا ہاتھ کارفرما ہے۔"

"بات پھر مقصد کی آجاتی ہے۔"

"سامنے کی بات ہے، مجھے اشتعال دلا کر تمہارے پیچھے لگانا تھا۔ اس وقت تک رمضان چاچا سے ملے ہوئے فون نمبر کے ذریعے لائیڈز کالج میری نگاہ میں آچکا تھا۔ مقصد یہی رہا ہوگا کہ میں اِدھر کا رُخ کروں اور دھر لیا جاؤں۔"

"نگرانی والی بات پھر بھی حلق سے نہیں اُترتی۔" وہ پُرتشویش لہجے میں بڑبڑایا۔" رمضان چاچا سے بغیر کسی پروگرام کے کچہری کے گیٹ پر ملاقات ہوئی تھی۔ پھر میں اسے ہوٹل لے گیا تھا۔"

"تم بھول رہے ہو کہ تمہارے ساتھ اس وقت کوئی اور بھی تھا۔"

"صادق تھا۔" وہ یاد کرتے ہوئے بولا۔" لیکن اس کے بارے میں میں کوئی غلط بات سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"یہی تمہاری بھول ہے۔" میں نے صادق کے نام پر چونکتے ہوئے کہا۔" واقعات کی کڑیاں بکھر کر ازسرِنو یکجا ہو رہی تھیں اور تشنہ سوالوں کے جواب بھی ملتے جارہے تھے۔" یہ صادق وہی تو نہیں ہے جو عینک لگاتا ہے اور بائیں ٹانگ پر زور دے کر چلتا ہے۔"

"وہی... وہی ہے! تم اُسے کیسے جانتے ہو؟" وہ بے تابانہ لہجے میں بولا۔

"اس کی فاتحہ پڑھ لو۔ تمہاری آستین کا سانپ وہی تھا اور آج صبح سویرے ایئرپورٹ پر میرے ہاتھوں مارا جاچکا ہے۔" میں نے کہا اور وہ بے یقینی کے عالم میں میرا منہ تکتا رہ گیا۔

اس کے استفسار پر میں نے ایئرپورٹ پر صادق سے ٹکراؤ اور پھر اس کی ہلاکت کے بارے میں سارے واقعات من وعن دہرا دیے اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"وہ لائیڈز کالج میں میرے گہرے ساتھیوں میں سے تھا۔" میری بات پوری ہونے پر وہ بولا۔" اسی کے ساتھ وہ سیکیورٹی آفیسر کا بھی منہ چڑھا تھا ـــ اب مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ یہ سارا چکر طفیل ہی کا چلایا ہوا نہ ہو۔ ایشین سنڈیکیٹ کے کاغذات لانے والا محمود بھی اکثر و بیشتر اسی کے لیے کام کیا کرتا تھا۔"

"مجھے حیرت ہے کہ تمہارے ذریعے مجھے گھیرنے کی بالواسطہ کوششوں کے باوجود انھوں نے براہِ راست تم سے کوئی بات نہیں کی۔"

"اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔" اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔" صادق کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں بڑی ماں کی خواہش کے احترام میں ہر قیمت پر تمہیں تلاش کرکے ان سے ملانا چاہتا ہوں۔ اس سے میں ذاتی معاملات میں کھل کر تبادلہ خیال کیا کرتا تھا۔"

"کبھی اے۔ لُو کا نام سننے کا بھی اتفاق ہوا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ کیا بلا ہے؟"

"میرے نزدیک تو بلا ہی ہے۔" میں نے کافی کی پیالی خالی کرتے ہوئے کہا۔" اُسے بھی کسی نے نہیں دیکھا لیکن وہ کراچی میں ہیروئن کی فراہمی اور تقسیم کا سب سے بڑا اور منظم ریکیٹ آپریٹ کر رہا ہے ـــ کہا جاتا ہے کہ اس کا ہیڈ کوارٹر لاہور ہی میں ہے۔"

"مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میرے ہی نصیب میں حرام کی روزی لکھی ہوئی ہے لیکن تمہاری کہانیوں نے تو دماغ ہی ماؤف کرکے رکھ دیا ہے۔ نجانے کب سے تم ان گورکھ دھندوں میں اُلجھے ہوئے ہو۔"

"اے۔ لُو اور لائیڈز کالج کا باس ایک ہی شخصیت کے دو رُوپ معلوم ہوتے ہیں اور میں اس کی بیخ کنی پر تُلا ہوا ہوں۔"

"طریقۂ کار کی یکسانیت کی بنا پر تم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔" اس نے اعتراض کیا۔" ہوسکتا ہے کہ دونوں کا سرے سے آپس میں تعلق ہی نہ ہو۔"

"یہ تم کہہ سکتے ہو، میں نہیں سمجھ سکتا۔" میں نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔" مجھے لائیڈز کالج سے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو اے۔ لُو کے فراق میں ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ تک پہنچا تھا جس سے اس کا ناقابلِ تردید تعلق ہے۔ اسی سلسلے میں لائیڈز کالج سامنے آیا اور تم خود ایشین سنڈیکیٹ سے تعلق کا اعتراف کرچکے ہو۔ اب تو مجھے لائیڈز کالج پر ہی توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔"

"میں تمہاری تردید بھی نہیں کرسکتا لیکن اتنا بتا دوں کہ لائیڈز کالج تقریباً ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے ـــ وہاں بے جگر لڑاکوں اور نشانہ بازوں کی ایک پوری فوج کسی بُرے دن کے انتظار میں پل رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی جذباتی فیصلہ تمہیں لے ڈوبے۔"

"جمی لائیڈ کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟" میں نے اچانک ہی سوال کیا۔

وہ بے ہنگم انداز میں ہنس دیا۔" اس کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ کروڑپتی اور بے حد لاابالی انسان ہے۔ سُنا ہے کہ دنیا کے ہر برِاعظم میں اس کے خطیر مالی مفادات ہیں۔ وہ اِن گھٹیا کاموں کی سرپرستی نہیں کرسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے ملازمین میں سے کوئی اس کے اعتماد کو دھوکا پہنچا رہا ہو۔"

میں اس کی کم فہمی پر دل ہی دل میں ہنس کر رہ گیا۔ اگر میں اُسے جمی لائیڈ کے بارے میں بتا دیتا تو شاید وہ حیرت سے بیہوش ہو جاتا۔ میری توقع کے برعکس وہ خاصا کند ذہن ثابت ہو رہا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ لاکھوں اور کروڑوں کی ہوس کسی غریب آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی، وہ بے چارہ تو سر چھپانے، پیٹ بھرنے اور تن ڈھانپنے کی ہی فکر میں ساری زندگی گزار دیتا ہے۔ دولت کے انبار میں اضافے اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کما لینے کی ہوس ان ہی لوگوں میں ہوتی ہے جو عُرفِ عام میں زردار کہے جاتے ہیں اور اپنی آخری سانس تک پیسے کے بل پر اپنی سلطنت میں توسیع کے متمنی رہتے ہیں۔

میرے شبہات اور اندازوں کی پوری عمارت یک بیک مسمار ہوچکی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں ہر لمحے اے۔ لُو کی شہ رگ کے قریب تر ہوتا جارہا ہوں لیکن تصویر نے اپنی شخصیت، سوچ اور گفتگو سے میری وہ غلط فہمی رفع کردی تھی۔

اے۔ لُو نجانے کون تھا؟ کہاں تھا؟ اور میرے صبر کا امتحان کیوں لے رہا تھا؟

"اگر ہم میں سے ہی کوئی یہ کھیل کھیل رہا ہے تو اب مجھے محتاط رہنا ہوگا۔" اس نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔" میرا اور تمہارا یوں مل بیٹھنا اسے ہرگز پسند نہ آئے گا۔" اس نے پہلی بار اپنی عقل کی رسائی کا ثبوت دیا تھا۔" صادق مارا ہی جاچکا ہے۔ ڈرائیور کو کچھ علم نہیں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ میں اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ تم بھی اپنی زبان بند رکھنا۔"

میں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اچانک میں نے ریستوران کی دیوار میں بنی ہوئی بڑی سی کھڑکی کے سامنے سے ایک مانوس چہرہ گزرتے دیکھا اور بے اختیار اپنی نشست چھوڑ دی۔

تصویر نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں نے اس کی سُنی اَن سُنی کردی اور ریستوران سے نکاسی کے راستے کی طرف ہو لیا کیونکہ وہ مانوس چہرہ اسی شخص کا تھا جو کراچی میں توقیر کے نام سے میرا مہمان ہوا تھا۔ ریستوران کی کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ میری اور تصویر کی جانب گھور رہا تھا۔ اس موقع پر میں اُسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

ریستوران سے باہر آکر میں نے راہداری سے اُوپری منزل کے زینوں پھر پیشاب خانوں تک کا طواف کر ڈالا لیکن اس شخص کا کہیں سراغ نہ مل سکا۔ چند سیکنڈ کی مہلت میں وہ کسی چھلاوے کی طرح نجانے کہاں تحلیل ہوگیا تھا۔

سخت کوفت اور رنجیدگی کے عالم میں ہر طرف کی خاک چھاننے کے بعد میں مایوس ہوکر ریستوران کی طرف واپس لوٹا تو دروازے پر پہنچتے ہی چھٹی حس نے تگڑٹ فرار ہونے کا حکم صادر کردیا کیوں کہ تصویر کی میز پر ویٹروں اور ہوٹل کے عملے کی بھیڑ نظر آرہی تھی۔ وہاں موجود گاہک بھی اپنی نشستیں چھوڑ کر بے چینی کے ساتھ اسی طرف نگراں تھے۔

میں بلاتوقف واپس ہولیا اور کہیں رُکے بغیر سڑک پر ایک ٹیکسی تک پہنچ کر دم لیا۔ ہمارا ہوٹل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن میں نے براہِ راست ہوٹل جانے کے بجائے پُرانی

انارکلی کے نکڑ تک پہنچنے کو ترجیح دی اور وہاں ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کرنے کے بعد ٹہلتا ہوا ہوٹل کی طرف ہولیا۔

راستے میں سگریٹ وغیرہ خریدتا ہوا میں ہوٹل پہنچا تو کاؤنٹر پر چابی موجود نہیں تھی۔

”چند منٹ پہلے آپ کے ساتھی اوپر گئے ہیں۔“ استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود خوش رو لڑکی نے کی بورڈ کا جائزہ لینے کے بعد خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور میں حیرت کے عالم میں سیڑھیوں کی طرف ہولیا۔

دستک کے جواب میں سلطان شاہ نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔

”تم یہاں کیسے؟“ میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے متحیرانہ لہجے میں سوال کیا۔

”کہانی ختم کرکے آیا ہوں۔“ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تم تو کافی پہلے چلے آئے تھے، پھر دیر کہاں ہوگئی؟“

”پرانی انارکلی سے ٹہلتا ہوا آرہا ہوں۔ تم کون سی کہانی ختم کرآئے ہو؟“ میں نے اُلجھن محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

”تمہارا مہمان بھی وہاں پہنچا تھا۔ مجھے حیرت ضرور ہوئی تھی کہ تم تصویر سے باتیں کررہے تھے اور توقیر باہر منڈلا رہا تھا۔ پھر وہ اندر داخل ہوا تو میں بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔ وہ شاید دانستہ ریستوران کی کھڑکی کے سامنے گزرا تھا تاکہ تمہیں جگہ چھوڑ کر اپنے تعاقب پر مجبور کرسکے۔ تمہارے اٹھتے ہی وہ مجھے جُل دے کر غائب ہوگیا۔ میں بھانپ چکا تھا کہ وہ کسی وجہ سے تصویر سے تنہائی میں ملنا چاہ رہا تھا۔ لہٰذا میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ریستوران کی طرف پلٹا تو وہ نجانے کہاں سے گھوم کر اندر پہنچ چکا تھا اور تصویر کے شانے پر جھکا ہوا کچھ کہہ رہا تھا۔ مجھے ریستوران کے دروازے پر دیکھتے ہی وہ پلٹ کر بھاگا، میں بھی اس کے پیچھے لپکا لیکن تصویر کی میز تک پہنچنے سے پہلے میں نے دیکھا کہ تصویر کرسی پر بیٹھے بیٹھے کسی بے جان لاش کی طرح میز پر گرگیا۔ میز کی سطح سے سر ٹکرانے کا شور سُن کر ہوٹل کا عملہ بھی اُدھر دوڑ پڑا اور میں کسی کی نگاہوں میں آنے سے پہلے وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ وہاں توقیر کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اسی اثنا میں ہوٹل بھر میں تصویر کی موت کی خبر پھیل گئی۔ وہ کسی سریع الاثر زہر کا شکار ہوا تھا کیونکہ فوراً ہی اس کا جسم نیلا پڑنا شروع ہوگیا تھا۔“

”مجھے اندیشہ ہوگیا تھا۔“ میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”وہ خود بھی خطرہ بھانپ چکا تھا لیکن مخالفین ہماری توقع سے زیادہ تیز اور چالاک ثابت ہوئے۔ انہوں نے اسے مہلت دیے بغیر راستے سے ہٹا دیا گیا۔“

”تم کن مخالفین کی بات کررہے ہو؟ میں نے توقیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ تو بھائی کے ہاتھوں بھائی کی ہلاکت کا ناقابلِ یقین واقعہ ہے۔ تم پھر سوتیلے ہو لیکن وہ تو سگے بھائی تھے۔“

”اس سے مل کر میری بڑی غلط فہمیاں دور ہوئی ہیں۔“ میں نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ ”اس نے یہی بتایا تھا کہ توقیر مدت سے اوٹاوا میں ہے، اس کے نام کی آڑ لے کر میرا مہمان بننے والا کوئی اور ہی تھا۔“

”اوہ!“ اس کے منہ سے بے اختیار تحیر آمیز آواز نکل گئی۔

”میں نے چند ثانیوں کے لیے ان دونوں کو یکجا دیکھا تھا۔ تصویر کے چہرے پر شناسائی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ شاید وہ بھی اس شخص سے پہلی ہی بار ملا تھا۔“

”اے۔ ٹو نے دیدہ و دانستہ ہمیں غلط راہ پر ڈالا ہوا تھا۔ تصویر کو اس کے قریبی ساتھیوں کے ذریعے آلۂ کار بنایا گیا تھا۔ آج ایئرپورٹ پر مرنے والا شخص تصویر کا جگری دوست تھا لیکن دوسری طرف سیکیورٹی آفیسر کے لیے بھی کام کرتا تھا۔“

”یعنی اے۔ ٹو کے بارے میں اب تک ہم جھک ہی مارتے رہے ہیں۔“ وہ یک بیک مایوس نظر آنے لگا۔

”ہم بالکل صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”فرق صرف اتنا تھا کہ تصویر یا توقیر کو اے۔ ٹو سمجھ رہے تھے جبکہ اس کی شخصیت ابھی تک راز میں ہے۔“

”شخصیت بھی سامنے آچکی ہے۔ توقیر بن کر تم سے ملنے والا ہی اے۔ ٹو ہے۔ تمہارے ملازم نے اس کی بدلی ہوئی آواز سُنی تھی۔ جہانگیر نے اس بات کی تصدیق کی تھی، وہ تو ساری رات اس کے ساتھ ڈرائیور کے طور پر رہا تھا پھر اس نے رات بھی جہانگیر کے گھر ہی بسر کی تھی۔ کم از کم ہم اسے [illegible] پان سکتے ہیں خواہ اس کا اصل نام کچھ بھی ہو۔“

”تصویر کی مو[illegible] کی خبر بڑی ماں کو پاگل کردے گی۔“ میں ان کا خیال آتے ہی [illegible] ہولیا۔ ”توقیر کینیڈا میں ہے انہیں کوئی بھی نہ سنبھال سکے گا۔ اور وہ بلک بلک کر مرجائیں گی۔“

”تمہارا بس یہی ایک کڑا امتحان ہے۔“ اس نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ”تصویر کا قاتل تم تک رسائی کے اس موقع پر غافل نہیں رہے گا۔ تم نے بڑی ماں کا رُخ کیا اور [illegible] گئے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”خود کسی جال میں پھنسنے کے بجائے اب مجھے کسی کے گریبان پر ہاتھ ڈالنا ہوگا اور اس بار طفیل کی باری ہے۔“

”یہ طفیل کہاں سے آگیا؟“

”ایس۔ او۔۔۔ لائیڈز کالج کا سیکیورٹی آفیسر۔ تصویر نے جو کچھ بتایا، اس کی روشنی میں لائیڈز کالج کے ملازمین میں طفیل ہی سب سے زیادہ باخبر آدمی ہے، وہ میرے قہر سے ہرگز نہ بچ سکے گا۔“

”اس کا آدمی تین بجے منٹو پارک پہنچے گا۔“ سلطان شاہ نے اس کا ذکر آتے ہی چونک کر مجھے یاد دلایا۔ ”اس وقت سوا بجنے والا ہے، شاید تمہیں کچھ تیاری بھی کرنا ہوگی۔“

”میں مقررہ وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”تاکہ وہاں کے حالات نگاہ میں رہیں، ہوسکتا ہے کہ اس کے مددگار پہلے سے گاڑیوں میں وہاں جمع ہونا شروع ہوجائیں۔“

میں منٹو پارک کی پارکنگ لاٹ میں پہنچا تو سلطان شاہ مجھ سے پہلے ایک خستہ حال آوارہ گرد کے روپ میں وہاں منڈیر پر بیٹھا تھا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا، اس لیے پارکنگ لاٹ میں چند ہی گاڑیاں موجود تھیں لیکن مجھے کوئی مشتبہ آدمی نظر نہ آسکا۔

اس وقت میں نے سلک کا سُرخ شناختی مفلر نہیں لپیٹا تھا تاکہ دوسرے فریق کے گرگے مجھے پہلے سے نہ پہچان سکیں۔ میں بےفکری کے انداز میں بڑھ کر خوانچے والوں کے پاس جا کھڑا ہوا اور تلی ہوئی چنے کی دال لے کر اس سے شغل کرنے لگا۔

ٹھیک پونے تین بجے ایک کار منٹو پارک کی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی اور اس میں سے تین صحت مند افراد سینے پھلائے نیچے اتر آئے۔ ان کے لباس اور بشروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پیشہ ور غنڈے نہیں تو بگڑے ہوئے اور اوباش طبیعت ضرور ہیں۔ اپنی کار سے اُترنے کے بعد وہ تینوں وہیں کھڑے متجسسانہ انداز میں چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انھیں وہاں کسی کی تلاش تھی۔ میں دور ایک ٹھیلے کے پاس کھڑا کنکھیوں سے ان کا جائزہ لیتا رہا۔

وہ اپنی کار کے قریب کھڑے سگریٹیں سُلگا رہے تھے کہ میں نے سلطان شاہ کو کسی آوارہ گرد ملنگ کے سے انداز میں خود کلامی کرتے ہوئے ان کی طرف بڑھتے دیکھا اور بے چین ہوگیا۔

شاید اُن کی حرکات و سکنات کی بنا پر سلطان شاہ بھی ان کی طرف سے شبہات کا شکار ہوگیا تھا۔ وہ دلیر اور ذہین آدمی تھا لیکن میری دانست میں ایسی کھلی چھیڑ چھاڑ کھیل بگاڑنے کے ساتھ ہی اس کے لیے مشکلات بھی پیدا کرسکتی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان تک پہنچنے کے بعد بھی ...

سلطان شاہ نے اپنا لاتعلقانہ انداز برقرار رکھنے ہوئے ان کے سامنے دستِ سوال دراز کردیا تھا۔ نچلے درجے کے عام جرائم پیشہ لوگوں کی طرح وہ تینوں بھی کچھ توہم پرست تھے۔ ایک مجذوب نما سوالی کا ہاتھ پھیلا دیکھ کر بیک وقت تینوں کے ہاتھ جیبوں سے کچھ دبائے برآمد ہوئے اور سلطان شاہ کی ہتھیلی پر خالی ہوگئے۔

سلطان شاہ نے بزرگانہ انداز میں ان میں سے ایک کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور شاید کچھ کہا بھی تھا جو فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث میں نہ سُن سکا۔ نجانے اس کے کلمات میں کیا تاثیر تھی کہ وہ تینوں ہی اس کی طرف متوجہ ہوگئے اور سلطان شاہ وہیں جم گیا۔ آثار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان چاروں میں کچھ دلچسپ مذاکرات شروع ہوچکے تھے۔

ٹھیک تین بجے ایک سفید کرولا اس علاقے میں داخل ہوئی اور راستے ہی میں رُک گئی۔

میں وہاں رکشے سے پہنچا تھا۔ لہٰذا پارکنگ کے ضوابط سے لاعلم تھا۔ کرولا کے رُکتے ہی سرکاری پارکنگ فیس یا جگا ٹیکس وصول کرنے والا ایک لڑکا اس کی طرف بڑھا تھا لیکن اُسے شاید دور ہی سے دھتکار دیا گیا۔ سفید کرولا کے آتے ہی سلطان شاہ کے ساتھ اُلجھے ہوئے تینوں بدمعاش چونکے تھے اور اُن کی توجہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے نقلی مجذوب سے ہٹ کر سفید کرولا پر مرکوز ہوگئی تھی۔ میں نے اس تبدیلی کا اندازہ کرتے ہی پیش قدمی کی تیاری کرلی۔

کرولا سورج کے سامنے ایسے زاویے سے کھڑی ہوئی تھی کہ جب تک ڈرائیور نیچے نہ آیا، میں ونڈ اسکرین کے پیچھے اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا لیکن اسے دیکھتے ہی میرے قدم بے اختیار حرکت میں آگئے کیوں کہ اس کے سر پر نیلی ٹوپی نظر آرہی تھی۔

جب تک میں اس کے مقابل نہ پہنچ گیا، اس نے مجھ پر کو[illegible] نہیں دی بلکہ بے چینی کے ساتھ گرد و پیش میں نظریں د[illegible] لیکن مجھے اپنے سامنے محسوس کرتے ہی وہ چونک [illegible] تھا۔

”سُرخ مفلر گلے کے بجائے میری جیب میں ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

”ہوا کرے، میں کیا کروں؟“ اس نے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”طے شدہ باتوں سے انحراف کی صورت میں

وہی ہوگا جو شوگر کوئین چاہتی ہے۔ اس میں تمہیں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔"

"میں خود شوگر کنگ ہوں، اس وقت تو وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔" میں نے اپنے لہجے میں کرختگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

کوڈ ورڈز کا تبادلہ ہو چکا تھا لہٰذا اس کے تیور ڈھیلے پڑ گئے۔ "تمہاری امانت لے آیا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جھک کر پینجر سیٹ سے ایک بڑا سا براؤن چرمی بریف کیس اٹھایا جو خاصا وزنی معلوم ہو رہا تھا اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میری ذمے داری ختم، اب یہ تمہارے حوالے ہے، تم جانو اور تمہارا کام۔"

میرا ارادہ اس سے بریف کیس وصول کر لینے کا تھا لیکن عین موقع پر مجھے وہ بریف کیس یاد آ گیا جو تنظیم کی طرف سے میرے حوالے کیا گیا تھا۔ اس بریف کیس کو کھولنے میں ذرا بھی غلطی کی جاتی تو قفل کے میکنیزم سے منسلک طاقت ور بارودی ذخیرہ اتنی قوت سے پھٹتا کہ بریف کیس تو درکنار قرب و جوار والوں کے چیتھڑے ملنے بھی محال ہو جاتے۔

"تحویل میں لینے سے پہلے شاید رقم تو گننا دشوار ہوگی مگر میں گڈیاں ضرور گننا چاہوں گا۔" میں نے اس وزنی بریف کیس کو ہاتھ لگائے بغیر کہا۔

"یہ میرے دائرہ کار سے باہر ہے۔" اس نے اکھڑپن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس میں رقم ہے یا گتے کے ٹکڑے بھرے ہوئے ہیں۔ مجھے حکم ملا تھا کہ یہ بریف کیس لال مفلر والے کو پہنچا دوں، اس سے آگے میں کوئی ذمے داری نہیں لے سکتا۔"

"بریف کیس کس طرح کھلے گا؟"

"بالکل لٹو رسٹر کی طرح ہے، دونوں طرف کے کلپ گرا کر نو سو بارہ ملاؤ گے تو قفل کھل جائے گا۔"

"یہ کام تم ہی کو سر انجام دینا ہوگا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں اس کا مجاز نہیں ہوں۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد میں اس بریف کیس کا مالک ہوں، میں تمہیں مجاز قرار دیتا ہوں۔" میرے لہجے میں کاٹ پیدا ہو گئی۔

"میں تمہارا نہیں کسی اور کا تابع ہوں۔" وہ میرے لہجے کا ترلیے بغیر بولا۔ "میرا وقت برباد نہ کرو، بریف کیس لینا ہے تو لو۔ میں واپس جا رہا ہوں مجھے کچھ اہم کام بھی نمٹانے ہیں۔"

اس وقت تک میرا ہاتھ اپنی جیب میں رینگ چکا تھا۔

"میری جیب میں ایک عدد بھرا ہوا پستول ہے جس کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا ہے۔ میری انگلی ٹریگر پر ہے اور نال تمہاری طرف۔ اب تم کس کام کو اہم خیال کرتے ہو؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

اضطراری طور پر اس کی نگاہیں اُدھر اٹھ گئیں جدھر سلطان شاہ تین غنڈوں کے ساتھ موجود تھا۔

"اس وقت تو تمہارا ہی کام اہم نظر آ رہا ہے۔ گاڑی میں آ جاؤ، یہ بریف کیس ہم کسی محفوظ مقام پر کھولیں گے۔" وہ بولا۔

وہ بہت ذہین اور مکار تھا لیکن میرے سامنے طفلِ مکتب ہی تھا۔ اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہاں سے میرے ساتھ روانگی چونکہ پروگرام کے خلاف ہوگی لہٰذا اس کے تینوں چوکیدار بھی سفید کرولا کا پیچھا کریں گے اور کسی محفوظ مقام پر پہنچنے سے قبل اسے میری بالادستی سے نجات دلا دیں گے لیکن میں بھی ان امکانات سے غافل نہیں تھا۔

اسے مزید کسی ہوشیاری کا موقع دیے بغیر میں اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے وزنی بریف کیس عقبی نشست پر ڈال دیا تھا اور جھلائے ہوئے انداز میں کار تیزی سے آگے بڑھا دی تھی۔

میں نے کار کے روانہ ہوتے ہی پستول جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا تاکہ اسے ہر لمحے صورتِ حال کا احساس رہے لیکن راوی روڈ پر کچھ دور چلنے کے بعد عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے وہ مضحکانہ انداز میں ہنس دیا۔

"اسے جیب میں رکھ لو۔" میری خاموشی پر وہ خود ہی بولا تھا۔ اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"کیوں — کیا اس میں سے مینڈک نکلنے کی امید ہے تمہیں؟" میں نے بھی اسی لہجے میں سوال کیا۔

"پیچھے مڑ کر دیکھو۔" اس نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ "نیلی ڈاٹسن میں میرے تین محافظ پیچھے آ رہے ہیں۔ وہ نہ صرف پوری طرح مسلح ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک تمہاری پسلیاں چکنا چور کر سکتا ہے۔"

"یہ اور بھی اچھا ہوا۔" میں نے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔

"اب کم از کم تم کو یہ شکایت نہیں ہوگی کہ تم اکیلے میں مارے گئے۔ تین سورما تمہاری بدترین درگت کے چشم دید گواہ ہوں گے۔"

اس نے راوی کا نیا پل پھر پرانا پل بھی چھوڑا اور گاڑی خستہ و شکستہ بند روڈ پر مڑ گئی جہاں گرد و غبار سے اٹی ہوئی نیم پختہ سڑک پر عملاً ویرانی کا راج تھا۔

کافی دور نکل آنے کے بعد بھی جب اس ویرانے کا خاتمہ نہ ہوا تو ایک جگہ میں نے اُسے گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ سفید کرولا ایک کنارے پر رک گئی اور میں نے اپنے پستول کی نذر پر اسے نیچے اتار لیا۔

"تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟" اس کے لہجے میں پہلی بار تشویش کے آثار محسوس ہوئے تھے کیونکہ تعاقب میں آنے والی نیلی ڈاٹسن کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا اور وہ محض میرے رحم و کرم پر رہ گیا تھا۔

"یہاں تم بریف کیس کھول کر مجھے رقم کی گڈیاں گنواؤ گے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"بریف کیس میں نہیں کھولوں گا۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔ "تم کھول دو، رقم میں گنوا دوں گا۔"

"برخوردار! تمہارا تو باپ بھی کھولے گا۔" میں نے اس کے منہ پر بھرپور تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ وہ مغلظات بکتا ہوا دور ہٹ گیا اور اسی لمحے میں نے پچھلے موڑ سے غبار کا ایک بگولا سا اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس کیا۔

چند ہی ثانیوں میں صورتِ حال واضح ہو گئی۔ نیلی ڈاٹسن تیزی سے ہماری طرف بڑھی آ رہی تھی۔ میرے شکار کے بشرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور میں نے بدترین حالات سے مقابلہ کرنے کی نیت سے بڑھ کر اپنے پستول کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔

تھوڑی دیر میں نیلی ڈاٹسن ہمارے قریب آ کر رک گئی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ عقبی نشست پر سلطان شاہ بھی براجمان تھا۔

اس کار کا انجن بند ہوا، پھر یکے بعد دیگرے وہ تینوں بدمعاش اپنے ہاتھ سروں پر باندھے نیچے اترے تو فرطِ حیرت سے میری عقل چکرا کر رہ گئی۔ آخر میں سلطان شاہ اس کار سے نیچے اترا تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔

تینوں بدمعاش سلطان شاہ کو بدترین مغلظات سے نواز رہے تھے لیکن اس کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

پیام — "اس دور کی سب سے بڑی حقیقت ہے" سلطان شاہ ان تینوں کو کور کیے کہہ رہا تھا۔ "رشوت اور سفارش کی لعنت نے ہم سب کو ایسا برباد کیا ہے کہ بارگاہِ خداوندی میں بھی رسائی کے لیے ہم سفارشیں اور سہارے ڈھونڈتے ہیں۔ یہ تینوں ضعیف الاعتقاد میری دعاؤں کے متمنی تھے اور اب نابکار مجھ ہی کو مغلظات بک رہے ہیں۔"

"لیکن تم نے انھیں کیسے گھیر لیا؟" میں نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"چند حسبِ حال دعاؤں کے طفیل ان سے تھوڑی سی بھیک سمیٹنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور یہ وقت گزاری کے لیے اپنے مقدرات کے بارے میں سوالات کرنے لگے تھے۔ اسی دوران میں تمہارا کام شروع ہو گیا۔ یہ لوگ تعاقب میں روانہ ہوئے تو میں بھی خاموشی سے ان کے ساتھ سوار ہو گیا اور ان میں سے کسی نے مجھ مسکین سے تعرض نہیں کیا۔ ان بے چاروں کو تو اس وقت ہوش آیا جب سفید کرولا نظر آنے کے بعد میں نے اچانک ہی پستول نکال کر صورتحال بدل ڈالی اور اب یہ اسی بے چارے کو کوس رہے ہیں جسے ذرا دیر پہلے اپنا سب سے مضبوط ستون سمجھ رہے تھے۔"

"اُلّو کے پٹھے!" ان تینوں میں سے ایک دانت پیس کر غرایا۔ "ہمیں شبہ بھی ہو جاتا کہ تم اسی نابکار کے ساتھی ہو تو اس طرح مارتے کہ تمھیں قبر بھی نصیب نہ ہوتی۔"

"خیر۔ ہم اس کا خیال رکھیں گے۔" سلطان شاہ بایاں ہاتھ اٹھا کر بے نیازی کے ساتھ بولا۔ "تم سب کو الگ الگ قبر میسر ہوگی۔ کوشش کریں گے کہ تمہاری مزنگ کی جنازگاہ میں تدفین ہو کیونکہ اس علاقے میں ہمارا ایک تنخواہ دار، فاتحہ خواں رہتا ہے۔ وہ اپنے چار بیٹوں سمیت ہر روز تمہارے مزاروں پر فاتحہ خوانی کرتا رہے گا تاکہ تاقیامت تمہاری قبریں نور سے بھری رہیں۔"

"ہرزہ سرائی بند کرو اُلّو کے پٹھے!" ان میں سے ایک غالباً خوف زدہ ہو کر چلّایا۔ "ہم تمہارا خون پی جائیں گے۔"

"اس کا خون بہت کڑوا ہے۔" میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "بہتر ہوگا کہ تم تینوں خاموش ہی رہو، ورنہ اس کے کڑوے خون کو جوش آ گیا تو تم میں سے ایک آدھ مزنگ کی جنازگاہ تک بھی نہ پہنچ سکے گا۔ جہاں اس کے تنخواہ دار فاتحہ خواں کا بندوبست ہے۔"

"تم کون ہو اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟" ان تینوں میں سے ایک اور بھڑک کر غرایا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے سادگی کے ساتھ کہا۔ "یہ میرے لیے تیس لاکھ روپے لایا ہے، میری خواہش ہے کہ یہ رقم نہیں تو کم از کم گڈیاں ہی گن کر میرے حوالے کر دے، رقم پوری ہوئی تو تم سب کی چھٹی ہو جائے گی ورنہ یہ یرغمال میں رہ جائے گا، تم واپس لوٹ کر اپنے اوپر والے کو اس کی بے ایمانی سے آگاہ کر سکو گے۔"

"ہم اسی کو جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا کسی سے کوئی

تعلق نہیں۔" وہی شخص غرّایا۔" تیس لاکھ کے معاملے میں ہمیں توصرف پانچ ہزار کے عوض گھسیٹا گیا ہے۔"

"تم سب ملعون اور نابکار ہو۔" میرا نیلی ٹوپی والا قیدی دہاڑا۔" آج میں نے تمھاری نمک حرامی دیکھ لی ہے، آئندہ کبھی تم پر اعتماد نہیں کروں گا۔"

وہ تینوں چپ رہے لیکن میں انھیں للکار بیٹھا۔" سن لی اپنی اوقات۔ اگر بہتری چاہتے ہو تو ابھی واپس بھاگ لو، ایک بار تمھارے سامنے کھیل شروع ہوگیا تو پھر مزنگ جنازگاہ سے پہلے کہیں پناہ نہ مل سکے گی۔"

"تو کیا تم ہمیں اسی آسانی سے واپس جانے دو گے؟" ان میں سے ایک نے سوال کیا۔

"نہ جانا چاہو تو دوسری بات ہے۔" میں نے سارا بوجھ اسی پر ڈال دیا۔

وہ تینوں کرائے کے ٹٹّو تھے اور غالباً انھیں اپنے معاوضے کی رقم پیشگی مل چکی تھی لہٰذا انھوں نے یہی طے کیا کہ انھیں مزید ملوث ہوئے بغیر واپسی کی راہ اختیار کرنا چاہیے نیلی ٹوپی والے قیدی نے دھمکیوں اور خوشامدوں کے ذریعے انھیں لاکھ روکنا چاہا لیکن ان میں سے کوئی تیار نہیں ہوا میری اور سلطان کی بالادستی نے ان کی تمام خوش فہمیوں کو فنا کر دیا تھا۔

نیلی ڈاٹسن اپنے تین سواروں کو لے کر واپس چلی گئی تو میں پھر اپنے قیدی کی طرف متوجہ ہوگیا۔" رقم سنبھلوا کر تم بھی اپنی چھٹی کرو دوست۔"

"کلِپ گرا کر نو سو بارہ ملاؤ گے تو قفل کھل جائے گا۔" اس نے کسی رٹائے ہوئے طوطے کی طرح دُہرایا۔" تم بریف کیس کھولو، میں رقم سنبھلوا دوں گا۔"

میرے ذہن میں بارودی بریف کیس کا تصوّر اور راسخ ہوگیا۔

"اسے کھولنا تو تم ہی کو ہے میرے دوست! رقم میں خود گن لوں گا۔" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔" اس خیال میں بھی نہ رہنا کہ تم کسی طرح ہمیں دھوکا دے کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہو سکو گے۔ یہ جعلی پیرزنشانے کا بہت سچّا ہے۔"

نیلی ٹوپی والے کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لرزنے لگے اور بشرے پر فکر مندی کی علامات اُبھر آئیں۔" آخر تم مجھ ہی سے بریف کیس کُھلوانے پر کیوں مُصر ہو؟" اس نے خود کو تنہا اور بے بس پا کر تھکے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"اور تم کیوں اسے نہ کھولنے پر اَڑے ہوئے ہو؟ میرے ننھے چوزے۔" سلطان شاہ نے آگے بڑھ کر اس سے زہریلے لہجے میں سوال کیا اور اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔

"مجھے یہ ذمّے داری سونپتے ہوئے خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ بریف کیس ہرگز نہ کھولوں۔" اس نے کہا۔

"اور تم نے اس کی وجہ جاننے کی قطعی کوشش نہیں کی؟" میں نے سوال کیا۔

"ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔" میرا خیال تھا کہ اتنی بڑی رقم کا معاملہ ہے، وہ چاہتا ہوگا کہ تم خود ہی رقم سنبھالنے کا فرض سرانجام دو۔"

"پھر تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ تمھیں یہ تک نہیں معلوم کہ اس میں رقم ہی ہے یا پھٹے پرانے کاغذات وغیرہ بھرے ہوئے ہیں؟" سلطان شاہ نے ترش لہجے میں سوال کیا۔

"وہ بعد کی بات ہے۔" اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔" تم لوگوں کے جارحانہ رویّے سے مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ تمھیں میرے ہاتھوں زک پہنچانے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔"

"جب تم خود یہ سوچ رہے ہو تو بریف کیس کھولنے میں ہچکچا کیوں رہے ہو؟"

"اس بارے میں مجھے خاص طور سے منع کیا گیا تھا، ہو سکتا ہے کہ یہ بھی کوئی چال رہی ہو۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔" میرا تو خیال ہے کہ جو بھی اسے کھولنے کی کوشش کرے گا کسی نہ کسی مشکل سے دوچار ہو جائے گا۔"

"کیسی مشکل؟" میں نے اسے ٹٹولنے کی نیت سے سوال کیا تاکہ اس کی ذہنی اُڑان کا اندازہ لگا سکوں۔

"ہو سکتا ہے کہ اس میں ردّی کاغذات کے ساتھ کوئی بھرا ہوا زہریلا سانپ بند ہو جو ڈھکن کھلتے ہی سامنے والے کو ڈس لے۔"

اس کے جواب سے مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ ان لوگوں کا ہرکارا تھا جو جرائم کے ارتکاب میں جدید سائنسی سہولتوں سے استفادہ کرتے آ رہے تھے۔ فولٹو سیل، خودکار کیمرے، وائرلیس اور الیکٹرونکس پر مشتمل حفاظتی حصار استعمال کرنے والوں کے لیے کام کرتے ہوئے بھی اس کی ذہنی سطح اس قدر پست تھی کہ وہ سترھویں صدی میں بھی سانپ سے ڈسوانے والے حربے سے آگے کچھ بھی نہ سوچ سکا تھا اور اس کی یہ کم علمی شاید میرے لیے سود مند ہی تھی۔

"اس خطرے کا توڑ بہت آسان ہے۔" میں نے قدرے توقّف کے بعد اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔" تم اس بریف کیس کو دور لے جا کر دونوں لیور اٹھاؤ اور نمبر ملا کر قفل کھول دو اور بریف کیس وہیں چھوڑ کر ہمارے پاس آجاؤ، ہم اس کا ڈھکن کسی درخت کی لمبی سی ٹہنی کی مدد سے کھول دیں گے اندر سانپ ہوا تو راستہ پاتے ہی ویرانے میں فرار ہو جائے گا اور ہم بلا خوف و خطر قریب جا کر رقم گن سکیں گے۔"

مجھے اپنی تجویز کے مضمرات کا خوب اندازہ تھا لیکن اس کی کھوپڑی کے لیے میری رائے قابلِ قبول تھی۔ اس نے وہیں ٹھہر کر چند ثانیوں کے لیے کچھ سوچا پھر کار سے بریف کیس اتارنے لگا۔ اس کو بریف کیس کہنا کچھ اتنا مناسب نہیں تھا کیونکہ نہ اس کا سائز بریف کیس کا تھا، نہ ساخت سوٹ کیس جیسی۔ وہ ان دونوں کے درمیان کی کوئی چیز معلوم ہو رہا تھا۔ وزنی اور بڑے بریف کیس کو کار سے اتار کر وہ داہنی سمت کے کچے ویرانے میں بڑھ گیا جہاں تاحدِ نظر خودرو درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" سلطان شاہ کی دھیمی آواز نے میرے پُرہول خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔" چہرے سے کوئی بہت بڑی الجھن ٹپک رہی ہے۔"

"یہ بے خبری میں مارا جائے گا۔" میں نے متاسف لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔" جب لمبی ٹہنی سے ڈھکن کھولنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے تو سانپ اس کا کیا بگاڑ سکے گا۔"

"وہ اسے سمجھانے کے لیے کہا تھا۔" میں نے تفکّر آمیز لہجے میں کہا۔" مجھے شبہ ہے کہ اس کے میکینزم میں طاقتور بارودی دھماکے کا پورا بندوبست پوشیدہ ہوگا اور ٹہنی سے ڈھکن کھولنے کی نوبت ہی نہیں آسکے گی۔"

"نہ آئے۔" وہ بے پروایانہ لہجے میں بولا۔" تم کیوں اپنا ذہن تھکا رہے ہو؟ وہ جو جال تمھارے لیے لایا ہے خود ہی اس کا شکار ہو جائے گا اور اگر کچھ نہ ہوا تو تیس لاکھ پکے ہیں۔"

میں پھیکے انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔ میری نگاہیں کچے ویرانے کی طرف مرکوز تھیں۔ جہاں وہ تھوڑی دور ریت پر بیٹھا بریف کیس کے دونوں لیور اٹھانے کے بعد گھٹنوں کے بل نیچے جھکا قفل کے نمبر ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک ایک ہولناک دھماکے سے میری نگاہیں خیرہ ہوگئیں کیونکہ اس مقام پر طاقتور بارودی دھماکے کے ساتھ ہی بارودی شعلوں کا کثیف بادل بھی بلند ہوا تھا۔ میں اچھل کر پہلو کے بل کئی فٹ دور جا گرا۔

میں سنبھل کر اٹھا اور دیوانہ وار کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ شاید سلطان شاہ نے بھی اسی لمحے وہی فیصلہ کیا تھا کیونکہ ہم دونوں تقریباً ایک ساتھ ہی کار میں سوار ہوئے تھے۔

دھماکے کے باعث فضا میں اٹھنے والا ریت کا غبار دور تک پھیلا ہوا تھا، بارود جلنے کی بُو سے نتھنوں اور آنکھوں میں سوزش ہو رہی تھی، بریف کیس میں بھرے ہوئے کاغذات آگ پکڑ کر دور تک بکھر گئے تھے اور خشک جھاڑیوں نے جابجا آگ پکڑ لی تھی۔ بربادی کے اس مہیب منظر میں نہ بریف کیس کے باقیات کہیں نظر آ رہے تھے، نہ اس کے کھولنے والے کا پتا تھا، بس کار سے ذرا دور جوتے اور پاؤں سمیت جھلسی ہوئی پنڈلی کی ایک ہڈّی ریت پر پڑی یہ اعلان کر رہی تھی کہ نیلی ٹوپی والے کا جسم دھماکے کے نتیجے میں چیتھڑوں میں تقسیم ہو کر ہر طرف بکھر گیا تھا۔

اس بدترین بارودی دھماکے کے نتیجے میں قرب و جوار سے لوگوں کا ادھر اُبل پڑنے کا قوی امکان موجود تھا لہٰذا میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور کار بند روڈ پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھا دی۔

چند ثانیوں کی خالی الذہنی کے بعد دماغ کام کرنے کے قابل ہوا تو مجھے یہ سوچ کر ہی پھریریاں سی آگئیں کہ میں نے ذرا بھی غفلت کا مظاہرہ کیا ہوتا تو اس وقت میرے بدن کے چیتھڑے خودرو جھاڑیوں کی چتا میں جل رہے ہوتے۔

"تم جو سوچ لیتے ہو، وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔" سلطان شاہ کی آواز سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا تو چونک پڑا۔ اس کا داہنا رخسار اور کان بری طرح زخمی تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔

"تم زخمی کیسے ہوگئے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"بس دھماکے کے ساتھ ہی کوئی جلتی ہوئی چیز ہوا میں اُڑتی ہوئی داہنی کنپٹی پر آ کر لگی تھی۔" اس نے تکلیف کے احساس سے عاری حوصلہ مند لہجے میں کہا پھر ہنستے ہوئے بولا۔" وہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔ کیا تم بارودی دھماکے کے بجائے گلاب کے پھولوں کی برسات کے بارے میں نہیں سوچ سکتے تھے؟"

"سوچنے سے کچھ نہیں بنتا سلطان شاہ۔" میں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔" گلاب برستے تو ان کے کانٹے شاید تمھیں اس سے زیادہ لہولہان کر دیتے۔ ہر بات اور کام کا ایک وقت معیّن ہے، ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے اور ہم بس اس کی تاویلیں سوچتے رہ جاتے ہیں، جو ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے۔"

"اب تو کھل کر جنگ چھڑ گئی ہے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔" تصویر ہم دونوں کی موجودگی میں دن دہاڑے ہوٹل میں مار دیا گیا۔ دوسری طرف سکیورٹی آفیسر نے بھی بارودی بریف کیس بھیج کر تمھیں للکار دیا ہے جبکہ اسے لوٹ کی شخصیت ابھی تک راز میں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کس محاذ پر زور دینا ہوگا۔"

"محاذ تو اب ایک ہی رہ گیا ہے۔" میں نے سڑک پر نظریں جما کر تلخ لہجے میں کہا۔" لائیڈز کا ہیچ غنڈوں اور بدمعاشوں

کا مسکن بنا ہوا ہے، وہاں ان کی فوج پل رہی ہے۔ ہمیں اس قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجانا ہوگی۔"

"اپنی بڑی ماں کو کس خانے میں رکھو گے؟" اس نے آہستگی کے ساتھ یاد دلایا۔ "وہ بھی تو اسی قلعے میں رہ رہی ہیں۔ وہاں اور بھی بہت سے بے گناہ ہوں گے . . ."

"بڑی ماں کے بارے میں یقیناً کچھ سوچنا ہوگا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ نہ بھولو کہ گیہوں کے ساتھ گھن ہمیشہ سے پستا آیا ہے، دس پانچ بے گناہوں کی فکر میں سیکڑوں بدمعاشوں کو ڈھیل نہیں دی جاسکتی۔"

وہ ہنس پڑا۔ "پتا نہیں کیوں، مجھے ایک بات یاد آگئی۔ کہیں پڑھا تھا کہ دنیا بھر میں ایک قانونی بنیاد رائج ہے کہ ہر شخص بے گناہ ہے جب تک کہ اس کے خلاف جرم ثابت نہ کر دیا جائے اور اس کے برعکس یورپ کے کسی ملک کا قانونی فلسفہ سراسر مختلف ہے یعنی ہر شخص مجرم ہے جب تک کہ وہ خود کو بے گناہ ثابت نہ کر دے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے خالی الذہنی کے عالم میں سوال کیا۔

"واہ، یہ تو سب سے بڑی بات ہے۔ پہلے نظام میں کسی کو مجرم قرار دینا عدلیہ کی ذمّے داری ہے اور دوسرے نظام میں انتظامیہ کسی کو بھی پکڑ کر جیل میں ٹھونس سکتی ہے۔ اب یہ قیدی کی ذمّے داری ہوگی کہ وہ اپنی بے گناہی کے لیے دلیلیں اور شواہد پیش کرتا پھرے یا جیل میں سڑتا رہے۔"

"یہ مغرب کی باتیں ہیں میرے دوست۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "جہاں ہر قدم پر بنیادی انسانی حقوق کا احترام کیا جاتا ہے۔ یہاں ہم ایک عجیب معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ زرداروں کے لیے یہاں پہلا نظام رائج ہے اور ناداروں کے لیے دوسرا۔ اور میں نہ زردار ہوں نہ نادار۔ بڑی ماں کو بچاتے ہوئے جو کچھ ممکن ہوا، کر گزروں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمھیں تصویر کی باتوں پر پورا یقین آگیا ہے؟"

"مجھے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "اس کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب اس نے مجھ سے مل بیٹھنے کی کوشش کی تو عجلت میں مار ڈالا گیا۔"

"اور تم یہ بھی مان چکے ہو کہ تصویر کے بقول توقیر کینیڈا میں ہے؟"

"اس میں شبہ کرنے کا کوئی سبب اگر ذہن میں آتا ہو تو ضرور بتاؤ۔"

"وہ شخص کس خانے میں جائے گا جو پہلے کراچی میں توقیر کے نام سے تمھارا مہمان ہوا اور اب تصویر کے قتل سے پہلے تمھیں ہوٹل میں نظر آیا تھا۔"

"میری دانست میں تو اب وہی ہر مسئلے کی کلید ہے۔ وہ بذاتِ خود اسے ٹو ہو یا نہ ہو، اس کا معتمدِ خاص ضرور ہے۔ اس سے شاید ہم بہت کچھ اگلوا سکیں گے۔"

"پھر جمی لائیڈ اور ویرا لائیڈ یعنی شوگر کوئین کو تم کس خانے میں رکھو گے؟"

"وہ بعد کے معاملات ہیں۔" میں نے اس کے خیالات کو لگام دیتے ہوئے کہا۔ "فی الحال ہمیں سکیورٹی آفیسر اور نام نہاد توقیر کے معاملات سے نمٹنا ہے۔ اس کے بعد باقی گرہیں خود بخود کھلتی جائیں گی۔ حالات نے اتنی تیزی کے ساتھ پلٹا کھایا ہے کہ عقل چکرا کر رہ گئی ہے۔ مہینوں سے ایک راہ بن رہی تھی اور توقیر اسے ٹو نظر آرہا تھا لیکن جب تصویر پر ہاتھ ڈالنے کی نوبت آئی تو اندازوں کا سارا محل ریت کے گھروندے کی طرح نیچے آرہا۔"

"اب ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ہم جعلی توقیر کی نگاہوں میں آچکے ہیں اور وہ کسی پُراسرار چھلاوے کی طرح ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ وہ بے خبری میں ہم پر کہیں بھی وار کرسکتا ہے۔"

صورتِ حال بہت زیادہ سنگین ہوچکی تھی۔ مُہم کا ایک بہت بڑا مرحلہ طے ہوچکا تھا۔ تنظیم کے ہیڈ کوارٹر کی نشاندہی ہو چکی تھی لیکن ہم سرغنہ کا سراغ کھو چکے تھے۔ جو مہرے ہماری نگاہوں میں آچکے تھے، ان پر ہاتھ ڈالنے میں ہمارے لیے زیادہ خطرات مُضمر تھے۔ سیکورٹی آفیسر یا لائیڈز کاٹج کے کسی مکین کا اتلاف تنظیم کے لیے افرادی قوّت کے نقصان پر تو ضرور منتج ہوتا لیکن مجموعی طور پر اسے کوئی قابلِ ذکر نقصان ہرگز نہ پہنچتا اور اب میں ایسی کسی بے مقصد طبع آزمائی کے لیے تیار نہیں تھا۔

"تم کس تشویش میں مبتلا ہوگئے ہو؟" خاصی دیر کے بعد سلطان شاہ نے میرے تفکر آمیز رویّے پر ٹوک ہی دیا۔

"ذہن کام نہیں کر رہا، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"حالانکہ سب کچھ سامنے ہے۔" اس کے لہجے میں بھی مایوسی نمایاں تھی۔ "پہلے صرف سُنتا ہی رہا تھا کہ بڑی بڑی مجرمانہ تنظیموں کے سربراہ اور اوپر والے لوگ کھلے بندوں پہچانے جاتے ہیں لیکن ان پر ہاتھ ڈالنا ناممکن ہوتا ہے اور اب اس تجربے سے بھی گزر رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ہم بھول بھلیوں میں پھنس گئے ہوں، راستے ہر طرف موجود ہیں لیکن یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کون سا راستہ منزل کی طرف رہنمائی کرے گا؟"

"شاید تصویر کی ناگہانی موت نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم کسی سراب کے پیچھے بھاگ کر اپنا وقت برباد نہیں کرسکتے۔ جو سامنے ہے، اسی سے ابتدا کرنا ہوگی۔"

"[illegible] تفصیل؟" میں نے [illegible] طلب لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے، لائیڈز کاٹج میں تصویر کے علاوہ وہی اہم ترین آدمی ہے۔"

"لیکن ایک بات میرے ذہن میں کچوکے لگا رہی ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اس گمنام شخص نے تصویر کو کیوں ہلاک کیا؟" میرا حوصلہ افزا ردِعمل دیکھ کر اس نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ "اس نے تمھیں ہٹا کر تصویر کو کیوں قتل کیا۔ اگر اسے تصویر سے افشائے راز کا ہی ڈر تھا تو وہ اس کے سامنے براہِ راست تم پر وار کر کے ایک تیر سے دو شکار کرسکتا تھا۔ تم سے نجات مل جاتی اور تمھارا حشر دیکھ کر تصویر بھی خوف زدہ ہوجاتا لیکن اس نے تمھیں چھوڑ دیا۔"

"بڑی آسان سی بات ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ پستول وغیرہ کی قسم کا کوئی آتشیں ہتھیار استعمال کرتا تو اس کا رنگے ہاتھوں پکڑا جانا یقینی تھا۔ شاید تم نے اس کے طریقۂ واردات پر غور نہیں کیا۔ اس نے قریب آکر تصویر کو کسی سریع الاثر زہر کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ میرا رُخ کرتا تو میں اسے پہچانتے ہی نہ صرف ہوشیار ہوجاتا بلکہ مزاحمت کے ساتھ اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش بھی کر گزرتا لیکن تصویر کے لیے وہ اجنبی تھا کیونکہ تصویر نے بھی کھڑکی میں سے اس کی جھلک دیکھی تھی مگر اس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ مجھے روکنے کی کوشش کی تھی، میرے اٹھنے کے بعد وہ عقبی راستے سے اندر گھسا اور کوئی بات کرنے کے بہانے سے اس نے تصویر کو زہر دے ڈالا۔ اگر تم بروقت وہاں نہ پہنچتے تو شاید اسے بوکھلا کر فرار بھی نہ ہونا پڑتا۔ اپنی کارروائی کر کے وہ اطمینان سے لوٹ جاتا اور کسی کو وہاں قتل کے ارتکاب کا شبہ بھی نہ ہو پاتا۔"

"بات سمجھ میں آتی ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس طریقۂ کار سے وہ تمھیں زیر نہیں کرسکتا تھا اور اس کے ہاتھوں تصویر کے سفاکانہ قتل نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تمھارے دونوں بھائی ان معاملات میں اس حد تک ملوث نہیں تھے جتنا تم سمجھ رہے تھے لیکن تصویر یقیناً بہت کچھ جانتا تھا، اسی وجہ سے مار ڈالا گیا۔"

"آہستہ آہستہ میرا ذہن کسی راہ پر چلنے لگا ہے۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ اس طرح ہم جلد ہی کوئی بڑی کامیابی حاصل کرسکیں۔"

"وہ کیا؟" اس نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"تمھیں یہ معلوم کرنا ہے کہ تصویر کا جنازہ کب اٹھایا جائے گا؟"

"اوہ!" میری تجویز پر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "واقعی یہ زبردست ترکیب ہوگی، جنازے کے جلوس میں شاید خاصے اہم لوگ شریک ہوں گے۔"

"تمھارے مزاج میں عُجلت بھری ہوئی ہے۔" میں نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تصویر کی موت پُراسرار حالات میں کھلے بندوں واقع ہوئی ہے۔ فی الحال تو لاش پولیس کی تحویل میں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ پوسٹ مارٹم کے بعد بھی لائیڈز کاٹج والے لاش کے دعوے دار بن کر سامنے نہ آئیں۔"

"انھیں سامنے آنا ہی پڑے گا۔ لائیڈز کاٹج سے باہر بھی تصویر کے جاننے والوں کا کوئی حلقہ رہا ہوگا اور شاید سب ہی جانتے ہوں کہ وہ لائیڈز کاٹج کا اسٹیٹ منیجر ہے۔ قتل کے وقت ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں اس کا ڈرائیور گاڑی سمیت موجود تھا۔ اس نے جس انداز میں ہوٹل کے دربان کو ٹِپ دی تھی اور جس شناسائی کے انداز میں تصویر کا وہاں خیرمقدم کیا گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ وہاں اجنبی نہیں تھا۔"

"کچھ انتظار کے بعد ہی صحیح صورتِ حال سامنے آسکے گی۔" میں نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں آرام کرنا چاہتا ہوں، تم کھوج نکالنے کی کوشش کرو کہ اس واردات کے بارے میں پولیس اور لائیڈز کاٹج والوں کا کیا رویّہ ہے۔ تصویر کی تدفین کسی کی بھی طرف سے کی جائے، میں اس میں ضرور شرکت کرنا چاہوں گا، باقی فیصلے بعد میں کیے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔ "میں فوراً ہی کام شروع کر رہا ہوں۔"

میں خاموشی سے مسہری پر پڑا اسے تیار ہوتے دیکھتا رہا اور پھر وہ چلا گیا۔

اس وقت میرا دل بھاری ہو رہا تھا۔ سلطان شاہ کی موجودگی میں میں نے خود پر قابو پایا ہوا تھا، اس کے جاتے ہی میری آنکھیں نمناک ہونے لگیں اور دھندلائی ہوئی بصارت میں ماضی کی جھلکیاں سی کوندنے لگیں۔

انسان جو کچھ کرتا ہے، اپنی زندگی میں اس کا پھل ضرور پاتا ہے۔ جزا سزا، دکھ اور سُکھ مقدّر کے ایسے اٹل فیصلے ہوتے ہیں جن کی ہلکی سی جھلک ہر شخص اپنی زندگی میں ضرور دیکھ لیتا ہے۔ کہیں مادّی آسائشوں کے حصول میں انسان قیمت کے طور پر اپنے

ذہنی سکون کا بڑا حصّہ کھو دیتا ہے اور کہیں اندر کے اطمینان کے لیے ایسی منفعت کو ٹھکرا دیتا ہے جس پر زندگی پچھتاووں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ اس دور میں مادّی اور ذہنی آسودگی سے مالا مال لوگوں کی تعداد بہت ہی کم نظر آتی تھی لیکن ہر ایک کو ظاہرداری کا ایسا روگ لگا ہوا تھا کہ دوسروں کو سُلگانے اور اپنی جھوٹی انا کو برقرار رکھنے کے لیے لوگ اپنے دکھوں کو چھاتیوں میں دفن کیے، چہروں پر مسکراہٹ سجائے کاروبارِ حیات میں ہر جگہ اداکاری کرتے نظر آتے تھے اور دوسرے اس اداکاری سے فریب کھاکر ان پر رشک بھی کرنے لگتے تھے، بعض حسد کی آگ میں جلنے لگتے تھے لیکن ٹٹولنے اور کُریدنے پر ہر خوشی اور خوشحالی کی تہ میں کچھ لوگ دریافت ہوتے تھے جن کا درماں کسی کے بس میں نہیں تھا۔

اور میں بھی نام نہاد خوشحالوں اور بے فکروں کی اسی بھیڑ میں شامل تھا لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ سے یہ خیال بہت مضبوطی کے ساتھ جما ہوا تھا کہ میں جن مسائل سے دوچار تھا، ان کی بنیاد میری پیدائش سے پہلے رکھ دی گئی تھی۔

اگر والد مرحوم محدود آمدنی والی ملازمت پر مامور تھے تو انھیں کوئی حق نہیں تھا کہ رشوت کی بے تول آمدنی کے خمار میں بڑی ماں کا شوہر اور توقیر اور تصویر کا باپ ہوتے ہوئے دوسری شادی کے بارے میں سوچتے۔ جن دنوں انھوں نے دوسری شادی کی، شاید عائلی قوانین وجود میں نہیں آئے تھے اور مذہب و معاشرے کی نگاہوں میں عقدِ ثانی کوئی غیر معمولی فعل نہیں تھا۔ بشرطیکہ انسان مادّی اور جذباتی پیمانوں پر اس معاہدے کے ہر فریق سے انصاف کرنے کی استطاعت رکھتا ہو لیکن مالِ حرام کا خمار دانۂ گندم سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ والد مرحوم نے دوسری شادی کا قصد کیا اور کر گزرے لیکن جب رشوت کا خانہ یکلخت بند ہوا تو انھیں اپنی تنگ دامانی کا احساس ہوا اور میری ولادت کے بعد تلخیاں دن بدن اتنی بڑھتی چلی گئیں کہ والد صاحب رشوت کے پیسے سے خریدے ہوئے مصائب کے بوجھ تلے زیادہ دن نہ جی سکے۔ بڑی ماں اپنے دو بیٹوں کے ساتھ گھر کی مختارِ کل بن گئیں اور مجھے اپنی ماں کی گود میں اس گھر کی دہلیز سے گلی میں دھکیل دیا گیا۔

میرے وجود میں رزقِ حرام کی آمیزش ایسی رچی ہوئی تھی کہ اپنی مظلوم ماں کی تمام تر محنت اور مشقت کے باوجود میں نے اپنی بدمعاشی کے ہاتھوں اپنی سگی ماں کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا اور وہ اپنے تمام زیور و اسباب کو داؤ پر لگا کر میری ضمانت کا بندوبست کرنے کے بعد بے سروسامانی کے عالم میں لاہور کے ایک ویرانے میں خودکشی کرنے پر مجبور ہو گئی۔

بدی کے بیج سے جنم لینے والی کونپل آج ایک تناور درخت بن چکی تھی۔ میں منشیات کی سوداگری میں دولت کے انبار کما چکا تھا اور اب ماضی کے گناہوں کا کفّارہ ادا کرنے پر تُلا ہوا تھا لیکن حالات میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے تصویر بھی کسی اور راستے سے اسی منزل پر پہنچا تھا جہاں حلال غائب اور حرام غالب تھا اور اسی حالت میں اپنے دردناک انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اور میں بے بسی کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ اپنے دشمنوں پر ہاتھ ڈالنے کے قابل تھا، نہ تصویر کے قاتلوں تک رسائی تھی۔ بڑا بھائی مارا جا چکا تھا اور مجھے یہ تک یقین نہیں تھا کہ میں اسے اپنے ہاتھوں سے مٹی دے سکوں گا۔

بوجھل دل میں آگ سی بھڑکتی رہی اور آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ بڑی ماں نے مجھے اور میری ماں کو بے گھر کیا تھا اور اب آخری عمر میں ان کی مٹی خراب ہوتی نظر آ رہی تھی کیونکہ لائیڈز کاٹیج ان کا اپنا گھر نہیں تھا۔ وہ وہاں ایک مجرم کی ماں کی حیثیت سے رہ رہی تھیں۔ مجرم مارا جا چکا تھا اور اسے جنم دینے والی پر زمین و آسمان تنگ ہونے کی باری آنے والی تھی۔

مکافاتِ عمل۔ میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا اور میں کانپ کر رہ گیا، میرے دل میں بڑی ماں کے لیے عزت تھی، میں ان کا احترام کرتا تھا لیکن اچھے اور بُرے اعمال ہمیشہ ایک حسابی مساوات کی طرح ہوتے ہیں جسے آدمی اپنے لیے، خود مکمل نہیں کر سکتا لیکن دوسروں کے لیے یہ فعل بہت آسان ہوتا ہے۔ زبانِ خلق ہر موڑ پر وہی کچھ کہتی ہے جو مکافاتِ عمل کا تقاضا ہوتا ہے۔

میں بوجھل دل کے ساتھ کافی دیر تک یوں ہی بستر پر پڑا رہا پھر شاید آنسوؤں کی برسات سے دل میں بھڑکتی ہوئی جذبات کی آگ کچھ سرد ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ میں اپنا وقت ضائع کر رہا تھا۔ اس وقت لوہا گرم تھا اور میری لگائی ہوئی کوئی بھی ضرب خاصے اچھے نتائج فراہم کر سکتی تھی۔

”شوگر کنگ کالنگ فار ایس او۔۔۔ اوور۔“ میں نے ٹرانسمیٹر آن کر کے مضبوط لہجے میں پیغام نشر کیا۔

”ایس۔ او ریسیونگ!“ دوسری طرف سے محض چند ثانیوں کے توقف کے بعد متجسسانہ آواز اُبھری۔ ”تم اپنے نام سے کیوں نہیں کال کرتے؟ اب تم میرے لیے اجنبی تو نہیں رہے ہو؟ اوور!“

”لوگ برسوں ساتھ رہ کر بھی اجنبیوں کی طرح زندگی گزار دیتے ہیں پھر میری اور تمھاری آشنائی تو بہت مختصر سی ہے۔۔۔۔ اسی لیے تم سے تمھارے حوالوں سے بات کرنا اچھا لگتا ہے۔۔۔ اوور!“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”جلی کٹی باتیں کر رہے ہو۔ خیر یہ بتاؤ کہ رقم مل گئی تمھیں؟ اوور!“

”نہ ملی ہوتی تو تم سے پہلی شکایت اسی بارے میں کرتا۔ کیا تمھارے آدمی نے واپس آکر تمھیں رپورٹ نہیں دی؟۔۔۔ اوور!“

”میرا آدمی ابھی تک نہیں لوٹا۔ رقم گن لی ہے تم نے؟ اوور!“ وہ کوشش کے باوجود اپنے لہجے میں دبا ہوا اشتیاق پوشیدہ نہ رکھ سکا۔ رقم کی گنتی کے بارے میں اس کے سوال سے ظاہر تھا کہ اسے میرے زندہ رہنے پر حیرت تھی۔ اصولاً تو یہی ہونا چاہیے تھا کہ میں بریف کیس وصول کرنے کے بعد رقم گننے کے لیے بریف کیس کھولنے کی کوشش کرتا اور مہلک دھماکے کا شکار ہو جاتا لیکن میں نہ صرف زندہ تھا بلکہ اس سے بات بھی کر رہا تھا۔

میں نے اچانک قلابازی کھانے کا فیصلہ کر لیا اور غصیلے لہجے میں بولا۔ ”اپنے بدنیت آدمی کو تلاش کرو طفیل خان! مقررہ مقام پر میں تین سے چار بجے تک انتظار کرتا رہا لیکن نیلی ٹوپی کہیں نظر نہ آسکی۔ اس کے برعکس پانچ آدمیوں نے مجھے وہاں گھیرنے کی کوشش کی تھی اور اب کہیں پڑے اپنے زخموں کو چاٹ رہے ہوں گے۔ یہ یاد رکھو کہ اس طرح دھوکا دے کر تم مجھے اپنے راستے سے نہ ہٹا سکو گے۔ میں اب کسی جونک کی طرح تمھارے اور لائیڈز کاٹیج کے پیچھے لگ گیا ہوں۔ اوور!“

”تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔“ اس کی آواز سے بوکھلاہٹ ہویدا ہونے لگی۔ ”وہ ایسا آدمی نہیں تھا، اسے ہر قیمت پر مقررہ وقت پر تم تک پہنچنا چاہیے تھا۔ اوور!“

”شاید پہنچا ہی ہو لیکن میں اسے نہ پہچان سکا کیونکہ ان میں سے کسی کے سر پر نیلی ٹوپی نہیں تھی، ہاں وہ مسلح ضرور تھے۔ مجھ سے ذرا بھی غفلت یا اندازے کی غلطی سرزد ہوتی تو وہ مجھے مار ہی ڈالتے۔ اوور!“

”میں نہیں مان سکتا۔“ اس کی ہذیانی آواز سنائی دی۔ ”وہ میرا خاص آدمی تھا، برسوں سے میرے لیے کام کر رہا تھا۔۔۔۔ اوور!“

”یہ غلط فہمی ہے تمھاری۔ تمھارے لیے نہیں، وہ اس معقول معاوضے کے لیے کام کر رہا تھا جو تم اسے ادا کر رہے تھے لیکن تیس لاکھ نیت بگاڑنے کے لیے بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ اگر انھوں نے برابر کا حصّہ بھی رکھا ہو تو اس وقت ان میں سے ہر ایک چھ لاکھ کا مالک بن چکا ہوگا اور تم بیٹھے اپنا خون سلگا رہے ہو۔۔۔۔ اوور!“

”اگر اس نے دغا کی ہے تو وہ پاتال میں بھی نہ بچ سکے گا۔“ اس نے اپنے اضطراری ردِعمل پر قابو پا لیا تھا اور اب اس کی آواز پُرسکون ہو چکی تھی۔ ”اسے تو میں نے رقم کی ہوا بھی نہ لگنے دی تھی بلکہ یہ بتایا تھا کہ بریف کیس میں ردّی کاغذوں کی گڈیاں بھری ہوئی ہیں اور جوں ہی اس کے قفل کا میکینزم حرکت میں لایا جائے گا پورا بریف کیس زبردست بارودی دھماکے سے پھٹ کر کھولنے والے کے چیتھڑے اُڑا ڈالے گا۔ ایسی صورت میں وہ بریف کیس پر قبضے کا تصور تک نہ کر سکتا تھا۔ اوور!“

”تو کیا تم نے مجھے ردّی کاغذات میں بارودی ذخیرہ لپیٹ کر بھیجا تھا؟ اوور!“ میں نے چُبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا اور وہ اپنی دُکھتی رگ پر ہاتھ پڑتے ہی تلملا اٹھا۔

”عجیب کُند ذہن ہو تم۔ بتا رہا ہوں کہ اسے محض کسی امکانی بے ایمانی سے روکنے کے لیے میں نے اسے ردّی کاغذات اور بارود کی کہانی سنائی تھی۔ ورنہ اس میں رقم ہی موجود تھی۔ اوور!“

”اس کا مطلب ہوا کہ تمھیں پہلے سے اس کی نیت پر شبہ تھا، پھر تم نے یہ کام اسے کیوں سونپا تھا؟ اوور!“

”میرے ساتھ وکیلوں کی طرح جرح مت کرو۔“ اس کی چڑچڑی آواز سنائی دی۔ ”یہاں رقم سمیت آدمی لاپتا ہے اور تم لکیروں کو پیٹ رہے ہو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اپنے کس آدمی سے میں کیا کام لے سکتا ہوں۔ اوور!“

”جہنم میں جائے تمھارا آدمی۔“ میں نے بھی غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ سب تمھارا دردِ سر تھا لیکن کان کھول کر سن لو کہ مجھے اس کہانی پر یقین نہیں آیا ہے۔ میری دانست میں تم سنگین وعدہ خلافی کے مرتکب ہوئے ہو۔ تمھارے آدمی مجھے مار ڈالتے تو تمھاری جان چھوٹ جاتی، میں بچ نکلا تو تم مجھے ایک کہانی سنا کر بہلا رہے ہو۔ مجھے مقررہ وقت پر رقم نہیں ملی ہے۔ لہٰذا اب میرا جو دل چاہے گا کر گزروں گا اور اب تمھاری ذات میرا پہلا نشانہ ہوگی۔ اوور!“

”جو چاہو کرتے رہو۔“ اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ”تیس لاکھ گنوا دینے کے بعد میں فوری طور پر دوبارہ اتنی بڑی رقم جمع نہیں کر سکتا۔ ضرورت محسوس ہوئی تو ہم بعد میں کوئی سودا کریں گے۔ اوور!“

”فی الحال تو مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ تم لوگوں نے بھوکے بھیڑیوں کی طرح خود ہی ایک دوسرے کو نوچنا شروع کر دیا ہے۔ یہ سلسلہ رُکے گا تو کچھ سوچوں گا۔ اوور!“

”کس واقعے کی طرف اشارہ کر رہے ہو؟ اوور!“ اس کی طنزیہ آواز اُبھری۔

”آج صبح ایک ہوٹل میں تمھارا اسٹیٹ منیجر ہلاک کر دیا گیا ہے اور قاتل تمھاری ہی صفوں کا آدمی ہے۔ اوور!“

"لائیڈز کاٹیج میں شروع سے آج تک کبھی کوئی اسٹیٹ مینیجر ہی نہیں رہا۔ تم نجانے کس کی بات کر رہے ہو؟ اوور!" اس بار اس کا لہجہ مضحکانہ ہو گیا تھا۔

"تمہارا حافظہ خراب ہو گیا ہے تو پولیس لائیڈز کاٹیج کے دوسرے ملازمین سے اُگلوا لے گی — اوور!"

ریسیور پر اس کا تلخ قہقہہ سنائی دیا۔ "مشاہرے فراخ دلی کے ساتھ ادا کیے جائیں تو ملازمین اپنی عقلوں کے بجائے احکام کے مطابق سوچتے اور عمل کرتے ہیں۔ پولیس کو ضرور بھیجو، بے نیل و مرام ہی واپس جائے گی، کسی نے زیادہ ذہانت دکھانے کی کوشش کی تو عدالت میں ازالۂ حیثیتِ عرفی کے یادگار مقدمے کا سامنا کرتا نظر آئے گا — اوور!"

"تم سب کے منہ بند کر سکتے ہو لیکن اسٹیٹ مینیجر کی ماں تمہارے ہاتھوں نہیں بک سکے گی۔" میں نے شکست اور جھلاہٹ کے عالم میں کہا۔ "لاش کی شناخت کے بعد وہ تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے گی — اوور!"

"تمہیں جو کرنا ہے کر کے دیکھ لو۔" اس بار اس کا لہجہ بالکل ہی رُوکھا تھا۔ "لائیڈز کاٹیج کوئی محتاج خانہ نہیں ہے جہاں ملازمین کے معذور اور ازکار رفتہ لواحقین کی پرورش کی جاتی ہو۔ یہاں صرف اور صرف صحت مند ملازمین ہی رہتے ہیں، کسی بوڑھی عورت کا وجود تم خوردبین سے بھی ثابت نہ کر سکو گے۔ اوور اینڈ آل۔"

بڑی ماں! میرے وجود کی گہرائیوں میں ایک کربناک اور بے آواز چیخ اُبھری اور میں نے ٹرانسمیٹر ایک طرف پھینک دیا۔ نہ جانے ان سنگ دل بھیڑیوں نے تصویر کے قتل کے بعد بڑی ماں کا کیا حشر کیا تھا اور وہ کہاں تھیں؟

اس وقت ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کر کے میں طفیل کو الجھن اور پریشانی میں ڈالنا چاہ رہا تھا لیکن گفتگو کے آخری لمحات میں اس مردود نے مجھ پر بالادستی حاصل کر کے مجھے خلش سے دوچار کر دیا تھا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بڑی ماں کے بارے میں کس سے اور کیسے معلومات حاصل کروں؟

اسی اثنا میں معاً مجھے وہ فون نمبر یاد آیا جو میں نے رمضان چاچا سے حاصل کیا تھا، اس نمبر پر میں کئی بار تصویر سے گفتگو کر چکا تھا اور اس وقت میرے لیے اس نمبر سے رجوع کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا۔

میں فوراً ہی نیچے آیا اور پبلک بوتھ سے وہ نمبر ملانے لگا۔ سلسلہ ملنے پر دوسری طرف سے وہی شناسا نسوانی آواز سنائی دی تھی جس سے میں پہلے متعارف ہو چکا تھا۔

"تصویر علی صاحب سے بات ہو سکے گی؟" میں نے اس سے خلیقانہ لہجے میں سوال کیا۔

"یہاں تو کوئی تصویر علی صاحب نہیں ہوتے!" اس جواب کے ساتھ ہی دوسری طرف سے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا گیا۔

میں ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ لوگ منصوبہ بندی اور اس کے اطلاق میں قابلِ رشک حد تک منظم تھے، تھوڑی سی مدت میں ہر شخص کو سمجھا دیا گیا تھا کہ اسے کیا کہنا اور کرنا ہے۔

میں نے دوبارہ وہی نمبر ملایا اور رابطہ قائم ہوتے ہی براہِ راست مطلب کی بات پر آ گیا۔ "میرا نام ڈینی ہے اور آج صبح آٹھ بجے اسی نمبر پر میری تم سے بات ہوئی تھی۔ اس وقت تک تم تصویر علی کی سیکریٹری تھیں اور تم نے اس سے میری بات کرائی تھی اور اب تم اس کے وجود ہی سے انکار کر رہی ہو!"

"تمہیں کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔" ٹھہرے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔ "ڈینی اور تصویر دونوں نام میرے لیے اجنبی اور مضحکہ خیز ہیں۔ تصویر بے جان ہوتی ہے پھر یہ کسی جیتے جاگتے انسان کا نام کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تو کیا وہ مر چکا ہے؟" میں نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"زندہ یا مُردہ کا سوال تو اسی وقت پیدا ہوتا جب میں اس سے واقف ہوتی۔" اس کی آواز بدستور پُراعتماد تھی۔ "میں نے اس وقت تم سے پہلی بار اس کا نام سنا ہے۔"

"اور اس کی ماں کہاں ہے؟"

"دیکھو مسٹر ڈینی! شاید تمہارا ذہنی توازن کچھ بگڑا ہوا ہے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے مگر تلخ لہجے میں کہا۔ "جب میں کسی تصویر سے ناواقف ہوں تو اس کی ماں کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ لائیڈز کاٹیج ہے کوئی محتاج خانہ یا معذور گھر نہیں ہے جس کے اراکین خدمتِ خلق کے جذبے سے تمہاری بے سروپا باتوں کے جواب دیتے رہیں — براہِ کرم اب مجھے تنگ نہ کرنا۔"

"پھر میری کسی ذمے دار آدمی سے بات کرا دو۔" میں نے عجلت کے ساتھ کہا۔

"ذمے دار تو میں بھی ہوں، لیکن ٹھہرو، میں بات کراتی ہوں۔ شاید تم تیز و تند لہجے ہی کو ذمے داری کا مظہر سمجھتے ہو۔"

اس کی آواز معدوم ہو گئی لیکن رابطہ بحال تھا، شاید وہ سوئچ بورڈ پر کچھ کر رہی تھی۔

"ہیلو — کیا مصیبت ہے؟" چند ثانیوں بعد ہی ریسیور پر ایک غراتی ہوئی، پھاڑ کھانے والی آواز سنائی دی تھی۔

"تم تصویر علی یا اس کی ماں کے بارے میں کچھ بتا سکو گے؟" میں نے اپنی طرف سے مصالحانہ رویّہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نرمی کے ساتھ سوال کیا۔

"ہمیں کچھ نہیں معلوم۔" وہی درندگی سے بھرپور آواز ابھری۔ "اگر تم نے تیسری بار فون کر کے ٹینا کو تنگ کیا تو میں تمہیں تلاش کر کے تمہاری [illegible]"

"بہت [illegible]" میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "مگر بس اتنا ضرور بتا دو کہ کُتّے کی کس نسل سے تمہارا تعلق ہے، کیوں کہ غرانے میں خاصی مہارت رکھتے ہو، چہرہ بھی شاید ایسا ہی ہو گا۔"

میرے تبصرے نے شاید اس کے تن بدن میں آگ لگا دی کیوں کہ وہ گندی گندی گالیاں بکتے ہوئے اتنی قوت سے دہاڑنے لگا تھا کہ میں نے ریسیور کان سے ہٹا کر سلسلہ منقطع کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

میں واپس اوپر لوٹ آیا اور سوٹ کیس میں سے اسکاچ کی سربند بوتل نکال کر دل بہلانے میں مصروف ہو گیا کیوں کہ اس وقت میرے پاس کرنے کے لیے کچھ اور نہیں رہا تھا۔

ساڑھے سات بجے کے قریب سلطان شاہ واپس آیا تو مجھ پر ہلکا سا خمار طاری ہو چلا تھا۔ اس کے بُشرے سے بھی کوئی امید افزا علامات ظاہر نہیں ہو رہی تھیں۔

"کیا کر آئے؟ کچھ تھکے ہوئے نظر آ رہے ہو؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"میں نے آج پہلی بار تمہاری آواز پر شراب نوشی کا اثر محسوس کیا ہے۔" اس نے لیٹر والی آدھی بوتل کا جائزہ لیتے ہوئے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "کوئی اتنی بڑی مصیبت تو نہیں نازل ہوئی تھی تم پر — تصویر تمہارا سوتیلا بھائی ضرور تھا لیکن اس رشتے پر تمہیں کبھی بھی فخر نہیں رہا۔ ہمیشہ وہ تمہارے اور تم اس کے پیچھے لگے رہے۔ پھر اب اس کی موت پر اس قدر غمگین کیوں ہو؟"

"بات اس کے قتل تک محدود رہتی تو اتنا دُکھ نہ ہوتا — لائیڈز کاٹیج والوں نے بڑی ماں کو بھی غائب کر دیا ہے۔ ان سے کچھ بعید نہیں کہ انھوں نے اس بوڑھی عورت کو اپنے لیے بوجھ سمجھتے ہوئے ذبح نہ کر دیا ہو۔"

"بُرا نہ مانو تو مجھے کہنے دو کہ وقت بڑا سفاک اور سنگدل ہوتا ہے۔" اس نے اُداس لہجے میں کہا۔ "تم تو سدا سے بڑی ماں کا احترام کرتے آئے ہو، لیکن اپنی ماں کے ساتھ اس عورت کے ظلم کی کہانیاں تم ہی نے مجھے سنائی تھیں۔ شاید تمہاری سگی ماں نے مرتے دم تک بڑی ماں کو معاف نہیں کیا تھا اور آج اُسی دکھی دل کی فریادیں رنگ دکھا رہی ہیں۔"

"پرانے زخموں کو نہ کریدو سلطان شاہ۔" میں گلاس میں بچا ہوا سیّال ایک بڑے گھونٹ میں خالی کرتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔ "یہ بتاؤ کہ تم کیا کر آئے ہو؟"

وہ سامنے بیٹھا ہمدردانہ نظروں سے مجھے نیا گلاس تیار کرتے دیکھتا رہا، پھر خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "فلموں میں بہت دیکھا ہے۔ گورے ناپ کر بہت تھوڑی مقدار لیتے ہیں مگر تم تو آدھا گلاس بھر لیتے ہو۔ کیا اتنی تیز تمہارا سینہ نہیں جلاتی؟"

"ہم دل جلانے کو پیتے ہیں اور وہ دل بہلانے کو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "دیوانگی میں ہر کام یوں ہی بے تول ہوتا ہے — ناپ تول کر لینا ان ہی فرزانوں کا کام ہے... تم بتاتے کیوں نہیں کہ کیا کر آئے؟"

"تصویر کی لاش کا کوئی دعوے دار ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔" اس نے [illegible] کیا۔ "اس کی مفروضہ حیثیت کے پیشِ نظر فوراً ہی پوسٹ مارٹم کرا لیا گیا تھا لیکن لاوارث لاش ابھی تک مُردہ گھر میں پڑی ہے۔ آثار کچھ یہی ہیں کہ کوئی سامنے نہیں آئے گا اور وہ سرکاری خرچ پر دفنا دیا جائے گا۔"

"یہ کس بنیاد پر کہہ رہے ہو۔ ابھی تو اس کے قتل کو پورا دن بھی نہیں گزرا ہے؟"

"مرنے والے کے پاس سے ایسی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی جس سے اس کی شناخت ہو سکے۔ ہوٹل کا عملہ بھی بس اس کا مخفف نام ہی بتا سکا کیوں کہ وہ اکثر وہاں آتا رہتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ پارکنگ لاٹ سے اس کی گاڑی غائب تھی اور وہاں اس کے ڈرائیور کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی اسی زہر کا شکار ہوا ہے۔ کار کا نمبر ہوٹل میں کسی کو بھی یاد نہیں، ان حالات میں تم اس کے سوا اور کیا کہہ سکو گے کہ قاتل نے شناخت مٹانے کی پوری کوشش کی ہے۔ ٹی اے ملک کے نام سے ورم آلود نیلے چہرے کی بگڑی ہوئی تصویر دیکھ کر تو تم بھی اسے تصویر کی حیثیت سے شناخت نہ کر سکو گے۔"

"تمہارا اندازہ سو فیصدی درست ہے۔" میں نے گلاس سے اپنے لبوں کو تر کرتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "لائیڈز کاٹیج میں اب کوئی تصویر یا اس کی ماں کو نہیں جانتا۔ انہوں نے دونوں سے لاتعلقی اختیار کر لی ہے۔"

پھر میں اُسے طفیل، ٹینا اور کریہہ آواز والے سے گفتگو کی تفصیلات سنانے لگا۔

"سب راستے بند ہوگئے۔" وہ میری کہانی سُن کر مایوسانہ لہجے میں بولا۔ "باہر جتنے محاذ تھے، ایک ایک کر کے تباہ ہوگئے اور اب جو لوگ نگاہوں میں ہیں، وہ سب لاُبٹڈز کالج کے مضبوط حصار میں محفوظ ہیں جہاں گھُسنا تو شاید اتنا دشوار نہ ہو لیکن باہر نکلنا ناممکنات میں سے نظر آتا ہے۔"

اچانک کمرے میں ایک نامانوس سی غیر ملکی آواز سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ سُلطان شاہ اپنی جگہ سے اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور میری مسہری پر پڑے ہوئے آپریٹس کو گھورنے لگا جیسے طفیل سے ناکام مذاکرات کے بعد میں نے آف کیے بغیر وہاں پھینک دیا تھا۔ وہ آواز اسی کے اسپیکر سے اُبھر رہی تھی۔ سلطان شاہ نے جھپٹ کر آپریٹس کا ریسیونگ والیوم بڑھا دیا اور آواز واضح ہوگئی۔

ابتدا میں وہ آواز نامانوس محسوس ہوئی تھی لیکن پھر مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ وہی غیر ملکی تھا جس کی آواز ہم ٹرانسمیٹر پر پہلے بھی سُن چکے تھے۔ وہ اس وقت بھی وہی پرانا پیغام دُہرا رہا تھا جو شاید کوئی شناختی کوڈ تھا۔

"ٹیبل ٹاک ... تھری کلاک ... ڈیڈلی راک ... شوگر کوئین ... اوور!" وہ مشینی آواز وقفوں کے ساتھ مسلسل وہی پیغام دُہرائے جا رہی تھی۔

چار پانچ مرتبہ کال دُہرانے کے بعد بھی دوسری طرف سناٹا چھایا رہا اور میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے اُبال سے آتے رہے۔

"میری آواز کیسی ہے؟" اچانک میں نے بدلی ہوئی آواز میں سلطان شاہ سے سوال کیا اور وہ یوں بھڑکا جیسے کمرے میں اچانک کوئی جن گھس آیا ہو۔ اس سے پہلے اس کی پوری توجہ آپریٹس پر مرکوز تھی۔

مجھے نظرانداز کر کے اس نے متوحش نظروں سے پورے کمرے کا جائزہ لیا، پھر چڑھتے ہوئے سانسوں کے درمیان بولا۔ "یہ نسوانی آواز کہاں سے آئی تھی؟ تم نے بھی سنی تھی نا!"

میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ آپریٹس پر کال ایک بار پھر نشر ہو رہی تھی۔ میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے اسی بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"اوہ خدا! تو یہ تمہیں مذاق سُوجھ رہا ہے، میری تو جان ہی نکل گئی تھی کہ بند کمرے میں عورت کہاں سے گھُس آئی ہے؟"

"مذاق نہیں، میں اُس سے اسی آواز میں بات کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" میں نے بدستور نسوانی آواز میں کہا۔ "شاید شوگر کوئین کا آپریٹس آف ہے یا وہ غیر حاضر ہے۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں، مردانہ آواز میں بولا تو کوئی بھی شبہات کا شکار ہو سکتا ہے۔"

"ضرور کوشش کرو۔" وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی عمدہ آواز بدل سکتے ہو۔"

میں نے مسہری پر سے آپریٹس اٹھا لیا۔ اس بار خاصے طویل سناٹے کے بعد کال دہرائی گئی تھی۔ دوسری طرف سے لائن اوور ہوتے ہی میں نے ٹرانسمیٹنگ بٹن دبا کر نسوانی آواز اور غیر ملکی لب و لہجے میں انگریزی بولنا شروع کر دی۔

"شوگر کوئین باہر مصروف ہے۔ اس کی ہدایت ہے کہ پیغام مجھے نوٹ کرا دیا جائے ... اوور!" سلطان شاہ کسی احمق کی طرح منہ پھاڑے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کیا تم کوڈ ورڈز میں بات نہیں کر سکتیں؟ اوور!" مردانہ آواز نے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔

"یہ سوال میرے بجائے تمہیں مادام سے کرنا چاہیے کہ مجھے کوڈ کیوں نہیں سکھایا گیا ... اوور!" میں نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ، نو بے بی! ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔" میرا تُرش لہجہ سُن کر مرد کا غصہ فوراً ہی کافور ہوگیا۔ "پیغام بہت اہم ہے، میں کھلے الفاظ میں نہیں دُہرا سکتا، شوگر کوئین جب بھی لوٹے، اس سے میری بات کرا دینا ـــ اوور۔"

"ضرور کرا دوں گی ـــ لیکن تمہاری کوئی شناخت بھی ہوگی ـــ اوور۔" میں نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرا کوڈ اولڈ ڈارلنگ ہے ـــ اوور!" جلدی سے کہا گیا۔

"اور اگر مادام رات بھر واپس نہ آئیں؟ اوور!" میں نے سلطان شاہ کو آنکھ سے اشارہ کر کے سوال کیا۔

"اوہ ـــ یہ بہت ضروری ہے ـــ بہت اہم ہے۔" اس کی مضطربانہ آواز اُبھری۔ "کیا تمہیں علم ہے کہ وہ اس وقت کہاں مل سکے گی؟ اوور!"

"معلوم ہے لیکن بتا نہیں سکتی ـــ اوور!" سلطان شاہ سپاٹ چہرے کے ساتھ احمقانہ انداز میں منہ پھاڑے

بیٹھا تھا۔

"پھر کام بن گیا ـــ مائی بے بی! اس سے کہو کہ فوراً مجھے فون کر لے ... اوور!"

"نمبر ... اوور!"

اس نے ایک فون نمبر دُہرایا جو میرے اشارے پر سلطان شاہ نے پھرتی کے ساتھ نوٹ کر لیا۔ میں نے نمبر اُسے سنانے کے بعد اوور اینڈ آل کہہ کر سلسلہ ختم کر دیا لیکن آپریٹس بدستور آن رہنے دیا۔

"کیا بات ہوئی؟" گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی سلطان شاہ نے سوال جڑ دیا، کیوں کہ شکستہ فقروں سے آگے اس کی انگریزی جواب دے جاتی تھی۔ "تمہیں ڈارلنگ کیوں کہہ رہا تھا؟"

میں اپنا گلا سہلاتے سہلاتے بے اختیار ہنس پڑا۔ "وہ مجھے ڈارلنگ نہیں کہہ رہا تھا بلکہ اپنا کوڈ بتا رہا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے اختصار کے ساتھ اسے پوری گفتگو کے خلاصے سے آگاہ کر دیا۔

"حیرت ہے کہ اس دوران میں کسی نے بھی دخل اندازی نہیں کی، یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس وقت ہمارے علاوہ باقی سارے ہی آپریٹس آف رہے ہوں۔" میرے خاموش ہونے پر اس نے رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی ہر آن دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اور کسی نے نہیں تو کم از کم طفیل نے ضرور ساری گفتگو سنی ہوگی، لیکن دخل انداز ہونے کی ہمت نہ کر سکا۔ شاید اس کے لیے شوگر کوئین اور اولڈ ڈارلنگ کا منصب خاصا بلند ہے۔ اب اس سے پہلے کہ ہماری اس دخل اندازی کا بھانڈا پھوٹے ہمیں فون نمبر سے اولڈ ڈارلنگ کے ٹھکانے کا پتا لگانا ہے ورنہ وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

"تم جاؤ، میں یہیں بیٹھا ہوں۔" اس نے کہا۔

"تمہیں جانا ہوگا۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "اس دوران میں پھر گفتگو شروع ہوگئی تو تم کچھ نہ سمجھ سکو گے۔"

وہ ہنستا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ اس کی تعلیم بس اسی حد تک تھی کہ انگریزی اچھی طرح پڑھ لیتا تھا، صاف لہجے میں بولے گئے عام فہم الفاظ کا مطلب سمجھ لیتا تھا، لیکن فقروں اور خصوصاً روانی میں بولے گئے فقروں سے مفہوم اخذ کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ انگریزی فلمیں بھی محض اپنے وسیع تجربے کی بنیاد پر ایکشن اور اداکاروں کے تاثرات کی بنا پر سمجھ لیتا تھا

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو خاصا مسرور تھا۔ رقعے پر لکھا ہوا پتا گلبرگ کے علاقے کی نشان دہی کر رہا تھا۔

"اب ایک مسئلہ پریشان کُن ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اُس پتے پر پہنچنے تک میں آپریٹس آن رکھنا چاہتا ہوں تاکہ اس پر ہونے والی ہر گفتگو سے باخبر رہ سکوں۔ اگر یہ گفتگو ٹیکسی ہی میں شروع ہوگئی تو ڈرائیور ہماری طرف سے بھڑک جائے گا۔"

"مجھے اس دشواری کا اندازہ تھا۔" وہ ایک کار کی چابی جیب سے نکال کر چٹکی میں دباتے ہوئے بولا۔ "نیچے کاریں کرائے پر دینے والوں کا ایک کل وقتی کاؤنٹر موجود ہے، میں نے دو دن کے لیے گاڑی کرائے پر لے لی ہے جو باہر موجود ہے۔"

میں اپنے گلاس میں رہا سہا سیّال معدے میں انڈیل کر اس کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے آپریٹس کا والیوم بہت کم کر دیا تھا اور اسے جیب میں ڈال لیا تھا۔

"ایک سفید کار بھی تھی مگر میں نے سرمئی کو ترجیح دی ہے۔" سلطان شاہ نے میرے لیے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اندھیرے میں دور سے نظر بھی نہ آ سکے گی۔"

"بشرطیکہ ہیڈ لیمپس روشن نہ ہوں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔

"تمہارے سانسوں سے شراب کی تیز بُو آ رہی ہے۔" سلطان شاہ نے انجن اسٹارٹ کر کے کار سڑک کی راہ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "راستے میں کسی نے روک لیا تو دشواری میں پڑ سکتے ہیں۔"

"کہیں سے ایک خوشبو والا پان لے لینا۔"

"کیا اب اس غیر ملکی کو بھی چھاپنے کا ارادہ ہے؟" کچھ دیر کے بعد اس نے سوال کیا۔

"یہ حماقت کے مترادف ہوگا ـــ یہ پہلا غیر ملکی نظروں میں آیا ہے۔ اس کے سہارے ہم یقیناً دیرا لائیڈ یا کسی اور اہم شخصیت تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔"

"اس سے زیادہ صبر آزما کام روئے زمین پر محال ہے، چھپے بیٹھے رہو اور بس انتظار کرتے رہو۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اسی کی رگڑائی کر کے سب کچھ اگلوا لیا جائے؟"

"بے سود ہوگا ـــ اس سے تعلق رکھنے والوں کو جوں ہی

اس کی رگشائی کا علم ہوگا، سب اپنے ٹھکانے چھوڑ کر روپوش ہوجائیں گے اور ہم خلا میں ہاتھ پیر مارتے رہ جائیں گے، میری بات لکھ کر رکھ لو کر شوگر کوئین سے رابطہ قائم ہونے کے بعد تمہارے اولڈ ڈارلنگ کو جوں ہی حقیقت کا علم ہوگا، وہ بھی کسی خارش زدہ چوہے کی طرح اپنے گلبرگ کے ٹھکانے سے نکل بھاگے گا۔"

کار چونکہ اب اپنی ہی تھی لہٰذا میں نے آپریٹس کا والیوم بڑھا دیا۔

مال روڈ سے کنال بنک روڈ پر مڑنے کے بعد جب ہم گلبرگ روڈ کے مقام اتصال پر پہنچے تو اچانک ہی آپریٹس پر وہی مردانہ آواز سنائی دینے لگی۔ اس بار بھی وہ شوگر کوئین سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بے چین تھا۔

میرے ایما پر سلطان شاہ نے کار بائیں طرف گلبرگ روڈ پر گھما کر رفتار تیز کر دی۔ پھر ہم خیابان اقبال پر مڑ گئے جہاں آگے چل کر گلبرگ مین مارکیٹ کے بارونق علاقے میں کسی سے صحیح رہنمائی حاصل کی جاسکتی تھی۔

اس نے یکے بعد دیگرے تین بار شوگر کوئین کے لیے پیغام نشر کیا لیکن دوسری جانب سناٹا چھایا رہا، آخر اس کے ہاتھ سے صبر کا دامن جاتا رہا اور وہ کسی سے بھی بات کرنے پر تل گیا۔

"اِٹ از اولڈ ڈارلنگ آن دی لائن —— جو بھی میری آواز سُن رہا ہو، جواب دے —— یہ بہت اہم ہے... اوور۔" اس بار وہ کوڈ ورڈز کے بجائے انگریزی میں بولا تھا اور یہ نکتہ میرے لیے خیال انگیز تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ تنظیم میں شوگر کوئین اور اولڈ ڈارلنگ کے علاوہ دوسرے لوگ کوڈ ورڈز کے نظام سے نابلد تھے۔

"ایس۔ او فرام لائیڈز کاٹج ریسونگ سر! اوور۔" دوسری سمت سے طفیل کی مؤدبانہ آواز سُن کر میرا دل خوش ہوگیا۔

"شوگر کوئین کہاں لاپتا ہے اور وہ دوسری لڑکی بھی نجانے کہاں جامری ہے ... وہ کہاں مل سکے گی؟ اوور!"

"اس سے آپ کی تمام گفتگو میں نے سنی تھی سر! میرے لیے وہ نئی آواز تھی .... ہوسکتا ہے کہ مادام نے اُسے حال ہی میں رکھا ہو، میں اس کے ٹھکانے سے لاعلم ہوں۔ اوور!" طفیل کی آواز پر یتیمی سی طاری ہوگئی تھی۔

"وہ جانتی ہے کہ شوگر کوئین کہاں ہے، لیکن بتانے پر آمادہ نہیں تھی —— تم فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ اوور۔"

"پتا بتا دیں، میں ابھی پہنچتا ہوں سر... اوور!" طفیل نے سوال کر کے میرا دل باغ باغ کر دیا۔

اولڈ ڈارلنگ نے اپنا پتا بتا کر گفتگو ختم کر دی۔

"خدا بڑا مہربان ہے۔" آپریٹس کے خاموش ہوتے ہی سلطان شاہ درویشانہ انداز میں بڑبڑایا۔

"صرف اس لیے کہ تمہارے حاصل کیے ہوئے پتے کی تصدیق ہوگئی؟" میں نے اُسے چھیڑا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس وقت میرے ذہن پر سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

"بلکہ اس لیے کہ اللہ نے دونوں کے لیے کام پیدا کر دیا۔ تم گورے کی نگرانی کرنا، میں طفیل کو اس تک پہنچنے سے پہلے اٹھا لوں گا۔ بڑی حسرت ہے مجھے اس کے دیدار کی۔"

"میرے نزدیک اس وقت طفیل کا اغوا سب سے اہم ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم اُسے کہاں رکھو گے؟" میں نے تشویش زدہ لہجے میں سوال کیا۔ "وہ آسانی سے ہار ماننے والوں میں نہیں ہے، تمہاری کمزوری بھانپتے ہی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔"

"تم میرے اُن دوستوں کو بھول رہے ہو جنھوں نے مجھے اسلحہ اور چوری کی ایک کار پچھلے چکر میں فراہم کی تھی، ایک تو کیا، دس طفیل بھی ان کی تحویل سے نہیں بھاگ سکیں گے جگہ کا مسئلہ تمہارے لیے ہوسکتا تھا، اسی لیے میں نے یہ ذمہ اپنے سر لیا ہے۔"

مین مارکیٹ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہمارا مطلوبہ مکان اسی علاقے میں قدرے اندر واقع تھا۔ بتائے ہوئے راستوں کو اختیار کرتے ہوئے ذرا ہی دیر میں ہم درختوں کے سائے میں گھرے جدید طرز کے اس مکان کے سامنے پہنچ گئے جہاں پلاسٹک کی ایک روشن، دیوارگیر پلیٹ پر جارج سالومن کے نام کے نیچے مطلوبہ نمبر لکھا ہوا تھا۔

غنیمت یہ تھا کہ وہ علاقہ آمد و رفت کے اعتبار سے سنسان نظر آ رہا تھا۔ مکان بھی وسیع احاطوں میں ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر تعمیر کیے گئے تھے کہ ہر مکان اپنی جگہ سراپا خلوت تھا۔

اس گلی کا ایک چکر کاٹنے کے بعد ہم نے متفقہ طور پر یہ تعین کر لیا کہ طفیل، جارج سالومن کے مکان تک پہنچنے کے لیے وہی راستہ اختیار کرے گا جو ہم نے اپنایا تھا — خیابانِ اقبال سے وہاں پہنچنے کے لیے بس وہی ایک راستہ تھا۔ ہمارے اندازے کی غلطی کی بس یہی ایک صورت ہوسکتی تھی کہ طفیل گلیوں میں بھٹکتا ہوا اِدھر آ نکلے۔

میں اسی گلی میں کار سے اتر گیا اور سلطان شاہ سرعت سے کار کو گھما کر اسی سمت میں لے گیا جدھر سے طفیل کے آنے کا امکان تھا۔ معاً مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا اور میں نے کار کے پیچھے تقریباً دوڑ لگا دی۔

سلطان شاہ نے گاڑی نکڑ سے گھومنے کے بعد روک لی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ کچھ پریشان سا ہوگیا۔

"گاڑی تم لیے جارہے ہو، اگر وہ نکل ہی کھڑا ہوا تو میں اس کا پیچھا کیسے کر سکوں گا؟" میں نے قریب پہنچ کر سوال کیا۔

"مجھے خیال آیا تھا لیکن مجبوری کے تحت خاموش رہا۔ میں بھی تو اُسے کندھے پر لاد کر نہیں لے جاسکتا۔" وہ شرمندہ نظر آنے لگا تھا۔

"وہ بھی پیدل تو نہیں آئے گا — اسے گاڑی سے اترنے کی مہلت ہی نہ ملے، وہی کار تمہارے کام آئے گی، یہ میرے پاس رہ جائے گی۔"

"بعض اوقات سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ سے اترتے ہوئے خفت آمیز ہنسی کے ساتھ بولا۔ "تو بس تم جاؤ، کہیں وہ نکل نہ جائے۔"

"وہ پہلی تھی اور یہ دوسری سامنے کی بات ہے۔" میں بلاوجہ ہی ہنس پڑا۔

"اب کیا ہوگیا؟" اُس نے حیرانگی کے عالم میں سوال کیا۔

"طفیل سے نمٹنے کے بعد ہی میرا کام شروع ہوگا — اس کی اور طفیل کی گفتگو ہم نے خود سُنی ہے، وہ گھر ہی میں رک کر طفیل کا انتظار کرے گا۔ اس سے پہلے کہیں نہیں جائے گا۔ ہاں یہ دھیان رکھنا کہ طفیل کے ساتھ بھی ٹرانسمیٹر ہوگا۔ اسے صحیح سالم حاصل کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر کُند ذہن ہونے کے باوجود میں اب تک کیسے بچا ہوا ہوں۔" وہ جھلاتے ہوئے انداز میں سر جھٹک کر بڑبڑایا۔

"اس طرح تو ہم دونوں ہی ہم عصر اور ہم پایہ ہیں۔"

"فرق ہے مجھ میں اور تم میں — تم اپنی غلطیوں کی اصلاح بھی خود ہی کر لیتے ہو، مجھے جب تک بتا یا نہ جائے یا تجربہ نہ ہوجائے، غلطی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو تمہارے پیچھے دوڑ لگانے کے بجائے کسی کونے کھدرے میں گھس کر باقاعدہ نگرانی کا آغاز کر چکا ہوتا جو طفیل کے آنے سے پہلے بالکل بے سود ہوتی۔"

"اگر طفیل کو تم اٹھا لے گئے تو وہ انتظار سے اکتا کر دوبارہ ٹرانسمیٹر لے بیٹھے گا ... میں سوچ رہا ہوں کہ اس کی نوبت ہی نہ آنے دوں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" اس نے تائید کی۔ "لیکن طفیل کو یہ اندازہ ضرور ہے کہ اولڈ ڈارلنگ کا منصب اس سے برتر ہے۔"

"کیوں نہ میں طفیل بن کر اس سے جا ٹکراؤں؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پُرخیال لہجے میں کہا۔

وہ اچھل پڑا۔ "بڑا انوکھا خیال ہے۔ ایک تیر میں دو شکار ہوجائیں گے۔"

میں نے اس کی خوشی پر پانی پھیرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر میں طفیل بن کر اولڈ ڈارلنگ سے مل لیتا تو میرا وہ منصوبہ دھرا رہ جاتا جو اس کو چارا بنا کر مزید معلومات حاصل کرنے کے بارے میں تھا لیکن اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک قابلِ عمل تجویز پہلے سے موجود تھی۔ لہٰذا میں خاموش ہی رہا۔

سلطان شاہ نے کسی بُری گھڑی کے لیے اپنا پستول بھی میرے حوالے کر دیا۔ اس کی دانست میں اُسے کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں تھی۔ اور پھر طفیل سے بھی کچھ اسلحہ برآمد ہونے کے قوی امکانات تھے۔

ہم دونوں وہیں کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ سامنے سے ایک گاڑی کی روشنیاں نمودار ہوئیں اور سلطان شاہ نیچے بیٹھ کر ٹائر کا جائزہ لینے لگا۔ میں سگریٹ سلگائے کسی فرعون صفت زردار کی طرح لاتعلقانہ انداز میں کھڑا رہا۔ میری پشت روشنی کی جانب تھی۔

گلیاں سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ لہٰذا میرا اندازہ بالکل درست نکلا اور آنے والی کار میرے قریب تھم گئی۔ اس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی آگے گزر چکی تھی اور میں ایک مرتبہ پھر تاریکی میں تھا۔

سلطان شاہ بھی چونک کر یوں سیدھا ہوا جیسے اب تک اس کار کے وجود سے لاعلم رہا ہو۔ آنے والی کار میں صرف ایک شخص ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا۔ اس نے بڑے نرم لہجے میں جارج سالومن کے مکان کا پتا دہرا کر اُس کا محل وقوع دریافت کیا اور میرے جواب دینے سے پہلے ہی سلطان شاہ نے پھرتی سے عقبی نشست پر سوار ہو کر پیچھے سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ تھا اور گیئر بھی پڑا

ہوا تھا۔ اس ناگہانی گرفت سے بچنے کی جدوجہد میں سلطان شاہ کے شکار کا پاؤں ایکسیلیٹر پر سے ہٹا ہوگا کہ گاڑی تیزی سے آگے اچھلی، انجن بند ہوا اور کار رک گئی۔

میں اپنی جیب سے پستول نکال کر آگے لپکا اور سلطان شاہ کی خوف ناک گرفت میں غراہٹوں کے ساتھ مچلتے ہوئے شخص کی داہنی کنپٹی پر پستول کے آہنی دستے سے ضرب لگائی، فوراً ہی اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ہم دونوں نے حیرت ناک سرعت کے ساتھ اسے پیا رہ والی نشست کے پائیدان پر لڑھکا دیا۔ اس کے جسم کا اوپری حصہ منہ کے بل نشست پر ہی پڑا رہا۔

سلطان شاہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کر کے آناً فاناً ہیں وہاں سے رفوچکر ہوگیا اور میں آسودہ انداز میں سرمئی کرولا کی طرف ہولیا۔

میں نے کار جارج سالومن کے مکان کے پھاٹک کی طرف گھمائی تو ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی کے باعث پھاٹک کے پیچھے کچھ تحریک نظر آئی اور پہلے ہی ہارن پر ذیلی کھڑکی کے بجائے بن پھاٹک تھوڑا سا کھول دیا گیا۔ اس میں سے گزر کر تندرست چوکیدار میری طرف آیا تھا۔

"طفیل" میں نے کار کی کھڑکی میں سے سر نکال کر کہا اور اس نے واپس لوٹ کر پھرتی کے ساتھ پھاٹک کھول دیا۔

میں نے کار آگے بڑھائی تو اس نے اپنا داہنا ہاتھ تعظیم کے انداز میں پیشانی تک لے جاتے ہوئے مجھے کار آگے عمارت تک بڑھا لے جانے کے لیے کہا اور میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کار کی رفتار تیز کردی۔

گاڑی پورچ کی طرف گھماتے ہوئے میں نے دور ہی سے اس تنومند اور دراز قامت سفید فام کو دیکھ لیا جو بے چینی کے ساتھ روشن برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔

گاڑی رکتے ہی وہ برآمدے کی سیڑھیاں طے کر کے تیر کی طرح میری طرف آیا تھا۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" اس نے قریب آتے ہی ناخوشگوار تحکمانہ لہجے میں دریافت کیا۔ اس کی انگریزی صاف ستھری تھی لیکن لب و لہجہ انگریزوں جیسا نہیں تھا۔

اس نے جس اعتماد کے ساتھ مجھ سے وہ سوال کیا، اس کی بنا پر میں نے دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لیا کہ وہ میرے اندازے کے مطابق طفیل کا صورت آشنا نہیں تھا اور آواز پر شبہ کرنا تقریباً ناممکن تھا کیوں کہ میری اور طفیل کی آواز میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ویسے بھی آپریٹس پر ریڈیائی شور کے باعث اصل آواز خاصی حد تک مسخ ہوجاتی ہے۔

"میں نے فوراً ہی حکم کی تعمیل کی تھی سر۔" میں نے کار سے اترتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ اس سے مصافحے کے لیے میں پیش قدمی کرنے کے بجائے اس کی پیش رفت کا منتظر رہا لیکن وہ ہاتھوں کو جنبش دیے بغیر منہ بنائے کھڑا رہا۔ "مکان کی تلاش میں ضرور چند منٹ ضائع ہوئے ہیں۔"

"چلے آؤ۔" اس نے تیزی سے مڑتے ہوئے کہا اور سیڑھیاں عبور کر کے برآمدے سے گزرتا ہوا ایک دروازے میں داخل ہوگیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کر ڈالی۔

وہ وسیع ڈرائنگ روم تھا جہاں نشستوں کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ ایک دوسرے کی مصروفیات میں مخل ہوئے بغیر بیک وقت کئی گروپ بیٹھ سکتے تھے۔ وہ قالین پر لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم کے دور افتادہ گوشے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں سینٹر ٹیبل پر آپریٹس سمیت کچھ کاغذات وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔

"میں سخت الجھن سے دوچار ہوں۔" اس نے وہاں اپنی نشست سنبھالتے ہی مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"مجھ سے جو کچھ ممکن ہوگا، کر گزروں گا۔" میں نے فدویانہ انداز میں کہا۔

"مجھے جانے بوجھے بغیر؟ یہ شاید ہماری پہلی ملاقات ہے۔" اس نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہوا کرے۔" میں نے اپنے اندازِ گفتگو میں مبہم سی تبدیلی لاتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میرا تم سے آپریٹس پر رابطہ ہوا ہے، میں پہلے بھی تمہاری آواز سنتا رہا ہوں اور اب آپریٹس بھی یہاں پڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اپنے آدمی کی شناخت کے لیے یہ سب کافی سے زیادہ ہے۔"

"شوگر کوئین بتا رہی تھی کہ ایک آپریٹس تم لوگوں کے ہاتھ سے نکل کر کسی غیر کے قبضے میں چلا گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن ہم اسے اور اس کی آواز کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ شاید تم اسی لیے ہمیشہ کوڈ ورڈز استعمال کرتے رہے ہو۔" میں نے بے چینی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ مجھے فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ وہ اپنی کسی اہم پریشانی اور الجھن کو بھول کر فضول باتوں میں وقت کیوں برباد کر رہا تھا۔

"یہاں کے لوگ میرے اندازے سے زیادہ چالاک اور پھرتیلے ثابت ہوئے ہیں۔ آج لاہور میں میرا ایک آدمی پکڑا گیا ہے۔ اس کی گاڑی میں تین کلو کے قریب براؤن شوگر چھپی ہوئی ہے۔" پھر وہ رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ "اب سے چالیس منٹ پہلے تک وہ لوگ گاڑی سے مال برآمد نہیں کر سکے تھے، لیکن انہیں اپنی اطلاع پر اس قدر اندھا یقین ہے کہ وہ اسے چھوڑنے کے بجائے پُرتشدد بازپرس پر اتر آئے ہیں۔"

"اگر وہ اسی قدر پُریقین ہیں تو مال ضرور برآمد کرلیں گے۔" میں نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ "براؤن شوگر کہاں چھپائی گئی ہے؟"

وہ تحقیر آمیز انداز میں ہنسا۔ "انہیں دانتوں پسینے آجائیں گے۔ وہ یورپ سے بذریعہ کار یہاں آیا تھا اور اس کی پٹرول کی ٹنکی میں ایک ایسی محفوظ تہ ہے جہاں اس نے مال چھپایا ہوا ہے۔ انہیں اسی لیے ناکامی ہو رہی ہے کہ یہ کام ڈیوڈ نے کسی کو اعتماد میں لیے بغیر اپنے ہاتھوں سے انجام دیا تھا لیکن میں نے سنا ہے کہ یہاں تھرڈ ڈگری کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں ہے، اگر اسے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا تو وہ کب تک زبان بند رکھ سکے گا۔"

"اور اس کی رہائی تمہارے لیے بہت اہم ہے؟"

"دراصل وہ میرے ملک کا ایک اہم افسر ہے۔ مال برآمد نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک کسٹم انٹیلی جنس والوں نے اس کی گرفتاری کی خبر روکی ہوئی ہے، اگر اس خبر کی تشہیر ہوگئی تو وہ اور اس کا گھرانا برباد ہوجائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ میں یہ کام سرانجام دے سکوں گا۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کے لیے شوگر کوئین کی اجازت ضروری ہے۔"

"پھر وہی بات آگئی۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں کہہ رہا ہوں کہ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ تم معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ ڈیوڈ کسی زمانے میں یہاں اپنے ملک کے سفارت خانے میں بھی اہم عہدے پر فائز رہا ہے لیکن اس وقت نام تبدیل کر کے عام شہری کی حیثیت سے یہاں آیا ہے۔ اس کا جرم ثابت ہوتے ہی مقامی حکام سفارت خانے سے رابطہ قائم کریں گے اور ڈیوڈ کی اصل شخصیت بے نقاب ہوجائے گی، اس کے لیے بدترین اور رسوا کن اسکینڈل ہوگا۔"

"شوگر کوئین اگر لاپتا ہے تو وہ لڑکی کہاں ہے جس نے تم سے گفتگو کی تھی؟" میں نے تشویش کا ڈھونگ رچاتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی کہیں جا مری ہے... سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی بدنظمی میں یہاں کا نظام کیسے چل رہا ہے۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

"ہوسکتا ہے کہ وہ آپریٹس آن رکھنا بھول گئی ہو یا سو ہی گئی ہو۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"اگر تم شوگر کوئین کے ٹھکانے سے واقف ہو تو وہاں جاسکتے ہو۔ شوگر کوئین نہیں تو دوسری لڑکی ضرور مل جائے گی۔ شاید تمہیں ہماری مجبوریوں کا علم نہیں۔ اصولاً دیکھا جائے تو میں نے تم سے رجوع کر کے بھی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ تنظیم کا کوئی بڑا چاہے تو اس پر میری گرفت ہوسکتی ہے۔" میں نے محتاط انداز میں کہا۔

"بڑے... بڑے۔" وہ غصیلے انداز میں میز پر مکا مار کر غرایا۔ "تنظیم میں میں بھی اتنا بے حیثیت نہیں ہوں..." بولتے بولتے اچانک ہی اس نے سنبھالا لیا اور پُرسکون ہوتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ لڑکی مل بھی گئی تو مجھے اس سے شوگر کوئین کا موجودہ ٹھکانا معلوم کر کے اس سے رجوع کرنا ہوگا۔ پھر وہ تم سے یا تمہارے کسی بڑے سے رابطہ قائم کرے گی... یہ بڑا لمبا چکر ہے اور میں اس شہر سے اتنا زیادہ واقف نہیں ہوں... وقت بچانے کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"شاید اس وقت تمہیں اندازہ نہیں رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"جو کچھ کر رہا ہوں، اس کی جواب دہی میری ذمے داری ہے۔" اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ دی۔

میں بھی منہ لٹکائے مجبوری کے انداز میں اٹھ گیا۔

"ذرا ایک منٹ ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔" وہ یہ کہتے ہوئے تیزی کے ساتھ ڈرائنگ روم سے کسی اندرونی کمرے کی طرف چلا گیا۔

اولڈ ڈارلنگ کے کوڈ سے پہچانے جانے والے اس شخص کا نام نجانے جارج سالومن ہی تھا یا کچھ اور لیکن مجھے اس سے اس قدر عامیانہ رویے کی امید نہیں تھی۔ اس سے ملنے کا فیصلہ کر کے میں نے اپنی دانست میں ایک بہت بڑا خطرہ مول لے لیا تھا لیکن اس سے ملنے کے بعد یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے اپنے کام سے زیادہ میرے مفاد کی فکر رہی ہو۔

شاید اس میں اس کا زیادہ قصور بھی نہیں تھا۔ وہ خود کچھ ایسے پیچیدہ حالات کا شکار ہوا تھا کہ اسے

بوکھلا کر ایک ایسے آدمی کا تعاون حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس طرح ایک طرف طفیل ہمارے ہاتھ آگیا تھا اور دوسری طرف میں طفیل کی جگہ اولڈ ڈارلنگ کے سینے سے معلومات اگلوائے جا رہا تھا۔

اس نے مجھے گھر کا بھیدی سمجھتے ہوئے ڈیلو ڈکی ذات سے وابستہ ہر راز سے آگاہ کردیا تھا اور اب مجھے شوگر کوئین کا ٹھکانا دکھانے پر تلا ہوا تھا۔ میں کسی بھی حالت میں اس اقدام کے ذریعے اتنی بڑی کامیابی کا تصور نہیں کرسکتا تھا

لیکن اس ضمن میں ابھی تک مجھے ایک ہی فکر لاحق رہی تھی کہ کہیں ائیرپیس پر شوگر کوئین کی آواز نہ اُبھرنے لگے۔ ایسا ہوتا تو میرا سارا کھیل بگڑ سکتا تھا۔

لیکن وہ بہت ہی شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے وہاں مجھے اکیلا چھوڑ کر اس مسئلے سے نمٹنے کا موقع بھی فراہم کردیا تھا۔ میں نے میز پر سے ائیرپیس اٹھا کر آواز کم و بیش کرنے والی ناب گھما کر ائیرپیس کو آف کردیا۔ پھر اُسے مزید مروڑا تو اندر سے ہلکی سی آواز آئی جیسے کوئی پرزہ ٹوٹا ہو۔ میں نے فوراً ہی ائیرپیس اس کی جگہ واپس رکھ دیا۔ اب اس کی ناب ناکارہ ہوچکی تھی جس کی مرمت کیے بغیر ٹرانسمیٹر کو آن کرنا ناممکن تھا۔

چند ثانیوں کے بعد وہ واپس آگیا۔ اس نے کچھ دیکھے بھالے بغیر بے پروائی کے ساتھ ائیرپیس کو جیب میں ڈالا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ اس مُہم کے لیے اس نے میرے ساتھ چلنے کو ترجیح دی تھی۔

"اگر بُرا نہ مانو تو ڈرائیونگ تم ہی کرلو۔" میں نے چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے تردد آمیز لہجے میں کہا۔ "میرے شانے کی ہڈی میں کچھ تکلیف ہے جو اسٹیئرنگ کاٹنے میں حارج ہوتی ہے۔"

اس نے مجھے گھورتے ہوئے میرے ہاتھ سے چابی لے لی اور تنک کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف چلا گیا۔ شاید میری فرمائش سے اس کا احساسِ برتری مجروح ہوا تھا۔

تقریباً دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد ایک.... سڑک پر اس نے کار کی رفتار دھیمی کی تو میں ہوشیار ہوکر بیٹھ گیا۔

"کیا اس کا مکان آگیا؟" میں نے پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں، وہ داہنی طرف دوسرا چوبی پھاٹک اسی کے بنگلے کا ہے۔" اس نے رواداری میں کہا اور میں نے پھرتی کے ساتھ جیب سے پستول نکال لیا۔

"میرا خیال ہے کہ اب سیدھے ہی نکل چلو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

میرے لہجے پر اس نے چونک کر سر گھمایا تو نگاہ میرے ہاتھ میں دبے ہوئے مہلک ہتھیار پر پڑی اور اس کی آنکھیں غصے سے پھیل گئیں۔ چہرہ چقندر کی طرح سُرخ ہوگیا۔ "تت... تم... تمہاری یہ مجال۔" اس نے غصے کی شدت سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"مجبوری ہے۔" میں نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔

"مجھے شبہ ہے کہ تم اصلی اولڈ ڈارلنگ نہیں ہو۔ لائیڈز کالج میں تم نے اپنی شناخت ثابت کردی تو میں تمہارے پاؤں تھام کر معافی مانگ لوں گا۔"

"میں... شش... شوگر کوئین...."

اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نو سر! شوگر کوئین بہت بڑی ہستی ہے، ہوسکتا ہے کہ تم بھی اس کے ہم رتبہ ہو لیکن میں صرف اسی کو بڑا مانتا ہوں جس کو میں جانتا ہوں۔ تمہیں اس کے سامنے پیش کرنے کے بعد میری ذمے داری ختم ہوجائے گی۔ آخری فیصلہ اب وہی صادر کرے گا۔"

"یو ڈرٹی بلیک۔" اس نے تحقیر آمیز انداز میں دانت پیستے ہوئے کہا اور کار کی دم توڑتی ہوئی رفتار میں اضافہ کردیا۔ "دیکھنا کہ تم اپنے اس رویے پر پچھتاؤ گے۔"

"اب اس کا امکان کم ہی ہے کیوں کہ میرے اوپر والا بھی بقول تمہارے گندا کالیا ہے۔"

وہ دانت پر دانت جمائے ڈرائیونگ کرتا رہا اور میں وقفے وقفے سے اسے راستے کے بارے میں ہدایات دیتا رہا۔ اس وقت میرا ذہن بہت تیزی کے ساتھ کام کررہا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب اس غیر متوقع شکار کے ساتھ کیا سلوک کروں اور اسے کہاں لے جاؤں؟

پھر اچانک ہی ڈیش بورڈ کے خانے میں پڑے ہوئے میرے ائیرپیس سے آواز بلند ہوئی۔ "شوگر کوئین کالنگ اولڈ ڈارلنگ — اوور!" وہ آواز سنتے ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ اپنے ائیرپیس کو میں فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔ اگر میرے پستول نکالنے سے پہلے وہ پیغام آجاتا تو میں بدترین اُلجھن سے دوچار ہوجاتا۔"

اولڈ ڈارلنگ کو اس سے بات کرنے کی اجازت دینا زیر بحث... کو ڈورڈز میں تبادلۂ خیال کرکے فوری طور پر میرے بارے میں نہ سہی تو کسی تیسری لڑکی کے بارے میں شبہات کا شکار ہوجاتا۔ دوسری طرف شوگر کوئین کو علم ہوجاتا کہ اس کی لاعلمی میں کسی نے ٹرانسمیٹر کے ذریعے اولڈ ڈارلنگ کو فریب دینے کی کوشش کی ہے اور اس بارے میں لامحالہ میری ہی ذات شبہات کا نشانہ بنتی کیوں کہ تنظیم سے باہر صرف ایک ائیرپیس میرے قبضے میں تھا اور اگر اس مرحلے پر میں اولڈ ڈارلنگ کو گفتگو سے روکنے کی کوشش کرتا تو وہ میری طرف سے بھڑک کر مجھے قابو کرنے کی فکر میں لگ جاتا۔

ائیرپیس پر وہ آواز سنتے ہی اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف گیا تھا لیکن میں نے سختی کے ساتھ اسے روک دیا۔

"نہیں — اس سفید کتیا کو بھونکنے دو اور صرف وہی کرتے رہو جو میں کہہ رہا ہوں۔" میں نے پستول کی نال اس کی پسلیوں سے لگاتے ہوئے کہا اور وہ مجھے قہر بار نظروں سے گھور کر رہ گیا۔

اس کے لیے تین بار پیغام نشر ہوا پھر خاموشی چھاگئی۔

پھر جوں ہی کار ایک ویران سڑک پر نکلی، میں نے اسے کار روکنے کا حکم دیا۔ اس نے زبان سے کچھ کہے بغیر تحقیر آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور گیئر نیوٹرل کرکے آہستگی کے ساتھ بریک پیڈل پر پاؤں رکھ دیا۔

کار تھمنے سے لحظہ بھر قبل جب اس کی پوری توجہ سڑک پر مرکوز تھی میں نے پوری قوت سے اس کی کنپٹی پر پستول کا دستہ رسید کیا اور وہ غضب ناک غراہٹ کے ساتھ اسٹیئرنگ پر جھکتا چلا گیا۔

اسے ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹا کر میں نے وہ نشست سنبھال لی اور کار آگے بڑھا دی۔

میں نے اسے پوری طرح زیر کرلیا تھا اور اب وہ میرے رحم و کرم پر تھا۔ میرے پاس کوئی ایسا ٹھکانا نہیں تھا جہاں میں اسے چند گھنٹوں یا دنوں کے لیے قید کرسکوں۔ سلطان شاہ کے دوستوں کا ایک سہارا تھا لیکن وہ خود طفیل کے ساتھ مصروف تھا اور میرے لیے اسے تلاش کرنا بے نتیجہ ہی ثابت ہوتا۔

دوسری طرف میں نے اولڈ ڈارلنگ کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی تھی۔ اس نے طفیل کے دھوکے میں مجھے بہت سے رازوں سے آگاہ کردیا تھا لیکن ایک بار جانبرانہ ہونے کے بعد کہ دشمنوں کی قید میں ہے، وہ اپنی جان پر کھیل جاتا لیکن دیدہ و دانستہ ایک لفظ بھی اُگل کر نہ دیتا۔

زیر بحث گروہ تنظیم کی مقامی کڑیوں سے بالکل ہی لاتعلق نظر آرہا تھا۔ ورنہ کم از کم طفیل جیسے اہم مہرے سے ضرور روشناس ہوتا۔ ان پہلوؤں پر خاصا غور کرنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اسے بلاوجہ گلے میں لٹکائے پھرنا وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ تنظیم کے بین الاقوامی روابط کا کوئی اہم مہرہ تھا اور میں فوری طور پر مقامی مسائل میں اُلجھا ہوا تھا۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ اس کا پتا صاف کردیا جاتا۔

میں نے کار کنال بینک روڈ کے راستے پر ڈال دی۔

رات ڈھل رہی تھی اور وہ کراچی نہیں لاہور تھا مضافاتی سڑکیں بڑی حد تک ویران ہوچلی تھیں، شہر میں بھی کچھ زیادہ رونق نظر نہیں آرہی تھی۔ کنال بینک روڈ پر میں نے ایک جگہ معقول ویرانہ دیکھ کر اندھیرے میں کار روک دی۔

میرے پاس کرائے کی کار تھی اور میں اسے گندا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اولڈ ڈارلنگ کو کالر سے پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیا پھر میں نے ائیرپیس سمیت اس کی جیبوں سے ہر چیز نکال کر اس کے بائیں پہلو میں گولی اتار دی۔

گولی لگتے ہی اس کا وجود بری طرح اُچھلا تھا لیکن میں اس کا انجام دیکھنے کے لیے وہاں ٹھہرنے کی ہمت نہ کرسکا۔ کیونکہ میرا پستول بے آواز نہیں تھا، مجھے ڈر تھا کہ کہیں دھماکے کی آواز پولیس کی کسی گشتی پارٹی کی توجہ ادھر مبذول نہ کرالے۔

پہلے تو میرا ارادہ یہ تھا کہ اسے ہلاک کرکے نہر میں پھینک دوں گا لیکن ویرانے میں ہولناک دھماکے کی گونج سننے کے بعد میں وہاں رکنے کی ہمت نہ کرسکا۔ وہاں سے خاصی دور نکلنے کے بعد میں نے کار واپس گھمائی اور شہر کی طرف ہولیا۔

ہوٹل کے کمرے میں سلطان شاہ کو براجمان دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔

"تم یہاں کیا کررہے ہو؟"

"آرام۔" اس نے مسکراتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تمہارے گورے کا کیا رہا؟"

"وہ تو مر گیا لیکن طفیل کہاں ہے؟ اس وقت ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم وہی ہے۔" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"گورا مر گیا لیکن طفیل زندہ ہے۔ اسے کچھ زیادہ ہی چوٹ آگئی تھی، میری واپسی تک ہوش میں نہیں آسکا تھا۔ لہٰذا اسے ایک دوست کے حوالے کر آیا ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ تمہاری فکر تھی۔ باہر رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنا آسان ہوتا ہے، اس کے گھر میں گھس کر جیتنے کے لیے بہت ہوشیاری اور مکاری کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اور دوسرا سبق کیا ہے؟" میں نے مضحکانہ لہجے میں پوچھا۔

"سبق نہیں، میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تمہارا کام زیادہ خطرناک اور مشکل تھا۔ اس وجہ سے مجھے اپنے شکار سے زیادہ تمہارے بارے میں فکر لاحق تھی کہ کہیں شکار کرنے کے بجائے خود شکار نہ ہو گئے ہو جب کہ میری کارکردگی اور طفیل کے انجام سے تم بخوبی واقف تھے۔ مجھے تو بس اسے لاد کر ٹھکانے پر ہی پہنچانا تھا۔"

"اولڈ ڈارلنگ میری توقع کے برعکس بالکل ہی بودا ثابت ہوا۔" میں نے اس کی جیب سے برآمد ہونے والی اشیا میز پر بکھیرتے ہوئے کہا۔ "ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ تنظیم سے باغی ہو کر میرے ساتھ مل گیا ہو، حد تو یہ ہے کہ تلاشی کے دوران میں اس کی جیبوں سے اسلحہ کے نام پر قلم تراش چاقو تک برآمد نہیں ہوا۔"

"اعتماد میں مارا گیا نا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "پورے خلوص کے ساتھ تمہیں اپنا آدمی سمجھ بیٹھا ہوگا، تم اسے گھر سے نکالنے میں کیسے کامیاب ہو گئے؟"

"ہیروئن رکھنے کے جرم میں اس کا ایک ساتھی پکڑا گیا ہے جو کچھ عرصے پہلے تک یہاں اپنے ملک کے سفارت خانے میں ایک اہم افسر تھا۔ شاید یہاں رہ کر اس نے آسانی سے لکھ پتی بننے کی یہی ترکیب سیکھی ہوگی اور اب لالچ میں نام بدل کر اپنے ملک سے جعلی کاغذات پر یہاں آیا اور ہیروئن خریدتے ہی دھر لیا گیا۔ اولڈ ڈارلنگ اس کی رہائی کے لیے تڑپ رہا تھا۔"

"کسی ایمان دار افسر کے ہاتھ لگ گیا ہوگا جو مارا گیا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ورنہ ایسے معاملات میں تو سودا بہت آسان ہوتا ہے۔ بس برآمد ہونے والا مال کلو سے گھٹ کر گراموں میں رہ جاتا ہے، کچھ لینے دینے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔"

"مسئلہ یہ بھی ہے کہ گرفتاری کے باوجود مال ابھی تک برآمد نہیں ہوا۔ وہ اسی لیے شوگر کوئین کی تلاش میں تھا کہ اس کے رسوخ کو بروئے کار لا کر ڈیوڈ کو رہائی دلوا سکے۔"

"اس فکر میں نہ صرف وہ خود مارا گیا بلکہ طفیل بھی ہماری تحویل میں آ گیا۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"یہی نہیں بلکہ شوگر کوئین کی قیام گاہ کی نشاندہی بھی کر گیا۔" میرا انکشاف سن کر وہ حیرت اور مسرت سے اچھل پڑا اور میں اسے اپنی روداد سناتے ہوئے میز پر پھیلے ہوئے سامان کا جائزہ لینے لگا۔

متوفی کی جیبوں سے جو کچھ برآمد ہوا، وہ میرے لیے بالکل بے مصرف تھا۔ مقامی کرنسی، سکوں، ایک سادہ ڈائری اور رومال کے علاوہ چند رقعے تھے جن پر کچھ حساب کتاب درج تھا۔ کرنسی اور سکے نکال کر میں نے باقی سامان کو دیا سلائی دکھا دی۔ سلطان شاہ نے طفیل کی گاڑی کے بارے میں عقلمندی سے کام لیا تھا اور اسے ہوٹل سے دور ایک ایسے علاقے میں چھوڑ دیا تھا جہاں اس کی دانست میں کئی روز تک بھی کسی کو کسی لاوارث گاڑی کی موجودگی کا شبہ تک نہ ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ اس کار کو ہم کسی بُرے موقع یا خطرناک مہم میں استعمال کر سکتے تھے۔

میرا ارادہ فوری طور پر طفیل کی طرف روانگی کا تھا لیکن سلطان شاہ نے احتجاج کیا کہ وہ میرے انتظار میں بھوکا بیٹھا ہوا تھا لہٰذا ہم نے ہوٹل کے کمرے ہی میں کھانا منگوا لیا۔

ویسے تو میں اس بار بہت توقعات لے کر لاہور آیا تھا اور میرا خیال تھا کہ میں تنظیم کی جڑوں پر کاری ضرب لگانے میں کامیابی حاصل کر لوں گا لیکن تصویر کی موت نے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

میں اپنے مشاہدات اور معلومات کی روشنی میں شروع ہی سے یہ نظریہ قائم کیے بیٹھا تھا کہ ہیروئن فروشی کا وہ منظم اور گھناؤنا کاروبار تصویر اور توقیر مل کر چلا رہے تھے لیکن اس بار میرے سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ طویل جدوجہد کے بعد تصویر سے مل بیٹھنے کا موقع آیا تو اسے کسی عام مہرے کی طرح نہایت بے دردی کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا گیا اور پل بھر میں اس کے اپنوں نے اس سے یوں بیگانوں کی طرح آنکھیں پھیریں جیسے روئے زمین پر اس کا کبھی وجود ہی نہ رہا ہو۔ توقیر کے بارے میں اس نے بتا ہی دیا تھا کہ وہ ملک سے ہزاروں میل دور اوٹاوا میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بعد بڑی ماں کی صورت میں میرے گھرانے کی ایک آخری کڑی باقی رہ گئی تھی لیکن ان کے بارے میں لائیڈز کالج والوں نے ایسا سنگدلانہ رویہ اختیار کیا تھا کہ ان کے وجود ہی سے منکر ہو گئے تھے۔

دوسری طرف وہ پُراسرار شخص سامنے آیا تھا جو تصویر کے قتل کا قصے دار تھا۔ وہ نجانے کون تھا لیکن میرے لیے اس نے ابتدا ہی سے توقیر کا نام اختیار کیا ہوا تھا اور بظاہر تنظیم کا سربراہ معلوم ہوتا تھا۔

تصویر کو کھو دینے کے بعد بھی خوشی کی بات یہ تھی کہ ایک طرف طفیل جیسا اہم مہرہ ہمارے قبضے میں آ گیا تھا، دوسری طرف شوگر کوئین کا ٹھکانا میری نگاہوں میں آ گیا تھا۔ یہ دو بڑی کامیابیاں تھیں جو تنظیم کی بیخ کنی میں اہم کردار ادا کر سکتی تھیں۔

"یہ آن کیوں نہیں ہو رہا؟" سلطان شاہ نے اولڈ ڈارلنگ والے آپریٹس پر طبع آزمائی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے اس کا سوئچ ناکارہ کر دیا تھا، مرمت کے بعد یہ بھی قابلِ استعمال ہو جائے گا۔"

"یہ اچھا ہوا۔ اب ہم دونوں ہی ہر وقت باخبر رہ سکیں گے۔"

"کسی ناگزیر ضرورت کی صورت میں آپس میں رابطہ بھی قائم کیا جا سکے گا۔ اس کے استعمال کا طریقہ تو معلوم ہی ہے تم کو، بس یہ یاد رکھنا کہ تمہارا کوڈ ایکس اور میرا وائی ہوگا۔"

"تیسرا آپریٹس مل گیا تو بھابی کو زیڈ بنا دیں گے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

اس کی زبان سے غزالہ کا ذکر سنتے ہی میں مضطرب ہو گیا۔ لاہور آنے کے بعد میں اپنی مصروفیات میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اس کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا اور اب اس کا ذکر آتے ہی اپنے وجود میں شدت کے ساتھ کسی کمی یا خلا کا احساس ہونے لگا تھا۔

"کہاں کھو گئے؟" مجھے خاموش پا کر سلطان شاہ نے شرارت آمیز انداز میں ٹوکا۔

"ابھی کھونے کی فرصت نہیں ہے، فارغ ہو گئے ہو تو بس جلدی اٹھو۔" میں نے اس موضوع کو ٹالتے ہوئے کہا اور پھر ہم دونوں ہی اٹھ گئے۔

سلطان شاہ کی رہنمائی میں میں بادامی باغ کے علاقے میں اس کے دوستوں کی رہائش گاہ پر پہنچا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کا متوسط انداز کا مکان کسی گنجان علاقے میں واقع نہیں تھا۔

"آبادی سے الگ تھلگ کیوں رہتے ہیں یہ لوگ؟" میں نے کار قدرے آگے لے جا کر روکتے ہوئے سوال کیا۔

"قبائلی لوگ ہیں۔ ان کی سرگرمیاں عیالدار شہریوں کے لیے بلاوجہ تجسس کا باعث بنتی ہیں یوں الگ تھلگ نہ رہیں تو روز ہر بات کا ایک افسانہ تراش لیا جائے گا۔ افغان مہاجروں نے ان بے چاروں کو بڑا بدنام کیا ہوا ہے۔"

"ان سے کیا تعلق نکل آیا تمہارے لوگوں کا؟"

"اپنی مٹی سے رشتہ توڑ کر آدمی بے حجاب ہو جاتا ہے۔" وہ سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا۔ "زندہ رہنے اور زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لیے ہر وہ کام کر گزرتا ہے جو اپنے وطن اور اپنے لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ لاکھوں کی تعداد میں آئے ہوئے ہیں، ان میں چور، ڈاکو، دہشت گرد اور منشیات فروش شاید چند ہزار بھی نہ ہوں گے لیکن ان کی وجہ سے مظلوم بھی بدنام ہو رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان کی وضع قطع اور بول ہم سے ملتی جلتی ہے۔ لہٰذا ان کی برائیاں ہمارے کھاتے میں چلی جاتی ہیں اور شہروں میں ہر جگہ ہمارے آدمیوں کو شک کی نظروں سے دیکھا جانے لگا ہے۔"

"تم تو تقریر بھی اچھی خاصی کر لیتے ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم مذاق کر رہے ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب میں ہیروئن کی تجارت کا منصوبہ بنا کر گاؤں سے کراچی آنے کے لیے پر تول رہا تھا تو میرے ایک دوست نے کہا تھا کہ کسی جماعت میں شریک ہو جاؤں، اس کا کہنا تھا کہ مقدر نے ساتھ دیا تو سیاست کھلتے ہی ایسے وارے کے نیارے ہوں گے کہ سارے منصوبے بھول جاؤں گا۔"

اسی اثنا میں ہم مطلوبہ مکان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ سلطان شاہ نے کنڈی ہلا کر دستک دی اور میں دل ہی دل میں اس کی سادگی سے کہی ہوئی بات کا وزن کرنے لگا۔

دروازہ کھول کر ایک دراز قامت اور صحتمند قبائلی نے ہمارا استقبال کیا تھا۔ اندر اس کا ایک ساتھی بھی چارپائی پر دراز تھا۔ اندر پہنچنے کے بعد ان میں جن فقروں کا تبادلہ ہوا ان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ سلطان شاہ سے خاصے بے تکلف تھے۔

"ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تم صبح ہی واپس لوٹو گے۔"

"میں اپنے مہمان کو تم پر زیادہ دنوں تک بوجھ نہیں بنانا چاہتا۔" سلطان شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہوش میں آیا یا نہیں؟"

"ہوش میں نہ آتا تو اچھا ہوتا۔" ان میں سے ایک بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "ایسی دھمکیاں دے رہا تھا جیسے یہاں اسی کا حکم چلتا ہو، تمہارا خیال نہ ہوتا تو اس کے منہ سے خون کی دھاریں بہا دیتا۔"

"یہ حسرت تم اب پوری کر سکو گے۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔

"کھانا دیا تو لات مار کر تھالی اُلٹ دی تھی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اسی وقت سے ہاتھ پیر باندھ کر اسے ایک کوٹھری میں ڈالا ہوا ہے۔ وہاں اندھیرے میں چوہوں نے دماغ درست کر دیا ہوگا۔"

سلطان شاہ نے ایسا جاندار قہقہہ لگایا جیسے وہ کارروائی اسے بہت پسند آئی ہو۔

وہ کوٹھری تک ہماری رہنمائی کر کے اُلٹے قدموں واپس چلا گیا اور سلطان شاہ نے بڑھ کر کنڈی کھول دی۔ اندھیرے میں اندر سرسراہٹیں سنائی دے رہی تھیں، اسی کے ساتھ موہوم سی گھٹی گھٹی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔

سلطان شاہ نے سوئچ آن کر کے کوٹھری میں روشنی کی تو طفیل مضحکہ خیز حالت میں فرش پر پڑا ہوا نظر آیا۔ گھور اندھیرے میں روشنی ہوتے ہی اس نے آنکھیں بھینچ کر بند کر لی تھیں اور اس کے بدن پر سے کئی چوہے اچھل کر ساز و سامان کے پیچھے جا چھپے تھے۔ کوٹھری کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے فاضل یا ناکارہ سامان کے اسٹور کے طور پر استعمال کیا جا تا رہا تھا۔

چند ثانیوں بعد طفیل نے آنکھیں کھولیں تو وہاں قہر کے کوندے لپک رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ٹخنے بھی آپس میں ملا کر مضبوطی سے باندھ دیے گئے تھے، منہ میں کپڑا ٹھونس کر غالباً اوپر سے رومال باندھ دیا گیا تھا۔ فرش پر ایک طرف ٹوٹی ہوئی پلیٹ اور تھالی پڑی ہوئی تھی اور

طفیل کے لیے لایا جانے والا کھانا چوہوں کے معدوں میں منتقل ہو چکا تھا۔

سلطان شاہ نے بڑھ کر اس کے منہ پر سے رومال کھول کر، دہانے میں ٹھونسا ہوا کپڑا نکال دیا اور طفیل فوراً ہی گالیاں ایجاد کرنے والے کمپیوٹر میں تبدیل ہو گیا۔

غصے کے عالم میں وہ اپنی حالت کو بھی فراموش کر چکا تھا۔ میں طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی ہرزہ سرائی سنتا رہا لیکن سلطان شاہ ایک نازک سی گالی پر بھڑک گیا۔ اس کی بھرپور ٹھوکر طفیل کے چہرے پر پڑی اور اس کا داہنا رخسار پھٹ گیا۔

"اس وقت تم جو سلوک چاہو کر سکتے ہو لیکن تمہیں اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں غرایا۔ "کسی کو بے دست و پا کر کے مار لینا مردانگی نہیں ہے۔"

"پہلی بات تو یہ ذہن سے نکال دو کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کو آسکے گا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہم تمہارے بدن سے ساری کھال بھی اتار دیں گے تو کوئی تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ ان اطراف میں میلوں دور تک ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔"

"تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے مضبوط لہجے میں سوال کیا۔

"بہت گھسا پٹا سوال ہے۔ تیس لاکھ کی آڑ میں تم نے مجھے جو بارودی بریف کیس بھیجا تھا، اس سے بچنے کے بعد مجھے حق حاصل ہے کہ تمہارا جو حشر چاہوں، کر گزروں۔"

اس نے فرش پر پڑے پڑے گردن جھٹک کر چند ثانیوں کے لیے غور سے میری طرف دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں حیرت پھیلتی چلی گئی۔ "اوہ میرے خدا! تم تو شاید ڈینی ہو۔"

"بالکل ہوں، یہ بتاؤ کہ رقم کے بارے میں میرے ساتھ فریب کیوں کیا گیا تھا؟"

"لائیڈز کاٹیج کے اطراف میں رونما ہونے والے واقعات کے سلسلے میں تم پر شبہ ضرور تھا لیکن یقین نہیں آسکا تھا۔ پہلے تمہیں زندہ پکڑنے کی کوشش کی گئی پھر تمہارا قصہ پاک کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا گیا۔"

"فیصلہ صادر کرنے والا کون تھا؟" میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہوں میں ابھی تک حیرت رچی ہوئی تھی۔ جیسے اسے مجھ سے ہم کلام ہونے کے بارے میں یقین نہ آرہا ہو۔

"وہ کس نام سے پہچانا جاتا ہے؟"

"باس۔ اسے کسی نے نہیں دیکھا، میں نے بھی بس اس کی آواز ہی سنی ہے۔"

"وہ اسے لٹو بھی کہلاتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" اس کا لہجہ اس کی سچائی کا مظہر تھا۔

"تم مجھے کیسے پہچانتے ہو؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"کچھ عرصہ پہلے تمہاری تصاویر فراہم کی گئی تھیں۔ تمہیں دیکھتے ہی پکڑ لینے کے احکام دیے گئے تھے۔"

"جو آج بھی برقرار ہیں۔" میں نے اضافہ کیا اور اس نے سر ہلا کر میری تائید کر دی۔

"لائیڈز کاٹیج میں کس کا حکم چلتا ہے؟"

"بظاہر میرا، لیکن اہم معاملات میں مجھے باس سے ہدایات ملتی ہیں۔ ویسے وہاں کام کرنے والا ہر شخص گمنام باس کے وجود سے واقف ہے اور اسے جمی لائیڈ کا کوئی پرانا نمک خوار سمجھا جاتا ہے۔"

"جمی لائیڈ کہاں رہتا ہے؟"

"کچھ معلوم نہیں، سیلانی آدمی ہے، مجھے اس کے لیے کام کرتے ہوئے دس سال ہونے والے ہیں لیکن میں نے بس دو بار اسے دیکھا ہے۔ وہ کسی ایک جگہ نہیں رہتا، دنیا بھر میں گھومتا رہتا ہے۔"

"لائیڈز کاٹیج میں کیا کھیل ہو رہا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے کہا اور اس بار میں نے اس کا جھوٹ محسوس کر لیا۔

"اسے کھول دو سلطان شاہ!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اس حالت میں میں اس کے ساتھ کوئی بے رحمانہ سلوک نہیں کر سکوں گا۔"

سلطان شاہ نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا اور مجھ سے کوئی اشارہ نہ پا کر بے دلی کے ساتھ طفیل کی بندشیں کھولنے لگا۔ اس نے آخری گرہ کھلتے ہی سلطان شاہ پر حملہ کیا تھا اور دونوں بازوؤں میں اس کی گردن دبوچ لی تھی لیکن اس کی تمام تر پھرتی کے باوجود سلطان شاہ ہوشیار تھا۔ اس نے پوری قوت سے طفیل کے چہرے پر ٹکر رسید کی اور وہ کراہتا ہوا پیچھے گر گیا۔

"میں جواب کا منتظر ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "مجھے ہر سوال کا صحیح جواب درکار ہے ورنہ تمہیں موت بھی امان نہ دے سکے گی۔ کافی مدت کے بعد تمہارے درجے کا ایک آدمی میرے ہاتھ لگا ہے۔"

"میں نہیں جانتا۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ وہ جمی لائیڈ کا اپنا شوق ہے۔ عمارت کے ہر محافظ کے پاس اسلحہ کے باقاعدہ لائسنس موجود ہیں۔"

"پھر تم مجھے تیس لاکھ کس لیے دے رہے تھے؟"

"تمہیں ایک دھیلا بھی نہ دیا جاتا۔ تم نے دیکھ ہی لیا کہ وہ ایک گہری چال تھی۔" مجھے حیرت تھی کہ اس نے اپنے اس آدمی کے حشر کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ پوچھا جو اسی کی ہدایت پر

بارودی بریف کیس لے کر مجھ سے ملنے آیا تھا۔

"اگر وہاں کوئی ہیر پھیر نہیں ہو رہا تو یہ شوگر کوئین اور ہیروئن ڈارلنگ کیا بلا ہیں؟"

"یہ سب میرے لیے غیر متعلقہ باتیں ہیں، میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ ہمارے یہاں اپنی حدود سے تجاوز کرنے والے کو معاف نہیں کیا جاتا۔"

"پھر تم اس کی کال پر وہاں کیوں دوڑے گئے تھے؟"

"وہ میرا فرض تھا، ٹرانسمیٹر ہمارے آدمیوں کے استعمال میں ہیں پھر میں اس کی آواز پہلے بھی سنتا رہا تھا۔ اسے کسی مدد کی ضرورت تھی تو میرا وہاں پہنچنا ضروری تھا۔"

"جانتے ہو کہ اس کا مسئلہ کیا تھا؟" میں نے حقارت آمیز انداز میں سوال کیا۔ "ہیروئن! اس کا ایک مغربی سفارتکار دوست ہیروئن سمیت پکڑا گیا ہے اور شاید لائیڈز کاٹیج کی بنیادیں بھی اسی ستون پر کھڑی ہیں۔ فرض، ہدایت اور ایمانداری سب ڈھکوسلے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تم سب موت کے سوداگر ہو اور تمہاری ٹولی نے یہاں اپنی حفاظت کے لیے ایک محفوظ بلکہ ناقابل شکست حصار قائم کیا ہوا ہے تاکہ گھر کی کوئی خبر باہر نہ جاسکے۔"

"جانتے ہو تو مجھ سے پوچھنا بے سود ہے۔" وہ ڈھٹائی اور بے پروائی کے ساتھ بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ تمہارے ذرائع ہی درست ہوں۔"

"باس سے رابطے کا کیا طریقہ ہے؟" قدرے توقف کے بعد میں نے سوال کیا۔

"کوئی نہیں۔ جب ضرورت ہوتی ہے، وہ خود ہی رابطہ قائم کر لیتا ہے۔" اسے لٹو کے بارے میں اپنے تجربے کے پیش نظر مجھے اس کی بات میں صداقت نظر آرہی تھی۔

وہ بظاہر جتنا سخت جان تھا، اندر سے بھی اسی قدر مضبوط تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ہماری مرضی کے بغیر اس کوٹھری سے زندہ نہیں نکل سکے گا لیکن اس کے باوجود وہ خائف نہیں تھا۔

"باس سے ہدایات ملنے کا ذریعہ کیا ہوتا ہے؟"

"جب چاہتا ہے فون کر لیتا ہے۔" اس نے بلاتوقف جواب دیا۔

"اور اب یہ بتاؤ کہ تصویر کی ماں کہاں ہے؟" میں نے چند ثانیوں تک اسے گھورتے رہنے کے بعد سرد لہجے میں وہ سوال بھی کر ہی ڈالا جسے میں اب تک روکے ہوئے تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ وہ آسانی کے ساتھ اس سوال کا جواب نہیں دے گا اور اس کے منہ سے سچ اگلوانے کے لیے مجھے تشدد کا سہارا لینا پڑے گا۔ اسی وجہ سے وہ سوال میں نے آخر کے لیے رکھ چھوڑا تھا کیونکہ ایک بار اس موضوع پر اس سے الجھ پڑنے کے بعد میرے ذہن میں دوسرے تمام سوالات گڈمڈ ہو جاتے اور گفتگو کا تسلسل ٹوٹ جاتا۔

"دونوں نام میرے لیے اجنبی ہیں۔" اس نے اپنے زخمی رخسار کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔" میں نے سختی کے ساتھ کہا۔

"یہ اچھا کیا کہ تم نے میرے ہاتھ پیر کھلوا دیے۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے ادھیڑنا اتنا آسان ثابت نہ ہوگا اگر ایک پیرایک کے اصول پر عمل کیا تو مجھے زیر نہ کر سکو گے۔"

"یہ خوش فہمی ہے تمہاری۔ اب میں ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا تمہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے پستول نکال لیا۔ اس کے چہرے پر تردد کا ایک ہلکا سا سایہ آکر گزر گیا۔

"میں تصویر کی ماں کے وجود سے لاعلم ہوں۔" اس نے پھیکے لہجے میں کہا۔ "وہ خود لاپتہ ہے۔"

"اس سے لاتعلقی کیوں اختیار کر لی گئی ہے؟"

"یہ بات سمجھنے کے لیے غیر معمولی ذہانت تو درکار نہیں ہے۔ خود تم ہی نے بتایا تھا کہ وہ مار ڈالا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے قتل کے پیچھے کسی نہ کسی ناپسندیدہ واقعے کی کارفرمائی رہی ہوگی۔ ایسے حالات میں اس سے اپنا تعلق ظاہر کر کے پریشانیوں کے سوا اور کیا مل سکے گا۔"

"ابھی تم مار دیے جاؤ تو تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا؟"

"ہوا کرے۔" وہ شانے اچکا کر بولا۔ "مرنے کے بعد آدمی ان سب فکروں سے آزاد ہو جاتا ہے کفن سرکاری ہو یا درباری، دو گز زمین ہر ایک کو مل جاتی ہے۔ کام کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ زندگی میں ہر آسائش فراہم کی جاتی ہے۔"

"تقریر بند کرو۔" سلطان شاہ پہلی بار دخل اندازی کرتے ہوئے غصیلی آواز میں غرایا۔ "تصویر کی ماں کے بارے میں جو پوچھا گیا ہے، اس کا جواب دو۔"

وہ کچھ کہنے کے بجائے چیلنج کرتی ہوئی، تحقیر آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور سلطان شاہ کی کھوپڑی سلگ اٹھی وہ کسی بھوکے درندے کی طرح طفیل پر ٹوٹ پڑا۔

طفیل پہلے سے تیار تھا۔ اس نے سلطان شاہ کو اپنے ہاتھوں پر روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی جونک کی طرح اس سے لپٹ گیا۔ اس کی دو تین ہی ٹکروں میں طفیل کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ مدافعانہ انداز برقرار رکھتا تو شاید سلطان شاہ اسے بری طرح رگید کر رکھ دیتا لیکن اسے فوراً ہی ہوش آگیا اور پھر سلطان شاہ کے ستارے گردش میں آگئے۔

اگر میں گولی چلانے کی دھمکی نہ دیتا تو وہ سلطان شاہ کو نیچے گرا لیتا۔ میرے للکارنے پر وہ زور آزمائی فوراً ہی موقوف

ہوگئی اور سلطان شاہ بڑبڑاتا ہوا پیچھے ہٹ آیا۔

"مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ تم سن چکے ہو۔" چند ثانیوں کے توقف کے بعد طفیل اپنے چڑھتے ہوئے سانسوں کو قابو کرتے ہوئے بولا۔ "بہتر یہ ہوگا کہ اب میری راہ نہ روکو۔"

"یہ نہ سمجھو کہ ہم نے تمھیں مہمان کے طور پر مدعو کیا تھا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "بڑی ماں کا سراغ بتائے بغیر تم یہاں سے زندہ وسلامت واپس نہیں لوٹ سکو گے۔"

"غلط فہمی ہے تمھاری۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "ہم لوگ اُنیسویں نہیں بیسویں صدی میں رہ رہے ہیں اور یہ ایجادات کا دور ہے۔ تم اپنی دانست میں مجھے اغوا کر لائے ہو لیکن کسی بھی لمحے میرے حامی اس مکان پر دھاوا بول سکتے ہیں۔۔۔ یہ دیکھو۔" اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی کو فضا میں لہراتے ہوئے کہا "وہائٹ گولڈ کی یہ انگوٹھی میں نے محض شوقیہ نہیں پہنی ہوئی ہے۔ اس میں نگ کی جگہ ایک ایسا سلیکون چپ نصب ہے جو ہر لمحے ریڈیائی لہریں نشر کرتا رہتا ہے اور دوسری طرف ایک آپریٹس پر یہ اشارے باقاعدہ مانیٹر ہوتے ہیں جن سے میری موجودگی کے مقام کا تعین محض گزوں کے فرق سے کرنا ممکن ہے۔۔۔ ہم لوگ وقت کے ساتھ چل رہے ہیں۔ تم اتنی آسانی کے ساتھ ہمارے ساتھ من مانی نہ کر سکو گے!"

"یہ کہانی مجھے سُنانے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ تم غلط لوگوں سے اُلجھے ہو۔ آخر میں نتیجہ یہی نکلے گا کہ تم بے بسی کے عالم میں اپنا سر پیٹتے کسی شاہراہ پر تماشا بنے ہوئے نظر آؤ گے۔" اس کے لہجے میں تمسخر کے ساتھ ملا کا اعتماد جھلک رہا تھا۔ "یہ انگوٹھی استعمال کرنے والے اس بات کے پابند ہیں کم ہر گھنٹے بعد مانیٹرنگ یونٹ کو اپنی سلامتی کی اطلاع دیتے رہیں۔ مجھے آخری رپورٹ دیے تین گھنٹے سے زائد ہو چکے ہیں۔ وہ لوگ حرکت میں آچکے ہوں گے اور اب کسی بھی لمحے تم ناقابلِ بیان مشکلات سے دوچار ہو سکتے ہو۔"

"انگوٹھی اتار لو اس کی انگلی سے۔" میں نے سلطان شاہ کو حکم دیا۔ اور وہ کسی وحشی سانڈ کی طرح طفیل پر ٹوٹ پڑا۔

"اپنی ہرزہ سرائی سے تم نے خود ہی مصیبت مول لی ہے۔" میں اسے سلطان شاہ کے خلاف مدافعانہ مقابلے میں مصروف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب انھیں یہ انگوٹھی کسی خارش زدہ کتے کے گلے میں ہی جھولتی ہوئی ملے گی۔"

اس وقت سلطان شاہ نے اپنے وحشیانہ حربوں سے اسے لوکھلا کر رکھ دیا تھا لیکن اس کا بایاں ہاتھ کسی طرح سلطان شاہ کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔

"انگلی توڑ دو یا کاٹ دو، انگوٹھی بہت ضروری ہے۔" میں نے ہانک لگائی اور اس بار کوٹھری کی محدود فضا طفیل کی دردناک چیخ سے گونج اٹھی۔ سلطان شاہ نے بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ اس کا بایاں ہاتھ گرفت میں لیا تھا اور ایک دو جھٹکوں میں کامیابی حاصل کر کے اس سے الگ ہٹ آیا تھا۔

شاید اس نے انگلی کی ہڈی توڑ کر کھال کے چیتھڑے اُڑا دیے تھے کیوں کہ وہ بھدی اور خون آلود انگلی فرش پر پڑی کسی کیڑے کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اور انگوٹھی سلطان شاہ کی تحویل میں آچکی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے سلطان خانا!" اچانک باہر سے سلطان شاہ کے دوستوں میں سے کسی نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں، ذرا ورزش ہو رہی ہے۔" سلطان شاہ نے بلند حوصلانہ آواز میں کہا۔

"ضرورت ہو تو میں بھی آؤں تمھارا ہاتھ بٹانے؟" باہر پیش کش کی گئی جسے سلطان شاہ نے خوبصورتی سے ٹال دیا۔

میں نے بڑھ کر طفیل کو کچھ سمجھنے کا موقع دیے بغیر اس کی کھوپڑی پر پستول کے دستے سے ضرب لگائی اور وہ کراہتا ہوا تیورا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

"انگوٹھی کو پوری قوت سے کسی طرف اچھال دو۔" میں نے کہا اور سلطان شاہ نے کوٹھری سے باہر کھلے صحن میں نکل کر میری ہدایت کو فوراً ہی عملی جامہ پہنا دیا۔ میں طفیل کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔

"اس کی بے ہوشی خاصی گہری ہے، یوں ہی پڑا رہنے دو، تھوڑی دیر بعد واپس آکر اسے لے جائیں گے۔" سلطان شاہ کی واپسی پر میں نے مشورے کے طور پر کہا۔

"اسے کہاں لادے پھرو گے۔ مار کر قصہ ہی ختم کیوں نہیں کر دیتے۔"

"نہ لادے پھریں گے، نہ ماریں گے۔" میں نے کہا۔ "میں اب ان کے لیے دشواریاں کھڑی کرنا چاہتا ہوں۔ واپس چل کر ہم اپنی کرولا چھوڑ کر طفیل کی گاڑی سے آئیں گے اور اسے اسی گاڑی میں ڈال کر کہیں چھوڑ دیں گے، ہماری نشاندہی پر پولیس اسے گرفتار کر لے گی۔ گمنام فون پر میں انھیں بتاؤں گا کہ طفیل، ڈیوڈ کا ساتھی ہے۔ دوسری طرف ہم کسٹم انٹیلی جنس والوں کو فیول کی ۔۔۔ ی ٹنکی کے ذریعے سے آگاہ کر دیں گے یوں ڈیوڈ ہیروئن کے اسمگلر کے طور پر، طفیل ڈیوڈ کے ساتھی کے طور پر اور لائیڈز کالج طفیل کی اقامت گاہ کے طور پر پولیس کی نگاہوں میں آجائے گا۔"

"سب کچھ ہو گا لیکن تمھاری بڑی ماں کا سراغ تو پھر بھی نہ مل سکے گا۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔ "آخر ہم اس سے کیوں نہیں اگلوا سکتے۔ تشدد کے سامنے تو بڑے بڑے قدموں میں جاتے ہیں۔"

"ضرور آجاتے ہیں۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے طفیل کی باتوں پر غور نہیں کیا۔ اس نے ہر معمولی بات آسانی سے اُگل دی لیکن اہم موضوعات پر خاموش رہا۔ وہ جانتا ہے کہ ہمارے تمام سوالوں کے جوابات دینے کے بعد ایک طرف وہ ہمارے لیے ناکارہ ہو جائے گا۔ اور دوسری طرف اس کے بڑے اُس کے لہو کے پیاسے ہو جائیں گے۔ وہ مر جائے گا لیکن بڑی ماں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتائے گا۔ ان کی طرف سے تو اب میں مایوس ہی ہو گیا ہوں۔ یہ بہت سفاک اور سنگ دل لوگ ہیں۔ جب محض خطرے کے امکان کی بنا پر تصویر کو قتل کر سکتے ہیں تو بڑی ماں جیسی ضعیف اور ناکارہ عورت کو انھوں نے کیوں زندہ رکھا ہو گا۔ انھیں لائیڈز کالج سے نکال کر کہیں چھڑواتے تو یہ خطرہ تھا کہ تصویر کی طویل غیر حاضری پر بے چین ہو کر وہ پرانی کہانیاں چھیڑ دیتیں اور یوں لائیڈز کالج کا نام بدنام ہو جاتا جو انھیں کسی بھی قیمت پر گوارا نہیں ہے۔"

"مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے طفیل کے بارے میں ساری ہی بھاگ دوڑ رائیگاں گئی ہو۔" وہ میرے ہمراہ کوٹھری سے باہر نکلتے ہوئے مایوسانہ لہجے میں بولا۔

"اس کے فائدے ایک آدھ روز میں تمھارے سامنے آجائیں گے۔ یہ کیوں بھول رہے ہو کہ اب شوگر کوٹین کا ٹھکانا ہماری نظروں میں آچکا ہے، پھر زخمی حالت میں طفیل کی گرفتاری بھی خاصے گل کھلائے گی۔"

طفیل کو بے ہوشی کے عالم میں اس کی کار میں اولڈ یونیورسٹی کیمپس گراؤنڈ کے قریب چھوڑ کر ہم کچھ دور پیدل چلے پھر لٹن روڈ کے نکڑ سے ٹیکسی حاصل کر کے ہوٹل واپس آگئے۔ پبلک بوتھ سے میں نے سب سے پہلے پولیس ہیڈکوارٹر فون کیا تھا۔

سلسلہ ملنے پر دوسری جانب سے ایک میکانیکی سی آواز سنائی دی تھی۔ "السلام علیکم۔ پولیس ہیڈکوارٹر، ایمرجنسی سنٹر۔"

"اولڈ کیمپس گراؤنڈ کی دیوار کے ساتھ تاریکی میں ایک کار کھڑی ہوئی ہے جس میں ہیروئن کا ایک بدنام اسمگلر زخمی حالت میں بے ہوش پڑا ہوا ہے۔" میں نے اسے مطلع کیا۔

"نام کیا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"اس کا نام طفیل ہے اور وہ بظاہر لائیڈز کالج میں سیکیورٹی آفیسر بن کر رہ رہا ہے۔"

"اوئے! اس کا نہیں، تمھارا نام پوچھ رہا ہوں، اسے تو ہم دیکھ ہی لیں گے۔" ریسیور پر غراہٹ اُبھری۔

"بس اسی کو دیکھ لینا۔ میں کسی گواہی، شہادت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "اور یہ بھی بتا دوں کہ طفیل کا ایک غیر ملکی ساتھی کسٹم انٹیلی جنس کی قید میں ہے۔ ڈیوڈ نامی اس گورے کو بھی ہیروئن رکھنے کے جرم میں پکڑا گیا ہے۔"

اس نے مزید کچھ کہنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اپنی بات پوری کر چکا تھا۔ لہٰذا میں نے فوراً ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

سلطان شاہ اوپر کمرے میں جا چکا تھا۔ میں نے ڈیوڈ کے سلسلے میں ٹیلی فون ڈائریکٹری کی ورق گردانی شروع کی تو مجھے شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ اس محکمے کا بھی ایک کُل وقتی دفتر ہونا چاہیے جسے فرض شناس شہری بروقت اپنی معلومات میں حصے دار بنا سکیں اور اسی الجھن میں مجھے ایئرپورٹ کا خیال آگیا۔ جہاں باہر سے آنے والے مسافروں اور ساز و سامان کی پڑتال کے لیے ہر وقت ہی کسٹم کے مختلف شعبوں کے لوگ موجود رہتے ہیں۔

ایئرپورٹ پر کسٹم کے ایک افسر سے فون پر بات ہوئی تو پتا چلا کہ اس کا تعلق پریونٹو کے شعبے سے تھا۔ اور اسے شہر میں رونما ہونے والے کسی واقعے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے استفسار پر اس نے مجھے ایک افسر کے گھر کا فون نمبر دیا جہاں ناگوار لہجے میں میرا فون وصول کیا گیا لیکن جب میں نے کام کی بات چھیڑی تو بات کرنے والے کے لب و لہجے میں دلچسپی عود کر آئی۔

ڈیوڈ کی کار میں ایندھن کی ٹنکی کی دوہری ساخت کا انکشاف سنتے ہی اس کی تحیر آمیز آواز اُبھری تھی۔ اس سے پتا چلا کہ ڈیوڈ کو شبے کی بنا پر چھتیس گھنٹوں تک حراست میں رکھنے کے بعد چند گھنٹے قبل ہی رہا کر دیا گیا تھا لیکن غنیمت یہ تھا کہ رہائی سے قبل محکمے نے اس کے سفر اور قیام کی تمام تر تفصیلات جمع کر لی تھیں جس کی بنا پر اس کی دوبارہ گرفتاری دشوار نہ ہوتی۔

"یہ بھی یاد رکھنا کہ وہ جعلی دستاویزات پر سفر کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کے تمام کاغذات درست پائے گئے تھے۔ یہ تم کس بنا پر کہہ رہے ہو؟"

"اس کا نام ڈیوڈ نہیں ہے، کچھ عرصے قبل وہ اپنے ملک کے سفارت خانے میں متعین تھا۔ ہیروئن کے سودے میں پرکشش نفع کے لالچ نے اسے نام بدل کر یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔"

"معلومات فراہم کرنے کا شکریہ۔" خوش اخلاقی کے ساتھ کہا گیا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پولیس کے برعکس کسٹم والوں کا طریقہ کار خاصا مختلف تھا۔

شاید وہ اطلاعات فراہم کرنے والے گمنام ذرائع سے اچھی طرح روشناس تھا کیونکہ اس نے مجھ سے میری شناخت کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

اوپر پہنچا تو سلطان شاہ نے دروازہ کھولتے ہی کچھ کہنا چاہا پھر منہ بند کر لیا۔

"بولو، کیا کہنا چاہ رہے تھے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں اپنا کام کر آیا ہوں اور تمھاری ہر قسم کی باز پرس کے لیے تیار ہوں۔"

"وہ انگوٹھی کا کیا چکر تھا؟" اس نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"جو کچھ تھا، تم نے سن ہی لیا تھا۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟" اس نے قدرے جھلاہٹ کے ساتھ کہا۔

"سب کچھ ممکن ہے، یہ نہ بھولو کہ ہم خلائی دور میں رہ رہے ہیں، زمین پر بیٹھا ہوا انسان چاند اور مریخ کی سطح کو اپنی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اور یہ لوگ جدید ذرائع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اس کا فراڈ تھا۔ تم بھی کبھی تنظیم کے لیے بہت اہم تھے لیکن تمھارے لیے کبھی ایسی کوئی تجویز پیش نہیں کی گئی۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ سلسلہ چند اہم ترین لوگوں کے لیے مخصوص رہا ہو۔ طفیل ہیڈ کوارٹرز کا ایک اہم فرد تھا۔ میرا تو خیال ہے کہ مانیٹرنگ کی سہولت بھی صرف لاہور ہی میں فراہم کی گئی ہے۔"

"اگر وہ سچا ہوتا تو ہمیں آخر تک اس کی بھنک نہ لگنے دیتا اور اس کے حامی بے خبری میں ہم پر آ پڑتے، میرا تو خیال ہے کہ اس نے انگوٹھی کے بارے میں زبان کھول کر اپنی شامت کو دعوت دی تھی ورنہ ہو سکتا ہے کہ اس کے بارے میں تمھارا فیصلہ کچھ اور ہوتا۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اگر قید میں ہونے کے باوجود اس کے بہی خواہ اس کی خبر گیری کر رہے تھے تو اسے خاموشی کے ساتھ ان کے نمودار ہونے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

"اگر وہ انگوٹھی کے بارے میں جھوٹ ہی بول رہا تھا تو اس سے کیا فرق پڑا؟ ہم نے تو اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جس کا میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔"

"فیصلہ اور انجام مختلف باتیں ہیں۔" وہ خفت آمیز انداز میں ہنس پڑا۔ "میں تو اس کی زبان سے انگوٹھی کے خواص سن کر بوکھلا گیا تھا۔ اسی گھبراہٹ میں میں نے طفیل پر اپنی پوری طاقت صرف کر دی ورنہ وہ آسانی کے ساتھ قابو میں آنے والا نہیں تھا۔"

"اب یہ سوچو کہ شوگر کوئین کے بارے میں کیا کرنا چاہیے، طفیل اور ڈیوڈ تو اب کسی طرح قانون کے بے رحم چنگل سے نہ نکل سکیں گے۔ ان کے بارے میں سوچ کر ہم بلاوجہ اپنا ذہن تھکائیں گے۔"

"شوگر کوئین!" اس نے پُرخیال انداز میں دہرایا۔ "تمھیں یقین ہے کہ وہ وہی لڑکی ہو گی جو تم سے مل چکی تھی؟"

"صرف آواز پر شبہ ہوا تھا۔" میں نے محتاط انداز میں کہا۔ "ٹرانسمیٹر پر آواز ویسے بھی بگڑ جاتی ہے۔ دھوکے کا امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیا تمھاری دانست میں اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟"

"اگر وہ وہی ہے تو تم اس کے ٹھکانے سے ہٹ کر کہیں بھی اس سے یوں ٹکرا سکتے ہو جیسے اتفاقاً مل گئے ہو۔ ایسی صورت میں اس کا ردِعمل فوری اور شدید نہیں ہو گا۔"

اور اسی موضوع پر باتیں کرتے کرتے میری آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح میں دیر سے بیدار ہوا، سلطان شاہ اس وقت بھی لمبی تانے سو رہا تھا۔

میں نے دروازے کے قریب پڑے ہوئے اُردو اور انگریزی اخبار اٹھائے تو اردو اخبار کے پہلے صفحے پر ہی سنسنی خیز خبریں نمایاں سرخیوں میں جھنگھاڑ رہی تھیں۔

کنال بینک روڈ سے ایک سفید فام کی بے نام و نشان لاش کی برآمدگی کو بہت ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ رات گئے تک پولیس اس کی شناخت کی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ قومیت کے بارے میں صرف اندازے ہی اندازے تھے کیوں کہ مرنے والے کی تحویل سے کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی تھی جو کارروائی میں مددگار ثابت ہوتی۔

کنال بینک روڈ کی اہمیت کے حوالے سے یہ سوال بھی اٹھائے گئے تھے کہ وہ وہاں کس مقصد کے تحت گیا تھا۔ وہ کسی محبِ وطن شخص کے عتاب کا نشانہ بنا تھا یا کسی حریف کی زد میں آیا تھا۔

ڈیوڈ کسٹم انٹیلی جنس کی تحویل سے رہائی کے صرف چار گھنٹے بعد کراچی جانے والی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس کی کار کے فیول ٹینک سے چار کلو اعلیٰ درجے کی ہیروئن برآمد کی گئی تھی۔ متعلقہ سفارت خانے سے فوری رجوع کر کے یہ تصدیق بھی کر لی گئی تھی کہ پکڑا جانے والا گیارہ ماہ پہلے تک اسلام آباد میں اپنے ملک کے سفارت خانے میں کام کر رہا تھا اور اس بار نام اور حلیے کی چند تبدیلیوں کے ساتھ ہیروئن لے جانے کی نیت سے آیا تھا لیکن پکڑا گیا۔

پہلی بار کسٹم والوں کے ہاتھوں گرفتاری اور پھر باز پرس کے دوران اس نے لاہور میں اپنے کسی شناسا سے رجوع کرنے کی اجازت چاہی تھی جو دینے سے انکار کر دیا گیا لیکن پھر پولیس حکام نے اولڈ کیمپس کے قریب ایک گاڑی سے ایک مقامی آدمی کو شدید زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں گرفتار کیا تھا، جو امکانی طور پر ڈیوڈ کا ساتھی معلوم ہوتا تھا۔

اس کے بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی ٹوٹی ہوئی کار کے پائیدان پر پڑی ہوئی تھی۔ ڈیوڈ نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا پھر جب وہ مقامی قیدی ہوش میں آیا تو اس نے بالکل چُپ سادھ لی۔ خاصی کوششوں کے باوجود پولیس کا تفتیشی عملہ اس کا نام تک نہ اگلوا سکا تھا پھر اس کی ابتر حالت کے پیشِ نظر باز پرس ملتوی کر کے اسے لاک اپ میں ڈال دیا گیا تھا جہاں اس نے حفاظتی عملے کی موجودگی میں اپنے پاس چھپا ہوا کوئی زہر کھا کر خودکشی کر لی تھی۔

لائیڈز کالج میں رعب اور دبدبے کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے طفیل کا وہ انجام عبرتناک تھا۔ اس نے تنظیم کے بازوؤں کی حفاظت کے لیے نہ جانے کتنے خون بہائے تھے لیکن حالات نے اسے ایک ایسے دھارے میں دھکیل دیا کہ وہ اپنا بھی خون بہانے پر تل گیا، میری دانست میں وہ بڑی ماں کے لہو کی پکار تھی جو طفیل کی موت پر منتج ہوئی تھی۔

طفیل کو اپنے فلسفے کے تحت موت کے بعد کی کوئی فکر نہیں تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ لائیڈز کالج والے اپنے مُردوں کی سرپرستی کے قائل نہیں ہیں، خصوصاً وہ لوگ جو باہر بدنامی کی حالت میں مرتے ہوں۔ اس اعتبار سے تصویر کی طرح طفیل کو بھی پس مرگ پہچاننے سے انکار کر دیا جاتا اور اس کی لاش لاوارث قرار دے کر دفن کر دی جاتی۔

اس پورے معاملے میں سب سے بڑی بات یہ ہوئی تھی کہ طفیل کی کار کے ڈیش بورڈ سے اس کا ڈرائیونگ لائسنس برآمد ہوا تھا جس پر اس کا لائیڈز کالج کا پتا درج تھا اور آخری نیوز پر اسی حوالے سے دو مختصر سطریں شائع ہوئی تھیں کہ آخری خبریں موصول ہونے تک لائیڈز کالج والوں نے طفیل سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا۔

اس بار لاہور آنے کے بعد میرے دل میں طفیل کی طرف سے اس قدر نفرت پیدا ہو گئی تھی کہ عملاً میں اپنے لٹو کو فراموش کر کے اسی کے پیچھے پڑ گیا تھا اور مجھے خوشی تھی کہ وہ میرے ہاتھوں اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گیا تھا۔

اور اب شوگر کوئین کی باری تھی!

اسی اثنا میں سلطان شاہ بھی نیند سے بیدار ہو گیا اور بستر چھوڑتے ہی میرے ساتھ اخبار کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

"لائیڈز کالج والے اس بار بھی اپنا دامن بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" اس نے خبریں دیکھنے کے بعد تبصرہ کیا۔

"کوشش تو ہم بھی بہت کچھ کر رہے ہیں۔ اب نتائج کا انتظار کرنا ہو گا۔"

"کیوں نہ ٹرانسمیٹر پر کچھ چھیڑ چھاڑ کی جائے۔" اس نے رائے پیش کی جسے میں نے فوراً قبول کر لیا۔

"جب ہم ایک دوسرے کے سامنے آ ہی گئے ہیں تو اب کھل کر بات کرنا چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے آپریٹس آن کر دیا۔

ریڈیائی شور جب اعتدال پر آیا تو میں نے بٹن دبا کر پیغام نشر کرنا شروع کر دیا۔

"ڈینی کالنگ لائیڈز کالج... اوور!"

میں وقفے وقفے سے کوشش کرتا رہا لیکن دوسری طرف بالکل سکوت چھایا رہا۔

"طفیل کے بعد وہاں کون رہا ہو گا جو تمھاری کال کا جواب دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کر سکے۔" سلطان شاہ نے میری مسلسل ناکامی پر دھیمی آواز میں کہا۔ "جواب کے لیے تمھیں شاید کسی نہ کسی کو مخاطب کرنا ہی ہو گا۔"

"ڈینی کالنگ لائیڈز کالج۔ جو بھی میری آواز سن رہا ہو جواب دے۔ اوور!"

"کیا چاہتے ہو؟ اوور!" چند ثانیوں کے بعد ریسیور پر ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

"طفیل، ڈیوڈ اور اولڈ ڈارلنگ کا حشر تمھارے سامنے ہے، مجھے ہر قیمت پر تصویر کی ماں کا سُراغ درکار ہے ورنہ آج کا سورج غروب ہونے تک لائیڈز کالج اور اس کے مکینوں پر مزید مصائب نازل ہوں گے... اوور!"

"تم کسی غلط فہمی کا شکار معلوم ہوتے ہو۔ ہم لوگوں کا لائیڈز کالج سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ہم کسی تصویر یا اس کی ماں کو جانتے ہیں۔ اوور!"

"شاید تم طفیل کے وجود سے بھی انکار کر دو گے؟ اوور!" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تم خود ہی سمجھ دار ہو۔" دوسری طرف سے ٹھنڈے لہجے میں کہا گیا۔ "ایسی صورت میں ہمیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ کون زندہ رہا اور کون مارا گیا۔ میں کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو تمھارے سوالات کے جواب دے سکے۔ اوور!"

"یہی بہتر ہوگا ورنہ تمھارے لیے زندہ رہنا عذاب بن جائے گا... اوور!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"دھمکیوں سے تم ہمیں مرعوب نہیں کرسکو گے۔" دوسری طرف سے بدستور پُرسکون لہجے میں کہا گیا۔ "ہمارے بھی ہاتھ بہت دراز ہیں، بدقسمتی بس اتنی ہے کہ ہمارا ایک آپریٹس تمھاری تحویل میں چلا گیا ہے اور اب....!"

میں نے پورا پیغام سُننے بغیر فوراً ہی آپریٹس آف کرکے چادر کے نیچے ڈال دیا کیوں کہ دروازے پر دستک سنائی دی تھی۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے سلطان شاہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی حیرت سے میری طرف نگراں تھا۔

"کون ہوسکتا ہے؟" اس نے سرسراتی ہوئی تشویش زدہ آواز میں کہا۔

"پتا نہیں۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ اسی لمحے دوبارہ دستک سنائی دی، شاید باہر والا جواب نہ ملنے پر مضطرب ہورہا تھا۔ "کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ میں دروازہ کھولتا ہوں، تم ہوشیار رہنا۔" یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھولا تو ایک اجنبی چہرہ ہاتھ میں کچھ کاغذات تھامے کھڑا تھا۔

"بے وقت تکلیف دینے پر معذرت خواہ ہوں۔" اس نے رسمی لہجے میں کہا۔ "میں اس ہوٹل کا منیجر ہوں، آپ کو میرے ساتھ نیچے دفتر تک چلنا ہوگا۔"

"مگر کیوں؟" میں نے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔ "ابھی تو میں نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا۔ میرے شب خوابی کے لباس کی حالت آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ میں ایسی حالت میں کمرے سے ہرگز نہیں نکل سکتا۔"

"آپ لباس تبدیل کرلیں۔ مجبوری نہ ہوتی تو میں ہرگز زحمت نہ دیتا، میرے دفتر میں اس وقت کچھ سینئر پولیس افسران موجود ہیں، میں انھیں بمشکل دفتر میں روک سکا ہوں ورنہ وہ خود اوپر آنے پر مُصر تھے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی وجہ سے ہوٹل میں کوئی تماشا کھڑا ہوجائے۔" اس کے لہجے میں معذرت کے ساتھ غصے کی بھی ہلکی سی جھلک نمودار ہوگئی تھی۔

پولیس کا نام سنتے ہی میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ منیجر نے مزید کچھ کہا لیکن وہ میرے پلّے نہ پڑ سکا کیونکہ اس وقت عارضی طور پر میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔

شاید سلطان شاہ نے ہوٹل منیجر کے کہے ہوئے الفاظ سن لیے تھے کیونکہ وہ فوراً ہی میرے پیچھے آپہنچا تھا اور مجھے راستے سے ہٹا کر آگے بڑھنے کی فکر میں تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا اور پریشان ہوگیا۔ سلطان شاہ نے داہنے ہاتھ میں دبا ہوا پستول اپنی پُشت کی طرف چھپایا ہوا تھا اور اس کے تیور بہت خطرناک نظر آرہے تھے۔

"تم اندر جاؤ!" میں نے سلطان شاہ کو غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ "میں بات کررہا ہوں۔"

"اوہ! آپ لوگ بلاوجہ اشتعال کا شکار ہورہے ہیں۔" منیجر مضطربانہ انداز میں پہلو بدلتے ہوئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "پولیس افسران کی یہ کارروائی صرف آپ ہی کے لیے نہیں ہے، وہ ہوٹل میں مقیم ہر اُس شخص سے بالمشافہ ملاقات پر مُصر ہیں جس کے مکمل کوائف ہمارے رجسٹر میں موجود نہیں ہیں۔"

"تو یہ آپ کے عملے کا قصور ہے، اس کی سزا یہاں قیام کرنے والوں کو کیوں دی جارہی ہے۔ کیا صرف اس لیے کہ انہوں نے ٹھہرنے کے لیے اس ہوٹل کا انتخاب کیا ہے؟" میں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"اوہ۔" وہ بائیں ہتھیلی سے اضطراری طور پر اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے بولا۔ "میں کہتا ہوں کہ اس معمولی سی بات پر آپ جذباتی کیوں ہورہے ہیں۔ ہمارے رجسٹر میں مسافروں کی شناخت، سفر کے مقاصد اور منزل کے بارے میں کئی کالم ہوتے ہیں اور ہمارا عملہ محض خوش خلقی کے اظہار میں آنے والوں سے وہ سوالات دریافت نہیں کرتا کہ کہیں آنے والے ایسی جرح کو اپنی توہین نہ سمجھ بیٹھیں۔ مسافروں کی بخیر و عافیت واپسی کے بعد وہ کالم اپنے طور پر پُر کرلیے جاتے ہیں۔ یہ کم و بیش ہر چھوٹے اور بڑے ہوٹل کا اصول ہے، اب یہ اتفاق ہے کہ اس بار پولیس آپہنچی ہے۔ ہمارے رجسٹر میں جس نام کے آگے اندراجات کے خانے خالی ہیں، ان سب کو باری باری میرے دفتر میں طلب کیا جارہا ہے۔ کم و بیش میرے سارے ہی مہمان اس ناپسندیدہ مشق سے گزریں گے اور انھوں نے بتایا ہے کہ یہ تفتیش شہر کے تمام ہوٹلوں میں ہورہی ہے۔ کیوں ہورہی ہے؟ اس سوال کا دریافت کرنا میرے لیے دشوار ہے۔ ہم سے ہر وقت چھوٹی موٹی فروگزاشتیں ہوتی رہتی ہیں۔ وہ جب چاہیں ہمیں اندر کرسکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میری اس وضاحت کے بعد آپ کو میرے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

اس نے کوریڈور میں کھڑے رہ کر جس عاجزانہ لہجے میں وہ ساری تقریر کی تھی، اس پر میرا دل پسیج گیا اور ذہن سے بیشتر اندیشے صاف ہوگئے اور میں خندہ پیشانی کے ساتھ اس سے تعاون پر آمادہ ہوگیا۔

"آپ اندر تشریف لے آئیں، میں بس پانچ منٹ لوں گا۔" میں نے اسے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

"آپ تیار ہوں، میں دوسو پندرہ والوں کو کہہ آؤں، ہوسکتا ہے کہ وہ بھی کچھ وقت لیں۔" اس نے خوش خلقی کے مظاہرے میں دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان شدید قانونی پابندیوں کے باوجود شہروں میں جابجا ہوٹل کیوں بن رہے ہیں؟ مسافروں کے ساتھ تو جو ہوتا ہے سو ہوتا ہے لیکن ہمارے پلے میں تو ہر بار یہی رویّہ ہوتا ہے جیسے ہم بدنام جرائم پیشہ افراد کے پُشت پناہ ہوں۔"

وہ چلا گیا اور میں نے دروازہ بند کردیا۔

"تم بھی جلدی سے لباس تبدیل کرلو۔" میں نے سلطان شاہ سے کہا۔ "میری اور منیجر کی روانگی کے بعد کمرے میں سے نکلنا۔ اگر حالات خراب ہوں تو تمھیں دخل اندازی کی کھلی اجازت ہوگی۔"

"اچھا ہی ہوا کہ تم نے مجھے پھٹکار کر اندر لوٹا دیا ورنہ میں تو پولیس کا نام سنتے ہی منیجر کو گریبان پکڑ کر اندر گھسیٹنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔" اس نے احمقانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ "میں سمجھا تھا کہ یہ ہمارے لیے کوئی خاص پھندا تیار کیا گیا ہے۔"

"مجھے حیرت ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے یہاں سُرخ فیتے کی لعنت اس قدر مستحکم ہے کہ میں اب تک یقین نہیں کرسکتا کہ پچھلی رات رونما ہونے والی وارداتوں یا کسی مخبری کی بنا پر پولیس آج صبح سویرے حرکت میں آچکی ہے۔"

"صبح سویرے نہ کہو۔" اس نے لباس تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت دس بج چکے ہیں۔"

چند منٹ بعد میں لباس تبدیل کرکے باہر نکلا تو منیجر بے چارہ کسی یتیم خانے کے منشی کی طرح دست بستہ راہداری میں ہمارے ظہور کا منتظر تھا۔

"آپ کے ساتھی؟" مجھے تنہا کمرے سے نکلتے دیکھ کر منیجر نے مسمسی آواز میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں ساری جوابدہی کرلوں گا۔" میں نے خوش خلقی کے ساتھ کہا۔ "ضرورت محسوس ہوئی تو اسے بھی نیچے بلالیا جائے گا۔"

منیجر سر ہلا کر میرے ساتھ ہولیا۔

میں نے طویل راہداری عبور کرکے سیڑھیوں کی طرف مُڑتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھا تو سلطان شاہ کمرے سے باہر نکلا تھا اور ہمارے پیچھے بڑھا چلا آرہا تھا۔

گراؤنڈ فلور پر پہنچ کر میں منیجر کے پیچھے آگے بڑھتا رہا اور جب اس نے اپنے دفتر کے کمرے کا دروازہ کھولا اور میں چند قدم آگے بڑھا تو بے اختیار میرے تنفس کی رفتار تیز ہوگئی۔

میرے سامنے توقیر کے نام سے کراچی میں میرا مہمان ہونے والا پولیس کی وردی میں موجود تھا اور اس کی شناسا نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں، جن میں قدرے تحیّر کے ساتھ تحقیر کے آثار موجود تھے۔

میرے لیے وہ صورتحال ناقابلِ فہم تھی لیکن شاید میرے پیچھے آنے والے سلطان شاہ نے صورتحال کی نزاکت بھانپ لی تھی۔ میرے عقب سے ایک بے آواز فائر ہوا جو بے سود ثابت ہوا، پھر اسی کے بعد توقیر کا نام اختیار کرنے والے نے اچانک نکاسی کے راستے کی طرف چھلانگ لگادی۔ ہوٹل کا منیجر ایک دیوار سے ٹکا اس طرح ہانپ رہا تھا جیسے میلوں دور سے دوڑتا ہوا وہاں تک آیا ہو۔

میں نے اس جعلی پولیس آفیسر کی طرف چھلانگ لگادی جو کراچی میں توقیر کے نام سے میرا مہمان ہوا تھا لیکن اس وقت ایک پولیس آفیسر کی یونیفارم میں نظر آرہا تھا۔ وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار تھا کیونکہ ایک چھلاوے کی طرح مجھے جُل دیتا ہوا ہوٹل کی راہداری سے گزر کر باہر کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ کک... کیا ہورہا ہے... کیا ہورہا ہے؟ میں برباد ہوجاؤں گا۔" ہوٹل کے منیجر کی کانپتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی لیکن اس وقت میرے ذہن میں بس ایک ہی گونج سمائی ہوئی تھی۔

اے ٹو پولیس کی وردی پہنے شہر میں دندناتا پھر رہا تھا اور اب میرے سامنے سے کسی چھلاوے کی طرح نکل بھاگا تھا، میرے پیروں میں گویا پَر لگ گئے، میں برق رفتاری کے ساتھ دوڑتا ہوا منیجر کے کمرے سے نکل کر ہوٹل کی راہداری سے ہوتا ہوا نکاسی کے راستے کی طرف پہنچا۔ راستے میں ہوٹل کے کئی ویٹر ہراس اور سراسیمگی کے عالم میں کھڑے نظر آئے، یہی کیفیت دربان کی تھی۔ وہ ہکا بکا کھڑا باہر کی سمت میں گھورے جارہا تھا۔

"وہ... وہ کہاں گیا؟" میں نے دربان کو تقریباً جھنجوڑتے ہوئے سوال کیا۔

دربان نے پھٹی پھٹی تحیّر آمیز نگاہوں سے مجھے یوں گھورا جیسے میں نے کسی اجنبی سیّارے کی زبان میں وہ سوال کیا ہو۔ شاید اس کا اس قدر حیران و پریشان ہونا فطری بھی تھا کیونکہ اس نے چند لمحوں قبل ایک باوردی اعلیٰ پولیس افسر کو کسی ادنیٰ مجرم کی طرح فرار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ بے چارہ سمجھ ہی نہ سکا ہوگا کہ اس واقعہ کا سبب کیا ہوسکتا تھا۔

لیکن اس وقت میں خود بھی دربان کی پریشانی کا احساس نہ کرسکا، مجھ پر عجیب سی اضطراری کیفیت طاری تھی، میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا حریف یوں آسانی کے ساتھ فرار ہوسکے۔

"جلدی بکو... وہ مردود کدھر گیا ہے؟" میں نے دونوں مٹھیوں میں اس کا گریبان دبوچ کر اس کے قدم زمین سے

چند انچ اوپر اٹھا دیے اور وہ جیسے سکتے سے ہوش میں آ گیا۔
"ادھر، وہ ادھر گیا ہے۔" اس نے پارکنگ لاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اچانک اس کا گریبان چھوڑ دیا پھر میں نے اسے لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گرتے ہوئے دیکھا اور برآمدے سے نیچے دوڑ لگا دی۔ میں دیوانہ وار آگے [illegible] ک ایک سیاہ سیڈان کار کچے راستے پر تیزی سے اچھلتی ہوئی پارکنگ لاٹ سے برآمد ہوئی اور مجھے ونڈ شیلڈ سے اسٹیئرنگ کے عقب میں وہی بدمعاش لے ٹو بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس سے پیشتر کہ اس کے بارے میں کچھ سوچنے کی نوبت آتی، وردی پوش لے ٹو نے اسٹیئرنگ کاٹا اور سیاہ کار کسی درندے کی طرح غراتی ہوئی میری طرف آنے لگی۔

میرے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ کچا راستہ بالکل ہموار تھا، کہیں کوئی ایسی اونچی جگہ نہیں تھی جہاں چڑھ کر میں خود کو اس مشینی حملے سے محفوظ رکھ سکتا، واپس برآمدے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ پیچھے سے مجھے روندتا ہوا گزر جاتا۔

میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا اور میں ادھر اُدھر بھاگنے کے بجائے کسی سحر زدہ معمول کی طرح اپنی جگہ پر جم کر کھڑا ہو گیا۔ دماغ ایک دم سُن ہو کر رہ گیا تھا۔

پھر اچانک ایک بے آواز فائر ہوا اور سیاہ سیڈان کی ونڈ شیلڈ چُور چُور ہو گئی لیکن گولی کے گزرنے کے مقام پر پیدا ہونے والے سوراخ کے علاوہ باقی تمام ٹکڑے اپنی جگہ قائم رہے جن کے آر پار دیکھنا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

اس صورتِ حال نے کار ڈرائیو کرنے والے کو بوکھلا دیا اور سیڈان ایک تیز جھٹکے کے ساتھ مجھ سے چند فٹ دور رک گئی۔

میری کھوپڑی پر جمتی ہوئی برف یکلخت پگھلنے لگی۔

اپنے کمرے سے میں تنہا ہی نیچے نہیں آیا تھا بلکہ سلطان شاہ بھی اپنے اسلحہ سمیت میرے پیچھے آیا تھا اور جب میں نے منیجر کے کمرے میں تین باوردی پولیس افسران میں لے ٹو کو شناخت کیا تو اپنے ردِعمل میں حیرت کے اظہار سے آگے بڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ سلطان شاہ نے صورتِ حال کی نزاکت بھانپ کر میرے عقب سے لے ٹو پر فائر جھونک مارا تھا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس کا نشانہ خطا گیا اور لے ٹو کو وہاں سے نکل بھاگنے کا موقع مل گیا۔

پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ سلطان شاہ اس کے تعاقب میں مجھے تنہا چھوڑ دیتا، یقیناً وہ میرے پیچھے موجود تھا اور اسی نے بروقت گولی چلا کر لے ٹو کے لیے اس گاڑی میں فرار ہونا ناممکن بنا دیا تھا۔

وہی نہیں، عین ممکن تھا کہ اس کے ساتھ ہوٹل کا منیجر اور اس کا عملہ بھی موجود ہوتا۔ الجھن کی بات بس اتنی تھی کہ میں نے اعلیٰ پولیس افسران کی وردیوں میں لے ٹو کے علاوہ مزید دو افراد کو وہاں دیکھا تھا اور وہ یقینی طور پر لے ٹو کے ساتھی ہی تھے۔ اس بھگدڑ میں انھیں یقینی طور پر فرار کا موقع مل گیا تھا ورنہ وہ سلطان شاہ وغیرہ کو یوں کھلی چھٹی نہ دیتے۔ ان دونوں کو پورا یقین رہا ہوگا کہ لے ٹو کو روکنا ناممکن ہوگا پھر وہ کیوں وہاں رک کر کسی چوہے دان میں پھنسنے کا انتظار کریں۔

میرے ذہن نے کسی برق رفتار کمپیوٹر کی طرح آناً فاناً میں وہ سارا تجزیہ کر لیا اور میں نے وقت ضائع کیے بغیر سیاہ سیڈان کی طرف چھلانگ لگا دی۔

میں نے بڑھ کر ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے پر پوزیشن لینا چاہی تھی تاکہ لے ٹو کو نیچے اترتے ہی گردن سے دبوچ لوں لیکن میرے وہاں پہنچنے پر بھی دروازے میں جنبش نہ ہوئی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے جھک کر کھڑکی کے شیشے میں سے جھانکا تو لے ٹو عجلت میں دوسری سمت کے دروازے سے نیچے اتر چکا تھا۔

ابھی میں کوئی فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ اچانک پھر ایک فائر ہوا اور اس بار کار کی دوسری سمت سے ایک بے ساختہ چیخ ابھری تھی۔ شاید اس بار سلطان شاہ کا نشانہ کارگر رہا تھا۔

میں نے دوڑ کر کار کی دوسری سمت میں پہنچنے کی کوشش کی لیکن میں ڈکی تک ہی پہنچا تھا کہ کار کے سامنے ایک شدید دھماکا ہوا اور فضا میں کثیف دھویں کی چادر پھیل گئی۔

وہ بدمعاش ہر قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا اور اپنے فرار کی راہ مسدود پا کر اس نے دھویں کے بم استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ دھویں کی چادر کے پار سلطان شاہ ہوٹل کے عملے سمیت موجود تھا۔ ان لوگوں کے لیے اس کثیف دھویں سے گزرنا ناممکن تھا کیونکہ دھویں کی زد میں آتے ہی تنفس کا نظام ناکارہ ہو جاتا اور ایسی حماقت کرنے والا دم گھٹنے کے سبب آناً فاناً میں بے ہوش، ہو جاتا۔

دھویں کے دوسری جانب لے ٹو کار کی آڑ میں زمین پر پڑا دوسرے دستی بم کو داہنی ہتھیلی پر تول رہا تھا اور میں اس کے عقب میں موجود تھا۔

میرے لیے وہ مرحلہ فیصلہ کن تھا، میں کسی چیتے کی سی مکاری کے ساتھ بے آواز قدموں کے ساتھ آگے بڑھا، اس اثنا میں لے ٹو نے دوسرا بم بھی سامنے اچھال دیا۔ دھماکے سے زمین لرز اٹھی اور سیاہ دھویں کی چادر کے اس پار دیکھنا ناممکن ہو کر رہ گیا۔ فضا میں پھیلے ہوئے دھویں کے اثرات سے لے ٹو کھانس رہا تھا مگر میں حلق، سینے اور آنکھوں میں شدید جلن کے باوجود کوئی آواز پیدا کیے بغیر عین اس وقت لے ٹو پر ٹوٹ پڑا جب وہ ایک تھیلا سمیٹ کر زمین سے اٹھ رہا تھا۔

میرے ناگہانی حملے کے باعث لحظہ بھر کے لیے وہ میرے نیچے دب کر رہ گیا مگر اگلے ہی لمحے میں اس نے اپنے گھٹنوں پر زور دے کر مجھے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی پشت پر سے دور اچھال دیا۔

لے ٹو — جس کا نام میرے لیے برسوں سے ایک ہیبت بنا ہوا تھا، اس وقت میرے ساتھ دوبدو مقابلے میں مصروف تھا اور میری دسترس میں تھا۔ میں زمین سے لگتے ہی پھرتی کے ساتھ اٹھا اور دوبارہ اس پر جا پڑا۔

میں نے عقب سے اس کے دونوں شانوں کو گرفت میں لے کر اپنے پورے وجود کو فضا میں اچھال کر وحشیانہ قوت کے ساتھ اس کے سر کے پچھلے حصے پر ٹکر رسید کی۔ وہ ٹکر کھاتے ہی غرا کر نیچے جھکتا چلا گیا اور میں توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے اس کے اوپر سے اُڑتا ہوا آگے جا گرا۔

اس وقت وہ چاہتا تو بآسانی مجھے گہری زک پہنچا سکتا تھا لیکن اسے صورتِ حال کی نزاکت کا پورا احساس تھا۔ دھویں کے بم پھینک کر اس نے ایک راستہ مسدود کر دیا تھا لیکن ہوٹل کے عملے کی مدد سے لوگ دوسری طرف سے اسے گھیر سکتے تھے۔ یوں گزرتا ہوا ہر لمحہ اس کے فرار کے امکانات محدود کر رہا تھا۔

اس نے میری گردن پر پیر رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے تھیلے سے یکے بعد دیگرے تین دستی بم نکال کر مختلف سمتوں میں اچھال دیے۔ شاید اس طرح وہ لوگوں میں ہراس پھیلا کر انھیں خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اس کی ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی لیکن جسمانی طور پر مجھ سے بہت زیادہ برتر نہ ہونے کے باوجود اس کے وجود میں کسی گینڈے کی سی توانائی عود کر آئی تھی۔ اس کی پنڈلی میری گرفت میں آ کر ایک جھٹکے سے نکل گئی اور میرے ہاتھ میں پتلون کے پائنچے سے پھٹا ہوا ایک چیتھڑا دبا رہ گیا۔

اس سے پیشتر کہ میں زمین سے اٹھتا، لے ٹو نے ایک طرف دوڑ لگا دی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے کثیف دھویں کے سیاہ بادل میں گھستا چلا گیا۔

میں ہر طرف سے دھویں میں گھرا ہوا تھا اور سمتوں کا احساس معدوم ہو چکا تھا مگر پھر سیاہ سیڈان پر نظر پڑی تو مجھے لے ٹو کی حاضر دماغی کی داد دینا پڑی۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں بھی اس طرف بھاگا تھا جدھر پارکنگ لاٹ واقع تھی۔

دھویں کے بڑھتے ہوئے اثرات اس قدر اذیت ناک تھے کہ میں اس کے پیچھے دھویں کی چادر عبور کرنے کی ہمت نہ کر سکا اور وہیں کار سے ٹک کر بری طرح کھانسنے لگا۔

اسی دوران میں مجھے احساس ہوا کہ لے ٹو وہاں ایک خوفناک ہنگامہ برپا کرنے کے باوجود صاف بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن میں سخت دشواری میں مبتلا ہو گیا تھا۔

میرے چاروں طرف زہریلے دھویں کا حصار قائم تھا، میں اس میں گھرا فضا صاف ہونے کا منتظر تھا لیکن ہوٹل کے احاطے میں ہونے والے ان ہولناک دھماکوں کے نتیجے میں کسی بھی لمحے اصل پولیس فورس وہاں پہنچ سکتی تھی، یہ امکان بھی تھا کہ ہوٹل کے عملے کے ہی کسی رکن نے فون پر پولیس سے مدد طلب کر لی ہو۔ ایسی صورت میں مفرور مجرموں کی تلاش کے سلسلے میں پولیس کی ساری توجہ میری اور سلطان شاہ کی ذات پر مرکوز ہو جاتی اور ہمیں بدترین حوالاتی تفتیش سے جان بچانا محال ہو جاتی۔ لہٰذا عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ پولیس کی آمد سے پہلے ہم دونوں وہاں سے فرار ہو جائیں۔

یہ خیال آتے ہی میں اپنی ساری تکلیف بھول کر لے ٹو کی چھوڑی ہوئی سیڈان میں سوار ہو گیا۔ کنجی اگنیشن میں موجود تھی لیکن اگلا شیشہ ریزہ ریزہ ہو جانے کے باعث پتھر کی دیوار بن گیا تھا جس کی دوسری طرف دیکھنا ناممکن تھا۔

میں نے اپنے پیر سے جوتا اتار کر اس ٹوٹے ہوئے شیشے پر چند ضربیں لگائی اور بیشتر ٹکڑے کار کے اندر یا بانٹ پر جا گرے بس چاروں طرف ربر میں پھنسے ہوئے ٹکڑے اٹکے رہ گئے لیکن اب کار ڈرائیونگ کے قابل ہو چکی تھی۔

انجن اسٹارٹ کرتے ہی میں نے ہیڈ لیمپس آن کیے اور ہارن بجاتے ہوئے محض اندازے کی بنا پر کار تیزی سے آگے بڑھا دی۔ دھویں کے گاڑھے بادل زمین سے لگے ہوا کے رخ پر دھیمے دھیمے ہوٹل کی عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے، ان میں سے گزرتے ہوئے ٹوٹی ہوئی ونڈ شیلڈ میں سے دھواں اندر داخل ہوا۔ میں نے سانس تو روک لیا مگر نتھنوں اور آنکھوں کی سوزش نے ان چند ثانیوں ہی میں حالت غیر کر دی۔

میں دوسری طرف نکلا تو دھویں کی زد سے دور مسافروں، ہوٹل کے عملے اور تماشائیوں کا ایک جمِ غفیر موجود تھا۔ ہر چہرے پر خوف و ہراس اور تشویش کے آثار دور ہی سے پڑھے جا

سکتے تھے۔

مجھے اس حصار سے برآمد ہوتے دیکھ کر سلطان شاہ ہوٹل کے منیجر کو بازو سے تھامے تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ میں نے کار روک دی۔ مجھے حیرت تھی کہ مجمع میں سے کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"اترو، گاڑی میں چلاؤں گا۔" قریب آ کر اس نے تحکم آمیز لہجے میں ... وقت مجھ پر دھویں کے اثرات اس حد تک غالب تھے کہ شاید میں ہوٹل سے نکلتے ہی ہر خطرہ مول لے کر ڈرائیونگ سیٹ اس کے حوالے کر دیتا۔

"پیچھے بیٹھ جاؤ اس کے ساتھ، جلدی کرو، ابھی وہ دور نہ گیا ہوگا۔" میرے اترتے ہی سلطان شاہ نے منیجر کو ٹھوکا مار کر ترش لہجے میں کہا اور وہ بوکھلا کر جلدی سے پچھلی سیٹ میں گھس گیا۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھا اور سلطان شاہ نے ہارن بجاتے ہوئے کار تیزی کے ساتھ آگے بڑھا دی۔

مجمع کار کو راستہ دینے کے لیے کائی کی طرح پھٹتا چلا گیا۔

"اسے کیوں لے آئے؟" میں نے کار کے سڑک پر آتے ہی ناخوشگوار لہجے میں سلطان شاہ سے سوال کیا۔

"میں نے اسے بتا دیا تھا کہ پولیس کی وردیوں میں آنے والے دراصل خطرناک مجرم ہیں اور ہم دونوں کو ان ہی کی گرفتاری کے لیے سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز سے بھیجا گیا ہے، نہ بتاتا تو شاید یہ لوگ مجھے ہی قابو کر لیتے.....۔"

سلطان شاہ نے نہایت چالاکی کے ساتھ اپنی لائن مجھے سمجھا دی تھی۔ میں نے کھانس کر پہلو بدلا اور منیجر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"وہ تینوں تمہارے پاس کیوں آئے تھے؟"

"میرا کوئی قصور نہیں ہے جناب۔" منیجر گھگھیاتے ہوئے مدافعانہ لہجے میں بولا۔ "میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وردیوں سے دھوکا کھا جاتا۔ ایس ایس پی تو بہت بڑا افسر ہوتا ہے، ہوٹل والوں کی تو اے ایس آئی سے بھی روح فنا ہوتی ہے۔ جب اور جس جرم میں چاہیں، ہمیں بند کر سکتے ہیں، ہمارا کام ہی کچھ ایسا ہے۔"

"کام کی بات کرو۔" میں نے سنبھالا لے کر اسے افسرانہ شان سے پھٹکارتے ہوئے کہا۔ "یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ وہ مسافروں کو کیوں چیک کرنا چاہتے تھے؟"

"مجھ سے کہا گیا تھا کہ ان کی اطلاعات کے مطابق بیرون شہر سے آئے ہوئے کچھ اشتہاری مجرم شہر کے کسی ہوٹل میں روپوش ہیں۔ اس بارے میں وہ تین ہوٹلوں کی چیکنگ کے بعد میرے پاس آئے تھے۔"

"ہم دونوں کو خاص طور پر بلوایا گیا تھا؟"

"نن... نہیں۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔ "رجسٹر میں جن ناموں کے سامنے اندراجات نامکمل تھے، سب ہی کو بلوایا تھا، صرف میرے تین غیر ملکی مہمان اس پیشی سے بچ سکے تھے کیونکہ غیر ملکیوں کے معاملے میں ہم خاص احتیاط برتتے ہیں۔"

میری دانست میں اسے اپنا دُم چھلا بنائے رکھنا بے سود ہی تھا۔ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "ہم اس وقت ان کے دوسرے ٹھکانے پر چھاپا ماریں گے، ہمارے ساتھ تمہارا وقت برباد ہوگا، اس وقت تمہاری ہوٹل میں موجودگی ضروری ہے تاکہ کوئی مقامی پولیس پارٹی جائے واردات پر پہنچے تو تم اسے حقائق سے باخبر کر سکو، اگر ابتدا ہی میں وقوعہ کا غلط پرچا کٹ گیا تو تمہارے لیے دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔"

"واقعی آپ نے بہت دور کا نکتہ سوچا ہے۔" اس کے چہرے سے ممنونیت کے آثار پھوٹ پڑے۔

"ہو سکے تو ہمارا سامان اپنی ہی تحویل میں رکھنا۔ ورنہ ہم مقامی تھانے سے ہی لے لیں گے۔" سلطان شاہ نے ہانک لگائی۔

"بہت بہتر جناب! میں آپ کا خادم ہوں۔" وہ ایک ایک لفظ پر بچھا جا رہا تھا۔ اپنے تجربے کی بنا پر شاید اسے ہم سے ایسے شریفانہ رویے کی امید نہیں تھی۔

سلطان شاہ نے ایک جگہ گاڑی روکی اور وہ یوں سلام کرتے ہوئے پھرتی سے اترا جیسے اسے ہمارا ارادہ تبدیل ہو جانے کا خوف لاحق رہا ہو۔

"اب اس جنازے سے پیچھا چھڑاؤ، منیجر کے واپس پہنچتے ہی پورے شہر کی پولیس ٹوٹی ہوئی ونڈ شیلڈ والی سیاہ سیڈان کی تلاش شروع کر دے گی۔" گاڑی حرکت میں آنے پر میں نے کہا۔

"لیکن یہ ہوا کیا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ لوگ اس قدر دیدہ دلیر ہوں گے۔" اس نے تحیر آمیز لہجے میں کہا۔

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ ہماری پولیس اتنی سُرعت کے ساتھ حرکت میں نہیں آ سکتی لیکن مجھے یہ قلق رہے گا کہ ہمیں سامان چھوڑ کر بھاگنا پڑا ہے۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ ان کی حد سے زیادہ خود اعتمادی ہمارے کام آ گئی ورنہ وہی دونوں اپنے پستول نکال لیتے تو ہمارا نشان بھی نہ ملتا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"بوکھلاہٹ میں اس لٹو کے قدم اکھڑنے کی وجہ سے یہ سب ممکن ہوا ورنہ آج ہمارا آخری دن آ لگا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے بھاگتے ہی اس کے دونوں ساتھی میرے آگے بڑھے تھے پھر ایک بغلی راستے سے نکل بھاگے۔ شاید انھیں پورا یقین تھا کہ لٹو اپنی راہ بنا لے گا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ ہم نے انھیں کھل کر سامنے آنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہمیں تینوں ٹرانسمیٹرز سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں۔"

"میں بالکل ہی احمق نہیں ہوں۔" وہ قہقہہ مار کر بولا۔ "تمہاری طرح کبھی کبھی سوچ بچار بھی کرنے لگا ہوں۔ کمرے سے نکلتے ہوئے تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نیچے ہمارے اصلی بھی ہوں گے۔ اصل پولیس بھی ہوتی تو ہمارے دوبارہ کمرے کا رخ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لہٰذا تمہارے جانے کے بعد میں نے تینوں ایکسپریس اور دوسرا بے آواز پستول جیبوں میں اڑس لیا تھا اور وہ اب بھی میرے قبضے میں ہیں۔"

اگر وہ گاڑی ڈرائیو نہ کر رہا ہوتا تو میں بے اختیار اسے گلے سے لگا لیتا۔

"ٹوٹی ہوئی ونڈ شیلڈ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ سڑک چھوڑ کر کسی مضافاتی علاقے کی طرف نکل چلو جہاں اس گاڑی کو چھوڑا جا سکے۔"

"مجھے اپنا نشانہ خطا ہونے کا افسوس زندگی بھر رہے گا، گاڑی کچی سڑک پر نہ ہوتی تو میری چلائی ہوئی گولی تمہارے دوست کے بھیجے میں اتری ہوتی۔"

"تمھیں دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے فائر میں تم نے اسے زخمی کر دیا تھا۔"

وہ مضحکانہ انداز میں ہنس کر رہ گیا۔ "گولی سے وہ خود کو صاف بچا گیا تھا۔ اس نے محض ہمیں دھوکا دینے کے لیے چیخ ماری تھی۔ اگر میں چیخ سن کر آگے دوڑ لگا دیتا تو اگلے ہی لمحے میں اس کے پھینکے ہوئے دھویں کے بم کے ٹکڑے مجھے لہولہان کر کے رکھ دیتے۔ معلوم ہو رہا تھا کہ مقابلے کے امکانات اس کے ذہن میں پہلے ہی سے موجود تھے۔"

سلطان شاہ نے ایک جگہ راستہ بدلنے کے لیے گاڑی موڑی اور چند سو گز دور چلنے کے بعد ہی وہ واقعہ رونما ہو گیا جسے ٹالنے کے لیے میں نے سلطان شاہ کو راستہ تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

سڑک کے کنارے موٹر سائیکل کے ساتھ ٹریفک سارجنٹ کھڑا ہوا تھا اور اس کا باوردی سپاہی ہاتھ ہلا کر ہمیں رکنے کا اشارا کر رہا تھا۔

ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور سلطان شاہ بولا۔ "رکے بغیر گزر جاتے ہیں... رکے تو یہ قصہ گلے بھی پڑ سکتا ہے۔"

"جو کارروائی ایک آدھ گھنٹے بعد شروع ہونے والی ہے، اس کا آغاز اسی وقت ہو جائے گا، وہ موٹر سائیکل پر ہمارا تعاقب کرے گا۔ بہتر ہوگا کہ گاڑی روک لو۔"

"اور اگر وہ کٹ حجتی پر اتر آیا؟" سلطان شاہ نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھا جائے گا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "ٹریفک میں ... ہے۔ جیسے چلتا ہے یا پھر قانونی دفعات۔ سنگل ٹریک پر دونوں کا چلنا محال ہے، کچھ دے دلا کر پیچھا چھڑا لیں گے۔"

"بشرطیکہ اس بار وردیاں اصلی ہوں۔" اس نے دھیمے سے کہا اور پھر کار سڑک کے کنارے روک دی۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ٹوٹی ہوئی ونڈ شیلڈ سے قطع نظر سیاہ سیڈان بہت شاندار کار تھی اور ہم دونوں کا حلیہ اس وقت کار کے معیار سے مطابقت نہیں رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود سپاہی کا سوال سلگا دینے کے لیے کافی تھا۔

"کس کی گاڑی اٹھا لائے ہو؟" اس نے تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ پھبتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"سسرال سے لائے ہیں۔" مجھ سے پہلے ہی سلطان بول پڑا۔ "چاہو تو تمھیں بھی سیر کرا دیں گے۔"

"نیچے اترو۔" سپاہی کی قہر بار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ دوسری جانب سلطان شاہ والی کھڑکی کے قریب باہر کھڑا ہوا تھا جس کے نتیجے میں اس کا چہرہ میری نگاہوں سے اوجھل تھا لیکن اس کی آواز سے اس کے تیوروں کا اندازہ کرنا دشوار نہیں تھا۔

سلطان شاہ بلاتوقف بے پروایانہ انداز میں نیچے اتر گیا۔ مجھے بھی نیچے آنے میں عجلت سے کام لینا پڑا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں سلطان شاہ کی منہ زوری کوئی بڑی دشواری نہ کھڑی کر دے۔

"گاڑی کے کاغذات اور ڈرائیونگ لائسنس نکالو۔" کانسٹیبل نے غراتے ہوئے کہا۔ سارجنٹ ہم سے چند گز دور لاتعلقانہ انداز میں کھڑا خلا میں کچھ تک رہا تھا۔ اس کی اداسی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس وقت تک اسے اپنے فرائض کی بجا آوری میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

"سنتری بادشاہ سے بحث مت کرو۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے ترش لہجے میں سلطان شاہ کو پھٹکارا۔ "وہ جو کچھ مانگ رہے ہیں، قانون کے مطابق مانگ رہے ہیں۔"

غیر ارادی طور پر سپاہی کی گردن قدرے اکڑ گئی اور اس نے مشینی لہجے میں ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرا دیا۔

"ونڈ شیلڈ ٹوٹی ہوئی ہے کہیں گاڑی چھوڑتے تو کاغذات چوری ہو سکتے تھے، اس لیے گھر ہی چھوڑ آئے ہیں۔" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "ہم سے قصور کیا سرزد ہوا ہے جو کاغذات کی ضرورت پیش آگئی۔"

"کنون کاغذات مانگتا ہے۔" وہ نتھنے پھلا کر جارحانہ لہجے میں بولا۔ "اسے ونڈ شیلڈ سے کوئی غرض نہیں، وہ سالم ہو یا ٹوٹی، کاغذات ساتھ ہونے چاہئیں۔"

"کیا بات ہے غلام نبی؟" ٹریفک سارجنٹ نے دور ہی سے ہانک لگائی۔ شاید وہ گاڑیاں گنتے گنتے اکتا گیا تھا۔

"سر! کاغذات اور لائسنس کے بغیر لاٹ صاحب کے بچے سڑک پر گاڑی چلا رہے ہیں۔" اس نے فوراً ہی جواب دیا پھر تحکمانہ لہجے میں ہم سے مخاطب ہو گیا۔ "چلو ادھر، پرچا کٹے گا تمھارا۔"

سلطان شاہ کی جیبیں قدرے پھولی ہوئی تھیں۔ لہٰذا میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے وہیں روک دیا اور خود سپاہی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ٹریفک سارجنٹ اس اثنا میں اپنی چالان بک سنبھال چکا تھا۔

"کاغذات وغیرہ سب موجود ہیں، مہلت دیں تو پندرہ منٹ میں لے آؤں گا۔" ابتدائی سوال جواب کے بعد میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"ہوں۔" سارجنٹ حلق سے بل غرایا۔ "میں تمھارا نوکر ہوں جو یہاں کھڑا رہوں گا؟"

میرا خون کھول گیا۔ ساری خرابی یہی تھی کہ عوام کے ٹیکسوں پر پلنے والے سرکاری اہلکار خود کو عوام کا خادم کے بجائے آقا سمجھنے لگے تھے اور اپنے اس منصب سے نیچے آنے کو تیار نہیں تھے لیکن وہ نازک موقع کسی تقریر کے لیے سازگار نہیں تھا لہٰذا میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "پھر مجبوری ہے، جو چاہیں کر لیں۔"

"نام کیا ہے؟" اس نے قلم سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

"سر! چالان سے تو کچھ بھی نہ ہوگا۔" غلام نبی کو غالباً کوئی نیا نکتہ سوجھ گیا تھا۔

سارجنٹ نے کتاب سے نگاہیں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیوں؟"

"ہو سکتا ہے کہ گاڑی چوری کی ہو۔ یہ تو پرچا کٹوا کر فرار ہو جائیں گے۔ ابھی تو ہم تھوڑی دیر یہیں کھڑے ہیں، اتنی دیر میں یہ رکشا ٹیکسی سے جا کر کاغذات لے آئے تو ٹھیک ہے ورنہ گاڑی ہم مال خانے میں جمع کرا دیں گے۔" غلام نبی خاصا گھاگ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بالکل وہی کچھ کہا تھا جو میں سوچ رہا تھا۔ جھوٹے سچے نام سے چالان کرانے میں میرا کوئی نقصان نہیں تھا، رہی گاڑی تو میں خود ہی اس سے گلو خلاصی کی فکر میں تھا۔

لیکن آسانی سے رضامندی کی صورت میں غلام نبی کی سالخوردہ کھوپڑی کوئی اور گل کھلا سکتی تھی لہٰذا میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سراسر زیادتی ہے۔ ہم دونوں میں سے ایک یہیں رک جاتا ہے، دوسرا گاڑی سے جا کر کاغذات لے آئے گا۔"

"بک بک نہ کرو زیادہ۔" سارجنٹ نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "بے شک دونوں چلے جاؤ مگر گاڑی یہیں رہے گی ورنہ دونوں کو گاڑی سمیت تھانے لے جا کر ابھی بند کرا دوں گا۔ پھر ثابت کرتے رہنا کہ کار تمھاری ہے یا چوری کی۔"

نہ صرف دلیل بلکہ دھمکی بھی خاصی کارگر تھی۔ میں نے مایوسانہ انداز میں کار کی چابی سارجنٹ کی طرف بڑھائی جو غلام نبی نے درمیان ہی میں اچک لی۔

"پندرہ منٹ سے زیادہ دیر ہوئی تو شام سات بجے تھانے میں ہی ملاقات ہو سکے گی۔" میرے چلتے چلتے غلام نبی نے ہانک لگائی مگر میں پہلے ہی اس کی آنکھوں میں نمودار ہونے والی حریصانہ چمک سے اس کی نیت کا اندازہ لگا چکا تھا۔

ہماری ایک کمزوری ہاتھ آجانے کی بنا پر وہ اور شاید اس کا افسر بھی ڈیوٹی کو خیرباد کہہ کر دن کا باقی حصہ سیڈان کی سیر میں گزارنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور میں دل ہی دل میں کار سمیت اس مصیبت سے گلو خلاصی پر خوش تھا۔

"کیا ہوا؟" میرے قریب پہنچتے ہی سلطان شاہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"کاغذات گھر سے لانے پڑیں گے، گاڑی چھوڑ کر۔" میں نے اونچی آواز میں کہا پھر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "جلدی کھسک لو، گاڑی سے خود بخود جان چھوٹ گئی ہے۔"

ہم دونوں واپس چل پڑے۔

"کیا ہم پر شبہ ہو گیا تھا انھیں؟" کچھ دور نکل آنے کے بعد سلطان شاہ نے سوال کیا۔

"بس بلاوجہ کی دھونس دے رہے تھے۔" میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "مجھے پورا یقین ہے کہ پندرہ منٹ تو دور کی بات ہے، ہمارے اوجھل ہوتے ہی وہ گاڑی لے جائیں گے، اگر وہ واقعی ہماری ملکیت ہوتی تو اس کے واپس حصول میں دانتوں پسینہ آجاتا۔"

"سب کچھ ہوا لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔" سلطان شاہ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "لے ٹو اپنے ساتھیوں سمیت صاف بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر مجھے ذرا بھی عقل ہوتی تو تمھارے پیچھے دوڑ لگانے کے بجائے منیجر کے کمرے میں لے ٹو کے ساتھیوں کو گھیرنے کی کوشش کرتا۔ انھیں اسلحہ نکالنے کا موقع تک نہ مل سکتا تھا، چوہوں کی طرح پکڑے جاتے۔"

میں مسکرا دیا۔ "وہ ضرور پکڑے جاتے مگر لے ٹو شاید مجھے کچلتا ہوا نکل جاتا، تمھارے بروقت فائر نے ونڈ شیلڈ کو ناکارہ کر کے اسے یک جانے پر مجبور کر دیا ورنہ وہ مجھ پر گاڑی چڑھانے والے رہا تھا، جو ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے۔ کم از کم یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ پے در پے بھاری نقصانات اٹھانے کے بعد ہماری طرف توجہ ہونے پر مجبور ہو گیا ہے اور خود ہماری تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہے۔"

"لیکن چھلاوا ہے چھلاوا۔ کیسی دیدہ دلیری کے ساتھ فرار ہوا ہے۔" اس نے کہا۔

"اس کے لیے کوئی تیسری راہ ہی نہیں تھی۔ بچ نکلو یا ایسی کوشش کرتے ہوئے مارے جاؤ، اس کا فلسفہ اسی قدر رہ گیا تھا۔ سارے ساتھ تھے جو وہ کامیاب ہو گیا لیکن ہر بار ایسا نہ ہو سکے گا۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" اس نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

"اولڈ ڈارلنگ، ڈیوڈ، طفیل اور نیلی ٹوپی والے کو اس نے چند گھنٹوں میں کھویا ہے۔ ان بھاری نقصانات نے اسے مشتعل کر دیا ہے۔ ایک بار یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ہم ہوٹل میں رہ رہے تھے، وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ لاہور میں ہمارا کوئی مخصوص ٹھکانا نہیں ہے۔ اب شہر کے ہوٹل وہ بری طرح کھنگال ڈالے گا، شاید عارضی طور پر ہمیں تمھارے دوستوں کے پاس ہی پناہ لینا پڑے گی۔"

"وہ بڑی خوشی سے ہمیں مہمان رکھیں گے۔" وہ بولا۔ "لیکن میں مسلسل یہی سوچ رہا ہوں کہ لے ٹو جب ہماری ہی تلاش میں نکلا تھا تو سامنا ہوتے ہی بزدلانہ انداز میں کیوں بھاگ نکلا؟"

"شاید اسے اتنی جلدی سامنا ہونے کی توقع نہیں تھی۔ اپنی مہم کو محفوظ اور شبہات سے بالاتر رکھنے کے لیے اس نے اپنے ساتھیوں سمیت پولیس پارٹی کا سوانگ بھرا تھا لیکن اپنی تمام کوششوں کے باوجود وہ دور ہی سے پہچان لیا گیا۔ شاید پھر بھی وہ منیجر اور اس کے ماتحت عملے کی مدد سے پولیس مقابلے کا ڈراما کھڑا کر کے ہمیں پکڑنے کی کوشش کرتا لیکن تم نے اسے ہوشیار ہونے کا موقع دیے بغیر دور ہی سے بے آواز فائر جھونک مارا اور اس کا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔"

اسی اثنا میں سلطان شاہ نے ایک ٹیکسی روک لی اور ہم اس میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔

تنظیم سے ٹکرانے کے بعد میری کوئی شناخت باقی نہیں رہی تھی۔

گھر جلا کر خاک کر دیا گیا تھا، فیکٹری کو تباہ کرنے کی کوشش اتفاق سے ناکام ہو گئی تھی اور مجھے اپنی جان بچانے کے لیے فیکٹری سے کنارہ کش ہو کر وہاں کے سارے تنظیمی اور مالی امور اپنے معتمد ملازمین کی صوابدید پر چھوڑ دینے پڑے تھے۔ زندگی کے طویل راستے پر مسلسل تنہا سفر کرتے کرتے میں اکتا گیا تھا اور جب غزالہ ملی تو یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اپنی تنہائی کا درماں مل گیا ہو لیکن میری وجہ سے غزالہ بھی مشکلات میں گھر گئی تھی۔ ایک بار اغوا ہونے کے بعد صحیح سلامت گھر لوٹ آنے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس پر دشمنوں کا دوسرا وار کب اور کہاں ہوگا۔

ان ہی حالات میں میں لاہور آیا تھا اور جب آدمی اپنی شناخت ہی کھو بیٹھا ہو تو مختصر سے سامان میں کسی ایسی چیز کی موجودگی کا امکان کہاں ہو سکتا ہے جس کی بنا پر اس کا سراغ لگایا جا سکے۔ اسی لیے میں ہوٹل میں رہ جانے والے سامان کی طرف سے بے فکر تھا۔ جو چیزیں ہمارے لیے کارآمد ہو سکتی تھیں، وہ سلطان شاہ اپنے ساتھ نکال لایا تھا۔

سلطان شاہ کے دوستوں نے ہماری ضرورت کا احساس ہوتے ہی اس کشادہ لیکن قدیم طرز تعمیر پر مشتمل مکان کا ایک کمرہ فوری طور پر ہماری تحویل میں دے دیا تھا۔ یہاں ہمیں یہ سہولت بھی میسر تھی کہ ضرورت کے وقت اسٹور کے طور پر کام آنے والی کوٹھری میں اپنا کوئی قیدی بھی لا سکتے تھے۔

دونوں بے آواز پستول اور تینوں آپریٹس میرے قریب ہی تپائی پر پڑے ہوئے تھے۔ سلطان شاہ وہاں ٹھکانا بنانے کے بعد خریداری کے لیے نکل گیا تھا اور میں یکے بعد دیگرے سگریٹیں پھونک پھونک کر آئندہ کے بارے میں کوئی ٹھوس لائحہ عمل طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لے ٹو کی تلاش کی مہم میں جب سے میری توجہ لائیڈز کالج کی طرف مرکوز ہوئی تھی، طفیل سیکورٹی آفیسر کے ایسے روپ میں میرے سامنے آیا تھا کہ میں اس سے متنفر ہو گیا تھا پھر تصویر کے مارے جانے کے بعد اس کا گھناؤنا کردار کھل کر سامنے آگیا اور میں وقتی طور پر لے ٹو کو بھول کر اس کی سرکوبی پر تل گیا تھا۔

اب نہ صرف طفیل میرے ہاتھوں اپنے عبرتناک انجام کو

پہنچ چکا تھا بلکہ اس کے طفیل شوگر کوئین کا ٹھکانا بھی میری نظروں میں آ گیا تھا۔ میرا قیاس یہی تھا کہ شوگر کوئین کے پردے میں ویلا لائیڈ پوشیدہ ہوگی اور اگر وہ ہمارے ہاتھ آ جاتی تو تنظیم کے بارے میں ہمارے بہت سے سوالات کے جوابات مل سکتے تھے۔

میں نے تپائی پر پڑا ہوا ایک آئی پیس آن کر دیا اور کمرے کی خاموش فضا میں دھیما دھیما ریڈیائی شور گونجنے لگا۔

سوچتے سوچتے میری ذہنی رو ایک دفعہ پھر غزالہ کی طرف مبذول ہوگئی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ محبت بھی ایک عجیب سا جذبہ ہے جس کی لذت سے محبت کیے بغیر آشنا ہونا ناممکن ہے اس سے اور تو جو ہوتا ہو سو ہوتا ہو مگر دل میں گداز ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ جب تک محبت نہ کی جائے، کسی کو چاہا نہ جائے، دل کسی پتھر کی طرح سخت، کٹھور اور بے پاش سا رہتا ہے۔ نہ کسی کے ملنے کی خوشی ہوتی ہے نہ بچھڑنے کا غم۔ انسان ایک کھاتا پیتا اور جیتا جاگتا کمپیوٹر بنا رہتا ہے جو صرف اور صرف حقائق کی دنیا میں رہتا ہے۔ لطیف اور موہوم جذبوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اور محبت بھی سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی، بس اچانک ہی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ ہم محبت کر سکتے ہیں یا کرنے والے ہیں لیکن اسی لمحے کیوپڈ کسی خاموش گوشے سے اپنا تیر چلا دیتا ہے اور احساس بھی نہیں ہو پاتا کہ کچھ ہوا ہے۔ محبت اس بے خبری میں پروان چڑھتی ہے کہ اس کا پتا اس وقت چلتا ہے جب چاہا جانے والا غیر متوقع طور پر روٹھ جائے یا کچھ دنوں کے لیے بچھڑ جائے۔ اس وقت میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔

غزالہ خوبصورت تھی لیکن اس سے پہلے میں اس سے کہیں زیادہ حسین نازنینوں کا ہم نشین رہ چکا تھا۔ میرے حافظے کے نہاں خانوں میں ناموں کی ایک قطار تھی جن کے ساتھ سیرت، صورت اور اداؤں کا حسن وابستہ تھا لیکن ان سب سے جب تک دوستی رہی رہی، بچھڑ گئے تو بھول کر بھی کوئی خیال آیا نہ کسی خلش نے سر ابھارا۔

لیکن غزالہ عابدہ کے ساتھ میرے دفتر میں کالج کے مجلے کے لیے اشتہار لینے آئی اور نجانے کیا کچھ لوٹ کر لے گئی۔ انجم کے بال لمبے اور گھنے تھے، حنا کا رنگ دودھ جیسا تھا، زاہدہ ہنستی تھی تو رخساروں میں پڑنے والے گڑھے بہت خوبصورت لگتے تھے، مسرت سبک اندام تھی لیکن غزالہ پہلی لڑکی تھی جسے کسی ایک خوبی کے حوالے سے یاد کرنا زیادتی کے برابر ہوتا۔ وہ سراپا چاہے جانے کے قابل تھی۔ اس کے ساتھ رہ کر مجھے آسودگی کا احساس ہوتا تھا لیکن یہ اندازہ پہلی بار اس سے چند روز کے لیے بچھڑ

کر ہی ہوا تھا کہ میں اسے کس قدر چاہتا تھا۔ اس سے دور رہ کر میں بہت مضطرب اور بے قرار سا رہتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ مصروفیات میں الجھنے کے بعد یہ اضطراب تحت الشعور میں کہیں جا دبکتا تھا اور فرصت کے چند لمحات میسر آتے ہی پورے وجود پر چھا جاتا تھا۔

میرا دل چاہا کہ لٹو اور تنظیم پر لعنت بھیج کر واپس کراچی چل دوں۔ اگر معاشرے میں ہیروئن کا زہر سرایت کر رہا تھا تو اس میں میرا کیا قصور تھا؟ میں پورے معاشرے کا ٹھیکیدار تو نہیں تھا۔ ہیروئن بیچنے خریدنے اور پینے والے سب بالغ اور باشعور تھے۔ موت کی اس سوداگری میں ہیروئن فروش اور ہیروئن نوش دونوں برابر کے شریک تھے۔ قانون کے محافظ ہاتھ دفعات پر مشتمل وزنی کتابیں سنبھالتے سنبھالتے شل ہو چکے تھے۔ پڑیاں بیچنے والے نگر نگر اور گلی گلی پکڑے جاتے تھے۔ ٹنوں کا ہیر پھیر کرنے والوں کے لیے ہر جال چھوٹا پڑتا ہے۔ اس بارے میں سلطان شاہ نے ایک لطیفہ خوب سنایا تھا۔ کسی سپاہی نے دو آدمی پکڑے۔ ایک کے پاس تین گرام ہیروئن تھی دوسرے کے پاس سات سو گرام۔ اس نے زیادہ والے کو چلتا کر کے تین گرام والے کو اندر کر دیا کہ قانون میں قابل تعزیر وہی مقدار تھی۔ تین گرام سے زیادہ کے لیے یہ تفصیل درج نہیں تھی کہ کتنے گرام یا کلوگرام پر گرفتاری کی جا سکتی ہے۔ شاید سلطان شاہ نے حقیقت کو لطیفے میں تبدیل کیا تھا۔ ہر طرف یہی ہو رہا تھا۔ جن کے جوان اس نشے کے ہاتھوں برباد ہو رہے تھے، وہ سب کچھ جانتے تھے اور جنہیں کھوج لگانے کے مشاہرے دیے جاتے تھے، ان میں سے بیشتر معصوم تھے۔ لوگ چاہتے ہوئے بھی ان معصوموں کی مدد نہیں کر سکتے تھے کہ قانون کے مندرجات ضعیف تھے، ارتکاب جرم ثابت کرنے کی مشقت بہت کڑی تھی پھر اگر یہ مرحلے بھی طے کر لیے جاتے تو سزائیں ایسی حوصلہ افزا تھیں کہ سزا یافتہ چند ہی مہینوں کے بعد چھری سنبھال کر مخبر یا گواہوں کے سینے پر سوار ہو سکتا تھا۔

اس حوصلہ شکن ماحول میں میری نگاہوں میں غزالہ کا شگفتہ شگفتہ، روشن چہرہ چمکا۔ اس کی گنگناتی، مسکراتی نگاہیں مجھے بلا رہی تھیں۔ اس کے ہر طرف لال، پیلے، نیلے اودے پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ پس منظر میں کسی پہاڑی سے ایک جھرنا وادی میں گر رہا تھا اور ہوا کے دوش پر اڑ کر آنے والی جھرنے کی پھوار اس کے چہرے پر شبنم کے ننھے ننھے موتیوں کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور مجھے بلا رہی تھی۔

جنہیں مرنا تھا وہ میرے یا سلطان شاہ کے ہاتھوں مر چکے تھے۔ مجھے واپس لوٹنا چاہیے۔ میں نے پوری شدت کے

سوچا لیکن وہ انسان ہی کیا جو اپنی سوچ کو اپنی مرضی کے مطابق عملی جامہ پہنا سکے۔ میرے تصور سے غزالہ کی تصویر یکلخت غائب ہوگئی اور اس کی بجائے تصویر کی ماں، میری بڑی ماں کا کرب آلود چہرہ ابھر آیا۔ ان کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں شکوہ رچا ہوا تھا، رنگ برنگے پھولوں نے کسی قبر پر پڑی ہوئی پھولوں کی چادر کی ترتیب اختیار کر لی تھی، شبنم کے قطرے بڑی ماں کی آنکھوں میں آنسو بن کر جم گئے تھے۔ وہ رو رہی تھیں اور مجھے ملامت کر رہی تھیں۔

میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ تصویر میرا سوتیلا بھائی تھا، بڑی ماں میری سوتیلی ماں تھیں لیکن وہ اتنی دور کے رشتے تو نہ تھے کہ میرا محبت گزیدہ دل انہیں ٹھکرا دیتا۔ اب وہ ہیروئن ہی کی جنگ نہیں رہ گئی تھی۔ اس میں میرے اپنوں کا لہو بھی شامل ہو چکا تھا جو مجھے انتقام کے لیے پکار رہا تھا۔

میں سر جھٹک کر بستر سے نیچے آ گیا۔

"اے لٹو! میں تجھے کہاں تلاش کروں؟ کیسے جہنم واصل کروں؟" میں دونوں مٹھیاں بھینچ کر بڑبڑایا۔ اس وقت مجھ پر غصے اور بے بسی کی ملی جلی سی کیفیت طاری ہو چلی تھی۔

میرا حریف شاید اپنے دور کا عیار ترین مجرم تھا۔ وہ مجھے فریب دے کر میرے ہی گھر میں میرا مہمان بنا رہا اور میں اسے اپنا بڑا بھائی سمجھ کر اس کی تواضع کرتا رہا پھر جوں ہی میرے دل میں شبہات نے سر ابھارنا شروع کیا، وہ غائب ہو گیا اور میرے گھر کو اس طرح نذر آتش کیا کہ ایک وفادار ملازم سمیت گھر کا تنکا تنکا خاک ہو گیا۔ وہ اے لٹو کے پہلے دیدار کی قیمت تھی جو میں نے ادا کی۔ دوسری بار وہ ہوٹل میں نظر آیا اور کسی چھلاوے کی طرح نور کی جان کی بھینٹ لے کر چلا گیا۔ آج وہ تیسری بار پولیس افسر کی وردی میں نظر آیا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس بار اس کے وجود کی نحوست ابھی تک مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکی تھی لیکن کون جانے کہ کب کیا ہونے والا ہے۔ ابھی دن کا بڑا حصہ باقی تھا۔ سلطان شاہ کو باہر گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ جب کہ اس کی خریداری کی فہرست زیادہ لمبی نہیں تھی۔ وہ آ جاتا تو میں لباس بدل کر باہر کہیں سے غزالہ کو فون کر سکتا تھا۔

مجھے اس کی جانب سے تشویش ہونے لگی۔ وہ بہت بے جگر دلیر آدمی تھا لیکن اس میں تجربے کی شدید کمی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ کوئی الجھن نہ مول لے بیٹھا ہو۔

جب شام ہونے لگی تو میں نے ہر خطرہ مول لے کر اس کی تلاش میں نکلنے کا ارادہ کیا مگر وہ اسی وقت واپس آ پہنچا۔ اس کے بشرے سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"بہت دیر لگا دی، کہاں رہ گئے تھے؟" میں نے اس کی خوشی کو نظر انداز کرتے ہوئے ترش لہجے میں سوال کیا۔

"تمہارے لیے گرما گرم خبریں جمع کر رہا تھا۔" اس نے بھی ترکی بہ ترکی ہنستے ہوئے میرے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کر دیا۔

"تم بالغ ہو گئے ہو لیکن کبھی کبھی تمہارے مزاج میں بچپن خود کر [illegible]۔" اس کے انداز پر میں بھی بے ساختہ ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔ "کیا خبریں جمع کرتے پھر رہے تھے؟"

"ذرا سانس لینے دو۔" وہ سامان کے تھیلے ایک طرف ڈالتے ہوئے بولا۔ "سب سے بڑی خبر تو یہی ہے کہ بیچارہ غلام نبی ناگہانی مارا گیا۔ سیاہ سیڈان میں گھومنے کا شوق اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔"

وہ خبر سن کر مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ دوسروں کی ملکیت پر اپنے تصرف کی آرزو رکھنا کسی بھی طرح قابل تحسین فعل نہیں تھا لیکن بڑھتے ہوئے معاشی تضادات کے اس پُرآشوب دور میں کم و بیش ہر نادار ہی ایسی آسائشوں کے خواب دیکھتا رہتا ہے جو شاید اسے زندگی میں کبھی میسر نہیں ہو پاتیں، ہاں، کبھی کوئی موقع ہاتھ آ جانے کی بات اور تھی۔

غلام نبی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

"وہ اپنی ڈیوٹی کے مقام سے میلوں دور اپنے گھر کے نزدیک مارا گیا۔ تین موٹر سائیکلوں پر سوار غنڈوں نے گھیر کر اس کا راستہ روکا اور بے دردی کے ساتھ اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ دو فرار ہو گئے، تیسرے کو لوگوں نے پکڑ لیا۔" وہ بتا رہا تھا "مشتعل ہجوم نے موقع پر ہی اسے اس بری طرح زدوکوب کیا کہ وہ زمین سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا، بعد میں اسے پولیس لے گئی۔"

"تم تو اس طرح تفصیل بتا رہے ہو جیسے اس واقعے کے چشم دید گواہ رہے ہو۔"

"چشم دید ہی سمجھو۔ میں وہاں سے کچھ دور خریداری میں مصروف تھا کہ شور سنا اور یوں موقع پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک غلام نبی مر چکا تھا اور تیسرے کی مرمت جاری تھی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیچارہ ہمارے دھوکے میں مارا گیا۔" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

"میرا بھی اندازہ یہی تھا لیکن تھانے سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ پکڑے جانے والے نے کیا اعتراف کیا ہے۔ اس کی ابتر حالت کے باوجود پہلے اسے تھانے میں رکھا گیا پھر اعلیٰ حکام کی آمد کے بعد اسے کڑی نگرانی میں شاہی قلعہ منتقل کر دیا گیا۔"

میں بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ مجرم کی

شاہی قلعہ میں منتقلی اس بات کا ثبوت تھی کہ پولیس صحیح راہ پر چل پڑی تھی اور حراست میں لیے جانے والے کا تعلق شہر میں رونما ہونے والی حالیہ پُرتشدد وارداتوں سے قائم کر لیا تھا۔ شاید انھیں شبہ تھا کہ غیر معمولی حفاظتی بندوبست نہ کیا گیا تو کہیں قیدی کو حوالات ہی میں ٹھکانے نہ لگا دیا جائے۔

"تم نے خبروں کا تذکرہ کیا تھا، یہ تو ایک ہی خبر ہوئی؟" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"ایک نہیں تین۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "غلام نبی مارا گیا، یہ پہلی خبر ہوئی، دوسری ایک حملہ آور کی گرفتاری اور تیسری اس کی شاہی قلعہ میں منتقلی کی تھی لیکن تم فکر نہ کرو میرے پاس کچھ اور بھی اطلاعات ہیں۔"

میں خاموشی کے ساتھ اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا۔ وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔ "طفیل کے قبضے سے اس کا جو ڈرائیونگ لائسنس برآمد ہوا تھا، اس پر طفیل کی رہائش لائیڈز کالج میں ظاہر کی گئی تھی۔ پولیس کے رجوع کرنے پر لائیڈز کالج والوں نے متوفی سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا تھا لیکن پولیس کی توجہ اس عمارت پر مرکوز ہو گئی ہے۔ لائیڈز کالج سے بتایا گیا ہے کہ چند سال پہلے طفیل نے کچھ دنوں کے لیے وہاں ملازمت کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنا ڈرائیونگ لائسنس اسی عرصے میں بنوایا ہو لیکن پولیس مطمئن نہیں ہے۔ آج میں دو مرتبہ ادھر سے گزرا اور دونوں ہی بار وہاں باوردی پولیس والوں کی موجودگی کے آثار نظر آئے۔"

"یہ اہم خبر ہے۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "اس کا مطلب ہوا کہ ہمارا محکمۂ پولیس اتنا نکما نہیں ہے جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔"

"میں سنجیدگی کے ساتھ لائیڈز کالج میں گھسنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"میں تمھیں ہرگز خودکشی نہیں کرنے دوں گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "عجلت میں مر جانے سے بہتر ہو گا کہ ہم صبر کے ساتھ کچھ دن اور انتظار کریں۔ تم نے غور نہیں کیا کہ میں نے چند روز سے شیو کرنا ترک کر دیا ہے تاکہ داڑھی نکل آنے سے حلیے میں نمایاں تبدیلی ہو سکے، اس کے بعد ہی ہم کھل کر کام کر سکیں گے۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو، میرا ارادہ زبردستی اندر گھسنے کا نہیں ہے۔ تمھاری تصویر کی ان کے حلقے میں بڑے پیمانے پر تشہیر ہو چکی ہے۔ لہٰذا تم باہر رہ کر اپنا کام سرانجام دو، میں اندر کوئی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ جتنی تیزی کے ساتھ اپنی نفری سے محروم ہوئے ہیں، اس کے پیشِ نظر میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے بارے میں خاصا پُرامید ہوں۔"

"بات معقول ہے لیکن تم اسے ٹو کو بھول رہے ہو جو توقیر کا نام اختیار کر کے کراچی میں میرا مہمان رہ چکا ہے، اس نے ہم دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اگر اس سے تمھارا سامنا ہو گیا تو وہ فوراً تمھیں پہچان لے گا۔"

"وہ لائیڈز کالج میں ہرگز نہ رہتا ہو گا۔" وہ پُرامید لہجے میں بولا۔ "اب تک کے حالات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس پورے کھیل کے پسِ پشت اسی کی ذات کارفرما ہے، وہ اپنے لوگوں میں یوں کھلے بندوں اپنی ذات کو بے نقاب نہیں کر سکتا۔"

"اسے سامنے آنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لائیڈز کالج میں کسی بے حیثیت ملازم کی طرح رہ رہا ہو، جہاں اسے بُری طرح نظرانداز کیا جاتا ہو مگر وہ ہر ایک پر نظر رکھتا ہو۔"

"ایسا ہوا تو میرے لیے اور بھی سہولت پیدا ہو جائے گی، میں بآسانی اس پر ہاتھ ڈال سکوں گا۔" وہ مجھ سے اپنی بات منوانے پر مُصر تھا لیکن میں اس بارے میں پوری طرح غور و خوض کیے بغیر فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

ہم دونوں اس موضوع پر بحث میں مصروف تھے کہ اچانک ٹرانسمیٹر پر ریڈیائی شور میں کچھ جھنجھناہٹ سی سنائی دی اور میں نے لپک کر اس کی آواز بڑھا دی۔ دوسری طرف سے رابطے کی کسی کوشش کی توقع ہی میں مَیں نے اسے مسلسل آن کیے رکھا تھا۔

دوسری طرف سے کوئی بھاری مردانہ آواز مجھے نام لے کر پکار رہی تھی۔

"ڈینی اسپیکنگ . . . اوور!" دوسری طرف سے لائن اوور ہونے کے بعد میں نے ٹرانسمیٹنگ بٹن دبا کر جواب دیا۔

"تم شہر میں مرنے والوں کا تعلق ہم سے قائم کرنے پر کیوں تُلے ہوئے ہو؟ اوور!" خشک لہجے میں سوال کیا گیا۔

"میری کوششوں سے حقائق تبدیل نہیں ہو سکتے، یہ طے ہے کہ تمھارے کچھ لوگ دوسروں کے ہاتھوں مارے گئے اور کچھ کو تم نے خود ہی جہنم واصل کر دیا۔ اگر تم واقعی کوئی اہمیت رکھتے ہو تو یقیناً میری اس رائے سے متفق ہو گے — اوور۔"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ تم ہمیں لائیڈز کالج سے متعلق سمجھ رہے ہو؟ اوور!" اس نے میرے تبصرے کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

"اگر یہ غلط ہے تو اپنا صحیح ٹھکانا تم بتا دو۔ مجھے تم لوگوں سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم خود کو کچھ اہم سمجھ رہے ہو لیکن تمھاری حیثیت بساط کے ایک مہرے سے زیادہ نہیں ہے، میرا اصل ٹکراؤ تمھارے گاڈ فادر سے ہے جو کبھی کسی کے سامنے نہیں آیا۔ تصویر بھی تمھاری ہی طرح اس کا ایک مہرہ تھا جسے خطرہ بھانپ کر تمھارے باس نے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دیا، اس کی ماں لائیڈز کالج میں تھی جسے تصویر کی ہلاکت کے بعد ہی غائب کر دیا گیا، میں ہر قیمت پر اس خاتون کا سراغ چاہتا ہوں . . . اوور!"

"شاید تم کسی خیالی سائے سے لڑ رہے ہو۔" دوسری طرف سے مضحکانہ لہجے میں کہا گیا۔ "رہا تصویر اور اس کی ماں کا معاملہ تو میرے لیے یہ نام ہی اجنبی ہے۔ اوور!"

"یہ وہی تصویر ہے جو ٹی اے ملک کے نام سے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا ایم ڈی بنا ہوا تھا، دوسری طرف لائیڈز کالج میں اسٹیٹ منیجر کے طور پر رہ رہا تھا اور اتفاق سے میرا بھائی بھی تھا۔ اوور!" میں نے تلخ اور جذباتی لہجے میں کہا۔

"اوہ! تم ملک کی بات کر رہے ہو۔" دوسری طرف سے ایک گہرا سانس لے کر کہا گیا۔ "دراصل میرا تعلق اسی سے تھا، کبھی کبھار میرے آدمی معاوضے پر اس کے لیے کام کرتے تھے، اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا، اب لائیڈز کالج میں میرا ایک بھی آدمی نہیں ہے۔ یہ خیال ذہن سے نکال دو کہ میں کسی اور کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا ہوں — اوور!"

"اگر تمھارے آدمی وہاں تھے تو وہ ضرور بتا سکیں گے کہ تصویر کی ماں بھی وہاں رہتی تھی — اوور!"

"اس مدت میں حاصل ہونے والی معلومات میرے ذریعے سے کسی اور کے کام نہ آ سکیں گی، میں اسے بدترین پیشہ ورانہ بددیانتی سمجھتا ہوں۔ تم چاہو تو آئندہ کے لیے مجھ سے معاہدہ کر سکتے ہو، میں تمھارے لیے تصویر کی ماں کا کھوج نکال سکوں گا.... اوور!"

"اتنا ضرور بتا دو کہ معمولی کرائے کے بدمعاش ہوتے ہوئے بھی تم ٹرانسمیٹر جیسی مہنگی اور جدید سہولت سے کیسے استفادہ کر رہے ہو؟ اوور!" میں نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

دوسری طرف سے ہنسی کی آواز ابھری۔ "یہ مقابلے کا دور ہے اور اب بدمعاشی ہو یا اعلیٰ تجارت، ہر جگہ بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کرنا پڑتی ہے۔ لوگ یہ دیکھ کر کام دیتے ہیں کہ ہم کن سہولتوں کے مالک ہیں، ایک چھری اور پستول کے سہارے کام چلانے کا دور اب بہت جلد لد جائے گا۔ یہ بتاؤ کہ تم اپنے مسئلے کے بارے میں کس حد تک سنجیدہ ہو؟ اوور!"

"میں سنجیدہ ہوں لیکن اسی آپریٹس پر میری طفیل وغیرہ سے بات ہوتی رہی ہے، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہر ایک پر برتری رکھتا ہو — اوور!" میں نے پوچھا۔

"محسوس ہونا ہی چاہیے تھا، میرے آٹھ آدمی تصویر کے لیے کام کر رہے تھے اور سب اس کے احکام کے تابع تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان ہی میں سے کسی کا آپریٹس طفیل کے زیرِ استعمال رہا ہو — اوور!"

"تم اپنی وضاحتوں سے مجھے مطمئن نہیں کر سکو گے۔" میں نے ترش لہجے میں کہا۔ "تصویر کے لیے تم کام کر رہے تھے لیکن اولڈ ڈارلنگ سے تمھارا کیا رشتہ تھا؟ تم مجھ سے رابطہ قائم کرنے پر کیوں مجبور ہوئے؟ اوور!"

"مجھے تم سے صرف اسی قدر دلچسپی ہے کہ میں اپنا آپریٹس واپس لینا چاہتا ہوں۔ ایک آپریٹس باہر چلے جانے سے میرے لیے یہ پورا نظام ناکارہ ہو کر رہ گیا ہے۔ میں تمھیں منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوں — اوور!"

"منہ مانگی قیمت۔" میں تضحیک آمیز انداز میں ہنس پڑا۔ "شاید تمھیں معلوم نہ ہو کہ ایک بار طفیل بھی مجھے منہ مانگی رقم ادا کر چکا ہے۔ اوور!"

"اسے بھول جاؤ، بارودی بریف کیس کے دھماکے میں میرا ہی ایک آدمی کام آیا تھا، اس بار ایسا نہیں ہو گا۔" اس کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ "میں دھوکا دے کر وار کرنے والوں میں سے نہیں ہوں — اوور!"

"پھر اس اکلوتے آپریٹس کی قیمت بھی تم ہی مقرر کر دو گے — اوور!"

"ایک تو یقینی طور پر تمھاری تحویل میں ہے لیکن میرے دو اور آپریٹس لاپتا ہیں۔ تم خود ہی طفیل اور اولڈ ڈارلنگ کا حوالہ دے چکے ہو، مجھے ان کے آپریٹس بھی واپس چاہئیں۔ اوور!"

"مجھے معلوم ہوتا تو میں ضرور ان پر قبضہ کرتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اب پولیس کی تحویل میں ہوں اور ان پر ہماری تمام گفتگو سنی اور ریکارڈ کی جا چکی ہو — اوور!"

"میں چیک کر چکا ہوں۔ ان کے پاس سے پولیس ایسی کوئی چیز برآمد نہیں کر سکی تھی — اوور!"

"بہرحال میں اس سے لاعلم ہوں، چاہو تو مجھ سے ایک کا سودا کر سکتے ہو، ورنہ میں تمھارے ہر کام میں رخنہ اندازی کرتا رہوں گا — اوور!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ سیدھی انگلیوں یہ گھی نہیں نکلے گا۔"

یک بیک دوسری طرف سے بولنے والے کا لہجہ خشک اور درشت ہو گیا۔ "اب تم سے کسی اور طرح ملاقات ہوگی اور تم ہاتھ جوڑ کر وہی کچھ کرو گے جو میں چاہوں گا۔ شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ کراچی میں اس لڑکی کا سراغ مل گیا ہے جس کے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ میں آنے کے ساتھ ہی تصادم کی راہ کھل گئی تھی — اوور!"

طنز اور تلخی سے بھرپور لہجے میں کہے ہوئے وہ الفاظ نشتر بن کر میرے وجود کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے اور میں بٹن دبا کر ٹرانسمیٹر پر بے اختیار چلا اٹھا۔ "اس لڑکی کا بال بھی بیکا ہوا تو میں تم سب کو فنا کر دوں گا اس شہر میں ایسی لاوارث لاشوں کی برسات شروع ہو جائے گی جن کے پاس سے برآمد ہونے والی ہر شے ان کے لائیڈز کاٹیج سے تعلق کی نشاندہی کرے گی اور وہاں رہنے والوں کی زندگی ایک عذاب میں بدل جائے گی — اوور!"

"چچ چچ — تم انتقام کے طور پر بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلو گے تو ان کا لہو آسیب بن کر تمہارے سر پر ناچے گا — اوور!"

"شہر میں تم جیسے بہتیرے گناہگار مل جائیں گے جو کسی نہ کسی وجہ سے قانون کی گرفت سے محفوظ ہیں لیکن درحقیقت گردن مارے جانے کے قابل ہیں۔ میں ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں ہوں تمہاری ہر حرکت کا جواب تمہارے تصور سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ لوٹا دیا جائے گا — اوور!"

"یہ یاد رکھنا کہ کچھ بارسوخ لوگوں نے تمہارا نام اپنے باغیوں کی فہرست میں درج کیا ہوا ہے اور جس دن بھی ان سے میری شرائط طے ہو گئیں، میں تمہیں پاتال میں سے بھی کھینچ نکالوں گا۔ اس وقت تک میری طرف سے تم آزاد ہو —— اوور اینڈ آل۔"

"اب تمہیں چکر دے کر گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔" گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے پر سلطان شاہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور مختلف سمتوں سے وار کرنے کی فکر میں ہیں۔"

"اپنی ذات کی حد تک مجھے ان کی ذرا بھی پروا نہیں ہے لیکن غزالہ کے بارے میں مجھے تشویش لاحق ہو گئی ہے۔ وہ کراچی میں بالکل تنہا رہ گئی ہے، ان کے خلاف اپنا کوئی دفاع نہ کر سکے گی۔"

"میرا اندازہ ہے کہ وہ کھوکھلی دھمکی دے رہا تھا۔ اس نے ایشین سنڈیکیٹ آنے والی لڑکی کا حوالہ دیا تھا اگر انہیں واقعی کراچی میں سراغ مل گیا ہوتا تو وہ براہ راست غزالہ کا نام لیتا لیکن میری دانست میں تمہیں کراچی ہو آنا چاہیے۔ وہاں سے آئے کئی دن ہو چکے ہیں، اس دوران میں تم نے وہاں فون بھی نہیں کیا۔"

"میں ابھی باہر جا کر فون کروں گا۔" میں نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "تمہیں شوگر کوئین کا ٹھکانا بھی دکھا دوں گا۔ تم اس کے بارے میں معلومات جمع کرنے کے ساتھ ہی کوشش کرو کہ تمہیں لائیڈز کاٹیج میں گھسنے کا موقع مل جائے۔ میں کل صبح کراچی چلا جاتا ہوں، ایک دو روز میں لوٹ آؤں گا۔"

تفصیلات طے کرنے کے دوران ہی میں لباس تبدیل کرتا رہا پھر ہم دونوں باہر روانہ ہو گئے۔

سلطان شاہ کو شوگر کوئین کی قیامگاہ دکھانے کے بعد ہم فضائی کمپنی کے دفتر پہنچے تو اگلی صبح کراچی جانے والی پرواز پر اکانومی کلاس میں کوئی نشست میسر نہیں تھی، میں نے مجبوراً فرسٹ کلاس کے کرائے کا فرق ادا کر کے نشست کنفرم کرا لی اور وہاں سے ہم ٹہلتے ہوئے جنرل پوسٹ آفس کی طرف روانہ ہو گئے۔

چند منٹ کے انتظار کے بعد آپریٹر نے کال ملا کر مجھے بوتھ میں جانے کا اشارا کیا تو ریسیور اٹھاتے ہی میرے حلق سے اطمینان کا ایک گہرا سانس خارج ہو گیا۔

کراچی سے ریسیور پر غزالہ کی ہیلو ہیلو سنائی دے رہی تھی۔

"کیا حال ہے تمہارا؟" میں نے پُرسکون لہجے میں براہِ راست سوال کیا۔

"اوہ خدا!" گہرے سانس کے ساتھ اس کی آواز آئی۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ کو خیال تو آیا، میں سمجھ رہی تھی کہ اس بار لاہور جا کر آپ ہمیں بھلا ہی بیٹھے ہیں۔"

"یہاں پے در پے رونما ہونے والے واقعات نے ہوش اڑا رکھے تھے، صبح کراچی آؤں گا تو تفصیل سن کر تم خود دنگ رہ جاؤ گی۔ میرے آنے تک تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے، ایک مرتبہ پھر گڑبڑ کے آثار پیدا ہو گئے ہیں..."

"میں سمجھ گئی۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "آپ کہاں سے فون کر رہے ہیں؟"

"پوسٹ آفس سے بول رہا ہوں۔ صبح میرے لیے ائیرپورٹ آنے کی ضرورت نہیں، میں سیدھا گھر پہنچ جاؤں گا۔"

"میرے پاس بھی کچھ اطلاعات ہیں، اب صبح ہی تفصیل بتاؤں گی۔"

اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ رسمی گفتگو کے

بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

باہر آیا تو میرے ذہن پر سے ایک بوجھ ہٹ چکا تھا اور مجھے سلطان شاہ کی رائے میں وزن محسوس ہونے لگا تھا کہ غزالہ کے بارے میں شاید مجھے کھوکھلی دھمکی دی گئی تھی۔

طیارے کو فضا میں بلند ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور کیبن کریو پھرتی کے ساتھ مسافروں کو ہلکا پھلکا ناشتا فراہم کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ مجھے ٹوائلٹ کی ضرورت محسوس ہوئی اور میں نے نشست چھوڑ دی۔

میری طرف والی راہداری میں مجھ سے آگے دو خواتین انتظار کی زحمت سے دوچار تھیں۔ لہٰذا میں گلیارے سے گزر کر دوسری راہداری میں جا گھسا لیکن وہاں بھی دروازے پر زیرِتصرف کے سرخ انگریزی حروف جلوہ گر نظر آئے لیکن غنیمت یہ تھا کہ اس طرف میں پہلے نمبر پر تھا۔ اندر والا بھی شاید کوئی شریف انسان ہی تھا کیونکہ چند ہی ثانیوں بعد چٹخنی ہٹنے کی آواز کے ساتھ زیرِتصرف کے سرخ حروف کی جگہ قوس نما خلا میں خالی کے سبز حروف نمودار ہو گئے۔

دروازہ کھلا اور اندر سے ایک شخص سر جھکائے برآمد ہوا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اسی اثنا میں اسے بھی راہداری میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہو چکا تھا، مجھ سے ٹکرائے بغیر اپنا راستہ بنانے کے لیے اس نے سر اٹھایا، ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور اس کے قدم اپنی جگہ پر جم کر رہ گئے۔

مجھے اپنے چہرے کے تاثرات کا اندازہ تو نہ ہو سکا لیکن اس کی نگاہوں میں یکلخت خون کی پیاس لہرائی تھی جو لحظہ بھر میں تیز چمک میں تبدیل ہو گئی، وفورِ جوش سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

کئی سیکنڈ تک ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر خونخوار انداز میں ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر وہ اچانک ہی ہنس پڑا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟" ہنسی کے باوجود اس کے الفاظ میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔

"اگر جہاز راستے میں اتر سکے تو ٹنڈو باگو جانا چاہوں گا۔" اس کے احمقانہ سوال کے جواب میں میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" اس نے بڑھ کر بظاہر دوستانہ انداز میں اپنا داہنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا لیکن اس کی سخت گرفت انتہائی غیر دوستانہ تھی۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ تم کراچی ہی جا رہے ہو لیکن کہاں؟"

"اپنے گھر۔" میں نے مسکراتے ہوئے سختی کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے شانے پر سے ہٹا دیا۔

اس وقت میرے وجود میں عجیب سی سنسنی سرایت کر چکی تھی۔ کس قدر عجیب اتفاق تھا کہ میرا بدترین دشمن، جس کی تلاش میں، میں ہر طرف سرگرداں تھا، اس جہاز پر میرا ہم سفر تھا۔ شاید قدرت کو مجھے اس سے یوں ملانا مقصود تھا جو مجھے اکانومی کلاس میں جگہ نہ مل سکی اور میں نے فرسٹ کلاس سے سفر کا فیصلہ کر لیا ورنہ سیکڑوں مسافروں کی بھیڑ میں نہ اسے میرا پتا چلتا، نہ میں اس کا سراغ پا سکتا تھا۔

شاید اے لٹو سے میری اس غیر متوقع ملاقات کا کچھ کریڈٹ ان دو خواتین کو بھی جاتا تھا جو میری سمت کی راہداری میں مجھ سے پہلے ٹوائلٹ خالی ہونے کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھیں۔

اس وقت میرا ذہن تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ فضائی قزاقی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں کے پیشِ نظر مسافروں کے لیے پرواز پر کسی بھی قسم کا اسلحہ لے جانا ناممکنات میں سے تھا اسی وجہ سے میں گھر سے غیر مسلح چلا تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ اے لٹو کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں رہا ہوگا لیکن میں لاہور کے ایک ہوٹل میں اس کے ہاتھوں تصویر کا انجام دیکھ چکا تھا، اس نے کوئی اسلحہ استعمال کیے بغیر کوئی سریع الاثر زہر آزما کر آناً فاناً میں تصویر کو یوں ہلاک کر دیا تھا کہ اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی قتل کی اس دلیرانہ واردات کا علم نہ ہو سکا تھا۔

اس تجربے کی بنا پر میں اے لٹو پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ غیر مسلح ہونے کے باوجود وہ میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اور محض اسی وجہ سے میں جسمانی طور پر خود کو اس سے الگ رکھنے کے لیے کوشاں تھا۔

"گھر پر اتنا ناز اچھا نہیں ہوتا، جل جائے تو بس خاک کا ایک ڈھیر رہ جاتا ہے۔" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی چمکتی ہوئی تیز نگاہیں مسلسل میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"تم گھر میں نہیں تو کیا کسی یتیم خانے میں ٹھہرو گے؟" میں نے بھی زہریلے لہجے میں کہا۔

"مرچیں چبا رہے ہو۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔ "اب مل ہی گئے ہو تو بیٹھ کر باتیں کریں گے، پہلے ہلکے ہو آؤ۔"

"سیٹ نمبر کیا ہے؟"

"یاد نہیں۔ وہ کھڑکی کے ساتھ والی خالی نشست میری

ہی ہے۔" اس نے کیبن کے ایک سرے کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا۔

میں اس کے قریب سے گزر کر ٹوائلٹ میں داخل ہوگیا۔

وہ صورتِ حال میرے لیے بہت عجیب اور ڈرامائی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے تھے لیکن اس وقت دونوں ہی غیر مسلح تھے اور دورانِ پرواز یا لینڈنگ کے بعد بھی طیارے پر ایک دوسرے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے' زیادہ سے زیادہ سلگتے ہوئے الفاظ کی سرد جنگ لڑ سکتے تھے۔

خاص بات یہ تھی کہ نہ اسے میرے ٹھکانے کا علم تھا نہ میں اس کی کمین گاہ سے واقف تھا۔ لہٰذا دونوں میں سے کوئی بھی اس اتفاقی ملاقات کو رائیگاں نہ جانے دیتا۔ آثار بتا رہے تھے کہ ہمارے درمیان اصل مقابلہ طیارہ چھوڑنے کے بعد ہی شروع ہوگا اور اس میں وہی کامیاب رہے گا جو سرد جنگ میں اپنے اعصاب پر قابو رکھ سکے۔

ٹوائلٹ میں جاتے ہوئے میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اے ٹو کے برابر والی نشست خالی نہیں تھی بلکہ اس پر کوئی ادھیڑ عمر عورت براجمان تھی، میرا خیال تھا کہ اے ٹو اسے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا اور دورانِ پرواز ہماری تفصیلی گفتگو کی نوبت نہ آسکے گی لیکن میں ٹوائلٹ سے باہر نکلا تو غیر ارادی طور پر میری نگاہیں اسی سمت میں اٹھ گئیں۔ اے ٹو پہلے سے اسی طرف نگراں تھا۔ مجھے برآمد ہوتے دیکھ کر اس نے ہاتھ کا اشارا کیا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے برابر والی نشست خالی ہو چکی تھی اور اس پر براجمان عورت کا کہیں پتا نہیں تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی تمھاری ہی ساتھی ہے۔" میں نے اے ٹو کے برابر میں خالی نشست سنبھالتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ تم اتنی آسانی سے میرے لیے نشست خالی کرا سکو گے۔"

"نشست تو معمولی چیز ہے' میرے ایک اشارے پر روح جسم کا ٹھکانا چھوڑ دیتی ہے۔" وہ دھیمے اور تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔ "تمھارے کچھ ستارے ہی عروج پر ہیں کہ اب تک زندہ ہو اور اس وقت مجھ سے ہم کلام ہو کر میرے سینے پر مونگ دل رہے ہو۔ ورنہ میرے باغی کبھی اگلے دن کا سورج نہیں دیکھ سکے۔"

"آسمان پر ابر آجاتا ہوگا۔" میں نے ترکی بہ ترکی اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ "لیکن آج کل مطلع صاف ہے، مجھے سورج دیکھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی... نہیں... اپنے ہاتھوں کو جیبوں تک لے جانے کی کوشش نہ کرو' اس وقت میں طیارے میں تنہا نہیں ہوں' مجھے ذرا بھی کوئی غیر معمولی صورتِ حال پیش آئی تو میرے تین محافظ تمھاری جان کو جونک بن کر چمٹ جائیں گے اور تمھیں کہیں امان نہ مل سکے گی۔"

"میں جیب سے چیونگم نکال رہا تھا۔" وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "فکر نہ کرو' اب مل ہی گئے ہو تو اتمامِ حجت کیے بغیر تم کو ٹھکانے نہیں لگاؤں گا۔"

"میری طرف سے یہ صرف وارننگ تھی' میں دیکھ چکا ہوں کہ تصویر کو تم نے کس بزدلانہ انداز میں قتل کیا تھا۔ میرے لیے تم کوئی بے ہوش کرنے والی سوئی بھی برآمد کر سکتے ہو لیکن یہ یاد رکھنا کہ میرے تینوں محافظ میرے دشمن کی کھال کے جوتے پہننے پر تلے ہوئے ہیں۔ چلتے پھرتے تمھاری کوئی ایسی رگ دبائیں گے کہ تمھیں گھنٹوں ہوش نہ آسکے گا اور طیارہ لینڈ کرنے کے بعد وہ خود کو تمھارا شناسا ظاہر کر کے تمھیں چرٹیا گھر لے جائیں گے۔"

"لیکن تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"محض احتیاطاً۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم بے خبری میں میرے کسی معمولی ہرکارے کے ہاتھوں چوہے کی طرح مارے جاؤ' میں تم سے شایانِ شان سلوک کرنا چاہتا ہوں۔"

"آخر تم ہماری راہ میں کیوں مزاحم ہو رہے ہو؟" وہ یکلخت سنجیدہ ہوگیا۔

"مجبوری ہے۔" میں نے بے پروائی سے شانے اچکا کر کہا۔ "کبھی نہ کبھی تو آنکھ کھلنا ہی تھی' میری دانست میں تم دولت کی ہوس میں پورے معاشرے کو برباد کرنے پر تُل گئے ہو۔"

"معاشرہ۔" وہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔ "تم کس معاشرے کی بات کر رہے ہو' یہاں تو ہر طرف جنگل کا قانون رائج ہے۔ زبردست چھائے ہوئے ہیں' زیر دست کچلے جا رہے ہیں۔ ہر ایک خود غرضی میں مبتلا ہے۔ تم کس کس سے جنگ کرو گے؟ پھر یہ کیوں بھول رہے ہو کہ اسی جنگل کے قانون سے برسوں فائدہ اٹھانے کے بعد تم اس قابل ہوئے ہو کہ آج میرے سامنے ہرزہ سرائی کر رہے ہو۔ میں تمھیں بروقت سہارا نہ دیتا تو آج تم کسی سڑے ہوئے جیل خانے میں جیب تراشی کے جرم میں سزا بھگت رہے ہوتے۔"

"وہ قید میرے لیے راحت ہوتی' سزا تو یہ ہے جو اب بھگت رہا ہوں۔"

"جزا اور سزا کے پیمانے انسان کے اپنے مقرر کیے ہوئے ہیں' بات صرف اتنی سی ہے کہ جب تم ننگے اور بھوکے تھے تو تمھیں ہر قیمت پر پیسے کی تلاش تھی جو اس دور میں کامیابی کی کلید ہے۔" وہ تلخ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "پیسے سے رشتے سمیت اس دنیا کی ہر چیز خریدی جا سکتی ہے پھر جب تم نے اس کھیل میں اپنی حیثیت بنالی تو حلق تک پیٹ بھر لینے کے بعد تمھیں وعظ سوجھ رہا ہے۔"

"وعظ نہیں سُوجھ رہا' یہ کھلے کھلے حقائق ہیں' اگر میں پہلے انھیں نظر انداز کرتا رہا تو یہ میری کمینگی تھی اور اگر اب محسوس کرنے لگا ہوں تو اس میں میرے لیے کوئی اعزاز نہیں ہے' تم ہمیشہ سے چور اور بدمعاش تھے جو آج بھی ہو۔"

"تو تم مجھے اور میری تنظیم کو ختم کرنا چاہتے ہو؟" اس نے اپنی آنکھیں سکوڑ کر مجھے گھورتے ہوئے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"کوشش تو یہی ہے۔" میں نے بلا تامل جواب دیا جسے سن کر اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

"تمھاری کوشش تو رہی ایک طرف لیکن دیکھنا یہ ہوگا کہ اب تم اور طیارے میں موجود تمھارے ساتھی کیسے بچ سکیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ آج یہ قصّہ ہمیشہ کے لیے نمٹ جائے۔"

"اندازہ میرا بھی یہی ہے۔" میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اگر وقت نے ہمیں ایک پرواز پر یوں اکٹھا کر دیا ہے تو کچھ نہ کچھ ہو کر ہی رہے گا۔"

ہم دونوں کی وہ تمام گفتگو دھیمی سرگوشیانہ آوازوں میں ہو رہی تھی۔ میں بظاہر اس کے ساتھ بے پروایانہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا لیکن اسے محسوس کرنے کا موقع دیے بغیر اس کی ہر حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس سے تو میں نے کہہ ڈالا تھا کہ جہاز پر میرے ساتھ میرے کچھ محافظ بھی سفر کر رہے تھے۔ اس کا مقصد اسے کسی جارحانہ اقدام سے باز رکھنا تھا لیکن یہ میں ہی جانتا تھا کہ اگر وہ کچھ کر ہی گزرا تو میں اپنی تمام تر زبانی دلیری کے باوجود اس کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ جاؤں گا۔

"سماجی انصاف اور معاشرے کی فلاح کے نعرے سیاسی شخصیتوں کو زیب دیتے ہیں۔" وہ دھیمے' ناصحانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اور ان کا مقصد صرف ہجوموں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ تمھاری زبان سے یہ باتیں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں' میرا اندازہ ہے کہ تمھارے باغیانہ رویے کی تہ میں کوئی اور بات کارفرما ہے جو میں جاننا چاہتا ہوں۔ اگر تمھارے کچھ بڑھتے ہوئے مالی مطالبات ہیں تو میں ان پر بھی غور کر سکتا ہوں۔ تمھاری تربیت پر بہت وقت صرف ہوا ہے' تمھیں راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرتے ہوئے مجھے خاصا قلق ہوگا۔"

"حالانکہ یہ فیصلہ تم کر چکے ہو۔"

"ابھی نہیں۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ ملاقات نہ ہوتی تو میں واقعی فیصلہ کر چکا تھا' اب مل گئے ہو تو تمھیں مصالحت کا ایک فراخدلانہ موقع فراہم کرنا چاہتا ہوں۔"

"تاکہ بعد میں موقع پا کر میرا پتّا صاف کر سکو۔"

"وہم اور غلط فہمی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ تم بھی کوئی شیر خوار بچّے نہیں ہو کہ محتاط نہ رہو گے۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"میری بد دلی کی ابتدا ہیروئن کے تباہ کن اثرات دیکھنے کے بعد ہوئی تھی لیکن اب تمھارا دامن تصویر کے خون سے آلودہ ہے' اس کی ماں لاپتا ہے۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ وہ ضعیف عورت میری بھی ماں ہے' اسے میرے حوالے کر دو پھر میں دیکھوں گا کہ کون سا اقدام بہتر ہوگا۔ رہا پیسہ تو تم جانتے ہو کہ میرے پاس اس کی کمی نہیں ہے۔"

"پھر طفیل سے تیس لاکھ طلب کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟"

"اس طرح میں اسے اور تم کو اپنی بالادستی کا احساس دلانا چاہتا تھا۔"

"اور تم نے دیکھ لیا کہ میں ان حربوں سے مرعوب نہیں ہوسکتا۔"

"تم اصل موضوع سے ہٹ رہے ہو' میں بڑھی ماں کی بازیابی کی بات کر رہا تھا۔"

"مجھے شروع سے معلوم تھا کہ تم تصویر کے سوتیلے بھائی ہو۔" وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا۔ "اور ماضی میں تمھارے درمیان بدترین تلخیاں کارفرما رہی ہیں' میرے لیے تمھارا یہ مطالبہ ناقابلِ فہم ہے۔"

"تمھارے لیے وہ عورت ناکارہ ہے' اگر وہ زندہ ہے تو اسے میرے حوالے کر دو۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں تمھاری فطرت کو خوب سمجھ چکا ہوں' تمھیں کسی کارآمد آدمی کی افادیت میں بھی کمی محسوس ہوتی ہے تو تم اسے راستے سے ہٹا دیتے ہو پھر تصویر کے بعد اس کی ماں کا تمھارے لیے کوئی مصرف نہیں تھا' غالب امکان یہی ہے کہ تم نے سفاکانہ انداز میں اسے بھی ہلاک کر دیا ہوگا۔"

"جب اس حد تک اندازے قائم کر لیتے ہو تو مجھ سے یہ مطالبہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟"

"ذہن کے کسی گوشے میں ذرا سی خوش فہمی باقی ہے' تمھاری زبان سے حقیقت سُننا چاہتا ہوں۔"

"تمھارا مطالبہ میرے لیے ناقابلِ قبول ہے' اس عورت کو کسی قیمت پر تمھارے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔"

"اس لیے کہ وہ زندہ ہی نہیں ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"جو چاہو سمجھ لو۔" اس نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔ "میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"پھر ہمارے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہوسکتی۔" میں نے دو ٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اب ہمارے درمیان مستقبل ہی کوئی فیصلہ صادر کرے گا۔"

"کراچی میں تمھارا کہاں قیام ہوگا؟" اس نے سرسری لہجے میں سوال کیا۔

میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تیر گئی۔ "تمھیں ضرور بتاؤں گا۔ ہر لمحے مجھے اب قرب وجوار ہی میں پاؤ گے۔ میں نظر نہ بھی آیا تو میری موجودگی کی علامات ملتی رہیں گی۔"

وہ ہنس پڑا اور اس کے چہرے پر مجھے درندگی سی تیرتی نظر آئی۔ "محافظوں کے ساتھ سفر کرنے کے باوجود اس قدر خائف ہو۔ میں تم سے مذاکرات کا ایک فیصلہ کن راؤنڈ کرنا چاہتا تھا۔"

"اپنا پتا اور وقت بتا دو، میں خود رجوع کر لوں گا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"تمھارے ساتھ سامان تو نہیں ہے؟" باتوں کی روانی میں وہ اچانک ہی سوال کر بیٹھا۔

"کافی سامان ہے۔" میں نے بے ساختہ جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کے لیے فاضل کرایہ بھی ادا کرنا پڑا ہے، اس بات سے تمھارا کیا تعلق نکل آیا؟"

میں نے دیکھا کہ میرے جواب پر اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر پھیل گئی۔ "ایسے ہی پوچھ لیا تھا، میرے ساتھ بھی سامان ہے، جہاز سے اترنے کے بعد لاؤنج میں بھی ہماری گفتگو جاری رہ سکے گی۔"

"اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی، تم میری اکلوتی شرط کو مسترد کر چکے ہو۔"

"احمقانہ بات ہے۔" وہ فضا میں ہاتھ لہراتے ہوئے بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "میں برابری کے اصول کا قائل ہوں، پیشگی شرائط کو تسلیم کرنا میرے لیے ناممکن ہوگا۔ ہاں، گفتگو کے دوران میں اس پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔"

میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ وہ کہاں جھوٹ بول رہا تھا۔ مذاکرات اور گفتگو کے حیلے تراش کر وہ مجھے الجھانا چاہ رہا تھا تاکہ کراچی میں اترنے کے بعد موقع پا کر مجھ پر کوئی کاری وار کر سکے لیکن میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ میرے ذہن میں اپنے بچاؤ کی واضح حکمتِ عملی جنم لے چکی تھی جس کی کامیابی کا تمام تر دار و مدار پہل پر تھا۔

"میں تم پر ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تم سے تصادم مول لینے کا فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا اور میری بیشتر معلومات کا نچوڑ تحریری صورت میں محفوظ ہے، اگر میرے ساتھ غیر معمولی حالات پیش آئے تو وہ تحریری معلومات بلا تاخیر متعلقہ حکام تک پہنچا دی جائیں گی۔ میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا تمھارے لیے اتنا آسان نہیں ہوگا۔"

"میں یہ سب سمجھتا ہوں۔" وہ بے اعتباری کے ساتھ بولا۔ "اپنی چمڑی محفوظ رکھنے کے لیے تمھیں ایسی کہانیاں تراشنے کا پورا حق ہے لیکن میرے لیے ان پر اعتبار کرنا کوئی زیادہ ضروری نہیں ہے۔" لحظہ بھر کے لیے خاموش ہو کر اس نے میری طرف دیکھا پھر بولا۔ "تم جانتے ہی کیا ہو جو کسی کو کچھ بتا سکو گے؟ جو مُہرے تمھاری نگاہوں میں آگئے تھے، وہ پہلے ہی بساط سے ہٹ چکے ہیں۔"

"کن مُہروں کی بات کر رہے ہو؟"

"بہتیرے نام ہیں۔" وہ لاپروایانہ لہجے میں بولا۔ "سکندر، قاسم، تصویر، طفیل، اس کے حواری۔ چاہو تو ڈیوڈ اور کارویلو کے نام بھی اس فہرست میں شامل کر لو۔"

"لیکن تم اے لٹو، جی لائیڈ، رخشی، جہانگیر، لائیڈز کاٹج اور جیوا ہاؤز کو بھول رہے ہو۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں اسے یاد دلایا۔

"جیوا ہاؤز آگ لگنے کے بعد ایک بھولی بسری کہانی بن گیا ہے، میرے بارے میں تم جو کچھ جانتے ہو، وہ بہت ناکافی ہے۔ رخشی اور جہانگیر کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ رہا لائیڈز کاٹج تو وہ حکام کے لیے شجرِ ممنوعہ ثابت ہوگا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ جی لائیڈ کا نام تم کہاں سے کھود لائے؟"

"میرے پاس کچھ اور بھی پردہ نشینوں کے نام ہیں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا اور اس بار وہ بے ساختہ چونک پڑا۔

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"سب کچھ بتا دیا تو میرے پاس کیا رہ جائے گا۔" میں نے اس کے تجسس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے مُہروں کی بات کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہو کہ تمھارے بڑوں کے سامنے تمھاری کیا حیثیت ہے۔"

"شاید تصویر کی ہلاکت نے تمھارے ذہن پر کچھ بُرے اثرات مرتب کیے ہیں، سنبھلو گے تو قاعدے کی باتیں کرنے لگو گے۔" اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ مار کر اپنی دانست میں میری بات اڑاتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے وہ خاتون آموجود ہوئی جسے اٹھا کر اے لٹو نے ...یے جگہ بنائی تھی۔ میں نے نشست چھوڑ دی، اے لٹو ...ے ساتھ ہی سیٹ چھوڑ کر باہر راہداری میں آگیا۔ دروازے کے پاس کریو سیٹ کے قریب وہ پھر رک گیا، ...نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میری گفتگو نے اسے کچھ مضطرب ...کر دیا تھا۔

"اب کیا چاہتے ہو؟" اسے خاموش پا کر میں نے لٹو کا۔ ...ں کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا، اس کا داہنا ہاتھ جیب ...تھا۔ لہٰذا میں اس سے ذرا دور ہی کھڑا ہوا تھا۔

"جہانگیر کی وساطت سے تمھیں میرا پیغام ملے گا۔" اس نے ...گی کے ساتھ کہا۔ "لیکن میں بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتا، امید ہے ...تم تنہا ہی ملنے کے لیے آؤ گے۔"

وہ بہت مکار تھا، ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش ...کر رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کی غلط فہمی رفع کر دی۔ "جہانگیر کا ...نام نہ لو تو بہتر ہے، تمھارے چکر میں میں اس کی دوستی سے بھی ہاتھ ...دھو بیٹھا ہوں، شہر میں وہ میرا متلاشی ضرور ہے لیکن میرے ٹھکانوں ...ے قطعی بے خبر ہے، اسے بھنک بھی مل گئی تو مجھ پر چڑھ دوڑے گا۔"

"پھر رابطے کی کیا صورت ہوگی؟" اس نے براہِ راست میری ...آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"سب کچھ تم پر منحصر ہے۔" میں نے شانے اُچکا کر کہا۔ ...مجھے تو ابھی تک تمھارا اصل نام بھی معلوم نہیں ہوسکا۔"

"نام میں کیا رکھا ہے، چاہو تو توقیر ہی سمجھتے رہو۔ آخر اسی ...نام سے کئی دن تمھارا مہمان رہا ہوں۔"

اچانک طیارے کے پیجنگ سسٹم پر ایک نسوانی آواز گونجنے ...لگی۔ طیارہ اس وقت ایک ایئر پاکٹ سے گزر رہا تھا۔ مسافروں ...کو ہدایت کی جا رہی تھی کہ وہ اپنی اپنی نشستیں سنبھال کر تا اطلاعِ ...ثانی حفاظتی بیلٹ باندھے رہیں۔

وہ آگے بڑھا، اس کا داہنا ہاتھ جیب سے برآمد ہو چکا ...تھا۔ میں پھرتی کے ساتھ دور ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ...لمحے کے لیے غصے اور جھلاہٹ کے آثار نمودار ہوئے پھر وہ ...مسکرا دیا۔

"لاؤنج میں بات ہوگی۔" اس نے اپنی نشست کی طرف ...پلٹتے ہوئے کہا اور راستہ صاف ہونے پر میں اپنی نشست کی ...طرف بڑھ گیا۔

اے لٹو کے ساتھ گفتگو میں میں نے چند ہی منٹ گزارے ...تھے لیکن وہ عرصہ میرے لیے بے انتہا صبر آزما اور اعصاب شکن ...ثابت ہوا تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران میرے لیے ہر لمحہ سنسنی میں گزرا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے لیے ذاتی مفاد ہر چیز پر مقدم ہوتا ہے۔ اپنی ذات اور اپنے غیر قانونی کاروبار کو ہر قسم کے شبہات سے بالاتر رکھنے کے لیے وہ نہایت سنگدلی اور سفاکی کے ساتھ انسانی لہو سے ہولی کھیلنے کا عادی تھا۔ جب کہ میری ذات اس کے لیے کافی عرصے سے نقصانات کا سبب بن رہی تھی اور وہ مجھے مالی زک پہنچانے کے سوا کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ ان حالات میں اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کس وقت کیا حربہ آزما بیٹھے۔

اس سے گفتگو میں اس کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ نہیں ہوسکا تھا لیکن اس نے ڈیوڈ کے ساتھ کارویلو کا نام جس انداز میں لیا تھا، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اولڈ ڈارلنگ کا اصل نام تھا جو دھوکے میں میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ دوسری طرف وہ میری زبان سے جی لائیڈ کا نام سن کر چونکا تھا لیکن میں اس موضوع پر زیادہ نشتر زنی نہ کر سکا تھا۔ اسی ضمن میں جب میں نے کچھ پردہ نشینوں کا حوالہ دیا تو وہ اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ یہ سب کڑیاں ایک ہی سمت میں نشاندہی کر رہی تھیں کہ تنظیم اے لٹو کی ذات پر ختم نہیں ہو جاتی تھی بلکہ وہ شاید حقیقی تنظیم کا پہلا مُہرہ تھا۔

اس نے جس انداز میں مجھ سے میرے اسباب کے بارے میں سوال کیا تھا، اس سے میں اے لٹو کی نیّت بھانپ چکا تھا۔ اگر میرے پاس سامان ہوتا تو طیارہ چھوڑنے کے بعد مجھے سامان کے انتظار میں رکنا پڑتا۔ اس دوران میں وہ مجھے گھیرنے کا کوئی منصوبہ بنا سکتا تھا۔ یہ امکان بھی تھا کہ کراچی ایئرپورٹ پر اس کا کوئی گُرگا موجود ہوتا اور وہ اسے میرے پیچھے لگا دیتا۔

جہاز بدستور ائر پاکٹ میں سے گزر رہا تھا اور اسے جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس دوران ائر ہوسٹس دو بار میری طرف سے گزری تھی تاکہ یہ دیکھ سکے کہ ہدایت کے مطابق تمام مسافروں نے حفاظتی بند باندھ لیے ہیں لیکن دونوں بار میں اسے غوطہ دینے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے نشست سے منسلک بیلٹ کے دونوں بکل ایک دوسرے سے ملا کر یوں ہاتھوں کے نیچے چھپا لیے تھے کہ بادی النظر میں وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نظر آرہے تھے لیکن حقیقتاً میں بیلٹ کی گرفت سے پوری طرح آزاد تھا۔

اس کے ساتھ میں بار بار جھک کر پوری راہداری کے عقبی حصے کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ اے لٹو سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ جہاز کی لینڈنگ کا انتظار کیے بغیر دورانِ پرواز ہی میرا کام تمام کر ڈالنے پر تل جائے۔ جہاز ائر پاکٹ سے گزر رہا تھا، تمام مسافر اپنی نشستوں پر حفاظتی بند باندھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے

میں اے لٹو اگر ٹوائلٹ وغیرہ کی شدید ضرورت کا اظہار کر کے سیٹ چھوڑ دیتا تو پرواز کے حفاظتی ضابطوں کے مطابق اسے روک دینے کا پورا اختیار ہونے کے باوجود جہاز کے عملے کا کوئی فرد اخلاقاً اسے سختی سے روکنے کی کوشش نہ کرتا اور وہ پیچھے سے آکر میرے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بازو میں کوئی زہریلی سوئی وغیرہ گھونپتا ہوا آگے نکل جاتا تو بلیٹ باندھ لینے کی صورت میں شاید مجھے اپنی نشست سے اٹھنے کا موقع بھی نہ ملتا اسی لیے میں پوری طرح چوکنا اور آزاد بیٹھا ہوا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ میرا ذہن بھی کام کرنے میں مصروف تھا۔ اس سے دوبدو ملاقات کے باوجود میں اس کا نام معلوم نہیں کر سکا تھا اور اس دور میں پروازوں اور ان سے سفر کرنے والے فضائی مسافروں کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ محض پرواز نمبر کے حوالے سے کسی مخصوص مسافر کا نام معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ حادثوں کی صورت میں بھی مختلف مقامات سے سوار ہونے والے مسافروں کے فلائٹ کوپن کے اندراجات کے ذریعے نام جمع کرنے میں خاصا وقت لگ جاتا تھا چہ جائیکہ یوں بھی ہوتا تھا کہ زید کے نام پر بنے ہوئے ٹکٹ پر سفر کرنے والا بکر ثابت ہوتا تھا اور یہ خرابی اندرون ملک پروازوں میں زیادہ عام تھی۔

لیکن پھر بھی میرے ذہن میں امید کی ایک کرن روشن تھی۔ میں اے لٹو کے کوٹ کی اوپری جیب میں ٹکٹ کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار فضائی مسافر تھا، مجھے یقین تھا کہ اس نے کسی دوسرے کے نام پر بنے ہوئے ٹکٹ پر سفر نہیں کیا ہوگا کیونکہ اس طرح کسی حادثے کے بعد انشورنس کلیم میں شدید دشواریاں پیدا ہو جاتی تھیں۔

میرے پاس ایک مختصر سے بریف کیس کے علاوہ کوئی سامان نہیں تھا۔ لہٰذا میں فیصلہ کر چکا تھا کہ طیارے سے اترتے وقت میں کسی نہ کسی طرح اے لٹو کے قریب رہوں گا اور اس کی جیب سے ٹکٹ اڑانے کی کوشش کروں گا تاکہ کم از کم اس کے اصل نام سے باخبر ہو سکوں۔

طیارہ دیوہیکل تھا لہٰذا جھٹکوں کا احساس بہت شدید نہیں تھا، سیٹ بیلٹ باندھنے کی ہدایات روشن ہی تھیں کہ تمباکو نوشوں کے لیے ممانعت کے احکام بھی روشن ہو گئے جس کا مطلب تھا کہ منزل قریب آ چکی تھی۔

میرے اعصاب پر چھایا ہوا تناؤ کچھ اور بڑھ گیا۔

دیوہیکل طیارے نے لینڈنگ سے قبل شہر پر ایک طویل چکر کاٹتے ہوئے بتدریج بلندی کم کی۔ گو میری نشست کھڑکی سے ملحق نہیں تھی لیکن طیارے کے بدلتے ہوئے زاویوں کے باعث سورج کی شفاف روشنی میں دمکتے ہوئے شہر کے آثار مجھے بھی نظر آ رہے تھے اور یہ سب اتنا دلفریب تھا کہ فضا سے میرے لیے اپنے شہر کو شناخت کرنا مشکل ہو گیا۔

وہ میرا پہلا فضائی سفر نہیں تھا۔ کراچی سے میں نے بارہا جہازوں میں سفر کیا تھا۔ جب تک تنظیم چرس فروشی پر انحصار کرتی رہی ہمیں اپنے کاموں کے لیے ٹرین کے پہلے درجے سے زیادہ سہولت حاصل نہیں تھی لیکن جب ہیروئن کا لین دین شروع ہوا تو اس بلند پرواز اور گراں قیمت جنس کے عوض مجھے دوسرے ساتھیوں سمیت طیاروں پر سفر کی اجازت مل گئی۔ اسی دوران میرا بیرونِ ملک بھی جانا ہوا لیکن فضا سے میں نے کبھی اپنے شہر کو یوں شناخت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی جس طرح اس بار کر رہا تھا۔

بل کھاتی ہوئی اور سیدھی سیاہ لکیروں کی طرح چمکتی ہوئی سڑکوں اور آباد و غیر آباد صنعتی و رہائشی علاقوں کا فضائی منظر دیکھ کر مجھے ان لوگوں پر غصہ آنے لگا جو کہتے ہیں کہ اس شہرِ خرابات کو کسی مناسب منصوبہ بندی کے بغیر مسلسل بڑھایا اور آباد کیا جا رہا ہے۔ اوپر سے پورا شہر مربعوں، مثلثوں، مستطیلوں اور تکونوں کا ایک حسین مجمع نظر آ رہا تھا۔

لیکن جیسے جیسے طیارہ نیچے آتا گیا، ان ریاضی اشکال کا فسوں تباہ ہوتا چلا گیا، ہر ہزار پانچ سو فٹ پر میرے غصے کی شدت میں کمی آتی چلی گئی اور جب میں نے طیارے کے اپروچ میں آ جانے کے بعد کھڑکی میں سے کچھ دور مُردہ خور گدھوں اور چیلوں کے ایک غول کو کسی مُردار یا کوڑے کے ڈھیر پر حملہ آور دیکھا تو واقعی منصوبہ سازوں پر دماغ کھول رہا تھا۔

شاید وہ سب ہی اونچی اڑان والے لوگ تھے، اپنے منصوبوں کو زمین پر رہ کر دیکھنے کے عادی نہیں تھے، بس اونچی فضاؤں میں اڑ کر طائرانہ نگاہوں سے دل خوش کر لیتے تھے کہ جو انھوں نے طے کر دیا، وہی اس شہر کو نگارِ وطن بنانے کے لیے بہترین اور موزوں ترین ہے جس سے بہتر کی تخلیق انسانی بساط سے شاید باہر ہے۔

کاش انھیں جہازوں کی دُم سے باندھ کر روم، ایتھنز، فرینکفرٹ، لندن حتیٰ کہ استنبول پر اڑانا ممکن ہو اور وہ دیکھ سکیں کہ شہر کیسے بسائے اور بڑھائے جاتے ہیں، جسے عروس البلاد کہا جاتا ہے، اسے بیوہ کی طرح کہیں اُجاڑا اور بکھیرا نہیں جاتا، سنوارا ہی جاتا ہے۔

جہاز کے پہیے رن وے سے لگنے کا ایک ہلکا سا احساس ہوا اور طیارہ کسی دم توڑتے ہوئے غضبناک درندے کی طرح دھاڑتا ہوا زمین پر دوڑنے لگا اور میرے ذہن سے سارے منصوبہ ساز یک بیک رخصت ہو گئے۔

میں نے مڑ کر راہداری میں دیکھا تو وہ ویران پڑی ہوئی تھی۔ اے لٹو میری توقع سے کہیں زیادہ کند ذہن ثابت ہوا تھا۔ طیارے کی رفتار میں لمحہ بہ لمحہ رونما ہونے والی کمی کا دباؤ اپنے سینے پر محسوس ہو رہا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ اگر طیارے کے اترتے ہوئے اس کے پہیے یا لینڈنگ گیئر ٹنوں کا بوجھ سنبھالنے سے انکار کر دیتے تو کیا ہوتا۔

وہی ہوتا جو کراچی جیسے شہرِ نگاراں میں ہو رہا ہے۔ منصوبہ ساز کسی گوشے سے پھر ابھر آئے۔

منصوبے بناتے ہیں بالکل کسی مکمل ایروڈائنامک طیارے کی طرح جو جب فضا میں پرواز کر رہا ہو تو ہر طرف سے گول مٹول، صاف ستھرا اور چکنا ہو تاکہ ہوا اس کی اڑان اور بلندی میں کم سے کم مزاحم ہو۔ ان کی منصوبہ سازی کا طیارہ اڑتا ہے اور اڑتا ہی رہتا ہے لیکن جب منصوبے کی پرواز مکمل ہوتی ہے، لینڈنگ کا وقت آتا ہے تو گیئر کھلنے سے انکار کر دیتے ہیں، منصوبہ پیندے کے بل گھسٹنے لگتا ہے، چنگاریاں اڑتی ہیں، آہ و فغاں مچتی ہے، اخبارات میں مراسلے چھپتے ہیں، متاثرین کے وفود اعلیٰ حکام سے ملتے ہیں اور پھر ایک دوسرا منصوبہ وجود میں آ جاتا ہے اور عموماً یہ ذیلی منصوبہ اصل منصوبے سے بڑا اور قیمتی ہوتا ہے کیونکہ دنیا دن بدن افراطِ زر کا شکار ہے، ہر چیز کی لاگت بڑھ رہی ہے۔ قرار بس کمیشن ہی کو ہے جو شروع سے وہی دو ڈھائی فیصد چلا آ رہا ہے مگر منصوبے پھر بھی بن رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے کریش لینڈنگ کرتے جا رہے ہیں۔

طیارے کی رفتار دم توڑ گئی، ائیرپورٹ کی عمارات نظر آنے لگیں، طیارہ رن وے پر کسی کاہل الوجود ملازم کی طرح رینگتا ہوا پارکنگ ایریا کی طرف بڑھنے لگا۔ مسافروں میں ہلچل سی مچ گئی۔ حفاظتی بند باندھے رکھنے کی ہدایت بدستور روشن تھی لیکن کیبن کی فضا ابھی بند کھلنے کی کھٹا کھٹ سے گونجنے لگی مگر جس نے بند باندھا ہی نہ ہو وہ کیا کھولتا۔ میں اپنا بریف کیس نکال کر راہداری میں نکل آیا۔ تاکہ اے لٹو کے نمودار ہوتے ہی دروازے کے قریب اس کے ساتھ ہو لوں۔

کراچی نہ دارالخلافہ رہا تھا، نہ زر داروں کا مرکز لیکن پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کہ ہر شہر سے آنے والی پروازیں بھری ہوئی ہوتی تھیں، اس میں نہ اکانومی کلاس کا استثنیٰ تھا، نہ اوّل درجے کا، وہی حال ریلوں کا تھا۔ طیارہ تھمنے سے پہلے ہی فرسٹ کلاس کے دروازے کے سامنے بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔

سیڑھی لگنے کے بعد دروازہ اوپر اٹھایا گیا تو مسافر یکے بعد دیگرے آگے بڑھنے لگے لیکن میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ چند ثانیوں بعد اے لٹو نظر آیا تو میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ بھی میری طرف سے غافل نہیں تھا، میری اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

"شاید میرا ہی انتظار کر رہے تھے تم؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ کئی مسافروں نے یوں چونک کر گردنیں گھما کر اسے دیکھا جیسے جہاز سے اترتے ہوئے اونچی آواز میں بولنا ممنوع رہا ہو۔

"کیوں نہ کرتا؟ مدت کے بعد ملے ہو، تمھاری تو زیارت بھی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آگے بڑھتے ہوئے اس نے اپنے آگے جگہ پیدا کرتے ہوئے مجھے اپنے گوشے سے پیشقدمی کی پیشکش کی تھی لیکن میری اُلجھن ایک عجلت پسند خاتون نے دور کر دی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سامان اٹھائے خالی جگہ میں گھس گئی اور میں اطمینان سے اے لٹو کے پیچھے ہو لیا۔

آخری چند سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں اور مجھے اپنے ہاتھ کی صفائی دکھانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ راستہ صاف دیکھ کر میں نے اچانک ہی کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اے لٹو کے آگے سیڑھیاں خالی تھیں لیکن وہ آہستہ آہستہ ہی اتر رہا تھا۔ مجھے گمان ہوا کہ شاید تصویر کے قتل کے بعد فرار ہوتے ہوئے وہ سلطان شاہ کی کسی گولی سے زخمی ہو گیا تھا جب ہی سیڑھیاں اترنے میں احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

اچانک میری داہنی ٹانگ حرکت میں آئی۔ اے لٹو کے حلق سے ایک بے ساختہ سی آواز نکلی، اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے ریلنگ پکڑنا چاہی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور اوندھے منہ نیچے جا پڑا۔

اس کے گر جانے کے بعد میں نے اسے سنبھالنے کی اداکاری کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا بریف کیس پکڑ لیا، وہ سر کے بل نیچے پہنچا تھا، گراؤنڈ پر کھڑا ہوا ائیرلائن کا عملہ اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔

میں تیزی سے سیڑھیاں عبور کرتا ہوا نیچے اترا اور رن وے پر سیڑھیوں کے قریب کھڑی ہوئی مائیکرو بس میں سوار ہو گیا۔ اے لٹو کا بریف کیس اٹھانے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے ہاتھوں میں بیک وقت دو بریف کیسز کی موجودگی ہر ایک کی نگاہوں میں مجھے مشتبہ بنا دے گی لہٰذا میں نے اپنا بریف کیس

سیڑھیوں پر ہی چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس میں میرے کپڑوں کے ایک جوڑے کے علاوہ ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی جس کی بنا پر میری شناخت ہو سکے۔

مائیکرو بس میں سوار ہوتے ہوتے میں نے یہ ضرور دیکھا تھا کہ اے ٹو کا چہرہ خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاید گرتے ہوئے المونیم کی سیڑھی کا کوئی کنارا اس کی پیشانی میں گھس گیا تھا۔

مجھے خوشی یہ تھی کہ اس کارروائی کے نتیجے میں مجھے مطلوبہ کامیابی حاصل ہو چکی تھی اور اے ٹو کو سہارا دینے کی اداکاری میں میں نے اس کے کوٹ کی اوپر والی جیب سے ٹکٹ نکال لیا تھا جو اس وقت میری تحویل میں تھا۔

عام حالات کی بات اور ہوتی ہے لیکن کسی حادثے کی صورت میں ائیر لائن کا ہر مسافر وی آئی پی بن جاتا ہے۔ پھر اے ٹو تو فرسٹ کلاس کا مسافر تھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر رن وے پر کھڑے ہوئے ائیر لائن کے عملے کو جوں ہی حادثے کے وقوع پذیر ہونے کا احساس ہوا وہاں کھلبلی سی مچ گئی۔

ہماری مائیکرو بس رینگتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور ائیر پورٹ کے کسی حصے سے ایمبولنس کے سائرن کی آواز آنے لگی۔ شاید ان میں سے کسی نے اپنے محدود حیطۂ عمل کے ٹرانسمیٹر پر ایمبولنس طلب کر لی تھی۔

اس وقت صرف میں ہی نہیں بلکہ مائیکرو بس کا ہر مسافر اے ٹو کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لیے بے چین تھا۔ لہٰذا میں بھی ندامت کے کسی احساس کے بغیر شیشوں سے طیارے کی طرف دیکھتا رہا۔

اے ٹو رن وے سے ٹکراتے ہی بوکھلائے ہوئے انداز میں اٹھا تھا، اس نے پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا پھر غالباً مجھے وہاں موجود نہ پا کر اس نے رینگتی ہوئی مائیکرو بس کی طرف دوڑنا چاہا تھا لیکن اسی لمحے ائیر لائن کے عملے اور مسافروں نے اسے گھیر لیا اور وہ میرا پیچھا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

راستے میں ایک ایمبولنس سائرن بجاتی ہوئی ہماری مائیکرو بس کے قریب سے گزر گئی۔ اس وقت مجھ پر عجیب سی وحشت اور گھبراہٹ طاری تھی، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ڈرائیور کے سر پر سوار ہو کر اسے تیز رفتاری پر مجبور کرتا تاکہ جلد از جلد ائیر پورٹ کی عمارت سے نکلنے کا موقع مل جاتا۔

میرا قیاس تھا کہ اے ٹو زخمی ہونے کے بعد مجھے گنوا کر ائیر پورٹ پر اپنا وقت برباد کرنا پسند نہیں کرے گا لیکن دوسری طرف اس کے زخم سے بہنے والی خون کی مقدار دیکھتے ہوئے ائیر لائن کا عملہ کسی بھی قیمت پر اسے طبی امداد دیے بغیر روانہ نہ ہونے دیتا کیونکہ بعد میں اس حادثے پر غفلت اور بے پروائی کا کوئی بھی اسکینڈل بن سکتا تھا۔

میرے لیے الجھن کی بات صرف ایک ہی تھی کہ اے ٹو کا بریف کیس میری تحویل میں تھا۔ طیارے کی سیڑھیوں پر تو میں نے دوسروں کو شبے کا موقع دیے بغیر اپنا بریف کیس چھوڑ کر اے ٹو کے بریف کیس پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اے ٹو اسے پہلی نظر میں ہی تاڑ گیا ہوگا۔ اس کا پہلا ردِعمل تو یہ ہوتا کہ وہ بریف کیس کی تبدیلی کا ذکر کیے بغیر جلد از جلد لاؤنج میں پہنچ کر مجھے پکڑنے کی کوشش کرتا لیکن میرے خیال میں اس کے زخمی ہونے کے باعث ایسے امکانات معدوم تھے۔ ائیر لائن کے زمینی عملے کو طبی امداد کی کوششوں سے روکنے کے لیے دوسرا ردِعمل یہ ہو سکتا تھا کہ وہ خطیر رقم یا قیمتی دستاویزات کے حوالے سے اپنے بریف کیس کی گمشدگی کا شور کھڑا کر دیتا اور ہر شخص کی توجہ اے ٹو کی پیشانی کے زخم سے ہٹ کر بریف کیس کی بازیابی پر مرکوز ہو جاتی۔

میں نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اے ٹو کا ٹکٹ نکالا تاکہ کسی ہنگامے کے آغاز سے قبل کم از کم اس کے مندرجات ہی دیکھ سکوں۔ وہ ٹکٹ دو دن پہلے راجہ ظہور احمد کے نام ائیر لائن کے لاہور سیلز آفس سے جاری ہوا تھا۔ نام کے آگے ہی حوالے کے لیے ایک فون نمبر درج تھا جو یقینی طور پر لاہور ہی کا ہونا چاہیے تھا۔

مائیکرو بس لاؤنج کے رن وے کی طرف کھلنے والے دروازے پر رک گئی۔ میں نے وہ ٹکٹ جلدی سے جیب میں اڑس لیا لیکن میں یہ دیکھ چکا تھا کہ اس پر دو بیگیج ٹیگ لگے ہوئے تھے جس کا مطلب تھا کہ اے ٹو میری طرح خالی ہاتھ سفر نہیں کر رہا تھا بلکہ طیارے کے کارگو ہولڈ میں اس کا بھی سامان موجود تھا۔

لاؤنج کے دروازے پر ائیر پورٹ سیکیورٹی فورس کے دو مسلح جوان چاق و چوبند کھڑے ہوئے تھے، تیسرا ائیر لائن کے زمینی عملے کا کوئی رکن تھا جو ایک ائیر پیس کان اور دہانے کے قریب لگائے کسی سے گفتگو میں مصروف تھا۔

میرے لیے وہ مرحلہ فیصلہ کن تھا۔ میں اے ٹو کو کھلی زک پہنچا کر صاف نکل سکتا تھا اور اگر اس مرحلے پر دھر لیا جاتا تو اے ٹو کے ساتھ ہی قانون نافذ کرنے والے اداروں کی گرفت میں بھی آجاتا۔

نیچے اترتے ہوئے مائیکرو بس کے شیشے میں سے ایک منظر دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ بس سے اترنے والے مسافروں کو براہِ راست اندر داخلے کی اجازت دینے کے بجائے خلافِ معمول باہر ہی روک لیا گیا تھا اور ٹرانسمیٹر والا غالباً اس اقدام کی توجیہہ کر رہا تھا۔

میں نیچے آیا تو کسی کو مسافروں کے یوں روکے جانے کا سبب معلوم نہیں تھا۔ ٹرانسمیٹر والا برہم مسافروں کے سامنے بس دہرائے جا رہا تھا کہ چند منٹ بعد سب اندر جا سکیں گے۔

میرے لیے وقت بہت کم رہ گیا تھا، میرے کان ایمبولنس کے بجتے ہوئے سائرن پر جمے ہوئے تھے۔ وہ جس لمحے بھی زخمی اے ٹو کو لے کر وہاں آپہنچتی میری بازی الٹ جاتی۔

میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا، تنفس کی رفتار تیز ہو چکی تھی اور ہاتھ میں جھولتا ہوا بریف کیس یک بیک منوں وزنی محسوس ہونے لگا تھا لیکن اس کے باوجود میرا ذہن کسی کمپیوٹر کی طرح کام کر رہا تھا۔

گاڑی سے اتر کر میں ایک لحظہ کے لیے رکا پھر داخلی دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ لوگوں نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے مجھے راستہ دیا تھا لیکن ٹرانسمیٹر والا میرے راستے میں حائل ہو گیا۔

”بس چند منٹ جناب!“ وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا ”پھر آپ سب اندر جا سکیں گے، ہمیں آپ کی . . .“

”میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر رنگت اور تیکھے لہجے میں کہا ”پیشاب کر کے واپس آرہا ہوں۔“

اس کے چہرے پر مایوسی کی لہر پھیل گئی ”اگر آپ صرف دو منٹ رک سکیں . . .“

”بنیادی ضروریات تمہاری مرضی کی تابع نہیں ہو سکتیں۔“ میں نے بد دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ترش روئی سے کہا۔

”پھر اپنا شناختی کارڈ دیتے جائیں، واپسی پر لے لیں۔“ اس نے ندامت آمیز لہجے میں شرط عائد کر دی۔

”یہ رکھو۔“ میں نے چڑچڑے انداز میں جیب سے اے ٹو کا ٹکٹ نکال کر اسے تھما دیا۔

خالی ٹکٹ اس کے لیے بیکار تھا لہٰذا اس نے فوراً ہی ٹکٹ کھول کر دیکھا اور اندر چپکے ہوئے دو عدد بیگیج ٹیگ دیکھتے ہی معذرت کرتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔

اندر داخل ہو کر میں پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر تیر کی طرح سیدھا چلا گیا۔ شاید کچھ دیر پہلے ائیر پورٹ پر کوئی اور پرواز بھی اتری تھی کیونکہ لاؤنج میں مسافروں کا خاصا ہجوم تھا۔ میں اس بھیڑ میں شامل ہو کر سیدھا نکاسی کے راستے کی طرف ہو لیا۔

میں باہر نکلا ہی تھا کہ اچانک چھٹی حس سے متعلقہ میری گھنٹی کھڑک اٹھی۔ میں نے سر گھمایا تو ائیر پورٹ سیکیورٹی فورس کا ایک جوان مسافروں کی بھیڑ سے بچتا ہوا مجھے اپنے پیچھے بھاگتا ہوا نظر آیا۔

اسے یوں دوڑتے دیکھ کر وہاں سامان کے انتظار میں موجود مسافروں میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ائیر پورٹ سیکیورٹی فورس کی کارکردگی آئے دن خبروں کا موضوع بنتی رہتی تھی۔ کسٹم والوں سے لے کر ائیر لائن کے عملے تک کو یہ شکایت تھی کہ فورس کے بیشتر اراکین اسلحہ کے بل پر ان پر بالادستی جمانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ مجھ پر عقب سے فائر ہی نہ جھونک مارے، میں نے بھی اچانک ہی دوڑ لگا دی اور انتظار کرنے والوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا ٹریک عبور کر کے دوسری طرف نکل گیا، اتنی دیر میں تعاقب کرنے والا باہر آچکا تھا۔ میں ریلنگ پھلانگ کر پارکنگ ایریا میں داخل ہوا اور سب سے پہلے جو آباد گاڑی نظر آئی، اسی کی طرف بڑھ گیا۔

سفید مزدا کا ادھیڑ عمر ڈرائیور اپنی طرف کا دروازہ کھولے سگریٹ پی رہا تھا اور کار ریڈیو پر کرکٹ کمنٹری پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری تھی۔ میں نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر گریبان پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ بریف کیس سیٹ پر پھینک کر میں نے اگنیشن میں موجود چابی کو جنبش دی۔ لحظہ بھر کے لیے کمنٹری موقوف ہو گئی اور کار کا انجن غرا کر بیدار ہو گیا۔ چابی چھوڑتے ہی نہ صرف ریڈیو پر کمنٹری شروع ہو گئی بلکہ باہر ڈرائیور نے صورتِ حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے چلانا شروع کر دیا۔

میں نے گیئر ڈال کر کار تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھا دی۔ اسی وقت مجھے گاڑیوں کے درمیان دو تین باوردی اہلکار دوڑتے نظر آئے لیکن پارکنگ لاٹ میں گاڑیوں کی کثرت کے باعث انھیں صورتِ حال کا اندازہ لگانے یا کوئی کارروائی کرنے کی مہلت دینے سے پہلے ہی میں گاڑی باہر لیتا چلا گیا۔

گاڑی گھماتے ہوئے فضا میں یکے بعد دیگرے دو فائروں کی آواز گونجی لیکن میں فوری طور پر ہر خطرے کی زد سے باہر نکل چکا تھا۔ میں نے سفید مزدا تیز رفتاری کے ساتھ شہر جانے والے راستے پر ڈال دی۔

میں ائیر پورٹ سے تو بچ نکلا تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ معاملہ اتنی جلدی ختم نہیں ہوگا۔ مظلوم ڈرائیور کی کہانی سے واقف ہوتے ہی تعاقب اور سفید کار کی تلاش کی مہم کا آغاز کر دیا جائے گا۔

اسٹار گیٹ پر پہنچنے تک میں اپنے ذہن میں ایک واضح حکمتِ عملی مرتب کر چکا تھا۔ وہاں ٹریفک سگنل کی سرخ بتی نے

شہر کی طرف جانے والا ٹریفک رکا ہوا تھا لیکن مجھے ادھر جانا ہی نہیں تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ کار بائیں طرف گھمائی اور نیشنل ہائی وے پر لانڈھی کی طرف ہولیا۔

ڈرائیونگ کے ساتھ میری نظریں عقب نما آئینے پر بھی مرکوز تھیں لیکن پیچھے بظاہر میدان صاف نظر آرہا تھا۔

اچانک ریڈیو پر کمنٹریٹر پوری قوت سے حلق کے بل چیخا اور میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہک گئے۔ میں نے خفت آمیز جھلاہٹ کے ساتھ ریڈیو آف کر دیا۔

ملیر ہالٹ کے بارونق اسٹاپ پر میں نے کار بائیں طرف کچے میں اتار کر ایک طرف روک دی۔ انجن بند کر کے بریف کیس سنبھالا اور چابی اگنیشن میں چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ دروازہ مقفل کرنے کے بعد میں نے ایک پان والے سے سگریٹ کا پیکٹ خریدا اور سکون کے ساتھ سڑک عبور کر لی۔ اس دوران میں نے اسے ٹو کے بریف کیس سے ائرلائن کا ٹیگ پھاڑ دیا تھا۔

چند ثانیوں بعد جب میں شہر جانے والی برق رفتار منی بس میں سفر کر رہا تھا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں تھوڑی دیر پہلے کسی جہاز کے اوّل درجے کا مسافر تھا۔

منی بس میں سفر کا وہ میرا پہلا موقع تھا اور میرا خیال تھا کہ اگر اس میں صرف پروں کا اضافہ کر دیا جائے تو ڈرائیور اسی انجن کے سہارے بس کو فضا میں اڑانے کی پوری مہارت رکھتا تھا۔

بس اسٹار گیٹ کے اسٹاپ پر رکی تو وہاں مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ ٹریفک حسب معمول رواں تھا اچانک میری پسلیوں میں کوئی چیز چبھنے لگی۔ اس وقت میرے ذہن پر اے ٹو، ائرپورٹ سیکیورٹی فورس اور پولیس جیسے دشمن اپنے اسلحہ سمیت چھائے ہوئے تھے لہٰذا میرا ابھر کنا قطعی فطری تھا لیکن سر گھماتے ہی سارا ذہنی تناؤ کافور ہو گیا۔ میری پسلیوں میں چبھنے والی چیز کسی پستول کی نال نہیں تھی بلکہ کنڈیکٹر کی کہنی کی ہڈی تھی کیوں کہ وہ بس میں مسافروں کی تعداد پوری ہونے کے باوجود مزید کو للکار رہا تھا۔ اور میری طرف جھک کر ان لوگوں کو راستہ دے رہا تھا جو اس کا چیلنج قبول کر کے شاید دروازے پر حملہ آور ہو چکے تھے۔

کسی غنی کے دل سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن اس دن منی بس کی گنجائش دیکھ کر میرے ذہن میں غنی کے دل کا تصور ابھرا تھا جہاں ہر وقت گنجائش رہتی ہے۔

منی بس اسٹار گیٹ سے روانہ ہوئی تو اس میں صرف نشستوں کی حد تک سروں کی تعداد دگنی ہو گئی تھی جو بیٹھنے کی سعادت حاصل کرنے سے محروم رہ گئے تھے، نشستوں کے درمیان رہی سہی جگہ پر سر جھکائے، پشت دوہری کیے، سزا یافتوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے اور مزے کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی چہرہ شکن آلود نہیں تھا جیسے انھیں یوں ہی منی بسوں میں دوہرا ہو کر کھڑا ہونے کے لیے پیدا کیا گیا ہو۔ بس کے چلتے ہی کنڈیکٹر پچھلے پائیدان پر قدم جما کر کھلے ہوئے دروازے سے باہر جھول گیا تھا۔

اگر میں اس وقت اے ٹو کے پھندے سے بچ کر فرار نہ ہوا ہوتا تو میرے لیے اس رواں دواں عقوبت کدے میں ایک لمحہ بھی گزارنا دشوار ہوتا لیکن میں سکون سے بیٹھا سوچتا رہا۔ اس وقت وہ بس میرے لیے گوشۂ عافیت بنی ہوئی تھی۔

دوران پرواز اے ٹو کو شروع سے آخر تک مجھ پر ذہنی بالادستی حاصل رہی تھی جس کا اندازہ شاید اسے خود بھی ہو گیا تھا لیکن طیارے سے نکلتے ہی وہ بُری طرح میری زد میں آیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہوگا کہ میں یوں کھلے بندوں اس پر وار کر گزروں گا۔

اس کے ساتھ پیش آنے والی متوقع صورت حال کا تصور کر کے میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ زخم خوردہ حالت میں لاؤنج پہنچتے ہی جب اس نے باہر ٹارمک پر رکے ہوئے مسافروں میں مجھے موجود نہ پایا ہوگا تو بھنّا کر رہ گیا ہوگا پھر ائرلائن کے آدمی نے بتایا ہوگا کہ ایک مسافر بطور ضمانت اپنا ٹکٹ، بیگیج ٹیگ سمیت ضمانت کے طور پر اس کے پاس چھوڑ کر پیشاب کرنے اندر گیا ہوا ہے۔ ٹکٹ سامنے آتے ہی شاید اے ٹو نے اپنا سر پیٹ لیا ہوگا کیوں کہ وہ خود اسی کا ٹکٹ تھا۔

اس انکشاف کے بعد ہی وہاں میری تلاش شروع ہوئی ہو گی لیکن میں صاف نکل بھاگا تھا۔ اور اے ٹو معروف معنوں میں مظلوم ہونے کے باوجود ان کی تحویل میں تھا بجانے اس نے اپنے بریف کیس کی چوری کے بارے میں کیا کہانی تراشی تھی لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس عجیب و غریب واقعے کے نتیجے میں اے ٹو کی ذات تفتیش کرنے والوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی اور وہ لازمی طور پر الجھنوں سے دوچار ہو جاتا۔

نرسری کے اسٹاپ پر میں نے منی بس چھوڑ دی اور وہاں سے ٹیکسی میں غزالہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆

غزالہ اور اس کے باپ نے باہر لان ہی میں میرا استقبال کیا تھا۔ میں غزالہ کو پچھلی رات اپنی آمد کی اطلاع دے چکا تھا لہٰذا وہ دونوں لان پر کرسیاں ڈالے میری آمد کے منتظر تھے۔

"یہ کیا؟ خالی ہاتھ ہی چلے آرہے ہو، سامان کہاں ہے؟" کرنل زوار زیدی نے میرے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے حیرت کے ساتھ سوال کیا تھا۔

"اب تو بے سر و سامانی کا ہی عالم رہے گا کچھ دنوں۔" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔ "سامان ساتھ ہوتا تو آج گھر پہنچنا دشوار ہو جاتا۔"

ان کے استفسار پر میں نے مختصر الفاظ میں اپنی کہانی دہرا دی لیکن یہ نہ بتایا کہ دوران پرواز طیارے پر ٹکرانے والا کون تھا بس یہ کہہ دیا کہ وہ تنظیم کا ہی ایک کارندہ تھا جس کے نام سے ٹکٹ چرانے کے بعد ہی واقفیت ہوئی تھی۔

"بڑی خطرناک بات ہے۔" زوار زیدی نے مجھے لان میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بٹھلاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اب تو اس آدمی تک تمھاری رسائی ہو سکے گی، نام معلوم ہو گیا ہے پھر فون نمبر بھی ہے۔"

"شاید اتنا آسان بھی نہ ہو۔" میں نے کرنل کی آنکھ بچا کر غزالہ کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں میں رازداری کی اہمیت ہر بات سے زیادہ ہے، امکان یہی ہے کہ وہ کسی اور کے ٹکٹ پر سفر کر رہا ہوگا۔"

"چھوڑیے ڈیڈی یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، ذرا انھیں ابتدا ممی سے بھی ملنے دیں۔" غزالہ نے ہنستے ہوئے دخل اندازی کی اور ہم تینوں نے ہی بیک وقت کرسیاں چھوڑ دیں۔

"ارے ہاں! وہ نوکر کہاں ہے تمھارا؟" کرنل کو اٹھتے اٹھتے اچانک سلطان شاہ کا خیال آگیا۔

اس بار میں اس کے سوال کا برا ماننے کے بجائے انجان بن گیا۔ "کون نوکر؟ کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"ارے وہی... کیا نام ہے اس کا؟... ہاں سلطان شاہ۔" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"اس نے میری ملازمت ترک کر دی ہے اور اپنی جاگیر چلا گیا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"جاگیر؟" کرنل حیرت سے تقریباً چیخ پڑا۔ "اس کے پاس جاگیر کہاں سے آگئی؟"

"سنا ہے کہ شمال میں اس کے پاس کئی سو ایکڑ زرعی زمین ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"بکواس، سراسر بکواس!" وہ بے اعتباری سے بڑبڑایا۔ "یہ ممکن ہی نہیں سکتا۔ اس نے تمھیں دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے۔ اسی پیسے سے زمین خرید کر اب بڑا جاگیردار بن بیٹھا ہے۔"

میں نے کسی ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور وہ ڈرائنگ روم پہنچنے تک مسلسل اسی موضوع پر بولتا رہا۔

غزالہ کی ماں اپنے بال سمیٹے ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر براجمان تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے زردی مائل سفید چہرے پر تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ بے رونق آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ پھر وہیں مجھے پتا چلا کہ کامران کی حالت بتدریج سنبھل رہی تھی۔ ماضی کی یادیں ابھی تک اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں سوئی ہوئی تھیں لیکن وہ اسپتال کے عملے کو ناموں سے شناخت کرنے لگا تھا۔ اس بارے میں شمع میری بہت ممنون تھی۔

وہاں گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا کہ کرنل فوری طور پر میرا پیچھا چھوڑنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ بار بار اس کی نگاہیں میرے قدموں میں رکھے ہوئے بریف کیس پر مرکوز ہو جاتی تھیں لیکن وہ نجانے کیا سوچ کر خاموش تھا۔

پھر جب گفتگو کی تکان پسینے کی ننھی ننھی بوندوں کی صورت میں شمع کی پیشانی اور اوپر ہونٹ پر چمکنے لگی تو غزالہ اپنی ماں کو سہارا دے کر اس کی خواب گاہ کی طرف لے گئی۔ ان دونوں کے جاتے ہی کرنل کو گویا میدان خالی مل گیا اور وہ لپک کر میرے برابر میں آبیٹھا۔

"بریف کیس تو کھولو۔ اسی سے پتا چلے گا کہ وہ کون تھا اور کس چکر میں تھا۔" اس نے مجھے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے حکم دیا۔

"ان لوگوں کے ایک بارودی بریف کیس کی تباہ کاری میں دیکھ چکا ہوں اس لیے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اگر میرا اندیشہ درست ہے تو زبردستی کرنے کی صورت میں یہ بریف کیس ہولناک دھماکے سے پھٹے گا اور ہم دونوں کے چیتھڑے بھی نہ مل سکیں گے فی الحال اسے بھولے رہنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔"

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟" اس نے سوال کیا اور میں اندر ہی اندر سلگ کر رہ گیا۔ اس کے رویے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں کسی معاہدے کے تحت اس کے ساتھ کام کرنے کا پابند ہوں۔

"آرام کروں گا۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لاہور میں مسلسل بھاگ دوڑ سے تھک گیا ہوں۔"

"پھر میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے ناصحانہ لہجے میں بولا "میری ضرورت محسوس ہو تو بلا تکلف بلا لینا۔"

"خدا نہ کرے کہ تمھاری ضرورت پڑے۔" میں نے دل ہی دل میں کہا اور گلو خلاصی کی خوشی میں مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"اس کی عادتیں بگڑ چکی ہیں۔" کرنل نے جاتے جاتے ایک مرتبہ پھر اپنے دل کا غبار اگلنا شروع کر دیا۔ "مجھے پورا سا

یقین ہے کہ وہ چوری کے مال سے خریدی ہوئی جائداد کا انتظام اپنے کسی رشتے دار کے سپرد کر کے پھر تمہارے پاس آئے گا تاکہ سال دو سال میں مزید پیسہ نچوڑ سکے لیکن تم اسے قریب نہ پھٹکنے دینا اب۔"

"بہت بہتر۔" میں نے بات ختم کرنے کی نیت سے سعادت مندانہ انداز میں کہا۔ اور وہ کمرے سے چلا گیا۔ میں بریف کیس سنبھال کر اپنے کمرے کی طرف ہو لیا جہاں حسب توقع غزالہ میری منتظر تھی۔

"کون تھا وہ؟" غزالہ نے سامنا ہوتے ہی سوال کیا۔ "شاید آپ ڈیڈی کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کر رہے تھے۔"

"اسے لو بذات خود تھا۔ اگر ٹکٹ اس ہی کا تھا تو اس کا نام راجہ ظہور احمد ہے۔"

"آپ نے کیسے پہچانا اس کو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں نہ پہچانتا، وہ کئی دن تک توقیر کے نام سے میرا مہمان رہا تھا۔"

"اوہ! تو یہ ثابت ہو گیا کہ وہی اسے لو تھا؟" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

"وہی اسے لو تھا اور ابھی میں کھوج نکال لوں گا کہ ظہور کس کا نام ہے۔"

"میرے لیے کس خطرے کی نشاندہی کی تھی کل آپ نے؟" اس نے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا اور میرے وجود میں تازگی کی ایک لہر سی سرایت کر گئی۔

اکثر و بیشتر انسان اپنی روزمرہ مصروفیات میں الجھ کر یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے اپنے طرز عمل کا انحصار بڑی حد تک دوسروں کے رویے پر ہوتا ہے اور جن حسین چہروں اور ناز پرور لوگوں کو چاہا جاتا ہے، ان کے مزاج کی معمولی تبدیلیاں بھی حیرت انگیز ردعمل پیدا کرتی ہیں۔ شاید مرد اور عورت کے آفاقی تعلق میں خوب صورتی سے زیادہ خوش مزاجی کا پرچار اسی لیے ملتا ہے۔

غزالہ میری تھی۔ میرے اور اس کے درمیان چاہت کا بہت قریبی اور نازک سا تعلق پروان چڑھ رہا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لیے اپنانے کا عہد کر کے گویا صرف اس چاہت کا اقرار کیا تھا۔ اس کچے رشتے کی مضبوطی کا یہ عالم تھا کہ اس کے ابرو و مژگاں کی جنبشیں میرے احساس کی گہرائیوں کو چھیڑنے لگی تھیں۔ اس لمحے سے پہلے ہجر اور وصل کے بارے میں کہے ہوئے تمام اشعار مجھے شاعروں کے معمولی تجربے کا نتیجہ معلوم ہوتے تھے لیکن اس ایک لمحے میں مجھے ان کی سچائی پر اعتبار آ گیا اور ان سب میں صرف ایک مصرعہ ہی پورے پورے دیوان پر کافی تھا جس میں وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ جیسی حقیقت سمو کر کوزے میں دریا بند کر دیا تھا۔

جب لگے بندھے باوقار رویے میں کوئی بہت شوخ تبدیلی رونما ہو تو حیرت ہوا ہی کرتی ہے لیکن غزالہ کھل کر حیرت کا اظہار بھی نہ کر سکی اور میرے جواب نے اس کا چہرہ گلنار کر دیا۔

میں زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں نہ جانے کب سے تنہا دوڑ رہا تھا اور جب اس جانگسل جدوجہد میں غزالہ جیسی حیات افروز لڑکی کا ساتھ میسر آیا تو اب لے لو اور اس کے خونخوار ہرکارے ہمارے لہو کے پیاسے ہو رہے تھے۔ مجھے ایک روز پہلے اس کے کسی تنخواہ دار نے کراچی میں مطلوبہ لڑکی کا سراغ ملنے کی خبر دی تھی اور آج اسے لو کراچی پہنچا تھا۔ میرا قیاس کہہ رہا تھا کہ آپریشن پر دی جانے والی اطلاع کسی قدر بھی بے بنیاد رہی ہو لیکن اسے لو کی کراچی آمد خالی از علت نہیں تھی۔ شہر میں یقینی طور پر کچھ نہ کچھ ہونے والا تھا۔

"لاہور میں خبر ملی تھی کہ ان لوگوں نے تمہارا سراغ پا لیا ہے۔" خاصے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "مجھے فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اس دوران میں کوئی غیر معمولی بات تو تمہارے مشاہدے میں نہیں آئی؟"

"شاید آپ اسی لیے ڈیڈی کو ٹال رہے تھے۔" وہ حیا آمیز لیکن ملامت بھرے لہجے میں بولی۔ "انسان اپنے نفس کو زیر نہ کر سکے تو رشتوں کا اعتبار اور تعلق کی لذت پھیکی پڑ جاتی ہے۔"

"تقریر نہیں۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "اسے لو کے ہوش سنبھالنے سے پہلے مجھے کچھ کام نمٹانا ہے۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ جب تک وہ اس شہر میں ہے تم گھر میں بھی کھلے آسمان کے نیچے نہیں نکلو گی۔"

"دو روز سے سلمیٰ آپ کے لیے بہت پریشان ہے۔" اس نے نظریں جھکا کر دھیمے لہجے میں کہا۔

میں چونک پڑا، میرا دل صاف تھا لیکن سلمیٰ کے دل کے چور سے میں واقف تھا۔ پھر اس کے بارے میں غزالہ کو کیسے معلوم ہوا، میں نے تو کبھی اس سے سلمیٰ کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے مجھے خیال آیا کہ کہیں غزالہ کو اس بارے میں کسی سے بھنک نہ مل گئی ہو اور اب وہ میرے محبت جتانے پر مجھ پر طنز نہ کر رہی ہو لیکن اس نے خود ہی میری الجھن دور کر دی۔

"آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے فیکٹری فون کیا تھا۔ وہیں سے معلوم ہوا کہ جہانگیر کی بیوی سلمیٰ بار بار آپ کے لیے فون کر رہی ہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کا دوست کسی دشواری سے دوچار نہ ہو گیا ہو۔"

اس کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ جہاز پر گفتگو کے دوران میں اسے لو نے خود مجھے جہانگیر سے رابطہ رکھنے کا مشورہ دیا تھا کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ جہانگیر اپنی کسی حماقت کی بنا پر میرے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کر بیٹھا ہو اور نگاہوں میں آ گیا ہو۔

"پھر تم نے فون کیا تھا اس کے گھر؟" میں نے مضطربانہ لہجے میں پوچھا۔

"میرے لیے وہ اجنبی ہے۔ بس آپ ہی کی زبانی اس کا ذکر سنتی رہی ہوں۔ بھلا میں کیسے فون کر سکتی تھی اسے!"

اس کی بات معقول تھی۔ میں فوراً ہی وہاں سے اٹھ گیا، اور فون والے کمرے کی طرف چل دیا۔

نمبر ملانے پر دوسری طرف خاصی دیر تک گھنٹیاں بجتی رہیں لیکن کسی نے ریسیور نہ اٹھایا۔ میں نے کریڈل دبا کر سلسلہ منقطع کیا اور دوبارہ جہانگیر کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

اس بار دوسری گھنٹی پر ہی مجھے ریسیور میں افسردہ سی نسوانی آواز سنائی دی تھی۔

"میں ڈینی بول رہا ہوں، جہانگیر صاحب سے بات ہو سکے گی میری؟" میں نے شائستگی کے ساتھ سوال کیا۔

"اوہ ڈینی!" دوسری طرف سے ایک گہرے سانس کے ساتھ کہا گیا اور اس بار میں نے سلمیٰ کی آواز پہچان لی۔ "تم کہاں غائب ہو۔ میں تو تم سے بات کرنے کے لیے تڑپ رہی ہوں!" اس کی آواز بہت زیادہ مضمحل محسوس ہو رہی تھی۔

"جہانگیر کہاں ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"تین دن سے کوئی اطلاع دیے بغیر لاپتا ہیں۔" اس کی آواز اپنے ناپسندیدہ شوہر کے ذکر پر روہانسی ہو گئی۔ "میں کہاں جاؤں؟ کہاں تلاش کروں انہیں؟ تھانے میں رپورٹ بھی درج کرا دی ہے لیکن کوئی سراغ نہیں مل سکا۔"

تنظیم میرے لیے دن بدن بھیانک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس کے گندے دھندوں کے تحفظ کے لیے جو عام لوگ مارے گئے، ان کی کوئی گنتی ہی نہیں تھی لیکن میرے چند پیاروں کا لہو بھی اس کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ پہلے تنظیم کے کسی بڑے کے اشارے پر قاسم کے ہاتھوں میرا برسوں پرانا جگری دوست طارق اس طرح مارا گیا کہ مجھے اس کی میت کو کاندھا تک دینے کی اجازت نہ مل سکی۔ پھر لاہور میں اسے لو نے میرے بڑے بھائی تصویر کو زندگی سے محروم کیا اس کے بعد بڑی ماں لاپتا تھیں اور اب بیتے دنوں کا رہا سہا واحد ساتھی، جہانگیر بھی غائب تھا۔ وہ کیوں غائب ہوا تھا؟ وہ کہاں تھا؟ اسے غائب کرنے والے کون تھے؟ میرے ذہن میں سوالات کا ایک جنگل ابھرنے لگا اور میں نے کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟" شاید غزالہ میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر بھانپ گئی کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔

"جہانگیر تین دن سے غائب ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اسے ذرا بھی نقصان پہنچا تو میں چن چن کر انہیں کتوں کی موت ماروں گا۔"

وہ خاموشی سے سر جھکائے کمرے سے نکل گئی۔

میں نے ریسیور اٹھایا اور لاہور کا کوڈ ڈائل کر کے وہ نمبر ملانے لگا جو میں نے اسے لو کی جیب سے نکلے ہوئے ٹکٹ پر سے یاد کیا تھا۔

دوسری طرف سے فوراً ہی کسی عورت کی زندگی سے بھرپور چہکتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

"راجہ ظہور احمد صاحب!" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"کون بول رہا ہے؟ یہاں کوئی راجہ ظہور نہیں رہتا۔" تنک کر جواب دیا گیا۔

"غور کر لیں خاتون — یہ بہت ضروری ہے۔" میں نے اصرار کیا۔

"تم کون ہو اور کہاں سے بول رہے ہو؟"

"میں کراچی میں پی آئی اے کے صدر دفتر سے بول رہا ہوں۔ ہمیں ظہور صاحب کا پتا معلوم ہونا بہت ضروری ہے۔"

"وہ تو آج صبح ہی کراچی گئے ہیں۔" اس مرتبہ بولنے والی کی آواز الجھن آمیز تھی۔ "لیکن تم لوگوں کو ان سے کیا کام پڑ گیا؟"

"اپنا پتا نوٹ کرائیں۔" میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے خشک لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں؟" تیز لہجے میں سوال کیا گیا۔ "بات کیا ہے؟ تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟"

"ان کی لاش بھجوانی ہے ... پتے کے ساتھ ہی ان کا حلیہ بھی دہرا دیں۔"

"لاش۔" ریسیور پر پھٹی پھٹی ہذیانی آواز سنائی دی۔ "کیوں؟ کیا ہوا انہیں؟"

"پرسکون رہنے کی کوشش کریں۔ ان کا حلیہ بتائیں تاکہ لاش کے اعضا یکجا کرنے میں مدد مل سکے، ہمیں افسوس ہے

کہ ہمیں یہ خبر بد آپ تک پہنچانا پڑ رہی ہے۔" میں نے سفاکانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آپ کے ساتھ کیا رشتہ تھا ان کا؟"

"وہ بس دوست تھے میرے۔" بھرائی ہوئی روہانسی آواز اُبھری۔ "رہتے کہیں اور تھے لیکن میرے گھر خاصا وقت گزارتے تھے۔ ان کی لاش کے ٹکڑے خدا کے لیے مجھے نہ بھجوانا میرا دل بہت کمزور ہے، اسے دیکھتے ہی ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"

"وہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے آپ حُلیہ دہرائیں۔"

اور اس نے جو کچھ کہا وہ لفظ بلفظ لے ڈو پر صادق آتا تھا یعنی اب میرا اوزی معرکہ کسی بے نام آسیبی سائے سے نہیں رہا تھا بلکہ راجہ ظہور احمد سے تھا جو تنظیم کا مقامی حکمران بن کر لے ڈو کے نام سے کاروبار چلا رہا تھا۔

"کیا جہاز گر گیا ہے اس کا؟" حلیہ بتانے کے بعد اس خاتون کو وہ اہم سوال یاد آیا تھا۔

"ہوش کی باتیں کرو احمق عورت۔" میں نے تُرش لہجے میں کہا۔ "جہاز کیوں گرنے لگا، اس پر کسی نے بم پھینکا تھا، لاش کے ٹکڑے اڑ گئے ہیں۔"

"مم... مگر تم نے تو کہا تھا کہ تم پی آئی اے سے بول رہے ہو؟ ہلکے سے احتجاج آمیز لہجے میں اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے کان خراب ہیں۔ میں سی آئی اے سے بول رہا ہوں... میرا خیال ہے کہ بم کے دھماکے میں مرنے والا کوئی اور تھا، راجہ ظہور دھماکے کی وجہ سے بوکھلاہٹ میں اپنا ٹکٹ وہیں پھینک بھاگا، ہم سمجھے کہ وہ مرنے والے کے پاس تھا۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"راجہ ظہور احمد۔" میں دانت پیس کر بڑبڑایا۔

اس وقت مجھے سلطان شاہ شدت کے ساتھ یاد آ رہا تھا۔ وہ مجبوری کے تحت ہوٹل کے بجائے اپنے دوستوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا جہاں اس سے فون پر رابطے کی سہولت میسر نہیں تھی ورنہ پہلی انتقامی کارروائی کے طور پر میں اس کے ذریعے ظہور کی اس نام نہاد 'دوست' کو اغوا کرا سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس عورت کے ذریعے ہمیں ظہور کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

پہلے میں نے سوچا کہ اس عورت کو ظہور سے اس فون کال کا ذکر کرنے سے منع کر دوں لیکن بعد میں یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اگر وہ ظہور سے اسی قدر قریب تھی تو شاید اس کی خون آشام طبیعت سے بھی واقف رہی ہو گی اور ہر صورت میں وہی کچھ کرتی جو اس

کے مفاد میں ہوتا۔

میرے لیے لے ڈو کے نام سے واقفیت ایک اہم کامیابی تھی لیکن جہانگیر کی گمشدگی کی خبر نے میری اس خوشی پر پانی پھیر دیا تھا۔ میں سگریٹ سلگا کر اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

اگر ہر قسم کے حوالوں کو نظر انداز کر کے سوچا جائے تو وہ موت کے سوداگروں کی ٹولی کا ایک اہم رُکن تھا لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ پورے کاروبار میں اس کی اہمیت تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ کسی بھی وقت وہ کام سے انکار کرتا تو اسے خاموشی کے ساتھ ہلاک کر کے اس کی جگہ دوسرا مُہرہ بٹھا دیا جاتا۔ ویسے وہ خود بھی اپنے کام سے نالاں تھا لیکن اچھی طرح جانتا تھا کہ جس دن اس نے کھل کر اپنی اس خواہش کا اظہار کیا، وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔

یوں درحقیقت وہ بُری دنیا کا ایک اچھا آدمی تھا۔ اس نے تنظیم کے لیے بہتیرے قابلِ ذکر کام سرانجام دیے تھے کیوں کہ اس زمانے میں وہ نچلی سطح کا آدمی تھا لیکن اوپر آنے کے بعد اس کی عملی افادیت ختم ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ محض تنظیم کی طرف سے عائد ہونے والی ذمے داریوں کی بجا آوری میں وقت بے وقت کی مشتبہ بھاگ دوڑ نے اس کی ازدواجی زندگی میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ اس کی بیوی کو اس سے عدم توجہی کی سنگین شکایات تھیں اور مسلسل شکایات کے باوجود شوہر کے رویے میں تبدیلی نہ پا کر وہ میری طرف جھکنے لگی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اخلاق اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے کبھی سلمیٰ کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

لیکن گھریلو تلخیوں کے باوجود سلمیٰ کے دل میں شوہر کی چاہت موجود تھی۔ وہ جہانگیر کی پُراسرار گمشدگی پر شدید پریشانی میں مبتلا تھی۔ شاید اسے اندازہ بھی نہ رہا ہو گا کہ اس کا شوہر جن لوگوں کے لیے کام کرتا ہے، ان میں سے کسی کی برہمی کا نتیجہ ہمیشہ کے لیے گمشدگی کی صورت میں بھی برآمد ہو سکتا ہے۔

اسی اثنا میں غزالہ میرے لیے چائے بنا کر لے آئی اور ڈرائنگ روم میں قالین پر ہی بیٹھ گئی۔

"آپ اس بریف کیس کو کیوں نہیں کھولتے؟" اس نے چائے کی پیالی میں شکر گھولتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس میں بارودی ذخیرہ نہ چھپایا ہوا ہو۔"

"تو کیا ہوائی اڈوں پر نصب مشینیں بارود کی موجودگی کی نشاندہی نہیں کرتیں؟" اس نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "جس قسم کی مشینوں سے میرا واسطہ پڑا ہے وہ صرف دھات سے بنے ہوئے ہتھیاروں کی موجودگی کا سراغ لگا سکتی ہیں... ایکسرے مشین تو اسکرین پر اندر رکھا ہوا سامان تک دکھا دیتی ہے۔"

"یعنی دستی بم وغیرہ سیکیورٹی سے بآسانی نکالا جا سکتا ہے؟"

"اس پر بھی دھات کا خول منڈھا ہوا ہوتا ہے۔ مشین مشکوک دھاتی خول کی موجودگی ظاہر کرے گی اور اس کی بنا پر تجربہ کار افسر بم کا سراغ لگا لیں گے۔ ایسے معاملات میں ڈیوٹی پر مامور عملے کا تجربہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔"

"آج کل تو پلاسٹک بم عام ہیں، انہیں کوئی مشین نہیں پکڑ سکتی۔" اس نے جرح کے انداز میں کہا۔

"یہ بتاؤ کہ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" میں نے زچ ہو کر سوال کیا۔

"کچھ بھی نہیں، بس معلومات میں اضافہ کرنا چاہ رہی تھی۔" اس نے معصومانہ سادگی کے ساتھ کہا اور کھٹکے کی آواز پر خوفزدہ ہو کر اُچھل پڑی۔ میں جھپٹ کر اس کے قریب پہنچا تو بریف کیس کا ایک طرف کا کھٹکا کھلا ہوا تھا۔

"یہ کیسے کھلا؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"بے خیالی میں شاید بٹن دبا بیٹھی تھی۔"

"پھر تو دوسرا کھٹکا بھی مقفل نہیں ہو گا۔" میں نے مسرت آمیز لہجے میں کہتے ہوئے بریف کیس اپنے آگے کھسکا لیا۔ یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ دوسری طرف کا بٹن دباتے ہی دوسرا کھٹکا بھی کھل گیا اور میں نے بے تابانہ انداز میں بریف کیس کا ڈھکنا اٹھا دیا۔

بریف کیس کھلتے ہی سب سے پہلے میری نظر پاسپورٹ پر پڑی۔ وہ لے ڈو ہی کا پاسپورٹ تھا لیکن اندراجات والے صفحے پر اس کا نام پرویز احمد درج تھا۔ مذہباً عیسائی ظاہر کیا گیا تھا اور پتا ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا تھا۔ پاسپورٹ آٹھ ماہ پہلے جاری کیا گیا تھا۔ اس کے بیشتر صفحات بھرے ہوئے تھے جن پر مشرقِ بعید سے یورپ اور برطانیہ تک کے ویزے لگے ہوئے تھے اور تقریباً ہر ویزا استعمال کیا جا چکا تھا۔ پاسپورٹ کے ساتھ ہی اس کا شناختی کارڈ بھی اسٹیپل کیا ہوا تھا۔

میری کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ چند ہی منٹ قبل میں نے لے ڈو کے راجہ ظہور احمد ہونے کی تصدیق کی تھی اور اب اس کے پرویز احمد ہونے کا دستاویزی ثبوت میرے پاس ہاتھ میں موجود تھا۔ بریف کیس میں سادہ کاغذات کے چھوٹے بڑے پیڈ اور کئی قسم کے قلموں کے علاوہ میری دلچسپی کا بھی خاصا سامان موجود تھا۔ بالکل باریک سوئی والی تین ننھی ننھی ہائپوڈرمک سرنجز کے ساتھ ہی پلاسٹک کے ایک ڈبے میں سیاہ رنگ کی ایک شیشی موجود تھی۔ اس شیشی کی ساخت غیر معمولی تھی اور اس کی بناوٹ میں ایسا ڈراپر بھی شامل تھا کہ شیشی کو اُلٹنے کے باوجود اس میں سے سیال کے ایک قطرے سے زیادہ مقدار خارج نہ ہوتی۔ ڈھکن کے نیچے ڈراپر کے گرد سخت اسفنج نما کوئی مادّہ بھرا ہوا تھا جس میں ربر کی طرح پھیلنے اور سُکڑنے کی صلاحیت تھی۔ غالباً ضرورت کے تحت اسی میں سوئی داخل کر کے سیال سرنج میں کھینچا جا سکتا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" غزالہ نے مجھے اس کے گہرے مشاہدے میں مصروف پا کر سوال کیا۔

"شاید پوٹاشیم سائنائیڈ۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "اسی زہر سے اس نے تصویر بھائی کو میری نگاہوں کے سامنے ہلاک کیا تھا۔"

"تصویر بھائی؟ ان کا ذکر کہاں سے آگیا؟"

"ہاں، یہ سب میں نے تمہیں نہیں بتایا۔ لے ڈو نے توقیر کا صرف نام اختیار کیا تھا جب کہ وہ کینیڈا میں ہے۔ تصویر اس کے قبضے میں تھا۔ جب اس نے ہم دونوں بھائیوں کو مل بیٹھتے دیکھا تو تصویر کو بھرے ہوٹل میں مار دیا۔"

غزالہ وہ خبر سُن کر حیران رہ گئی۔ پھر مختصر الفاظ میں میں نے بڑی ماں کی المناک گمشدگی سمیت تمام تفصیلات بتا ڈالیں، اور اپنی اَن دیکھی سوتیلی ساس کا عبرتناک انجام سُن کر اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

"اس کا حشر بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔" وہ غصے سے بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اس موذی کو تو انسان کہنا بھی انسانیت کی کھلی توہین ہے۔"

"یہی ہو گا، بس تم دیکھتی جاؤ۔" میں نے یہ کہتے ہوئے بریف کیس سے نکالا ہوا وہ رقعہ غزالہ کی طرف بڑھا دیا جس پر قلم سے عجلت میں کسی عزیز احمد کا نام لکھا گیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے رقعہ مجھے لوٹاتے ہوئے سوال کیا۔

"قاسم کا ایک منہ چڑھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اب براہِ راست لے ڈو کے لیے کام کر رہا ہو۔ اس کے بریف کیس سے یہ رقعہ برآمد ہونے کا تو یہی مطلب ہے لیکن صحیح خبر رخشی ہی سے مل سکے گی۔"

"بڑی دیر بعد خیال آیا آپ کو۔" اس نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"سیدھی سی بات ہے۔ پہلے خیال آجاتا تو شاید وہ جہانگیر کے بارے میں کچھ بتادیتی۔ چلیے اب کوشش کرلیں۔" وہ بدستور اسی طرح مسکرائے جارہی تھی۔

میں نے فوراً ہی فون پر رخشی کا نمبر ملالیا۔

"میں ڈینی بول رہا ہوں۔" میں نے ریسیور میں کہا۔

"اتنے دن سے کہاں مرے ہوئے ہو تم؟" میرا نام سنتے ہی وہ غصّے سے پھٹ پڑی۔ "نہ اپنا پتا ٹھکانہ بتاتے ہو، نہ خود رابطہ قائم کرتے ہو، تمہیں معلوم ہے کہ شہر میں کیا ہورہا ہے؟"

میں نے کنکھیوں سے غزالہ کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ "مجھے کچھ کچھ معلوم ہے، اتنی برہمی کی ضرورت نہیں، آج ہی کسی وقت ملنے کی کوشش کروں گا۔" پھر آواز ذرا سے بلند کرتے ہوئے سوال کیا۔ "تم بتاسکو گی کہ عزیز آج کل کہاں پایا جاتا ہے؟"

"وہ اچانک کیسے یاد آگیا تم کو؟" رخشی کی آواز اس کے تذکرے پر تلخ ہوگئی۔ "تمہیں معلوم ہے کہ اس ولدالحرام نے میرے لیے کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔"

"چلو اب معلوم ہوگیا — اس کا ٹھکانہ بتاؤ۔ میں اُسے کسی خارش زدہ کتے کی طرح تمہارے قدموں میں لاڈالوں گا۔"

"سنا ہے کہ اس نے ساحلی علاقے ایک تیسرے درجے کا ہوٹل خرید لیا ہے۔ شام میں عموماً وہیں پایا جاتا ہے۔ لیکن تم اسے بعد میں تلاش کرلینا، اس وقت مجھ سے ملنا بہت ضروری ہے — جہانگیر تین روز سے لاپتا ہے۔ اگر فوراً کچھ نہ کیا گیا تو دنیا کی کوئی قوت اسے مرنے سے نہ بچاسکے گی۔"

"اس کے بارے میں کیا معلوم ہے تمہیں؟" میں نے مضطربانہ لہجے میں سوال کیا۔

"کچھ بھی نہیں — اور بہت کچھ۔ بس فوراً چلے آؤ۔" اس بار اس نے بہت عجلت میں بات پوری کی تھی۔

میں ماؤتھ پیس پر ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا لیکن دوسری طرف سے کوئی آواز نہ سنائی دی۔ شاید اس نے ریسیور واپس رکھ دیا تھا۔

آخر اسے یوں فون بند کرنے کی کیا گھبراہٹ تھی؟ میں سوچ میں پڑ گیا کیوں کہ لٹو شہر میں موجود تھا اور میرے ہاتھوں چوٹ کھا کر کسی خونخوار درندے کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ اس وقت وہ شہر میں کہیں بھی کچھ کرسکتا تھا۔

میں نے دل میں فوری روانگی کا مصمم ارادہ کیا اور غزالہ کی طرف متوجہ ہوگیا جو بظاہر خاموشی سے سر جھکائے قالین کے ریشوں سے کھیل رہی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ میرا کہا ہوا ایک ایک لفظ بغور سن رہی تھی۔

"شاید بلاوا آگیا ہے آپ کا۔" غزالہ نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ جانا ہی پڑے گا۔" میں نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ بات سیدھی سادی تھی لیکن میرے دل میں چور تھا اور اسے میرے اور رخشی کے تعلق کے بارے میں شاید کچھ بھنک بھی مل چکی تھی۔ لہٰذا اس کے معنی خیز لہجے نے مجھے مضطرب کردیا تھا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "اسے جہانگیر کے بارے میں کچھ معلوم ہے، وہ خود میری تلاش میں تھی۔"

"ہونا ہی چاہیے۔" اس کے یاقوتی ہونٹوں پر مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔ "آپ کا تو اس سے خاصا پرانا تعلق ہے، ویسے بھی آپ سے ایک بار مل کر آپ کو بھول جانا کسی کے لیے ممکن نہیں۔"

"عجیب باتیں کررہی ہو۔" میں نے کھوکھلے لہجے میں احتجاج کیا۔ "آخر کہنا کیا چاہتی ہو تم؟"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "وہ منتظر ہے تو آپ کو فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔"

"جہنّم میں جائے وہ اور اس کے ساتھ جہانگیر بھی۔"

میں چڑچڑے انداز میں صوفے پر گر گیا۔ "میں کہیں نہیں جارہا۔"

"ارے، آپ تو ناراض ہوگئے۔" وہ بوکھلا کر میرے قریب آبیٹھی۔ "میری باتوں کا برا مان گئے۔ کیا میں آپ سے مذاق بھی نہیں کرسکتی؟ میرے لیے تو بس یہی کافی ہے کہ آپ مجھے چاہتے ہیں، اس سے آگے آپ جس سے چاہیں، ملیں مجھے کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ پھر رخشی سے تو آپ ایک کام سے ملنے جارہے ہیں، بس ذرا چڑا رہی تھی آپ کو۔"

اس کے سہمے سہمے، معذرت خواہانہ انداز پر میں دل ہی دل میں نادم ضرور ہوا لیکن میں اسے کیسے بتاتا کہ رخشی کے بارے میں میرے دل میں ماضی کا ایک چور موجود تھا جو اس بارے میں کہی گئی ہر بات کو سنجیدگی کی ترازو میں تولنے لگتا تھا اور اس وقت تو تبصرہ کرنے والی غزالہ تھی لہٰذا من کا چور فوراً ہی اپنی داڑھی میں تنکا تلاش کرنے میں مصروف ہوگیا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ میرا رخشی سے ملنا شاید تمہیں ناگوار گزرے" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "عورتوں کا دل چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کرسکتیں کہ ان کے نام کا دم بھرنے والا دوسری عورت کے سامنے اتنا بےبس ہوجائے کہ محض اس کی فون کال پر اُدھر دوڑا چلا جائے۔ خواہ اس کا کچھ ہی سبب نہ ہو۔"

"آپ بلاوجہ سنجیدہ ہورہے ہیں۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ "آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ عورتوں کا دل کتنا وسیع ہوتا ہے۔ جب اسے یہ یقین ہو کہ اس کا نام اپنے مرد کے ساتھ سدا باقی رہے گا اور دوسرے نام سایوں کی طرح پل پل بدلتے رہیں گے، اسے کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی، اس معاملے میں چھوٹے دل کا مالک مردوں ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔" آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے وہ اچانک ہی ہنس پڑی۔

میں نے اس موضوع کو وہیں ختم کردیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی درست ہی کہہ رہی تھی۔ مرد اپنے گھروں کو فراموش کرکے جانے کہاں کہاں دل کے بہلاووں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور ان کی عورتوں کا احتجاج کبھی نوک جھونک یا تلخ کلامی سے آگے نہیں کرتا لیکن کہیں ایسی ہی لغزش صرف ایک بار، عورت سے سرزد ہوجائے تو گھرانے تباہ ہوجاتے ہیں، نوبت خونریزی تک پہنچ جاتی ہے۔

مرد واقعی عورت کے مقابلے میں زیادہ متعصب، تنگدل اور خودغرض واقع ہوا ہے۔ میں نے سوچا۔

اسی لمحے ذہن کے کسی گوشے سے ندا اُبھری کہ عورتوں کو نسلوں کا امین بنایا گیا ہے اور میں سر جھٹک کر رہ گیا۔ جس کا جو رویّہ تھا، وہ فطرت کے قانون کے مطابق تھا۔ جس طرح پانی کو بہنا چاہیے اور لوہے کو ایک جگہ پڑا رہنا چاہیے، بالکل اسی طرح وہ بھی ایک اٹل قانون تھا۔ دونوں میں نہ کوئی تنگ نظر تھا اور نہ فراخ دل۔

"تو آپ جارہے ہیں؟" غزالہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

"پھر جھگڑا شروع کردیا تم نے؟" میں نے بھڑک کر کہا۔

"کیا کہہ دیا میں نے؟" مسکراہٹ بےساختہ ہنسی میں بدل گئی۔ "یہ بھی نہ پوچھوں کہ آپ جارہے ہیں یا گھر پر آرام فرمائیں گے؟"

میں نے بےبسی کے ساتھ اسے گھورتے ہوئے جگہ چھوڑ دی۔

باہر نکلتے ہوئے مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں غزالہ کا باپ نہ ٹکرا جائے۔ مجھے اندازہ تھا کہ میری طویل غیر حاضری کے دوران اس کے دل و دماغ میں تجسّس اور سوالات کا لاوا کھولتا رہا ہوگا اور وہ پہلی فرصت میسّر آتے ہی اپنے دل کا غبار نکالنے کی کوشش کرے گا۔

"آپ بےفکری سے نکلے چلے جائیں۔" وہ مجھے متجسّسانہ انداز میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑاتے دیکھ کر مغموم لہجے میں بولی۔ "اس وقت ڈیڈی مصروف ہوں گے۔ امّی کے صبح کے ڈوز کا وقت ہوگیا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں کوکین والا پان کھا رہی ہوں گی اور ڈیڈی وہیں بیٹھے ان سے باتیں کررہے ہوں گے۔ ایسے موقع پر امّی تنہائی برداشت نہیں کرسکتیں۔"

بڑا اچھا نشہ ہے کوکین بھی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ کم از کم اس طرح شوہر کو مضبوط لگام دینے کا بہانا تو ہاتھ آہی جاتا ہے لیکن زبان سے کچھ نہ بولا ورنہ اس بار غزالہ واقعی ناراض ہوجاتی۔

میں وہاں سے روانہ ہوا تو ذہن میں بہتیرے سوالات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہورہے تھے۔

مدّتوں سے میرے ذہن میں بھائیوں کے خلاف پکنے والا لاوا مرد ہوچکا تھا۔ تصویر تنظیم کے لیے ایک اہم ذمّے داری ضرور سرانجام دے رہا تھا لیکن اس کا مرتبہ بہت زیادہ بلند نہیں تھا بلکہ وہ بیچارہ تو ان کی نگاہوں میں اس قدر حقیر ثابت ہوا تھا کہ مجھ سے پہلی بار ملاقات کے دوران اسی جرم کی پاداش میں اسے لٹو نے ہلاک کردیا تھا۔

تصویر مارا جاچکا تھا، توقیر ہزاروں میل دور کناڈا میں مقیم تھا، بڑی ماں تصویر کے قتل کے ساتھ ہی لائیڈز کاٹیج سے لاپتا ہوچکی تھیں۔ گمان یہی تھا کہ انہیں بھی مار ڈالا گیا ہوگا۔ میں جس شخص کو لٹو کے طور پر پہچانتا تھا، وہ اس وقت کراچی آیا ہوا تھا۔ پہلے ایک ذریعے سے اس کا نام راجہ ظہور احمد دریافت ہوا پھر اس کے بریف کیس سے برآمد ہونے والے شناختی کارڈ سے پتا چلا کہ اس کا نام پرویز احمد تھا۔ بہرحال یہ میرے لیے کوئی بڑی الجھن نہیں تھی۔ زیرِزمین دنیا میں بیک وقت مختلف نام اختیار کرنا اور ہر حیثیت میں مصدقہ شناخت نامے رکھنا کوئی انہونی بات نہیں تھی بلکہ ملک میں شناختی کارڈ بنانے والے مختلف دفاتر میں باہمی ربط کا جو فقدان تھا، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ادارے کے بدعنوان اہلکار مناسب سی رشوت لے کر کسی بھی شخص کو کسی بھی نام کا شناخت نامہ ہاتھوں ہاتھ جاری کردیتے تھے اور وہ حقیقی امیدوار جو رشوت نہ دینا چاہتے ہوں، مہینوں تنگ کیے جاتے تھے۔

آئے دن سننے میں آتا تھا کہ فلاں مغربی ملک کے فلاں ہوائی اڈے پر ایک پاکستانی شہری ہیروئن کی بھاری مقدار سمیت گرفتار کرلیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوتا کہ وہ کوئی افغان مہاجر، بھارتی مہاشے یا مشرقِ بعید کا کوئی شہری تھا جس نے جعلسازی سے نہ صرف پاکستانی شناختی کارڈ بلکہ پاسپورٹ تک حاصل کرلیا تھا۔ اس میں تمام تر زورِ مجرم کی جعل سازی پر ہوتا تھا، اپنے یہاں رائج رشوت کے چلن کو دانستہ پسِ پشت ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ نہیں کہ پاکستانی ایسے جرائم میں ملوث ہی نہیں ہوتے تھے لیکن ان کی حقیقی تعداد اخبارات کی فراہم کی ہوئی ابتدائی اطلاعات سے کہیں کم ہوتی تھی لیکن اس قومی بے غیرتی اور رشوت خوری کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ سے مغرب اور امریکا کے ہر مقام پر پاکستانی حکام کے جاری کیے ہوئے باضابطہ سفری پروانوں کو محض اس بنا پر شک و شبے کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا کہ وہ نئے ہوتے تھے۔ ہاں جس پاسپورٹ پر ایک دو سفر بخیر و خوبی طے کرلیے جائیں، اسے عموماً تسلیم کرلیا جاتا تھا۔

اے لو جس پیمانے پر کام کررہا تھا اس کی بنا پر مجھے یقین تھا کہ اس کے صرف دو ہی نہیں، دس نام بھی ہوسکتے ہیں لیکن ان دو ناموں سے اس کی ذات کے بارے میں ایک سِرا ہاتھ آگیا تھا۔

پرویز احمد کے طور پر وہ ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ سے تعلق رکھتا تھا جس کا دفتر میرے ہاتھوں تباہ ہوچکا تھا لیکن رابطہ ظہور احمد کے حوالے سے لاہور میں کم از کم وہ آبرو باختہ عورت ضرور اس کے کسی ٹھکانے کی نشاندہی کرسکتی تھی۔

لیکن لاہور اور اس عورت تک فی الحال میری رسائی نہیں تھی۔ سلطان شاہ لاہور میں موجود تھا لیکن میرے پاس اس سے فوری رابطہ قائم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ لاہور میں اس ناگن پر مامور تھا جو ٹرانسمیٹر کے ذریعے شوگر کوئین کے طور پر سامنے آئی تھی اور ڈارلنگ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے سے پہلے شدید غلط فہمی میں مبتلا ہوکر اس کے ٹھکانے کی نشاندہی کربیٹھا تھا۔

محض شوگر کوئین کی دلکش اور رسیلی آواز کی بنا پر مجھے شبہ ہوا تھا کہ کہیں وہ ویرا لائیڈ ہی نہ ہو جو میرے مشرقِ بعید کے سفر میں ایشلے ہاؤز نامی ایک مغربی فرم کے نمائندے کے طور پر مجھ سے ملی تھی اور منشیات کی ایک بڑی کھیپ کا سودا طے ہوجانے کے بعد کئی دن تک میرے دل و دماغ پر حسن کے راستے حکمرانی کرتی رہی تھی۔

کس قدر عجیب بات تھی کہ بکرے کے سر کی وضع کے نقرئی ٹائی پن کی بنیاد پر مجھے پہچاننے کے بعد وہ مجھ سے ویرا لائیڈ کے

نام سے ملی تھی پھر کراچی میں منعقد ہونے والی ایک بین الاقوامی انسدادِ منشیات کی کانفرنس میں دوسری بار ویرا لائیڈ کا نام اس وقت سننے میں آیا جب آزاد علاقے میں ہیروئن تیار کرنے والی پہلی فیکٹری کے لیے بھاری معاوضے پر کام کرنے والے جرمن کیمسٹ کی گرفتاری کا ذکر آیا۔ اس کیمسٹ کو مومن خان کی ہیروئن فیکٹری میں کام کرنے پر آمادہ کرنے والی کا نام بھی ویرا لائیڈ ہی تھا۔

پھر پہلا نام پیچھے رہ گیا، لائیڈ باقی رہ گیا۔

رمضان چاچا سے ملنے والے فون نمبر سے لائیڈز کاٹج کا نام سامنے آیا۔ جو چھٹے ہوئے شوریدہ پشتوں اور بدمعاشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور وہیں سے تنظیم کے غالباً تمام تر امور کے بارے میں آخری فیصلے صادر ہوتے تھے اور اس عمارت کا مالک جی لائیڈ نامی ایک ایسا بارسوخ سفید فام تھا جسے دیکھنے کا کوئی دعویدار ابھی تک نہیں مل سکا تھا۔

ان حالات کی روشنی میں شوگر کوئین کی ذات میرے لیے بہت زیادہ اہمیت اختیار کرگئی تھی اور میں سلطان شاہ کو اس مورچے کا کمان دار بنا کر کراچی چلا آیا تھا۔

لیکن کراچی پہنچنا تو بعد کا معاملہ تھا، میرے لیے دورانِ پرواز ہی کہانی شروع ہوگئی اور میرے اپنے شہر کے بارے میں ٹھوس حقائق یہ تھے کہ اب اے لو شہر میں وارد ہوچکا تھا۔ جیوا ہاؤز کی عمارت تباہ ہوچکی تھی، جہانگیر کسی اطلاع کے بغیر تین دن سے گھر سے لاپتا تھا، رخشی بظاہر تنظیم سے وفادار تھی لیکن درپردہ اپنے بھائی اور اپنے محبوب کے دوہرے خون کا انتقام لینے کے لیے مجھ سے تعاون کررہی تھی۔ تشویش کی بات یہ تھی کہ اس نے بات کرتے کرتے فون کا سلسلہ اچانک ہی منقطع کیا تھا جس کی وجہ سے میرے دل میں شبہات جنم لے چکے تھے۔

میں خیالات کی دھن میں ڈوبا کار ڈرائیو کرتا رہا۔ آخرکار مطلوبہ عمارت آگئی۔

اے لو شہر میں موجود تھا اور رخشی نے فون کا سلسلہ غیر متوقع طور پر منقطع کیا تھا لہٰذا میں وہاں پورے ذہنی تحفظات کے ساتھ پہنچا تھا۔ گاڑی روکنے کے بجائے میں سست رفتار سے اسٹون ہاؤس کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ وہ حصہ حسبِ توقع ویران پڑا ہوا تھا اور زندگی کے آثار یکسر مفقود تھے۔ کیونکہ رخشی اپنے محبوب قاسم کی خریدی ہوئی اس عمارت کے صرف دو عقبی کمرے استعمال کررہی تھی اور آمد و رفت کے لیے بھی عقبی راستہ ہی استعمال کرتی تھی۔ میں ایک طویل چکر کاٹ کر عمارت کے عقبی حصے کی طرف سڑک پر نکلا تو دور ہی سے دیکھ لیا کہ اسٹون ہاؤس کے عقبی پھاٹک کے قرب و جوار میں کوئی کار موجود نہیں تھی اور اس سمت میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ کوئی کار اندر پارک کی جاسکے لہٰذا میں پرسکون انداز میں کار آگے لیتا چلا گیا۔

اسٹون ہاؤس کے پھاٹک سے کچھ آگے میں نے کرنل جاوید زیدی کی سالخوردہ کار فٹ پاتھ کے کنارے روک دی اور دروازہ لاک کیے بغیر نیچے اتر آیا۔

عقبی پھاٹک کے ستون پر لگے ہوئے کال بیل کے بٹن کو دبا کر میں کئی منٹ تک جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن اندر بدستور گہرا سناٹا چھایا رہا۔ کہیں بھی کوئی آہٹ نہیں سنائی دی۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہاں کوئی بھی ذی روح موجود نہ ہو۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔ تھوڑی دیر قبل اگر میں اس سے بات نہ کرچکا ہوتا تو شاید یہی سمجھ لیتا کہ وہ کہیں گئی ہوئی ہوگی لیکن اس وقت مجھے یقینی طور پر دال میں کالا نظر آرہا تھا۔ میں نے دوبارہ پش بٹن پر انگلی رکھ دی اور اسے کئی سیکنڈ تک دبائے رہا۔

عمارت کے کسی حصے میں بزر کے چیخنے کی آواز سنائی دی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ میں نے پھاٹک کی کنڈی کا جائزہ لیا جو باہر سے مقفل نہیں تھی۔ میں نے پھاٹک اور اس کی ذیلی کھڑکی پر بھی زور لگا کر دیکھا لیکن وہ دونوں اندر سے بند تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر وہاں سے کوئی دیوار پھاند کر باہر نہیں نکلا تو اندر ضرور کوئی نہ کوئی موجود ہوگا۔

میں ان ہی امکانات کا جائزہ لے رہا تھا کہ اندر سے ایک سخت بے ہودہ آواز ابھری۔ ”کون ہے بے؟“

میں لب و لہجے پر عموماً تاؤ کھانے کا عادی نہیں ہوں لیکن اس آواز میں نہ جانے کیسی للکارتی ہوئی تحقیر پوشیدہ تھی کہ میری کھوپڑی بُری طرح کھول اٹھی۔

”تیرا باپ۔ دروازہ کھول ورنہ ہڈیاں توڑ دوں گا۔“ میں نے جھنّائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میرے جواب پر اندر سے ہذیانی ہنسی کی آواز سنائی دی، وہ جو کوئی بھی تھا، یقیناً عمر رسیدہ یا بیمار تھا کیونکہ اس کی آواز میں زندگی کی بھرپور تازگی نہیں تھی۔ پھر قدموں کی بے ہنگم آہٹوں کے ساتھ اس کی آواز سنائی دی۔ ”بڑے دنوں بعد آئے ہو ابا جان۔ تمہارا نام تو میری ماں نے بھی مجھے نہیں بتایا تھا۔ آ ہی گئے ہو تو ذرا صبر کے ساتھ کھڑے رہو تاکہ تمہاری زیارت کرلوں۔“

لہجہ واضح طور پر کاٹ دار اور زہریلا تھا۔ وہ جو کوئی تھا، ہتھوڑن حالات سے بھی حظ حاصل کرنے کی خداداد صلاحیت سے بہرہ ور تھا۔ ورنہ ولدیت کے حوالے سے اس قدر اٹل اور استہزائیہ جملہ نہ دے پاتا۔

میں اپنی جگہ تن کر کھڑا ہوگیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے مہلت دیے بغیر ہی دبوچ بیٹھوں گا، بعد میں جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔

آہٹیں غیر متوازن اور بے ترتیب تھیں جو بتدریج قریب آتی جارہی تھیں مجھے شبہ ہوا کہ کہیں آنے والا نشے کی جھونک میں نہ ہو۔ ایسا ہوتا تو میرا کام خاصا آسان ہوسکتا تھا۔

میں اعصابی تناؤ کی حالت میں، تصادم کے لیے تیار کھڑا ہوا تھا کہ اچانک چھوٹا پھاٹک کھل گیا۔ میں اپنے قد و قامت کے کسی شخص کی توقع میں سطحِ زمین سے کم و بیش چھ فٹ کی بلندی پر نگراں تھا لیکن دروازہ کھلنے پر وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ کھلے ہوئے پھاٹک میں سے خلا اور پھر اسٹون ہاؤس کا عقبی برآمدہ نظر آرہا تھا۔

لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی کیونکہ لحظہ بھر بعد ہی کوئی ڈیڈی کا نعرہ مار کر میری پنڈلیوں سے کسی خونخوار جونک کی طرح لپٹ گیا تھا۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ میری پنڈلیوں کی ہڈیاں توڑ ڈالنے کا مصمم ارادہ کرچکا ہو۔

وہ جو بھی تھا، بلا کا طاقتور تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اس کے حملے کا فوری تدارک نہ کیا گیا تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے میرے پیر اکھاڑ کر مجھے منہ کے بل زمین پر گرا دے گا یا میری مزاحمت کی صورت میں کم از کم ایک آدھ ہڈی ہی توڑ ڈالے گا۔

میں نے تکلیف اور درد کا احساس ہوتے ہی اپنی بلند نگاہی پر لعنت بھیجی اور فی الفور چھ فٹ سے تین فٹ کی سطح پر اتر آیا تو دیکھتا ہوں کہ ایک جوان العمر اور تنومند کبڑا میری پنڈلیوں کو گرفت میں لیے مجھے اندر گھسیٹ لے جانے کے لیے کوشاں ہے۔

”ٹھہرو۔“ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی تھی، میں کسی کبڑے کا باپ ہرگز نہیں ہوسکتا۔“

”اب تو یہ فیصلہ اندر ہی ہوسکے گا۔“ وہ بدستور میری پنڈلیوں پر زور آزمائی کرتے ہوئے بولا۔ ”کوبڑ دیکھ کر اب ولدیت سے ہی انکاری ہوئے جارہے ہو؟ یہ ظلم تو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔“

اس دوران میں میں اپنے دفاع سے غافل نہیں رہا تھا لیکن پنڈلیوں پر پوری قوت صرف کرنے کے بعد میں اندازہ لگا چکا تھا کہ اس انسانی جونک سے بآسانی چھٹکارا آسان نہیں تھا۔ لہٰذا ایک بار اس نے جیسے ہی سانس لے کر پوری قوت کے ساتھ میری پنڈلیوں کے گرد اپنے بازوؤں کی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کی، میں نے اس طرح اپنے جسم کا پورا بوجھ آگے کی طرف ڈال دیا جیسے میں نے اس کی گرفت کے سامنے شکست تسلیم کرلی ہو۔

وہ شاید دو چار بار مزاحمت کی توقع کررہا تھا، میں نے جو یوں اچانک ہاتھ پیر ڈال دیے تو وہ بوکھلا گیا۔ جتنی دیر میں وہ میری حکمتِ عملی سمجھتا، اس کے قدم اکھڑ چکے تھے اور وہ خود کو میرے گرتے

ہوئے بدن کے بوجھ سے بچانے کے لیے کوشاں تھا۔

اس کی کوئی کوشش بار آور نہ ہوسکی اور میں اسے دبوچے اس طرح پھاٹک کے اندر زمین بوس ہوا کہ میرے دونوں گھٹنے پوری سختی کے ساتھ اس کے سینے میں اترے جا رہے تھے۔

"یع... یح... یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ میرے گھٹنے اپنے سینے سے اُٹھانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بمشکل ہکلایا۔

"یہ بلوا اٹھ ہو رہا ہے۔" میں نے اس کے نرخرے کے قریب اپنے داہنے گھٹنے کا دباؤ بڑھاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "اب تم اتنے کم سن بھی نہیں ہو کہ اس بات کا مطلب نہ سمجھ سکو۔"

"م... مم... میں... سب کچھ... بس... سمجھتا ہوں۔" وہ میرے داہنے گھٹنے کی وحشیانہ گرفت سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے بلبلایا۔ "تم مجھ سے یہ جائداد کسی طرح نہیں چھین سکتے، میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا۔"

"دماغ خراب ہوا ہے تیرا۔" میں نے اس کی گردن پر بھرپور ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا اور اس بار وہ بری طرح تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا۔ میری گرفت سے آزاد ہوتے ہی وہ اسٹون ہاؤس کے پختہ فرش پر لڑھکتا ہوا کافی دور تک چلا گیا پھر ہانپتے ہوئے اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر مجھے کینہ توز نظروں سے گھورنے لگا۔

"رخشی کہاں ہے؟" میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے غراتے ہوئے سوال کیا۔

"میں کسی رخشی کو نہیں جانتا۔" وہ اپنی گردن سہلاتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔

"تم کون ہو؟ اور یہاں کر رہے ہو؟"

"ارے واہ۔" وہ بھنا کر بولا۔ "اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے۔ ابے یہ میرا گھر ہے اور میں اس کا مالک ہوں، سمجھ گیا؟ اب جاتا ہے یا دوسری ترکیب استعمال کرنا پڑے گی مجھے؟"

اس کا جواب میرے لیے تحیّر انگیز تھا لیکن میں نے اس کے لہجے سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، پورے اعتماد سے کہہ رہا تھا اور اسی بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

"یہ مکان کب اور کتنے میں خریدا ہے تو نے؟" میں نے اس بار مصالحانہ لہجے میں سوال کیا۔

وہ ہذیانی انداز میں ہنسا۔ "یہ مکان تو بڑی بات ہے میں تو جھونپڑی خریدنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا تھا۔"

"پھر یہ تیری ملکیت کیسے بن گئی؟"

"بس دین ہے میرے مولا کی، خیرات میں ملا ہے۔" اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک عود کر آئی۔

"خیرات میں ملا ہے؟" میں حیرت سے تقریباً چیخ پڑا۔ "کون سخی مل گیا تھا تجھے؟"

"بس اپنے اڈے پر بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا کہ ایک بڑی سی کار میرے پاس آر کی۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق اللہ کے نام پر ہاتھ پھیلا دیا۔ کار والے نے میری ہتھیلی پر دس کا نوٹ رکھتے ہوئے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا کہ مکان چاہیے؟ مجھے کیا انکار ہوسکتا تھا، بس وہ اپنی گاڑی میں مجھے یہاں لے آیا۔"

"اس وقت یہ گھر خالی پڑا ہوا تھا؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"ایک عورت تھی جسے وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ اب تو یہاں میرا راج ہے، ایسا ایسا سامان بھرا پڑا ہے جو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک دو دن میں میں شہر بھر کے فقیروں کی یہاں دعوت کروں گا۔"

"یہ مکان اسی عورت کا ہے، دوسرا آدمی بہت بڑا دھوکے باز ہے، تجھے یہاں پھنسا کر عورت کو اٹھا لے گیا ہے۔ قانونی کارروائی کے بغیر کوئی کسی جائداد کا مالک نہیں بن سکتا، عورت کو موقع مل گیا تو تجھے اندر کرا دے گی۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ایک کاغذ تو وہ دے گیا ہے مجھ کو، کہہ رہا تھا کہ بس وہی کافی ہوگا۔"

بمشکل میں اسے اس بات پر آمادہ کر سکا تھا کہ وہ کاغذ مجھے دکھائے۔ کاغذ دیکھتے ہی میرے منہ سے بے اختیار ایک گہرا سانس آزاد ہوگیا۔ کاغذ پر لکھا ہوا تھا "یہ مکان آج سے حاملِ رقعہ کی ملکیت میں دیا جا رہا ہے، میرا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔" ان سطور کے نیچے قاسم کا نام لکھا ہوا تھا جس کے نیچے اسی دن کی تاریخ درج تھی۔

"مکان مل گیا تھا تو مجھے مارنے کو کیوں دوڑا تھا؟" میں نے پرچا اسے واپس دیتے ہوئے سوال کیا۔

"وہی سخی مائی باپ کہہ گیا تھا کہ کوئی بھی اجنبی یہاں آئے تو اس کے ہاتھ پیر توڑ کر اسے باہر پھینک دوں۔ ورنہ مجھے کمزور دیکھ کر اس کا کوئی بھی واقف کار مجھے نکال کر اس مکان پر قبضہ کر لے گا۔"

"عورت اپنی خوشی سے اس کے ساتھ گئی تھی؟"

وہ ہونٹ بھینچ کر عجیب سے انداز میں ہنسا۔ "عورت کو کوئی زبردستی نہیں لے جا سکتا بابو! وہ ہمیشہ خوشی سے جاتی ہے، رنگے ہاتھوں پکڑی جائے تو شور مچا دیتی ہے کہ اس پر ظلم کیا گیا، اسے زبردستی اٹھا لیا گیا... لے، وہ بھی آ گئے۔"

بات کرتے کرتے اس کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا تھا۔ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پیچھے گھوما تو اوسان خطا ہو گئے اسے لٹو میرے پیچھے اندر داخل ہو کر دروازے کو کنڈی لگا رہا تھا لیکن اس کی قہر بار نگاہیں مجھ پر ہی مرکوز تھیں۔

"مجھے پورا یقین تھا کہ تم یہاں ضرور آؤ گے۔" اسے لٹو زہریلے لہجے میں بولا۔ "میرا خیال درست ہی نکلا کہ وہ کمینی تم سے مل چکی ہے۔"

"اس بیچارے کو کیوں بیچ میں لے آئے؟" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اسے چلتا کرو تا کہ کھل کر دو دو باتیں ہوسکیں۔"

"یہ اب کہاں جائے گا۔" اسے لٹو نے سرد اور سفاکانہ لہجے میں کہا۔ "اسے تو اب ہمیشہ یہیں رہنا ہے، تمھیں یہاں کچھ دیر تک الجھائے رکھنے کے لیے فوری طور پر یہی تجویز ذہن میں آسکی تھی۔"

بگڑا بھکاری اسے لٹو کی معنی خیز بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے فوراً ہی بات کھول دی۔ "اس بے گناہ معذور کو مار کر تمھیں کیا مل جائے گا، بہتر یہی ہوگا کہ اسے جانے دو۔"

"مم... مجھے مار ڈالو گے تم؟" بھکاری کی کھوپڑی پر جمی ہوئی برف پگھلنے لگی تھی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے اسے لٹو کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا اور پھر اپنا بوجھ بار بار ایک سے دوسرے پیر پر منتقل کرنے لگا۔

"یہ بکواس کر رہا ہے؟" اسے لٹو نے سرد مہری کے ساتھ کہا۔ "چپ چاپ کھڑے رہو، تم سے بعد میں بات کروں گا۔"

لحظہ بھر خاموش رہنے کے بعد اسے لٹو مجھ سے مخاطب ہوگیا۔ "بریف کیس کہاں ہے؟"

"ہوٹل چلو تو ابھی لوٹائے دیتا ہوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس قدر ناکارہ چیزوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہو تو ہرگز اتنی محنت نہ کرتا۔"

"اس بار میں تم کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اسے لٹو غرایا اور میں نے دیکھا کہ مجھے دی جانے والی اس دھمکی پر کبڑے بھکاری کا چہرہ دھواں ہوگیا تھا۔ "تمھاری سرکشی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی ہے۔"

میں مضحکانہ انداز میں ہنس پڑا۔ "تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے اب تک مجھے دانستہ ڈھیل دیتے آئے ہو حالانکہ تمھارا بس چلتا تو مہینوں پہلے میری ہڈیوں کا سرمہ بنوا چکے ہوتے۔"

"وہ لڑکی کہاں ہے جو تمھارے ساتھ لاہور گئی تھی؟"

"جہاں بھی ہے، آرام سے ہے، تم اس کی طرف سے فکرمند نہ ہو، البتہ یہ ضرور بتاؤ کہ رخشی کو تم نے کہاں قید کیا ہے؟"

"رخشی بہت جلد اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے گی۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔ "لیکن اس سے پہلے مجھے تمھارا اور تمھاری ساتھی لڑکی کا قضیہ طے کرنا ہے، اس بار میں یہی مشن لے کر کراچی آیا ہوں۔"

"میرے ساتھ جو سلوک چاہو، کر سکتے ہو لیکن یہ یاد رکھنا کہ تمھاری قبر اسی لڑکی کے ہاتھوں تیار ہوگی، وہ میرے ہر راز میں پوری طرح شریک ہے اور تم سے زیادہ پُراسرار ہے۔"

اس نے پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ "اس طرح تم اپنی زندگی کے آخری لمحات کو کربناک بنا لو گے۔ میرے تشدد کے تصور ہی سے تمھارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔"

"آ گئے اپنی اوقات پر۔" میں نے چڑانے والے انداز میں کہا۔ "میرا تو اندازہ تھا کہ شاید اس بار مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جسمانی طاقت کے بل پر ہی مجھے زیر کرنے کی کوشش کرو گے۔"

"اندر چلو۔" وہ ریوالور کی نال کو جنبش دیتے ہوئے غرایا۔

"خیر تمھاری قید میں بھی مجھے زیادہ تکلیف نہ ہوگی۔" میں نے پُرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بریف کیس میں موجود تمھارے شناختی کارڈ سے پتا چل گیا ہے کہ تم غیر مسلم ہو، تمھیں تو پرمٹ پر ملتی ہوگی، اپنا بھی گزارا ہوتا رہے گا۔"

"وہ کارڈ کسی بھی کام نہ آسکے گا۔" وہ بولا۔ "تم ٹھیک ہی سمجھے ہو، وہ کارڈ محض کوٹا حاصل کرنے کے لیے بنوایا گیا تھا۔ قحط کے دن گزر جانے کے بعد اب وہ میرے لیے بھی بے مصرف ہو چکا ہے۔"

میں مڑ کر عمارت کی طرف چل دیا۔ کبڑے بھکاری کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ اسے لٹو کی زہرہ گداز گفتگو سن کر اپنی جگہ کھڑے کھڑے کانپ رہا تھا۔

شاید اسے اپنے انجام کا اندازہ ہو چکا تھا کیونکہ سخی کے روپ میں اسے سجے سجائے عالیشان مکان کا مالک بنانے والا اب اپنی کینچلی بدل کر اصل روپ میں سامنے آگیا تھا اور اس کے ایک ایک لفظ سے تشدد اور خونریزی کی بُو آ رہی تھی جس کا اندازہ لگانے کے لیے کسی خاص ذہانت کی ضرورت نہیں تھی۔

"تم بھی اندر چلو۔" اسے لٹو نے شاید کبڑے بھکاری کو بھی میری تقلید کا حکم دیا تھا۔ میرے قدم بے اختیار زمین میں گڑ گئے۔ میں بھکاری کا چہرہ پڑھ چکا تھا۔ لہٰذا کسی انہونی کے ہونے کی امید میں تماشا دیکھنے کے لیے پیچھے گھوم گیا۔

"مجھ پر رحم کرو مائی باپ!" بھکاری دونوں ہاتھ جوڑ کر رو دینے والی آواز میں کراہا۔ "اللہ تمھارا بھلا کرے گا۔ روزی میں

برکت دے گا۔“

”شٹ اپ!“ اے لٹو نے جھلا کر اسے درمیان ہی میں پھٹکار دیا۔ ”جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو ورنہ چمڑی گرا دوں گا۔“

”مجھے جانے دو۔“ بھکاری کی آواز بھرا گئی۔ ”میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا، جو کچھ یہاں دیکھا ہے، سب بھول جاؤں گا۔ میں تو اپنی اوقات سے بڑھ کر ہاتھ مارنے کے چکر میں برباد ہی ہو گیا۔“

اے لٹو کے دل پر اس کی فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ پہلے ہی بھکاری سے خاصا قریب تھا۔ پھر جوں ہی وہ برہمی کے عالم میں دانت پیستا ہوا اس کی طرف بڑھا، کبڑا بھکاری دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے آگے کی طرف لپکا جیسے اے لٹو کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے کا ارادہ رکھتا ہو، پھر اس سے پہلے کہ اے لٹو اسے روکتا، بھکاری نے اس کی دونوں ٹانگیں جکڑ کر آگے گھسیٹ لیں۔ اور اے لٹو کسی وزنی شہتیر کی طرح پشت کے بل پختہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

فرش سے کھوپڑی ٹکراتے ہی اے لٹو کے حلق سے غضبناک غراہٹ ابھری تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس ضرب پر اسے دن میں تارے نظر آ گئے ہوں گے۔

اپنی جان کے خوف سے سہمے ہوئے کبڑے بھکاری نے زبردست کام کر دکھایا تھا۔ مجھے اس کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا لیکن اے لٹو اس وقت مسلح تھا، میں بھکاری کی مدد سے اے لٹو کو زیر کرنے کے لیے ان دونوں کی طرف لپکا۔ بھکاری جونک کی طرح اے لٹو کی پنڈلیوں سے لپٹا ہوا تھا اور اس کے بدن کو شدید جھٹکے دیے جا رہا تھا اور اے لٹو اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح موقع پاتے ہی داہنا ہاتھ سیدھا کر کے اسے گولی مار دے کیونکہ ریوالور اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

میں نے بڑھ کر اے لٹو کے داہنے ہاتھ کو پکڑنا چاہا اور اسی لمحے شاید کبڑے بھکاری نے مدد آ جانے کی بنا پر اپنی گرفت قدرے ڈھیلی کی اور اے لٹو نے میرے کامیاب ہونے سے پہلے بھکاری کی کھوپڑی میں گولی اتار دی۔

فائر کے پُرشور دھماکے کے ساتھ کبڑے بھکاری کی بھیانک چیخ فلک شگاف تھی۔ اس کی کھوپڑی کے زخم سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا اور وہ خود اچھل کر دور جا گرا تھا۔

میرے لیے وہ صورتِ حال نازک اور بدترین تھی۔ میں نے پوری قوت کے ساتھ اے لٹو کی داہنی کلائی پر ٹھوکر رسید کی، ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اڑتا ہوا دور جا گرا۔ اب اے لٹو غیر مسلح ہو گیا تھا اور میں تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اسے زیر کر سکتا تھا لیکن دھماکے اور بھکاری کی چیخوں کے بعد وہاں رکنا بدترین حماقت کے مترادف ہوتا۔

اس معاملے میں اے لٹو کی قوتِ فیصلہ مجھ پر سبقت لے گئی، میں متذبذب رہا اور اس نے فرش سے اٹھتے ہی مجھ سے الجھنے کے بجائے نکاسی کے راستے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں بھی بلا تامل اس کے پیچھے ہو لیا۔

وہ چونکہ اس رہائشی علاقے کی عقبی سڑک تھی لہٰذا فائر اور چیخ کے باوجود ادھر سناٹا ہی تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اگلی سمت میں اس وقت تک بہت سے لوگ صورتِ حال معلوم کرنے کی فکر میں باہر نکل آئے ہوں گے۔

پھاٹک سے نکلتے ہی اے لٹو کی چال اعتدال پر آ گئی۔ تاکہ اتفاقاً کوئی سامنے آ بھی جائے تو اس پر شبہ نہ کر سکے، میں بھی اسی کے ساتھ ہو لیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی سفید کار میری گاڑی سے آگے کھڑی ہوئی تھی۔

”اب کیا مصیبت ہے؟ جاؤ دفع ہو جاؤ۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے کسی کٹکھنے کتے کی طرح غرایا۔

”فیصلہ نہیں کرو گے میرا؟“ میں نے مضحکانہ لہجے میں سوال کیا۔

”مجھے اس کبڑے کی قوت کا ذرا بھی اندازہ ہوتا تو پہلے اسی کو ٹھکانے لگاتا۔ اب مقدر سے تمھیں کچھ مہلت مل ہی گئی ہے تو فوراً میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ۔ ورنہ میں نتائج کی پروا کیے بغیر یہیں تمھارا خون پی جاؤں گا۔“

”میرا خون بہت کڑوا ہے میرے دوست۔ اسی لیے آج تک زندہ پھر رہا ہوں۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ رخشی کہاں ہے؟ میں فوراً تمھارا پیچھا چھوڑ دوں گا۔ ورنہ تمھارا تعاقب کرتا رہوں گا۔“

”تعاقب۔“ وہ یوں چونک کر بولا جیسے اس وقت تک اس امکان کو فراموش ہی کیے رہا ہو۔ پھر مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”یہ سب سے عمدہ ترکیب ہے۔ کسی بھی ویرانے میں چل کر دو دو ہاتھ کیے لیتے ہیں، جس کا مقدر یاوری کر گیا، وہ زندہ لوٹے گا، دوسرے کی لاش وہیں سڑنے کے لیے پڑی رہ جائے گی۔“

”ایسی گھٹیا باتیں تم ہی سوچ سکتے ہو۔ میں تمھاری لاش کو ہرگز بے گور و کفن نہ چھوڑوں گا۔“ میں نے اچانک خاموش ہو کر اپنے کان فضا پر جما دیے۔ ہوا کی لہروں کے دوش پر وقفے وقفے سے کہیں دور سے کسی سائرن کی موہوم آواز سنائی دے رہی تھی جو بتدریج واضح ہوتی جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید اس علاقے کے کسی مکین نے فائر اور چیخ کے بارے [illegible] پولیس کو باخبر کر دیا ہے۔

میں اپنی کار کے قریب رک گیا۔

”پھر آ رہے ہو نا میرے پیچھے؟“ اس نے آگے بڑھتے [illegible] ہوئے تائید طلب لہجے میں سوال کیا۔

میں ہاتھ ہلا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جب اس کی [illegible] اسٹارٹ ہو کر کافی آگے نکل گئی تو میں نے پھرتی کے ساتھ [illegible] کار واپس گھمائی اور مخالف سمت میں روانہ ہو گیا۔

پولیس کار کے سائرن کا شور اب خاصا قریب آ چکا تھا۔ [illegible] نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ اے لٹو نے بھی اپنی کار واپس [illegible] لی تھی۔ شاید وہ مجھے پھانسنے کے لیے کوئی موثر تدبیر سوچ چکا [illegible] جب ہی ساتھ چلنے پر مصر تھا لیکن میں کسی بھی قیمت پر اپنی [illegible] کو داؤ پر لگانے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

اسٹون ہاؤس میں ریوالور ہاتھ سے نکل جانے کے بعد [illegible] میرے برابر آ گیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ جب وہ دوسری بار [illegible] سے برآمد ہوگا تو نہ صرف کسی آتشیں اسلحے سے لیس ہوگا [illegible] ایک آدھ کیمیاوی چٹکلا بھی ساتھ لائے گا۔ تاکہ مجھے کچھ سوچنے [illegible] کا موقع دیے بغیر زیر کر سکے۔

اسے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر میں نے کار فوراً ہی ایک [illegible] گلی میں موڑ لی اور پھر میں سمت یا فاصلے کا تعین کیے بغیر [illegible] گلیوں میں بھٹکتا رہا۔ کم و بیش دس منٹ بعد ایک مانوس [illegible] نظر آئی تو میدان صاف تھا۔

میرے ذہن میں رہ رہ کر اس کبڑے بھکاری کا پیکر سر [illegible] رہا تھا جو بیچارہ خیرات میں ملنے والی ایک کوٹھی کے [illegible] میں آخرکار اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ اس بدنصیب کی رحم انگیز [illegible] اپنی جگہ تھی اور دوسری طرف رخشی بھی غائب ہو چکی تھی [illegible] بھکاری کے بیان کے مطابق اسے لے جانے والا اے لٹو تھا۔

تین دن پہلے جہانگیر پُراسرار طور پر غائب ہوا اور اب [illegible] رخشی دن دہاڑے اپنے گھر سے اٹھا لی گئی تھی۔ مجھے یوں محسوس [illegible] ہو رہا تھا جیسے میری لاہور میں موجودگی کے دوران کراچی [illegible] کے معاملات کچھ عجیب سی نہج پر چل پڑے تھے جن کا بظاہر [illegible] کوئی سر پیر نظر نہیں آتا تھا۔ لے دے کر بس یہی ایک امکان [illegible] ذہن میں آتا تھا کہ ان لوگوں سے یقینی طور پر کہیں نہ کہیں کوئی [illegible] سنگین بے احتیاطی سرزد ہوئی تھی کہ اے لٹو بذاتِ خود فوری [illegible] طور پر کراچی کے معاملات میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا اور [illegible] اس نے کراچی آتے ہی سب سے پہلے رخشی پر ہاتھ ڈالا تھا جو [illegible] میری دوست اور ہمدرد تھی۔

ایک دن میں دو بار اے لٹو سے ٹکراؤ ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور دونوں ہی بار حالات کے تحت ہم دونوں ایک دوسرے کا کچھ بگاڑے بغیر اپنی اپنی راہ پر ہو لینے پر مجبور ہو گئے تھے اور اس ساری جمع تفریق کے نتیجے میں کبڑا بھکاری بے موت مارا گیا تھا۔

اس وقت میرے ذہن میں رہ رہ کر ایک نام سر ابھار رہا تھا۔ عزیز احمد جو کسی زمانے میں قاسم کا دستِ راست ہوا کرتا تھا۔ پھر قاسم کی موت کے بعد کچھ روز کے لیے وہ لاپتا ہو گیا اور جب تنظیم کی طرف سے قاسم کا منصب رخشی کو سونپا گیا تو اس نے بکھرے ہوئے لوگوں کو یکجا کرنے کی کوشش میں عزیز احمد سے بھی رابطہ قائم کیا لیکن عزیز نے دوٹوک الفاظ میں اس کے لیے کام کرنے سے انکار کر دیا۔

پھر مجھے اے لٹو کے بریف کیس میں سے کاغذ کا ایک پرزہ ملا جس پر عزیز احمد کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس بارے میں تھوڑی ہی دیر پہلے رخشی سے معلوم ہوا تھا کہ عزیز نے ان دنوں بندرگاہ کے علاقے میں تیسرے درجے کا ایک ہوٹل خرید لیا ہوا تھا اور شام کو عموماً وہیں پایا جاتا تھا۔

اے لٹو کے بریف کیس سے اس کا نام برآمد ہونے کی وجہ سے اس کی ذات میرے لیے اہمیت اختیار کر گئی تھی اور میرا خیال تھا کہ اس سے مجھے کوئی نہ کوئی اہم سراغ ضرور مل سکے گا لیکن میرے لیے کرنل زوار زیدی کی کار اب مخدوش ہو چکی تھی، اے لٹو اسے دیکھ چکا تھا اور دور سے بھی پہچان سکتا تھا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں اے لٹو کار کے نمبروں کے سہارے رجسٹریشن آفس سے کار کے مالک کا سراغ نہ لگا لے۔ ایسی صورت میں وہ کرنل زوار زیدی پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتا اور پھر یہ معلوم ہوتے ہی کہ کرنل ایک جوان لڑکی کا بھی باپ ہے، اس کے ذہن میں غزالہ کا نام ابھر آتا جس کی تصاویر کی تنظیم میں خاصی تشہیر ہوئی تھی۔ پھر غزالہ کی شناخت کے ساتھ ہی دشواریوں کا ایک نیا باب کھل جاتا۔ میں نے فوراً ہی گاڑی راستے میں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

شہر کے ایک بارونق علاقے میں کار پارک کر کے میں ٹیکسی سے گھر روانہ ہو گیا۔

”گاڑی کیا ہوئی؟“ مجھے ٹیکسی سے برآمد ہوتے دیکھ کر غزالہ کے باپ نے لٹھ مار انداز میں سوال کیا تھا۔

”رات چوری ہو گئی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پیشانی پر جا چڑھیں۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ ابھی صبح تو تم لے گئے ہو۔“

"راستے میں چھوڑ آیا ہوں۔ آپ کو اس کی چوری کی رپورٹ درج کرانا ہے۔" میں نے کہا اور وہ اس اقدام کا سبب معلوم کرنے پر تل گیا۔ میں نے اسے اختصار کے ساتھ مقصد سے آگاہ کیا تو وہ فوراً ہی رپورٹ درج کرانے روانہ ہو گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر کار کی بازیابی میں تاخیر ہو گئی تو وہ کہیں سچ مچ نہ چرالی جائے۔

اس کے جاتے ہی عزالہ میرے پاس آ پہنچی "بہت جلد واپس لوٹ آئے ہیں آپ؟"

"ہاں، رخشی کو بددعا لگ گئی تمہاری۔"

"کیوں؟ کیا ہوا اسے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"میرے پہنچنے سے پہلے اے ٹو اسے اٹھا لے گیا۔ مجھے وہاں الجھائے رکھنے کے لیے ایک بھکاری کو وہاں چھوڑ گیا تھا اور اس مقصد میں پوری طرح کامیاب رہا۔ رخشی کو کہیں پہنچا کر واپس آیا تو میں وہیں بھکاری کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔"

"تو کیا وہ پہلے ہی رخشی کی طرف سے کھٹک گیا تھا؟"

"بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت وہ میرے ہاتھوں سے بال بال بچا ہے۔ اگر وہ بھکاری اس کے ہاتھوں نہ مارا گیا ہوتا تو اے ٹو اس وقت میرا قیدی ہوتا۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ رخشی نے اے ٹو کے ساتھ مل کر آپ کو گھیرنے کی کوشش کی ہو؟" وہ پوری کہانی خاموشی کے ساتھ سننے کے بعد بولی۔ "اے ٹو کو سگنل دے کر خود ہی وہاں سے کھسک گئی ہو تاکہ آپ کی نگاہوں میں بدستور اچھی بنی رہے؟"

"کوڑی تو بہت دور کی لائی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مگر بڑے بھکاری نے بھی جو کچھ بتایا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ رخشی اپنی مرضی سے اے ٹو کے ساتھ گئی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جہاں تک میں اس کے مزاج کو سمجھ سکا ہوں، وہ بہت ضدی عورت ہے۔ اسے اپنے فیصلے تبدیل کرنے پر آمادہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ایک بار وہ اے ٹو کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کر چکی ہے تو اب اس کے ساتھ ہرگز مخلص نہ ہو سکے گی۔"

"پھر اب آپ اسے بھی تلاش کریں گے؟"

"مل گئی تو آزاد کرا ہی لوں گا۔ ورنہ اصل نشانہ اس بار اے ٹو ہے۔"

"اے ٹو بڑا عجیب سا لگتا ہے۔" وہ بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی افسانوی دنیا کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ اس کا نام کیوں نہیں لیتے؟"

"کیا نام لوں؟ جب اس نے خود ہی افسانوی روپ دھارا ہوا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں، پہلے توقیر کے نام سے سامنے آیا تھا پھر آج صبح لاہور سے پتا چلا کہ اس کا نام راجہ ظہور احمد ہے۔ بریف کیس کھولا تو پرویز احمد کے نام کا شناختی کارڈ سامنے آگیا۔ اب بتاؤ کہ اس کا ذکر کس نام سے کیا جائے؟ اس کے علاوہ تو سب ہی سامنے آچکے ہیں۔"

"آپ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "پھر اب کدھر کا قصد ہے؟"

"بندرگاہ کے علاقے کی خاک چھاننے کا ارادہ ہے۔ اس بار اسلحہ ساتھ لے کر نکلوں گا۔"

پستول اور فالتو راؤنڈز کے ساتھ ہی عزالہ کے ایما پر میں نے اے ٹو کے بریف کیس سے برآمد ہونے والی پوٹاشیم سائنائیڈ کی شیشی ایک سرنج سمیت ساتھ لے لی اور پھر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

پہلے میرا ارادہ تھا کہ ایک چکر فیکٹری کا بھی لگاؤں گا، کیونکہ ادھر کے معاملات سے میں کافی عرصے سے لاتعلق ہو کر رہ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ طویل اور ناکام نگرانی کے بعد فیکٹری کا پیچھا چھوڑ دیا گیا ہو گا لیکن پھر میں نے پروگرام بدل دیا۔ اے ٹو شہر میں موجود تھا اور میری یہاں آمد سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ شاید میں موقع ملتے ہی فیکٹری کا رخ کرنے کی کوشش کروں۔ ایسی صورت میں میرا وہاں جانا قیامت سے کم نہ ہوتا۔

میں نے نگینہ سینما کے قریب ٹیکسی چھوڑ دی۔

ٹیکسی سے اتر کر میں سگریٹ خریدنے کے لیے ایک دکان کی طرف بڑھ گیا۔

"عزیز کا ہوٹل کدھر ہے چاچا؟" میں نے دکاندار کو سگریٹ کے پیسے دیتے ہوئے سرسری لہجے میں سوال کیا۔

"آزیز کا ہوٹل۔" دکاندار نے اشتباہ آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے دہرایا۔ پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "خریدنا ہے یا بیچنا ہے؟"

میرے لیے اس کا ردِعمل غیر متوقع تھا۔ لحظہ بھر کے لیے تو میں بوکھلا گیا لیکن فوراً ہی سنبھالا لے لیا اور مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ "وہ کیا بیچتا اور خریدتا ہے؟"

"چرس، افیم، ہیروئن، ولایتی دارو۔ ہر چیز کا سودا کرتا ہے، تم کیا لایا ہے؟"

"نہ لایا ہوں، نہ لے جانا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہاں میرے گاؤں کا ایک چھوکرا کام کرتا ہے، اسے اس کی ماں کا خط پہنچانا ہے۔ میں کوئی غلط دھندا نہیں کرتا۔"

"پھر روٹی کدر سے کھاتا ہے بابو؟" وہ بگڑ کر تلخ لہجے میں

بولا۔ "دال، چاول، پان، سبزی بیچو تو کارپوریشن سے انکم ٹیکس تک سب سر پر آنے لگتے ہیں۔ چرس، ہیروئن کو قانون مانتا ہی نہیں، جتنا چاہے بیچو اور خریدو، اس کا نہ حساب دینا پڑتا ہے نہ ٹیکس۔ جائز کاروبار پر ظلم یوں ہی بڑھتا رہا تو ایک دن سب راستے پر لگے ہوئے ملیں گے۔ میں خود یہی کام کرتا ہوں۔ بھاڑا دلا کر بھی چار پیسے کما لیتا ہوں، باقی سب تو یہی دھندا ہے۔"

اس دل جلے کی گفتگو دلچسپ تھی لیکن میرے پاس وقت نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اس موضوع کو آگے بڑھانے کے بجائے اسے عزیز کا ہوٹل یاد دلایا تو وہ ہنس پڑا اور خفت آمیز لہجے میں بولا۔ "معاف کرنا بابو۔ ذرا دماغ کو گرمی چڑھ گئی تھی۔ پہلے میں بھی یہ سب کچھ برا سمجھتا تھا اور ہر وقت پریشان رہتا تھا۔ جب فاقوں تک بکنے کی نوبت آئی تو پڑیاں، پوے اور ادھے بیچنے لگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی میں خوشحال ہوں۔"

وہ مجھے عزیز کے ہوٹل کا راستہ بتانے لگا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ خرابی کہاں تھی؟

معاشرے میں خرابیاں دن بدن ناسور کی طرح پھیلتی جا رہی تھیں۔ پندرہ بیس برس پہلے بھی خرابیاں تھیں لیکن انہوں نے معاشرے کی مستحکم اقدار کا درجہ حاصل نہیں کیا تھا۔ رشوت خور بھی چھپ چھپ کر ڈرتے ڈرتے رشوت لیتا تھا، ملاوٹ کرنے والا بھی دلیر نہیں تھا، اسی قدر ملاوٹ کرتا تھا کہ گاہک کو شبہ نہ ہو سکے۔ شرابی ہر ایک سے چھپ کر اپنا شوق پورا کرتا تھا لیکن اب تو پورا آوا ہی بگڑا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ رشوت حق سمجھ کر کھلے عام طلب کی جا رہی تھی۔ بے غیرتی کے ساتھ کھلے بندوں سودے کیے جاتے تھے، ملاوٹ تجارت کا ایک بنیادی رکن بن چکی تھی۔ دھوکے باز بے خوف ہو چکے تھے، اعتراض کرنے والوں کے دانت سے لے کر ہاتھ پیر تک توڑ دیے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تمام مخلوق طاقتوں نے باہمی تعاون کا معاہدہ کر کے اچھائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اللہ کے اس مشکور و ممنون بندے کے بیان کے مطابق عزیز کا ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ میں ہوٹل کی طرف روانہ ہوا تو بس ایک ہی خیال ذہن پر طاری تھا کہ اگر مجھے ملک کا آمرِ مطلق بنا دیا جائے تو میں ان خرابیوں کی کس بنیاد پر سب سے پہلے ضرب لگاؤں گا؟

دھوپ خاصی تیز تھی اس کے باوجود پیدل چلتے ہوئے اچانک ہی میرے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔

آئین، جمہوریت، شخصی آزادیاں، بنیادی حقوق اور طرزِ حکومت سب سیاستدانوں کی کھلی ذہنی عیاشیاں تھیں۔ عوام الناس کا ان سب سے براہِ راست کوئی گہرا تعلق نہیں تھا۔ عوام کا دن رات قانون سے واسطہ پڑتا تھا اور ملک میں وہی مبہم اور سنگدلانہ قانون نافذ چلا آ رہا تھا جسے انگریزوں کے دورِ حکومت میں نوآبادیاتی مفادات کی پرورش کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔

اس قانون کی بیشتر اہم دفعات میں اگر، مگر، چونکہ، چنانچہ اور بشرطیکہ کے ساتھ پے در پے اس قدر سقم رکھے گئے تھے کہ عملاً یہ قانون افسرِ مجاز کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گیا تھا۔ جب تک انگریز اس خطۂ زمین پر حکمراں رہا، سارے قوانین کو ان کی اصل روح کے مطابق نافذ کراتا رہا۔ اگر، مگر، چونکہ، چنانچہ وغیرہ کا سہارا صرف اسی وقت لیتا تھا جب اس کے نوآبادیاتی مفادات پر براہِ راست کوئی ضرب پڑنے کا امکان ہوتا تھا اور ایسے مواقع پر عموماً بدترین فیصلے صادر ہوتے تھے۔ دیگر حالات میں وہی کچھ فیصلہ کیا جاتا جو قانون کی کتابوں میں اگر، مگر سے پہلے درج تھا۔ پھر انگریز بہادر دو قوموں کو پروانۂ آزادی تھما کر اپنے ڈوبتے سورج کو سہارا دینے چلا گیا۔ ان نوآبادیاتی قوانین کی اصل روح اپنے آقاؤں کے ساتھ ہجرت کر گئی اور اس خطۂ زمین پر صرف قانون کے بے روح اور سپاٹ الفاظ رہ گئے جن کا نفاذ کالے آقاؤں کے ہاتھ میں آگیا۔

خاک و خون کے ہولناک بگولوں کی گرد بیٹھی تو ان کالے آقاؤں نے قوانین کو دیکھا اور بالکل انگریز کے سے انداز میں ان کا نفاذ شروع کر دیا۔ آزادی کے ساتھ فرق یہ پڑا کہ پہلے اگر، مگر کو صرف اور صرف نوآبادیاتی مفادات کے لیے حرکت میں لایا جاتا تھا، اب کالے آقاؤں نے بطورِ آزمائش اس سقم کو ذاتی مفادات کے لیے آزمانا شروع کر دیا۔ وہ وارداتیں حیرتناک حد تک کامیاب ثابت ہوئیں اور یوں ملک میں ایک بری روایت چل نکلی جو نیک نیت لوگوں کو بتدریج پسِ پشت لے گئی۔

جو قانون کا جتنا زیادہ اور پکا محافظ تھا، اسی قدر اس کا کام آسان تھا۔ افسرانِ مجاز کی صوابدید پر اتنے بڑے بڑے فیصلے چھوڑ دیے گئے تھے کہ اگر افسر کے دل میں بے ایمانی آجائے تو وہ محض ایک سودے میں عمر بھر کی کمائی حاصل کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مفاہمت ہر کس و ناکس کے بس سے باہر تھی۔ لہٰذا ساری مہم کا رخ تجارت پیشہ طبقوں کی طرف ہوتا چلا گیا جو اپنے نفع نقصان کا تمام تر بوجھ صارفین کی جیبوں پر منتقل کرنے پر قادر تھے۔

گاہے گاہے دوسرے بھی تختۂ مشقِ ستم بنتے رہے لیکن بدنیت لوگوں نے اس کھیل میں پوشیدہ بھاری منفعت کو فوراً بھانپ لیا۔ جہاں ابہام نہیں تھے وہاں ایجاد کر لیے گئے۔ تاجر خوش کہ ہزار کی جگہ دو سو کا محصول نافذ ہوتا ہے۔ افسر اپنی جگہ

خوش کہ سرکار سے لگی بندھی تنخواہ کے ساتھ محض ایک چڑیا بٹھانے کے سو مل گئے اور یوں ملی بھگت سے آنے والا مال بازار میں لاگت سے بھی کم داموں پر بکنے لگا تو ایماندار دکانداروں کے چھکے چھوٹ گئے اور رفتہ رفتہ اس ملی بھگت کو اکثریت نے ایک سود مند متبادل کے طور پر قبول کر لیا جو اس صورت حال سے سمجھوتا نہ کر سکے، وہ بازار میں کبھی نہ پنپ سکے کیونکہ رشوت خور افسر کی دلی خواہش ہوتی تھی کہ ہر ایک بے ایمانی کرے تاکہ اسے اپنے سیکڑے ملتے رہیں، ایمانداروں سے اسے خاک ملنا تھا جو وہ انھیں رعایتیں دیتا۔

میری دانست میں یہ رشوت کی مختصر اور جامع سی تعریف تھی اور اگر نو آبادیاتی قوانین کو بیک جنبشِ قلم موقوف کر کے نئے قوانین تصنیف کیے جاتے جن میں افسرانِ مجاز کے اختیاراتِ تمیزی کو حتی الامکان کم کرتے ہوئے ہر جرم کی واضح اور غیر مشروط تعریف کے ساتھ اس کی سزا بھی مندرج کر دی جاتی تو معاشرے سے بے شمار خرابیاں خود بخود مفقود ہو جاتیں۔

اچانک میرا پیر ایک گڑھے میں جا پڑا۔ شدید جھٹکا سا لگا لیکن میں کوشش کر کے گرنے سے بچا رہا۔ میں نے فوراً ہی چلتے چلتے سوچنے کے سلسلے کو خیر باد کہا اور سگریٹ سلگا کر گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہوا بڑھنے لگا۔

آخر کار میں بتائے ہوئے پتے پر ایک بے نام ہوٹل کے سامنے پہنچ گیا۔ جہاں دوپہر کے وقت بھی خاصی بھیڑ نظر آ رہی تھی۔ میں کسلمندانہ انداز میں ٹہلتا ہوا ہوٹل میں داخل ہو گیا اور خالی میز کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگا لیکن ہوٹل میں کوئی میز خالی نہیں تھی۔ میں بڑھ کر ایک ایسی میز کے گرد جا بیٹھا جہاں پہلے سے ایک ادھیڑ عمر مزدور براجمان تھا۔

میرے بیٹھتے ہی ایک نوخیز لڑکے نے پانی سے بھرا ہوا اسٹین لیس اسٹیل کا جگ اور گلاس پوری قوت سے ماربل کی میز پر لا پٹکا۔ اسی لمحے ملے جلے شور میں تیز گھنٹی کی آواز گونجی۔ میں نے سر گھمایا تو کاؤنٹر پر دو افراد کھڑے تھے۔

”بھائی سے ڈھائی روپیہ۔“ ہوٹل کے کسی گوشے سے ایک آواز گونجی اور کاؤنٹر والا اپنے سامنے والوں کو ریزگاری لوٹانے لگا۔

لباس کے اعتبار سے میں ہوٹل میں موجود لوگوں سے بالکل الگ نظر آ رہا تھا۔ چند لمحے چاروں طرف دیکھنے کے بعد میں نے جگ میں سے پانی نکال کر پیا اور ٹیبل والے کو ایک چائے کا آرڈر دے دیا۔

اسی دوران میں میرے سامنے بیٹھا ہوا ادھیڑ عمر مزدور کئی بار تجسس آمیز نگاہوں سے میرا جائزہ لے چکا تھا لیکن جوں ہی میں اس کی طرف متوجہ ہوتا، وہ مجھ سے لاتعلق نظر آنے لگتا۔

جمود توڑنے کی خاطر میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ماچس کے لیے سامنے والے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے بے نیازی کے ساتھ مٹھی میں دبے ہوئے سگریٹ کے ٹوٹے کا گل جھاڑ کر وہی میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر شکریے کے ساتھ ٹوٹا اسے واپس کر دیا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے اپنی حکمت عملی میں فوری طور پر رد و بدل کر ڈالا اور اپنے سامنے والے سے بات کرنے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا۔ پیالی خالی کر کے میں کاؤنٹر پر پہنچا اور پیسے ادا کرتے ہوئے کاؤنٹر والے سے سوال کر بیٹھا۔

”عزیز بھائی کدھر ہے؟“

”تم کون ہو؟“ اس نے اشتباہ آمیز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

وہ میرا پرانا یار ہے، سنا ہے کہ اسی علاقے میں کوئی ہوٹل لے لیا ہے اس نے، یہ اسی کا ہوٹل تو نہیں ہے؟“

”اسی کا ہے۔ ملنا ہے تو شام چھ بجے آ جانا۔ کاؤنٹر پر وہی ملے گا۔“

”اوہ!“ میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”شام میں تو میں کراچی سے چلا جاؤں گا۔“ پھر بے پروایانہ لہجے میں بولا۔ ”خیر! میرا نام سلام ہے۔ اسے میرا سلام کہہ دینا، پھر کبھی ادھر آنا ہوا تو اس سے مل لوں گا۔“ میں نے دانستہ اس کا پتا معلوم نہیں کیا۔

”کوئی ضروری کام تو نہیں ہے اس سے؟“ کاؤنٹر والے نے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔

”نہیں۔ کام تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے معلوم ہوتا کہ میں کراچی آ کر اس سے ملے بغیر لوٹ گیا تو بہت ناراض ہوتا۔ اب کم از کم وہ کوئی شکایت تو نہ کر سکے گا مجھ سے۔“

”تم کہاں سے آئے ہو؟“

”لاہور سے چار روز پہلے آیا تھا۔ آج شام واپس جا رہا ہوں۔ مجھے کل ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ ادھر ہوٹل چلا رہا ہے۔ ویسے وہ اس وقت کہاں ہو سکتا ہے؟“

”بادشاہ آدمی ہے۔ شہر بھر میں کہیں بھی ہو سکتا ہے۔“ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جانتے ہوئے بھی کچھ چھپا رہا تھا۔ ”بتانے کو میں دو چار ٹھکانے بتا سکتا ہوں لیکن تم پردیسی ہو، جگہ جگہ دھکے کھاتے پھرو گے، ہو سکتا ہے کہ وہ پھر بھی تمھارے ہاتھ نہ آ سکے، تم بلا وجہ مجھے بددعائیں دیتے پھرو گے۔“

”ٹھکانے بتا دو، وقت ہوا تو کوشش کر لوں گا۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسی اثنا میں یکے بعد دیگرے کاؤنٹر پر دو گاہک آ گئے۔ ایک نے خورد و نوش کے پیسے ادا کیے تھے دوسرے نے داہنی آنکھ دبا کر مال مانگا تھا اور کاؤنٹر والے نے اپنی ایک دراز سے میری جانی پہچانی ہیروئن کی پڑیا نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

”شہر میں تم بلا وجہ ہی بھٹکتے پھرو گے۔“ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ کہنے لگا۔ ”تم اس کے پرانے دوست ہو، اس لیے بتا رہا ہوں۔ ورنہ کسی کو ادھر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ مل ایریا میں تھانے سے آگے ایک پلاٹ پر بہت بڑا کھلا گودام ہے، وہاں ایک بڑا ہال بھی بنا ہوا ہے۔ وہاں پہنچ کر چوکیدار سے پوچھ لینا۔ عزیز نے ملنا چاہا تو خود ہی اندر بلا لے گا۔“

”تو کیا یہ امکان بھی ہے کہ وہ ملنے سے انکار کر دے؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

”یہ تمھارے اور اس کے تعلقات پر منحصر ہے، میں نے بتایا نا کہ کسی کو ادھر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ تم بھی اسے یہ مت بتانا کہ وہاں کا پتا میں نے بتایا ہے۔ تم اس کے پردیسی دوست ہو، اس لیے بتائے دے رہا ہوں۔“

”وہ وہاں کیا کرتا ہے جو کسی کا آنا پسند نہیں کرتا؟“

”یہ سب اسی سے پوچھ لینا۔“ وہ میرا سوال ٹال کر مجھے گودام کا پتا سمجھانے لگا۔

میں وہاں سے سیدھا سوسائٹی کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ اب میرے لیے سواری کا انتظام ناگزیر ہو گیا تھا جس کے لیے کرائے کی کار ہی سب سے موزوں رہتی۔

سوسائٹی کے ایک شوروم سے طاقتور انجن والی ایک کار کرائے پر حاصل کر کے مل ایریا کی طرف روانہ ہو گیا اور تھوڑی سی تلاش کے بعد اس گودام پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس کا پتا عزیز کے ہوٹل سے معلوم ہوا تھا۔

وہ گودام ایک بالکل ویران علاقے میں واقع تھا جہاں قرب و جوار کے صنعتی پلاٹوں کے گرد صرف چار دیواری بنانے پر اکتفا کیا گیا تھا یا پھر وہ خالی ہی پڑے ہوئے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان وسیع و عریض قطعاتِ آراضی کے مالکان کو زمین کے حصول سے زیادہ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ورنہ برسہا برس گزرنے کے بعد وہاں ایسی ویرانی کا راج نہ ہوتا۔

میں نے کار ایک طرف چھوڑی اور مطلوبہ گودام کے زنگ خوردہ آہنی پھاٹک کے سامنے پہنچ گیا۔ پہلے میرا ارادہ پھاٹک پر دستک دینے کا تھا لیکن مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اندر کتنی نفری ہوگی لہٰذا چند ثانیوں تک اندر کی سن گن لینے کے بعد میں آگے بڑھ گیا۔ کافی آگے ایک جگہ مجھے شکستہ دیوار میں چند دراڑیں نظر آ گئیں جو بآسانی قدم جمانے کے کام آ سکتی تھیں۔

میں نے ارد گرد کا میدان صاف دیکھ کر دیوار پر چڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ پہلی دراڑ میں قدم جما کر میں نے دیوار کا کنارا تھاما اور اوپر اٹھ کر اندر کا جائزہ لیا تو وہاں کچے میدان میں جا بجا کاٹھ کباڑ کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں کسی ذی روح کا وجود نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دیوار پر چڑھ کر پھرتی کے ساتھ اندر کود گیا۔

کچھ دیر تک میں وہیں زمین پر بیٹھا اندر کے محلِ وقوع کا اندازہ لگاتا رہا جو زیادہ پیچیدہ نہیں تھا۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ پھاٹک کے قریب ایک کوٹھری بنی ہوئی تھی اور پلاٹ کے انتہائی عقبی حصے میں دیوار سے ذرا دور ایک بڑا سا شیڈ بنا ہوا تھا جہاں عزیز کو موجود ہونا چاہیے تھا۔

میں اس وقت بھیڑیوں کے بھٹ میں آ گھسا تھا اور مجھے اس جسارت کے انجام کا کچھ علم نہیں تھا لیکن پیشقدمی کرنے کے بعد پیچھے ہٹنا میرے لیے ناممکنات میں سے تھا۔ میں دیوار سے لگے لگے پھاٹک کے قریب بنی ہوئی چوکیدار کی کوٹھری کی طرف بڑھنے لگا۔ کوٹھری کے قریب پہنچ کر مجھ پر جھلاہٹ سی طاری ہو گئی۔ میں شروع سے ایسی احتیاط کر رہا تھا جیسے میرا معرکہ کسی پلاٹون سے ہونے والا ہو لیکن وہاں کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس پر ایک صحتمند قبائلی پوری بے فکری کے ساتھ پاؤں پسارے چت پڑا سو رہا تھا۔

میں بھرا ہوا پستول سنبھال کر کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ اس کا داہنا پیر میں نے ہلایا تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولی تھیں پھر اپنے سامنے ایک پستول بردار اجنبی کو دیکھ کر اس کے فرشتے کوچ کر گئے اور وہ مشینی انداز میں چارپائی سے اٹھتا چلا گیا۔

”تم کون ہے؟“ اس نے اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے ہی بوکھلائے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔

”ہمارا تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے برادر خان!“ میں نے اسی کے لب و لہجے میں نرمی سے کہا۔ ”تمھارا صاحب کدھر ہے؟“

”اوئے برادر خان کو غرق کرو۔“ وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم چور کا بچّہ! اندر کیسے آیا؟“

وہ میرے لہجے کی نرمی سے غلط معنی اخذ کر رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس سے سخت رویّہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ”ہوش میں رہ کر بات کرو ورنہ کھوپڑی کے ٹکڑے اڑا دوں گا۔ اس جگہ کا مالک کون ہے؟“

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر مجھے یوں گھورا جیسے بس چلے تو مجھے کچّا ہی چبا جائے گا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

”مجھے جواب چاہیے۔ میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا۔“

”جگہ کا مالک ولایت میں ہے۔“ وہ پھنکارتے ہوئے بولا۔

”اس کا نام کیا ہے؟“

”مالک، مالک ہوتا ہے۔“ وہ اُجڈ لہجے میں بولا۔ ”نام وام ہم کو مالوم نہیں۔“

”عزیز احمد کون ہے؟“ میں نے سرد اور بے رحمانہ لہجے میں سوال کیا۔

میری زبان سے عزیز کا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں میں یوں حیرت اُمڈ آئی جیسے میں نے کوئی انہونی سی بات پوچھ لی ہو پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہم تمھارا کسی بات کا جواب نہیں دے گا۔ تم ہم کو نوکری سے نکلوائے گا۔“

وہ ضدی طبیعت کا روایتی قبائلی تھا جو جان دینا گوارا کر لیتا لیکن اپنے مالکان کے خلاف زبان ہرگز نہ کھولتا۔ لہٰذا میرے لیے اس پر وقت خراب کرنا بے سود تھا۔ میں نے اسے کچھ سمجھنے کا موقع دیے بغیر پستول بائیں ہاتھ میں تھاما اور داہنے ہاتھ سے اس کی کنپٹی پر ایسی بھرپور ضرب لگائی کہ وہ لحظہ بھر کے لیے بھی اپنے قدموں پر نہ ٹھہر سکا اور دونوں ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے تیورا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

مجھے یقین تھا کہ اس کی بے ہوشی خاصی طویل ثابت ہو گی لیکن میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے کوٹھری کا دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی تاکہ وہ ہوش میں آکر بھی آسانی کے ساتھ باہر نہ نکل سکے۔

وہاں کسی گارڈ کو موجود نہ پاکر مجھے یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ کم از کم اے لٹو وہاں موجود نہیں تھا۔ عزیز کے بارے میں میں نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید اس نے اس ویران پلاٹ پر منشیات کی تیاری یا ذخیرہ اندوزی کا کوئی چکر چلایا ہوا تھا۔ جب ہی وہ کسی کی وہاں آمد پسند نہیں کرتا تھا لیکن میں اس کے کیشیئر کے پیٹ میں اتر کر وہاں تک آنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

کوٹھری سے فارغ ہونے کے بعد میں دور افتادہ حصّے میں بنے ہوئے شیڈ کی طرف ہو لیا۔

اس شیڈ میں داخلے کا بس ایک ہی راستہ تھا جو اندر سے بند تھا۔ میں نے اس پر زور آزمائی سے پہلے شیڈ کا طواف کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ فرار کے امکانی راستے نظر میں آسکیں۔

میں شیڈ اور احاطے کی عقبی دیوار کے درمیانی گلیارے سے گزر رہا تھا کہ اچانک میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ کسی سمت سے ائیر کنڈیشنر چلنے کی دھیمی اور مسلسل گھوں گھوں سنائی دے رہی تھی۔ ابھی میں ائیر کنڈیشنر کی تلاش میں نظریں دوڑا ہی رہا تھا کہ اچانک فضا میں ایک موہوم سی چھنکار ابھری جیسے کسی عورت نے بوجھل آواز میں مختصر سا قہقہہ لگایا ہو۔ میں نے دیوانہ وار ہر طرف کا جائزہ لے ڈالا لیکن اب فضا پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہونے لگا تھا جیسے وہ نسوانی قہقہہ میرے وہم کی پیداوار رہا ہو۔ میں کافی دیر تک کسی آہٹ، کسی آواز کے انتظار میں اسی گلیارے میں وقت برباد کرتا رہا لیکن اس کے بعد نادیدہ ائیر کنڈیشنر کی آسیبی گھوں گھوں کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دی۔

میں نے مایوسی کے عالم میں اس شیڈ کا طواف مکمل کیا اور پھر تن بہ تقدیر ہو کر داخلے کے واحد راستے پر مقدر آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا، میں نے پوری طرح چوکنّا ہو کر پستول ہی کے دستے سے شیڈ کے آہنی دروازے پر گویا طبلِ جنگ بجا دیا۔

اس وقت میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا اور انتظار کا ایک ایک لمحہ صدیوں طویل محسوس ہو رہا تھا... ایک... دو... تین... شاید چار پانچ منٹ اسی روح فرسا انتظار میں گزر گئے لیکن میں نے اپنے تمام تر اضطراب کے باوجود دوبارہ دروازے پر دستک نہ دی کیونکہ آقاؤں کی لغت میں چوکیدار کی ایسی کوئی جسارت سرکشی کے زمرے میں گنی جاتی ہے اور میں اندر والوں کو یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس ناگہانی مداخلت کا ارتکاب چوکیدار کی طرف سے ہوا ہے۔

آخر کار کھٹکا کھلنے کی پُرشور آواز کے ساتھ برہمی کے عالم میں دروازہ کھولا گیا۔ ”کیا مصیبت ہے نادر خان؟“ اسکاچ کے تیز بھبکے کے ساتھ ایک ناگوار آواز ابھری۔

میں پستول سیدھا کیے دیوار کی اوٹ سے اچانک سامنے آگیا۔

”تت... تم کون ہو؟“ مخمور آنکھوں والے نے لکنت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”خدائی فوجدار۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”نادر خان اپنی کوٹھری میں گہری نیند سو رہا ہے، ہاتھ اٹھا لو اور جو کچھ کہوں اس پر بلا چون و چرا عمل کرتے جاؤ۔ ورنہ بلا تامّل جہنّم واصل کر دوں گا۔“ میرے رویّے پر وہ ہکّا بکّا رہ گیا تھا، کچھ نشے کی جھونک پھر میرا اچانک نمودار ہونا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ سب کیسے اور کیونکر ہو گیا لیکن یہ غنیمت تھا کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لیے تھے۔

میں اسے کور کیے اندر داخل ہوا تو چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ بظاہر خستہ و شکستہ نظر آنے والا وہ شیڈ اندر سے کچھ اور ہی بنا ہوا تھا۔

کے تقریباً وسط میں لگے ہوئے دروازے کی داہنی جانب سامان ذخیرہ کرنے کے لیے کھلی جگہ تھی جہاں گتّے کے ڈبوں اور لکڑی کے کریٹوں کے کئی ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ بائیں طرف دوسری ڈال کر کمرے اور راہداریاں نکالی گئی تھیں۔ جہاں سے آرہی تھی۔

اس وقت تک میرا شکار ہاتھ اٹھائے اُلٹے قدموں چل ... مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ ٹھوکر کھا کر گر ہی نہ جائے۔ لہٰذا ... نے تحکم آمیز لہجے میں سیدھا ہونے کا حکم دیا۔

”مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟“ اس ... نا رخ تبدیل کیے بغیر سوال کیا۔

”اگر تمھارے دماغ پر اسی قدر چربی چڑھ گئی ہے تو سنو ... نام ڈینی ہے اور قاسم کے دنوں سے تم پر میرا حساب ... چلا آرہا ہے جسے شاید میں آج بے باق کر لوں گا۔“

”ڈینی!“ اس نے مسرت آمیز حیرت کے ساتھ دُہرایا پھر ... ہی مجھ پر لوٹ پڑا۔

میں اگر اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا تو اس قدر غافل ... نہیں تھا کہ وہ مجھے زیر کر لیتا۔ میرا داہنا گھٹنا بروقت فضا میں ... اور وہ اپنے ہی زور میں کراہتا ہوا پیچھے الٹ گیا لیکن میرے ... سے پستول نکل گیا۔

اس وقت میرے تمام حواس پوری طرح کام کر رہے تھے۔ ... کے ساتھ ہی عزیز کی آواز بلند ہوتے ہی شیڈ کے بائیں ... سے کہیں کچھ آہٹ پیدا ہوئی جو فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

”اے لٹو!“ میری چھٹی حس نے خطرے کا اعلان کیا اور میں ... بڑھ کر وحشیانہ قوت سے عزیز کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کر دی۔ ... بلا وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے سانڈ کی طرح ڈکرایا تھا لیکن میری ... ہاتھ لہراتی ہوئی ٹانگ پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

اگر اس وقت اے لٹو یا عزیز کا کوئی اور حمایتی اس شیڈ ... موجود تھا تو میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ اس کے نمودار ... سے پہلے مار مار کر عزیز کا کچومر نکال دوں تاکہ مجھے بیک ... دو حریفوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

عزیز جسمانی طور پر مجھ سے کمتر نہیں تھا لیکن اس کی ... تھی کہ وہ اس وقت نشے کی حالت میں تھا۔ دو چار ہی ... لاتوں میں اس کی ساری مدافعت دم توڑ گئی اور وہ ... لیے گھگیانے لگا۔ میں نے اس کی گردن پر ایک بھرپور ... رسید کیا اور جھپٹ کر پستول اپنی تحویل میں لے لیا۔

وہ اپنا سر گھٹنوں میں دیے فرش پر بیٹھا کراہتا رہا شاید ... نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر اس نے مزید سکت کا اظہار کیا تو اسے مزید تشدد سہنا ہو گا جس کی مدافعت اس کے بس سے باہر تھی۔

میں بھرا ہوا پستول ہاتھ میں تھامے اپنی جگہ چوکنّا کھڑا رہا۔ عزیز کے ساتھ میری نگاہیں بائیں حصّے سے آنے والی راہداری کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ تاکہ آنے والے کا فوری استقبال کیا جا سکے۔

راہداری میں بے ترتیب سی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ شاید آنے والا مجھے یہ تاثر دینا چاہ رہا تھا کہ عزیز کی طرح وہ بھی نشے میں ہے۔ میں نے فوری طور پر اپنی جگہ قدرے تبدیل کر لی تاکہ آنے والا مجھے براہِ راست نشانہ نہ بنا سکے۔ شیڈ چاروں طرف سے بند ہونے کی وجہ سے وہاں دن میں بھی روشنی ناکافی ہی تھی جسے پورا کرنے کے لیے راہداری میں بتیاں جل رہی تھیں۔ راہداری سے شیڈ کے فرش پر پڑنے والے روشن مستطیل میں مجھے ایک سایہ لڑکھڑاتا نظر آیا۔ آہٹیں آتی رہیں اور وہ ناقابلِ فہم انسانی سایہ دراز تر ہوتا چلا گیا اور جب وہ ہیولا غیر محتاط انداز میں راہداری سے برآمد ہوا تو میں حیرت سے تقریباً چیخ اٹھا۔

وہ رخشی تھی اور نشے میں بُری طرح دھت نظر آرہی تھی۔

”ہا ہیں... کس نے... پکارا؟“ میری چیخ سن کر وہ وہیں رک کر لہراتے ہوئے منمنائی۔

”ہوش میں آؤ رخشی!“ میں نے عزیز سے بچ کر اس کے قریب جا کر اس کے رخسار پر بیک وقت کئی تھپڑ برسا دیے۔ ”میں ڈینی ہوں۔ ڈینی۔ یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے؟“

”ڈے... نی۔“ وہ ہچکی لے کر بڑبڑائی۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم رنگ میں بھنگ کرو گے۔ ذرا دیر بعد ہی آجاتے تو کیا بگڑ جاتا تمھارا؟ اور وہ کہاں گیا، میرا پالتو گینڈا؟ وہ تو بس دروازہ دیکھنے آیا تھا... اسے بلاؤ نا۔“

غصّے سے میرا خون کھول اٹھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا دامن کبھی بھی پارسائی کے داغ سے آلودہ نہیں ہونے پایا تھا لیکن پھر بھی بے غیرتی اور کمینگی کی ایک حد ہوتی ہے۔ میرا بایاں ہاتھ پوری قوت کے ساتھ گھوم گیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ وہ بھی ایڑیوں کے بل پر گھومتے ہوئے مُرغی سی چیخ مار کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

وہ تماشا دیکھ کر عزیز اپنا دکھ فراموش کر بیٹھا تھا اور گھٹنوں سے سر اٹھائے تشویش زدہ انداز میں مجھے گھورے جا رہا تھا۔ جوں ہی میں طیش کے عالم میں اس کی طرف پلٹا، وہ بلبلاتا ہوا

فرش سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"مم۔۔۔ میں بالکل بے قصور ہوں!" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے ہکلایا۔ "یہ قاسم کی زندگی میں بھی مجھ پر نظر رکھتی تھی لیکن قاسم کی وجہ سے میں ہمیشہ اس سے دور رہا۔ آج اس نے خود ہی شراب نوشی کی تجویز پیش کی تھی۔۔۔!"

میرے بھرپور تھپڑ نے اس کی زبان بند کر دی اور وہ بُرے بُرے منہ بناتے ہوئے خون تھوکنے لگا۔

"اسے یہاں کون لایا تھا؟" میں نے غضبناک لہجے میں سوال کیا۔

"قق۔۔۔ قاسم کا ایک دوست لایا تھا۔۔ بلکہ یہ خود اس کے ساتھ آئی تھی۔" اس نے مار سے بچنے کے لیے جلدی سے جواب دیا۔

"نام کیا ہے قاسم کے اس دوست کا؟" میں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں دریافت کیا۔

"ظہور۔۔۔ راجہ ظہور احمد۔" اس نے گہرے گہرے سانسوں کے درمیان بعجلت جواب دیا۔

"تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟" میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سوال کیا۔

"بس قاسم کے حوالے سے دوستی ہے، کبھی کبھار چھوٹے موٹے کام لیتا رہتا ہے جس کا پورا معاوضہ دیتا ہے۔ رخشی کے معاملے میں بھی پانچ ہزار کا وعدہ کر کے گیا ہے۔"

"واپس کب آئے گا؟" میں نے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"آج کی رات شاید یہیں بسر کرے گا، شہر میں وہ کسی سے خائف معلوم ہوتا ہے۔"

"رخشی کے علاوہ یہاں اور کتنے قیدی ہیں؟"

"کک۔۔ کوئی بھی نہیں۔" اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا اور ایک بار پھر میں نے طیش میں آ کر اس کا جبڑا سہلا دیا اور اس کی ٹھوڑی کی کھال بری طرح ادھڑ گئی۔ اس نے اپنے جواب کی تصحیح کرنے میں تاخیر کی تو میں نے دوسرا مکا بھی رسید کر دیا اور اس بار وہ ہل کر رہ گیا۔

"ٹھٹ۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔ بب بتاتا ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھے روکتے ہوئے گڑگڑایا پھر جلدی سے بولا۔ "یہاں ایک اور بھی قیدی موجود ہے لیکن اس کا ظہور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے درشت لہجے میں سوال کیا۔

"جج۔۔۔ جہانگیر!" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا اور میں نے ایک مرتبہ پھر اسے لاتوں اور مکوں پر رکھ لیا۔ اس کی حالت اس قدر ابتر ہو چکی تھی کہ اس نے مجھ پر ایک بار بھی ہاتھ اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ مسلسل مدافعت ہی کرتا رہا۔

"اسے کیوں اٹھایا گیا تھا؟"

"میں اے لُو کے لیے بھی کام کرتا ہوں۔" اپنے منہ سے خون صاف کرتے ہوئے وہ رک رک کر بتلانے لگا۔ "تین دن پہلے اس کی طرف سے فون پر حکم ملا تھا کہ جہانگیر کو اٹھوا کر بند کر دوں، اسے شبہ ہے کہ پچھلے دنوں ہماری دو کھیپیں جہانگیر کی لاپروائی کی وجہ سے پکڑی گئی ہیں لیکن وہ اس الزام کو قبول کرنے سے انکار کر رہا ہے۔"

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" اچانک رخشی کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ "میں تھک گئی ہوں، مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔"

میرا دل چاہا کہ ایک مرتبہ پھر اس کی مرمت کر ڈالوں تاکہ اس کا نشہ ہرن ہو جائے لیکن میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس وقت عزیز میرے لیے زیادہ اہم تھا اور وہ اس درجہ پر آ گیا تھا کہ میں اس کی طرف سے ذرا بھی غفلت برتتا تو وہ فوراً ہی وہاں سے بھاگ نکلتا۔

"ظہور کو معلوم ہے کہ جہانگیر یہاں قید ہے؟" میں نے رخشی کو نظر انداز کر کے عزیز پر جرح جاری رکھی۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔ میرے لیے ظہور تنظیم سے باہر کا آدمی ہے۔"

"حالانکہ وہی خود اے لُو ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا اور عزیز کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی کے ساتھ پھیلتی چلی گئیں۔ میں نے اسے توڑنے کے لیے فوری طور پر ایک شوشہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ "اور تم بھی اس کی نگاہ میں آ گئے ہو۔ ایک طرف وہ اے لُو کی پراسرار اور خفیہ حیثیت میں تم کو احکام دیتا ہے اور دوسری طرف ظہور کے روپ میں قریب سے تمہاری کڑی نگرانی بھی کرتا ہے، جس دن ذرا بھی چوک ہوئی، وہ بہت بے رحمی کے ساتھ تمہیں ذبح کر ڈالے گا۔"

"نہیں، وہ اے لُو نہیں ہو سکتا۔" وہ جھرجھری لے کر بے اعتباری کے ساتھ بڑبڑایا۔

"وقت آنے پر تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "چلو! جہانگیر کدھر ہے؟"

"پہلے اس کا نشہ زائل کرنے کی کوشش کرو۔" وہ رخشی کی طرف دیکھتے ہوئے تشویش زدہ انداز میں بولا۔ "اگر ظہور ہی اے لُو ہے تو میری اس خیانت کو ہرگز برداشت نہیں کرے گا۔"

میری زبان سے اپنے لیے ایک خطرے کا انکشاف سنتے ہی وہ ذہنی طور پر مجھ سے قریب آ گیا تھا لیکن اس کے مفاد سے قطع نظر میرے لیے بھی یہی بہتر تھا کہ رخشی اس حالت میں کسی جھگڑے میں ملوث نہ ہو۔

میں نے شیڈ کا داخلی دروازہ اندر سے بولٹ کر کے عزیز کی جیبوں کی تلاشی لے ڈالی لیکن اس کے پاس سے کوئی ہتھیار برآمد نہ ہو سکا پھر میں نے اسے رخشی کو سہارا دے کر اندر لے چلنے کی ہدایت کی۔

عام حالات میں شاید وہ اس کام کو خوشگوار فریضہ سمجھ کر انجام دیتا لیکن اس وقت اسے رخشی کو سہارا دے کر فرش پر سے اٹھانا دشوار ہو گیا اور آخرکار میں ان دونوں کے پیچھے راہداری میں ہو لیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد عزیز بائیں طرف ایک کھلے ہوئے دروازے میں گھس گیا۔ اندر گھستے ہی مجھے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اسی کمرے میں ایک دیوار گیر ائیر کنڈیشنر موجود تھا۔ خواب گاہ نما کمرے کی ابتر حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے سے قبل محفلِ نا و نوش وہیں جمی ہوئی تھی۔ عزیز نے رخشی کو ایک بستر پر ڈال دیا۔

کمرے میں رکھے ہوئے ریفریجریٹر سے ٹھنڈے پانی کی دو بوتلیں نکال کر میں نے رخشی کے سر پر انڈیلیں تو وہ ہڑبڑا کر کسی اندھے کی طرح فضا میں ہاتھ چلاتے ہوئے یوں اٹھی تھی جیسے اس کا سانس اکھڑ رہا ہو۔

"چلے آؤ۔" میں نے بے پروائی سے عزیز سے کہا۔ "تھوڑی دیر میں حواس ٹھکانے آ جائیں گے۔" باہر نکل کر میں نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

راہداری کے آخری سرے پر عزیز نے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر روشنی کی تو جہانگیر کو دیکھتے ہی مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ فرش پر اس حالت میں پڑا ہوا تھا کہ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے، پیر بھی مضبوط رسی میں جکڑے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا، اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں کرب اور نفرت کی سرخی رچی ہوئی تھی۔ سرخ آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے سیاہ حلقے بہت نمایاں لگ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے وہاں بھوکا پیاسا قید رکھا گیا ہو۔

مجھے دیکھتے ہی جہانگیر کی آنکھوں میں عجیب وحشیانہ سی چمک کوندنے لگی تھی اور بے بس ہونے کے باوجود اس نے بندشوں سے زور آزمائی شروع کر دی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کی قہر بار نظریں عزیز سے دوچار ہوتیں، وہ سر جھکائے آگے بڑھا اور اس نے جہانگیر کے دہانے سے ٹیپ ہٹا دیا۔ لبوں کو آزادی ملتے ہی جہانگیر پھٹ پڑا۔

"مجھے اب زندگی کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ یہ سب بھیڑیے اور درندے ہیں، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم انہیں ڈک دے کر مجھ تک پہنچ سکو گے۔۔۔ یہ حرامزادہ مجھے دن میں صرف دو بار پانی دیتا رہا ہے جب سے اس کے ہاتھ لگا ہوں، ایک کھیل بھی اڑ کر میرے منہ میں نہیں گئی ہے۔" اس کی غصیلی آواز پر لرزہ خیز نقاہت چھائی ہوئی تھی۔

"اس کی بندشیں کھول دو۔" میں نے اپنے غصے پر قابو رکھتے ہوئے عزیز کو حکم دیا اور وہ جھجکتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

جہانگیر کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے، زبان تالو سے چپکی جا رہی تھی لیکن وہ طویل زباں بندی سے نجات ملنے کے بعد مسلسل بولے جا رہا تھا۔ عزیز نے پہلے اس کے ہاتھ آزاد کیے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے ہاتھ کو حرکت میں لا کر عزیز کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی کوشش کی لیکن طویل عرصے سے ایک ہی پوزیشن میں مسلسل بندھے رہنے کے باعث اس کے عضلات سن ہو چکے تھے یا اکڑ کر رہ گئے تھے، وہ کوشش کے باوجود ہاتھ تک نہ ہلا سکا۔

آزادی ملنے کے بعد بھی جہانگیر فرش پر پڑا ہاتھ پیروں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی دونوں کلائیوں پر رسیوں کے خون آلود نیل پڑ چکے تھے اور ہاتھوں پر ورم آیا ہوا تھا، پنڈلیوں کی حالت بھی کم و بیش ویسی ہی تھی۔

اس دوران میں عزیز کی ایک ایک حرکت میری نگاہ میں تھی اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اے لُو کی طرف سے جان کے خطرے کے انکشاف نے اسے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ میرے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھا۔

میں نے پستول جیب میں رکھ لیا اور عزیز کے ساتھ جہانگیر کو سہارا دے کر اس کمرے کی طرف لے گیا جہاں مدہوش رخشی بند تھی۔ شاید ٹھنڈے پانی نے اس کا نشہ ہرن کر ہی دیا تھا کیونکہ ہمارے راہداری میں نکلتے ہی اس نے آہٹیں سن کر اندر سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ ناگفتہ مغلظات بھی بک رہی تھی۔

باہر سے کنڈی کھولتے ہی وہ برہمی کے عالم میں ہم تینوں پر آ پڑی تھی۔ وہ لاکھ صحت مند اور مشتعل سہی لیکن تھی ایک عورت ہی جو چار مَن کی بھی ہو تو روایتاً اور اخلاقاً سُبک اندام ہی قرار دی جاتی ہے۔ ہم تینوں نے اس کا شاید تصادم بڑی آسانی سے سہہ لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کے سر پر پڑنے والی ٹھنڈے پانی کی دو بوتلوں نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔

پانی کی چند دھاروں نے دماغ کی ان رگوں کی خوب آبیاری کی تھی جو سوکھ جائیں تو جبلت کے معاملے میں انسان کو پل بھر میں حیوان کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔

ہم نے اس کا تصادم سہہ لیا لیکن جب اس نے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹتے ہوئے عناصرِ ثلاثہ کا تجزیہ کیا تو اس کی خوب صورت اور خمار آلود نگاہیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"گینڈا... جہانگیر اور تم۔" اس کے یاقوتی ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ وہ دیکھ ہم تینوں کو رہی تھی لیکن فقرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مخاطب مجھ سے ہی تھی۔ "تم سب یہاں کیسے یکجا ہو گئے؟ میں تو ظہور کے ساتھ تفریحاً نکلی تھی پھر وہ مجھے یہاں گینڈے کے ساتھ چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ تم دونوں کہاں سے آ ٹپکے؟"

"گینڈے نے انڈے دیے تھے، ان ہی میں سے برآمد ہوئے ہیں۔" میں نے جہانگیر کو اندر لے جاتے ہوئے جل کر کہا۔

"کیا جہانگیر یہیں ملا ہے؟" کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے سوال کیا۔ اس کے حواس بحال ہو چکے تھے لیکن زبان پہ ابھی تک لکنت طاری تھی۔

"یہ شروع سے یہیں قید تھا۔" عزیز نے آہستگی سے کہا۔

"لیکن تم نے مجھے تو نہیں بتایا تھا۔" وہ برہم ہو کر بولی۔

"تم نے پوچھا ہی کب تھا؟" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اور پھر جہانگیر، اے ٹو کا قیدی تھا۔ تم ظہور کی دوست بن کر آئی تھیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ فریج کی طرف متوجہ ہو گیا کیونکہ جہانگیر کی حالت بھوک کی شدت سے بہت ابتر تھی۔

"تم ظہور کے ساتھ اپنی مرضی سے آئی تھیں؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ظاہر ہے۔ وہ میرا پرانا دوست ہے۔" اس نے شانے اچکا کر کہا۔

"تمہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ تم نے ذرا ہی دیر پہلے فون پر مجھے اپنے گھر بلایا تھا؟" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"یہاں تو لنگر جاری رہتا ہے۔" وہ ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ میں یہاں پھنس جاؤں گی۔ یہی خیال تھا کہ ایک آدھ گھنٹے میں لوٹ آؤں گی۔"

"اور اپنا مکان کسی گبرے بھکاری کو خیرات کر آئی تھیں؟" میرا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔

"وہ ظہور کی ذہنی اپج تھی۔ میں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔"

"ظہور کا تنظیم سے کیا تعلق ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "بس قاسم کا دوست تھا، اسی بہانے مجھ سے بھی دوستی ہو گئی۔ کبھی کبھار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ملنے آ جاتا ہے۔ لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"پوچھنا ہی پڑ رہا ہے کیونکہ ظہور ہی اے ٹو ہے۔" میرے الفاظ سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ پھر اس کے چہرے پر زردی پھیلتی چلی گئی۔

"شاید بازی ہمارے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی مایوسانہ آواز برآمد ہوئی۔ "تین دن پہلے اے ٹو نے بذاتِ خود مجھے فون پر جہانگیر کی خبر دی تھی اور بتایا تھا کہ جہانگیر کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر تنظیم کی جڑوں پر کاری ضرب لگانے کی تیاری کر رہا ہے لہٰذا اس نے جہانگیر کو اٹھوا لیا ہے اور اب ایسی چال چلنے والا ہے کہ سازش کے تمام مہروں کو یکجا کر کے اس طرح موت کے گھاٹ اتارے گا کہ دوسرے بغاوت کے تصور ہی سے لرزہ براندام ہو جائیں گے۔" وہ ایک مختصر سی ہچکی لے کر سینہ صاف کرنے کے لیے خاموش ہوئی پھر بولنے لگی۔ "اور آج ہم سب یہاں یکجا ہو گئے ہیں۔ جہانگیر کو اس نے اے ٹو بن کر اغوا کرایا، مجھے ظہور کے دوستانہ روپ میں یہاں لا چھوڑا۔ شاید اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ گینڈا، قاسم کی زندگی ہی میں میری کمزوری بن گیا تھا اور اس سے مل بیٹھنے کے بعد میں سب کچھ فراموش کر دوں گی۔ تمہارے بارے میں جب میں نے اسے بتایا کہ تم تھوڑی دیر بعد میرے گھر پہنچنے والے ہو تو وہ بہت ہنسا تھا اور اسی وقت اس نے ایک بھکاری کو مکان کا متولی بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور مجھ سے پُراعتماد لہجے میں کہا تھا کہ دیکھ لینا، ذہنی تمہاری بو سونگھتا آخر کار وہیں پہنچ کر دم لے گا جہاں میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ظہور کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھیں لیکن اب اس کا ایک ایک لفظ واضح ہوتا جا رہا ہے۔"

"تم لوگ تو اس کے معتوب ہو لیکن مجھے وہ کس جرم کی پاداش میں گھیر رہا ہے؟" عزیز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تو ہمیشہ سے اس کے احکام کی تعمیل کرتا آیا ہوں۔"

"وفاداری اور بغاوت کے بارے میں اس کے اپنے تصورات ہیں۔" میں نے کہا۔ "کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس بات پر گرفت کر بیٹھے۔"

وہ خورد و نوش کی کئی اشیا جہانگیر کے سامنے رکھ چکا تھا اور وہ جنم جنم کے بھوکے کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا اور میں تیزی کے ساتھ یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ اب اے ٹو کے بارے میں کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔

یہ غنیمت تھا کہ جہانگیر بازیاب ہو چکا تھا۔ اے ٹو نے رخشی کو ٹھکانے لگانے کی کوشش میں بھی منہ کی کھائی تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ اب ہمارا زیادہ دیر تک شیڈ پر رکنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اے ٹو نے رخشی سے اس یقین کا اظہار کیوں کیا تھا کہ میں اس کی بو سونگھتا ہوا آخر کار وہیں پہنچوں گا جہاں وہ مجھے گھیرنا چاہتا تھا۔

مجھے امکان کچھ ایسا نظر آ رہا تھا کہ رخشی کو وہاں چھوڑنے کے بعد شاید وہ اے ٹو کے روپ میں سیاہ پوش بن کر رات گئے کسی وقت وہاں آتا اور عزیز پر اپنی پُراسراریت کا بھرم رکھتے ہوئے جہانگیر اور رخشی کا کام تمام کر دیتا۔ آخر کار میں نے فوراً ہی وہاں سے روانگی کا فیصلہ کر لیا۔ میرے عزائم سے واقف ہوتے ہی عزیز کچھ سراسیمہ نظر آنے لگا۔

"تم لوگوں کے نکل جانے کے بعد تو وہ مجھے ہرگز معاف نہیں کرے گا۔" اس نے متذبذب لہجے میں کہا۔ "وہ ظہور کی حیثیت میں آیا تھا مگر کہہ گیا تھا کہ میں اس کی واپسی تک رخشی کو کڑی نگرانی میں رکھوں۔ ہو سکتا ہے کہ اب وہ نقاب پوش ہی بن کر واپس آئے۔"

"یہ تمہارا مسئلہ ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "اس کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہو تو خاموشی کے ساتھ بھاگ نکلو۔"

وہ پھیکے سے انداز میں ہنس پڑا۔ "تم اسے جانتے ہی ہو، بھاگ کر اس سے کہاں تک بچ سکوں گا؟"

"میری مثال تمہارے سامنے ہے... ابھی تک نہ صرف بچا ہوا ہوں بلکہ اس کے لیے مسائل بھی کھڑے کر رہا ہوں۔ اصل مسئلہ صرف تھوڑی سی جرأت کا ہے۔ جرأت ہے تو مقابلہ کر لوگے ورنہ مارے جاؤ گے۔"

"اور اگر میں تمہارے ساتھ آنا چاہوں؟" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"شوق سے آؤ لیکن ہمارے پاس بس کام ہی کام ہے، آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، اپنا گزارا تمہیں خود کرنا ہوگا۔"

پھر ہم وہاں سے بہت عجلت میں روانہ ہوئے تھے، عزیز ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ اس کا چوکیدار اس وقت بھی کوٹھڑی میں بیہوش پڑا ہوا تھا۔

رخشی اس معاملے میں عزیز سے بدرجہا بہتر ثابت ہوئی اور راستے ہی میں ایک جگہ اتر گئی۔ تجربے کے اعتبار سے وہ بہت گھاگ عورت تھی، اس کا فوری طور پر اسٹون ہاؤس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ وہ عمارت نہ صرف ظہور کی نظروں میں تھی بلکہ ایک قتل ہو جانے کے سبب پولیس کی بھی نگاہوں میں آ گئی ہوگی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ چند دن اپنے کسی قابلِ اعتماد شناسا کے ساتھ رہ کر صورتِ حال کا جائزہ لے گی پھر آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں کچھ طے کرے گی۔ تازہ ترین واقعات نے اس کی خود اعتمادی کو کسی حد تک مجروح ضرور کیا تھا لیکن ذہنی طور پر وہ ناکارہ نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ جہانگیر کی ذہنی اور جسمانی حالت بہت ابتر تھی۔

اس پر رہ رہ کر جھلاہٹ سوار ہو رہی تھی اور وہ تنظیم کو بے تحاشا گالیاں بکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی سلمیٰ اس کی گمشدگی کی طرف سے بہت زیادہ فکرمند تھی لیکن میں جہانگیر کو ایسی حالت میں اس کے گھر چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ اے ٹو کی نگاہوں میں موت کا سزاوار ٹھہرایا جا چکا تھا، عزیز کی تحویل سے اس کی رہائی اے ٹو کو دیوانہ کر دینے کے لیے کافی ہوتی اور عین ممکن تھا کہ وہ جھلاہٹ میں بذاتِ خود جہانگیر کے مکان پر چڑھ دوڑتا۔ ایسی صورت میں جہانگیر کسی طرح بھی اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں تھا۔

رخشی کو راستے میں اتار کر میں جہانگیر کو اپنے ہمراہ سیدھا غزالہ کے مکان ہی کی طرف لیتا چلا گیا جہاں میری دانست میں وہ بالکل محفوظ رہتا۔ اس کے بعد میں اپنی حکمتِ عملی اختیار کرنے کے لیے آزاد ہو جاتا۔

گھر پہنچنے پر سب سے پہلے غزالہ کے باپ سے سامنا ہوا اور اس نے جہانگیر کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"یہ جہانگیر ہے۔ میرا بہت پرانا اور جگری دوست۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "یہ کم از کم آج کی رات یہیں گزارے گا۔"

کرنل تنویر زیدی کی آنکھوں میں بے پناہ تجسس اور سوال ناچ رہے تھے لیکن میرے خشک انداز نے اسے وہاں سے ٹل جانے پر مجبور کر دیا۔

"یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟" تخلیہ ہوتے ہی جہانگیر نے سختی سے میرا بازو تھام کر سوال کیا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اپنے گھر لایا ہوں، یہاں تم محفوظ رہو گے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"مگر میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ اپنے گھر۔" وہ مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "تم سن رہے ہو؟ وہاں سلمیٰ کا بُرا حال ہو رہا ہوگا۔"

"ہوش میں رہو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے سلمیٰ کی پریشانی کا علم ہے، میں اس سے بات کر چکا ہوں اور ابھی

اسے بتادوں گا کہ تم بحفاظت میرے ساتھ موجود ہو بلکہ اسے بھی فوری طور پر گھر چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہونا ہوگا۔"

وہ سر جھکا کر خاموش ہوگیا اور میں اسے ہمراہ لیے اندر چل دیا۔

میں جہانگیر کو کامران کے کمرے میں لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ فوری طور پر سلمیٰ سے بات کرنے کے لیے بے چین ہوا جا رہا تھا لہٰذا میں اس کے ہمراہ وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔

لائن ملتے ہی دوسری طرف سے سلمیٰ کی کرب آلود، بھرّائی ہوئی آواز سنائی دی۔ شاید وہ اپنے شوہر کے بارے میں کسی اچھی خبر کی امید میں فون ہی سے لگی بیٹھی تھی۔

"میں ڈپٹی بول رہا ہوں سلمیٰ۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "جہانگیر بالکل صحیح سلامت میرے ساتھ موجود ہے۔"

"تیرا شکر ہے خدایا۔" اس کی تشکر آمیز آواز سنائی دی "میرے تو کان ترس گئے تھے یہ خبر سننے کے لیے مگر وہ گھر کیوں نہیں آئے؟ میری بات تو کرا دو اُن سے۔"

جہانگیر نے میرے ہاتھ سے ریسیور چھین لینا چاہا لیکن میں نے اسے پرے دھکیل دیا اور ماؤتھ پیس میں بولا "وہ خود تم سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے لیکن میں نے اسے روکا ہوا ہے، وہ کچھ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ فی الحال اسے ان کے چنگل سے نجات مل گئی ہے لیکن ابھی خطرہ دور نہیں ہوا ہے وہ دوبارہ اسے گھیرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ تم فوراً اپنے کسی عزیز کے یہاں منتقل ہو جاؤ۔ خطرہ ٹلتے ہی جہانگیر تم سے آملے گا۔"

یہ کہہ کر میں نے ریسیور جہانگیر کو تھما دیا۔

مجھے حیرت تھی کہ باہمی ناچاقیوں کے باوجود ان دونوں کے درمیان جذباتی گفتگو کا دورانیہ خاصا طویل تھا۔ مجھ جیسے عملی آدمی کے لیے وہ تمام گفتگو بالکل مہمل تھی مگر میں نے یہ بات ضرور نوٹ کی کہ جہانگیر نے اپنی بیوی کو میرے مشورے پر حرف بحرف عمل کرنے کی ہدایت کی تھی۔

جہانگیر کو اس کی نئی قیام گاہ یعنی کامران کے کمرے میں چھوڑ کر میں واپس لوٹا تو غزالہ میری منتظر تھی۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد اس سے میرا سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔

اس کی استفسار طلب نگاہوں کے جواب میں، میں نے فوراً ہی جہانگیر کی کہانی مختصر الفاظ میں دہرا دی۔

"میں نے پردے کی اوٹ سے دیکھا تھا، اس کا تو حال ہی ابتر ہو رہا ہے۔ پہچانا بھی نہیں جا رہا تھا۔" اس نے پھریری لے کر کہا۔

"تم نے پہلے کب دیکھ لیا تھا اسے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"اتنی جلدی بھول گئے آپ؟" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی "میں جہانگیر ہی کے گھر میں تو قید تھی جو اس کی بیوی نے مجھے وہاں سے نکال دیا تھا۔ اب تو اس کے چہرے کا رنگ تک سیاہ پڑ گیا ہے۔"

اور گزرے ہوئے تمام واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ اس وقت جہانگیر نے غزالہ کے معاملے میں بڑی فراست سے کام لیا تھا ورنہ وہ لے لوٹو کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہوتی۔ شاید اس بار قدرت نے مجھے اس کا وہی احسان اتارنے کا موقع فراہم کیا تھا۔

"آؤ، میں تمھیں اس سے ملوا دوں۔" میں نے غزالہ کا ہاتھ تھام کر کہا کیونکہ غزالہ کا معاملہ اس حد تک بڑھ جانے کے باوجود جہانگیر میرے اور غزالہ کے تعلق سے واقف نہ ہو سکا تھا۔

"اس سے بعد میں مل لوں گی پہلے ایک اہم بات سُن لیں۔" وہ مزاحمت کرتے ہوئے بولی "آپ کی غیر موجودگی میں سلطان شاہ کا فون آیا تھا، وہ شام کو آٹھ سے نو بجے تک لاہور کے ایک نمبر پر آپ کا انتظار کرے گا۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟" میں نے بے تابانہ لہجے میں سوال کیا۔

"مجھ سے کھل کر بات نہیں کی۔" وہ بولی "بتا رہا تھا کہ شوگر کوئین چھلاوا بنی ہوئی ہے، ابھی اس تک رسائی نہیں ہو سکی البتہ وہ لائیڈز کالج میں نوکری کے لیے کسی کو گانٹھنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اسی سلسلے میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہے۔"

"میں آج صبح ہی تو آیا ہوں۔" میں نے الجھن محسوس کرتے ہوئے کہا "اسے اتنی جلدی فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ ان دونوں میں سے تو کوئی بھی بات اتنی اہم نہیں ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہا تھا، میرے ڈانٹنے پر بے حیائی کے ساتھ ہنس دیا تھا۔" وہ مُنہ بنا کر بولی۔ "دیکھا جائے تو ڈیڈی اس سے ٹھیک ہی چڑتے ہیں، وہ آپ کے علاوہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے مخاطب کو چڑانے پر تلا بیٹھا رہتا ہو۔"

"خیر شام کو اس کی خبر لوں گا، تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔"

جہانگیر غزالہ پر نگاہ پڑتے ہی حیرت سے یوں اُچھلا تھا جیسے غلطی سے اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار پر پڑ گیا ہو "یہ... یہ تو وہی لڑکی ہے جسے سلام نے جیوا ہاؤز میں پہنچایا تھا..." وہ حیرت سے ہکلاتے ہوئے بولا۔

"جسے وہاں سے تم اپنے گھر لے آئے تھے اور وہاں سے تمھاری بیوی نے اسے بھگا دیا۔" میں نے اس کی بات پوری کرتے ہوئے کہا "اور آج کی تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ تم اسی

لڑکی کے گھر میں مقیم ہو۔"

"مگر لے لوٹو تو اس کے لہو کا پیاسا ہو رہا ہے۔ اسے ہر قیمت پر زندہ یا مُردہ پکڑوانا چاہ رہا ہے... اس سے تمھارا کیا رشتہ ہے؟" اس کے لہجے پر بدستور حیرت غالب تھی۔

"لے لوٹو تو اب اپنے زخموں کو چاٹے گا... اس لڑکی کا نام غزالہ ہے، میری بہترین دوست ہے اور میری غیر موجودگی میں یہی تمھاری دیکھ بھال کرے گی، بس یہ خیال رکھنا کہ باہر ملنے والے بڑے میاں غزالہ کے باپ ہیں، صرف باپ ہی نہیں بلکہ ریٹائرڈ کرنل بھی ہیں۔ اختلافِ رائے کو عموماً زبانی طور پر دور کرنا پسند نہیں کرتے..."

"کیوں غیر ضروری باتیں کر رہے ہیں۔" غزالہ نے مسکراتے ہوئے مجھے ٹوک دیا "ڈیڈی اتنے بھی مشتعل مزاج نہیں ہیں۔"

"اگر وہ مجھے برداشت کر لیتے ہیں تو ضروری نہیں کہ دوسروں کو بھی اتنی ڈھیل دے سکیں۔"

"اس تعارف سے میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں اس کی بنیاد پر مجھے تم کو مبارکباد دینا چاہیے۔" جہانگیر نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا "تمھارا انتخاب واقعی قابلِ داد ہے۔ سلمیٰ سُنے گی تو اسے بہت خوشی ہوگی کہ اس نے نادانستگی میں تمھاری ہونے والی بیوی کی مدد کی تھی۔ لیکن تم انھیں اس مار دھاڑ میں کہاں اُلجھا بیٹھے؟"

"کسی سے ذکر نہ کرنا۔" میں نے سختی کے ساتھ کہا "جب تک لے لوٹو کا قصّہ ختم نہیں ہو جاتا، میں غزالہ کے بارے میں پوری رازداری برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔"

"چلو کچھ دن اور سہی۔" وہ ہنس کر ذرا خدلانہ لہجے میں بولا۔ "مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے اپنی بے لگام زندگی کو ایک راستے پر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"ابھی ہم صرف دوست ہیں۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "وقت آنے پر دیکھا جائے گا کہ ہمارے درمیان کہاں تک مفاہمت موجود ہے۔ ابھی تک تو غزالہ نے ہر جگہ میرا ساتھ دیا ہے۔"

آتشِ شکم سرد ہونے کے بعد سلمیٰ سے ہونے والی گفتگو نے جہانگیر کے اعصاب پر خاصا خوشگوار اثر ڈالا تھا، پھر وہ غزالہ کے سامنے خود کو بہت زیادہ شائستہ اور خوش مزاج ظاہر کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

"شاید تمھیں علم نہ ہو لیکن لے لوٹو کا شروع ہی سے یہ قیاس تھا کہ لاہور میں مشکلات کو جنم دینے والی لڑکی کا کسی نہ کسی طرح تم سے ضرور تعلق تھا لیکن تم کسی نہ کسی طرح اپنی ذات کو الگ رکھنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔"

"پرانی باتوں کو دُہرانا اب بے سود ہے۔" میں نے اسے آنکھ سے اشارہ کر کے کہا "اب تو تم بھی معتوب ہو گئے ہو، دیکھنا یہ ہے کہ لے لوٹو سے ہماری گلو خلاصی کیسے ہوتی ہے۔ اس دوران میں تم میری اجازت کے بغیر اس مکان سے باہر نہیں نکلو گے۔"

"مجھے یہ پوچھنا تو یاد ہی نہیں رہا کہ رخشی وہاں کیسے پہنچ گئی تھی؟" اس احمق نے اچانک ہی ایک غلط موقع پر وہ نازک سوال کر ڈالا اور غزالہ کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تیر گئی۔

"کیا وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، درست ہی تھا؟" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے سوال مکمل کیا۔

"بالکل درست کہہ رہی تھی۔ اگر وہ مجھے نہ اکساتی تو شاید میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہی بیٹھا رہتا۔" میں نے غزالہ کی مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "اسی نے فون پر مجھ سے کہا تھا کہ تم خطرے میں ہو اور اگر فوری طور پر قدم نہ اٹھایا گیا تو دنیا کی کوئی طاقت تمھیں مرنے سے نہ بچا سکے گی، بس میں اسی پیغام پر نکل کھڑا ہوا تھا۔"

"تو وہ ملی تھی آپ سے؟" غزالہ نے سوال کیا۔

"نہیں بابا۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا "اس کے مکان پر ایک کیڑے بھکاری کا راج تھا۔ رخشی کو میرے پہنچنے سے پہلے لے لوٹو اُڑا لے گیا تھا۔ دیکھا جائے تو آج وہ بھی بال بال بچی ہے۔"

"تم سے بڑی مانوس ہے۔" مصائب ٹلنے کے ساتھ ہی جہانگیر کی کھوپڑی میں کیڑے کلبلانے لگے تھے، غزالہ کے سوال سے اس نے موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے آہستگی سے ایک شگوفہ چھوڑ ہی دیا۔

"یہ بھی خوبی کی بات ہے۔" غزالہ نے بُرا ماننے کے بجائے براہِ راست اسے جواب دے کر مجھے حیران کر دیا "بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہاں سے پرائی تو پرائی، اپنی عورتیں بھی عمر بھر مانوس نہیں ہو پاتیں۔"

"بھئی مان گئے۔" جہانگیر ہنس پڑا "تمھارا جادو پوری طرح چلا ہوا ہے۔"

"تم تو مان گئے لیکن ذرا سلمیٰ سے ملنے دو، پھر دیکھوں گا کہ اور کیا مانتے ہو۔" میں ہنستے ہوئے غزالہ کے ساتھ واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"آپ بڑی بے تکلفی سے نام لیتے ہیں اس کی بیوی کا؟" باہر آنے کے بعد غزالہ نے شکایتی لہجے میں کہا اور میں دل ہی دل میں اس کی چھٹی حس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ اور بات ہے کہ میری اپنی سرد مہری کی بنا پر سلمیٰ سے

میرا کوئی غیر اخلاقی رابطہ استوار نہیں ہو سکا تھا لیکن میرے اور اس کے درمیان کچھ ایسی نوک جھونک ہوتی ہی رہتی تھی جو کسی بھی وقت بڑھ کر ایسے پیرائے میں بدل سکتی تھی جسے جہانگیر ہرگز برداشت نہ کرتا اور غزالہ نے میرے لب ولہجے سے یہ چور بھی پکڑ لیا تھا جبکہ جہانگیر کو شاید اندازہ ہی نہ ہو سکا تھا کہ اس بار میں نے غیر ارادی طور پر بھابی کا صیغہ ترک کر دیا تھا بلکہ فون پر بھی اس سے آپ جناب کے بجائے بے تکلفانہ انداز میں تم سے بات کرتا رہا تھا۔

حقائق کچھ بھی رہے ہوں مگر غزالہ کی بات کا جواب تو دینا ہی تھا۔ "جہانگیر میرا بہت پرانا اور جگری دوست ہے، ہو سکتا ہے کہ ابتدائی جھجک دور ہونے کے بعد وہ بھی تمہارا نام لینے لگے۔"

"آپ کو بُرا نہیں لگے گا؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ "میں تو ہرگز ایسے تخاطب کا جواب نہ دوں گی۔"

"تم تو مفروضات میں اُلجھتی ہو۔" مجھے بروقت ایک معقول جواب سوجھ گیا۔ "اس کی غیر موجودگی میں بات ہو رہی تھی اس لیے نام لے لیا اس کا، سامنے تو لحاظ کیا ہی جاتا ہے... بے تکلفی اور بات ہے، بدتمیزی اس سے مختلف ہو جاتی ہے۔"

"کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ماضی میں آپ راجہ اِندر کے رشتے دار رہے ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے خوب صورتی کے ساتھ اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ "ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر پرانی یادیں خلش کا کوئی روپ دھار لیں۔"

"تم احمق ہو۔" میں نے اس کی پشت پر ایک دھپ رسید کرتے ہوئے کہا اور بقیہ الفاظ میرے ہونٹوں ہی میں رہ گئے۔

"کیا ہوا؟ کون گرا؟" کرنل دھپ کی آواز سنتے ہی بوکھلائے ہوئے انداز میں ایک قریبی دروازے سے نکل پڑا تھا۔

"کک... کوئی بھی نہیں گرا ڈیڈی۔" غزالہ نے بوکھلا کر جلدی سے کہا۔

"نہیں۔" کرنل نے کھوپڑی ہلاتے ہوئے کہا "میں نے خود آواز سُنی ہے۔" پھر وہ اچانک ہی اچھل پڑا۔ "ایسا تو نہیں کہ عقب سے کوئی دُشمن گھر میں کودا ہو۔ میں ابھی چکر مار کر آتا ہوں۔"

اپنے وحشت انگیز خیال کے تحت وہ تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میری اور غزالہ کی نگاہیں چار ہوئیں اور ہم دونوں ہی ہنس دیے۔ غزالہ کی جھنکار میں شوخی تھی اور میں خفت آمیز انداز میں محض اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

ہم دونوں برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ کرنل گھر کا طواف کر کے واپس آ گیا۔ "ممکن ہے کوئی بلی وغیرہ کودی ہو۔ مجھے تو کہیں بھی کوئی نظر نہیں آیا۔" اس نے آتے ہی شکست خوردہ لہجے میں اعلان کیا۔

"آپ کی کار کا کیا رہا؟" میں نے یاد آتے ہی اس بارے میں بھی سوال کر ڈالا۔

"تھانے میں رپورٹ درج کرا دی ہے کہ رات میں کسی وقت گھر کے باہر سے کوئی اُڑا لے گیا، اب دیکھو کہ وہ کب تک گاڑی تک پہنچتے ہیں۔ ویسے تم نے چھوڑی کہاں تھی؟"

"آج کی رات گزر جانے دیں، اگر کل پولیس نہ پہنچی تو ہم خود ہی انھیں خبر دے دیں گے کہ ہماری کار فلاں جگہ موجود ہے، وہ ضابطے کی کارروائی کے بعد کار ہمارے حوالے کر دیں گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ کار کے بارے میں میری فکرمندی پر کرنل خاصا خوش ہو گیا تھا۔

اندھیرے کے باعث اس ویران علاقے میں سناٹا اور گہرا ہو گیا تھا۔ اُجاڑ اور ویران پلاٹوں پر مالکان نے ایک آدھ بلب بھی جلائے رکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ان کے اس رویے کے پیشِ نظر متعلقہ ادارے نے بھی جواب آں غزل کے طور پر اسٹریٹ لائٹس لگانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی اور اگر کبھی روشنی فراہم بھی کی گئی تھی تو فیوز ہونے کے بعد بلب تبدیل نہیں کیے گئے تھے۔

میں گاڑی میں وہاں سے گزرتا چلا گیا۔ اگر میں وہیں کہیں کار روک کر نیچے اترتا تو باآسانی تاریکی میں کہیں موجود کسی بھی شخص کی نگاہوں میں آ سکتا تھا۔

ایک طویل چکر کاٹ کر میں نے کار ایک روشن اور آباد علاقے میں روکی پھر چہل قدمی کے انداز میں نیچے اتر کر عزیز کے گودام کی طرف روانہ ہو گیا۔ اندھیرا پھیل جانے کے باعث وہ علاقہ اس وقت ہر قسم کی مجرمانہ کارروائیوں کے لیے سازگار ہو گیا تھا۔ میں براہِ راست اسی مقام پر پہنچا جہاں سے دوپہر میں اندر کودا تھا پھر دراڑوں کے سہارے باآسانی احاطے میں اتر گیا۔

احاطے میں بنا ہوا شیڈ گھپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس میں کہیں بھی روشنی کی کوئی رمق نظر نہیں آ رہی تھی البتہ جب میں نے چوکیدار کی کوٹھڑی کی طرف دیکھا تو وہاں بجلی کے بجائے کسی لالٹین یا لیمپ کی ٹمٹماتی ہوئی بےجان زردہ روشنی پھیلی ہوئی نظر آئی جس کا مطلب تھا کہ نادر خان اپنے مورچے پر مستعد تھا۔

میں نے دیوار سے لگے کسی چوپائے کی طرح کوٹھڑی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

وہاں بظاہر حالات معمول پر نظر آ رہے تھے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ عزیز وہاں موجود تھا یا واپس جا چکا تھا۔ اے ٹُو مقررہ پروگرام کے مطابق وہاں لوٹا تھا یا نہیں۔ دوپہر کے وقوعے کے بعد کوٹھڑی میں کتنی نفری موجود تھی؟

مجھے خیال آیا کہ ان سب سوالات کا جواب ایک پتھر باآسانی دے سکتا تھا۔ میں نے اپنی جگہ رک کر ایک پتھر اٹھایا اور پوری قوت کے ساتھ دور افتادہ کوٹھڑی کی طرف اچھال کر اپنی جگہ دبک گیا۔ چند ثانیوں بعد پتھر گرنے کی آواز آئی اور اسی کے ساتھ ٹوٹے ہوئے آہنی ڈرموں کے عقب سے ایک طاقتور ٹارچ روشن ہوئی۔ روشن دائرہ چند ثانیوں تک پھاٹک کے قرب و جوار میں رینگتا رہا اور پھر وہاں دوبارہ اندھیرا پھیل گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کوٹھڑی میں کسی قسم کی کوئی نقل و حرکت نظر نہیں آئی تھی۔

میں پیش قدمی ترک کر کے اندازے قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

گودام کے چوکیدار، نادر خان سے دوپہر میں میرا سامنا ہو چکا تھا۔ وہ دلیر، طاقتور اور وفادار ضرور تھا لیکن اس میں ذہانت کی کوئی علامت نہیں مل سکی تھی جو یہ سمجھ لیتا کہ وہ اپنے طور پر کوٹھڑی چھوڑ کر نامعلوم دشمنوں کے خلاف ڈرموں کے پیچھے مورچہ زن تھا۔ ویسے بھی مجھے اس کے پاس ڈنڈے کے علاوہ کوئی ہتھیار نظر نہیں آیا تھا۔ کسی آہٹ پر ایک غیر مسلح شخص کی طرف سے ٹارچ کا چمکایا جانا صریحاً خودکشی کے مترادف تھا۔ اس کی کمین گاہ کی نشاندہی ہونے پر آنے والے بہت آسانی کے ساتھ اسے گھیر کر موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔

پھر وہ عزیز بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سزا کے خوف میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ اے ٹُو سے بُری طرح خائف تھا۔ قرائن سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اے ٹُو کا مقابلہ کرنے کے بجائے خاموشی سے فرار ہو کر کسی گمنام ٹھکانے میں روپوش ہو جانے کو ترجیح دے گا اور اگر اس نے اے ٹُو سے ٹکرانے کا ارادہ کسی نہ کسی طرح کر ہی لیا تھا تو وہ اپنے ہیبت ناک سرپرست پر بےخبری میں تو وار کر سکتا تھا، اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ٹارچ روشن کر کے اے ٹُو کو احاطے میں کسی حریف کی موجودگی سے باخبر کرنے کا خطرہ مول لے۔

وہ یقینی طور پر راجہ ظہور احمد یا اے ٹُو ہی تھا جو اندھیرے میں چھپا کسی شکار کا منتظر تھا۔ عزیز غالباً اپنے دل سے اے ٹُو کا خوف نہ نکال سکا تھا اور وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ کوٹھڑی میں جلتی ہوئی لالٹین اور ادھر پھیلا ہوا سناٹا نادر خان کے بُرے انجام کی نشاندہی کر رہا تھا کیوں کہ اے ٹُو کو میدان صاف ہونے کی خبر اسی سے ملی ہو گی اور اس نے کسی زخم خوردہ بھیڑیے کی طرح سامنے نظر آنے والے واحد شکار کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو گا۔

میں نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا اور دیوار کے سہارے چوپائے کی طرح چلتے ہوئے ایک طویل چکر کاٹ کر ڈرموں کے ڈھیر کے عقب میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگا جہاں اے ٹُو کا مورچہ قائم تھا۔

شیڈ کے ویران اور تاریک ڈھانچے کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اس کے کھلے ہوئے دروازے کو حیرت سے دیکھا۔ شاید وہاں کی تلاشی لینے کے بعد غصے اور مایوسی کے عالم میں دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

دروازے کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے کانوں میں ایک مدھم سی انسانی آواز آئی اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں پستول ہاتھ میں لے کر سینے کے بل وہیں زمین سے چپک گیا۔

"یہ رات بڑی بھیانک نظر آ رہی ہے۔" کان لگا کر میں اندر سے آنے والی آواز سننے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ بولنے والے کی آواز سے دہشت جھلک رہی تھی۔ "نجانے اس ویرانے میں کس قدر خونریزی ہونے والی ہے؟"

"خونریزی سے میں نہیں ڈرتا، لیکن اس وقت وہ بھیڑیا بنا ہوا ہے، دشمنوں سے ٹکراؤ کی نوبت نہ آئی تو کہیں ہماری ہی باری نہ آ جائے۔ اس کی نظروں میں ہم جیسوں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔" دوسری آواز اس قدر مبہم تھی کہ شکستہ فقروں کے درمیانی الفاظ میں محض قیاس کے سہارے ہی پورے کر سکا۔

"کام کرو کام۔" پہلی آواز ابھری۔ "ہمیں اس کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہیے۔"

"کام تو ہو ہی رہا ہے، پھر ہمیں تو اگلی ہدایت تک یہیں رکنے کا حکم ملا ہے۔ لگتا ہے کہ رات یہیں کالی ہو گی۔ مصیبت تو یہ ہے کہ سگریٹ تک نہیں سلگا سکتے، وہ باہر سے دیاسلائی کے شعلے کی روشنی دیکھتے ہی تیر کی طرح ادھر آئے گا۔"

"اور سارے وقت یہ لاش یہیں ہمارے سینے پر مونگ دلتی رہے گی۔" پہلے کی آواز حسرت زدہ سی تھی۔ "یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اسی کو باہر ڈال دیں۔"

"تم پٹرول کے کین بھول رہے ہو، میرا خیال ہے کہ وہ اس شیڈ کو آگ لگانے کی نیت سے آیا تھا۔ شعلوں سے گھبرا کر جو

بھی باہر نکلنے کی کوشش کرتا اسے ہماری گولیاں چاٹ جاتیں لیکن یہاں تو میدان ہی صاف ملا۔"

"ہم غیر ضروری باتیں کر رہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ وہ اُکتا کر یہیں باہر آ بیٹھا ہو۔" پہلے نے شاید چونک کر کہا تھا۔

"تم ڈرا ہی دیتے ہو، ٹھہرو میں جائزہ لے کر آتا ہوں۔"

دوسرے کی آواز کے ساتھ خوفزدہ سی ہنسی بھی سنائی دی پھر سناٹا چھا گیا، شاید وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا باہر آ رہا تھا۔

میں ان دونوں کی گفتگو سننے کی کوشش میں دروازے کے بالکل قریب ہی پہنچ چکا تھا۔ آوازیں موقوف ہوتے ہی میں نے گھٹنوں اور کہنیوں کے بل تیزی سے پیچھے سرکنا شروع کر دیا۔

اس وقت میرا ذہن تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ وہ دونوں جس انداز میں اپنے سربراہ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں تھا کہ وہ لے ٹو ہی ہو سکتا تھا اور اگر وہ نچلے درجے کے لڑاکوں کی ٹولی بھی ساتھ لایا تھا تو یہ یقینی تھا کہ وہ کھلے چہرے کے بجائے نقاب پوش بن کر آیا ہوگا۔ ایسی حالت میں بس آواز ہی کی شناخت باقی رہ جاتی تھی۔ اس کی تحکم آمیز، خوابناک آواز ابھی تک میری یادداشت میں محفوظ تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر آنے والے کی نگاہ مجھ پر پڑ ہی گئی تو میں لے ٹو کی آواز میں پھٹکار کر اسے الٹے قدموں اندر لوٹ جانے پر مجبور کر دوں گا۔

چند ثانیوں بعد کھلے ہوئے دروازے کے قریب تاریکی میں ایک تاریک تر، مضبوط انسانی سایہ نمودار ہوا جس کے ہاتھوں میں لمبی نال والا کوئی لمبی مار والا آتشیں ہتھیار دبا ہوا تھا۔ میں سانس روک کر بالکل ہی زمین سے چپک گیا۔ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے چوکنے انداز میں چاروں طرف سر گھمایا اور دوبارہ شیڈ میں غائب ہو گیا۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میری طرف دیکھنے کے باوجود وہ تاریکی میں میری موجودگی کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ ان دونوں سے جو کچھ معلوم ہو سکتا تھا، وہ میرے علم میں آ گیا تھا۔ بس یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ اندر کیا اہم کام سرانجام دے رہے تھے۔ میں وہاں سے آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

اس بار وہ دونوں ہی ایک ساتھ اندر سے برآمد ہوئے تھے اور اندھیرے میں چمکتی ہوئی ان کی آنکھوں کی پتلیاں اُسی طرف نگراں تھیں جہاں میں زمین پر سینے کے بل پڑا ہوا تھا۔

"جاؤ۔" میں لے ٹو کی آواز کی نقل کرتے ہوئے پھاڑ کھانے والی مگر دھیمی آواز میں غرّایا۔ "جاؤ، میرا کام خراب نہ کرو۔ باہر کیا ایسی کی تیسی کرانے آئے ہو؟"

وہ بجلی کی سی سرعت سے واپس لوٹ گئے۔ اُن کے ذہنوں پر لے ٹو کا خوف اس حد تک مسلط تھا کہ آواز سننے کے بعد انھوں نے مزید کوئی تسلی کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

اس کامیابی پر میرا دل شیر ہو گیا، میرا جی چاہا کہ ان میں سے ایک کو طلب کر کے اس کی گن حاصل کر لوں تاکہ دور ہی سے لے ٹو کا نشانہ لے سکوں لیکن میں اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ رائفل لیتے ہوئے مجھے ان کے اس قدر قریب جانا پڑتا کہ وہ اندھیرے کے باوجود میرا ہیولا دیکھ لیتے جو نہ صرف ساخت کے اعتبار سے لے ٹو سے مختلف تھا بلکہ لباس اور چہرے پر نقاب کی غیر موجودگی بھی خطرات پیدا کر سکتی تھی۔

میں وہاں سے آگے روانہ ہوا تو مجھے یقین تھا کہ اب وہ دونوں رات بھر بھی اندر پھنسے رہے تو آپس میں بات کرنے کی جسارت نہیں کر سکیں گے۔ ان کا پتّا پانی کر دینے کے لیے یہی کافی تھا کہ انھوں نے اپنے نام نہاد سربراہ کی آواز سُن لی تھی۔

بڑھتے بڑھتے اچانک مجھے ٹھہر جانا پڑا۔ میدان کے وسط میں ایک عجیب سی آواز سنائی دی تھی جیسے کوئی بے آواز گولی ٹھوس لوہے سے جا ٹکرائی ہو۔ اس وقت میری توجہ اپنے راستے پر مرکوز تھی لہٰذا میں تعین نہ کر سکا کہ کوئی فائر ہی ہوا تھا یا وہ میرا وہم تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ کہیں انتظار کرتے کرتے لے ٹو کے صبر کا پیمانہ لبریز نہ ہو گیا ہو۔

تھوڑی دیر میں میں احاطے کی دیوار کے ساتھ ایک ایسی جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے ڈرموں کے انبار کے پیچھے دیکھنا ممکن تھا۔ وہاں تاروں کی چھاؤں میں مجھے دو انسانی ہیولے کھڑے نظر آئے۔ اندھیرے کے باعث ان دونوں کی جزئیات کا مشاہدہ کرنا ناممکن تھا لیکن ہلکی ہلکی ہوا نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ایک ہیولے کا لباس ہوا سے قدرے پھڑ پھڑا رہا تھا جب کہ دوسرا چُست لباس میں ملبوس تھا جو یقیناً لے ٹو ہی ہو سکتا تھا۔

میں ان کی بے خبری میں زمین سے چپکا تیزی کے ساتھ آگے سرکتا ہوا ایک چوبی ڈھیر کے پیچھے پہنچ گیا جو اُن کی کمین گاہ سے اتنے فاصلے پر تھا کہ میں بہ آسانی پستول سے ان دونوں کا نشانہ لے سکتا تھا۔ چوبی ڈھیر کے پیچھے پوزیشن لے کر میں نے ہاتھ سیدھا کیا اور پھر نیچے گرا لیا۔ میرا نشانہ کبھی بھی خراب نہیں رہا تھا لیکن یہ بھی دُرست ہے کہ مجھے آنکھیں بند کر کے نشانہ لگانے کا دعویٰ کبھی نہیں رہا تھا۔

اس احاطے میں اُن کی نفری جو بھی رہی ہو، کم از کم چار میری نگاہوں میں آ چکے تھے اور میرا نشانہ خطا ہونے کی صورت میں وہ بہت دل جمعی کے ساتھ مجھے گھیرنے کی کوشش کر سکتے تھے اور اُن کو میرے پستول کی محدود رینج کے مقابلے میں کم از کم دو رائفلوں کی برتری ضرور حاصل تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے عزیز کی دل شکنی کر کے عقل مندی نہیں کی تھی۔ اگر کم از کم اس رات کے لیے عزیز کو ساتھ ملا لیتا تو اس وقت تنہائی کا احساس کیے بغیر اُنھیں دو مختلف سمتوں میں الجھایا جا سکتا تھا۔

لیکن اب میرے لیے واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ بارہ گھنٹوں کی قلیل مدت میں لے ٹو تیسری بار میرے سامنے تھا اور اس موقع کو محض متوقع ناکامی کے خوف سے ضائع کرنا میرے نزدیک حماقت سے کم نہ ہوتا۔

میں نے دوبارہ ہاتھ سیدھا کیا۔ اندھیرے میں چُست پوش سائے کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ ہولناک بارودی دھماکے کے ساتھ دہکتا ہوا شعلہ اندھیرے میں نشانے کی طرف تیر گیا۔ اور یہ دیکھ کر میرا دل خوشی سے بلیّوں اچھل پڑا کہ دھماکے کی آواز لے ٹو کے کانوں تک پہنچنے سے پہلے میری چلائی ہوئی گولی نے اسے چاٹ لیا تھا۔

فضا میں اس کی کریہہ چیخ گونجی اور اس کا جسم فضا میں اچھل کر زمین پر آ رہا۔ دوسرا سایہ اس سے پہلے ہی زمین پر گر چکا تھا۔ میں گھور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُدھر گھورتا رہا لیکن وہاں زندگی کے تمام تر آثار مفقود نظر آ رہے تھے، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں نیچے گرتے ہی زمین میں سما گئے ہوں۔

چند ثانیوں کے اعصاب شکن سناٹے کے بعد ڈرموں کے انبار کے پہلو سے تقریباً بیک وقت دو گولیاں چلیں اور مختلف سمتوں میں تیر گئیں۔ انھوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ فائر پیچھے سے ہوا تھا مگر سمت کا تعین نہیں کر سکے تھے پھر ان میں سے ایک نیم دائرے کی صورت میں تسلسل کے ساتھ گولیاں برساتا ہی چلا گیا۔ اس کا زاویہ تبدیل ہوتے ہی میں نے بارودی آگ کے مخرج کا نشانہ لے کر دوسرا فائر کر دیا اور اس بار پھر وہی پہلے والی غرّاتی ہوئی چیخ فضا کا سینہ چیر گئی۔

شاید پہلی گولی سے زخمی ہونے کے بعد لے ٹو کا ذہنی توازن اُلٹ گیا تھا جو وہ ایسے کھلے محاذ پر اندھا دھند فائرنگ پر اتر آیا تھا جب کہ اس کا ساتھی ہوشیار تھا، بار بار جگہ تبدیل کر کے گولیاں برسا رہا تھا۔ میری طرف سے دوسرا فائر ہوتے ہی اس نے شاید میری پوزیشن بھی دیکھ لی تھی اور اب اس کی چلائی ہوئی تمام گولیاں چوبی ڈھیر پر یا اس کے قرب و جوار میں ہی برس رہی تھیں۔

میں زمین پر گر کر سینے کے بل رینگتا ہوا ایک دوسری آڑ میں چلا گیا۔ وہ دونوں مجھے اتنا احمق سمجھ رہے تھے کہ بدستور اسی چوبی ڈھیر پر چاند ماری کی مشق کرتے رہے۔ ان دونوں کی فائرنگ سے یہ پتا چل رہا تھا کہ لے ٹو میری دو گولیوں سے زخمی ضرور ہوا تھا مگر کوئی بھی زخم اتنا کاری نہیں تھا کہ فائرنگ میں رکاوٹ بنتا۔

میں کسی تیسرے بھرپور موقع کی تلاش میں اپنی جگہ خاموش پڑا رہا۔ پھر یکلخت ان کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ موقوف ہو گیا، میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ان کے اگلے وار کے انتظار میں زمین سے چپکا رہا۔

پھر فضا میں ایک سیاہ گولا سا اُڑتا نظر آیا۔ میں نے کہنیاں زمین پر ٹکا کر دونوں ہتھیلیوں سے اپنے کان بند کر کے آنکھیں بند کر لیں اور سر نیچے جھکا لیا۔ چوبی ڈھیر پر ہونے والے دھماکے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ مٹی اور لکڑی کے کئی ٹکڑے مجھ پر آ گرے اور فضا میں کثیف دھوئیں کی لہر کے ساتھ لوزنگ شعلوں کی سُرخی بکھرنے لگی۔

میرے لیے وہ سنگین صورتِ حال سخت تشویش ناک تھی۔ وہ لوگ میری توقع سے کہیں زیادہ تیاریوں اور بدترین عزائم کے ساتھ وارد ہوئے تھے۔ لکڑیوں کا ڈھیر جل اٹھنے کے بعد اس کھلے میدان میں اوچھی رکاوٹیں زیادہ دیر تک مجھے پناہ نہیں دے سکتی تھیں۔ شعلوں کی روشنی نے تقریباً پورے میدان کو غیر محفوظ بنا دیا تھا۔ وہ لوگ کسی بھی لمحے مجھے دیکھ سکتے تھے اور پھر میری ابتدائی کامیابیوں کا المناک انجام شروع ہو جاتا۔

یکے بعد دیگرے مزید دو دستی بم اور پھٹے۔ شاید احساسِ شکست نے لے ٹو کو پاگل ہی کر دیا تھا اور وہ ہر قیمت پر میرے خاتمے پر تُل گیا تھا۔ اس بار بم زمین پر گرے تھے۔ لہٰذا دھوئیں کے ساتھ ہلکے سے شعلے بھڑک کر دم توڑ گئے مگر لکڑیوں کی آگ لحظہ بہ لحظہ جان پکڑتی جا رہی تھی... میں نے تن بہ تقدیر ہو کر میدان چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ایسے نامساعد حالات میں مقابلے پر جمے رہنا میرے لیے مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے زمین پر پڑے پڑے کھسکنا شروع کیا اور اپنی دانست میں بھڑکتے ہوئے شعلوں اور دھوئیں کی آڑ لیتے ہی اُٹھ کر عقبی دیوار کی طرف دوڑ لگا دی۔

"وہ گیا۔" لکڑیوں کے چٹخنے کے شور میں ایک مضطرب آواز گونجی اور فوراً ہی گولی چلا دی گئی۔

اس وقت میرے پاس فرار کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا۔ دستی بموں، رائفلوں اور دوسرے آتشیں ہتھیاروں کی بھیڑ میں چار حریفوں کے ساتھ میں تنہا کتنی دیر ٹک سکتا تھا؟ اس وقت میری تمام تر قوت پنڈلیوں میں سمٹ آئی تھی اور میں تیزی کے ساتھ دائیں بائیں بل کھاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ پستول اب میرے لیے بے کار ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے اُسے جیب میں ڈال لیا تھا۔

ان دونوں ہی نے فائرنگ شروع کر دی تھی میرے ستارے یاوری کر رہے تھے کہ میں ان کا نشانہ بنے بغیر دوڑتے ہوئے ان کی فائرنگ رینج سے باہر نکل گیا اور ان کی چلائی ہوئی گولیاں پیچھے رہ گئیں۔ ان میں سے کسی ایک کے دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک مجھے سنائی دے رہی تھی اور میری اور اس کی رفتار میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں اپنی بقا کے لیے، جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا اور وہ میرا خون بہانے کے لیے۔ جب تک کسی بھی عمل کے پیچھے جذبے کی شدت نہ ہو عمل مثالی نہیں بن سکتا۔ یہ خیال ان گمبھیر لمحات میں بھی میرے ذہن میں در آیا۔ ہاں لے ٹو اگر دوڑ لگانے کے قابل ہوتا تو شاید وہ مجھے آلیتا کیونکہ میری ذات سے اس کی نفرت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی جو اس کی رفتار کے لیے تازیانے کا کام کرتی۔

"رُکو، ورنہ چیتھڑے اُڑا دوں گا۔" بھاری قدموں کی گونج میں پیچھے سے کوئی چیخا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سُنی، دیوار اب مجھ سے محض چند گز دور رہ گئی تھی۔

پھر شاید اُس نے ایک اور بم اچھال دیا۔ میں گولی کی زد سے نکل چکا تھا تو بھلا دستی بم کہاں مجھ تک پہنچتا، لیکن دھماکا اتنا شدید تھا کہ میں بھاگتے بھاگتے منہ کے بل زمین پر جا رہا۔ دہانے اور چہرے کو بدترین زخموں سے بچانے کے لیے میں نے گرتے گرتے ہتھیلیاں زمین پر جما دیں اور ان ہی کے بل کئی فٹ تک گھسٹتا چلا گیا۔

مٹی کے ذرات اور کنکر ہتھیلیوں کی کھال چیر کر زخموں میں اترتے چلے گئے لیکن اس وقت میرے لیے ایسی ہر تکلیف بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں دوبارہ اٹھا اور چند چھلانگیں لگا کر دیوار تک پہنچ گیا۔

میں دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود رہا تھا تو شیڈ کی طرف سے بھق کی ایک زوردار آواز آئی اور وہاں بھی مجھے دھوئیں کا کثیف بادل اُمڈتا نظر آیا۔ شاید پہلے سے طے شدہ کسی پروگرام کے مطابق شیڈ میں پٹرول انڈیل کر آگ لگا دی گئی تھی۔ میں نے دیوار پر سے سر گھما کر دیکھا تو نسبتاً ڈھیلے لباس والا فائر کرتا ہوا بدستور میری طرف دوڑا آ رہا تھا۔ میں نشیب و فراز کی پروا کیے بغیر دوسری طرف کود گیا۔

میرے پیر نرم اور گیلی زمین سے ٹکرائے۔ اسی کے ساتھ نتھنوں میں تیز بُو بھی در آئی۔ شاید وہ فیکٹریوں سے خارج ہونے والے پانی کو بہا لے جانے والا نالا تھا جو اس گودام کی پُشت سے گزر رہا تھا۔

میں نے فوراً ہی دوڑ کر ناہموار نالے میں اتر جانے کا فیصلہ کیا لیکن دیوار کی دوسری جانب قدموں کی دھمک سُن کر ارادہ ملتوی کر دیا اور وہیں دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ زندگی اور موت کا ایک بھیانک امتحان گزر چکا تھا اور اب میں اس موقع کو لے ٹو کے لیے بھی یادگار بنانا چاہتا تھا۔

وہی ہوا جس کے وقوع پذیر ہونے کی اُمید میں میں دیوار کے سائے میں کھڑا اپنے چڑھے ہوئے سانسوں پر قابو پا رہا تھا۔ دیوار کے پیچھے مجھے گہرے سانسوں کی آواز آئی جیسے کوئی سانڈ ہانپ رہا ہو۔ میں نے اپنا سانس روک لیا اور پنڈلیوں کو قدرے جھکا کر اوپر دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں دو بھاری ہاتھ دیوار کی مگر پہ جمے اور پھر میرا پیچھا کرنے والا دیوار پر چڑھ کر دور نالے کی گہرائی میں نگاہیں دوڑانے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہو گا کہ بے جوڑ مقابلے سے بوکھلا کر بگٹٹ بھاگ نکلنے والا وہیں اس کی موت کے ہرکارے کے روپ میں موجود ہو گا۔

توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں اس نے جیسے ہی اپنی داہنی ٹانگ دیوار سے باہر لٹکائی، میں نے وحشیانہ طاقت سے ٹانگ پکڑ کر اسے نیچے گھسیٹ لیا۔ اس کے حلق سے غیر ارادی طور پر ایک کریہہ چیخ آزاد ہو گئی اور وہ سر کے بل زمین پر آ رہا۔ میں پھرتی کے ساتھ اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور میرے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر جم گئے۔

میں نے اس کی گردن پر حلقہ تنگ کیا تو اس کے جسم میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی میں نے گرفت کمزور کیے بغیر اس کی گردن کو جنبش دی تو انکشاف ہوا کہ گرتے ہی اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اور جسدِ خاکی روح سے عاری ہو گیا تھا۔

میں اس کا پستول اٹھا کر اس گندے اور بدبودار نالے میں اترتا چلا گیا۔ گودام میں لگی ہوئی آگ کے شعلے تیزی کے ساتھ شدت اختیار کرنے لگے تھے اور کثیف دھوئیں کے بادل نالے پر چھاتے جا رہے تھے۔

نالے میں کیچڑ اور کوڑے کے ڈھیروں سے بچتا بچاتا میں کافی دیر بعد باہر نکلا تو دونوں ہتھیلیاں خون آلود تھیں۔ زخموں میں گھسے ہوئے کنکر بھی اب تکلیف دینے لگے تھے۔ گہرے رنگ کے لباس سے مٹی وغیرہ جھاڑنے کے بعد بھی خاص طور پر پتلون کے گھٹنوں پر رگڑ کے ایسے نشانات باقی رہ گئے کہ اس لباس میں کسی معقول جگہ کا رُخ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں دونوں جلتی ہوئی ہتھیلیاں پتلون کی جیبوں میں چھپا کر کار کی طرف چل دیا۔

اس وقت میرے ذہن میں بس ایک بھیانک سی سنسناہٹ گونج رہی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں اس اہم معرکے میں اپنی جان بچانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ لے ٹو زخمی ضرور ہو گیا تھا لیکن وہ اب بھی اپنی من مانی کرنے کے لیے زندہ اور آزاد تھا۔ وہ اپنے پیشے اور فطرت کے اعتبار سے ایک ایسا موذی تھا جسے فوری طور پر فنا کے گھاٹ اترنا چاہیے تھا۔

میں خالی الذہنی کے عالم میں ہونٹ بھینچے خاصی دیر تک کار ڈرائیو کرتا رہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ لے ٹو زخمی تھا اور اگر میرا اندازہ درست تھا تو اُسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔

لے ٹو لاکھ شاطر اور بارسوخ سہی لیکن کراچی اس کا شہر نہیں تھا اور گولیوں کے زخموں کے لیے اُسے کہیں بھی آسانی کے ساتھ طبی امداد نہ دی جاتی۔ ہر جگہ پولیس کا درمیان میں آنا لازمی تھا۔ پورے شہر میں بس ایک جگہ ایسی تھی جہاں اُس کا کام بن سکتا تھا۔ ڈاکٹر اکبر کی علاج گاہ، جہاں غزالہ کا بھائی کامران زیرِ علاج تھا۔ عرصۂ دراز سے ہیروئن کی کھپت کا ایک معقول ٹھکانہ تھی۔ تنظیم کے مقامی بڑوں سے اکبر کے جو مراسم رہے تھے، ان کی روشنی میں کچھ بعید نہ تھا کہ لے ٹو بھی کسی روپ میں اکبر سے شناسائی رکھتا ہو۔ ایسی صورت میں وہ طبی امداد کے لیے اسی سے رجوع کر سکتا تھا۔

میرے لیے کامران کی عیادت کے بہانے وہاں گھسنا بہت آسان تھا مگر دشواری یہ تھی کہ میری ہتھیلیاں زخمی اور خون آلود تھیں۔ لباس بھی اس جگہ کے قابل نہیں رہا تھا۔ اگر میں حلیہ دُرست کرنے گھر جاتا تو غزالہ اس حالت میں مجھے ہرگز لے ٹو کے پیچھے نہ جانے دیتی۔ اگر اس حالت میں اس کے باپ سے سامنا ہو جاتا اور وہ بزرگانہ ہٹ دھرمی پر اُتر آتا تو میرے لیے گھر سے قدم نکالنا بھی محال ہو جاتا۔

میں سوچتا رہا اور ہتھیلیوں کی تکلیف کو فراموش کر کے شہر کی پُرسکون سڑکوں پر کار ڈرائیو کرتا رہا۔ آخر کار مجھے ایک قابلِ عمل خیال سوجھ ہی گیا اور میں نے کار جہانگیر کے گھر جانے والے راستے پر ڈال دی۔

جہانگیر، غزالہ کے ہاں روپوش تھا۔ سلمٰی کو میں جلد از جلد گھر چھوڑ دینے کی ہدایت دے چکا تھا اور جہانگیر کے ملازمین مجھے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ سب سے آسان صورت یہ تھی کہ میں وہاں پہنچ کر اپنے زخم صاف کرتا۔ پھر اپنی اور جہانگیر کی یکساں جسامت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دستانوں سمیت اُس کا کوئی اچھا سا لباس زیب تن کر کے لے ٹو کی تلاش کی مُہم میں اکبر کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو جاتا۔

جہانگیر کے مکان پر پہنچ کر میں نے حسبِ معمول اپنی کار باہر فٹ پاتھ کے کنارے پارک کی اور پھاٹک کی طرف بڑھ گیا۔ چوکیدار نے پہلی ہی دستک پر ذیلی کھڑکی کھول دی اور مجھے پہچان کر کچھ حیران سا ہو گیا۔

"آپ ڈینی بابو! اس وقت کیسے؟" اس نے محبت اور احترام کے ساتھ پوچھا۔

"بس ایک کام پڑ گیا تھا۔" میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "کون کون ہے گھر پر؟"

سوال میں نے رسمی طور پر کیا تھا لیکن جواب سن کر مجھے سلمٰی پر خاصا غصہ آیا۔ "صاحب تو تین دن سے لاپتا ہیں۔ بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں ہوں گی۔"

"بیگم صاحبہ کو تو شام میں کہیں چلے جانا تھا؟" میں نے تُرش، استفسار طلب لہجے میں کہا۔

"جانا تھا مگر ان کے رشتے دار حیدرآباد گئے ہوئے ہیں، مجبوراً یہیں رکنا پڑا۔" اس نے کھیسیں نکال کر کہا۔ "آپ چلے جائیں، کچھ دھیان ہی بٹے گا، مجھ سے تو بے چاری کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔"

"اب کتے وغیرہ تو نہیں ہیں اندر؟" غصے کے باوجود تحفظ کی لاشعوری خواہش الفاظ کے روپ میں ڈھل ہی گئی۔

"وہ تو کب کے ختم ہو گئے۔ بیگم صاحبہ کو وحشت ہوتی تھی، دونوں کو زہر دلوا دیا تھا۔" اس نے معصومانہ سادگی کے ساتھ کہا۔ "آپ بے فکر ہو کر اندر چلے جائیں۔"

میں سلمٰی کو بے نقط سنانے کا ارادہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہ کوئی جاہل اور دیہاتی عورت نہیں تھی۔ اسے خطرے سے پوری طرح آگاہ کر دیا گیا تھا۔ اگر عین موقع پر اس کے رشتے دار حیدرآباد جا مرے تھے تو وہ فوری طور پر کسی اچھے ہوٹل میں ہی منتقل ہو سکتی تھی۔ میں غزالہ سے جان بچا کر ادھر آیا تھا اور اب مجھے اُمید

تھی کروہ موقع ہاتھ آنے پر اپنی تیمارداری کے سارے ہی جوہر آزما ڈالے گی۔

میں راہداری میں بچھے ہوئے نرم اور دبیز قالین پر چلتا ہوا اس کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچا تو پٹ بند تھے۔ ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہی اندر کی طرف کھل گئے۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

سر سے پیر تک سیاہ لباس میں ملبوس ایک نقاب پوش اس کی مسہری پر دراز تھا۔ اس کا داہنا شانہ اور بائیں پنڈلی برہنہ تھی جہاں اُدھڑے ہوئے گوشت پر جمے ہوئے خون کے لوتھڑے صاف نظر آرہے تھے۔ وہیں فرسٹ ایڈ کا سامان پھیلا ہوا تھا اور سلمیٰ دروازے کی طرف پُشت کیے اس کی پنڈلی کا زخم صاف کر رہی تھی۔

جہانگیر کے لہو کا پیاسا، سلمیٰ کو کس قدر عزیز تھا؟ میری آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

وہ منظر دیکھتے ہی بے اختیار میرا ہاتھ جیب میں پڑے ہوئے پستول کی طرف گیا تھا۔ ادھر نقاب پوش مچھلی کی طرح تڑپ کر بستر سے اٹھا تھا اور سلمیٰ کو دونوں شانوں سے جکڑ کر اپنے اور میرے درمیان ڈھال بناتا ہوا نیچے اتر آیا تھا۔

"ڈیڈی!" مجھے دیکھتے ہی سلمیٰ نے ہلکی سی چیخ مار کر میری طرف بڑھنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ نقاب پوش کی بے رحمانہ گرفت بہت سخت تھی۔

"پستول کی نال گرالو۔" نقاب پوش نے سرد اور تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے نشانہ نہ سمجھنا۔ میرے بائیں ہاتھ میں جو سرنج دبی ہوئی ہے اس میں مہلک ترین زہر بھرا ہوا ہے۔ اگر اس کی سوئی اس عورت کے جسم میں اتار دوں تو یہ بنا انجکٹ کیے بغیر پلک جھپکتے میں مر جائے گی، للہٰذا جو کچھ کہہ رہا ہوں، بے چون و چرا اس پر عمل کرتے رہو۔"

"مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔" میں نے بے رحمانہ لہجے میں کہا۔ "اسے ہلاک کرنے کی دھمکی دے کر تم مجھ سے بچ نہیں سکتے۔ جو عورت اپنے شوہر کے جانی دشمن سے ایسی آشنائی رکھتی ہو، میری دانست میں اسے مر ہی جانا چاہیے۔"

کمرے کی فضا میں نقاب پوش کی دبی دبی زہریلی ہنسی گونج اٹھی۔

"ڈیڈی!" سلمیٰ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پیٹتے ہوئے رو دینے والی آواز میں بولی۔ "مجھے اتنا بڑا الزام نہ دو۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ نہ جانے یہ کدھر سے دیوار پھاند کر نوکروں کے علم میں لائے بغیر گھر میں گھسا ہے۔"

اس کی ورم آلود آنکھیں اور ان میں ٹھہرے ہوئے موٹے موٹے آنسو دیکھتے ہی مجھے اس کی بے گناہی اور رلے لوٹ کی مکاری کا پورا یقین آ گیا تھا لیکن اسے لوٹ کے مدافعانہ حربے کو ختم کرنے کے لیے میں نے نفرت آمیز اداکاری جاری رکھی اس لمحے گبڑے بھکاری کے کہے ہوئے الفاظ ذہن کے کسی گوشے میں اُبھرے جو تلخ لہجے میں میں نے فوراً ہی اُگل دیے۔

"عورت بڑی ناقابل فہم ہوتی ہے سلمیٰ! آشنائی اپنی خوشی سے کرتی ہے۔ پکڑی جاتی ہے تو مظلومیت کا شور مچا دیتی ہے... تمہارے لیے تو مرنا ہی بہتر ہے... اس کے ہاتھوں سے بچ گئیں تو جہانگیر تمہیں ذبح کر دے گا۔ تم تو اس کے لیے مار آستین ثابت ہوئی ہو۔"

اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹ کر پیشانی پر جا پڑھیں ہونٹ اس طرح وا ہوئے جیسے اس کا دم گھٹنے لگا ہو۔ اس کے جسم پر پل بھر کے لیے تشنج ساطاری ہوا اور وہ کھڑے کھڑے صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔

لے لوٹ نے بمشکل اس کے گرتے ہوئے بدن کو اپنے بائیں بازو پر سنبھالا تھا۔

"جہانگیر کہاں ہے؟" لے لوٹ نے نقاب میں بنے ہوئے گول سوراخوں میں سے براہ راست مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"ہارے ہوئے فریق کو سوالات کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ عورت کو ایک طرف ڈال دو۔ آج تم میرے ہاتھ سے زندہ بچ کر جا سکو گے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ابھی تو تم نے اس کے لیے سزائے موت صادر کی ہے، اب ترس کیوں آرہا ہے؟" اس نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

"مارنا چاہو تو بے شک مار دو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس کی اصل سزا تو وہ ہوگی جب یہ جہانگیر کے سامنے اعترافِ جرم کرے گی یا اپنی صفائی پیش کرنے کی ناکام کوشش کرے گی۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں